محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، ڈھاکہ
اور جنرل ہیڈکوارٹرز لائبریریز کے لیے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون: ۶۳۹۹۳

افکار

سال: ۲۳ ○ شمارہ: ۱۸۹

مدیر

صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ	بیرونِ ملک سے	قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ / ۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

[illegible]
۳۰- پرنسیز [illegible] ۹

مئی ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

اس شمارے کی تمام تخلیقات براہ راست حاصل کی گئی ہیں۔ مضامین نظم و نثر کا حق اشاعت محفوظ ہے۔ کوئی تخلیق تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جاسکتی

یومِ اقبال

ہر سال کی طرح اس بار بھی اپریل میں "یومِ اقبال" کی ملک گیر تقریبات منعقد ہوئیں اور مفکرِ مشرق کو شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ زندہ اور آزاد قومیں ہمیشہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ اُن کے نام اور پیغام سے قوم کا ہر فرد درسِ تپش حاصل کر سکے ـــ

علامہ اقبال ہمارے اُن اکابرین کی صفِ اول میں شامل ہیں جنہوں نے ملت کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے فکری اور عملی انقلاب کی راہیں تلاش کیں۔ قافلے کی رہنمائی کی اور منزل پر پہونچ کر دم لیا ـــ اُن کی یاد منانا ہمیں سعادت ہی نہیں ـــ قومی فرض بھی ہے ـــ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ قوم پر کچھ اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ جن میں مقدم فرض یہ ہے کہ ہم اکابرینِ ملت کی ایسی یادگاریں بھی ضرور قائم کریں جو اُنؒ کے نام و کام کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھ سکیں ـــ اچھی لائبریریاں، ٹاؤن ہال، تعلیمی ادارے، تحقیقی شعبے ـــ وغیرہ اقبال کے نام سے قائم کئے جا سکتے ہیں اور شہروں سے لے کر دور دراز قصبات تک اقبال کی روشنی پھیل سکتی ہے بشرطیکہ 'یومِ اقبال' منانے والے اور سرمایہ فراہم کرنے والے ایک واضح لائحہ عمل کے ساتھ ان یادگاروں کے قیام کا عزم کر لیں، اور ہر سال جو روپیہ ظاہری نمود و نمائش پر صرف ہوتا ہے اُسے اقبال کی یادگاروں کے لئے وقف کر دیں ـــ یہ کام نہ مشکل ہے نہ پیچیدہ ـــ اقبال عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ وہ قومی شاعر اور قومی مفکر کی حیثیت سے جس مرتبہ پر فائز ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے اُن کے پیغام کو گھر گھر پہونچنا چاہئے۔ تاکہ پوری قوم اس عظیم شاعر و مفکر سے بہرہ وَر ہو سکے۔ اور اس بڑے مقصد کی بھی تکمیل ممکن ہو سکے جس کی خاطر ہر سال "یومِ اقبال" منایا جاتا ہے۔

اشاریہ

سراج الدین ظفر

اقبال

اقبال کہ خرد رازجو تھا — اسرار ازل سے دو بدو تھا
ہر حرف تھا اسکا حرفِ جبریل — ہر نکتہ کمالِ جستجو تھا
دانائے ازل نظر تھی اسکی — آگاہِ جمالِ بے نمو تھا
خورشیدِ ہنر کا تھا اجالا — دنیائے عمل کی آبرو تھا
وحدت کی شراب سے لبالب — اس مردِ فقیر کا کدو تھا
گنجینۂ نادرات سے پُر — دامانِ خیال و گفتگو تھا
دل اسکا جلائے معرفت سے — آئینۂ وارداتِ ہُو تھا
آیا نہ فریبِ رنگ و بو میں — نقادِ جہانِ رنگ و بو تھا

تحقیقِ زمان و لامکاں میں
آپ اپنی خودی کے روبرو تھا

سراج الدین ظفر

محسن احسان

اقبال کے حضور میں

پھر آج مردِ قلندر ترے حضور میں ہم
عقیدتوں کے حسیں پھول چن کے لائے ہیں
جلو میں اپنے جلائے چراغِ فکر و نظر
رموزِ زیست کا مقصد سمجھنے آئے ہیں

فضا میں تیرگی اس طرح سے تیری صدا
کہ جیسے نور اندھیرے میں دُور تک برسے
ترے پیامِ عمل ہی کا تھا یہ ردِ عمل
لپک لپک کے بڑھے لوگ دار تک در سے

ترے ہی نغموں نے دہقاں کو زندگی بخشی
ترے ہی گیتوں نے ملّا کا سحر ختم کیا
ترے ہی شکووں سے آئی جلال میں رحمت
ترے ہی نالوں سے گونجی وطن وطن کی صدا

ہمارے فکر پہ تو نے ہی آشکارا کیں
یہ فلسفے کی تحیّر فروز تاویلیں
بجھا کے اپنے چراغِ حیات کو تو نے
ہر ایک دل میں جلائیں خودی کی قندیلیں

جنہیں تو مدّتوں دیتا رہا پیامِ خودی
وہ لوگ آج خودی کا مقام بیچتے ہیں
وہ تیرا فلسفۂ زیست، تیرا درسِ عمل
بصد وثوق، بصد اہتمام بیچتے ہیں

ریاض انور

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں طویل نظم کا ایک حصہ)

حیات کی راہ بے اماں پر
خبر نہیں کب سے آنسوؤں کا سفر ہے جاری
حیات کا اک ایک لمحہ ہے اس طرح آدمی پہ بھاری
شکستہ کشتی میں جیسے کوئی
مہیب لہروں میں گھر کے
اک بحرِ بیکراں میں سسک رہا ہو
وصالِ ساحل کی آرزو میں
افق افق تک بھٹک رہا ہو
یہی ہے وہ سرزمیں کہ جس کو
سنہرے بنگال کے حسیں نام سے پکارا گیا ہمیشہ
یہاں کی بل کھاتی ندیوں، لہلہاتے کھیتوں،
مہکتے نغموں کی دلکشی سے
کئے تھے ٹیگور نے حریمِ سخن میں
وہ ماہتاب روشن
کہ جن کی جاں بخش نرم کرنیں
ابد تلک ہر تراشِ انساں کو
زندگی کا پیام دیں گی
یہیں مدن بول نے لکھی وہ امر کویتا
جو ابر بن کر حیات کی خشک کھیتیوں پر
برس رہی ہے
یہ رہگذاریں بڑی مقدس ہیں اب بھی جن پر
جلال شہ اور فقیر لالن کے نقشِ پا
جگمگا رہے ہیں
یہیں سے گذرے ہیں وہ قلندر
جو گیروی چادروں میں لپٹے، عصا کو تھامے
خدائے واحد کی عظمتوں کے ترانے گاتے
سمے کی دھندلاہٹوں میں شمعِ جنوں جلاتے
نگر نگر جا کے آدمی کو پیامِ انسانیت سناتے
جو رات پڑتی تو بستیوں سے پرے قلندر قیام کرتے
گھنے درختوں کے زیرِ سایہ الاؤ جلتے

صدائے ہو حق میں سنکھ بجتے
یہ کشتگانِ رہِ وفا جب
سرورِ مستی میں اپنا "اک تارہ" چھیڑتے تو
شجر شجر جھوم جھوم جاتا
کبھی کوئی کیف و جذب میں آ کے رقص کرتا
کسی کے ہونٹوں سے مرشدی کا
عظیم و پُر نور گیت ڈھلتا

کو ہتائے آپھے رسے دین درو دی سائیں
ہے کس دیس میں غم کا مداوا سائیں
چیتن گورو کے سنگ جا کر خبر لے آؤ بھائی
وہ کیونکر پہچانا جائے
جس کو یاں ہم دیکھ نہ پائے
وہ اک بار اگر مل جائے
کروں میں سیوا سائیں
ہے کس دیس میں غم کا مداوا سائیں
سوجھ بوجھ کر بھگت بنو تم
دل کے پاس اُسے دیکھو تم
لاگن کہوے
اپنا آپ جو ڈھونڈو تم
اتنا دور تو نائیں
ہے کس دیس میں غم کا مداوا سائیں

دمِ سحر جب افق پہ لہراتی روشنی کی حسین کرنیں

مُسافرانِ ازل
نئی منزلوں کی جانب روانہ ہوتے
ہوا میں رہ جاتی صرف گیتوں کی گنگناہٹ
سفر کے قدموں کی سنسناہٹ
گزرتے لمحوں کی سرسراہٹ

یہیں پہ اُترا تھا دو صدی پہلے ایک سایا
جو پھیلتے پھیلتے شبِ تار بن گیا تھا
تجارتی کوٹھیوں میں سازش کے جال بُن کر
حسیں خیاباں کو اک جہنم بنا دیا تھا
یہاں پہ کاٹے گئے تھے ہاتھ اس لئے کہ انساں
غلام ہو کر بھی حسن تخلیق کر رہا تھا
دیارِ ڈھاکہ میں اس لئے کھڈیاں جلا دیں
بلادِ مغرب کی کھڈیاں بند ہو نہ جائیں
یہاں ہر اک گھر کی روشنی اس لئے بجھا دی
جہانِ افرنگ کے در و بام جگمگائیں
مہکتی مسکاتی دھان کی لہلہاتی فصلیں
جفا کے ہاتھوں اڑیں ہواؤں میں راکھ بن کر
"تمام کھیتوں میں نیل ہی نیل کاشت ہوگا
یہ حکم دیتی ہے آج سے کمپنی بہادر"
تمام آنکھوں میں بجھ گئیں زندگی کی شمعیں
تمام چہروں پہ ڈھل گئے بے بسی کے سائے
برستے کوڑوں کی زد سے اڑ کر لہو کے چھینٹے
چراغ بن کر اندھیری راتوں میں جگمگائے

سراج[1] و تیتو[2] و گھوش[3] سے کتنے
جاں نثارانِ ارضِ ونگہ[4]
یہ عہد کر کے اُٹھے
کہ ہم کھینچ لیں گے لمحات کی طنابیں
ستم شعاروں کے دستِ پُرخوں سے
زورِ بازو سے چھین لیں گے
وہ بستیاں وہ نگر
جہاں زخم ہائے دل کے چمن کھلے تھے
مگر وہ لمحات کے پُراسرار قافلوں کو
نہ روک پائے
کہیں گھٹاؤں نے ہنس کے
تدبیر کے گھروندوں کو روند ڈالا
کہیں پہ جعفر سے کور دل نے
وطن کی تقدیس بیچ ڈالی
کہیں پہ راجاؤں نے خود اپنے گلے میں
طوقِ غلامی ڈالا
اسی طرح سرزمین سلہٹ سے تا بہ خیبر
شبِ الم موت کے اُڑاتی گئی پھریرے

مگر شکستِ قفس کا جذبہ
سدا سُلگتا رہا ہے دل میں
کبھی یہ نذرل کے لب سے اک شعلہ بن کے لپکا
کبھی یہ قاسم[5] کی آنکھ سے اشک بن کے ٹپکا
کبھی یہ عبدالحمید بھاشانی بن کے گرجا
مداری پور، باریسال، سورنگ[6] پور، کھلنا
نگر نگر ظلمتوں سے لڑتے رہے اُجالے
جو گنترا[7] صبحِ نو کی آواز بن کے ابھرا
لرز اُٹھے جس سے اجنبی حاکموں کے ایواں
قدم قدم پر کھڑی تھیں جھولتی پھانسیاں ستادہ
روش روش پر کھلے جیل خانوں کے در کشادہ
مگر زمیں کے یہ جیالے بیٹے رہِ ستم پر
سرورِ خود آگہی سے مخمور ہنستے گاتے
گزر گئے کیسی شبِ غم کے آستاں سے

ماجھی رے
او البیلے ماجھی
آج تری ناؤ پہ جھنڈا ایک نیا لہرائے
تیرے جیون کے آنگن سے ڈھل گئے موت کے سائے

---

[1] سراج الدولہ
[2] تیتومیر
[3] بریندا ناتھ گھوش
[4] بنگال کا قدیم نام

[5] ابوالقاسم فضل الحق
[6] سورنگ پور نیشنل اسکول
[7] انیسویں صدی کے شروع میں انقلابی تحریک کا ترجمان اخبار

افکار

ریاض انور

ماجھی رے

او البیلے ماجھی

آج ترے آکاش پہ چمکا ہے

اک چاند نیارا

یہ دریا یہ کھیت ہیں تیرے

تو اس دیس کا پیارا

ماجھی رے

ماجھی رے

تیرے فولادی سے بازو

طوفانوں کا مان

تو اس دیس کا رکھوالا ہے

تو اس دیس کی شان

ماجھی رے

ماجھی رے

ایک آواز :- دلیشیر زمین کا ہار آپچھے ؟

دوسری آواز. آمار آپچھے !

تیسری آواز. شونار بھوشل

شونال نودکی

کا ہار آپچھے ؟

بہت سی آوازیں : آمار آپچھے

آمار آپچھے

آمار آپچھے

یہ روشنی کیوں بجھی بجھی ہے

وہ صبحِ نو کیوں دُرِ افق سے پلٹ گئی ہے

چہار سو ناچتے ہیں محرومیوں کے سائے

دلوں کے صحرا میں آندھیاں سر اٹھا رہی ہیں

کہیں چراغِ حیات بے رنگ بجھ نہ جائے

یہ آرزوؤں کا نیلا آکاش

خواب میں کس قدر حسیں تھا

مگر اب اس پر کیوں حسرتوں کے

سیاہ دھبے جمے ہوئے ہیں۔

کنول کے یہ جھومتے ہوئے سرخ پھول

کتنے حسیں تھے پہلے

مگر کیوں اب زخم بن کے

تقدیرِ ابنِ آدم پہ ہنس رہے ہیں۔

لٹی ہے کس اجنبی کے ہاتھوں متاعِ ہستی

ملی ہے اندیشہ ہائے فردا کی جاں گزائی

یہ وقت کی رہگزر پہ کیا حادثہ ہوا ہے

چلے تھے ہم آرزوئے وصلِ بہار لے کر

مگر خزاؤں کے دشتِ ویراں میں کھو گئے ہیں

اُداس صبحو، سسکتی شامو، ملول راتو

کہیں تو آخر یہ درد کا قافلہ رکے گا

کہیں تو لمحوں کا سیلِ نامہرباں تھمے گا

کہاں رکے گا ؟

کہاں تھمے گا ؟

سید فیضی

ساحلِ اُفتادہ

مجھ کو تم سے کبھی دلچسپی تھی
اور یہ دلچسپی — نہ صورت کا تقاضا تھی نہ سیرت کا جواز
سازِ دل یوں ہی رہا نغمہ نواز

اک تھکے ہارے مسافر کی طرح
اپنی آواز کو میں سمجھا تمہاری آواز
دے دیئے میں نے تمہیں اپنی نظر کے انداز

ساحل افتادہ ہوں آج اور ستم خوردہ ہوں
ذہن پر چھائے ہیں آوارہ خیالوں کے یہ کالے بادل
اور نگاہیں مبہوت
دل کو اندیشہ کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے
قطرے شبنم کے ہیں دردانوں میں ڈھلنے والے
موج اچھلی ہے کہ ساحل سے بھی آگے نکلے

فضا ابن فیضی

رُباعیات

طبعِ گل اندام

کانٹا ہوں، مگر رنگ و بو رکھتا ہوں
پیاسا ہوں، مگر جوشِ سبو رکھتا ہوں
شاداب نہیں گو مرا پیکر، لیکن
نبضوں میں بہاروں کا لہو رکھتا ہوں

آفتابِ فردا

آغوشِ گلِ تر میں ابھی رہنے دے
اس نشّے کو ساغر میں ابھی رہنے دے
تا حال سمجھ میں نہیں آتا فردا
اس آب کو گوہر میں ابھی رہنے دے

سوزِ حیات

چُن چُن کے کلی درد کی توڑی میں نے
سینے میں کوئی پھانس نہ چھوڑی میں نے
کانٹوں سے ٹپکتا ہے جہاں شہدِ گلاب
پھولوں سے وہاں آگ نچوڑی میں نے

خمارِ فن

افکار کا اک نشّۂ شاداب ہوں میں
احساس کا اک "سوزِ غزل تاب" ہوں میں
با ایں ہمہ افسردہ نگاہی سے دوست!
کشمیر کی آنکھوں کا حسیں خواب ہوں میں

عیشِ رواں

کترا کے کناروں سے روانی گذری
چھوتی ہوئی ہونٹوں کو کہانی گذری
آہٹ نہ ذرا سی بھی ہوئی کیا کہیے
کچھ ایسے دبے پاؤں جوانی گذری

احمد ظفر

گمراہ

میرے ذہن میں آوازوں کے گھنے ذخیرے

رفتہ رفتہ درد کی آگ میں رینگ رہے ہیں

پلکوں کی تحریر کہیں افسانۂ غم ہے

پھول سے ہونٹ لہو میں ڈوبے، دیکھ رہا ہوں

دشمن کے سینے میں اُترنے والا خنجر

میرے ہاتھ میں آئے بھی تو کیسے آئے؟

خوشبو ایک سہانا خواب تھی — اب آئینہ!

وہ بھی جیسے ٹوٹ گیا ہو!

میں خاموش ہوں پھر بھی آوازوں کا جنگل

میرے ذہن پہ اپنا سایہ ڈال رہا ہے

وقار عزیز

میں — ایک سوال

ازل سے میں تھا ہواؤں کے دوش پر رقصاں
مری رگوں کے لہو اور میرے پیکر میں
یہ بے قرار سی روح
الجھ رہا تھا لہو روح کے تقاضوں سے
میں اک سوال تھا، الجھا ہوا سوال جسے
دیار و دشت میں، میں پوچھتا رہا سب سے
مگر سوال مرا تشنۂ جواب رہا

پھر ایک دن یہ ہُوا
کہ مجھ کو غلبۂ تہذیب نے اُداس کیا
لہو نے مجھ کو پکارا کہ کتنے ہی اسرار
ترے بدن میں ہیں خوابیدہ، تو فریب نہ کھا
سوادِ سود و زیاں میں سوال زندہ ہے
بدن نے خواب دکھایا،
میں خوں میں ڈوب گیا
کھلی جو آنکھ تو محسوس یوں ہوا مجھ کو
ازل سے میں ہوں ہواؤں کے دوش پر رقصاں

پروفیسر رشید احمد صدیقی

سوچتا ہوں کہ زندگی کیا ہے

سوچتا ہوں کہ زندگی کیا ہے، تو معلوم ہوا کہ زندگی کے ساتھ سوچنے کا سلوک اب تک نہیں کیا تھا۔ زندہ رہنے، کام کرنے اور ان سے انعام پانے کی اتنی مسرت و مصروفیت رہی کہ زندگی کو کام کرنے، خوش رہنے اور خوش رکھنے سے کبھی علیحدہ محسوس نہیں کیا۔ جیسے یہی زندگی کا مقصد ہو۔ یہ تو نہیں کہتا کہ زندگی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہئے۔ لیکن اس شغل میں خطرہ یہ ہے کہ اگر سوچنے والے کی نیت بخیر اور صحت اور سمجھ قابلِ اعتبار نہ ہو تو پھر وہ ساری عمر سوچتا، اردو میں تنقیدیں لکھتا یا پالیٹکس میں دھکے کھاتا رہتا ہے۔

زندگی کے مصرعۂ طرح پر انسان نے ابتدائے شعور سے اب تک جتنی غزلیں اور شہر آشوب تصنیف کئے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور موضوع پر کہے ہوں گے۔ اور جب اس صورت حال کو بھی پیش نظر رکھیں کہ زندگی پر سوچنے کا راستہ بھی خدا تھا اور اب خواتین ہیں تو یہ موضوع اور زیادہ فکر انگیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی جدید زندگی میں جسے عام طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد کہتے ہیں، ہم خدا کی طرف اس تکریم سے نہیں جھکتے جس توقع سے خواتین کی طرف! چنانچہ ترکیب تشکیل اور تہذیب کے اعتبار سے ہم موجودہ عہد کو سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ خواتین کا عہد یا عطیہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا۔ گو قحط اور افزائش اولاد سے اعتقاد اور عشق دونوں کا پارہ کیا بہت گر گیا ہے۔

انسان نے سب سے پہلے اور بغیر ارادے کے اپنی زندگی کو زندگی سمجھا ہوگا۔ یوں بھی ہر زندگی اپنی حفاظت کے شعور کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ فطرت کی طرف سے یہ انتظام نہ ہو تو حیات بخشی فطرت کا بے معنی و مسرفانہ عمل بن کر رہ جائے۔ آج جب کہ مذہب علم تہذیب سائنس اور ٹکنالوجی معراج کمال کو پہنچ چکے ہیں۔ انسان میں ہمہ خواہی، ہمہ گیری اور تنہا خوری کا اصول بدستور کارفرما ہے۔ ممکن ہے اپنی ہی زندگی کو زندگی اور ہر چیز کو جو خارج میں پائی جاتی ہے اپنے ہی لئے وقف سمجھنے سے نظامِ معیشت و معاشرت میں خلل واقع ہونے لگا ہو تو انسان یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہوا کہ اپنی خیریت منظور ہے تو دوسروں کی خیریت کا احترام کرے۔ اور اسی انکشاف کا اعتراف اردو خطوط نویسی کے پرانے اسلوب میں کیا جاتا تھا "یعنی میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت درگاہِ خداوندِ کریم سے نیک چاہتا ہوں"۔

علم و اخلاق کی ترقی کے ساتھ زندگی اور زندہ رہنے کا مقصد و محور بھی بدلا اور انسان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ زندگی

زندہ رہنا ہی نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے دینا بھی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے زندگی سے ہاتھ دھو لینا زندگی کا سب سے بڑا شرف ہے۔ بہت دنوں تک مذہب ہی ہر ترقی کا سرچشمہ رہا ہے۔ لیکن آبادی بڑھی زندہ رہنے اور زندگی کو آسان و آرام دہ بنانے اور رکھنے کی ضرورت اور اس کے ساتھ ساتھ حوصلے اور وسائل بڑھے تو دین کی جگہ دانش نے لینی شروع کر دی۔ چنانچہ سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کو نئے عزائم اور نئے ساز و سامان فراہم کئے۔ اب اُس نے تو ہین فطرت سے ڈرنے کی بجائے ان کو قابو میں لانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کی اس عدیم خدمت کی اور زندگی کی توتوں، نعمتوں اور ضمناً ایسی نعمتوں سے بھی آشنا کرایا کہ آج ہم آپ ان علوم و فنون کے اتنے ہی محتاج نہیں جتنے کہ گھر کے پرانے نوکر یا اسی طرح کی نیک بخت سے!

زندگی کیا ہے ؟

کیوں ہے ؟

اور کہاں ہے ؟

اِن مسائل پر غور کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انسان کو موت کے ناگزیر یا در نا قابلِ تسخیر ہونے کا قائل ہونا پڑا اگر زندگی کا سفر جلد یا بدیر موت پر ختم نہ ہوتا تو انسان اُن اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ افکار، اعمال اور عقائد کا پابند نہ ہوتا جن کے نتائج ہر طرف طرح طرح کی شکلوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ زندگی کے مسئلہ پر غور کرنے میں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ وہ جا ہے جس طرح وجود میں آئی ہو اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔ یقیناً ہے، اس لئے کہ جب دنیا کی حقیر سے حقیر شے بھی خواہ وہ دنیا میں کیسی اور کتنی ہی ہو، ہر چھوٹے بڑے مقصد کی تکمیل و تعمیل میں لازم آتی ہے اور اس میں معین ہوتی ہے تو زندگی کی اہمیت و عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ ہر مذہب و ملت کے خدا کی سب سے زیادہ سمجھ میں آنے والی صفت اور ذات دونوں ہے! خدا کی ہمیشگی زندگی میں، با مقصد و با عظمت زندگی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ زندگی کے بے شمار مظاہر و ممکنات میں خدا کی ذات و صفات کی تصدیق ملتی ہے۔

یہاں پہونچ کر ہم دین و دانش دونوں کی قلمرو میں بیک وقت داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم نہیں ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کا عرفان و انکشاف انسان نے عظیم مسائل و مقاصد کے پیش نظر کیا ہے۔ اور دونوں نے انسان کی بہترین توقعات و مقاصد کی تکمیل و تصدیق کی ہے۔ اس زندگی سے مراد انسان کی زندگی ہے، اور انسان سے بہتر و برتر مخلوق کا اب تک ہم پتہ نہ لگا سکے ہیں، اس لئے زندگی کے حسن، خوبی اور صداقت کی تائید اور تصدیق انسان کی سب سے بیش قیمت ذمہ داری اور سب سے بڑا مقصد قرار پاتا ہے۔ خوب کہا ہے ایک عزیز نے :

اعتبارِ جہاں ہے انساں سے

دنیا میں اسی انسانی زندگی کی تعمیر، تصدیق اور ترفیع کے لئے مذاہب وجود میں آئے جنہوں نے اس زندگی کے سرچشمے اور اس کے مقاصد نیز سفر اور منزل متعین کئے اور ان کی طرف رہنمائی کی۔ ان میں مرکزی حیثیت انسانی اعمال کے خوب و زشت اور ان کی جواب دہی کو حاصل ہے۔ انسان اپنے کو جتنے صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے کی کوشش کرے گا اتنا ہی زندگی اور اس کے مقاصد کی اہمیت و عظمت کو تسلیم کرے گا۔ دوسری بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کی جواب دہی اپنی یا کسی دوسرے کی بنائی ہوئی عدالت میں نہیں کرنی ہے۔ جس کی تعمیر سے وہ انحراف بھی کر سکتا ہے، بلکہ اس کو ایک ایسی عدالت

میں جواب دینا ہے جس کے فیصلے سے وہ روگردانی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس کا فیصلہ غلطی سے یکسر پاک اور انصاف پر تمام تر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں اکثر رعایت و رحمت بھی شامل ہوتی ہے۔ جو کل انصاف ہی کا ایک پہلو ہے۔

انسان کا اپنا احسن تقویم سے انکار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ذہن اور وجدان کسی خلقی یا نفسیاتی نقص کا شکار ہے۔ انسانی زندگی کی منزلت متعین کرنے میں موت کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ موت و حیات ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو معنی بخشتے ہیں۔ بالخصوص انسانی زندگی کو جو فکر و عمل اور سزا و جزا کی زندگی ہے۔ موت کی اہمیت کا تصور اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کرلیں کہ کوئی فرد موت کا شکار نہ ہوگا۔ پھر اس کا اندازہ لگائیں کہ ہماری دنیا کا نقشہ کیا ہوگا۔ حق پر رہنے اور حق کے لئے مرنے ہی کی زندگی کو وہ سعادت حاصل ہے جس کی بنا پر انسان کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ کہا گیا ہے۔

دنیا کا ہر مذہب اپنے اپنے خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ یہاں ان مذاہب کے بتائے ہوئے عقائد و اعمال اور دنیا و عقبیٰ کے رشتے کو معرض بحث میں لانا مقصود نہیں۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انسان کو اپنے کئے کی سزا یا جزا ملے گی۔ وہ سزا یا جزا کیسی ہوگی اور کہاں ملے گی، اس پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی نہ ایسی کوئی اہمیت ہے نہ یہاں اس پر بحث کرنے کی ضرورت۔ کوئی کسی مذہب کی پیروی کرے یا سرے سے کسی کا قائل نہ ہو۔ یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ زندگی جبر ہو یا اختیار، اس کے فرائض سے بہر حال عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ سزا اور جزا انہی فرائض کے انجام دینے میں مضمر ہے۔ اگر ہم مادی نفع و ضرر کے قائل ہیں تو ہم کو ذہنی، اخلاقی اور روحانی سبھی طرح کے نفع و ضرر کا قائل ہونا پڑے گا۔

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں اُن کا ایمان ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور سب سے بڑا انعام رضائے الٰہی ہے جس کو کسی قدر زیادہ واقعیت پسندی کے انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم کسی حال میں ہوں زندہ رہنے کا حق ادا کرتے رہیں۔ اور جب زندگی کو خیرباد کہنے کا وقت آئے تو ہمارے ساتھی نہ کہیں اور ہمارا ضمیر اس کی تصدیق کرے کہ اپنی بساط کے مطابق ہم نے اپنے حسن خدمت سے دنیا کو اس سے بہتر حال میں چھوڑا جس میں پایا تھا! (بشکریہ - موج مجید)

احسن علی خاں

اقبال کا "ساقی نامہ"

غالب نے کہا تھا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق کی گفتگو میں اقبال نے بھی "بادۂ و ساغر" کی روایت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس روایت کی ابتدا ایران سے ہوئی آتش پرستوں کے دور میں بادۂ و ساغر، ساقی و پیرمغاں کو شاہی سرپرستی کے ساتھ ساتھ مذہبی عظمت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ اس لئے یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ "مشاہدۂ حق" کی گفتگو میں بادۂ و ساغر کو دخل آتش پرستوں کے دور میں حاصل ہوا ہوگا۔ اگر سکندر اعظم کو ایران پر فتح حاصل نہ ہوتی اور یونانی حملہ آوروں کے ہاتھوں ایران کا مذہبی و ادبی سرمایہ تلف نہ ہوا ہوتا تو بادۂ و ساغر کی روایت سے متعلق ما قبل اسلام کا ایرانی ادب بھی آج ہمارے سامنے ہوتا۔ وہ ادب ختم ہوگیا لیکن اس کی چھوڑی ہوئی بادہ و ساغر کی روایت ختم نہیں ہوئی۔ اسلامی غلبہ کے بعد مجوسی مذہب نے بھی ایران کو خیرباد کہہ دیا لیکن عجمی تہذیب و تمدن زندہ رہے۔ عباسی خلفاء کے دور میں عجمیت نے سنبھالا لیا، عجمی تصورات نیا روپ دھار کر سامنے آنے لگے۔ اقبال نے عجمی تصورات اور افلاطونی نظریات کو اسلامی نظریات میں تحریف اور نظام اسلام کی تخریب کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ عجمیت نے ادبیات اسلامیہ میں ایسے نظریات داخل کردیئے جو سراسر غیر اسلامی ہیں۔ یہ نظریات لذت پرستی، قطع علائق، مصنوعی محبت، ہوس پرستی، غرض کہ ان تمام رجحانات کو فروغ دیتے ہیں جو عمل اور خودی کے دشمن ہیں۔ فارسی اور اردو کا تغزل زیادہ تر اس اختلاط کا آئینہ دار ہے جو عجمی نظریات و تصورات کو اپنانے سے پیدا ہوچکا تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے عجمی تغزل کے خلاف حالی نے علم بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ قیامت کے دن باقی گنہگار تو چھوٹ جائیں گے لیکن ہمارے شاعروں کو ضرور جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ حالی نے عجمی تغزل ہی کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ صحت مند شاعری کے بہترین نمونے پیش کرکے یہ بھی بتا دیا کہ گل و بلبل، بادۂ و ساغر اور تصوف کے پٹے ہوئے مضامین سے ہٹ کر بھی ایک ایسا وسیع میدان ہے جس میں طبع رسا اپنی جولانیاں دکھا سکتی ہے۔ حالی نے جس کا رنگ

کی ابتدا کی تھی، اسے اقبال نے آگے بڑھایا۔ عجمی تغزل پر اقبال کا حملہ حالی سے زیادہ شدید تھا۔ حالی نے تو عام طور پر روایتی تغزل کے شاعروں کو ہدفِ ملامت بنایا تھا لیکن اقبال نے عجمی تغزل اور تصوف کے سب سے بڑے شاعر حافظ شیرازی کے متعلق یہ تک کہہ دیا کہ ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

گو اقبال نے عجمی تغزل، تصوف اور نظریات کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن عجمی روایت نے شعر و ادب میں جن مخصوص تراکیب، اصطلاحات اور الفاظ کو فروغ دیا تھا، اقبال ان سے دامن نہ بچا سکے۔ اگر وہ چاہتے بھی تو ایسا نہ کر سکتے۔ کیونکہ وہ جن زبانوں میں شعر کہہ رہے تھے ان کا سرمایہ ہی سے دے کے اُن الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل تھا، جو انہیں عجمی شعر و ادب سے ورثہ میں ملے تھے۔ اور پھر ان الفاظ و اصطلاحات سے انہیں کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو غیر اسلامی عجمی تصورات و نظریات کے مخالف تھے، الفاظ و اصطلاحات سے انہیں کوئی بیر نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے یہ ضرور کیا کہ نئی تراکیب و اصطلاحات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ان فرسودہ تراکیب اور اصطلاحات کو بھی نئے معنی پہنا دیئے جو اب تک عجمی تصورات کا مظہر تھیں۔ بادہ و ساغر اور ساقی کی اصطلاحات کو جو نئے معنی اقبال نے دیئے ہیں اس کی سب سے اچھی مثال ان کی نظم "ساقی نامہ" میں ملتی ہے۔

"ساقی نامہ" کئی لحاظ سے ایک عجیب و غریب نظم ہے۔ شعریت اور فلسفہ کا جتنا حسین امتزاج "ساقی نامہ" میں ہے اتنا اقبال کی بہت کم نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یہ نظم سلاست اور تلخیص کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس میں اقبال نے اپنے تمام اہم نظریات اور دقیق فلسفیانہ نکتے نہایت آسان زبان اور دل نشیں انداز میں بیان کر دیئے ہیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے، جو بہت کم ظہور میں آتا ہے۔ اس کے لئے خلوص، لگن اور شاعرانہ الہام کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص اقبال کے نظریات جاننا چاہتا ہو تو اسے صرف "ساقی نامہ" پڑھا دو اور وہ سمجھ جائے گا کہ اقبال کیا کہتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

"ساقی نامہ" کی ہیئت ایک روایتی مثنوی کی سی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے یہ نظم عام مثنویوں سے مختلف ہے۔ اس میں سحر البیان یا گلزار نسیم کی طرح کوئی قصہ بیان نہیں کیا گیا۔ یہ تو چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ ہے۔ اور مثنوی کا یہ انداز اقبال نے مولانا روم سے سیکھا ہے۔ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے اپنی مثنوی میں خیالات و مضامین کو اولیت دی تھی۔

اقبال نے "ساقی نامہ" کے لئے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ وہی ہے جو فردوسی نے شاہنامہ میں استعمال کی ہے یعنی فعولن، فعولن، فعولن، فعول — یہ رواں دواں بحر رزمیہ بیان اور ہلکے پھلکے مضامین کے لئے نہایت موزوں ہے۔ لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس بحر میں دقیق فلسفیانہ مضامین حیرت انگیز سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

"ساقی نامہ" خالص روایتی انداز سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر سب سے پہلے بہار کی آمد کا مژدہ سناتا ہے ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
اِرم بن گیا دامنِ کوہسار

یہ شعر کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن دوسرا شعر پڑھ کر قاری چونک پڑتا ہے۔ اس شعر میں ...

احسن علی خاں

شہید ازل لالہ خونیں کفن

کے مصرعہ سے اقبال کا انفرادی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اور تیسرے شعر میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہنے والے ہیں۔ بہار کی نمود اور رعنائیوں میں اقبال کو زندگی کی نمو اور اس کا حسن نظر آتا ہے۔ گلہائے بہار میں زندگی کے لہو کی گردش کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان کی نظر "جوئے کہستان" پر پڑتی ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ پہاڑی ندی زندگی کا مظہر ہے۔ جو تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ اور جس کی طاقت کا عالم یہ ہے کہ ؎

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اور یہاں پہلی بار وہ ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سُناتی ہے یہ زندگی کا پیام

یہ ساقی کون ہے اور وہ "مئے پردہ سوز" اور "شراب کہن" کیا ہے جسے اقبال اس ساقی سے طلب کر رہے ہیں؟

اس سوال کا جواب آگے چل کر اس وقت ملتا ہے جب اقبال ساقی سے کہتے ہیں کہ ؎

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اِس بدن میں ترے دم سے ہے

اور پھر یہ شعر ؎

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

ان اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کا ساقی سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ساقی سے جو شراب مانگ رہے ہیں وہ ایسی ہے جس سے ضمیرِ حیات روشن ہو جاتا ہے۔ جس میں "سوز و سازِ ازل ہے" جس سے "رازِ ازل" کھل جاتا ہے جو عشق کے پر لگا کر اڑاتی ہے اور جس کے اثر سے خرد غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے جس کے بغیر نہ زندگی کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں، اور نہ خودی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ عشق کی ہی شراب ہے جو اقبال اپنے ساقی سے طلب کر رہے ہیں۔

وہ ساقی کو زمانے کے بدلتے ہوئے انداز کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرنگیوں کی قوت اور غلبہ کا راز فاش ہو چکا ہے۔ مغرب کی فریب کاریاں عیاں ہو چکی ہیں اور وہ روبہ زوال ہے۔ اب تو سوئے ہوئے چینی بیدار ہو گئے ہیں اور ہمالہ کے چشمے بھی اُبلنے لگے ہیں۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ دنیا کو ایک بار پھر ابدی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہ رہنمائی مسلمانوں کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ زبان سے اللہ کی وحدت کا اقرار کرتے ہیں ع

مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش"

افسوس ؎

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

غرض کہ مسلمان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اسے مسلمان بناتا ہے ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

چنانچہ اقبال ساقی سے تقاضہ کرتے ہیں کہ ؎

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

اقبال نے اپنے ساقی سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اسے مسلمانوں میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ "مئے پردہ سوز" کی عطا کردہ آرزوؤں، امنگوں، جستجو اور سوزِ جگر کو ایک بڑی دولت سمجھتے ہیں اور اس دولت کے متعلق کہتے ہیں ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ حقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

اس دولت کے عام کرنے میں ہی انسانیت کی نجات اور مسلمانوں کی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔

یہاں تک "ساقی نامہ" میں اقبال کا مخاطب ساقی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ زندگی اور خودی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں، اور ان کا مخاطب ساقی نہیں رہتا بلکہ قاری ہو جاتا ہے۔

اقبال کے نظریات میں زندگی اور حرکت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ "انائے کامل و مطلق" ہے جس کی اساسی صفت مسلسل اور لامتناہی خلاقی ہے۔ اللہ کی کامل و مطلق "انا" دوسری اناؤں یا نفوس کو تخلیق کرتی ہے۔ خالق نے جو نفوس خلق کئے ہیں ان میں بھی تخلیق اور ارتقا کی صلاحیت ودیعت کی ہے اور یہ صلاحیت زندگی کی علامت ہے۔ زندگی بجائے خود خالق مطلق کے وجود کا اظہار ہے۔

احسن علی خاں

زندگی جب مادہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کی آزادی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ ان رکاوٹوں کے چیلنج کو بخوشی قبول کر کے ان کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ؎

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک طرف وحدت ہے تو دوسری طرف اتنی رنگا رنگ اور بوقلموں ہے کہ اس کی وحدت پر کثرت کا گماں ہونے لگتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبال نے "ساقی نامہ" میں جس خوب صورتی سے واضح کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے فرماتے ہیں ؎

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

زندگی کی وحدت، کثرت اور خلاقی کے مسائل بیان کرنے کے بعد اقبال حرکت کے فلسفہ سے بحث کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ مسلسل اور مستقل حرکت ہی عین زندگی ہے ؎

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

یہ ہے وہ زندگی اقبال جس کا پیغام دیتے ہیں۔ جو عمل و حرکت ہے، جو جاوداں ہے۔ جسے کبھی موت نہیں آتی، اور جو ہمیشہ موت کی منفی قوتوں سے برسرِ پیکار رہتی ہے ؎

اتر کر جہانِ مکافات میں

رہی زندگی موت کی گھات میں

اور موت کی تلاش و تسخیر کے لئے زندگی ہر طرف پھیل گئی ہے ؎

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

بظاہر زندگی میں کثرت اور انتشار نظر آنے لگا۔ لیکن اس کی وحدت اور ابدیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زندگی تو ایک مسلسل اور مستقل عمل کا نام ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی مر جاتی ہے لیکن یہ فریبِ نظر ہے۔ زندگی مرتی نہیں، صرف شکلیں بدلتی ہے اور لوگ اس تبدیلی کو موت سمجھتے ہیں۔ اقبال اس نکتہ کو اس طرح واضح کرتے ہیں ؎

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

اقبال کے نزدیک زندگی کا انحصار وقت پر نہیں بلکہ وقت کا انحصار زندگی پر ہے۔ اگر زندگی نہ ہوتی تو وقت بھی نہ ہوتا۔ وقت کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ زندگی کا پیمانہ ہے۔ اور جب زندگی ترقی کرکے وجود کے اعلیٰ ادوار میں داخل ہوتی ہے تو وقت کا پیمانہ بھی اس کی ابدیت کو نہیں ناپ سکتا۔ فلسفہ کا یہ دقیق مسئلہ اقبال نہایت سادگی کے ساتھ اس طرح بیان کر جاتے ہیں ؎

بڑی تیز جولاں، بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

زندگی، موت اور وقت کے مسئلوں کو بیان کرنے کے بعد اقبال خودی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

اقبال کے نزدیک دنیائے آب و گل میں "انا" کی سب سے ترقی یافتہ شکل نفسِ انسانی ہے اور خودی نفسِ انسانی کے عرفان کا نام ہے۔ چنانچہ خودی کے متعلق کہتے ہیں ؎

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کے عرفان سے انسان کو نہ صرف اپنی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے بلکہ رازِ درونِ حیات معلوم ہو جاتا ہے۔ خودی کے عرفان سے پہلے انسان غیر اللہ کی پرستش کرتا تھا۔ وہ بتوں کو پوجتا تھا۔ لیکن خودی کے عرفان سے اسے یہ احساس ہوگیا کہ وہ عالمِ آب و گل میں ہر مخلوق سے برتر ہے اور اس کا معبود صرف خالقِ مطلق ہی ہو سکتا ہے۔ انسان کی خودی میں اقبال

کو وہی صفات نظر آتی ہیں جو معبودِ حقیقی کی ذات کا جزو ہیں۔ بظاہر انسان کی ذات محدود ہے لیکن انسانی خودی کی وسعت لامحدود ہے۔ اس نکتہ کو اقبال اس طرح واضح کرتے ہیں ؎

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

آگے چل کر یہی بات اس طرح کہتے ہیں ؎

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

تخلیقِ کائنات، زندگی کے گوناگوں ہنگاموں اور اس کی بوقلمونی میں خودی ہی کارفرما ہے۔ عالمِ آب و گل یا ماسوا کا وجود خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔ خودی کا اثبات اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ اپنا غیر نہ پیدا کرتی خودی "غیر خود" کی بھٹی میں تپ کر ہی کندن ہوتی ہے۔ غیر خود سے کش مکش کے بغیر نہ خودی کا احساس ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تکمیل ممکن ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں ؎

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

خودی کی حقیقت واضح کرنے کے بعد اقبال اس شخص کی خصوصیات بیان کرتے ہیں جو خودی کا حامل ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذلت کی روزی گوارا نہیں کرتا ؎

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

خودی کا نگہباں شاہوں کے جاہ و حشم کو خاطر میں نہیں لاتا اور اپنی خودی کو قائم رکھنے کے لئے کسی کی غلامی نہیں کرتا۔ وہ سوائے خدا کے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ وہ غیر اللہ کو سجدہ نہیں کرتا۔

قادرِ مطلق کی خودی اور انسانی خودی میں اسی وقت تعلق پیدا ہوتا ہے جب کہ انسانی خودی میں وہی خصوصیات اور صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو خودیٔ مطلق میں پائی جاتی ہیں۔ جس ~~طرح خودیٔ مطلق کا اثبات غیر خود سے کش مکش اور اس کی تسخیر سے ہوتا~~ ہے اسی طرح انسانی خودی کا اثبات غیر خود سے کش مکش اور اس کی تسخیر سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ عالمِ آب و گل خودی کے اثبات

کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

خودی ایک مسلسل جدوجہد اور ارتقا کی متقاضی ہے۔ خودی کی جدوجہد ارتقا میں یہ مادی دنیا محض منزلِ اولیں کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ ؎

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

مندرجہ بالا رموز بیان کرنے کے بعد اقبال اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ؎

یہ ہے مقصودِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی آشکار ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ اقبال اس حقیقت کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں، جو خودی آشکار ہونے کے بعد سامنے آئے گی۔ وہ کہتے ہیں ؎

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ

یہ وہ مقام ہے جہاں جبرئیل کی حدِ پرواز ختم ہو گئی تھی، اور وہ پکار اٹھے تھے ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

انجم اعظمی

سائنس کی تعلیم

یہ رفتار اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے آدمی نے اپنے مادی اور ذہنی سفر میں زندگی کی ہزار منزلیں طے کر لی ہیں۔ جو شہر کل تک ہزاروں میل کے فاصلے پر تھے اور جنہیں آدمی نے خیال و خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا آج ان کا فاصلہ صرف چند گھنٹوں اور دنوں کا ہے۔ اب مکاں کو زمانہ اور زمانہ کو مکاں کی طرح برتا جا سکتا ہے۔ سائنس کا یہ ایک معمولی کرشمہ خیر و شر ہے کہ ہم اضافیت کے دور میں ہیں جس نے انسانوں کی بہت بڑی آبادی کو (سائنسی کرشموں کی مدد سے) روشنی دینے کے بجائے مبہوت کر رکھا ہے۔ عالم حیرت میں آدمی زندگی کے اور رشتوں کے علاوہ یہ بھی بھول گیا ہے کہ سائنس کے کرشمے اسی کے ذہن کا اعجاز ہیں۔ اور یہ کہ سائنسی حقیقت کو خارج کے بجائے اپنی ذات کے "عمق" میں تلاش کرنا ہے۔ گویا ہمیں وہ رشتہ ڈھونڈنا ہے جو انسانی جستجو کو خارج سے ہم آہنگ کر کے انسان کو فطرت کے گہرے رموز تک پہنچاتی ہے محقق خارج میں سائنسی ترقی کو دیکھتے رہنے سے نہ صرف ہمارے ملک کے اساتذہ بلکہ وہ تمام لوگ جو دنیا کی بڑی بڑی تعلیم گاہوں میں سائنسی علوم کا درس دے رہے ہیں۔ سائنسی نقطۂ نظر اس کی غرض و غایت، معاشرہ کی اہمیت، انسان و کائنات کے ربط و تعلق اور انسان کی ماہیت سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ جس کے سبب سائنس کے طلبا تعلیم کے بنیادی مقاصد سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ انہیں سائنس کے کسی شعبہ کی جزئیات کا علم تو ہو جاتا ہے لیکن نہ وہ کسی کیفیت سے آشنا ہوتے ہیں اور نہ سائنس کی سچی بصیرت سے آگاہ ہوتے ہیں۔

زندگی کے اس موڑ پر ـــ جہاں روس اور امریکہ کی ایٹمی طاقتیں ایک دوسرے سے لرزہ بر اندام ہیں۔ ان کے خوف سے باقی دنیا کانپ رہی ہے۔ نئی نئی ایٹمی طاقتیں آئے دن ابھر رہی ہیں جو خود غرضانہ انداز میں صرف اپنے تحفظ کے لئے کوشاں ہیں۔ پوری دنیا سرد جنگ کا شکار ہے۔ بڑی سے بڑی طاقت نہیں جانتی کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ کب آتشیں لاوا پھوٹ پڑے گا جو دھرتی کی کوکھ جلا کر اس کی ساری تخلیقی قوت چھین لے گا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بانجھ عورت جیسا بنا دے گا ـــ مجھے حق ہے کہ میں اس عہد کے سائنس دانوں سے کہوں کہ سائنس کی ریسرچ ہی نہیں یہ دنیا بھی انہیں کی ذمہ داری ہے جس کے سرد و گرم سے ان کے ذہنوں کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے اور جس زمین اور فطرت کی گود میں انہوں نے جنم لیا ہے اس کو بچانا ان کا فریضہ بھی ہے، خود حفاظتی کا واحد ذریعہ بھی ہے اور ادراک کی وہ منزل بھی جہاں آج کے آدمی کو ہونا چاہیے۔ اسی منزل میں پہنچ کر اس معاشرے کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے جس میں مل جل کر سائنس داں، ماہر معاشیات، شاعر، ادیب، فلسفی اور عوام ایک پرامن زندگی گزار سکتے ہیں اور جسے صحیح معنوں میں انسانوں کی آبادی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

آج کی پیچیدہ زندگی کو سلجھانے کا کام کسی ایک گروہ کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ان ماہرین معاشیات کے ہاتھوں میں دنیا کی باگ ڈور دے دینا جو دولت کی لوٹ کھسوٹ کو انسانی وجود، اس کی بقا اور احترام سے کہیں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، نادانی نہیں تو اور کیا

ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ویت نام میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کے قتل سے بے نیاز ہو کر امریکی استبداد عالم انسانیت کے احتجاج کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے کہ وہ اپنی معاشی ضرورتوں کے سبب ایشیا سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ ایشیا اس کی نگاہ میں صرف ایک منڈی یا بیسویں صدی کے حیوانوں کے لئے خون کی پیاس بجھانے کی آماجگاہ ہے۔

اسی لئے آج ہمیں انصاف کی جتنی شدید طلب ہے اس کا اندازہ حضرت عیسیٰ کی اس پکار سے بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ "اے خداوند تو نے مجھے کہاں تنہا چھوڑ دیا" ــــ زمانہ ایسا عالمی بحران نہ اس سے پہلے پیدا ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ اسی لئے ہزارہا انسان اپنی امیدیں اور آرزوئیں کھو کر گونگے بن کر بیٹھ گئے ہیں، اور بے شمار لوگ جو زندگی گزارنے کے طلبگار تھے اندر ہی اندر اس کی لذتوں کے جویا تھے، سائنس اور مادیت پر الزام رکھ کر بظاہر یاد خدا میں مصروف ہیں لیکن یاد خدا ان کی عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی روحانیت، مادیت کا ردعمل اور دنیا کے کارزار سے پسپا ہونے کا نتیجہ ہے انہیں کے لئے غالب نے "واماندگی شوق" کی ترکیب استعمال کی ہے البتہ ایک مختصر گروہ جو انسانی جدوجہد اور اس کے نتائج کو ماضی، حال، اور مستقبل کے تسلسل میں تلاش کرنے کا عادی ہے اپنے جسم و جان کی ساری آگ سمیٹے مصروف عمل ہے اور سوچتا ہے کہ زندگی کا ایک دور گزر گیا، جب آنکھیں آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ہم زمین کی پستی میں حقیر مخلوق کی طرح رینگ رہے تھے۔ اور اب زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے جہاں سے اپنے اوپر ہی بھروسہ کر کے ہم قدم اٹھائیں گے تاکہ وہ مشینیں، وہ دولت، وہ تصورات جنہیں کل ہم نے اپنی جدوجہد کے دوران جنم دیا ہے ہمارے تابع اور ہماری فرمانبردار بن کر برسی کتابوں کے لکھے ہوئے کو صحیح ثابت کریں کہ یہ کائنات انسان کی فرمانروائی کے لئے ہے یہاں مابعد الطبیعات ختم ہوتی ہے اور سائنسی نقطہ نظر کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کی روشنی وقت کی آخری حدوں تک ہے۔

اب روشنی کا مفہوم وہ ہے ۔۔۔ جس نے انسان کو سماجی حیوان کے بجائے کائنات کے ذہن کی حیثیت سے قبول کیا ہے جو حرکت اور تبدیلی کے آہنگ کو عمل کے تسلسل اور زندگی کے نئے چہروں میں ہی نہیں اس کلیت کی صورت میں دریافت کرتا ہے جس کا نام انسانی شعور ہے۔ جسے انسان سے الگ کر کے کائنات کے باطن کا نام دیا جا سکتا ہے تاکہ جوہر کی اکائی کو دے کائنات کے بننے اور سنورنے تک اور اشیاء کی موت سے زندگی کے نئے ہیولوں کی تخلیق تک کائنات کی خارجی شہادت اور انسان کی داخلی صداقت کو ہم آہنگ کر کے ایک نیا نظام فکر مرتب کیا جا سکے اور اس جدلیات پر نظر ڈالی جائے جس نے انسان کی ذات کی پہنائی میں اور اس سے ماورا لئے سیدھے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلنے کو آگاہی میں بدل دیا ہے۔

اسی نقطے سے سائنس کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے یہیں سے انسانی تجربات کی اہمیت دیوتاؤں کی الوہیت کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے اور گناہ و ثواب کی حدیں سمٹ کر انسانی فطرت کی خوشگوار فضا میں گم ہو جاتی ہیں۔

دراصل سائنس کی ترقی کو مادی ترقی کا نام دے کر جو لوگ انسان سے اس کا رشتہ کاٹ رہے ہیں ان کے ذہنوں میں کوئی ایسا نظام فکر نہیں ہے جو انسان کو مجموعی حیثیت سے سمجھنے میں مدد دیتا ہو اسی لئے انسان کی کلیت کو دریافت کرنے کا سہرا بھی ان کے سر نہیں ہے زندگی کی ماہیت مادی ہے یا غیر مادی اس سوال کے اٹھانے والوں کو معلوم نہیں کہ خود اس سوال کے بطن سے ماضی پرستی اور روایت پرستی جنم لیتی ہے یہ سوال پرانا ہو چکا ہے اب اس کی جگہ نئے سوالوں نے لے لی ہے۔

زندگی فطرت کے ہزارہا مظاہر پر محیط ایک اکائی ہے ہمیں عناصر کی دوئی سے نکل کر زندگی کی اس وحدت تک پہنچنا ہو گا جہاں نہ مادہ ہے اور نہ روح بلکہ زندگی خود جلوہ فرما ہے جو اپنی علت بھی ہے معلول بھی ــــ وہ حقیقت جو موجود ہے اپنے موجود ہونے کی کیفیت کے اعتبار سے زندگی کہلاتی ہے اس کی ماہیت یہی موجود ہونے کی کیفیت ہے جو تمام اشیاء اور مظاہر فطرت میں قدر مشترک ہے اس اعتبار

سے آدمی نہ جسم ہے اور نہ جان، نہ مادہ ہے نہ روح بلکہ ثنویت سے آگے خالص وحدت کی صورت میں موجود ہونے کی شعوری حالت کا نام انسان ہے جو زندگی کے ارتقائی عمل کی اعلیٰ ترین سطح کا نمائندہ ہے جس کے ذہن میں شعور و لاشعور کی آویزش اور آمیزش زندگی کی جدلیات ہی کی ایک خوبصورت مثال ہے اور سائنس کی تعلیم کا مقصد مظاہر فطرت اور زمان و مکان میں زندگی اور آدمی کی اسی ماہیت کو دریافت کرنا ہے جو تسلسل وقت کے سہارے نو بہ نو آہنگ کی شکل میں سامنے آتی ہے جس کے مطالعہ نے مفکروں اور سائنسدانوں کو اعلیٰ ترین بصیرت عطا کی ہے

آئنسٹائن اور ڈارون نے اپنی اپنی دریافت میں صرف نیا خیال ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ ماضی پرستوں کو شکست دے کر انسان کو فطرت کی تسخیر کی وہ راہ سجھائی ہے جو اہل علم کا حصہ ہے۔ اگر سائنس کے طالب علم سائنس کے اس بڑے مقصد سے متعارف نہ ہوں کہ سائنس تسخیر کائنات اور انسان کے باطن کے ادراک کا ذریعہ ہے تو عالمی بحران کے اس زمانہ میں خیر و برکت کے بجائے سائنس تباہی کا ذریعہ بنی رہے گی۔ اسی لئے سائنس کے اساتذہ سے پوچھنا پڑے گا کہ وہ ہر بات کی تعلیم دیتے وقت ہر بات کی بھول بھلیوں سے نکلنا اپنے طالب علموں کو سکھاتے ہیں یا نہیں۔

جزاس وقت بڑا اہم ہو جاتا ہے جب ایک ذہن دریافت شدہ پورے خیال کا احاطہ کر چکا ہو اور نئے خیال تک پہنچنے والا ہو اس گھڑی وہ شے کو دریافت شدہ اصولوں کی اگلی کڑی سے آگاہ کرتا ہے اور زینہ بہ زینہ اس جز تک پہنچتا ہے جو نئے خیال کی صورت میں آ موجود ہوتا ہے اور پورے کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے لیکن اس سے پہلے اصولوں کی تعلیم اس طرح ملنی چاہیئے کہ پورے خیال کی واضح تصویر بن سکے اور اس کے امکانات کی مثال بھی طالب علم کے ذہن میں موجود ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے مفروضوں کو تجربہ گاہ میں آزماتا رہے۔ جب یہ کام نہیں ہوتا تو تخلیقی سوتے خشک پڑ جاتے ہیں اور ہمیں ایسے انجینئر جو گھسے پٹے علم کی مدد سے نوکری حاصل کر کے رشوت کماتے ہیں اور ایسے ڈاکٹر ہر طرف نظر آتے ہیں جو امراض کی تشخیص اور دواؤں کی تحقیق کے بجائے لوگوں کو موت کی نیند سلا کر قبر میں اتارنے کی قیمت وصول کرتے ہیں حالانکہ سائنس کا کام اس تخلیقی ذہن کی پرورش کرنا تھا جس کی غیر موجودگی میں قومیں پسماندگی اور زوال کے دائرے سے باہر نہیں آ پاتیں۔

دنیا کے بعض ترقی یافتہ ممالک میں سائنس کی تعلیم کسی حد تک زندگی کے بڑے مقاصد سے ہم آہنگ ہے اور بعض ملکوں میں معاشی اغراض سے بلند و بالا رکھ کر اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ممکن ہے ایک دن سائنس کی روز افزوں ترقی ہی سے انہیں اپنے معاشی ہتھکنڈے انسان کی تخلیقی قوتوں کے مقابلے میں ہیچ پوچ نظر آنے لگیں اور دولت کی وہ استحصالی قوت ٹوٹ جائے جس نے ان کے ذہن کو غلام اور دوسری بستیوں کو مظلوم بنا رکھا ہے اور اسی بہانے وہاں کے لوگ نئے عہد میں ترقی یافتہ انسانوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت پیدا کر لیں لیکن ہمارے ملک میں سائنس کی جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ بڑی حد تک منفی بنیادوں پر قائم ہے یہاں کا سائنس داں جو کم پڑھا لکھا ہوتا ہے اپنے آپ کو دوسرے علوم میں کام کرنے والوں کا حریف سمجھتا ہے۔ اور دیانتداری سے سیکھنے اور سکھانے کے بجائے اپنی کوتاہیوں کی بھی قیمت وصول کرنے کی فکر میں ہے۔ وہ سائنس داں کے بجائے ایک معاشی حیوان کا کردار ادا کر رہا ہے۔ سائنسی ریسرچ اور انسانی فلاح و بہبود کے بجائے معاشی آسودگی ہی اس کی آخری منزل ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے سائنسدانوں، مفکروں اور دوسرے شعبوں کے اساتذہ کو معاشی فارغ البالی حاصل نہیں ہے جس کے بغیر سکون سے کام کرنا دشوار ہے لیکن بڑی حد تک وہ خود بھی اپنی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہے اس میں کام کرنے کی سچی لگن کی کمی ہے وہ کسی ایسے نصب العین سے آشنا نہیں ہے جو فرد کو انسانیت کے حصول کی کوشش پر کاربند کرتا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام کا نام ہمارے ملک میں خاصی شہرت پا چکا ہے دنیا کے سائنس دانوں میں ان کی فی الحال کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن ان کے لئے بھی ہمارے ملک میں کام کرنے کے مواقع حاصل نہ تھے اپنی تحقیق کو مکمل کرنے کی لگن ان کے دل میں موجود تھی جو انہیں دوبارہ یورپ کھینچ کر لے گئی اور یہ وہ شخص ہے جو ایوب سے یہ کہہ کر اپنے ملک واپس آیا تھا کہ اس کی خدمات اور تحقیق

سے استفادہ کا اصل حق اس کی قوم کو پہنچتا ہے۔

کیا ہم اس صورت حال کو بدلنے کے لئے تیار ہیں کہ ہمارے سائنس دانوں کے لئے بہتر تجربہ گاہوں کی ضرورت ہے ورنہ خود ہمارے ان سائنسدانوں کو پروفیسر عبدالسلام کی طرح اپنی لگن کو زندہ رکھنا ہوگا ورنہ پسماندگی سے ابھرنے اور روشنی سے ہمکنار ہونے کے سارے خواب بے تعبیر رہ جائیں گے۔

سائنس کی تعلیم ہو یا فنون کی۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ اپنے لیکچر کو مؤثر بنائے، اسے مؤثر بنانے کے لئے دو چیزوں کا وجود ضروری ہوگا اس کی شخصیت کا جادو اور موضوع کی اہمیت اس کے لیکچر سے ایک ساتھ ابھریں گے دونوں ایک دوسرے کی مدد کے بغیر تشنہ رہ جائیں گے۔ استاد کی دردمندی۔ تڑپ اور خلوص ہی کے سہارے سائنس کے خشک اور بے مزہ موضوعات میں طالب علم کے لئے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ فطرت کے اصولوں کو دریافت کرنے کی ایک ایسے لیکچر کو بھی دریافت کر لیتا ہے جس میں استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے تعاون کرنے میں لذت اور مسرت حاصل کرتے ہیں۔ استاد کے تعاون کے بغیر طالب علم کے دل میں وہ آنند جنم لیتی ہے اور نہ اس کے سینے میں وہ آگ جلتی ہے جو فطرت کے اصولوں کی دریافت اور تحقیق کی منزل تک لے جانے والی سب سے بڑی قوت ہے اسی لئے سائنس کی تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔

(۱) فطرت کے اصولوں کی دریافت

(۲) دریافت شدہ اصولوں کی مدد سے ایجاد و اختراع کی کوشش۔

(۳) علم کی سچی لگن جس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

ان میں تیسرے کا تعلق عام تعلیم سے ہے۔ دو کو سائنسی تعلیم سے خصوصی ربط ہے۔ لیکن تیسرے کے بغیر خصوصی تعلیم کے کوئی معنے نہیں بنتے اور یہی خرابی مسلسل ہمارے یہاں سائنس کی تعلیم کو ناکام بنا رہی ہے ہمارے ملک میں نہ ذہین افراد کی کمی ہے اور نہ محنتی لوگوں کی لیکن ذہانت اور محنت صرف اس لئے ضائع ہو رہی ہے کہ ہم نے طالبعلموں میں علم حاصل کرنے اور علم سے کام لینے کی سچی لگن پیدا نہیں کی اس کے سبب وہ اپنے موضوع سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں طبیعیات کا ایک ذہین طالب علم بھی ہمارے ملک میں پوری طرح نہیں جانتا کہ نیوٹن سے آئنسٹائن تک ان کے نظریات کی بنا پر اس کے شعبے میں اور بحیثیت مجموعی زندگی گزارنے کے آداب میں کتنی بڑی تبدیلی ہو چکی ہے اور ایجاد و اختراع سے فطرت کے نئے اصولوں کی دریافت تک اس کا اگلا قدم کس سمت میں اٹھنا چاہیئے۔ اس کے دل میں کوئی امنگ نہیں وہ کورس کی چند کتابوں کا پابند ہے اس کے آگے دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ اس سے یہ ہمت اس نظام نے بھی چھین لی ہے جو طالب علم کی قومی یا مادری زبان نہ ہونے کے باوجود ذریعہ تعلیم ہے۔ ہمت کے نہ ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ طالب علموں نے پہلے سے اپنے بارے میں یہ سوچ لیا ہے کہ انہیں دو چار سو کی نوکری کر کے اپنا پیٹ پالنا ہے تعلیم کا اور سوا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہیں آتا گویا ہمارے ملک میں ہم سے ہمارے خواب چھین لینے کے لئے موجودہ نظام تعلیم ایک سازش ہے۔ اسی لئے سچی لگن پیدا کرنے کے لئے اساتذہ کو طالب علموں کے سامنے علم کے بڑے معیار اور کسی قومی یا انسانی نصب العین کو شدت سے پیش کرنا پڑے گا۔ اگر اس خیال کو سائنس کی تعلیم کی بنیاد نہیں بنایا گیا تو پھر اور نصب العین کی عدم موجودگی میں سائنس کے طلبہ پڑھے لکھے کہلائے جانے کے مستحق بھی نہ ہوں گے۔

مختصر ضروریات یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں سائنس پڑھنے اور پڑھانے والے سائنسی حقائق کو زندگی میں برتنے اور انہیں سدا بہتر بنانے کے بجائے اوہام پرستی کی بھینٹ چڑھاتے رہے ہیں ان کے ذہن سائنس کی روشنی سے محروم ہیں اور سائنس کی بہتر تعلیم

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

آغا افتخار حسین

مانٹسکیو کے فارسی خطوط

فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات

سترھویں صدی کے فرانس کی شاہی مطلق العنانی کا دور سنہ ۱۷۱۵ء میں لوئی چہاردہم کے انتقال پر ختم ہوا۔ اس صدی میں بعض شعبوں میں فرانس نے بڑی ترقی کی، لیکن بادشاہ کی مطلق العنانی کی وجہ سے فرانس اور خصوصاً پیرس کے معاشرے میں ایک قسم کی گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ لوئی چہاردہم کے انتقال پر فرانس کے بہت سے لوگوں نے جن میں دانشور بھی شامل تھے، اطمینان کا سانس لیا۔ اٹھارویں صدی میں فرانس کے دانشوروں کے سیاسی شعور میں کافی اضافہ ہوا۔ آزادیٔ فکر و عمل اور دیگر جمہوری قدریں پروان چڑھیں، اور ایسی علمی فضا پیدا ہوئی جس میں روسو، والتیر، دیدیرو، اور مانٹسکیو جیسے دانشور ادیب پیدا ہوگئے —— ان دانشوروں نے فرانس کے معاشرے کے کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اور قوم کی سیاسی، علمی اور فنی سربلندی کے لئے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اکثر اپنے ماحول اور بداطوار حکومت کے خلاف آواز بلند کی۔ اس فکری بغاوت کی پاداش میں صعوبتیں برداشت کیں اور آخرکار ۱۷۸۹ء کا انقلاب ہوا جس نے فرانس کے قدیم معاشرے کی شکست و ریخت کے بعد ایک نئے فرانسیسی معاشرے کو جنم دیا۔

معاشرے اور حکومتِ وقت کے خلاف آواز اٹھانے میں ان دانشوروں نے دو طریقے استعمال کئے۔ ایک تو ایسی تحریریں پیش کیں جن میں منطقی استدلال یا دیگر نظری بحثوں کے ذریعے طرزِ حکومت وغیرہ پر راست تنقید کی۔ لیکن دوسرا اور دلچسپ طریقہ فرانس کے ادیبوں نے اپنی بعض تحریروں میں استعمال کیا۔ یہ ادیب براہ راست تنقید کرنے کے بجائے "سیر دیگران" کو "حدیث دیگراں" کے ذریعے بالواسطہ اور نہایت لطیف انداز میں پیش کرتے تھے۔ کہانی ہندوستان، کشمیر، ایران، مصر اور دیگر مشرقی ممالک کی بیان کرتے تھے لیکن ان کے کرداروں میں فرانس کے بادشاہوں، ان کی منظورِ نظر خواتین، اعلیٰ سرکاری اور سیاسی شخصیتوں وغیرہ کی تصویریں نظر آتی تھیں۔ ذکر کسی مشرقی ملک کے خاندان کا ہوتا تھا لیکن روئے سخن فرانس کا وہ معاشرہ ہوتا تھا جو صدیوں پرانا تھا اور جس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

مختصر حالاتِ زندگی اور اہم زندگی

ان دانشوروں میں مانٹیسکو بھی تھا۔ اس کا پورا نام مع القاب "Charles Louis de Secondat baron de la Brede et de Montesquieu." تھا۔ اس کے "فارسی خطوط" — (Les Lettres Persannes) بہت مشہور ہیں۔ مانٹیسکو سنہ ۱۶۸۹ء میں بوردو کے قریب لابرید (La Brede) کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ ایک متمول اور بااثر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے مجسٹریٹ کا عہدہ مل گیا۔ لیکن چند سال اس عہدے پر کام کرنے کے بعد مانٹیسکو نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اور پیرس چلا آیا۔ اور جلد ہی وہاں کی علمی اور ادبی محفلوں اور "دیوان خانوں" (Salons) میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کی سب سے پہلی اہم تصنیف "فارسی خطوط" ہیں جو اس نے سنہ ۱۷۲۱ء میں شائع کئے۔ اس کے بعد دو ایک نسبتاً غیر اہم تصانیف (ناول) لکھنے کے بعد اس نے یورپ کا سفر کیا۔ اور اٹلی، ہالینڈ ہوتا ہوا سنہ ۱۷۲۹ء میں انگلستان پہونچا جہاں وہ دو سال رہا۔ یہاں اس نے ایک ایسا شاہی نظام حکومت دیکھا جس میں بادشاہ کے اختیارات کو پارلیمنٹ محدود کر دیتی ہے۔ وہ اس نظام حکومت سے بہت متاثر ہوا، اور اس کی جھلک اس کی کئی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۷۳۱ء میں وہ فرانس واپس آ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیا۔ سنہ ۱۷۳۴ء میں اس کی کتاب "سلطنت رومائی عظمت اور زوال کے اسباب پر خیالات" (Les Considerations sur les causes de la grandeur des Romains et de leur decadence) شائع ہوئی۔ جس میں اس نے شاہی کے عروج اور زوال کا فلسفۂ تاریخ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اہم ترین کتاب "روحِ قوانین" (L'Esprit des lois) سنہ ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی جس کی تصنیف پر اس نے بیس سال محنت کی تھی۔ اس کتاب کا موضوع سیاسی نظریات ہیں۔ پہلے وہ دنیا کی اہم قدیم اور جدید ریاستوں کے دساتیر کا جائزہ لیتا ہے۔ اور ان کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی توجیہہ کرتے ہوئے جغرافیہ، آب و ہوا، اور ان ملکوں کے رہنے والوں کے سیاسی شعور کے متعلق اظہار خیال کرتا ہے۔ حقائق پیش کرنے کے بعد مانٹیسکو دلچسپ نتائج اخذ کرتا ہے کہ کسی ملک کے قوانین کے مطالعے سے اس قوم کے کردار اور تاریخ پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد مانٹیسکو استدلال کے بعد اس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ بادشاہ یا سربراہ مملکت کو قانون نہیں بنانے چاہئیں، بلکہ قانون سازی کا کام ایک خود مختار ادارے کے سپرد کرنا چاہیئے۔ اور قانون کو رو بہ عمل لانے کا کام ایک اور خود مختار ادارے یعنی عدلیہ کو کرنا چاہیئے۔ صرف ایسے نظامِ حکومت ہی میں انفرادی آزادی کی ضمانت دی جا سکتی ہے یورپ کی فکری تاریخ میں یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کتاب میں اس عقلیت کا اثبات کیا گیا ہے جس کا امام دیکارت (پیدائش ۱۵۹۶ء وفات ۱۶۵۰ء) ہے اور جس کے انداز فکر کا اثر آج بھی فرانس کی علمی دنیا کے تقریباً ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔

مانٹیسکو کی اس کتاب میں جمہوریت اور آزادیٔ فکر کی جو تبلیغ کی گئی تھی وہ اس دور کے فرانس کے مذہبی علماء کو ناگوار گذری اور انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا جس کے جواب میں مانٹیسکو نے ایک اور مختصر کتاب اپنی صفائی میں شائع کی

یہ کتاب "Defense de l'Esprit des Lois" سنہ ۱۷۵۰ء میں شائع ہوئی۔ چار سال بعد سنہ ۱۷۵۵ء میں مانٹیسکو کا انتقال ہوگیا۔ "روحِ قوانین" مانٹیسکو کی نہایت اعلیٰ درجے کی عالمانہ تصنیف مانی جاتی ہے۔ لیکن اسے سب سے زیادہ شہرت "فارسی خطوط" ہی سے حاصل ہوئی۔

"فارسی خطوط" کے ماخذ

اٹھارویں صدی میں مشرق اور مشرقی تمدن سے دلچسپی عام ہوچکی تھی، بلکہ ایک فیشن بن گئی تھی۔ جس زمانے میں مانٹیسکو نے "فارسی خطوط" شائع کئے مشرقیات کے موضوع پر حسبِ ذیل کتابیں بہت مشہور تھیں:

1) Defresny: "Amusements Serieux et comique d'un Siamois à Paris" (1707)

اس ڈرامے میں ایک سیام کے رہنے والے نوجوان کے تاثرات مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سیامی نوجوان پیرس جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار، طرزِ رہائش وغیرہ کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور بھولے پن میں دلچسپ حرکتیں کرتا ہے۔ مانٹیسکو کے "فارسی خطوط" میں دو ایرانیوں کے تاثرات بیان کئے گئے ہیں جو پیرس جاتے ہیں اور وہاں کی معاشرت پر طنز کرتے ہیں۔

2) Chardin: Journal (1711)

شاردین کے اس سفرنامے سے مانٹیسکو نے ایرانیوں کی تہذیب، اخلاق و عادات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کئے ہیں۔ مثلاً مانٹیسکو کے "فارسی خطوط" میں ازبک قم کا ذکر کرتا ہے جہاں حضرت فاطمہ کا مزار ہے اور لکھتا ہے:

> "ہم نے ان محترم خاتون کے مزار پر نماز پڑھی، جن کی نسل سے بارہ پیغمبر پیدا ہوئے"[1]

یہی حوالہ شاردین کے سفرنامے میں بھی ہے[2]۔ یہی ذکر سولہویں خط میں بھی ہے[3]

---

[1] "فارسی خطوط" - یکم - مورخہ ۵ صفر سنہ ۱۷۱۱" - مانٹیسکو نے یہاں "پیغمبر" کا لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ "امام" ہونا چاہیئے۔ آگے چل کر بعد کے "فارسی خطوط" میں مانٹیسکو نے "امام" کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ غالباً سہوِ کتابت کی وجہ سے امام (Imam) کے بجائے امان (Iman) چھپ گیا ہے۔ یعنی M کے بجائے N - یہ سہو تمام مطبوعہ نسخوں میں ہے۔ میں پیرس جاکر مانٹیسکو کا اصل مسودہ دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

[2] دیکھئے حصہ سوئم

[3] میں نے ان حوالوں میں مارتینو کی مذکورہ کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس حوالہ میں مارتینو سے سہو ہوا ہے (ممکن ہے سہوِ طباعت ہو) مارتینو نے سترہویں خط کا حوالہ دیا ہے حالانکہ یہ ذکر سترہویں میں نہیں سولہویں خط میں ہے۔ (دیکھئے مارتینو صفحہ ۲۹۵)

ایسے ہی سولھویں خط میں مانتسکیو حضرت علی رض کی ذوالفقار نامی تلوار کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی اس نے شاردینے سے استفادہ کیا ہے۔ [1]

3) Tavernier: "Voyages en Turquie, en Perse et aux Indes" (1677)

تاورنیے کا یہ سفرنامہ سنہ ۱۶۷۷ء میں شائع ہوا، اور اس کے کئی ایڈیشن بعد میں اٹھارویں صدی میں شائع ہوئے۔ تاورنیے نے اس سفرنامے میں ترکی، ایران اور ہندوستان کے سفر کے حالات لکھے ہیں۔ فارسی خطوط (مثلاً انیسویں خط) میں ایک اور رضا نے ایران اور ترکی سے یورپ آنے کا جو راستہ بیان کیا ہے، اس کے تعین کے لئے مانتسکیو نے تاورنیے کے سفرنامے سے استفادہ کیا ہے۔

4) Galland: "Mille et une Nuits"

عربی کی مشہور کتاب "الف لیلہ" کا ترجمہ کسی مغربی زبان میں سب سے پہلے پروفیسر گالاں نے سنہ ۱۷۰۴ء میں فرانسیسی زبان میں کرکے شائع کرنا شروع کیا۔ سنہ ۱۷۱۵ء میں پروفیسر گالاں کی وفات تک اس کی دس جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ دو جلدیں اس کے بعد سنہ ۱۷۱۷ء میں شائع ہوئیں۔

"الف لیلہ" اس زمانے میں فرانس کے ہر طبقے میں مقبول تھی۔ مانتسکیو نے "فارسی خطوط" میں اس سے بہت استفادہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

> مانتسکیو کے "فارسی خطوط" 'الف لیلہ' کا ایک باب معلوم ہوتے ہیں جسے ایک آزاد فلسفی (مانتسکیو) نے جدید لباس میں پیش کیا ہے: [2]

5) Giovanni Pado Marana: "L'Espion dans les cours des princes Chertiens"

یہ دلچسپ کتاب ایک اطالوی ادیب مرآنا نے سنہ ۱۶۸۴ء میں لکھی، جو پیرس آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس کتاب میں ایک ترک جاسوس کی کہانی بیان کی گئی ہے جو عیسائی بادشاہوں کے درباروں میں رہا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ سنہ ۱۷۱۰ء تک اس کے تیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اور سنہ ۱۷۵۶ء تک اس کی مقبولیت کا یہی عالم رہا۔ اس کتاب میں بیان کیا گیا تھا کہ اس ترکی (عثمانی) جاسوس کو پیرس کے شاہی دربار اور اعلیٰ سوسائٹی میں بلد رسائی حاصل ہو گئی اور اس نے اپنے ملک کے لئے فرانس سے سیاسی، تہذیبی اور تاریخی معلومات فراہم کئے۔ یہ کتاب مانتسکیو کے مطالعے میں تھی اور پیرس کی سوسائٹی کے بارے میں ایک غیر ملکی مسلمان کا نقطۂ نظر بیان کرتے وقت "فارسی خطوط" میں "ترکی جاسوس" کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کتاب کی شہرت جرمنی اور

---

[1] دیکھئے سفرنامہ مذکورہ۔ حصہ ہشتم۔ "فارسی خطوط" میں ان حوالوں کی تفصیل آگے آئے گی۔

[2] دیکھئے پیر مارتینو Pierre Martino کی کتاب "L'Orient dans la littérature française" ص ۲۹۰۔

انگلستان میں بھی ہوئی۔

مندرجۂ بالا کتب سے مانتسکیو نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی موضوعات پر سیکڑوں کتابیں، رسالے خطوط وغیرہ اس زمانے میں شائع ہو چکے تھے۔ قرآن شریف کا پہلا فرانسیسی ترجمہ جو Du Ryer نے کیا تھا، سنہ ۱۶۴۷ء میں شائع ہو چکا تھا۔ سعدی کی گلستان کا پہلا ترجمہ سنہ ۱۶۳۶ء میں اور دوسری بار [illegible] میں شائع ہوا تھا۔

سائنس کی تعلیم

(صفحہ ۳۹ سے آگے)

کے بعد ہی ان میں یہ خواہش پیدا ہو سکتی ہے کہ اس سے باہر نکل کر علم کے دوسرے شعبوں اور زندگی کی دوسری سمتوں کو سمجھنے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ہم سائنس کی تعلیم میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے ہاں ادب، ثقافت اور سماجیات کا علم افہام و تفہیم کی اعلیٰ تر منزلوں میں ہے ہمیں مجموعی طور پر تمام شعبوں میں ترقی کر کے دوسروں کے برابر پہنچنا ہے۔ سارے شعبوں میں ترقی کے یکساں تصور سے وہ معیار اعتدال ہاتھ آتا ہے جس سے ہر شعبہ کا آدمی اپنے طالب علموں میں افراط و تفریط کے بغیر صحیح لگن پیدا کر سکتا ہے اور تعلیم کے بنیادی مقاصد کے تحت سائنسی تعلیم کو فروغ دے کر ہم ایک طالب علم کو اس کے شعبہ کی تجربہ گاہ کا کیڑا بھی بنا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک اچھا شہری بھی ورنہ ہم اچھے سائنس دانوں ہی سے نہیں اچھے شہریوں سے بھی محروم رہیں گے۔

تابش دہلوی

(نذرِ اقبال)

غم اپنے جو تسکینِ جاں اور بھی ہیں
محبت سے ہم بدگماں اور بھی ہیں

مرے رہزنوں کو مبارک یہ مژدہ
کہ رستے میں کچھ کارواں اور بھی ہیں

کب آزادی و قید میں فاصلہ ہے
قفس ہی کے پاس آشیاں اور بھی ہیں

نوا تلخ تر چاہیے لیکن اے دل
کچھ آدابِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

نہ سمجھے کہ اپنی وفا کے علاوہ
محبت میں آزارِ جاں اور بھی ہیں

نگاہ و تجلی کا پردہ تو اٹھا
حجابات ابھی درمیاں اور بھی ہیں

رکے اک نشیمن سے وابستگی ہے
چمن در چمن آشیاں اور بھی ہیں

فلک ہی نہیں دشمن اہلِ ہنر کا
زمیں پر بہت آسماں اور بھی ہیں

غمِ عشق سے شق ہے کیوں سینہ تابش
اسی راز کے رازداں اور بھی ہیں

اسنرشاہ پوری

دنیا میں کسی کا کوئی ہوتا تو نہیں ہے
کانٹے بھی مگر راہ میں بوتا تو نہیں ہے

یہ بھی تھا کرشمہ مری تقدیر کا ورنہ
قصداً کوئی کشتی کو ڈبوتا تو نہیں ہے

کچھ روز سے ہم شورِ سلاسل نہیں سنتے
دیوانہ کہیں دشت میں سوتا تو نہیں ہے

بس کھل گئی ہمدم تری رندی کی حقیقت
دامن کو شرابی کبھی دھوتا تو نہیں ہے

انجامِ وفا اپنے لئے دیکھئے کیا ہو
اس راہ میں یوں گم کوئی ہوتا تو نہیں ہے

اسنرؔ کو بلاتے نہیں کیوں بزمِ طرب میں
ہنستا ہے بہرحال، وہ روتا تو نہیں ہے

شاعر لکھنوی

عیاں ہے میرا لہو سُرخیٔ شفق کی طرح
چمک رہا ہوں سرِ دارِ حرفِ حق کی طرح

کتابِ عشق کے صورت نما ہیں ہم دونوں
ملے ہیں پھر بھی جُدا ہیں ورق ورق کی طرح

خیالِ دوست کی خاطر کبھی کبھی ہم نے
خوشی بھی کی ہے گوارا مگر قلق کی طرح

اُسی نگاہ کو کچھ رنگ آشنا کہئے
بکھر گئی کسی چہرے پہ جو رَمَق کی طرح

کہیں سے یاد ہے مجھ کو کہیں سے یاد نہیں
حیات ہے کسی بھولے ہوئے سبق کی طرح

چمن کو ہم نے جگر کا لہو پلایا ہے
بہار مانگ رہے ہیں ہم اپنے حق کی طرح

نگارِ زیست کا عالم نہ پوچھئے شاعرؔ
تڑپ رہی ہے کسی قلبِ نیم شق کی طرح

فارغ بخاری

خوشبو بکھر گئی جو مُسافر بکھر گیا
حسنِ نظر کے ساتھ ہی حُسن سفر گیا

اب تک دلِ حزیں ہے ہلاکِ فریبِ رنگ
کیا ناوکِ نظر تھا جو دل میں اُتر گیا

خم کھا گئے ہیں اپنی ہی عظمت کے بوجھ سے
طغیانیاں وہ آئیں کہ دریا اُتر گیا

صحرا کی پیاس قطرۂ شبنم سے کیا بجھے
سیلِ سرشک آتشِ غم تیز کر گیا

کیا رنگ لائے موسمِ پُرشور دیکھئے
سودائے بام و در کا زمانہ گذر گیا

پتھر سے ہوئے ہیں رہِ آرزو میں ہم
صہبائے موجِ نور کا نشہ اُتر گیا

دشتِ حیات میں وہی ویرانیاں ہیں، وہ
دھرتی کی طرح کیوں نہ مجھے روند کر گیا

فارغ کو یار ڈھونڈتے پھرتے ہیں چار سو
وہ آبروئے رونقِ محفل کدھر گیا

سحر انصاری

(قرۃ العین طاہرہ کی نذر)

تجھ سے اگر ہو گفتگو چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرحِ غم و الم کروں نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

مثلِ صبا لئے پھری مجھ کو تمہاری جستجو
خانہ بہ خانہ در بہ در کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

ہیں ترے ہجر میں رواں آنکھوں سے اشکِ خونِ دل
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

ابرو و چشم نے ترے طائرِ دل کیا اسیر
طبع بہ طبع دل بہ دل مہر بہ مہر خو بہ خو

قلبِ حزیں نے تیرا عشق بُن دیا بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو

کشتۂ دورِ قاہرہ، قرۃ العین طاہرہ
ریختہ میں تری غزل لکھی سحر نے ہو بہ ہو

شمیم حنفی

سرنگوں، چپ چاپ سا بیٹھا، یونہی سوچا کروں
وقت کی ندی بہت وحشی ہے لیکن کیا کروں

شرم سی آنے لگی ہے گیان کے اس موڑ پر
کس طرح لیکن خود اپنے آپ سے پردا کروں

تیری آنکھوں میں سمندر تیرتے ہیں رات دن
کیا تری آنکھوں میں یونہی رات دن ڈوبا کروں

روشنی کا بوجھ لے ڈوبے گا اس آواز کو
بے حجابی کا تری کس سے مگر شکوا کروں

ہنس کے تو نے اک نظر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا
میں تجھے کب تک بھلا یوں رات دن دیکھا کروں

خمار انصاری

جو ظلم ہو رہا ہے وہ کچھ راز بھی نہیں
اور کوئی احتجاج کی آواز بھی نہیں

ہم ہیں فروغِ مے کا سبب اس کے باوجود
ہم پر شراب خانے کا در باز بھی نہیں

اس انجمن میں ہم سے ہے روشن وفا کا نام
اس انجمن میں ہم سا سرافراز بھی نہیں

ہر گوشۂ حیات پہ چھائی ہوئی ہے رات
یارو ابھی تو صبح کا آغاز بھی نہیں

ہم تک ہے اس دیار میں یہ شورشِ حیات
ہم چپ ہوئے تو پھر کوئی آواز بھی نہیں

حالات و تجربات نے کتنا بدل دیا
پہلا سا سوچنے کا اب انداز بھی نہیں

اچھا ہوا کہ ٹوٹ گیا دل کا اعتماد
اب مجھ کو دوستوں پہ بہت ناز بھی نہیں

شعر و ادب سے اپنا تعلق رہا خمارؔ
شعر و ادب کہ باعثِ اعزاز بھی نہیں

نجیب اسلم

جذبۂ مہر و وفا جاتا نہیں
دل سے اک پتھر بنا جاتا نہیں
ذہن میں رقصاں ہے اک ایسا خیال
شعر میں جس کو کہا جاتا نہیں
دیکھ کر ویرانیٔ شہرِ طرب
غم کے صحرا سے اُٹھا جاتا نہیں

شاہد نور

ہم تجھ پہ ترے شہر پہ بھی بار نہ ہوتے
سائے جو در و بام کے غم خوار نہ ہوتے
ہر حال میں جو آپ بھی رہتے مرے شامل
جینے کے مراحل کبھی دشوار نہ ہوتے
اے دوست اگر دل پہ مرے چوٹ نہ لگتی
جذبات میں ڈوبے ہوئے اشعار نہ ہوتے

ریاض صدیقی

رنجِ شبِ فراق ہمیں اب گوارا ہے
یہ تیری یاد دل کے لئے اک سہارا ہے
ہے آج بھی وفورِ تمنا بنا ہوا
لمحہ جو تیرے ساتھ کسی نے گزارا ہے
بے ربطیٔ فضائے تصور کو دیکھ کر
فکر و نظر کو رنگِ شفق سے سنوارا ہے
مقتل بنائے جائیں زمیں پر نئے نئے
اہلِ ستم کو رسمِ جفا ہی گوارا ہے

آبغم میرزا

آوازوں کا پتھراؤ

گلی میں نسوانی قہقہہ اُچھلا۔ اور ہم چاروں کھڑکی پر آگئے۔

محلّہ میں ہمارا دوسرا دن تھا۔

پہلا دن سامان کو ترتیب دینے میں گذر گیا تھا۔ کسی سے شناسائی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ کسی چہرے کی پہچان نہ ہوئی تھی۔ گلی میں آمد و رفت بھی بہت کم تھی۔ گلی کے سبھی مکان اتنے بڑے تھے کہ بچوں کو کھیلنے کے لئے باہر آنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی، لوگ زیادہ تر کاروباری تھے۔ صبح جاتے اور شام کے بعد واپس لوٹتے اور پھر باہر نہ نکلتے تھے۔

ہمیں بڑی سفارش سے محلہ میں ایک کشادہ بیٹھک کرائے پر ملی تھی۔ ہمیں محتاط رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ شریفوں کے محلے میں اپنا وقار پیدا کرنے کا ہر ایک نے عہد کر لیا تھا۔

ہم چاروں مختلف دفاتر میں ملازم تھے۔ چونکہ ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ اس لئے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ کھانا جس ہوٹل میں کھاتے تھے۔ وہ بھی زیادہ دور نہ تھا۔

باہر نکلتے وقت ہی ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کسی دل کش منظر کی اس کھلی گلی میں امید رکھنا عبث ہے۔ اور اگر کسی کی جھلک نظر آ گئی تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیونکہ بازاروں میں گھومتے رہنے سے آنکھیں اپنی پیاس فراوانی سے بجھا لیتی تھیں۔ اور جب ہم محسوس کرتے کہ ابھی جذبات کی شدت باقی ہے، تو اسٹیشن آ جاتے۔ اور پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر یوں پلیٹ فارم پر چکر لگاتے رہتے جیسے طویل سفر پر جانے کی وجہ سے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال رہے ہیں۔

لیکن جب گلی میں نسوانی قہقہہ اچھلا تو ہم سب بے اختیار ہو گئے۔

کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر شریف نے باہر جھانکا ——— کلیم نے اس کے سر پر ٹھوڑی جما دی ——— چودھری ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جھانکنے لگا ——— میرے لئے کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ میں نے شریف کو زور سے گدگدایا۔ وہ پیچھے ہٹا تو کلیم کا توازن بھی قائم نہ رہ سکا۔ میں اس لمحے سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔

گلی میں ایک نوجوان لڑکی نے برقع کا نقاب اُٹھائے، نظریں اوپر کئے کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

میں چند لمحے ہی وہاں ٹھہر سکا۔ شریف مجھے پرے دھکیل کر اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔

میں چارپائی پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگا — چند لمحے ..... زندگی کے بائیس برسوں پر محیط ہو چکے تھے ..... ایک لمحہ ہی کائنات کی کایا پلٹ کے لئے کافی ہوتا ہے — ایک لمحہ، جس میں وقت کی وسیع خلیج سمٹ کر قطرہ بن جاتی ہے — ایک لمحہ، جس میں قلوپطرہ سے لے کر سوہنی تک کا سارا حسن جامد ہو جاتا ہے — وہ ایک لمحہ، چند لمحوں میں ڈھل کر، میری آنکھوں کی پتلیوں میں جم کر رہ گیا — میرے دل کی پنہائیوں میں ایک چکا چوند پیدا ہوئی — اور میرے شعور کی ساری سلوٹیں منور ہو گئیں۔

وہ لمحہ، اڑتے بادل کے سائے کی مانند بھاگ گیا۔ لیکن ہم چاروں یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔

ابھی ہمیں ستانا تھا۔ پھر کھانے کے لئے باہر نکلنا تھا۔ لیکن بے خوابی کے مریض کی مانند سب کی آنکھوں میں ایک چبھن تھی۔ ایک تجسس جھانک رہا تھا۔

میں یوں محسوس کرنے لگا، جیسے ہم کسی صحت افزا مقام پر آئے ہوئے مختلف ممالک کے سیاح ہوں۔ جو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہوں۔ جن کی کوئی قدر مشترک نہ ہو۔ اور رقص گاہ میں بیٹھے ایک ایسا نغمہ سن رہے ہوں جس کی لَے بے حد مسحور کن اور کیف آور ہو۔ لیکن جس کے بول سمجھ سے بالا تر ہوں۔

چودھری نے کسمسا کر کہا: "کب تک ہم یہاں ٹھہرے رہیں گے؟"

کلیم نے گہرا سانس بھر کر کہا: "جب تک مسمریزم کا اثر زائل نہ ہو جائے۔"

شریف مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آؤ ملک! ہم چلیں۔ دوپہر کو چائے کا صرف ایک کپ پیا تھا۔"

میں نے سب کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے ہر جگہ اپنے جذبات ہی کا رنگ نمایاں نظر آیا۔

پھر یکدم چودھری قہقہہ لگا کر میرا کندھا دبانے لگا۔ "ہم سب کتنے بیوقوف ہیں۔ پیٹ میں بھوک انتڑیاں چبا رہی ہے اور سر پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔"

کلیم کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

میرے کھڑے ہونے پر شریف نے تالا اٹھایا: دروازے کو تالا لگا کر ہم نظریں جھکائے ہوئے گلی میں سے گذرے۔ اور بازار میں آ کر یوں سانس لینے لگے جیسے تاریک غار میں سے نکل کر آئے ہوں۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہ کی۔

ہوٹل میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ وہاں ابھی زیادہ شور نہ تھا۔ کونے والی میز کے گرد بیٹھ کر ہم بات کرنے کے لئے کوئی موضوع تلاش کرنے لگے۔

اس سے پہلے ہم نے یوں گھٹن محسوس نہ کی تھی۔ ہزاروں موضوع تھے۔ ناواقفیت کے باوجود جن پر ہم دل کھول کر بحث کیا کرتے تھے۔ لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بات شروع کی اور وہ کسی جرم کا مرتکب ہوا۔

چودھری نے ہوٹل کے ملازم ناٹے قد کے باقر کو آواز دی: "ارے باقر، جگ میں پانی لے آ۔"

کلیم نے گلے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: "یارو! عجیب الجھن پیدا ہو گئی ہے — میں نے کبھی اتنی شدت سے پیاس محسوس نہ کی تھی — نہ جانے یہ اس حسن کی گرمی کا اثر ہے!"

شریف میز پر کہنیاں ٹکا کر بولا : "ظالم کا حسن اتنا تحیّر زا تھا کہ سوچنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے "۔

میں نے ہونٹ سے کہا : "ہمیں ہو کیا گیا تھا۔ سب کسی جادو کے زیر اثر آگئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم میں سے ہر ایک پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی "۔

چودھری نظریں گھما کر بولا : "میں خود حیران ہوں کہ ہم جو حسن کو دیکھنے کے بعد پرکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یوں سدھ بدھ کیسے گنوا بیٹھے "۔

شریف نے یقین دلانے کی خاطر کہا : "صورتیں تو بہت دیکھی ہیں۔ لیکن اس کی کوئی مثال ہی نہیں۔ وہ ہماری گلی ہی کی رہنے والی ہے...... بائیں طرف کے تیسرے مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے برقع کا اوپر کا حصہ اُتار دیا تھا "۔

میں نے انہیں ورغلانے کی خاطر کہا : "ہمیں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے۔ ہم کسی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتے جو کچھ دیکھ لیا بس اتنا ہی کافی ہے۔

شریف نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

چودھری نے اس کی نیت کو بھانپ کر کہا : "ملک نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس عورت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے اور پھر ہماری بساط ہی کیا ہے : ایک معمولی کلرک کہاں تک چھلانگ لگا سکتا ہے "۔

مجھے بات بڑھانے کا بہانہ مل گیا۔" ابھی تو صرف ایک بار دیکھنے ہی سے کھچاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے کسی سے بات کر لی۔ اگرچہ اس کا امکان نہیں۔ تو پھر ہم میں سے شاید کوئی قتل بھی ہو جائے "۔

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

اور کلیم نے پانی کا دوسرا گلاس ختم کر کے کہا : "تم تو یوں بات کو طول دے رہے ہو۔ جیسے یہ عشق کا کھیل تم برسوں سے کھیل رہے ہو۔ پانی کے دو چار گلاس پیو۔ خون کی کھولن ختم ہو جائے گی "۔

میں اب خوشی محسوس کر رہا تھا کہ دو ساتھیوں کو اپنا ہم نوا بنا کر شریف کو شکست دے دی ہے۔ اب کوئی بھی اس لڑکی کو اہمیت نہ دے گا۔ مجھے اس تک رسائی حاصل کرنے کی راہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ شاید دوسرے بھی ایسا ہی سوچ رہے ہوں۔ میں نے اس طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شریف نے ہوٹل سے باہر نکل کر کہا : "میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔ دفتر میں بعد مصروف رہا ہوں، اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں "۔

جی تو میرا بھی کہیں اور جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن میں خود کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہ چاہتا تھا۔ میں نے بے نیازانہ لہجے میں کہا : "ہم تو بازار کا چکر لگائے بغیر گھر واپس نہ جائیں گے۔ تم جا سکتے ہو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں "۔

اس کے جانے کے بعد کلیم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا : "بڑا آیا شاہ بہرام کہیں کا۔ جیسے وہ اس کے انتظار میں گلی ہی میں کھڑی ہوگی۔ ہونہہ ! "

اس دن کے بعد ہم میں سے ہر ایک اسی ٹوہ میں رہنے لگا کہ اس لڑکی سے پوری طرح آگاہی حاصل کی جائے۔ گلی کے نکڑ پر ایک پنواڑی کی دوکان تھی جسے ادھر سے گزرتے ہوئے میں سلام کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس پر میں اپنا

اہمیت جتلانے لگا تھا۔ پان کھانے کے بہانے لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر میں اس سے نئی فلم کے پوسٹر پر باتیں کرنے لگتا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی میری ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس گلی کے تقریباً سبھی مکینوں کے نام اور کام معلوم کر لیے۔

ہر بات میں وہ فرزانہ کا ذکر ضرور لے آتا۔ اس کی دونوں کنواری بیٹیوں کو موضوع گفتگو بنا کر اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ یوں الفاظ کو چبا چبا کر ادا کرتا جیسے اس کا بس چلے تو وہ عارفہ اور صادقہ دونوں کو پان کی گلوری بنا کر کلے میں دبا لے۔ اور ساری پیک نگل جائے۔

وہ دونوں ہماری دسترس سے باہر تھیں۔ ان تک پہونچ ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ہم اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ کوئی بہانہ ملے اور ہم فرزانہ کی ہمدردی حاصل کر سکیں۔

پنواڑی نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ جس پر فرزانہ مہربان ہو، محلہ میں کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ چیئرمین کا بھتیجا اشرف اس کے گھر میں بے جھجک آتا رہتا تھا — خواجہ نیاز کی وجہ سے فرزانہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ خواجہ نیاز کپڑے کی ایک مل کا مالک تھا — اونچی کرسیوں تک اس کی پہونچ تھی۔ شہر کے مشہور بدمعاش اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ بیوی فوت ہو چکی تھی۔ ایک ہی لڑکا تھا جو زیادہ وقت کاروں میں گھوم کر گذارنے کا عادی بن چکا تھا۔

ایک شام پنواڑی نے ریڈیو کا بٹن گھماتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے گلی میں داخل ہونے والے ایک ادھیڑ عمر کے.... خوش پوش آدمی کی طرف توجہ دلائی — میں نے اسے غور سے دیکھا..... درمیانہ قد اور دوہرے بدن کا آدمی کندھے اٹھائے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

پنواڑی نے طنز کے ساتھ کہا: "یہ ہے خواجہ نیاز۔ ہمارا دشمن نمبر ایک۔ اس نے فرزانہ کو اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ وہ ہر ایک کی پگڑی اچھال دیتی ہے"

میں نے متعجب ہو کر پوچھا: "فرزانہ میں ایسی کیا خوبی ہے جو خواجہ جیسا مال دار آدمی اس کی محبت کا دم بھرتا ہے؟"

پنواڑی ہنس پڑا: "بابو جی۔ آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ یہ سب عارفہ کے حسن کی کرشمہ سازی ہے۔ فرزانہ لاکھ میک اپ کرے لیکن ایسی مالدار آسامی کو نہیں پھانس سکتی۔ وہ تو عارفہ کی خاطر ہی روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے"

"اور چیئرمین کا بھتیجا؟"

"وہ بھی عارفہ کا شیدائی ہے"

"اور ڈپو والا راجہ حبیب؟"

"سبھی عارفہ پر مرتے ہیں، اور فرزانہ سب کو بیوقوف بنا رہی ہے"

"لیکن مرنے والے کیا رقابت کی آگ میں نہیں جلتے؟"

"کونسا کسی کو بیاہ رچانا ہے۔ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے.... جب تک ہوا میں خوشبو رچی ہے۔ سبھی گہرے سانس بھر کر مست ہو رہے ہیں..... جب کبھی بدبو پیدا ہوئی، سبھی کہیں دوسرا ٹھکانہ تلاش کر لیں گے"

"تو کیا فرزانہ ساری عمر لڑکیوں کو گھر پر بٹھائے رکھے گی؟"

"ابھی تو وہ اس مسئلہ پر غور کرنا بھی گوارا نہیں کرسکتی "

میں تو بالکل نا امید ہوگیا تھا۔ پنواڑی سے جو معلومات حاصل ہوتیں، میں دوسرے ساتھیوں کو بتا دیتا تھا۔ ان بڑے لوگوں کے سامنے ہماری بساط ہی کیا تھی ۔ لیکن عشق کا بھوت بڑا بے رحم ہوتا ہے ۔ جتنی زیادہ حالت بگڑتی جائے، اتنا ہی اُسے ستانے میں مزا آتا ہے۔

ہم میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت شریف کی تھی ۔ دوسروں نے تو ابھی تک اپنے جذبات کو رسوائی سے بچانے کی خاطر بے قابو نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن شریف بے بس ہوگیا تھا۔ رات کو کئی بار آنکھ کھلنے پر میں اُسے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پاتا... وہ عجیب عجیب حرکات کرتا۔ تکیہ کو بغل میں دبا کر انگریزی فلموں کے رومان پرور منظر کی مانند تکیہ پر رخسار رگڑ کر گہرے سانس بھرتا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب وہ کسی دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

ایک دن دفتر سے واپس آیا تو گلی میں کیلی آوازوں کا پتھراؤ ہو رہا تھا—— پنواڑی نے کہا بھی تھا کہ : فرزانہ آپے سے باہر ہوگئی ہے ۔ وہ ٹھیکیدار کی بیوی پر تابڑ توڑ حملے کر رہی ہے ۔ مجھے فضا کے پُرسکون ہوجانے کا انتظار کرنا چاہئے—— مگر میں غیر شعوری طور پر بڑھتا گیا۔

شریف کمرے میں آچکا تھا۔

دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ تو وہ کھڑکی کی سلاخوں پر رخسار رکھے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خاموش رہنے کا اشارا کیا۔

میں بھی اس کے پاس ہی کھڑا ہوگیا۔

اُس نے سرگوشی کی : بڑی جی دار عورت ہے۔ تین عورتیں اس کے مقابلے پر اتری تھیں ۔ دو کی تو اُس نے خوب دُرگت بنائی، اور تیسری بھاگ گئی ۔ اس کی گالیوں میں بھی نیا پن ہے "

واقعی میں نے ایسی نئی گالیاں ایک عورت کی زبان سے پہلے نہ سُنی تھیں۔ شام کے بعد تک وہ اونچی بلند آواز میں ٹھیکیدار کے گھر والوں کو کوستی رہی تھی ۔

ہم بہت دیر کے بعد کھانے کے لئے باہر نکلے ۔ پنواڑی نے بتایا کہ جنگ ابھی اور پھیلے گی ۔

تین دن تک یہ محاذ گرم رہا۔

ٹھیکیدار کے گھر والوں کی حمایت میں دو تین گھر اور میدان میں آگئے۔ لیکن فرزانہ اکیلی ہی سب کا مقابلہ کرتی رہی۔ عارفہ اور صادقہ صرف دروازے پر کھڑی رہتی تھیں ۔ اور ہمیں جی بھر کر نظروں کے جال پھینکنے کا موقع مل گیا تھا ۔

کوئی ایک ہفتہ بعد ڈپو والے کی بیوی سے فرزانہ الجھ پڑی۔

چیرمین اسے دھمکانے آیا، تو اس نے اسے بھی دھتکار دیا۔

ڈپو والے کا مکان ہمارے کمرے سے دائیں طرف تھا۔ اس لئے فرزانہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا....

بہت دیر تک وہ ہمارے کمرے کے سامنے کھڑی متکبرانہ لہجے میں ان لوگوں کو کوسنے دیتی رہی تھی ..... میک اپ کی بدولت اس میں اب بھی خاصی جاذبیت تھی...... چست ریشمی لباس میں وہ عارفہ کی جوانی کا مقابلہ کر رہی تھی ...... اتنا خوبصورت حسن

افکار

آخر میرنا

ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا...... ہم سب زیادہ محتاط ہوگئے تھے ......اس سے کسی سطح پر بھی مقابلہ ہمارے بس کی بات نہ تھی ..... ہم تو اس کی ایک گالی بھی برداشت کرنے کے قابل نہ تھے ...... شبہ پڑنے پر وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے نکلوا سکتی تھی۔

چودھری ہم میں سب سے زیادہ بزدل تھا۔ وہ اسی وقت کمرہ تبدیل کرنے پر مصر تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے اس بات پر رضامند کرلیا تھا کہ صبح نئے مکان کی تلاش شروع کردی جائے گی۔

اگلے دن دفتر جاتے وقت ہم میں سے کسی نے بھی نظر اٹھانے اور ادھر اُدھر گھمانے کی جرأت نہ کی تھی۔ پنواڑی کے پاس بھی ہم نہ ٹھہرے۔

شام کو واپس آکر ابھی ہوٹل جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ صادقہ دروازے پر آگئی —— عمر تو اس کی بارہ تیرہ سال ہوگی، لیکن چست قمیص اور بناؤ سنگار کی بدولت وہ ہر لحاظ سے بالغ نظر آرہی تھی۔ اس نے نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ سب کی طرف باری باری دیکھا——

اور ہم بُت بن کر رہ گئے!

مسکراہٹوں کا کوئی تبادلہ نہ ہوسکا۔

ہمارے حلق خشک ہوگئے!!

میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے۔

صادقہ نے شیریں لہجے میں کہا "ہمارا ریڈیو خراب ہوگیا ہے۔ باجی نے فرمائش سننی ہے۔ آپ رات کے لئے ہمیں اپنا ریڈیو دے سکتے ہیں؟"

شریف نے گہرا سانس بھرا۔

میں زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹرانسسٹر چودھری کا تھا۔ وہ گھر سے اس کی بٹون ٹھیک کرانے کے لئے لایا تھا۔ اور تنخواہ ملنے پر اس کا پروگرام گھر جانے کا تھا۔

چودھری ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ شریف نے ٹرانسسٹر کی بیرونی سطح پر رومال پھیر کر کہا: "جب تک تمہارا ریڈیو درست نہ ہو، یہ ٹرانسسٹر پاس ہی رکھنا۔ ہمیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

کلیم نے ٹرانسسٹر اُٹھا لیا۔ اور دروازے کے پاس جھک کر تشنہ لہجے میں کہا: "آپ لوگ ہم سے تو نہ جھگڑیں گے۔ ہم پردیسی تو پیار کے بھوکے ہیں۔"

میرا خیال تھا، صادقہ کی مسکراہٹ میں تلخی پیدا ہوجائے گی۔ لیکن اس میں تو اور بھی زیادہ نکھار پیدا ہوگیا تھا۔ اس نے لجا کر کہا: "آپ سے بھلا کون لڑسکتا ہے۔"

ٹرانسسٹر پکڑ کر وہ گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

اور شریف نے کلیم کی گردن دبوچ لی "تم کون ہوتے ہو پہل کرنے والے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔"

کلیم نے جھٹکے سے گردن چھڑا کر درشت لہجے میں کہا : "ہوش کی دوا لو شریف ! کہیں ایسا نہ ہو تمہیں تمہاری بتیسی باہر نکالنی پڑے"

چودھری درمیان میں آ گیا : "مال ہمارا گیا، اور گرم تم ہو رہے ہو"

میں بھی خاموش نہ رہ سکا : "شریف ! اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو ہم تمہارا سامان گلی میں پھینک دیں گے ..... دو گھڑی کا میلہ ہے۔ کونسا ہم نے ساری عمر یہیں بیٹھ رہنا ہے"

شریف نے چبھتی ہوئی نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ اور بے بس ہو کر بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔

اب ہم میں جرأت پرواز پیدا ہو رہی تھی۔ پہلا سا خوف نہ رہا تھا۔

تیسرے دن صادقہ پھر آئی، اور دلربایانہ انداز میں بولی : "کل تک ریڈیو مرمت ہو کر آ جائے گا"

شریف جلدی سے بول پڑا۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ جب ضرورت پڑے گی ہم خود ٹرانسسٹر منگوا لیں گے"

صادقہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا : "شکریہ ! آج ہمیں گھڑی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ صبح آپا کو بہلی کا لج پکڑنی ہے اور ہمارا ٹائم پیس خراب ہو گیا ہے"

گھڑی صرف میرے پاس ہی تھی۔ میں نے بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھا، اور گھڑی اتار کر صادقہ کی ہتھیلی پر رکھ دی، نخریلے انداز سے قدم اٹھاتی جب وہ اپنے دروازے پر پہنچ گئی، تو میں بشیر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا ___ وہ مرجھا سا گیا تھا۔ نہ تو اس کے پاس ٹرانسسٹر تھا اور نہ گھڑی ___ عشق کی دوڑ میں ہم اس سے بہت آگے نکل گئے تھے .....

وہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا ___ وہ اب ہمارے ساتھ باہر نکلنے کو تیار نہ تھا ___ اور ہم اس کی جذباتی بے چارگی کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔

گھڑی کے بغیر مجھے الجھن تو بہت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس خیال سے سینے میں آسودگی کی لہر پھیل جاتی تھی کہ گھڑی عارفہ کی کلائی پر بندھی ہو گی۔

ایسا ہی حال چودھری کا تھا۔ اس کے لئے یہی تصور سرور انگیز تھا کہ عارفہ ٹرانسسٹر کے پاس بیٹھ کر گانے سن رہی ہو گی

ابھی ہمارے تصورات کا رنگ نکھر ہی رہا تھا۔ ہماری خوابوں کی وادیوں میں حسین پھول کھل ہی رہے تھے کہ ایک نیا ہنگامہ پیدا ہو گیا۔

دفتر سے واپسی پر میں پنواڑی کی دوکان کے قریب پہنچا تو اس نے آواز دے کر مجھے اپنی طرف بلا لیا : "بابوجی، اب لطف آئے گا۔ دیکھیں میدان کس کے ہاتھ آتا ہے !"

میں اس کی باتوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔

وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا : "شیریں نے ڈپو والے کے مکان کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے"

"شیریں کون؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ بڑی چھی دار عورت ہے۔ وہ خود نہیں آئی، اُسے لایا گیا ہے۔ اور لانے والا خواجہ ریاض ہے"

میں کچھ نہیں سمجھ سکا"

اُس نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اور مسرورانہ لہجے میں کہا : "خواجہ ریاض کو اپنے باپ خواجہ ضیاء کا فرزانہ کے یہاں آنا جانا اچھا نہ لگتا تھا.... اسے بتایا گیا تھا کہ مل کی زیادہ تر آمدنی فرزانہ کے گھر جا رہی ہے۔ اس نے شیریں پہ ڈورے ڈالے، اور فرزانہ کے مقابلے پر لے آیا ہے۔ اب دیکھنا کیا گل کھلتے ہیں۔"

مجھے ایک دھکا سا لگا۔

پنواڑی ہمدردی جتا رہا تھا، لیکن مجھے اس کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ گلی محلے والوں کے لئے فرزانہ کی موجودگی خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ ہمارے لئے تو اس کا رویہ باعث مسرت تھا۔

میرا ذہن سلگنے لگا ــــــــ اس کی آنچ دوسرے ساتھیوں تک بھی پہونچ گئی ــــــــ ہم دیر تک دفاعی تدابیر سوچتے رہے تھے۔

صبح ابھی بیدار ہی ہوئے تھے کہ گلی میں گالیوں کی بوچھار ہونے لگی..... ہمارے دفتر جانے تک دونوں محاذوں سے گولہ باری شدت سے جاری تھی۔

پنواڑی نے بتایا کہ صادق دودھ والے کی آرہی تھی کہ شیریں نے دھکا دے کر اسے گرا دیا۔ وہ روتی ہوئی گھر پہونچی، تو فرزانہ باہر نکل آئی۔ اُسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس کی گالیوں کا جواب دینے کی کسی میں جرأت پیدا ہو سکے گی۔ شیریں نے جب اس سے وزنی گالی، بھاری پتھر کی مانند اس کے شعور کے چھجے پہ دے ماری تو فرزانہ کا ذہن بھنّا اٹھا تھا۔

"الٰہی خیر!" میری نظر اپنی خالی کلائی پر پڑی اور میں کپکپا اٹھا۔

شام کو بھی محاذ گرم تھا!

فرزانہ کی آواز قدرے بیٹھ چکی تھی، لیکن دم خم وہی تھے۔ وہ گلی میں دندنا رہی تھی۔ اور شیریں اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ مجھے تسلّی ہوئی کہ فرزانہ بازی جیت جائے گی۔ محلّے پر اسی کا رعب چھایا رہے گا۔

ہم دیر تک کمرے میں دبکے رہے تھے.....

ہوٹل سے واپسی پر پنواڑی کی دکان پر ٹھہرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہاں کئی نوجوان کھڑے نئے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ نئی معلومات حاصل کرنے کی خاطر ہم بھی رک گئے۔

ایک نوجوان شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو درست کرتے ہوئے بولا : "مقابلہ سخت ہے۔ آج تو فرزانہ کا پلّہ ہی بھاری رہا۔"

پنواڑی نے تمکنت کے ساتھ کہا : "شیریں اسے ڈھیل دیتی رہی ہے۔ دو چار دن کے بعد تم خود ہی اس کی تعریف کرنے لگو گے۔"

دوسرے نوجوان نے سگرٹ کا لمبا کش لگا کر کہا : اگر فرزانہ ہار گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

"پھر اس کی ساری اکڑ ختم ہو جائے گی۔ کوئی بڑا آدمی اس کے دروازے پر نہ جا سکے گا۔ اور ہم جیسوں کی قسمت جاگ پڑے گی" پنواڑی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

یہ انکشاف ہمارے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ جذبات میں جو تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔ شیریں سے جو نفرت

پیدا ہوئی تھی، وہ مٹ گئی۔

رات کو نہ جانے کیا وقت ہوگا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گلی میں شیریں کی آواز گونج رہی تھی: "نکال اس حرامزادے کو — شریف بہو بیٹیوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جو نجانے لفنگا ہے وہ رات کو یہاں ڈیرہ جما لیتا ہے۔"

میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔

شیریں نے سرکاری نل کے چبوترے سے زور لگا کر ایک اینٹ اکھاڑی، اور پورے زور سے فرزانہ کے دروازے پر دے ماری بھیگی رات کے دامن میں زلزلہ آ گیا۔ دھماکے کی گونج دور تک پھیل گئی۔ بشیرا اور کلیم بھی جاگ پڑے۔ ہم سانس روکے اگلے منظر کے ہیجان پرور کلائمکس کے منتظر تھے۔

شیریں نے دوپٹہ کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ پہلوانوں کی مانند جھوم رہی تھی۔ سرکاری بجلی کی ٹھٹھری ہوئی روشنی میں بھی اس کا حسین چہرہ اور صحت مند جسم مسحور کن ہو رہا تھا۔

فرزانہ نے کھڑکی کھول کر اس کی گالی کا جواب دیا۔

اور شیریں نے ایک اور اینٹ اٹھا لی۔

آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں بھی کھلنے لگی تھیں۔ لوگ جاگ پڑے تھے۔

دوسری اینٹ کا دھماکا بھی لرزہ خیز تھا۔

فرزانہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا۔

شیریں نے بازو لہرا کر "آ — ہا —" کا نعرہ لگایا۔ اور ڈنڈے کا وار اپنی ہتھیلی پر روک کر بڑی پھرتی سے ڈنڈا جھٹکا دے کر چھین لیا۔ ڈنڈا ایک طرف پھینک کر وہ چیتے کی مانند اس پر جھپٹی اور اتنے زور سے اسے دبوچا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ پھر پٹخنی دے کر اسے نیچے گرا لیا۔ اور اسٹنٹ فلم کے ہیرو کی مانند مکے مارنے لگی۔ ٹیپو والے کی بیوی اگر گھر سے نکل کر اسے نہ پکڑتی، تو شاید وہ اسے ختم ہی کر دیتی۔

لوگ گھروں سے نکل آئے۔

میں بھی باہر آ گیا۔

فرزانہ کے نتھنے بری طرح خون آلود تھے۔ چہرے پر نیل کے نشان ابھر آئے تھے۔ وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے عارفہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

شیریں ہمارے دروازے کے سامنے کھڑی پھنکار رہی تھی۔

لوگوں کی آنکھوں میں ٹوٹی ہوئی نیند کے خمار کے ساتھ حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔

کمرے میں واپس آ کر میں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنی کلائی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے میں بے کلی سی محسوس کرنے لگا۔ دوسرے ساتھی بھی خاموش تھے۔ ہم گڈمڈ خیالات کا اظہار کرنے سے قاصر تھے۔

صبح بازار میں بھی رات کا ہنگامہ موضوع بحث بن چکا تھا۔

پنواڑی کے چہرے پر عجیب رونق پیدا ہو گئی تھی۔

اگلی رات کو پھر شیریں نے ہنگامہ برپا کردیا —

فرزانہ کے گھر سے اب کوئی بھی باہر نہ نکلا تھا۔

شیریں اس کا دروازہ پیٹتی رہی۔ خونخوار لہجے میں چلاتی رہی "نکال اپنے خصموں کو مقابلے میں۔ رنڈی نے گلی محلے میں گندگی پھیلا رکھی ہے۔ تیرا جینا حرام نہ کردیا تو شیریں نام نہیں!"

لوگ کھڑکیوں میں سے جھانکتے رہے۔ اور ہم کمرے میں دبکے رہے۔

فرزانہ کو میں نے تیسرے دن اپنے دروازے پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نیل کے نشان اب بھی اُبھرے ہوئے تھے۔ اُس کی بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ اس کی ناک موٹی ہوگئی تھی۔ اور وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں سامنے مکان والی عورت سے کہہ رہی تھی: "شریفوں کے لئے تو سانس لینا دوبھر ہوگیا ہے۔ ایسی چھٹی ہوئی عورت سے کون مقابلہ کرسکتا ہے۔ عزت دار آدمی تو میلی آنکھ سے بھی گھبراتا ہے۔ میں نے نئی آبادی میں مکان کرایہ پر لے لیا ہے۔ عارفہ کی سگائی کی رسم وہیں ادا کروں گی۔ یہاں رہ کر میں اپنی بچیوں کا مستقبل تاریک نہیں بنا سکتی"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آسیب زدہ ماحول میں آگیا ہوں۔

بشیر نے سنا تو اُس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

کلیم دیوار سے ٹیک لگا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔

اور چودھری پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلی کے فرش کو تک رہا تھا۔

پنواڑی کے پاس آئے تو اس کے چہرے کی رونق غائب ہوچکی تھی۔ اس تک نئی خبر پہونچ چکی تھی۔ اُس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "یہ بھی ایک طرح کی دھمکی ہے۔ چیئرمین کا بھتیجا اب یقیناً کھل کر اس کی حمایت پر اُتر آئے گا۔ خواجہ نیاز اسے یہاں سے کبھی نہ جانے دے گا — ڈپو والا، شیریں کے ساتھ اپنی بیوی کو بھی گھر سے نکال دے گا۔ فرزانہ یہ گلی کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ عارفہ کی سگائی کی رسم کبھی ادا نہیں ہوسکتی۔ شیریں ہی کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ ہاں، دیکھ لینا"

اور اگلے دن ہم نے دفتر جانے سے پہلے دیکھا کہ فرزانہ کے گھر کا سامان چھکڑے پر لادا جارہا تھا۔ جب صادقہ ٹرانسسٹر لئے باہر نکلی تو چودھری مسکرانے لگا۔ اور مجھے اپنی وضعداری کے خول میں دراڑیں پڑتی نظر آنے لگیں۔ صادقہ تمکنت کے ساتھ دروازے کے سامنے سے گذر گئی۔ عارفہ بھی بازو ہلاتی گذر گئی۔ اور چودھری کا چہرہ لٹک گیا۔ میں مضطربانہ انداز میں باہر نکلا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پر آگیا۔ صادقہ اور عارفہ تانگہ پر سوار ہورہی تھیں۔ میں پنواڑی کی دکان پر رک گیا، اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی میرا بازو کہنی تک کاٹ کر لے گیا ہو۔ درد کی شدید لہر نے میرے زندگی کے ہر گوشے کو جھنجھوڑ دیا۔ تانگہ آگے بڑھ گیا اور پھر نظروں سے غائب ہوگیا۔

پنواڑی لرزتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا: "یہ سب کچھ خلافِ توقع ہوا ہے۔ فرزانہ ہار ماننے والی عورت نہ تھی — سیاہ بختی میں کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا — اور پھر، بابوجی! سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علاقہ میں ایک ہی بدمعاش کا سکہ چل سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ دو بدمعاش ایک ہی وقت میں دندناتے پھریں۔ ایک کو تو بوریا بستر گول کرنا ہی پڑتا ہے"

سیدہ حنا

یادش بخیر

یوں تو دنیا میں ہزار قسم کے لوگ ہوتے ہیں طرحدار لوگ، بیزار لوگ، خوش باش لوگ، نظرباز لوگ، چالباز لوگ، لیکن مشکل یہ ہے کہ طرحدار لوگ، لوگوں کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے، بیزار لوگوں کے پاس، لوگ نہیں پھٹکتے۔ خوش باش لوگ زندگی کے سنجیدہ مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے، نظرباز لوگوں کے ساتھ رہنے میں ہر گھڑی جوتی پا پوش کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور چالباز لوگ بڑے بڑے عقل مندوں کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ جیسے لوگوں کی دال اگر گلتی ہے یا گل سکتی ہے تو غمگین لوگوں میں۔ جو بے چارے بڑے ہی بے ضرر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور جتنی جلدی خود لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اتنی ہی آسانی سے نقب زنی کے لیے اپنا دل دوسروں کو پیش کر دیتے ہیں۔ ذرا غمگین صورت بنا کر پاس جا بیٹھئے اور پھر مزے سے دل چھوڑ روح کی گہرائیوں میں اتر جائیے۔ بڑی سادگی اور خلوص سے کتابِ زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیں گے۔ اگر آپ کو غمگین صورت بنانی اچھی نہ لگتی ہو تو چارہ ساز بن جائیے، آپ کو اجازت ہے۔ موقع محل دیکھے بغیر ان سے اظہار ہمدردی کر سکتے ہیں، اور دوستی کا آغاز چھوڑ اختتام بھی، میرا مطلب ہے ابتدا سے انتہا تک کے سارے مراحل ذرا سی ہمدردی ظاہر کر کے طے کر سکتے ہیں۔

ان قاضی صاحب کے متعلق ہم میں سے تقریباً ہر ایک نے سنا ہوگا جو شہر کے اندیشے میں دبلے ہو گئے تھے۔ جون پور کے قاضی صاحب کی طرح یہ قاضی صاحب بھی بہت مشہور ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ باوجود علم و ادب کی اس قدر ترقی کے جب کہ من چلے چاند پر کمندیں پھینک رہے ہیں اور سمندروں کو تحقیق کی چھلنی میں چھان رہے ہیں اور پاتال کی خبریں لا رہے ہیں، ان قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی، مولد و منشا اور شجرۂ نسب تک لاعلمی کی تاریکی میں روپوش ہے۔ ہو سکتا ہے اگر ساری دنیا کے نہیں تو کم از کم ہمارے ملک کے یہ غمگین لوگ انہیں بزرگوار کی نسل سے ہوں۔

ایسے لوگ اپنی طرز و ادا سے لاکھوں میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ جب بھی آپ کسی محفل یا مجمع میں کسی صاحب کو سر بہ زانو اس شان سے بیٹھا دیکھیں جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔ ؎

مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے

تو فوراً سمجھ جائیں کہ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کی آپ کو تلاش تھی۔ قریب جائیں، شانہ تھپک کر پاس بیٹھ جائیں، حال احوال

پوچھیں۔ کیوں غمگین ہیں۔ کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟

اس کے جواب میں وہ آپ سے جو کچھ کہیں اس پر ہرگز حیرانی کا اظہار نہ کریں، نہ مسکرانے کی کوشش کریں ورنہ آپ دوبارہ ان کا اعتماد کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ بس بار بار سر ہلایئے۔ چہ چہ چہ کیجئے اور آہیں بھرنے کی کوشش کیجئے، اس طرح آپ کے پھیپھڑوں کی بھی کافی ورزش ہو جائے گی، گردن کے عضلات بھی مضبوط ہوں گے۔ زبان کی دھار بھی تیز ہوگی اور اتنا میٹر بھی مل جائے گا جس پر آپ دنوں، ہفتوں بلکہ ساری عمر ہنس سکتے ہیں (ان کے سامنے نہیں)

ہاں تو صاحب ایک محترمہ ہیں، یادش بخیر، کہنا چاہیں تو بہت محتاط طور پر انہیں ہماری دوست کہہ لیجئے۔ اگرچہ ہمارے درمیان خدانخواستہ اس قسم کا کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ ہم ہیں ہنسوڑ اور وہ ہیں مقطع۔ ظاہر ہے ہمارا اُن کا میل نہیں ہو سکتا۔ بس کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ہم ایک دفعہ ان کے مہمان ہو گئے۔ گھر والوں سے بہنی خوشی مل کر جب ان سے نیاز حاصل کیا تو اُن کی صورت پر برستی ہوئی یتیمی دیکھ کر سچ مچ ہمارے دل کو دھکا سا لگا۔ سوچا: ہو نہ ہو بے چاری دنیا میں بالکل یکہ و تنہا ہیں۔ والدین، بھائی بہن سب فوت ہو چکے ہیں۔

ڈر کے مارے اور کچھ نہ پوچھ سکے، بس رسمی مزاج پرسی ذرا گرمجوشی سے کر لی۔

وہ ہم کو ہمدرد پا کر جھٹ اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئیں، بیمار ہیں، پریشان ہیں، بڑا غم یہ ہے کہ ان کی بیماری سے گھر والے پریشان ہیں اور یہ گھر والوں کی پریشانی سے غمگین ہیں۔

ہم نے کہا۔ اس کا علاج تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جلدی سے تندرست ہو جایئے۔ اس طرح گھر والوں کی پریشانی اور آپ کا غم بیک وقت دور ہو جائے گا۔

فرمایا: غم تو یہی ہے کہ ہم تندرست ہونا نہیں چاہتے۔

خدا خیر کرے وہ کیوں؟

بس ہم مرنا چاہتے ہیں — آنکھوں کی ویرانیاں بڑھ گئیں۔

خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔ بھلا آپ کی یہ عمر ایسی باتیں سوچنے کی ہے۔

وہ خیریت سے شعر و شاعری سے بھی ذوق رکھتی تھیں، برجستہ فرمایا ؎

موت اور صرف نزع کی تکلیف
زندگی اور ہزار تکلیفیں

ہم نے دل ہی دل میں شاعر کو کوسا، کم بخت نہ یہ شعر کہتا نہ یہ محترمہ بھری جوانی میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتیں۔ ان سے ہم نے کہا، یہ شاعر تو یونہی بے پر کی اُڑایا کرتے ہیں۔ وہ شعر بھی تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ ؎

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

بولیں، وہ بعد کی بات ہے بعد میں دیکھی جائے گی، فی الحال تو ان غموں سے چھٹکارا مل جائے گا۔

"مگر وہ غم کیا ہیں۔ یہ بھی تو پتہ چلے۔

بولیں، دیکھئے اب یہی غم کیا کم ہے کہ ابا ریٹائر ہونے والے ہیں۔

دل کی بات اپنے آپ سے بھی کہتے شرم آئے۔ محبت کے جذبے کو ایک قیمتی موتی کی طرح دل کی سیپ میں بند کرکے روح کے ساگر کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپا دیا جائے۔ کہاں یوں برسرِ عام فخریہ عشق کے کارنامے بیان ہوں۔

بکھرے ہوئے حواس مجتمع کرکے پوچھا:

"کون ہے وہ خوش نصیب؟" (اگرچہ بدنصیب کہنا چاہئے تھا)

وہ پرکٹے پرندے کی طرح بستر پر گر گئیں، اور تکیہ سینے کے ساتھ بھینچ کر آنکھیں بند کرکے ایک انداز سے فرمایا: "وہ ہماری کزن ہیں نا۔ مہ لقا۔ بس ہمیں ان سے محبت ہوگئی ہے۔"

ہمیں یوں لگا جیسے ہم عصمت کے کسی کردار سے شرفِ نیاز حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تو واقعی بڑی مشکل ہوگئی۔ اس محبت کی قسمت میں بھلا خوشی کہاں — نام سننے سے پہلے ہم نے سوچا تھا کچھ کوشش کریں گے اس بے وفا کو راہِ راست پر لانے کی تاکہ وہ ہماری محترمہ کی خوشیاں ان کو لوٹا دے۔ لیکن اس مرحلے پر تو نہ بھاگا جائے تھا ہم سے نہ ٹھہرا جائے تھا ہم سے۔ ہمیں رازدار بنا کے تو وہ اس طرح کھل کھیلیں کہ ہم ؎

ان کی باتوں کو سُن کے ڈرتے تھے
الحفیظ الحفیظ کرتے تھے

ساری رات نہ خود سوئیں نہ ہمیں سونے دیا۔ گرمی کی اس چاندنی رات میں ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کے درمیان وہ اشعار کے تیر اپنی محبت کی کہانی سناتی رہیں۔ ہم ہوں ہاں نہ کرتے تو روٹھ جاتیں:

"دیکھئے آپ دلچسپی نہیں لے رہیں۔ یہی تو ہمیں غم ہے کہ ہماری باتیں کوئی توجہ سے نہیں سنتا۔"

چار و ناچار دلچسپی کا اظہار کرنا پڑتا۔ حالانکہ نیند کے مارے بُرا حال تھا۔ جماہیوں پر جماہیاں آرہی تھیں، مگر صاحب آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کے ڈر سے جاگتے رہے۔

مہ لقا کو دیکھا تو برعکس نہند نام زنگی کافور والی مثل یاد آئی۔ خدا معلوم ہماری محترمہ نے کون سے عالم میں حسنِ دوست دیکھا تھا کہ اپنی ہر خوشی ہار بیٹھی تھیں۔ مزاج تھا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک بات پر سو سو جواب دے ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ غرض محبوبوں والی کوئی بات ہمیں تو ان میں نظر آئی نہیں۔ تمام وقت محترمہ کے ذوقِ نظر کو کوستے رہے۔ یہ عقدہ تو اب کہیں برسوں کے بعد جاکر کھلا کہ وہ عشق بھی ان کی غم پسند طبیعت کا ایک بہانہ تھا۔ اب کسی کو ناکامیاں اور محرومیاں ہی پسند ہوں تو کیا کیا جائے۔ سنا ہے کچھ عرصہ بعد مہ لقا کی شادی ہوگئی اور اس طرح ان کے غموں میں ایک غم کا اور اضافہ ہوگیا۔

ایک دفعہ پھر شومئی قسمت سے ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ گھر گئے تو پتہ چلا کہ گوشہ نشین ہوگئی ہیں۔ کھانا پینا برائے نام رہ گیا ہے ہنسنا تو خیر اُن کی عادت ہی نہ تھی، اب بولتی بہت کم ہیں — کئی جگہ سے رشتے آئے مگر انکار کر دیا۔ بس ہر وقت گم سم بیٹھی آہیں بھرتی رہتی ہیں۔

ہمارا تو خیال تھا کہ بغیر ملے ہی لوٹ جائیں۔ لیکن ایسا کر نہ سکے۔

ڈرتے ڈرتے بالاخانے پر قدم رکھا۔ دیکھا کہ پھولوں کے گملوں کے قریب ننگے پیر اکڑوں بیٹھی ہیں۔ سر زانو پر دھرا ہے بال پریشان ہیں، کم بخت گملوں پر بھی خزاں آئی ہوئی تھی۔ چند سوکھی جلی ٹہنیاں اور چند سوکھے سڑے پھول، زینتِ چمن تھے جو خزاں کا پتہ دیتے تھے

تاثر دے رہے تھے۔

چاپ سُن کر سر اٹھایا، بڑے افسردہ انداز میں پذیرائی کی۔

پوچھا: "کیا حال ہے؟ آپ تو بڑی اُداس نظر آرہی ہیں"

بولیں: کیا بتائیں اپنی قسمت میں غم کرنا ہی لکھا ہے۔ موت آئے تو غموں سے چھوٹیں۔

پھر وہی کہنا پڑا: خدا نہ کرے۔ مریں آپ کے دشمن۔

بولیں: نانا کا انتقال ہوگیا ہے — نانا کے ایک دور کے رشتے دار کا انتقال ہوگیا ہے۔ چچی مرگئیں، ممانی کے دو بچے جاتے رہے۔ اب ہم جی کے کیا کریں گے۔

اب ہم نے لاکھ سمجھایا کہ نانا اور ان کے دور کے رشتے دار اپنی عمرِ طبعی کو پہونچ کر فوت ہوئے کہ

موت سے کس کو رستگاری ہے

آپ کی والدہ بیٹی ہوکر صابر و شاکر، خوش و تندرست ہیں، تو آپ نواسی ہوکر اتنا غم کیوں کریں۔ چچی مرگئیں تو چچا نے دوسرا گھر بسالیا۔ بچوں کا غم ممانی کو کرنے دیں۔

کہنے لگیں: آپ سمجھتی نہیں ہیں تو آپ کو کیسے سمجھاؤں، دیکھئے مہنگائی کتنی زیادہ ہوگئی ہے۔

چھوٹے بھائی نے کہا — باجی میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ شاعری شروع کردیں۔ ایک طرف یہ غم کے اظہار کا اچھا ذریعہ ہے، دوسری طرف — آپ مہنگائی وغیرہ پر اس کے ذریعہ تنقید بھی کرسکتی ہیں۔

کہنے لگیں: ہاں ہم نے دو چار غزلیں کہی تو ہیں۔

ایک شریر — بولا: ہاں میں نے آپ کی ایک غزل پڑھی تھی، دیوانِ غالب میں چھپی تھی نا۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بات اتنی برجستہ اور حسبِ حال تھی کہ ہمیں بے ساختہ ہنسی آگئی۔ جس کے نتیجے میں ان کے گھر کے دروازے ہم پر ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے۔ اس لئے پڑھنے والوں کے لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ غمگین لوگوں سے ملتے وقت ذرا ہنسنے ہنسانے پر خاص پابندی رکھیں۔

اعتبار ساجد

موٹل

اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے سوٹ کا جائزہ لیا، اور دو روپے چار آنے کی ٹائی کی گرہ کچھ یوں کالروں کے مرکز میں جمائی کہ بے ساختہ اسے کھانسی آگئی۔ اپنی چال میں لقے کبوتر کی تمکنت پیدا کرنے کی کوشش میں اس نے آگے بڑھ کر پلائی وڈ کا دروازہ کھولنا چاہا کہ اسپرنگ دار دروازہ تیزی سے کھلا اور وہ قلابازی کھا جانے والے انداز میں غڑاپ سے اندر ـــــ

اندر تو دنیا ہی نرالی تھی۔ بلائنڈ ونڈو گلاس کے پیچھے روشنی کے سرمئی دھبے کانپ رہے تھے اور پھندوں پہنے ہوئے نیلے پھول آکٹوپس کے بازوؤں کی طرح دور دور لہراتے نظر آرہے تھے۔ عجب نیم تاریک سا سرمئی رنگ کا خواب آمیز منظر تھا۔ خوب صورت میزوں کے جزیرے پورے ہال میں پھیلے ہوئے تھے، اور بھنبھناتی ہوئی سرگوشیاں اور مہذب قہقہے سگرٹ کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ رنگ برنگی ساریاں، اودے نیلے سوٹ اور چست فراکوں نے ہال کی سرخ آرام دہ کرسیوں کو گلدستوں کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔ وہ میزوں کے جزیروں کے درمیان یوں چل رہا تھا گویا ایک نادیدہ زنجیر ہے، جو اُسے گھسیٹے لیے جا رہی ہے۔

کئی چہرے اُس کی طرف گھومے، کئی آنکھوں نے اُسے دیکھا۔

وہ کچھ محجوب سا ہو گیا۔

"اے نیو پریزنر ـــ!" اُڑتا ہوا سا ایک جملہ اُس کے کانوں سے ٹکرا گیا۔

"ایکروبیٹک فرام لومیا ـــ" ایک نسوانی قہقہے نے کہا۔

"ہیئر کمز اے نیو پریزنر ـــ" پانچویں میز پر بیٹھے ہوئے ایک اسمارٹ نوجوان نے سگریٹ سلگایا۔

وہ جھینپ مٹانے کے لئے ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔

اُجلی براق وردی میں ملبوس ایک بیرے نے لپک کر اُسے آگاہ کیا:

"ریزرو ـــ"

وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

کئی دبے دبے قہقہے جھنجھنائے۔ کئی حسین چہرے اس کی طرف گھومے۔

"اِف یو وانٹ ٹو سِٹ ـــ" بیرے نے بڑی رواں انگریزی میں کہا: "دس وے ـــ"

اس نے بیرے کو فالو کیا۔

ایک تنہا میز اسے مل گئی۔ یہیں اس نے بیرے کو چائے لانے کو کہا۔ بیرا چپ چاپ چلا گیا۔

اس نے جیب سے تازہ خریدا ہوا کیپسٹن کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے:

"تیز سے سگریٹ پیو۔ یہ اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریسٹوران ہے۔"

وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی۔ یہ اندرونی آوازیں بڑی پریشان کن ہوتی ہیں۔ اس کے اندر جانے کتنے آدمی چھپے بیٹھے تھے۔

ایک آدمی نے کہا تھا: "بشیر الدین! زندگی فائلوں کی ورق گردانی کا نام نہیں ہے۔ ان فائلوں کے انبار سے باہر جھانک کر دیکھو۔ زندگی بڑی خوبصورت بڑی وسیع ہے۔ یہاں پھول ہیں اور گیت ہیں اور قہقہے ہیں اور اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریسٹوران ہے۔ تم نے ہوٹل بہت دیکھے ہوں گے۔ اب ذرا موٹل بھی دیکھ لو۔"

اور اب وہ موٹل دیکھنے آیا تھا ـــ

لیکن یہ موٹل کہاں تھا۔ موٹل بھلا ایسا کیوں ہونے لگا۔ یہ تو ہوٹل ہے پورا ـــ البتہ اس ہوٹل کے ساتھ اسٹینڈرڈ کے دُم چھلّے نے اُسے ایک طبقے کے لئے مخصوص کر کے رکھ دیا تھا۔ اسٹینڈرڈ ـــ کیا پیارا لفظ ہے جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اور شیر دھاڑ رہے ہوں کیسی رعونت ہے اس لفظ میں۔ کیسی بُو ہے اس لفظ میں جیسے گوشت جل رہا ہو یا کارخانے کی چمنی دھواں اُگل رہی ہو۔ دھواں جس میں اس مزدور کے پسینے کی بو شامل ہے جسے دو ماہ سے تنخواہ نہیں ملی۔

"چل کر دیکھنا تو چاہئے۔" اُس کے اندر کے دوسرے آدمی نے ترغیب دی تھی: "دیکھنا تو چاہئے کہ یہ موٹل کیا ہوتا ہے اور جب موٹل اسٹینڈرڈ کے ساتھ چپک جائے تو مناظر کی ہیئت کیا ہوتی ہے؟"

یہ خواہش اس وقت اُبھری تھی جب اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریسٹوران کا افتتاح ہوا تھا، اور وہ فائلوں کی دنیا میں سر جھکائے ہندسوں سے کھیل رہا تھا۔ اس خواہش کو اس نے بڑی بے دردی سے کچلا تھا۔ کرم خوردہ فائل کے اوراق میں اس خواہش کو دفنا کر جب وہ دفتر سے باہر نکلا تو ایک متمول دوست مل گیا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹل کی افتتاحی تقریب کا کارڈ تھا۔ فائلوں میں دفنائی ہوئی خواہش آدھ موئے بچھو کی طرح پھر اس کے ذہن میں رینگنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے متمول دوست کے ہاتھ سے کارڈ چھین کر اسٹینڈرڈ موٹل کی طرف لپک جائے۔

لیکن پھر جب اُس نے جھرجھری سے کر اپنی آنکھیں ملیں تو حقائق کی طرف لوٹ آیا۔ آسمان بہت دور تھا اور زمین سخت تھی اور اس کی تنخواہ صرف ایک سو دس روپے تھی۔ ان ایک سو دس روپوں کا کو نالہ آدمیوں کے کنبے کا ذکر نہیں چل سکتا تھا۔ ان ایک سو دس روپوں سے تو کفن کا معقول لٹھا بھی نہیں مل سکتا تھا۔ پھر میاں بشیر الدین تم جونیئر کلرک ہو کر اسٹینڈرڈ کی باتیں کیوں سوچتے ہو۔ اس سے پہلے آپ کو سیکڑوں گالیاں دی تھیں، اور خوا مخواہ سے غریب ہوٹل میں گھس گیا تھا، جہاں چائے شیشے کے چھوٹے گلاس میں ملتی ہے [illegible]

پر رکھا ہوا گراموفون ایسے گیت اتنے تیز سُروں میں بجاتا ہے کہ ارد گرد کھڑے لوگ اپنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں۔

یہ ہوٹل اس کا تھا۔ اور اس جیسے ان سیکڑوں کلرکوں کا جو پیٹ بھرنے کے لئے سویٹ ڈش اور بڑا فروٹ نہیں مانگتے۔ تنور کی روٹی اور چنے کی دال مانگتے ہیں۔ اور ایک لمبی ڈکار لے کر گندم کا نشہ بڑھانے کے لئے دو آنے گلاس والی چائے منگواتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی یا چنے کی دال ہی ہے یا اُس فائل میں جس کے اوراق جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔

جانے ہوٹل کا خناس کہاں سے اس کے ذہن میں گھس گیا تھا کہ ہو بن کر رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ بعض خواہشیں اتنی شدت سے اپنے وجود کا اعلان کرتی ہیں کہ سارا جسم جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔

ہوٹل کی خواہش نے تو اس کے جسم کو کچی لسی کی طرح بلو کر رکھ دیا تھا۔ ماں دمہ کی مریضہ تھی۔ بہن کا دوپٹہ چیتھڑے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بھائی بغیر فیس کے اسکول جانے پر رضامند نہیں تھا۔ اور کنبے کے نو افراد، نو پیٹ، نو منہ روٹی مانگتے تھے، اور آٹا پینتالیس کی خبر لا رہا تھا کہ ناگہاں ہوٹل اس کے ذہن میں اور رگوں میں خواہش بن کر رینگنے لگا۔ اس نے ذہنی مدافعتی جنگ میں بارہا اس خواہش کی ہڈی پسلی چور کی تھی۔ لیکن خواہش اپنی جگہ برقرار تھی۔

اس خواہش کو ہوا ان خیالات نے دی جو اس کے ذہنی افق پر منڈلا رہے تھے۔ ہوٹل جانے کی ایک دلیل ایک ٹھوس جواز اس کے پاس موجود تھا کہ وہ اس معاشرے کا ایک فرد ہے اور فی الحال خواہشوں پر اس دیس میں انکم ٹیکس لگنا شروع نہیں ہوا۔ وہ بھی اس معاشرہ کا ایک فرد تھا، گو اپنی فائلوں میں محبوس تھا۔ لیکن زندگی کی دمکتی پیشانی چومنے کا حق کس نے چھینا ہے۔ وہ بھی چار پہیوں کی گاڑی کے مالکوں کی طرح اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریستوران جائے گا۔ اور زندگی کی مسکراہٹوں میں سے اپنا حق چھین لائے گا، اور اپنے ساتھی کلرکوں کو بڑے غرور سے بتائے گا کہ زندگی کب مسکراتی ہے اور ہوٹل کسے کہتے ہیں۔

اس خواہش کی تکمیل میں اسے بڑی تگ و دو کرنی پڑی۔ امجد صاحب مہربان آدمی نہ ہوتے تو ان کا سوٹ کیسے ملتا۔ اور پہلی تاریخ نہ آتی تو وہ ہوٹل کیسے پہونچتا۔ امجد صاحب بڑے شریف آدمی تھے، انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر چپکے سے سوٹ لا کر اُسے دے دیا تھا۔ البتہ جب وہ چلنے لگا تو یہ ضرور کہا تھا:

"خیال رکھئے گا۔ میں نے اسے کل ہی ڈرائی کلین کروایا ہے۔"

ٹائی البتہ وہ دینا بھول گئے۔ اُس نے اتنی معمولی سی چیز مانگنا مناسب بھی نہ سمجھا، اور چپکے سے دو روپے چار آنے کی ایک سیکنڈ ہینڈ ٹائی خرید لی۔ ایک سو سات روپے بارہ آنے اس کی جیب میں تھے اور وہ گھر جانے کے بجائے ایک دوست کے ہاں سوٹ بدل کر ہوٹل پہونچنا چاہتا تھا۔

یہ پہلی تاریخ تھی — اور مہینے کی یہی تاریخ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاتی تھی۔ چنانچہ جب وہ اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریسٹوران میں پہونچا تو مسکرا رہا تھا۔

چائے اب تک نہیں آئی تھی۔ حالانکہ پینتالیس منٹ پہلے اُس نے بیرے کو چائے لانے کو کہا تھا۔ ساتواں سگریٹ اُس کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا۔ منہ کا ذائقہ بری طرح بگڑ گیا تھا، اور اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ وقت گذاری کے لئے چہروں یا پردوں کا جائزہ لے سکے۔

اُسے احساس تھا کہ لوگ اسے استہزائیہ انداز میں گھور رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بیرا اُس کے قریب سے کئی مرتبہ گذرا تھا لیکن اُسے

پکارنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے اُسے یوں لگا جیسے وہ لکڑی کی ڈمی کا روپ دھارتا جارہا ہے۔ اور اُس کی جھکی ہوئی گردن میں درد ہونے لگا ہے۔

بارے خدا خدا کرکے بیرا چائے لایا۔ پیسٹری اسٹینڈ اس کے سامنے سجا کر چائے کی ٹرے رکھتے ہی بیرا اُلٹے پیروں لوٹ گیا۔ چائے بنانے کے لئے اُس نے کپ سیدھا ہی کیا تھا کہ وہ اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے پھسل کر چھن سے فرش پر گرا، اور کئی حصوں میں تقسیم ہوکر دور تک بکھر گیا۔ اس کے سارے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ لوگوں کے قہقہے اور سرگوشیاں اسے اپنے جسم میں جونکوں کی طرح دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس ڈر سے اس نے بیرے کو بلاکر نیا کپ لانے سے احتراز کیا کہ شاید اسے ایٹی کیٹ سے بالکل عاری نہ سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ وہ منہ کا مادھو بنا لرزتی انگلیوں سے پیسٹریاں کھانے لگا۔ دس منٹ بعد بیرا دوسرا کپ لایا۔ وہ ساتویں پیسٹری کھارہا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے چائے بنائی اور زہر کے پیالے کی طرح اپنے حلق میں انڈیلنے لگا۔ چائے تیز گرم نہیں تھی۔ چنانچہ جتنے ساتویں سپ میں ختم ہوگئی۔ وہ بل کے لئے بیرے کا انتظار کرنے لگا۔ اس قدر کوفت، گھبراہٹ اور پریشانی آج تک اسے لاحق نہیں ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد اس گھٹے گھٹے سے، سرد، سپاٹ اور بے جان ماحول سے نکل جانا چاہتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد بل آیا۔ تیرہ روپے دس آنے: اس میں کپ کی قیمت بھی شامل تھی۔ لرزتی کانپتی انگلیوں سے اُس نے بیس روپے جیب سے نکالے اور ٹرے میں پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ لوگوں کی نظروں کی پرواکئے بغیر بیرے کے ساتھ ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

جب بیرے نے بقایا رقم اسے کاؤنٹر کے قریب ہی لوٹائی تو اس نے ایک اٹھنی بیرے کی ہتھیلی پر رکھ دی، اور تیزی سے ہوٹل کے بیک ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ چھن سے اٹھنی اُس کے بوٹ سے آکر ٹکرائی۔ پلائی وڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے اُس نے گھوم کر دیکھا بپھرا ہوا بیرا کہہ رہا تھا:

"مسٹر ممبر الگیس، دس از اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریسٹورین ۔۔۔!"

باہر نکل کر وہ تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس کی ٹائی سینے سے اُلٹ کر شانوں پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ اور وہ سرخ چہرہ لئے راہگیروں کے ردعمل کی پرواکئے بغیر تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پھر اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریسٹورانٹ دور پیچھے رہ گیا۔ ٹریفک کا غوغا دھیما پڑ گیا۔ پُر رونق بازار تنگ دکانوں اور تاریک گلیوں میں مدغم ہوگیا۔ اور اس کے کانوں میں ریکارڈنگ کی آواز آنے لگی ۔۔۔ بسم اللہ اینڈ غریب ہوٹل گلی کے موڑ پر اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پھلانگ کر غریب ہوٹل میں گھس گیا۔ ایک چرچراتی ہوئی پرانی کرسی پہ ڈھیر ہوتے ہوئے اُس نے زور سے چلاکر کہا:

"چائے لاؤ بے گرم دین۔ خوب کڑک ۔۔۔ جورو دار ۔۔۔ سالے ہوٹل نے تو کباڑا کردیا ۔۔۔!!"

خالدہ شفیع

زمانہ بدل گیا

وسیع گہرے ہریالے لان پر کنیا اور ڈیلیا کے شوخ پھولوں کے اطراف پنکی، شہنہ اور جامی، دیر تک لڑکوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھیں۔ گلہریوں کی طرح درختوں پر چھلانگیں مارتی پھریں۔ کوڑا جمال شاہی کھیلتی رہیں، اور رسیوں کی طرح گلے میں لٹکے ہوئے دوپٹے تک اتار ڈالے، کوڑا بنانے کے لئے۔ پھر کارڈ لی گئی تھی۔ کہ کھیلنے میں گرمی لگتی ہے۔

دادی جان پہلے تو چپکے منہ پھیرے بیٹھی رہیں۔ پھر جب ساری لڑکیاں تھک کر بیٹھ رہیں تو دادی جان یوں گویا ہوئیں "اس عمر کی لڑکیاں گھربار سنبھالتی تھیں —— شہنہ کی عمر میں تو ہماری ساس کو بیٹے کی نسل بڑھانے کی فکر ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیا کیا الم غلم کھلا ڈالا تھا، خمیرے معجون کیسی کیسی کڑوی زہر جنگی پڑیاں۔ ہم نے بھی ایک عدد بیٹا جن دیا انہیں: اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور نازیبا سی بات کہہ ڈالی۔

وہ یہ باتیں تینوں کے سامنے بلا تکلف کہہ رہی تھیں جو اس وقت ریڈیو کی دھن پر باقاعدہ ان کے سامنے جھوم رہی تھیں۔ اور سنتے ہی ایکا ایکی ایک دوسرے سے لپٹ گئیں:

"ہائے اللہ دادی جان توحد کرتی ہیں"

پھر دھم دھم کرتے زاہد، مشکو اور نمی بھی آ گئے۔

ابا میاں حقے کی نے منہ میں دبائے بیٹھے تھے، اور ریڈیو آن تھا۔

اتوار کی شام سارے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں "قصر فضیلت" میں ہی گذارنے آتے تھے۔ پنکی اور جیدی آرکسٹرا کی دھن پر دیدے مٹکا رہے تھے اور جامی کے پیر دھن کے ساتھ ساتھ تھرک رہے تھے۔

دادی جان نے نفرت سے دیکھا اور اذان سے پہلے ہی وضو کے لئے اٹھ گئیں —— دل چاہا اپنا وقت بھی کوئی روشندان کا کانچ ہوتا اور ایک زنانے کی گیند سے چھنا چھن ٹوٹتا۔ اب بھلا دیکھئے تو سہی وہی ابا جان نوعمر پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو یوں ریڈیو کی دھن پر مٹکنے کے لئے چھوڑے بیٹھے ہیں۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈرامے کی ہیروئن چلا چلا کر کہہ رہی تھی "شہاب —— شہاب! تم نہ جانے کہاں چلے گئے —— مجھے تم سے محبت ہے —— میرے شہاب —— میری دنیا!" —— ادھر ابا میاں کھسیا کر جانے کچھ کہتے

یا ریڈیو بند کیے بغیر لیٹ گئے، اور آنکھیں بند کر لیں ـــــ کبوتر جب سر پر خطرہ منڈلاتے دیکھتا ہے تو آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ بچاؤ کا یہ طریقہ کس قدر بزدلانہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری عمر یہی کوئی چار سال کی ہوگی جب میں لہک لہک کر گا رہی تھی: "مورا بالم بے دردی ــ مورا بالم" کہ زبردست دھماکہ ہوا۔

جب میرے ہوش بجا ہوئے تو آواز آئی: "لڑکیاں گانا نہیں گایا کرتیں"۔

میری آواز یوں بند ہو گئی تھی، جیسے فیوز اڑ گیا ہو۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ چھٹی ساتویں جماعت میں جب لڑکیاں اپنی کاپیوں کے آخری صفحوں پر دھڑا دھڑ گانے لکھتیں اور اپنی سہیلیوں کو انتہائی محبت بھرے خط لکھتیں تو ایک دن زیب آپا نے ایسی خبر لی کہ میری رگ رگ میں پھلجڑیاں چھوٹ گئیں: "کم بختو! ابھی سے ولولے اٹھتے ہیں ـــــ شرم نہیں آتی گانے لکھتے ـــــ ایسے خط لکھے جاتے ہیں سہیلی کو جیسے میاں کو لکھے جائیں، ابھی سے اتنے ارمان ہیں! بدبختوں کی شادیاں کر دی جائیں"۔

زیب آپا، زندہ باد!

لیکن زیب آپا، اب تو اسکول کی لڑکیاں سہیلیوں کو کیا، اپنی اُستانیوں کو بے دھڑک ایسے ہی محبت بھرے خط لکھتی ہیں اور وہ بجائے ڈانٹنے کے خود شرما جاتی ہیں اور مزید عشوہ و انداز پہ اُتر آتی ہیں۔

ریڈیو بدستور آن تھا۔ ہیروئن اب رو رہی تھی، سسکیاں بھر رہی تھی ـــــ "میرے شہاب! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!"

جاوی اور ممی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"ہائے اللہ ابا جان ان سے بھی تو ذرا کہیئے ـــــ نالائقو ـــــ یہی سننے کو رہ گیا تھا ـــــ چلو بھاگو ـــــ سو جاؤ ـــــ مگر وہ بدستور لیٹے آنکھیں بند کئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

شہنہ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی "ایک نوجوان لڑکی کی ڈائری"۔

پنی کی پسندیدہ ایکٹریس ان دنوں شرلے میکلم تھی اور وہ اس کی فلمیں دیکھتی تھی۔

زاہد کو مارلن برانڈو سے عقیدت تھی۔

اور منی بجائے "کریما بہ بخشائے بر حال ما" کے کامکس سے شوق فرماتی تھیں۔

ہم نے اس عمر میں ایک بار "قراقرم کی حسینہ" اور "محبت کی قسم" ناولیں پڑھنے کی کوشش کی تھی تو بُری طرح پکڑے گئے تھے۔ اس کے بدلے دوسری کتابیں دی گئیں جیسے منازل السائرہ، خاتون مشرق، حیادار بیوی ـــــ اور آپا کو "بہشتی زیور" بھی۔

یہ بزرگوں کو کبھی کبھی نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ اب بھلا ناولیں کچھ زیادہ ایسی ویسی بھی نہ تھیں۔ بس یہی ہیروئن کا شرمانا اور ہیرو کی چھیڑ چھاڑ۔

"بہشتی زیور" نہ صرف آپا نے بلکہ ہم نے بھی بار بار پڑھا ـــــ توبہ اللہ ـــــ ابا میاں کو اس عمر میں نہ جانے کیا سوجھ گئی

تھی — کیا کچھ نہ لکھا تھا — کان کی لویں تک سرخ ہوگئیں — وہ اماں اور دادی خود ہی ہم سے دو قدم آگے ہیں — بہرحال کچھ پتے پڑا کچھ نہ پڑا — خواہ مخواہ کچے ذہن میں ایسے ویسے پکے مسئلے — ہمیں بزرگوں کی یہ بات پسند نہ آئی - اسی لئے پرانے زمانے کی لڑکیاں اتنی چھوٹی عمروں میں پکی ہو جاتی تھیں -

جو باتیں سمجھ میں نہ آتیں، انہیں آپا سے پوچھتے تو وہ کھانے کو دوڑ پڑتیں :

"ہے نا کوئی گڑبڑ جبھی تو — "

اور اگر ریڈیو سننے کو جی چاہتا تو وہی اعتراض .. .. یہ اتنے گانے کیوں سنتی ہے ؟

یہ اتنی مصیبت کیوں لگی ہوئی ہے اسے دنیا بھر کی کتابیں پڑھنے کی ؟ خالہ بی کڑھائی کے لئے میز پوش گود میں ڈال کر اپنی کتابیں چھپاتی پھرتیں ، اور ہم پہلے سے زیادہ عجیب و غریب کتابوں کا کھوج لگاتے پھرتے .

ہٹاؤ کتابیں — بند کرو ریڈیو — شریفوں کے گھر میں......

بلا سے شریف نہ ہوتے -

بڑے بھیا کے زمانے میں اکا دکا گراموفون ہوا کرتے تھے ، اور سب اپنے گھروں کے تاریک اور الگ تھلگ کمروں میں گراموفون سنا کرتے تھے .

ایک دن بھیا بھی کہیں سے چوری چھپے گراموفون مانگ لائے تھے کہ پسندیدہ گانے سنیں گے - لہٰذا شام کو گائے کے چارے والی کوٹھری میں بنولے کی بوریوں پر بیٹھ کر گانے سنے : "آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا " اور " آجا — آجا میری برباد محبت کے سہارے " اور اب جیدی، منی اور شہنہ کا پسندیدہ گانا — " مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا " — ہے -

ریڈیو سے ہیروئن کی مسلسل محبت کی تکرار پر منا بھائی جان سے پوچھ رہا ہے ، " بھائی جان محبت کیسے ہو جاتی ہے - ہم بھی کریں گے "

اور بھائی جان ہنس رہے ہیں .

"ابا میاں، آپ اسے تھپڑ کیوں نہیں جڑ دیتے جیسے ایک دفعہ راجو کے لگایا تھا - جس نے فلم دیکھنے کے لئے ضد کی تھی -

یہ لیجئے منی بھی بضد ہیں : " ماموں جان ہم بھی محبت کریں گے "

اور ماموں جان پیار سے چپت لگا کر کہہ رہے ہیں : " ارے نہیں بھئی — ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو — بڑی تو ہو جاؤ "

دادی جان آپ کب سے نماز پڑھ رہی ہیں - ذرا اس سات سال کی منی کے بال تو کھولئے جو اب تک فراک پہنتی ہے اور دوپٹے کا پتہ ہی نہیں - اور جس کی عمر میں آپ اس طرح دوپٹہ لیتی تھیں کہ ایک بال نظر نہ آئے . اور پانچوں وقت نماز پڑھتی تھیں -

ابا میاں بدستور آنکھیں بند کئے لیٹے تھے — ریڈیو آن تھا - ہیروئن بدستور چلا رہی تھی — میرے شباب — تم کہاں ہو — میں ساری زندگی تمہارا انتظار کروں گی — میں چاندنی راتوں اور درخشاں ستاروں کی چھاؤں میں تمہاری راہ تکتی رہوں گی "

دادی جان سلام پھیر کر سب کو گھورنے لگیں — ابا میاں بھی کچھ بڑبڑائے -

مجھے بے حد ہنسی آئی ——" اگر چاندنی رات اور درخشاں ستارے نہ ہوئے تو؟"
"میں اپنی سرچ لائٹ دے دوں گا" بھائی جان بولے۔
"...... میرے شہاب —— تمہارے بغیر میری راتیں ——"
ابا میاں نے ہڑبڑا کر حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا، اور دادی جان جا نماز پر بیٹھی نہ جانے کیا بکنے لگیں۔
میں بدستور ہنس رہی تھی —— پنکی اور شہنہ سے ہیروئن کا کرب سہا نہیں جا رہا تھا۔ جیدی اور ننھے کے چہرے بھی ہیروئن کی آہ و فغاں سے اُتر گئے تھے۔
"اللہ کرے، شہاب کے انتظار میں ہیروئن کباب ہو جائے"
"ارے خالہ رہنے دو اب بس —— کیوں بولے جاتی ہو" ننی کہہ رہا تھا۔
"آپ تو ڈرامے کا مزہ خراب کئے دے رہی ہیں —— مارے محبت کے اُس کا برا حال ہے" پنکی کہہ رہی تھی۔
"اسے محبت نہ ہوئی اپنڈی سائٹس کا درد ہو گیا جو شہاب پکارتے پکارتے اس کی زبان تالو سے نہیں لگتی" آپا بولیں۔
"ہونہہ —— خالہ تم لوگ بڑی کنزرویٹو ہو ——" نعیمی کہنے لگا۔
"تمہارا کلیجہ ہوں ——"
اور وہ سب باری باری پیر پٹختے یہ جا وہ جا ——
ابا میاں نے حقے کی نے منہ سے نکال لی، اور وہ بغیر کچھ کہے اندر چلے گئے —— مارے غصے کے اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔
دادی جان الگ ابا میاں پر ناراض ہو رہی تھیں "عالموں اور مولویوں کا گھرانا تھا، تم ہی نے اپنے بیٹیوں کو چھوٹ دے کر ان کی اولاد کا ستیاناس کر دیا۔
اماں پنج سورہ ہاتھ میں لئے آ گئیں۔ اور اب ابا میاں، اماں پہ برسنے لگے۔ ساتھ ہی جاری بھی کہ —— "تم ہی نے لاڈ پیار میں بچوں کو بگاڑا ہے جبھی تو ایسی نامعقول عادتیں ہیں ان کی —— کہیں ایسے بچے ہوتے ہیں شریفوں کے گھروں میں"

البرٹو موراویا

—— (اخذ و ترجمہ) ——

سید رضا کاظمی

لفظوں کا جادوگر

(اطالوی کہانی)

بہت دیر تک ہال کا شور اُن کا پیچھا کرتا رہا!

"........ اور آج ضرورت اس بات کی ہے کہ......... لیکن ......"

انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی آواز کہیں گم ہو گئی ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر آگے بڑھانے کے لئے دماغ پر بہت زور دیا، لیکن ——؟

ہال میں مکمل خاموشی تھی، اور لوگ اُن کے منہ سے کوئی اہم بات سننے کے لئے ان کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھے انہوں نے ڈائس پر بیٹھے اپنے ہم عصر ادیبوں اور ناول نگاروں کی جانب دیکھا۔ وہاں سے پھسلتی ہوئی ان کی نظریں مجمع پر پڑیں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ ڈرامے میں کوئی بہت بڑی خامی رہ گئی ہے۔ اور اب اس کے علاوہ کہ پردہ گرا دیا جائے اور کوئی چارہ نہیں رہا!

لیکن سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں سے اُکتاہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، اور لوگ اب بھی بدستور ان کی تقریر سننے کے لئے بے تاب نظر آ رہے تھے۔

"........ اور آج ضرورت اس بات کی ہے کہ احسان مندی کا جذبہ....... لیکن ....!

اُن کی زبان میں پھر لکنت آ گئی!

اُنہیں اچھی طرح یاد تھا کہ آج سے تقریباً بارہ سال قبل مشہور نقاد اعظم لطیفی نے اُن کے نئے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں "لفظوں کا جادوگر" قرار دیا تھا۔

اور اس کے بعد مختلف موقعوں پر یہ خطاب اتنی بار دُہرایا گیا تھا کہ اب وہ اسے سُن کر یا پڑھ کر ناگواری سی محسوس کرنے

لگے تھے۔

"لفظوں کا جادوگر!"

اب وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس خطاب کے ذریعے اُن پر شدید طنز کیا گیا ہے!

احسان مندی!

احسان؟

ٹیکسی میں آرام سے بیٹھنے کے بعد بھی وہ یہی محسوس کرتے رہے کہ ابھی تک مجمع کے سامنے ڈائس پر کھڑے ہیں اور اُن کے پیر تلے سے زمین سرکتی جا رہی ہے اور اُن کی آواز کہیں گم ہو گئی ہے!

احسان مندی! یہ لفظ ادا کرتے ہی ان کے ذہن میں احسان کی یاد اُبھر آئی تھی۔

لفظوں کا جادوگر؟ احسان کا خندۂ استہزا، اُس کی طنز بھری آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

پیروں تلے زمین سرک رہی تھی۔ پندرہ سال گذر جانے کے بعد بھی وہ خود کو اس قابل نہ بنا سکے تھے کہ اس شہر کی زمین پر مراد پا کر کے کھڑے ہو سکیں!

صدر۔ بندر روڈ۔ نمائش۔ کلیٹن روڈ...... لیکن...... !

بہت دیر بعد انہیں یاد آیا کہ اُن کی جیب میں سگریٹ ہیں، اور جب قریب سے ایک بس تیز رفتاری سے گذری تو انہیں ہوش آیا کہ وہ کہاں ہیں۔

"ڈرائیور؟ کدھر جا رہے ہو؟" انہوں نے سگریٹ جلاتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔

"جی؟" ڈرائیور نے اُن کی جانب حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ٹیکسی میں بیٹھتے وقت آپ نے جمشید روڈ کہا تھا۔"

انہوں نے محسوس کیا کہ ایک لفظ نے انہیں دوسری بار شکست دے دی ہے! جمشید روڈ؟ اس بات پر شک کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ انہوں نے ٹیکسی والے سے جمشید روڈ چلنے کے لئے کہا تھا ورنہ وہ اتنے اطمینان سے اپنی ٹیکسی آرٹ کونسل سے کلیٹن روڈ کے چوراہے تک نہ لاتا۔

انہیں یاد آیا کہ پندرہ سال بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے وہ بس میں بیٹھ کر کنڈکٹر سے ہمیشہ جمشید روڈ کا ٹکٹ لیا کرتے تھے حالانکہ کئی بار انہیں جمشید روڈ سے پہلے بھی اترنا ہوتا تھا!

دفعتاً انہیں اس خیال سے خوشی ہوئی کہ ان کی آواز واپس آگئی ہے اور وہ ٹیکسی ڈرائیور سے بات کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈرائیور نے جن نظروں سے انہیں دیکھا تھا اُس سے گمان ہوتا تھا کہ یقیناً اُن کی آواز میں شدید تلخی پیدا ہو گئی ہے!

آواز کی تلخی! لفظوں کا جادوگر! وہ مسکرانے لگے۔ بھلا ڈرائیور کو کیا پتہ کہ وہ کون ہیں؟ لیکن اُن کی آواز پھر کہیں گم ہو گئی تھی اور ٹیکسی پیر الٰہی بخش کالونی کی سمت گھوم چکی تھی!

"دیکھو ڈرائیور، مجھے اس طرف نہیں جانا ہے" انہوں نے بدقت تمام کہا اور محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئے ہیں۔

ڈرائیور نے اُن کی جانب گھور کر دیکھا اور ٹیکسی کھڑی کر دی۔

"کیا بات ہے، ٹیکسی کیوں کھڑی کردی؟"

"پہلے آپ یہ طے کرلیں کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ اتنی دور آکر آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اس طرف نہیں جانا ہے۔"

انہوں نے دماغ پر زور دے کر سوچا کہ انہیں اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ سیمینار کے منتظمین نے اُن کے قیام کا انتظام مشہور ادیب طالب کیفی کے گھر پر کیا تھا۔ اُن کے علاوہ دو دوسرے ادیبوں کو بھی وہیں قیام کرنا تھا۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اب وہ طالب کیفی کے ہاں نہ ٹھہر سکیں گے۔ لوگ اُن کے بارے میں نہ جانے کیسی کیسی باتیں کررہے ہوں گے۔ انہوں نے سوچا کہ بہتر یہ ہوگا کہ اگلی ٹرین سے لاہور واپس چلے جائیں۔ لیکن ......!

انہوں نے محسوس کیا کہ یہ لفظ 'لیکن' بار بار اُن کا منہ چڑا رہا ہے۔ ٹیکسی بدستور کھڑی ہے اور ڈرائیور اُن کا منہ گھور رہا ہے۔

"کافی ہاؤس چلو۔"

کہنے کو تو انہوں نے کافی ہاؤس کہہ دیا لیکن پھر فوراً ہی انہوں نے سوچا کہ وہ وہاں جاکر کیا کریں گے، لیکن وہ اتنی ہمت نہ کرسکے کہ ڈرائیور سے دوبارہ کچھ کہہ سکیں۔ ذہن سے سارے الفاظ محو ہو چکے تھے۔

کافی ہاؤس میں داخل ہو کر انہوں نے ایک کونے کی میز کا انتخاب کیا اور بیرے کو ہاٹ کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیا۔

سیمینار ابھی ختم نہ ہوا ہوگا ـــــ وہ سوچنے لگے۔ لوگ تقریریں کررہے ہوں گے، اور ان کے تقریباً ادھوری چھوڑ کر چلے آنے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی!

انہوں نے دیکھا کہ قریبی میز پر بیٹھا ہوا نوجوان بار بار اُن کی جانب دیکھ رہا ہے۔ اُنہوں نے سوچا کہ وہ یہاں بھی پہچان لئے جائیں گے، اور کوئی اُن کے قریب آکر انہیں لفظوں کا جادوگر کہہ کر مخاطب کرے گا۔ اور بہت سوچ بچار کے بعد بھی انہیں جواباً کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہ ملیں گے!

"کیا میں آپ کی میز پر بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ نوجوان اُن کے قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔

"شوق سے بیٹھئے، بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟"

نوجوان مسکرایا، اور انہوں نے محسوس کیا کہ نوجوان کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ طنز کے زہر سے بھری ہوئی ہے۔

"آپ مشہور ناول نگار تمنائی ہیں نا؟"

انہوں نے سوچا کہ جس ڈرامے کو وہ ادھورا چھوڑ آئے تھے، وہ پھر شروع ہونے والا ہے!

"اگر ہوں تو؟" اُنہیں اپنے لہجے کی ترشی پر خود حیرت ہوئی۔

نوجوان کو غالباً اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی، اُس کا چہرہ لٹک گیا۔

اُس کا چہرہ دیکھ کر انہیں شدید ندامت کا احساس ہوا۔

"آپ کا گمان درست ہے۔ میں تمنائی ہوں۔ دراصل اس وقت میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں نے آپ سے ایسی ترشی سے کیوں بات کی۔ میں شرمندہ ہوں ......!

لفظوں کا جادوگر!

انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی قوتِ گویائی واپس آگئی ہے۔

"تو میں آپ کے لئے "البیرو" لے آتا ہوں"

"نہیں نہیں، آپ تکلیف نہ کریں۔ ہاں آپ کا نام کیا ہے؟"

"جناب مجھے ریاض احمد کہتے ہیں، بڑی تمنا تھی مجھے آپ سے ملنے کی۔ میں نے آپ کا پہلا ناول "دل کی دھڑکن" کئی بار پڑھا ہے۔ اعظم لطیفی نے تو آپ کو "لفظوں کا جادوگر" کہا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس سے بھی عظیم......"

"چھوڑیئے ان باتوں کو —— ذرا یہ معلوم کیجئے کہ لاہور واپس جانے کے لئے اگلی ٹرین کس وقت ملے گی؟"

"تو کیا آپ لاہور واپس جائیں گے؟ لیکن ابھی تو سیمینار ختم نہیں ہوا۔ شاید آپ نہیں جانتے جناب کہ اس سیمینار میں کتنے ہی لوگ صرف آپ کو سننے اور دیکھنے آئے ہیں....."

"کم از کم میرے لئے سیمینار ختم ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا ہوں، اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جن الفاظ کا میں بار بار استعمال کر رہا ہوں وہ بے معنی ہو چکے ہیں"

"آپ غالباً پریشان ہیں۔ میری تو عرصے سے خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات ہو اور میں آپ کو اپنے غریب خانہ پر لے جاؤں"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"کھارادر میں۔ ممکن ہے آپ اس محلہ سے واقف نہ ہوں۔ ٹاور کے قریب ہی گلی میں......"

"تم کھارادر میں رہتے ہو؟ کتنے عرصے سے؟"

"پچھلے دس سال سے"

"ہوں"

"تو آپ میرے گھر چلیں گے جناب"

"نہیں پھر کبھی۔ اگلی بار صرف تمہارے گھر جانے کے لئے ہی کراچی آؤں گا"

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں جناب"

"مجھے افسوس ہے کہ میری بات تمہیں بری لگی۔ خیر چلو"

دونوں کافی ہاؤس کے باہر نکل آئے۔ نوجوان بے حد خوش نظر آ رہا تھا لیکن تمنائی سوچ رہے تھے —— کل سے یہ شخص ہر ایک سے فخریہ کہے گا "تمنائی صاحب میرے گھر آئے تھے"، اور میں کسی کو یہ نہ بتلا سکوں گا کہ درحقیقت میں اپنا گھر دیکھنے کھارادر گیا تھا، جہاں آج سے بارہ سال پہلے تک میں رخسانہ اور احسان کے ساتھ رہتا تھا

نوجوان نے ٹیکسی بلائی تو تمنائی نے کہا: "دیکھو ٹیکسی کا کرایہ میں دوں گا"

"جناب میں نے آپ کے دولت مند ہونے کی بات تو خیر اخباروں میں پڑھی ہے لیکن میرے غریب ہونے کی بات تو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی"

"تم بڑے چالاک ہو ریاض" تمنائی نے مسکرا کر کہا "تم سے ملنے سے پہلے سیمینار میں تقریر کرتے وقت مجھے احسان کی یاد آئی تھی، اور تم سے ملنے کے بعد اس کی یاد اور زیادہ آ رہی ہے"

"کیا آپ کا مطلب مشہور شاعر احسان عظیم سے ہے؟"

وہ نہیں میں اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہا ہوں۔"
"میں نے تو کہیں پڑھا تھا کہ آپ اس دنیا میں بالکل اکیلے ہیں؟ اگر آپ کے بارے میں غلط باتیں کہی جاتی ہیں تو آپ اُن کی تردید کیوں نہیں کرتے؟"
"اپنے بارے میں لکھی جانے والی باتیں میں کبھی نہیں پڑھتا۔ دراصل پچھلے تین چار سالوں سے میں نے کچھ نہیں پڑھا اور اب لکھنا بھی بند ہو چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان مسئلوں پر کچھ نہیں لکھا جن پر مجھے لکھنا چاہئے تھا۔ دراصل مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"
"لیکن اعظم لطیفی نے تو لکھا ہے کہ معاشرے کی بُرائیوں کی جس انداز میں اور جس دلیری سے آپ نے نشان دہی کی ہے۔۔۔"
"یہ اُن کا اپنا خیال ہے۔ درحقیقت میں ۔۔۔۔۔۔۔"
"بس مجھے میرا گھر آگیا۔"
ٹیکسی رکی تو وہ چونک پڑے۔
اُن دنوں اسی بلڈنگ کی چھت پر ٹین کے دو کیبن تھے جن میں وہ اپنی بیوی رخسانہ اور احسان کے ساتھ رہتے تھے، ایک سائبان کے نیچے باورچی خانہ بنایا گیا تھا۔
کھانے سے فارغ ہو کر ریاض انہیں اس کمرے میں چھوڑ آیا جو اُس نے اُن کے قیام کے لئے جلدی جلدی ٹھیک کیا تھا۔
انہوں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا، اور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔
اُنہیں یاد آیا کہ اُن دنوں بھی جب کبھی اُنہیں نیند نہ آتی تو وہ یونہی کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر باہر دیکھا کرتے اور جب کبھی وہ کھڑکی سے پیچھے مڑتے تو رخسانہ کو اپنی طرف نظریں جمائے پا کر جھینپ جایا کرتے۔
لیکن آج وہ کھڑکی سے ہٹیں گے تو انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہوگا ۔۔۔ یہ خیال آتے ہی وہ کھڑکی سے ہٹ آئے، اور کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سگریٹ جلایا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کتابوں کے ریک کے قریب پہونچ گئے۔
انہوں نے دیکھا کہ اُن کے تمام ناول قرینے سے ریک پر رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کا دل چاہا کہ اپنا کوئی ناول اٹھا کر پڑھیں اور خود یہ فیصلہ کریں کہ وہ کیسا لکھتے ہیں؟
کافی دیر تک اُن کی نظریں "محبت کی پیاس" کی جلد پر جمی رہیں، اور جب انہوں نے اُسے نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُن کے ہاتھ کانپنے لگے۔
اپنی کتابیں پڑھنا انہیں ہمیشہ تکلیف دہ محسوس ہوا تھا۔ اُن کی تمام کتابیں بھی اس خلا کو پُر کرنے سے قاصر تھیں جو اُن کی اپنی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔ دراصل زندگی نے اُس دن اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جس دن اُن کی بیوی رخسانہ کا جسم سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا، اور احسان نے کہا تھا کہ اب وہ ان کے ساتھ رہے گا!
لفظوں کا جادوگر!
اگر کبھی اُن کی ملاقات مشہور نقاد اعظم لطیفی سے ہوئی تو وہ اُن سے پوچھیں گے کہ انہوں نے ان کے ساتھ اتنا بڑا مذاق

یوں کیا؟ — جادو؟ — ہونہہ! — لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا آسان ترین طریقہ — بے معنی جملوں — روکھے پھیکے صفحات کا مجموعہ — سماجی ناول — چھی! جس تحریر میں زندگی کی حرارت نہ ہو اس کا مقصد؟

"اب میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا" احسان نے کہا تھا۔ "میں بھائی کی زندگی میں یہ سوچ کر چپ رہتا تھا کہ کچھ بولوں گا تو انہیں دکھ ہوگا۔ لیکن اب میں آپ کا وہ احترام نہ کر سکوں گا جس کی آپ مجھ سے توقع رکھتے ہیں"

اور اس دن وہ احسان کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ جو کچھ وہ کہیں گے غلط ہوگا۔ محض الفاظ کا گورکھ دھندا!

وہ دن اور آج کا دن۔ اُن کی احسان سے ملاقات نہ ہوئی۔ جن دنوں اُن کا نام ملک بھر میں گونجنے لگا تھا، انہوں نے سوچا تھا کہ شاید احسان اُنہیں خط لکھے۔ لیکن یہ تمنا بھی پوری نہ ہوئی۔

رخسانہ کی بیماری شروع ہوتے ہی انہیں گمان ہوا تھا کہ وہ اُسے کھو دیں گے اور ساتھ ہی احسان کو بھی، لیکن ان دنوں تو انہیں بس ایک ہی دھن تھی کہ ان کا شمار ملک کے عظیم ناول نگاروں میں ہونے لگے۔ ملک کے گوشے گوشے میں اُن کے نام کا ڈنکا سُنائی دے۔

رخسانہ کا جسم سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، اور پڑوسی تعزیت کے لئے آنے لگے تھے۔ اُسی رات اُن کی احسان سے آخری بار گفتگو ہوئی تھی۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور دور خلا میں گھورنے لگے۔ باہر سڑک تھکی ہوئی گرہستن کی مانند سو گئی تھی۔

وہ بستر کی سفید چادر کو گھورنے لگے۔

شمس الرحمٰن
— ترجمہ —
یونس احمر

بنگلا۔

بہت دِن ہوئے

بہت دِن ہوئے،
جانے جگ کتنے بیتے
کہیں ایک تاجر نے
سب سے چھپا کر
زمیں کے تلے
میٹوں میں دبا کر
نہایت حسیں، بیش قیمت دمکتا ہوا
ایک ہیرا رکھا تھا
جہاں مہر کی خیرہ کن روشنی کا
گذر بھی تھا مشکل
جہاں سرد موسم کے پیڑوں کے پتے
گرے تھے نہ آ کر کبھی!
تری چاہ بھی
اُس حسیں، بیش قیمت ضیا بار
ہیرے سے کچھ کم نہیں ہے
کہ اُس کی ضیا سے
شب و روز دل کا نہاں خانہ
روشن ہے، ماہِ مبیں ہے یا
میں پہروں خوشی میں یہ سوچتا ہوں
ترے حسن کی چاہ کا حوصلہ
کہاں سے ملا اور کس سے ملا ہے؟

رحمان بابا
ترجمہ
رضا ہمدانی

پشتو

رموزِ حکمت

یہ مان لوں اگر کہ میں آبِ حیات ہوں
پھر بھی یہ زندگی ہے مری صورتِ حباب

جیسے کہ چشم وا ہے مگر بُت خموش ہے
اس طرح دیکھتا ہوں میں بیداریوں میں خواب

برگِ خزاں کی طرح میں پا در رکاب ہوں
آئی ہے پیری، ہوگیا رخصت مرا شباب

قسمت سے شاخِ زلف مرے آگے جھک گئی
کوتاہ تھا، وگرنہ قدِ یار کے حضور

سینہ زنی بھی ہے وہی، فریاد بھی وہی
مرغِ سحر سے پوچھو مرا حال ناصبور

محبوب پر نہیں مجھے رحمان اعتماد
قائم نہ رہتا ورنہ رقیبوں کا یہ غرور

شاہ عبداللطیف بھٹائی رح
ترجمہ
شیخ ایاز

سندھی

قربِ محبوب

(سُر ساموسنڈی سے)

موج در موج بحرِ بے پایاں
میرے محبوب کی نشانی ہے
حاملِ جلوہ ہائے رنگا رنگ
درحقیقت وہی روانی ہے
ظاہری حسن کو ثبات کہاں
ہر تب و تاب آنی جانی ہے
خواہشِ وصلِ یار کیا معنی؟
قربِ محبوب جاودانی ہے

آزمودہ ہے جرأتِ صد شوق
دل کو اب سوگوار کون کرے
دیکھ کر جلوہ ہائے رنگا رنگ
حسن کا اعتبار کون کرے
اے خوشا لذّتِ فراقِ یار
خواہشِ وصلِ یار کون کرے
زندگی کشتۂ محبت ہے
موت کا انتظار کون کرے

مجبور کاشمیری
ترجمہ
نصیر

کشمیری

زہر خند

کشمیر کی حسین وادی تیرے دامن میں
زعفران کی مہک ہے، بہار کی رنگینی ہے
تو اترا رہی ہے کہ دور سے آنے والے
تیری رعنائی پہ مرتے ہیں۔ تیرے شیدا ہیں
تو شیدائیوں کے ہجوم میں بھول گئی ہے —
اُس انسان کو جس نے تجھے زندگی عطا کی
اور جو خود زندگی سے محروم ہوا جاتا ہے!
دیکھ میری آنکھوں سے دیکھ
تیری جھولی رنگین پھولوں سے لبریز ہے
ان پھولوں کو سونگھ — ان میں زندگی کا خون ہے
جو ہر ورقِ گل کو رنگین بنا چکا ہے۔
دیکھ اپنی خمار آلود آنکھوں سے
ان مہیب ڈھانچوں کو دیکھ
جنہوں نے اپنے خون سے تجھے رنگینی بخشی
دیکھ ان زرد چہروں کو دیکھ
جن پر ہر لمحہ یاس و حسرت کی بدلیاں چھائی رہتی ہیں
اے حسین وادی!
اپنی بہار کی چھاؤں میں اس خزاں رسیدہ ہجوم پر بھی ایک نظر ڈال
شاید تو مسکرانا چھوڑ دے
یہ مصنوعی ہنسی اب تجھے زیب نہیں دیتی

لوک گیت

بلوچی

ترجمہ

عطا شاد - عین سلام

اے جانِ جاناں

زہیروک کو زہیرگ، زہیرنگ یا زہرُوک بھی کہا جاتا ہے۔ زہیر کے معنی ہیں یاد۔ اس لئے گیتوں کی اس صنف میں عام طور پر انتظار، ہجر و فراق وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ زہیروک عام طور پر عورتیں چکی پیستے وقت گاتی ہیں۔ مکران کے علاقہ میں شتربان اسے سفر کا ساتھی سمجھتے ہیں، اور اس گیت کے غمناک آہنگ سے بچھڑے ہوؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

چوپہ عشک ء من گپتگوں کشک ء	دشتِ جہاں میں تیری تمنا - روشن ستارا
دارون عزابوں سینگ کبابوں	تیرے غموں سے ہم سوختہ جاں - اے جان جاناں
تئی سرے دوری چمانی کوری!	تیری جدائی قلب و نظر کی - مرگ و تباہی
بے تو من شیدا کپتگوں تیدا	دیوانگی ہے تیرا بچھڑنا - دل کا اُجڑنا
مہیراں رندے مئے دل ء سندے	تو بس رہا ہے دل میں ہمارے - گیسو سنوارے

سیّد ابوالخیر کشفی

محفل

نیویارک سے ایک خط - ایک نظم

نیویارک ۴؍اپریل سنہ ۱۹۶۷ء   برادر محترم صہبا!

چلتے وقت میں آپ سے شاید مل بھی نہ سکا تھا۔ ویسے جب بھی اردو اکیڈمی گیا آپ کو بھی آپ کے دفتر میں دیکھا مگر نہ خالد ملے نہ آپ۔ اور آج رات عجب کیفیت ہے۔ رات کے کوئی ڈیڑھ بجے ہیں اور میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میں بہت دنوں سے آپ کو خط بھی لکھنا چاہتا تھا اور افکار کے لئے کوئی ڈھنگ کی تحریر بھیجنا چاہتا تھا۔ یہاں ادب کی تدریس سے متعلق یا کچھ اساتذہ کے خاکے بھی مگر شاید اس کے لئے ابھی ہم دونوں کو انتظار کرنا ہوگا۔ ویسے انشاء اللہ آپ سے اور افکار سے میرا رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر کوئی آنے جانے والا ملے تو کچھ نئے شمارے اور "فیض نمبر" بھیج دیجئے۔ پاکستانی رسالوں کی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستانی مصنوعات کی ایک نمائش کولمبیا میں کر چکا ہوں۔ پاکستانی ثقافتی انجمن بھی قائم کی ہے۔ پاکستانی شاعری کی دو شامیں بھی برپا ہو چکی ہیں۔ نیویارک کا پھیلاؤ بہت سہی، مگر ہماری آواز اور ثقافت انشاء اللہ اس کی وسعتوں میں اپنی جگہ بنا کر رہے گی۔

اپریل کا مہینہ ایک بار پھر آہی گیا۔ اس کی ۲۳ تاریخ کو تو شاید میرا کوئی "دوست" نہیں بھولے گا۔ ۲۳؍اپریل سنہ ۶۳ء کو طاہرہ رخصت ہوئی، اور ۲۲؍اپریل سنہ ۶۴ء کو میں نے یہ نظم "حادثے" لکھی تھی۔ آج تین سال کے بعد افکار کے ذریعے اپنے دوستوں تک اسے پہونچا رہا ہوں۔ افکار ہی میں طاہرہ سے متعلق اپنی نظم شائع ہوئی تھی ——— انجم اعظمی کی نظم ——— مجھے اپنا دوست انجم اس وقت یاد آ رہا ہے ——— وہ جس کی آنکھوں کی خاکستر کے نیچے زندگی کے شعلے، حرارت کا سوتا ہیں۔ اگر انجم آئے یا کہیں ملے تو میرا سلام اور پیار اس تک پہونچا دیجئے۔

طاہرہ کا غم بھی اُس کی ذات کی طرح محدود نہیں رہا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اگر ممکن ہو تو مئی کے افکار میں یہ نظم شائع کر دیجئے گا۔

حادثے

حادثے وقت کے پہلو سے ہوئے ہیں پیدا

وقت انسان کا دیرینہ رقیب

سید ابوالخیر کشفی

محفل

افکار

حادثے وقت کا ہتھیار ہیں انساں کے خلاف
حادثے ذہن کو مفلوج بھی کر سکتے ہیں
حادثے فکر کو ظلمت میں بدل سکتے ہیں

حادثے ظلم بھی ہیں، رحم بھی ہیں
اِن کی آغوش میں ڈوبے ہیں کئی ماہ و نجوم
اِن کی آغوش سے اُبھرا ہے ضمیرِ آدم
حادثے عظمتِ انساں کی دلیلِ اول

حادثے زیست کا عنوان بدل دیتے ہیں۔
فکر اور ذہن کے خاکوں کو بدل دیتے ہیں
اک نئی رُوح اُبھرتی ہے جلو سے اِن کے
اک نئی روح کہ فریاد و فغاں سے آگے
"چشمِ آدم" کو دکھاتی ہے "مقاماتِ بلند"
موت اور زیست کا مفہوم بدل دیتی ہے
غمِ ذاتی کو عطا کرتی ہے وسعت، دل کی
اک نئی روح کہ فریاد و فغاں سے آگے
لبِ تشنہ کو عطا کرتی ہے مینائے ثبات
چاند کو درد کا پیمانہ بنا دیتی ہے

یہ نئی روح بھی اک نقش ہے دل کے غم کا
حادثے جس سے تصور میں بدل جاتے ہیں
کارواں وقت کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔
حادثے گردِ سفر بن کے بچھڑ جاتے ہیں
کارواں وقت کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

نہ جانے اور کیا کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر میں یہ قرض مضمون کی صورت میں ادا کروں گا۔ مگر ابھی ذرا طوفان ذہن میں کچھ اور کروٹیں لے لے اور نقشے خود بخود اپنے اظہار کے پیکر تراش لیں۔ ہر خیال، ہر جذبہ، ہر گفتنی بات، آخر روح کا نغمہ ہی تو ہے۔
کہاں گئے آپ۔ بچوں کو دعائیں اور پیار۔

آپ کا
ابوالخیر

ادارہ

تبصرہ و تعارف

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

ریزہ ریزہ ○ انتخاب مضامین عظمت
شاعری اور تخیل ○ ننھے میاں

ریزہ ریزہ

مصنف : ظہور نظر
ناشر . کتاب نما - ۴۷ - انارکلی - لاہور
صفحات : ۲۱۴ - قیمت : ۵ روپے

ظہور نظر ایک جدید ذہن اور "ریزہ ریزہ" زندگی کے ایک نئے احساس کا نام ہے۔"ریزہ ریزہ" میں جدید شاعری کے قاری کو فکر و خیال اور جذبہ و احساس کی نئی سمتیں ملتی ہیں۔ جن سے بیسویں صدی کے انسان کی لہولہان شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

یہ مجموعہ اس بات کا بھی شاہد ہے کہ جدید شاعری مسلسل ترقی پذیر ہے۔ اس مجموعہ میں اچھی اور خوب صورت شاعری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے ظہور نظر کے فن کی لطافت اور اثر انگیزی کا پتہ چلتا ہے۔ ظہور نظر کے فن میں اس کے پُر آشوب زمانے کے عکس کے علاوہ وہ حسن بھی فراوانی کے ساتھ موجود ہے جو شاعری کو ابدی قدروں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ہم اس کی نظموں میں اس کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔ اس کے خوابوں سے دو چار ہوتے ہیں، اور اس کے روحانی گداز اور وجدان کی دلکشی پاتے ہیں۔ یہ چند اقتباسات اس کی مختلف نظموں سے صرف اس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ قاری انہیں پڑھ کر خود فیصلہ کر سکے کہ ظہور نظر کی شاعری میں زندگی اور فن کی کتنی توانائیاں ہیں ؎

سیلِ فردا، تندِ بادِ رفتگاں
مجھ سے کہتے ہیں کہ جاؤ گے کہاں "نیا سفر"

سایہ ساتھ نہ دے گا
کچھ دے گا کون ! "فرار"

بیتی رُت
بیتے دنوں کی یاد میں
اے ہوائے وادیٔ امروز آہستہ چلو "التجا"

اے دلِ زار و زبوں
آ تجھے بے تاب کریں
خنجرِ درد اُتاریں تری ہر دھڑکن میں
ناوکِ ہجر ترازوئے رگِ خواب کریں "خواہشِ رائیگاں"

نیند کا شہر تھا
سپنوں کی عملداری تھی
دل میں دربار لگا تھا مرے ارمانوں کا "ایک رات"

بند گلی میں گھوم کے جانے والو جھونکو !
مرے لہو کے کھٹے کواڑوں سے ٹکراؤ
تنہائی بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہے "ایک دوپہر"

ان اشعار میں ظہور نظر کے فن کی معنویت، خوب صورتی، گہرائی اور گیرائی ہے، جو پورے مجموعے میں کم و بیش ہر جگہ موجود ہے۔ شعر و ادب کی مقبولیت کے سلسلے میں اس ناموافق دور میں بھی "ریزہ ریزہ" یقیناً ایک کامیاب کردار ادا کرے گی اور شاعری کے قاری کو جمال کے نئے پہلوؤں، زندگی کی نئی لذتوں اور جدید عہد کے انسان کی بے قرار اور بیتاب روح سے آشنا کرے گی۔

انتخاب مضامین عظمت

مصنف : عظمت اللہ خاں
ملنے کا پتہ : علی اسد اللہ - سی/۳۸۹ - نزد تار گھر - کوچہ شیر سنگھ
بازار تلواڑاں - راولپنڈی
صفحات : ۳۲۸ - قیمت : ۴ روپے

اردو ادب کا طالب علم عظمت اللہ خاں کے نام سے بخوبی واقف ہے - انہوں نے اردو نظم میں گیتوں کی زبان استعمال کی - ان کے پاس شاعری کا ایک نیا اسلوب تھا - وہ بڑے شاعر نہ سہی لیکن شاعری کو ایک نیا موڑ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے - انہیں کی روایت اپنا کر میرا جی نے ہندی آمیز زبان میں نظمیں لکھنا شروع کی تھیں - لیکن عظمت اللہ خاں کے یہاں موسیقی، روانی دلکشی اور سادگی کا حسن تھا - میرا جی نے اپنی نثر میں بھی زیادہ سپاٹ شاعری کر کے اس روایت کو شدید نقصان پہنچایا -

یہ کتاب عظمت اللہ خاں کے مضامین کا مجموعہ ہے - ان میں اُپج اور انفرادیت ہے - غور و فکر کی بعض انوکھی اور لاجواب مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں - میرا جی نے نثر اچھی لکھی تھی لیکن اُن کی نثر میں عظمت اللہ خاں کی نثر موجود ہے - حیرت ہے کہ اتنے عرصے کے بعد یہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں - اس سے ہماری تہذیبی اور ثقافتی بے لطفی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - عظمت اللہ خاں کے مضامین میں حیرت انگیز تنوع اور فکر کی ایسی بلندی ملتی ہے جو ہر ادیب کے لیے قابلِ رشک ہے - وہ تجزیے کی مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں - جن سے تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا حسن جھلکنے لگتا ہے -

بحیثیت مجموعی عظمت اللہ خاں تحریر کو معاشرہ، انسانی فطرت اور علم و فن کی ہم آہنگی کی علامت سمجھ کر قلم اٹھاتے ہیں - اُن کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے قلم میں بڑی جان تھی، کاش وہ شاعری کے جھگڑے میں نہ پڑے ہوتے -

شاعری اور تخیل

مصنف : محمد ہادی حسین
ناشر : مجلس ترقی ادب - ۲ - کلب روڈ - لاہور
صفحات : ۲۰۴ - قیمت : ۶ روپے

محمد ہادی حسین خاموش، سنجیدہ اور جم کر کام کرنے والے آدمی ہیں - یہ کتاب انہوں نے بڑی مشقت اور جگر کاوی کے ساتھ لکھی ہے اور شاعری کے متعلق بے حد اہم مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے - کتاب گیارہ ابواب اور اشاریہ پر مشتمل ہے - ابتدا میں آغا عبدالحمید کا لکھا ہوا تعارف شامل ہے - اس کتاب کے ابواب میں مختلف مضامین کے بجائے ایک مسلسل مضمون ہے جو شعر کی ماہیت، شعر اور تخیل، شاعری اور جذبہ، فکر اور شعوری تخلیق، اخلاق، الہام

تیکنک، زبان، ماورائیت، غرض شعر کے سلسلے میں تمام بحثوں کو احاطہ کرتا ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہادی حسین صاحب نے اردو تنقید میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے پہلے اور دوسرے باب میں خاص طور پر جن بحثوں کو اٹھایا ہے اور شعر کی ماہیت پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں صرف اردو تنقید کی روایت سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی نظر میں مغرب کا سارا تنقیدی سرمایہ بھی ہے۔ اُن کی تنقید میں ایک مشرقی مزاج کی واضح جھلک بھی ملتی ہے۔ تخئیل کے سلسلے میں وہ انگریزی نقاد کولرج سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور کہا جائے محمد ہادی حسین کی اس خدمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کولرج کی مشکل ترین تحریر کے بڑے اچھے ترجمے جابجا انہوں نے اس کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کولرج نے جب تخئیل کی بحث کو چھیڑا تھا تو ادب کی تنقید کو ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ اور اس بہانے ادب و شعر کے بارے میں سوچنے کا نیا انداز پیدا ہوا تھا۔ لیکن ارسطو نے المیہ یا رزمیہ یا شاعری پر رائے دیتے وقت تخئیل کو اتنی اہمیت اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ مختلف علوم میں کام کرنے کے سبب جانتا تھا کہ تخئیل شاعری کے لئے وجہِ امتیاز نہیں ہے۔ سائنس ہو یا فن دونوں کی اعلیٰ ترین تخلیقات انسان کے اعلیٰ ترین تخئیل کا نتیجہ ہیں۔ کالرج رومانوی عہد کا نقاد ہے۔ چونکہ انسانی تخئیل کی قوت شاعری کی بھی قوت بن کر سامنے آئی ہے اس لئے وجہ امتیاز کو تلاش کرنے کے بجائے وہ انسانی ذہن کے پورے بہاؤ (تخئیل) کو اصل شاعری سمجھ بیٹھا۔ حالانکہ تخئیل اور جذبے سے مل کر جو صورت بنتی ہے اُسی کو ہم شاعری سے تعبیر کریں گے۔ تخئیل ہی کی مدد سے جذبہ، ضبط اور شعور کا حامل ہو جاتا ہے۔ لیکن شعر کی اصل جذبے میں ہے۔ تخئیل انسان کے سارے کارناموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے جذبے کو بھی بہتر سے بہتر شکل دینے میں مدد کرتا ہے اسی لئے شاعری کی تعریف میں اس کیفیت کو احاطہ کرنا چاہیئے جو تخئیل کے دائرے میں جذبے کی گرم فضا سے پیدا ہوتی ہے۔ سراسر تخئیل یقیناً شاعری کی میراث نہیں ہے۔

ہادی حسین صاحب کی کتاب میں تخئیل کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ کتاب میں گہری سنجیدگی موجود ہے لیکن یہ بحث جو تخئیل سے متعلق ہے، ابھی بہت آگے تک جائے گی۔ یہی کیا کم ہے کہ ایک شخص نے اعلیٰ اور سنجیدہ بحث کا آغاز کیا ہے۔ جس کے سبب "شاعری اور تخئیل" اردو تنقید میں ایک نئی کتاب کی حیثیت سے پڑھی جائے گی۔ اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں یقیناً نئے نئے سوالات اٹھائے گی۔

مجلس ترقی ادب نے کتاب کو نہایت خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا ہے۔

ننھے میاں

مصنف : صابر علی

ناشر : خاتون پبلشرز۔کراچی

صفحات : ۱۳۶ قیمت : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

"ننھے میاں" میں صابر علی کی ۱۵ کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ صابر علی نوجوان افسانہ نگار اور بچوں کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کہانی پن کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو بچوں کے ذہن میں آہستہ آہستہ زمانہ کا شعور پیدا کر سکتی ہیں۔ ہلکی ظرافت سے صابر علی نے کرداروں کی تعمیر اور فضا کی تشکیل میں بڑی مدد لی ہے۔ بعض کہانیوں میں بچوں کی نفسیات کو بے حد چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ کہانیاں اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ ان میں کئی کردار بچوں کے کردار ہیں۔ بچہ پڑھتے وقت ان کرداروں کو اپنا کردار سمجھ کر ان سارے حالات سے گزرتا ہے جن سے کہانی کا کردار مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے بچے میں کسی نہ کسی خیال یا جذبے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

ان میں کہانی لکھنے کے انداز کے اعتبار سے کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں کی گئی ہے لیکن پھر بھی یہ قصے یقیناً نئے ہیں۔ روایت کے حسن کے ساتھ ساتھ مصنف کی تخلیقی قوت نے بھی ان قصوں کے تار و پود کو بننے میں پورا پورا حصہ لیا ہے۔

صرف بچوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ یہ جاننے کے لئے کہ بچوں کی نفسیات کیا ہے، بڑوں کو بھی چاہیئے کہ صابر علی کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ضرور پڑھیں۔ "ننھے میاں" کا تعارف علامہ نیاز فتحپوری (مرحوم) کا تحریر کردہ ہے۔

ص۔ل

فنتارِ عمل

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

علامہ اقبال کا پیغام ہمیشہ قوم میں اُمنگ اور جرأت پیدا کرتا رہے گا

اُن کے تصور میں ایک ایسا شاندار معاشرہ تھا جس کی بُنیاد عدلِ عمرانی پر ہو

شاعرِ مشرق کی ۲۹ ویں برسی پر صدر ایوب کا پیغام

کراچی۔ علامہ اقبال کی ۲۹ ویں برسی پر صدر ایوب نے اپنے ایک پیغام میں کہا ہے کہ آج ہم علامہ اقبال کی یاد منا رہے ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر، ممتاز فلسفی اور محب وطن تھے۔ ان کی شاعری نے قوم کو سو سال کے خوابِ گراں سے جگایا، اور جمود کو توڑا۔ اُن کے تصور میں ایک ایسا معاشرہ تھا جس کی بنیاد عدلِ عمرانی پر ہو۔ افراد میں ہم آہنگی ہو۔ اور جہاں متعدد عناصر کا ایک مستحکم مرکز بھی ہو۔ ان کا پیغام ہمیشہ قوم میں امنگ اور جرأت پیدا کرتا رہے گا۔ ہمیں ان کے پیغام کو حقیقت میں ڈھالنا چاہیے بالکل اسی طرح جیسے ہم نے اُن کے خواب پاکستان کو خلوص دل، تندہی اور مکمل اعتماد کے ساتھ حقیقت میں بدلا۔

علامہ اقبال کی یاد میں ملک بھر میں رنگا رنگ ادبی تقریبات منعقد ہوئیں۔ اور شاعرِ مشرق کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ کراچی میں "یوم اقبال" سال گذشتہ کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر منایا گیا۔ نادر تحریروں، مطبوعات اور ان کے اشعار پر مبنی تصاویر کی نمائش، قوالی، مشاعرہ، خواتین کی خصوصی نشست اور ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں پاکستان کے علاوہ روس، چیکوسلواکیہ، ترکی، ایران، افغانستان اور متعدد بیرونی ملکوں کے مشاہیر نے شرکت کی ـــ ڈاک خانہ نے یادگاری ٹکٹ جاری کئے، اور یہ پرشکوہ تقریبات دو روز تک جاری رہیں، جن میں عوام و خواص نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

توقع ہے کہ اولڈ راوین ایسوسی ایشن، اقبال اکیڈیمی، اقبال سرکل اور دوسرے ادارے مفکرِ مشرق کی ایسی یادگاریں بھی قائم کریں گے جن سے ان کا پیغام

شہروں سے قصبات تک پھیل سکے۔ اور قوم کا ہر فرد اس سے متمتع ہو سکے۔

بنگلہ کتب پر آدم جی اور داؤد ادبی انعامات

کراچی۔ انجمن مصنفین پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ بنگالی ادب کے لئے پانچ پانچ ہزار روپے کے آدم جی انعامات شاعر فرخ احمد کو ان کی کتاب حاتم طائی اور ابوالفضل کو ان کی کتاب ریکھا چترا پر، اور پانچ پانچ ہزار روپے کے داؤد انعامات عبدالستار کو ان کی کتاب ارانیا جنا پادے۔ اور استاد منشی رئیس الدین کو ان کی کتاب سات ماگہ پر دیئے گئے۔

صدارتی اعزازات

راولپنڈی۔ پچھلے دنوں صدر ایوب نے ادب وفن کی خدمات کے صلے میں جن ممتاز علمی و ادبی شخصیتوں کو صدارتی تمغہ و اعزازات سے نوازا اُن کے نام یہ ہیں:

- الطاف گوہر — ستارۂ پاکستان
- علامہ علاء الدین صدیقی — ستارۂ امتیاز

صدارتی تمغہ	(مصوری)	پروفیسر شاکر علی
"	(ادب اردو)	رئیس احمد جعفری
"	(سائنس)	ڈاکٹر عبدالوہاب خاں
"	"	ڈاکٹر ایم ایم سرور (مرحوم)
"	(کرکٹ)	فلائٹ لفٹیننٹ
		امتیاز احمد

پدم بھوشن اور پدم شری،

خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ملک راج آنند اور سردار جعفری کو خطابات

نئی دہلی۔ حکومت ہند نے — خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر ملک راج آنند کو "پدم بھوشن" اور سردار جعفری کو "پدم شری" کے خطابات سے نوازا ہے۔

ماؤ کی لال کتاب

نیویارک۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کی مختلف تحریروں کے حوالہ جات پر مبنی چھوٹی کتاب یہاں بڑی تیزی سے فروخت ہو رہی ہے۔ پیکنگ سے شائع ہونے والی اس کتاب کی قیمت ایک ڈالر ہے۔ امریکی تقسیم کار نے یہ کتاب ہانگ کانگ سے حاصل کی ہے۔ ادارہ یونا رڈ شوارٹر نے صدر برنٹینو نے بتایا کہ تھوڑی دیر میں کئی درجن کتابیں فروخت ہو گئیں، اور مزید کتابوں کے لئے آرڈر دے دیا گیا ہے۔

روسی ادیب کراچی میں

کراچی۔ گذشتہ دنوں روسی ادیبوں کا سہ رکنی وفد مشہور ادیب مسٹر کوچی توف کی زیر قیادت یہاں پہونچا۔ وفد میں قازقستان کے ممتاز ادیب علی خانوف اور مشہور مستشرق مریم سلگانیک شامل تھیں۔ یہ وفد پاکستان رائٹرز گلڈ کا مہمان رہا۔ کراچی پہونچ کر اراکین وفد نے قائد اعظم کے مزار پر پھول چڑھائے۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو اور نیشنل میوزیم دیکھنے

گئے۔ اور سہ پہر کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر میں گلڈ کے عہدے داروں اور نمائندہ ادیبوں سے ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ وفد نے یومِ اقبال کی تقریبات میں بھی شرکت کی۔

اقبال پر پی ایچ ڈی

گوہاٹی - تارا چرن رستوگی پرنسپل ایس بی ایم، ایس کالج سوالکچی (کامروپ - آسام) نے گوہاٹی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے تحت ڈاکٹر امریش دتہ پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی کی نگرانی میں علامہ اقبال پر انگریزی میں ڈاکٹریٹ (D. Phil) کے لئے مقالہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو۔ فارسی سے غیر معمولی شغف ہے مقالہ کا عنوان ہے "اقبال پر مغربی اثر"

'بانگِ درا' کی رُوس میں مقبولیت

کراچی - روسی سفارت خانہ کے ایک اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ حال ہی میں علامہ اقبال کے مشہور مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کا ترجمہ ماسکو سے شائع ہوا ہے جسے روسی عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور ہر طبقے میں بے حد مقبول ہوا ہے "بانگِ درا" کی دو سو نظمیں کئی روسی مستشرقین کی شبانہ روز محنت کے بعد پہلی بار شائع ہوئی ہیں۔

اقبال پر زیرِ ترتیب کتابیں

کراچی - اقبال اکیڈمی کے اشاعتی پروگرام میں جو کتابیں زیرِ ترتیب اور اشاعت کے قریب ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) اقبال کے خطوط، گرامی کے نام - مرتبہ: عبداللہ قریشی
(۲) ملفوظاتِ اقبال - (اقبال کی صحبتوں اور محفلوں کی مستند اور معتبر یادداشتیں - از سید نذیر نیازی
(۳) اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط - کشن پرشاد کے نام -
(۴) اقبال اور بھوپال (حیاتِ اقبال کا ایک نیا پہلو) از صہبا لکھنوی

بیمہ پر معیاری کتابوں کی اشاعت

ایسٹرن فیڈرل ڈھائی ڈھائی ہزار روپے انعام دے گی

کراچی - بیمہ کے متعلق قومی زبانوں میں لٹریچر کی انتہائی کمی کے پیشِ نظر ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی نے فیصلہ کیا ہے کہ بیمہ پر دو معیاری کتابیں اردو اور بنگالی میں شائع کرے گی۔ اور جس مصنف کا مسودہ منتخب ہوگا اسے ڈھائی ہزار روپے نذر کرے گی۔ مسودوں کی وصولی کی آخری تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء مقرر ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق ڈائریکٹر سنٹرل بنگالی بورڈ پروفیسر منیر چودھری لیکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر عبداللہ فاروق صدر شعبہ کامرس ڈھاکہ یونیورسٹی پر مشتمل کمیٹی بنگالی مسودے کا انتخاب کرے گی اور فیض احمد فیض، ابن انشا اور شان الحق حقی بہترین اردو مسودہ منتخب کریں گے مسودوں کی دو نقول ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لیمیٹڈ قمر ہاؤس بندر روڈ کراچی کے پتہ پر ارسال کی جائیں۔

نیاز فتحپوری پر تحقیق

علی گڑھ - جواں سال ادیب و شاعر امیر عارفی علیگ ایم اے جو گولڈ میڈلسٹ بھی ہیں، ان دنوں علامہ نیاز فتحپوری کی شخصیت اور ان کے فن پر تحقیقی کام کر رہے ہیں -- انہیں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے اسکالرشپ دیا ہے، اور ان کے

نگراں مشہور نقاد مجنوں گورکھپوری ہیں۔ نیاز فتح پوری کے عزیز و اقارب اور یارانِ نجد سے امیر عارفی نے درخواست کی ہے کہ وہ اس تحقیقی کام میں ان کی مدد کریں۔ اور ۴۔ مارلین روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پتہ پر ان سے رابطہ قائم فرمائیں۔

فیضی رحمین کی آرٹ گیلری کا افتتاح

کراچی۔ پچھلے دنوں یہاں ایک پُروقار مگر سادہ سی تقریب میں بیگم عطیہ فیضی کی بڑی بہن ہر ہائینس نازلی بیگم آف جنجیرہ نے ڈینسو ہال میں فیضی رحمین آرٹ گیلری کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر ڈویژنل کمشنر سید دربار علی شاہ نے رحمین کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر آج بیگم عطیہ فیضی زندہ ہوتیں تو وہ اس آرٹ گیلری کو دیکھ کر انتہائی خوش ہوتیں۔ جو اُن ہی کی فرمائش پر بنائی گئی ہے۔ کمشنر نے بلدیہ کو رحمین کے شاہکار جمع کرکے آرٹ گیلری قائم کرنے پر خراجِ تحسین پیش کیا۔

رائٹرز کلب کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز

کراچی۔ رائٹرز کلب نے جسے پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کراچی نے پچھلے دنوں قائم کیا ہے اور جس کا افتتاح کمشنر کراچی جناب دربار علی شاہ کر چکے ہیں اپنی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ شاخ کراچی کی مجلسِ عاملہ کے سرگرم رکن سرشار صدیقی اس کے اعزازی سکریٹری ہیں، جو شبانہ روز رائٹرز کلب کی سود و بہبود کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ کلب پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کلب ہے، جسے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی تفریحِ طبع اور ادبی و ثقافتی تقریبات کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اب تک نئے افسانہ نگاروں اور نئے شعراء کے تعارفی جلسوں کے علاوہ شام موسیقی بھی منائی جا چکی ہے۔ ان تقریبات میں کراچی کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ رائٹرز کلب کی مجلس منتظمہ کئی اور ثقافتی تقریبات کے انعقاد کا پروگرام تیار کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ رائٹرز کلب سے ادیبوں کی دلچسپی میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔ اور کراچی ایسے مشینی شہر میں یہ کلب جلد ہی ادیبوں کے اجتماعات کا مقبول ترین مرکز بن جائے گا۔

اُزبکستان میں منٹو پر تحقیق

ماسکو۔ ازبکستان کے ماہر لسانیات زینت اللہ اشور بائیف نے پاکستان کے مشہور ادیب سعادت حسن منٹو پر تحقیقاتی کام ختم کر لیا ہے۔ وہ تین سال سے منٹو پر کتاب لکھ رہے تھے۔ اشور بائیف نے سعادت حسن منٹو کے بارے میں لکھا ہے "فن کارانہ اظہارِ بیان کے لحاظ سے اُن کی کہانیوں کو اردو ادب میں اولین جگہ حاصل ہے۔" انہوں نے اپنی کتاب میں منٹو کی کئی کہانیوں کا ترجمہ بھی ازبک زبان میں کیا ہے۔

آزاد کشمیر کی سرکاری زبان: اردو

نیا میرپور۔ گذشتہ دنوں آزاد حکومت و کشمیر ریاستی کونسل نے صدر آزاد کشمیر جناب محمد ابراہیم خان کی صدارت میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ آزاد کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔

پروفیسر آل احمد سرور کا نیا اعزاز

نئی دہلی - وزارت تعلیمات حکومت ہند نے بھارتی بھاشا کمیٹی کے نام سے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی ہے، جو حکومت کو جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے سلسلے میں مشورے دے گی اور سفارشات کرے گی۔ کمیٹی کے صدر وزیر تعلیم ہوں گے اس کمیٹی میں ہر ریاست کے ایک نمائندے کے علاوہ دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج چودہ زبانوں میں سے ہر ایک کا کوئی ممتاز مصنف یا ادیب بھی نمائندہ نامزد کیا گیا ہے اردو کی نمائندگی کے لئے پروفیسر آل احمد سرور کو نامزد کیا گیا ہے

اردو میں بچوں کے ادب پر ڈاکٹریٹ

لاہور - پنجاب یونیورسٹی نے بہاول پور انٹر کالج کے لیکچرر اسد اریب کو "اردو میں بچوں کا ادب" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل محمود پرویز کاکوی اسی عنوان سے ایم اے اردو کے لئے اپنا مقالہ سندھ یونیورسٹی میں لکھ چکے ہیں۔

پنجابی مجموعۂ کلام پر انعام

لاہور - رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان شاخ لاہور نے نوجوان شاعر رؤف شیخ کو ان کے پنجابی مجموعۂ کلام کو سال گزشتہ ۱۹۶۶ء کی بہترین تخلیق قرار دے کر گلڈ کی جانب سے پانچ سو روپے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

عرفی اور فیضی کے متعلق کتابیں لکھی جائیں گی

لاہور - پبلشروں کی ایک امریکی فرم نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر کو عرفی اور فیضی کے متعلق کتابیں لکھنے پر مامور کیا ہے۔ عرفی اور فیضی برصغیر کے مقبول فارسی کے شاعر گذرے ہیں۔

یادیں اور آنسو

مجاز کی یاد میں

کراچی - گذشتہ دنوں جناح پولی ٹیکنیک ناظم آباد کے گوشۂ ادب کے زیر اہتمام مشہور و ممتاز ادیب سید سبط حسن کی صدارت میں "یوم مجاز" منایا گیا — پہلی نشست میں اشتیاق طالب، عتیق احمد، انجم اعظمی، اور مجتبیٰ حسین نے مجاز کی شخصیت وفن پر مضامین پڑھے۔ اور سحر انصاری اور شاہد عشقی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ دوسری نشست میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کئی نمائندہ شاعروں نے حصہ لیا۔

عصمت چغتائی - فیض احمد فیض اور ضیاء الحسن موسوی کو صدمہ

○ گذشتہ دنوں مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف کا حرکت قلب بند ہونے کے سبب بمبئی میں انتقال ہو گیا۔

○ پاکستان کے مایۂ ناز شاعر فیض احمد فیض کی والدہ لاہور میں رحلت کر گئیں۔

○ ممتاز ادیب ضیاء الحسن موسوی کی والدہ کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ادارۂ افکار اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

یہ عمارتیں ایک جھلک ہیں اس عظیم تر پاکستان کی جو ہمارے شہروں اور دیہی علاقوں میں اُبھر رہا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان سب کی مضبوطی کا راز ایک ہی ہے۔ وہ ہے، زیل پاک اور میپل لیف فیکٹریوں میں تیار ہونے والی اعلیٰ قسم کی ڈبلیو پی آئی ڈی سی سیمنٹ کا استعمال!

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
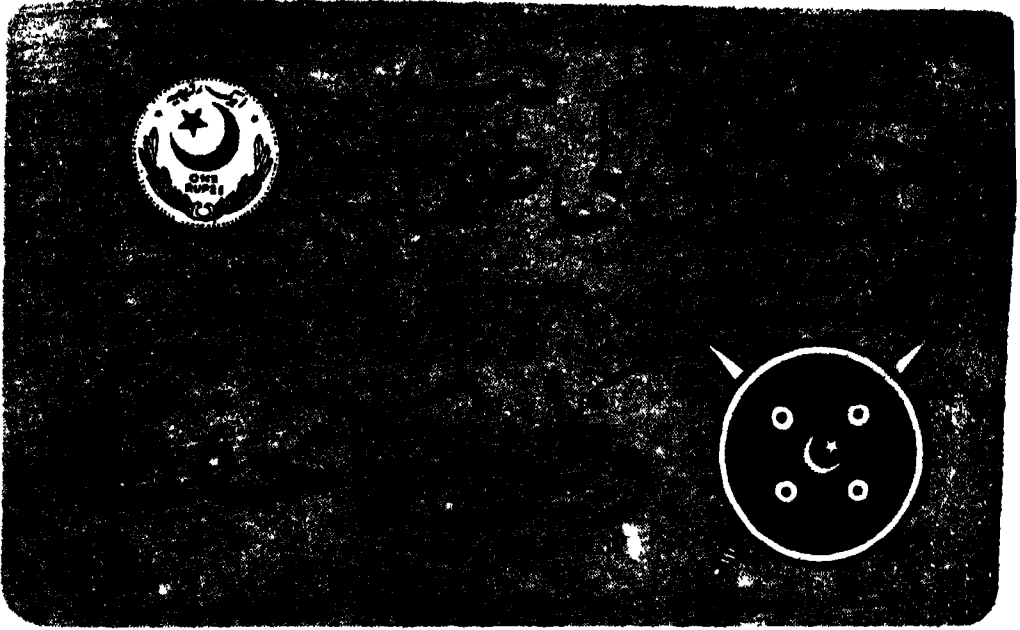
ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ میں سرمایہ لگاکر پہلے سے زیادہ منافع
کمانے کے ساتھ ساتھ، ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کی طمانیت بھی حاصل کیجئے۔

دفاعی بچت سرٹیفکیٹ کی چند اہم خصوصیات:-

اگر آپ یہ سرٹیفکیٹ پانچ برس تک رکھیں تو منافع ۶ فی صد ملے گا۔

اگر مزید پانچ برس رکھیں تو منافع ۸ فی صد ہو جائے گا۔ یعنی ۶ فی صد منافع اور مزید ۲ فی صد بونس۔ اس طرح دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپے ۱۸۰ روپے بن جائیں گے۔

منافع اور بونس دونوں پر ٹیکس کی مکمل چھوٹ ہے۔ آپ کی لگائی ہوئی ابتدائی رقم پر بھی انکم ٹیکس کی رعایت ملتی ہے یعنی اتنی رقم آپکی آمدنی میں سے منہا کرکے ٹیکس لگایا جاتا ہے۔

ایک آدمی ۲۵ ہزار روپے تک کے ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ خرید سکتا ہے، اور ساجھے میں ۵۰ ہزار روپے تک۔ ادارے اس سے بھی زیادہ رقم لگا سکتے ہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم بھی جس قدر چاہیں ان میں لگا سکتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔

ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ

۵ روپے سے لے کر ۵۰۰۰۰ ہزار روپے تک مختلف مالیتوں کے سیونگز سرٹیفکیٹ، اسٹیٹ بینک آف پاکستان، منظور شدہ بینکوں اور ڈاک خانوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔
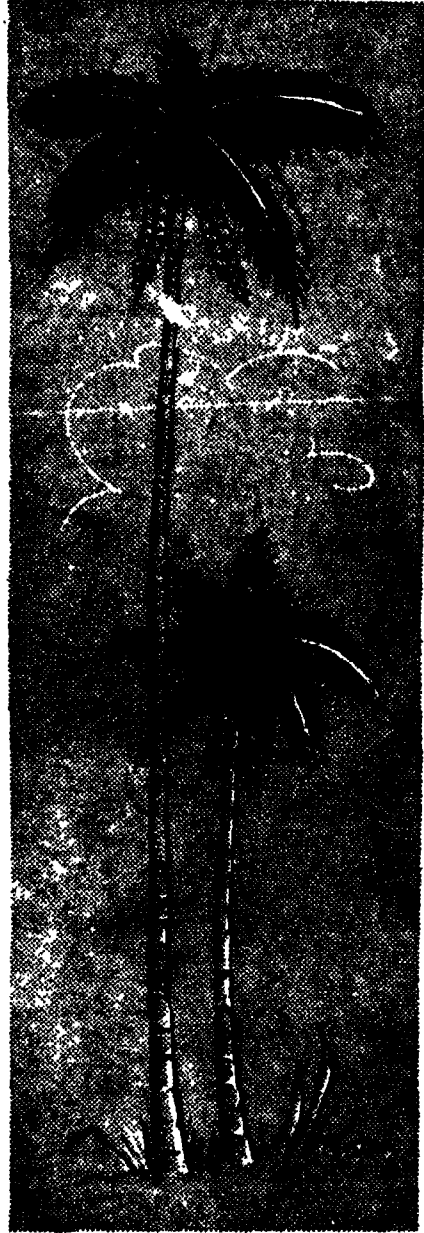
افکار دوستوں سے

ایک درخواست

خریداری مہم میں سرگرمی سے حصہ لیجئے،
اچھے اور معیاری ادب کی حوصلہ افزائی کیجئے!

افکار خود بھی پڑھیے
اور عزیزوں اور دوستوں
کو بھی اس کے
مطالعہ کی دعوت دیجئے

زرسالانہ صرف بارہ روپے
ادا فرما کر آپ اور گھر کا ہر فرد افکار سے استفادہ کر سکتا ہے

افکار، اردو ماہناموں کی آبرو ہے
افکار، آپ کا اپنا رسالہ ہے

افکار کی
توسیع اشاعت میں حصہ لے کر تعاون کیجئے

زرسالانہ اس پتہ پر بھیجئے:
منیجر ماہنامہ افکار،
رابسن روڈ کراچی

مدیر و ناشر صہبا لکھنوی طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی دفتر: رابسن روڈ کراچی

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون ۳۹۹۳۱

سال: ۲۳ ○ شمارہ: ۱۹۰

مدیر
صہبا لکھنوی

زر سالانہ	بیرونی ملکوں سے		قیمت
۱۲ روپے	۲۴ شلنگ	۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۴۔ پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این۔ ڈبلیو نمبر ۹

ترتیب

جون ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

اشاریہ

اُردو اصطلاحات

مغربی پاکستان کی سرکاری زبان کی کمیٹی کے اعزازی سکریٹری حکیم احمد شجاع نے اعلان کیا ہے کہ ۹۳ ہزار سے زائد انگریزی الفاظ اور جملوں کا اردو میں معیاری ترجمہ اوران پر نظر ثانی کی جا چکی ہے۔ سرکاری زبان کی کمیٹی ممتاز ماہرین پر مشتمل ہے اس لئے یہ توقع ہے کہ جس رفتار سے کام ہوا ہے اسی رفتار سے بقیہ کام سنہ ۱۹۷۰ء تک مکمل ہو جائے گا، اور دستور کی مدت سنہ ۱۹۷۲ء سے دو سال پہلے ہی اردو کو تمام محکموں میں سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کیا جاسکے گا۔ یہ اعلان بلا شبہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ کیونکہ ابھی تک انگریزی زدہ ایک بڑا طبقہ صرف انگریزی کو ہی محکموں میں برقرار رکھنے اور اردو کی اہمیت کو کم کرنے پر تُلا ہوا ہے اور اُسی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا ہے جو آزادی سے قبل ہمارا مقدر تھی۔

اردو زبان نہ کل فرومایہ تھی نہ آج تہی دامن ہے۔ آزادی سے قبل بھی اردو ریاستوں میں سرکاری زبان کی حیثیت سے آزادانہ استعمال ہوتی تھی۔ حیدرآباد، بھوپال، رام پور، اندور، گوالیار، بہاول پور، سبھی جگہ اردو کا سکہ چلتا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے تو آزادی سے بہت پہلے ہی اُسے یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم قرار دے کر اردو کو سربلند کر دیا تھا۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ پاکستان میں آزادی کے بیس سال گذر جانے کے باوجود، انگریزی کا دلدادہ طبقہ جو خوش نصیبی یا بدنصیبی سے صاحبِ اقتدار بھی ہے اردو کو سرکاری اور قومی حیثیت دینے سے برابر ہچکچا رہا ہے۔ لیکن اب جب کہ مغربی پاکستان کی سرکاری زبان کی کمیٹی نے اصطلاحات کا تین چوتھائی سے زائد کام مکمل کر لیا ہے۔ ہمیں یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ اردو کو دستور کی مدت سے پہلے ہی رائج کرنے کے لئے دستور میں مناسب تبدیلی کی جائے اور جو کام سنہ ۱۹۷۲ء میں ہونا ہے اُسے سنہ ۱۹۷۰ء اور ممکن ہو تو اس سے پہلے ہی شروع کیا جائے۔ تاکہ یہ ملک بھی اپنی قومی اور سرکاری زبان پر فخر کر سکے۔ انگریزی بلا شبہ ایک ترقی یافتہ زبان ہے، اور اس کے علمی سرمائے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کیا کسی اجنبی زبان کی اہمیت کو تسلیم کر کے اپنی قومی زبان کی ضرورت و اہمیت کو پس پشت ڈال دینا مناسب عمل ہے؟ اگر نہیں تو پھر مغربی پاکستان کے تمام محکموں میں اردو کو رائج کرنے میں اب کیا عذر و مجبوری لاحق ہے؟

نیاز حیدر

منم آوارہ گردے

کون جانے ہمیں چلنا ہے ابھی کتنی دور
ہر قدم پر تجھے اصرار کہ منزل ہے کہاں
تیری پیشانی سے رہ رہ کے ابھرتے ہیں سوال
موجزن ہیں تری زلفوں میں پریشاں جذبات
جانتا ہوں کہ ان امواج کا ساحل ہے کہاں

اتنی بے تاب ہیں کیوں تیری کنواری نظریں
پھر وہی
پھر وہی بے وقت کے راگ
میں نہیں کہتا کہ تو یاد نہ کر
اپنا ایوانِ طرب ــــــ اور وہ خوش رنگ فضا
گل بدن
عطر فشاں
مسکراتے ہوئے لمحات
چھنکتی پازیب
میں نہیں کہتا کہ تو یاد نہ کر
لیکن اس یاد کو تو
رہزنِ راہِ محبت نہ بنا
زندگی تیری محبت کی قسم
صرف تیرے لئے ــــ میرے لئے ــــ مخصوص نہیں
میرا آدرش

مرا عزم جہاد
دائمی عشق کی خاطر بے چین
آشتی!
صلح!
کہ انساں نہ رہے غم کا شکار
آرزو سب کی حیات
آرزو سب کی نجات

مجھ پہ الزام کہ ہوں —— دشمن تزئین جمال
نازک اندیش!
زمانے کا چلن بدلا ہے
دیکھ اندازِ چمن —— رنگ چمن بدلا ہے
چھا گئیں بم کے دھماکوں پہ چٹکتی کلیاں
خندۂ گل سے چٹانوں کا جگر کانپ اٹھا
پھر بھی گر مجھ سے تجھے کوئی گلہ ہے تو رہے
تیرا پہلو
ترا کاشانہ
ترے خواب کی سیج
کل بھی محفوظ نہ تھی —— آج بھی محفوظ نہیں

عرصۂ جہد میں چل
توڑ کے زنداں کو نکل
توڑ زنجیر
یہ الجھی ہوئی زلفیں نہ سنوار
گرد آلود ہی رہنے دے حسیں چہرے کو
خواہ مشکل ہو کہ آساں یہ گذرگاہ مری
ساتھ چلنا ہے تو چل ورنہ بھلا نا ہوگا
میری راہوں کو نہیں ہے کسی منزل پہ قرار
ہر قدم پر تجھے اصرار کہ منزل ہے کہاں
کون جانے ہمیں چلنا ہے ابھی کتنی دور

قتیل شفائی

تعاقب

صَدیوں پہلے کا اک لمحہ آن گرا ہے دَھرتی پر
صَدیوں بعد ملا ہے لیکن میں نے اسے پہچان لیا

اس کی چال میں آ کر چین گنوائے صدیاں بیت گئیں
آج مگر پھر میں نے اس کو اپنا ساتھی مان لیا

آج بھی اِس لمحے کی میٹھی تانوں میں اک جادو ہے
ڈالے گا کس راہ پہ مجھ کو آج بھی میں نے جان لیا

وہ آکاش تھا، یہ دَھرتی ہے، لیکن کوئی بات نہیں
آج بھی میں نے اس لمحے کا اپنے سر احسان لیا

صَدیوں پہلے کا اک لمحہ آن گرا ہے دَھرتی پر

سوز ہوشیارپوری

رُباعیاں

کیا فکر جو دنیا کی نگہ سے پھر جاؤں
کتنا ہی میں افکار جہاں میں گھر جاؤں
اُس روز الٰہی تو اٹھانا مجھ کو
جس روز میں اپنی ہی نظر سے گر جاؤں

کیوں آنکھ مرے دل کا بھرم کھوتی ہے
ہنگام تبسم بھی یہ اب روتی ہے
پروازِ تخیل بھی ہے لعنت مجھ پر
ملتے ہی جُدائی کی خلش ہوتی ہے

کچھ مجھ کو مصائب نے بھی رکھا جکڑے
کچھ جسم کے اعضا بھی ہیں اکڑے اکڑے
چلتا ہوں بہر گام سنبھل کر یُوں بھی
پیری کا کڑا ہاتھ ہے کاندھا پکڑے

چہرے تو ہمارے بھی نہ یوں فق ہوتے
اچھا تھا اگر جاہلِ مطلق ہوتے
حساس نہ ہوتے تو نہ ہوتے یوں خراب
دنیا کا بھی منشا تھا کہ احمق ہوتے

ہر لحظہ رہا بن کے سوالی یا رب
ہر نعمتِ دنیا سے تھا خالی یا رب
افسوس بڑھاپے کی بھی پونجی چھینی
تو نے مری لاٹھی بھی اٹھالی یا رب

ستیر ہاشمی

شہر کی راتوں کا غم

جھوم کر ابرِ سیہ اٹھا
عروسِ مے کے دروازے کھلے
اب کیوں ہے کوئی غم تشنہ لبی
یہ جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ
دستِ عنبر افشاں
سرکشیدہ لوگ
رخساروں کی بہتی چاندنی
یہ شوخ ملبوسات
نظروں کی پرافشانی
نین سائن کا راہوں میں چراغاں
لغزشِ پائے خرامِ ناز
رقصِ دلدہی
یہ زلفِ آوارہ کی خوشبو
معصیت کی لہر
دل کے چور دروازے پہ دستک
سوچتا ہوں
جب ہتیلی پر ہو سکوں کا چراغاں
کون اٹھائے شہر کی راتوں کا غم
کیوں ہے کوئی غم تشنہ لبی

حسن حمیدی

دو نظمیں

حلقۂ زنجیر

یارو کہاں وہ رسم و رہِ چاک دامنی
موجِ صبا ہے حلقۂ زنجیر کی طرح
دیوارِ گلستاں پہ نئی رہزنی کے زخم
تحریر ہیں نوشتۂ تقدیر کی طرح
بے جا ہی پہ عظمتِ قاتل کی بات ہے
انصاف بے زبان ہے تصویر کی طرح

حرفِ آخر

کوچۂ یار کی دلبری ہو فزوں
سنگِ بیداد و تیرِ ملامت چلے
فکر کیوں کیجئے سر سلامت رہے
پھر سلاسل نے یاروں کو آواز دی
ہوگئے اور بھی خوں فشاں راستے
مقتلوں کی طرح گل فشاں راستے
گل فشاں مثلِ دستِ صنم راستے
زندگی کی طرح محترم راستے
اب اُسی راستے کا مسافر ہوں میں
غم کی تاریخ کا حرفِ آخر ہوں میں

(سنٹرل جیل سکھر میں لکھی گئیں)

حسن طاہر

مختصر نظمیں

کسک

یہ روئی کے گالے سے بادل کے ٹکڑے
یہ شفاف چمکیلی کرنوں کے تیر
سمندر کے جھاگوں سے
سیپیوں سے
خوشبو کے جھونکوں سے
آکر چلے جانے والوں سے
پوچھو
یہاں اور وہاں کیا ہے؟

کنواری

نہ کہنا کسی سے
نہ کہنے کی بات!
کہیں وہ نہ سن لے
یہ ہے جس کی بات
کوئی اور سن لے تو ہو جائے کیا
مگر اُس سے کہہ دوں
یہ کہنے کی بات؟

خلیل تنویر

دل کی آگ

اِن باتوں پر دھیان دھرو تم
ان باتوں کو
دیوانے کا خواب نہ جانو
دل میں میرے کچھ ایسے بھی خواب بنے ہیں
جو ماضی کے دھندلے درپن بنے ہوئے ہیں
کیا بوڑھی "تاریخ بتائے ؟
کتنے ظلم ہوئے ہیں اس دھرتی کے اُوپر
کس نے کتنا درد سہا ہے
کس نے کتنا زہر پیا ہے
جو کچھ ڈھونڈو، میرے دل کی آگ میں ڈھونڈو

مہدی اظہر

ارتقار

فرش پر ٹوٹ گیا جہل کا بھاری پتھر
پردۂ دہر پہ اُبھرا ہے نیا عکسِ خیال
اک قدم اور سہی کاہکشاں کی جانب
ہے مگر چہرۂ تسکین پہ اک گردِ ملال

چاندکو چھُو ہی گیا ناخنِ انگشتِ شعور
پھر خلاؤں میں ہوا پرچمِ تسخیر بلند
چشمِ امکاں میں اُتر آئے کئی خواب نئے

انجم اعظمی

عمرانی علوم کی تعلیم

بیسویں صدی تک آتے آتے علم و آگہی کے راستے اتنے واضح اور روشن ہو چکے ہیں کہ انسان فردا میں بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ جمہوریت کا جو نقشہ افلاطون نے آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل کھینچا تھا اُسے لوگوں نے عینی اور تصوراتی قرار دیا۔ افلاطون نے معاشرہ کی بابت بہت سی اچھی اچھی باتیں جن پر عمل پیرا ہونے کے امکانات نہیں تھے اپنی کتاب میں لکھ دی تھیں۔ اس کے مقابلے میں مارکس نے جب جدلیاتی اور مادی ترقی کے ذریعے فردا میں ایک ایسے سماج کی تشکیل پانے کی خبر دی جو افلاطون کی جمہوریت سے بھی زیادہ مثالی ہے تو اسے عینی اور تصوراتی نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ حسن و مسرت کا حصول صدیوں تک عام انسانوں کے لئے ناممکن رہنے کے بعد اب معاشی، مادی اور انسانی وسائل کی دسترس میں ہے۔

یورپ نے سرمایہ دارانہ عہد کے طبقاتی سماج کا عذاب سارے عالم پر مسلط کر دیا، لیکن اس کا ایک کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ آدمی کو مابعد الطبیعاتی جھگڑوں سے نکال کر اپنے آپ سے نبرد آزما ہونے، فطرت کے اصولوں کی دریافت سے وسائل پیدا کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرنے، اور گناہ و ثواب کی سرحدیں عبور کر کے اپنی خواہشوں اور تمناؤں میں آباد ہونے کا سلیقہ عطا کیا اور علمی حیثیت ہی سے سہی، معاشرہ کی سب سے بڑی قدر آدمی کو مانا۔ لیکن چونکہ معاشرہ اور آدمی سے متعلق چند سوالوں کے تشفی بخش جوابات یورپ کی کتابوں میں بھی نہیں ملتے اس لئے عمرانی علوم کی تعلیم ہمیں ان سوالوں کی روشنی ہی میں دینا ہوگی۔

ممکن ہے بعض حضرات مجھ سے یہ کہیں کہ کتابوں میں ساری باتیں موجود ہیں۔ یہ قصور ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد کا ہے جو اس سے مستفید نہیں ہوتے یا نہیں ہونا چاہتے۔ اور اس میں کسی شک کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے یہاں علم کا شوق بہت کم ہے۔ اس لئے بے شمار علمی معاملات میں پڑھے لکھے طبقے پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہماری قوم میں خرابی کی دونوں ہی شکلیں موجود ہیں۔ لوگ محدود فکر رکھتے ہیں بڑی کتابوں سے انہیں دلچسپی نہیں ہے۔ دولت کی حرص ایسے لوگوں میں بھی پیدا ہو چکی ہے جن سے توقع تھی کہ یہ آزمائش سے گذر جائیں گے۔ دوسرے علم کو آگے بڑھانے والے افراد دو چار کے علاوہ یہاں نظر نہیں آتے، اور دو چار کا ذکر بھی رعایتاً اس لئے کیا جا رہا ہے کہ مردہ سے مردہ حالت میں بھی ایک قوم کے اندر چند زندہ عناصر بچ جاتے ہیں جو اس قوم کو جلد یا دیر دوبارہ زندگی عطا کرتے ہیں۔

ان دونوں حالتوں کے یکجا ہونے کے نتیجے میں ایک تیسری حالت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے کہ زندہ عناصر کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ قومی سطح پر شعور کی جگہ سستی جذباتیت لے لیتی ہے۔ اور جو دو چار افراد کام کرنے والے ہوتے ہیں، جنہیں علم و دانش سے غرض ہوتی ہے اگر اپنے اوپر دیوانگی نہ طاری کرلیں، انتھک محنت، فکر میں تلوار جیسی تیزی اور خیال کے بے باک، سچے اور حسین اظہار کو اپنا شعار نہ بنالیں، اور زمانے کے انعام و اکرام سے بے نیاز ہوکر مصروف عمل نہ ہوجائیں تو زندگی کا سارا سرمایہ ڈوب جائے۔

زندگی کے ایسے کسی بھی موڑ پر بحران ہم سے امید، ہمت، حوصلہ اور صداقت کے تصور کو چھین لینا چاہتا ہے، لیکن ایک آتش پنہاں جسے قوت حیات کی تازہ رو کا نام دے سکتے ہیں نئی دنیا کی تعمیر کی لگن بھی پیدا کرتی ہے، ایسی لگن جو بحران کو ختم کرکے حیات کی بقا کے نئے سامان فراہم کردیتی ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ بحران دور ہوجاتا ہے، اور انسان پہلے سے بھی زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔ اسی سے نظریۂ ارتقا عبارت ہے۔ لیکن آج زندگی کے جس موڑ پر ہم کھڑے ہیں وہاں کی بحرانی کیفیت نئے نئے سوال اٹھا رہی ہے۔

یونانیوں کے زمانے سے یوروپی تہذیب تک یہ سارا علم کیوں ہمارے کام نہیں آرہا ہے۔ ہم کیوں تیسری جنگ کے ہولناک اندیشوں سے نجات نہیں پارہے ہیں۔ فطرت کا کارخانہ پہلے ہی سے موجود تھا انسان کی بنائی ہوئی مشینوں سے بھی ہماری ضروریات زندگی کیوں پوری نہیں ہوئیں۔ ان سارے سوالوں کا جواب عمرانی علوم کے ماہرین کو دینا ہے۔ ان علوم کے اساتذہ سے بھی پوچھنا ہے کہ معاشرہ کے عنوان سے ان سوالوں کا کوئی جواب ان کے پاس ہے یا نہیں۔ اور پڑھاتے وقت وہ اپنے ذہین طالب علموں کو کس طرح مطمئن کرتے ہیں۔

کیا کچھ کرنے دھرنے، سوچنے سمجھنے کے بجائے آج بھی ہم مشیت پر ساری ذمہ داری ڈال کر گذر جانا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کسی استاد، ماہر علم و فن کی عزت و احترام بے معنی بات ہوکر رہ جائے گی۔ اور ہمارے یہاں ایسا ہوتا رہا ہے۔ یہ ماننے کے لئے کوئی شخص ہرگز تیار نہ ہوگا کہ سارے ہی لوگ جان بوجھ کر اساتذہ اور اہل علم کا احترام نہیں کرتے بلکہ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان حضرات نے بھی علم کی پیاس اور نصب العین کی لگن کے بجائے الفاظ کی تجارت سے دلچسپی لینی شروع کردی ہے۔ جہاں تک مشیت کا سوال ہے جس گھڑی آدمی کو فطرت نے شعور کی دولت سے نوازا تھا اپنی تخلیقی قوتوں کا شریک ہی نہیں بنایا تھا بلکہ انسانی ارادہ کی شکل میں جبر کو اختیار سے بدل دیا تھا۔

اسی اختیار کا ایک پہلو ہمیں معاشرتی تنظیم سے متعلق آدمی کی مسلسل کوشش میں ملتا ہے جس کی نمائندگی سماجی علوم کرتے ہیں۔ سیاسیات، معاشیات اور سماجیات وغیرہ کے شعبے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ان علوم کے ذریعہ آدمی اپنے لئے ایک بہتر معاشرہ کو جنم دے کر زندگی کو نسبتاً آسان بنا لینے کا متمنی ہے۔ آدمی کی اس خواہش سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اخلاقیات کا علم بھی خالص عمرانی نوعیت کا ہے اور سارے علوم میں اس کی جگہ ہے۔ اس کا انسانی جبلت سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ انسانی فطرت سے اخلاقیات کے گہرے تعلق کے باب میں اس کے سماجی قدر بننے سے پہلے بہرصورت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ انسان کی خواہش اور شعور کی پیداوار ہوتی ہے۔

یہاں جبلت اور فطرت کے فرق کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک کا تعلق صرف حسی زندگی سے ہے جو شعور

کا احاطہ نہیں کرتی اور اپنے آپ کو حیوانی سطح سے اوپر نہیں لے جا سکتی۔ جب کہ فطرتِ انسانی ان کے اندر کے ایک ایسے بنیادی نظام کا نام ہے جو کائنات کے خارجی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کو عالمِ اصغر کہا جاتا ہے جو چھوٹے پیمانے پر بجائے کائنات ہی کی ایک معنوی تصویر ہے۔

سماجیات کے عالموں نے اکثر فطرت کو ایک ایسی خارجی حقیقت سمجھا ہے جس سے انسان متصادم رہتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اسے اپنی بقا کے لئے فطرت سے مسلسل جنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہاں فطرت کو ماحول کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے ورنہ جس طرح انسانی ذہن شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی مجموعی حیثیت اور کیفیت کا نام ہے اسی طرح فطرتِ انسانی جبلت، شعور، اور کائنات کے بنیادی اصولوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فطرت کو کثرتِ عناصر سے تعبیر کیا جائے، بلکہ تجزیہ سے گزرنے کے بعد وہ ایک مکمل وجود، اکائی اور وحدت کی متحرک اور زندہ سطح بن کر سامنے آتی ہے۔

کائنات کی ہر شے کی طرح انسان بھی فطرت کی پیداوار ہے اور اسی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ اس کے وجود میں بھی وہی اصول کارفرما ہیں جو اس کے چاروں طرف اس کائنات کے اندر جاری و ساری ہیں وہ جنگ کرنے کے بجائے اپنی فطرت کا ادراک حاصل کرتا ہے تاکہ عمل کی اضطراری قوتیں اس کے ارادوں اور جذبوں کی معنویت حاصل کریں۔

فطرت کا ذکر چاہے انسان کے واسطے سے ہو یا کائنات کے تعلق سے۔ اس سے مراد ماہیت اور حقیقت ہے جب ہم انسانی فطرت کے بجائے صرف فطرت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد کائنات کی حقیقت کے ہوتے ہیں، جو انسان کی داخلی زندگی میں اسی طرح موجود ہے جس طرح اس کے خارج میں۔ جبلت فطرت کی پابند ہے اور انسان کی حیوانی خواہشات مثلاً بھوک، پیاس اور جنسی خواہش کو ابھارکر اسے اس کا موقع بہم پہونچاتی ہے کہ وہ انہیں دائرہ شعور میں لاکر تہذیب ذات اور تہذیب معاشرہ میں بدل دے۔

جبلت سے تہذیب تک کا ارتفاع یا ارتقائی سفر داخلی طور پر انسانی فطرت کی نامیاتی صداقت کا اظہار اور خارج میں سماجی قدروں کی پیدائش کا مسلسل عمل ہے۔ اسی لئے علوم عمرانی کے اساتذہ کو معاشرتی نظام کی تعلیم کچھ اس انداز سے دینی چاہئے کہ فرد اور جماعت کے تضاد کا تدارک ہو سکے۔ کیونکہ دونوں ہی سے مراد انسان یا آدمی ہے۔ چاہے فرد کو زیادہ اہمیت دی جائے یا جماعت کو۔ دونوں صورتوں میں تضاد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دراصل اس ذیل میں انسانی فطرت اور سماجی قدروں کے مطالعے سے ایک نئے نظام کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جو فرد اور جماعت کی مکمل ہم آہنگی چاہتا ہے اور اسی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ عمرانی علوم کے اساتذہ کے سامنے آج اگر یہ تصور نہیں ہے تو ان کا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو کر کبھی فرد کی آزادی اور اہمیت کی طرف جھک جائے گا، اور کبھی جماعت کی تنظیم کی جانب۔ وہ جماعت کی تنظیم عنصر کو آزادی سے محروم کر کے کھوکھلا پن پیدا کر دیتا ہے یا فرد کی آزادی کو جماعت کی تنظیم سے کاٹ کر انارکی کی طرف لے جاتا ہے اس مرحلے میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنے والا منطق کے بجائے جذباتیت کا سہارا لیتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ خود اس کے ذہن کو شبہات سے ہرگز نجات نہیں دلا سکتا۔

لیکن اہم بات یہ نہیں ہے کہ چند ذہنوں کو شبہات سے نجات نہیں مل رہی ہے بلکہ زندگی کی اس شاہراہ پر جہاں آج قافلے رواں دواں مستقبل کی دھند میں لپٹی ہوئی منزلوں کے خواب دیکھ رہے ہیں اعتماد کا ایک نیا سورج چمک رہا ہے

ارتقاء کی ایک نئی پرورش ہو رہی ہے۔ عمرانی علوم کے ذریعے آج ہمیں فرد اور جماعت دونوں ہی کا حساب چکانے کی امید ہے چونکہ جماعت افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہے، اس لئے فرد کے ساتھ ناانصافی ہو یا جماعت یعنی افراد کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ناانصافی کو ایک معاشرہ میں پھولنے پھلنے کے مواقع دے دیئے گئے ہیں۔ اس تضاد کو مٹانے کے لئے عمرانی علوم کے ان تمام اصولوں کو رد کرنا پڑے گا جن کا اختراع انسانی فطرت، فرد اور معاشرہ کے بارے میں غلط نظریات کی بناء پر ہوا ہے اور جن کے خمیر میں ناانصافی ہے۔

اب تک ایسا ہوتا آیا ہے کہ معاشرتی قوانین وضع کرنے والے یہ سمجھتے آئے ہیں کہ جماعت کو اہمیت دیتے وقت اُن کے خیالات ایک فرد کے خیالات ہوتے ہیں، اور اگر ان کے خیالات کی تائید میں جماعت کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا تو بحیثیت فرد ان کے خیالات کی پذیرائی بھی کی گئی ہے اور اگر وہ فرد کی مکمل آزادی کی بات کرتے ہیں اور دوسرے ان کے نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں تو خود بخود ایک فرد اپنے ہم خیال لوگوں کی موجودگی میں ایک جماعت میں بدل جاتا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فرد اور جماعت دونوں ہی خیالات، نظریات، جذبات اور عمل کی دنیا میں کسی نصب العین کی طرف مائل ہیں جس کا ایک نہایت سادہ نام انسانی سربلندی ہے جس کی حیثیت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔

انسانی سربلندی کے عنوان سے عمرانی علوم میں ایک نئے باب کا آغاز کرنا چاہئے جس میں جماعت سے مراد افراد کی بھیڑ بھاڑ کے بجائے انسانوں کی آبادی ہو، اور ساتھ ہی ساتھ فرد کو انسان سمجھ کر اس کی خواہشوں، خوابوں، خیالوں اور ولولوں اور حوصلوں کے مطابق معاشرہ کی تعمیر کا منصوبہ ہو ——— معاشرہ آخر ایسا کیوں ہو کہ افراد عاجز آ کر اپنی ذات کے خول میں سمٹ جائیں، اور فرد کی غیر ذمہ داریاں اس حد تک کیوں بڑھ جائیں کہ اس کی آزادی دوسروں کی غلامی کے مترادف ہو۔ اگر فرد سے مراد کسی سماج کا کوئی خاص فرد نہیں بلکہ ہر فرد ہے اور جماعت سے مراد ایک ایسا معاشرہ جو افراد کی اجتماعی خواہشات کا ترجمان ہوتا ہے تو فرد اور جماعت کا تضاد باقی نہیں رہتا۔ لیکن کتنے ایسے استاد ہیں جو عمرانی علوم کی تعلیم دیتے وقت اپنے عہد کے مشکل سوالوں کو حل کرنے کے سلسلے میں طلباء کی سچے دل سے رہنمائی کرتے ہیں۔

ہماری نگاہوں کے سامنے جو معاشرے ہیں وہ مردہ رسوم، عام بے راہ روی اور افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ حشر کے دن نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ کون جانے، لیکن اس دنیا کا ہر دن حشر کا دن ہو رہا ہے۔ لوگ نفسی نفسی کے عالم میں مبتلا ہیں۔ سیاست داں خود غرض اور مکار ہیں۔ ماہرینِ معاشیات انسانوں کو پیٹ کا غلام بنانے میں مشغول ہیں۔ مرد اور عورت کے صنفی فرق سے جذبۂ رفاقت کے بجائے ملکیت اور تجارت کی ہوس نے جنم لیا ہے۔ علم و تحقیق کے آتش کدے سرد پڑے ہوئے ہیں۔ دوستوں اور رفیقوں کے جلسے ختم ہوئے، سازشوں کی آڑ میں چالاک اور عیار دشمنوں کے قدم ہیں۔ ایک طرف سونے کی قیمت بڑھ رہی ہے دوسری جانب انسان ہو بہت ارزاں ہے اور زندہ بچ رہنے والوں کی سانسوں میں بارود کے دھوئیں سے بڑی گھٹن ہے ——— یہ ہماری دنیا ہے۔ یہاں نسل، مذہب، رنگ اور قومیت کے بُتوں کو پُوجنے والے رہتے ہیں جن سے نہ کوئی یہ پوچھتا ہے کہ تم کرۂ ارض کی زندگی کو ہلاکت میں ڈال کر اپنی کون سی آرزو پوری کر رہے ہو اور نہ یہ کہتا ہے کہ انسانوں کی اس بھیڑ کا نام معاشرہ نہیں ہو سکتا جہاں دو آدمی بھی مل جل کر رہنا نہیں جانتے۔

عمرانی علوم کے اساتذہ کو چاہئے کہ طلباء کو اپنے خوابوں میں خود بنا سکھائیں، اور انہیں اپنے آپ کو اور پھر دوسروں کو

انصاف اور محبت کی میزان پر تولنا سکھائیں تاکہ ان کے دلوں کی روشنی پھیل کر معاشرہ کو خوف اور بے یقینی کے اندھیرے سے نجات دلائے۔ تاریخ میں ہزارہا پیغمبر اور فلسفی گذرے ہیں۔ اتنے بڑے لوگوں کو طالب علم اپنے مقابل پا کر ڈر جاتا ہے۔ اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ وہ انہیں اپنے وجود کی وحدت میں سمیٹ سکتا ہے تو ان سب کو الگ الگ جاننا اور سمجھنا بھی اس کے لئے دشوار نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ ملتیں جزوایات بننے کے لئے بلتی چلی جائیں گی، اور طالب علم ماضی کی اوٹ سے اپنے زمانے کا نمائندہ اور تاریخ کا فاتح بن کر ابھرے گا۔

عمرانی علوم کے سارے اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے طلبا کی داخلی زندگی میں ایک ایسے معاشرہ کو جنم دیں جس کی سماجی قدریں ان کی آرزوؤں کی ڈور سے بندھی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے معاشرہ کے وہ سارے اصول ٹوٹتے چلے جائیں گے جن کی وجہ سے انسان کی داخلی زندگی سے اس کے ماحول یا معاشرہ کا ایک فاصلہ قائم رہا ہے، جو اب تک انسانی روح کی لطافت کو برابر مجروح کرتے آئے ہیں اور ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا، جو اپنی قدروں میں انسانی فطرت کا جمال بھر کر تضادات کے دائروں سے باہر نکل آئے گا، اور تسخیر کائنات کا بے پایاں عزم لے کر امن و سلامتی کی شاہراہ پر چل پڑے گا۔

آغا افتخار حسین

پیرس سے ایک ایرانی کا خط

فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات

"فارسی خطوط" (جن کا مصنف خود مانتیسکیو ہی ہے) زیادہ تر دو ایرانیوں ازبک اور رضا کے نام سے لکھے گئے ہیں۔ یہ دونوں دوست ایران سے پیرس آتے ہیں، اور دوران سفر اور پیرس آنے کے بعد وطن میں اپنے دوستوں اور عزیزوں وغیرہ کو خط لکھتے ہیں۔ ان خطوں میں ایک ایرانی حرم سرا کی سازش کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے لیکن اس کہانی سے زیادہ اہم وہ تاثرات ہیں جو پیرس کی سوسائٹی کے بارے میں ان ایرانیوں نے خطوط میں بیان کئے ہیں۔ ان فرضی خطوط کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے مانتیسکیو نے خطوں کی تاریخیں اسلامی سن ہجری کے مہینوں محرم، صفر، وغیرہ میں درج کی ہیں۔ خطوں میں جگہ جگہ پیغمبر اسلام، اہل بیت، حضرت علی اور دیگر اماموں کا ذکر ہے۔ غرض مانتیسکیو نے پوری کوشش کی ہے کہ یہ خطوط مسلمانوں کے لکھے ہوئے معلوم ہوں۔

کتاب میں پہلا خط ازبک کا ہے جو اس نے ۱۵ / صفر کو لکھا ہے۔ (لیکن تاریخی اعتبار سے پہلا خط ایک اور ایرانی ذکی کا ہے جو اس نے ۱۲ / محرم کو لکھا) جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیشتر خطوط ازبک اور رضا کے ہیں۔ ازبک کے اندازِ تحریر میں سنجیدگی ہے اور رضا کے خطوط میں طنز و ظرافت ہے۔

ازبک کے خط مورخہ ۵ / رمضان[1] میں فرانس کی سوسائٹی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

> ازبک لکھتا ہے کہ اس نے چند روز پیرس کے قریب ایک مقام پر گزارے۔ یہاں وہ ایک اچھے کھاتے پیتے مہمان نواز فرانسیسی کا مہمان رہا۔ اس دوران میں اس نے بہت سے لوگوں کو دیکھا۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہیں دیکھ کر کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے۔ اس نے ایک فرانسیسی سے زیادہ دوستی کر لی۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں اپنے دوست سے سوال کیا کرتا تھا، اور وہ جواب دیتا تھا۔ ایک دن

---

[1] اڑتالیسواں خط۔

ازبک اور اس کا دوست ایک بڑی محفل میں شریک تھے۔ اس میں بعض لوگوں کے طور طریقے دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دوست سے سوالات کرے۔

چنانچہ ازبک نے پوچھا:-

"وہ شخص کون ہے جس نے ہمیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ وہ بڑے بڑے آدمیوں کی دعوتیں کرتا ہے جو آپ کے ملک کے بیشتر نوابوں (ڈیوک) کا دوست ہے۔ جو آپ کے وزیروں سے اکثر ملتا ہے جن سے ملنا آسان نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شخص بعض اوصافِ حسنہ کا حامل ہو لیکن اس کے طور طریقے کچھ ایسے گرے ہوئے ہیں کہ وہ اشراف میں شامل ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم میں بھی وہ کچھ زیادہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ میں ایک غیر ملکی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اچھی تربیت کی نوعیت تمام قوموں میں کم و بیش ایک ہی ہوتی ہے۔ اور اس شخص میں وہ تربیت بھی موجود نہیں۔ کیا آپ کے ملک میں شرفا کی تربیت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے؟"

اس کے دوست نے ہنستے ہوئے جواب دیا:-

نودولتا

"یہ ایک نودولتا ہے[1] یہ دولت میں دوسروں سے اتنا ہی بلند ہے، جتنا حسب نسب میں اوروں سے پست! ......"۔

ازبک نے اپنے دوست سے ایک سیاہ پوش موٹے سے آدمی کے بارے میں دریافت کیا۔ دوست نے جواب دیا:

واعظ

"یہ ایک واعظ ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ اعترافِ گناہ سنتا ہے۔ یہ عورتوں کے بارے میں ان کے شوہروں سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ عورتوں کی کمزوریاں پہچانتا ہے۔ اور عورتیں اس کی کمزوریاں جانتی ہیں:"

"یہ کیونکر؟" ازبک نے پوچھا "وہ تو ہمیشہ خدا کی رحمت کا ذکر کرتا ہے:"

"ہمیشہ نہیں" دوست نے جواب دیا "خوبصورت عورتوں کے کان میں وہ عموماً حضرت آدم کے جنت سے نکالے

---

[1] مانتسکیو نے یہاں "Farmier" لکھا ہے۔ انقلابِ فرانس سے قبل "Farmier" اُن زمینداروں کو کہتے تھے جو دھوکہ دے کر یا ناجائز دباؤ ڈال کر زمینوں پر قبضہ کر لیتے تھے، اور اس طرح جلد امیر بن کر "شرفاء" میں شامل ہو جاتے تھے۔

جانے کا قصہ بیان کرتا ہے:

"اچھا۔ معاف فرمایئے گا۔ وہ ہمارے سامنے پھٹے پرانے کپڑے پہنے کون بیٹھا ہے؟" ازبک نے پوچھا" وہ کبھی تو منہ بناتا ہے اور کبھی ایسی زبان بولتا ہے جو ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے":

دوست نے جواب دیا:

شاعر

"وہ ایک شاعر ہے۔ انسانوں میں سب سے زیادہ عجیب مخلوق۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایسے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ ہمیشہ ایسے ہی عجیب الخلقت رہیں گے۔ اسی لئے لوگ ان سے دور دور رہتے ہیں۔ بھوک اس شاعر کو اس مکان میں لائی ہے۔ میزبان اور ان کی بیگم نے اس کی اچھی طرح پذیرائی کی ہے..... اس نے اُن کی شادی پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ زندگی میں اس نے یہی کام سب سے اچھا کیا۔ کیونکہ یہ شادی اتنی ہی اچھی رہی جیسی کہ قصیدے میں پیش گوئی کی گئی تھی":

"اور وہ نوجوان کون ہے؟" ازبک نے پوچھا" جس کے بال بہت لمبے ہیں۔ جس کے انداز بیان میں دل آویزی کم اور رعونت زیادہ ہے۔ جو اوروں سے زیادہ تیز آواز سے بول رہا ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ وہ خوش قسمت ہے کہ اس دنیا میں موجود ہے":

بانکا

"یہ ایک بانکا ہے"[5] دوست نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد اتفاق سے وہ شخص جسے ازبک کے دوست نے "بانکا" کہا تھا گھوم پھر کر ازبک کی طرف آیا۔ گفتگو شروع کرنے کے لئے پہلے اُس نے رسمی طور پر موسم کے بارے میں اظہار رائے کیا، پھر باتیں کرتا ہوا ازبک کو باغ میں لے گیا۔

"میں اس دیہات میں اس لئے آیا ہوں" بانکے نے کہا "کہ صاحب خانہ کی بیگم کی تالیف قلب کروں۔ موصوفہ کے ساتھ میرے مراسم کچھ برے نہیں ہیں":

اس معنی خیز جملے پر ابھی ازبک غور ہی کر رہا تھا کہ "بانکے" نے مزید وضاحت کی۔ "پیرس میں میری ملاقات بہت سی حسین

---

[5] مانتسکیو نے "un hom me a bon nes fortunes" لکھا ہے۔ جس کے لفظی معنی ہیں "ایک خوش نصیب انسان"۔ لیکن فرانسیسی محاورے میں یہ الفاظ ایسے انسان کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو اچھا کھاتا پیتا ہو اور صنف نازک کے معاملے میں بھی خاصا کامیاب ہو۔ اس کے اوصاف کم و بیش ان لوگوں سے ملتے ہیں جن کے لئے اردو میں "بانکے" کا لفظ موجود ہے۔ انقلاب سے قبل فرانس کی سوسائٹی کے بانکے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتے تھے۔

عورتوں سے ہے۔ بلکہ میں کسی ایک کا ہو کے نہیں رہتا۔ اور وہ مجھے حاصل کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔"

ازبک نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا: "محترم۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مصروفیات اور مشاغل اتنے اہم ہیں جن کی وجہ سے ان باتوں کے لئے آپ کو وقت نہیں ملتا۔"

اس کا جو جواب بانکے نے دیا اُسے سُن کر ازبک حیران رہ گیا۔ بانکے نے کہا: "جی نہیں۔ میرے مشاغل اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ کسی شوہر کو مشتعل کروں یا کسی باپ کو زندگی سے عاجز کر دوں۔ مجھے ایسی عورت کو تنگ کرنے میں مزا آتا ہے جو مجھے چاہتی ہے اور مجھے اپنا بنانے کی کوشش کرتی ہے۔"

ازبک اس ملاقات سے بہت متاثر ہوتا ہے اور خط کے آخر میں لکھتا ہے:۔

"ایسے ملک کے بارے میں تم کیا کہو گے جہاں اس قسم کے لوگوں کو برداشت کیا جاتا ہے! جہاں ریاکاری، اوباشی، زنا بالجبر، فریب اور بے انصافی کر کے عزت حاصل کی جاتی ہے۔ جہاں ایسے آدمی کی قدر کی جاتی ہے جس نے ایک باپ کو بیٹی سے اور ایک شوہر کو بیوی سے محروم کر دیا ہو، اور باعزت اور پُرامن خاندانوں کا سکون چھین لیا ہو۔ اہلِ علی[1] خوش رہیں کہ وہ اپنے خاندانوں کو اس غلط قسم کی ترغیبات سے محفوظ رکھتے ہیں۔"

اور پھر خط کے آخر میں مانتیسکیو نے ازبک کی زبان سے ایسے جملے کہلوائے ہیں جن کا انداز بالکل مشرقی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی خوب صورت فارسی متن کا ترجمہ ہوں۔ ازبک لکھتا ہے:۔

"آفتاب کی درخشندگی بھی پاکیزگی میں اس شعلے کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو ہماری خواتین کے دلوں میں فروزاں ہے۔ ہماری بیٹیاں عصمت پر حرف آنے کے تصور سے بھی لرز جاتی ہیں ــــ ایسی عصمت جو فرشتوں یا آسمانی ہستیوں ہی سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

اے میرے وطن کی پاک سرزمین! جس پر آفتاب سب سے پہلے ضیا پاش ہوتا ہے، تُو ان جرائم سے آلودہ نہیں ہوئی جن کو دیکھ کر تاریک مغرب کو جاتے ہوئے آفتاب بھی اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے[2]!!"

یہ انداز بیان وہی اختیار کر سکتا ہے جسے مشرق کی سرزمین سے عقیدت اور محبت ہو۔ اس لئے مانتیسکیو کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں۔

(مسلسل)

---

[1] مانتیسکیو نے "enfants d'Hali" جس کے لفظی معنی "علی کے بچے" ہیں۔ غالباً مانتیسکیو کا مقصد سادات یا علی کے ماننے والوں یا عام مسلمانوں سے ہے۔

[2] مغربی ممالک میں دھوپ کم نکلتی ہے۔ اس لئے مغرب میں آفتاب کا اپنے چہرے کو چھپا لینا صنعتِ تعلیل کی اچھی مثال ہے۔

جمیل ملک

ادبی تحریکوں کا مسئلہ

مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ ادبی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ موجودہ دور میں ادب کی موت واقع ہو چکی ہے۔ میں اس حقیقت کو درست نہیں سمجھتا، اس لئے کہ زمانہ تو ماضی، حال اور مستقبل سے عبارت ہے۔ جو ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ماضی اپنا بہترین ورثہ حال کے سپرد کر دیتا ہے، اور حال کی رگوں میں دوڑتا ہوا تندرست خون مستقبل کی توانائی اور صحت مندی کا ضامن بن جاتا ہے۔ ہر دور کی زندہ اور پائیدار حقیقتوں ہی کی بدولت ادبی تحریکیں وقت کی آواز بن جاتی ہیں۔ لیکن کسی ایک دور کو، زمانے کا مقام دینے سے بحث میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح زمانے کی رفتار کبھی نہیں رکتی، اسی طرح ادبی تحریکیں بھی کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بحث میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ادبی تحریکوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہر دور کی ادبی تحریکیں اپنے دور ہی میں ختم ہو جاتی ہیں، اور ان کا تعلق آنے والے دور کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر ادب میں روایت کا مفہوم ہی ختم ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک دور کی ادبی تحریکیں دوسرے دور میں اپنا لباس بدل لیتی ہیں، لیکن دوسرے دور کا سانچہ پہلے دور کی مٹی ہی سے تیار ہوتا ہے۔ جس میں ڈھل کر جب نئی ادبی تحریکیں ابھرتی ہیں تو ان میں ماضی کی بو باس بھی ہوتی ہے اور حال کی گرمی بھی۔ ایک جز دوسرے جز کے ساتھ مل کر کُل کی تعمیر کرتا رہتا ہے اور میں اس کُل کو مستقبل سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس طرح مختلف ادوار کی صورت میں ادبی تحریکوں کا زمانہ کبھی ختم نہیں ہوتا، بلکہ کبھی سطح کے ادھر اور کبھی سطح کے نیچے ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔

ذرا سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی ادبی تحریکوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے۔ سر سید احمد خاں اور حالی کی ادبی تحریک کی بنیاد عقل، یقین اور عمل پر رکھی گئی تھی، جس کا تعلق اندر کی دنیا سے کم اور باہر کی دنیا سے زیادہ تھا، اس لئے کہ سر سید احمد اور اُن کے رفقا ذات سے زیادہ کائنات کو اہمیت دیتے تھے، نتیجتہً اُن کی تحریک جذبے کے بجائے اپنے دور کی سماجی ضرورتوں اور سیاسی تقاضوں کا اظہار بن کر رہ گئی۔ مگر عمل کے ساتھ ہی ردِ عمل کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا جو شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کے ہاں جوش اور جذبے کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اس نیم رومانی تحریک نے سر سید کی عقلی تحریک ہی کے آغوش سے جنم لیا۔ ان دونوں تحریکوں کے ساتھ ہی اُسی دور میں ایک تیسرا رجحان 'اودھ پنچ' کی صورت میں سامنے آیا۔ اس رجحان نے سر سید تحریک

کی عقلی روش سے علیحدگی اختیار کی، توانا قدروں کی تردید اور انکار کی روش سے اپنا رشتہ جوڑ کر سرسید تحریک کی شدت اور مقصدیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ آگے چل کر سرسید احمد اور حالی کی کلاسیکی تحریک ایک طرف مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کی آوازوں میں پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہے تو دوسری طرف شبلی اور آزاد کی نیم رومانی تحریک مخزن کے صفحات پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ اس رسالے کے اردگرد رومانی فن کاروں کا ایک ہجوم دکھائی دینے لگتا ہے۔ نیم رومانی تحریک نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی اور ایک باقاعدہ رومانی تحریک میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء تک کلاسیکی اور رومانی تحریکوں کے درمیان تصادم کی یہ فضا قائم رہتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں سرسید احمد اور حالی کی عقلی اور اصلاحی تحریک ایک اور موڑ کاٹتی ہے۔ اور ادب کی ترقی پسند تحریک میں جذب ہو کر قومی آزادی کی نقیب اور ترجمان بن جاتی ہے۔ مگر اس کا ردِ عمل بھی ہو کر رہتا ہے اور حلقۂ اربابِ ذوق وجود میں آتا ہے جو ادب میں فنی اور دوامی قدروں کو اپنا کر ایک طرف لاشعوری طور پر رومانی تحریک کی پرورش کرتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف مغربی فکر و فن سے اپنا رشتہ استوار کر کے جدید ادب کا علم بردار بن جاتا ہے۔

میری یہ مختصر باتیں سن کر آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہمیشہ ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب کو اپنا خون دیتا رہا ہے اور ایک ادبی تحریک سے دوسری ادبی تحریک جنم لیتی رہی ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا قیامِ پاکستان سے اب تک ادبی تحریکوں کے آگے بڑھنے کا یہ سلسلہ جاری ہے یا اب ادبی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ جس طرح سرسید کی ادبی تحریک اپنی حد سے بڑھی ہوئی مقصدیت کی وجہ سے روبہ زوال ہو کر بالواسطہ طور پر رومانی تحریک کی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہوئی تھی۔ اسی طرح ادب کی ترقی پسند تحریک انتہا پسندی کا شکار ہو کر ادب میں داخلی اور نفسیاتی رجحانات کو راہ دے گئی۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ جس طرح ابتدا میں شبلی اور آزاد کی نیم رومانی تحریک سرسید اور حالی کی کلاسیکی تحریک ہی کا ردِ عمل بن کر ابھری لیکن بعد ازاں یہ دونوں تحریکیں دو مخالف سمت میں بہنے والے دھاروں کی صورت اختیار کرتی چلی گئیں۔ اسی طرح ادب برائے زندگی اور فن برائے فن کی تحریکیں بھی اگرچہ باہمی تصادم ہی سے پیدا ہوئیں لیکن انہیں اس انتہا پسندی کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب آنے کی بجائے دور ہوتی چلی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی ادبی تحریکیں ایک دوسرے کو سنبھالا نہ دے سکیں۔ اور توازن کھو کر ایک عرصے تک چھوٹی بڑی بے شمار الجھنوں میں گرفتار رہیں۔ اس لئے اگر کچھ دیر کے لئے ذہن میں یہ سوال ابھر آئے کہ کیا ادبی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے؟ تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ مگر اس بات کو سچ ماننے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم ماضی کے بہترین ورثے کو اپنانے ہی سے انکار کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ادب برائے زندگی اور فن برائے فن کی تحریکیں جن متوازی راہوں پر چل نکلی تھیں، اور جس بیخ کے رجحان کی طرح مختلف انداز میں آج بھی اس کا ردِ عمل ہونا ہی تھا۔ آج ادبی تحریکوں کے ختم ہونے کی بات زیادہ تر ادیبوں اور فن کاروں کی جدید ترین پود کی طرف سے اٹھائی جا رہی ہے۔ جو یہ محسوس کر رہی ہے کہ اب فرد کی ذات کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینے کی ضرورت ہے۔ ردِ عمل کی حد تک تو یہ احساس قدرتی ہے مگر تاریخی حقائق سے بے خبری اور توازن میں کمی کی وجہ سے جدید تر اردو ادب میں اس تردیدی رجحان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ اب ادبی تحریکوں کا زمانہ ہی نہیں رہا کیونکہ یہ رجحان تو داخلی اور نفسیاتی ہے جو اظہارِ ذات کے نام پر احساسِ کمتری کی تہوں سے ابھرا ہے۔

ادبی تحریکوں کی اس مسلسل آویزش سے باشعور فن کاروں کے ذہن میں یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ ادب کو

مختلف خانوں میں بند کرنے کا رجحان ادب اور زندگی دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ اس کا خوش گوار ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ ادب میں نعرہ بازی کا رجحان تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ادب کی کلاسیکی اور رومانی تحریکوں میں مفاہمت اور یگانگت کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ دوریاں اور فاصلے کم ہو رہے ہیں اور اردو ادب آہستہ آہستہ ایک ہموار سطح اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جو ادیب اور شاعر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ چلو اچھا ہوا ادبی تحریکوں کا زمانہ ہی ختم ہو گیا اب اپنے لئے میدان کھلا پڑا ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ اُن کی شدید غلط فہمی ہے۔ یہ اندازِ نظر تو اُس وقت سے بے جان ہو چکا ہے جب چھ ستمبر کے فوراً بعد ہمارے ملک کے تمام فن کاروں نے بیک زبان ہو کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُنہیں اپنا کلاسیکی، رومانی اور تہذیبی سرمایہ آج بھی عزیز ہے۔ ادبی تحریکیں آج بھی زندہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج یہ تحریکیں خارجی سطح پر ہی متحرک نہیں ہیں بلکہ ان کی جڑیں وطن کی سرزمین میں دور دور تک پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ اس وسعت اور گیرائی کی وجہ سے اردو ادب کی کلاسیکی اور رومانی تحریکوں میں ایک امتزاجی شان پیدا ہو گئی ہے اور یہی اس دور کی امتیازی خصوصیت ہے۔

جوگندر پال

رائٹرز نوٹ بک

—— ادب زندگی کی ایک خاموش تحریک ہے، لہٰذا بڑے ادیب کی تحریر میں الفاظ سُنائی دینے کے بجائے خیالات کے سلسلے ...ی بن کر نظر آتے ہیں۔ ادبی تحریر سے صرف نگاہ کی سمتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، اس پر تکلّم اور سماعت کا گمان نہیں ہوتا۔

—— خیالات انسانوں کے مانند چھوٹے بڑے نہیں ہوتے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ چھوٹے آدمی کے ذہن میں وہی خیال کوتاہ معلوم ...تا ہے جو بڑے کے ذہن میں عظیم ہو۔

—— ذہانت اور شرافت ہٹولی دور کے ساتھ کے بعد ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتی ہیں، کیونکہ ہر دو کی نوعیت مختلف ...ے: شرافت مجلسی خوبی ہے اور ذہانت 'ذاتی'۔ ایک کی پہچان اس کی رضاکارانہ اطاعت ہے اور دوسری کی 'باغیانہ انا'۔ ...ن لئے شرفا کی ذہانت اور ذہین لوگوں کی شرافت پر شک کی گنجائش رہتی ہے۔ اس سیاق میں اگرچہ کسی اچھے شہری کی اولین ...رورت شرافت ہے، تاہم کسی اچھے فن کار کی شرافت کے ڈھول پیٹنا خود اُسی کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے۔ اچھے فن کار ...ا ذہین ہونا ناگزیر ہے، لہٰذا وہ شرفا کے لب و لہجہ میں کبھی یہ قبول نہیں کرے گا کہ جو ہے وہ ٹھیک ہے۔ اُس کا کام پرانی ...ری انجمنوں کا اطاعت گذار رہنے کی بجائے انہیں اپنی جگہ سے ہٹانا ہے۔ شریف آدمی میں اس بُت شکنی کی جرأت ہوتی ہے نہ ...اہش۔ یہ آئینی سوشل رویّہ بگڑے ہوئے لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور انہی بگڑے ہوئے لوگوں کی بدولت مستقبل کی عکاسی ...ے اور نئے زمانے کی انجمن آراستہ ہوتی ہے۔ کالی داس اور غالب شرفا ہوتے تو اچھے خاصے تاجر ہوتے، لیکن ہے یہ کہ ان ...' بدچلنی' نے انہیں کالی داس اور غالب بنا دیا۔ عام غنڈوں سے اپنی جیلیں بھر دو، لیکن خدارا ادبی غنڈوں کو شریف کہہ کر ...یں کوتاہ قد نہ بناؤ۔

—— کہانی لکھنا ایک جمہوری عمل ہے۔ ہر زندہ کردار اپنے عمل و فکر کا کلی مجاز ہے اور اپنے اسی تسلیم شدہ جمہوری حق کی بدولت ...ندہ رہتا ہے مگر کئی معصوم کردار بے چارے محض اس لئے جاں بحق ہو جاتے ہیں کہ اُن کے خالق اُن کی آزادیاں تسلیم نہیں کرتے یہی ...یں بلکہ یہ مطلق العنان کہانی کار اپنے کرداروں کی لاشوں کو بھی چین سے نہیں پڑا رہنے دیتے اور انہیں بے حسی سے کم بخت مُردوں ...چلنے پھرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اگر ادب کا تصور جھوٹ موٹ کے قصوں سے وابستہ نہیں تو تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے قوانین ...ن قاتلوں کو سزا کا مستوجب قرار نہیں دے پاتے۔

—— حیران کُن بات یہ ہے کہ ادب پڑھ پڑھ کر زندگی رومانی ہو جانا چاہتی ہے اور ادب زندگی کا مشاہدہ کر کر کے ، حقیقت پسند۔

—— ہمیں اپنے قارئین سے شکایت ہے کہ انہیں ادب کی ان نئی تحریکوں یعنی اینٹی کامیڈی، اینٹی ٹریجیڈی اور اینٹی سٹوری سے دلچسپی نہیں۔ ہماری شکایت بے جا ہے، کیونکہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں، وہ اُن کی زندگی ہے۔ اُن کی لائف ہی اینٹی لائف ہے! بالکل بے واقعہ۔ انہیں کوئی المناک واقعہ پیش آتا ہے نہ طربناک اور ہمہ دم وہ کچھ ہو جانے کے منتظر رہتے ہیں، اور جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو بور ہو ہو کر جاسوسی ناولوں اور رومانی فلموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اس طرح انہیں واقعی کچھ ہو جاتا ہے اور یوں بے چارے خوش ہو لیتے ہیں۔ کیا ہم انہیں اس بے ضرر ایڈونچر سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہیں؟

—— کئی حالیہ یورپی ناولسٹ اتنے زیادہ حقیقت پسند ہیں کہ اُن کی سچائی پر یقین نہیں آتا، اور اُن کے اس ناقابلِ یقین حقیقت پسندانہ اسلوب کا تاثر پریوں کی کہانیوں کا سماں پیش کرنے لگتا ہے —— کیا سچائی بھی جھوٹ ہی کی کوئی دلفریب ادا ہے؟

—— اس نئے عہد میں محبت کا منظوم اظہار صرف اسٹیج پر ممکن ہے۔ اصل زندگی میں محبت کے کامیاب اظہار کے لئے خالص نثری لہجے کے بغیر چارہ نہیں: میری ماہانہ تنخواہ ایک ہزار ہے۔ بنک بیلنس ہے، بڑا خوب صورت مکان ہے اور —— مجھے تم سے محبت ہے!

—— ہمارے دور میں کئی ایسے خوددار باغی مفکروں کی مثالیں ملتی ہیں جو جنسی رفاقت کے لئے شادی کی انسٹی ٹیوشن کو نہ صرف ناکافی اور غیر ضروری سمجھتے ہیں بلکہ ایک سکینڈل بھی، کہ پبلک کی تشفی کے لئے سب کے سامنے قسم کھاؤ کہ تم عمر بھر اپنے ذاتی تعلقات نبھاؤ گے۔ ذاتی تعلقات کا یہ پبلک ٹریڈ مضحکہ خیز ہے اور اپنے محبوب رشتوں کی استواری کی قسمیں کھانا کسی ذی حس کے لئے باعثِ ذلت۔ بہت کیا تو اپنے محبوب سے چپکے سے کہہ دیا کہ مجھے تم سے محبت ہے، نہ کہ بہ آوازِ بلند یہ: خدا کی قسم! مجھے تم سے محبت ہے۔ انسان کا تمدن اب یقیناً اپنی لڑکپن کی حدود سے اتنا باہر آچکا ہے کہ اس پر قسم کے بغیر بھروسہ کیا جا سکے (یا قسم کے باوجود بھروسہ نہ کیا جائے)۔ دیگر کئی پرانی انسانی انسٹی ٹیوشنز کے مانند شادی کی انسٹی ٹیوشن کو بھی جو ہم اتنی بڑی عمر کے بچوں کی آیا بنی ہوئی ہے اب ڈسمس کر دینا چاہئے۔ بالغ مرد و زن کے ذاتی تعلقات کی استواری کا فطری انحصار رسمی تقریر و تحریر کے معاہدوں پر نہیں ہوتا۔ اُن کے بیڈ روم کے پرسکون ماحول پر ہوتا ہے۔

—— جب میں تیز رفتار گاڑیوں یا طیاروں میں سفر کرتا ہوں تو میرا جی صرف عشق و محبت کے فسانے پڑھنے کو چاہتا ہے۔ میرا یہ موڈ شاید اس امر کا عکاس ہے کہ ہمارے دور میں محبت زندگی کے رواں دواں لمحوں کا کھیل ہے۔ یہاں ہوئی، ہو کر یہاں پہنچی اور یہاں گئی۔ اگر کہیں تا دیر ٹھہری رہے تو ایسے ہی الجھن ہوتی ہے جیسے کسی ایئر پورٹ پر انجن کی خرابی کی وجہ سے کوئی طیارہ اپنے شیڈیول سے لیٹ ہو گیا ہو۔

—— مستقبل سے مایوس ہونے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر مستقبل کو اصل خطرہ اپنے آپ سے درپیش نہیں ہوتا، اصل خطرہ اُسے اپنے پیش رو حال سے ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ مستقبل یک لخت کہیں دور سے نہیں چلا آتا بلکہ لمحہ حاضر ہی لمحہ بہ لمحہ کل کے مناظر پیش کرتا ہے، یعنی جسے ہم مستقبل کہتے ہیں وہ حال بھی ہے۔ وقت فی الحقیقت گذرتا نہیں، وقت ہوتا ہے۔ گذشتنی محض

ہماری کیفیات ہیں۔ اس معنی میں روزِ اول سے روزِ آخر ایک ہی لمحہ ہے۔ حال ہی ہمارا مستقبل ہے۔

—— اپنے موت کے خوف پر قابو پانے کی خاطر انسان اپنے سائنسی شعور کو بروئے کار لا کر بیماریوں پر فتح یاب ہوتا رہا لیکن اس فتح یابی کے باوصف اب اُس کا موت کا خوف اور گہرا ہو گیا ہے۔ اس کے سائنسی شعور کی روشنی نے پھیل پھیل کر اُس کے ایمان کے سائے کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ اُسے معلوم ہوا ہے کہ اس تاریک دنیا میں کوئی زندگی سرے سے ممکن ہی نہیں، جہاں اُس نے اپنی ابدی زندگی بسا رکھی تھی۔ پچاس، ستر یا سو برس کی زندگی اور پھر ابدی موت۔ انسان کی ابدی زندگی کی سب سے بڑی انجمن، مذہب کی انجمن میں بظاہر بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو رہی ہے لیکن ایک عرصہ ہوا، اس انجمن کا وجود اپنی روح سے، خدا سے خالی ہو گیا۔ یوں لگتا ہے کہ سب لوگ کسی بڑی موت پر جمع ہیں اور اُن کی شک آمیز دعائیں سوائے اُن کے اور کوئی نہیں سن رہا۔ اور انہیں موت سے بچانے کے لئے کوئی معجزہ رونما نہ ہوگا۔

—— انا بھی خود سپردگی کا ہی اظہار ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اپنے آپ کو سپرد کرتے ہوئے آدمی بہ آوازِ بلند یہ کہہ رہا ہوتا ہے، دیکھو، میں کتنا اچھا ہوں۔ کہو، میں کتنا اچھا ہوں —— اور جب آپ اُس کی اچھائی کو بخوشی تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ کسی بچے کی طرح اُچھل کر آپ کی گود میں آ بیٹھتا ہے اور سر لٹکا کر آنکھیں بند کر کے بڑے اطمینان سے اپنا آپ آپ کو سونپ دیتا ہے۔

—— ہمارے ادب کی نئی نسل کا نیا پن اس لحاظ سے فرسودہ ہے کہ ماضی کی ہر ادبی نسل نئی ہونے کے بعد ہی پرانی ہوئی۔ فکر کے نئے مکاتیب اپنے خام اوائل میں نوعمرانہ اشتیاق و شدت سے قدامت کے خلاف جہاد پر تل جاتے ہیں، لیکن مزید بالغ ہو کر چکنے سے قدیم مکاتیب کی اگلی صفوں میں جا کھڑے ہوتے ہیں، اور اب ان کے خلاف جہاد کے نعرے بلند ہونے لگتے ہیں اور وہ ذرا پیچھے سرک جاتے ہیں تاکہ قدامت کی صفوں کے آگے ایک اور جدید صف کے لئے جگہ خالی ہو جائے۔ فی الحقیقت جس نئی تحریک میں بالآخر پرانی ہونے کی صلاحیت ہو، وہی عظیم ہوتی ہے، ورنہ جو تحریکیں تاریخ میں اترنے کی نااہل ہوں وہ قابلِ اعتنا نہیں ہوتیں۔

—— ماڈرن جینئس کی باتیں عام ہوتی ہیں۔ اپنی سوجھ کے اعتبار سے وہ اکثر متوسط الذہن ہوتا ہے مگر کسی چالاک کرشل ایڈورٹائزنگ کی طرح عوام کی توجہ کی خاطر اپنے اسلوب پر بیشتر دیا سالہ وقت صرف کر دیتا ہے۔ اس لگاتار ورزش سے اس کی فکری ساعت کندھے چوڑے کر کر کے چلنے لگتی ہے۔ طبعاً بے ضرر ہونے کے باوجود نہایت ضرر مند دکھائی دیتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے متنازعہ فیہ ہو جاتی ہے۔ ہمارا جینئس اِن حالات سے متاثر ہو کر خود کو مختلف النوع سمجھنے لگتا ہے۔ اور مروجہ فکر و عمل کو تضحیک کا نشانہ بناتا ہے۔ شرفا پہلے تو اسے نظر انداز کرنا چاہتے ہیں لیکن پھر اس کی مختلف النوعی کی لگاتار بے ہنگم نمائش سے تنگ آ کر صف آرا ہو جاتے ہیں، اور اپنے اس مجلسی مجرم کے قتل کا ارتکاب کر لیتے ہیں اور اضطراری حالت میں گویا اقرارِ جرم کے لئے مرحوم کی جینئس کا مقبرہ بنا لیتے ہیں۔

—— کیا یہ ضروری ہے کہ آج کا مہذب انسان اپنا کبھی بن مانس ہونا سدا یاد رکھے؟ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پذیر سماج میں روایت ماضی کے عجز کے ثبوت فراہم کرتی ہے اور اس کی دانستہ تقلید انسانی تدریج کے انحطاط یا فقدان کے مترادف ہے ہر تبدیلی عہد کو اپنی جینئس، ماحول اور ضرورت کے مطابق زندگی کے نئے مفہوم اور اس مفہوم سے متاثر ہو کر عمل کے نئے پیمانوں کی کھوج رہتی ہے۔

(باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

سحر انصاری

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

یومِ اقبال کی تقریبات کی چند جھلکیاں

اقبال اس لحاظ سے بہت خوش قسمت شاعر ہیں کہ ہمارے ملک میں اُن کا یوم اور اُن کی یادگاری تقریبات بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی کراچی میں یومِ اقبال کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ اولڈ راوینز، اپوا، اقبال سرکل اور اقبال اکیڈیمی نے دو روزہ تقریبات کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیا۔ اربابِ فکر و نظر کی جانب سے گذشتہ برسوں سے برابر ایک احتجاج کیا جارہا ہے اور وہ احتجاج اس سال بھی کیا گیا کہ اقبال کو اقبال سے اور پوری قوم سے چھین لیا گیا ہے! انہیں نہ معلوم کیا کیا بتایا جاتا ہے۔ لیکن شاعر ماننے میں تامّل سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ سفارتی نمائندوں، غیر ملکی اسکالروں اور خود اپنے ملک کے اعلیٰ افسروں نے اقبال کو بھی اقوامِ متحدہ جیسی کوئی چیز بنا دیا ہے۔ جس کی تاسیس کا یوم مناتے وقت یکساں قسم کے بے کیف اور بے رُوح مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ اقبال کی عظمت کو ثابت کرنے کا اب صرف ایک ہی طریقہ ان حضرات نے دریافت کیا ہے کہ آنکھ بند کر کے مبالغے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہیں۔ کوئی صاحب فرماگئے کہ اقبال کے کلام سے ہم زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں معاشیات، تعلیم، زراعت اور سائنس وغیرہ کے بہت سے نکتے کلامِ اقبال سے نکال کر رکھ دیئے۔ کسی صاحب نے ان کی فکر و عمل کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور یہ تک کہہ دیا کہ نہ صرف تصورِ پاکستان اقبال کا پیش کردہ ہے بلکہ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی اقبال ہی کی دریافت تھے۔

اس سال کی تقریبات میں صرف فیض احمد فیض کی تقریر ایسی تھی جس میں اقبال کو ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے تخلیقی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ فیض نے اقبال کے بارے میں بڑی جرأت سے بہت سچی باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کی شاعری اور پیغام کسی ایک معاشرے یا ایک نقطے تک محدود نہیں ہیں۔ وہ ایک صاحبِ نظر اور باخبر شاعر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے زمانے کی تمام تحریکات اور اہم واقعات سے متأثر ہو کر بہت سی سمتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے ——— اس پہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اولڈ راوینز کے سکریٹری یعقوب توفیق صاحب نے کہا کہ "جناب اور لوگ تو اقبال کے بارے میں کچھ اور

کہتے ہیں لیکن آپ کا نقطۂ نظر سب سے الگ ہی رہتا ہے۔ کبھی تو آپ بھی وہ بات کہہ دیں جو سب کہتے ہیں "۔ اس پر فیض صاحب مسکرائے اور بولے : "کوئی مناسب وقت آنے دیجئے"۔

یہ یعقوب توفیق صاحب (سکریٹری اولڈ راوینز) بھی خوب بزرگ ہیں۔ کلام و انتظام کے ایسے ایسے یادگار نمونے پیش کئے کہ رہے نام سائیں کا، — سید دربار علی شاہ صاحب کمشنر کراچی کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرنا تھا۔ ان سکریٹری صاحب نے یوں اعلان فرمایا "اب میں جناب دربار علی شاہ صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا خطبۂ ویلکم (Wel come) پڑھیں" — اسی طرح جب مفتیٔ اعظم فلسطین اسٹیج کے اُوپر پہنچ گئے تو ان توفیق صاحب کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اُن کے لئے نشست کا انتظام کرتے۔ تین چار منٹ بعد انہوں نے اپنی کرسی مفتی صاحب کے لئے خالی کی۔

پروگرام کی اشاعت اور منسوخی، دوبارہ اشاعت اور دوبارہ منسوخی کے سلسلے میں سکریٹری صاحب نے جو آرٹ پیپر اولڈ راوینز اور مشتہرین کا روپیہ برباد کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (توقع ہے کہ اولڈ راوینز نے آمدنی اور خرچ کے باقاعدہ حسابات ضرور رکھے ہوں گے)۔

اس سال پچھلے سال کا چھپا ہوا سووینئر (یادگار مجلّہ) تقسیم کیا گیا۔ بعض کے سرورق پھاڑ لئے گئے تھے تاکہ حاضرین ان ننگے مجلّوں سے مستفیض ہوسکیں۔

اس سال جو مجلہ شائع ہوا۔ اُس میں مختلف ادبی شخصیتوں سے اقبال کے اشعار کا انتخاب کرایا گیا۔ اس سلسلے میں لطف کی بات یہ ہے کہ کئی اشعار غلط یا بالفاظِ دیگر "اصلاح" کے بعد شائع ہوئے ہیں۔

مدیرِ افکار صہبا لکھنوی سے انتخابِ اشعار کروانے کے بعد اُن سے دستخط لے لئے۔ نام اور پتا لکھ لیا۔ لیکن جب مجلّہ شائع ہوا تو ان کا نام صہبا اختر لکھنوی کر دیا گیا۔ حال آں کہ 'صہبا اختر' اور 'صہبا لکھنوی' دو الگ الگ حضرات ہیں۔ اور یہ دونوں حضرات اس سلسلے میں بازپرس کا پورا مجاز رکھتے ہیں۔

اسی طرح "مقالات یومِ اقبال" نامی کتاب میں سراج الدین ظفر کی نظم کے بعد مولانا ماہر القادری کے اشعار اور مولانا ماہر القادری کی نظم کے بعد سراج الدین ظفر کے بقیہ اشعار درج ہیں۔

بدانتظامی اور بے ترتیبی کی یہ صرف چند مثالیں ہیں :

مقررین میں فیض احمد فیض، مریم بہنام، ڈاکٹر ناظر زادہ کی تقریریں مجموعی طور پر پسند کی گئیں۔ تقریبات کے دوران مسلسل بارش ہوتی رہی۔ اور اس سلسلے میں غیر ملکی مہمانوں کو بطورِ خاص تکلیف اٹھانی پڑی۔ راقم الحروف نے دیکھا کہ منتظمین نے ہر نشست کے اختتام کے بعد مخصوص حضرات کی پذیرائی کی، اور بعض اہم مہمانوں کو بے حسی اور بدتمیزی کا شکار بنایا۔ مثلاً مریم بہنام کے لئے کافی دیر تک سواری کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ چیکوسلواکیہ کے مشہور مستشرق ڈاکٹر یان ماریک اپنی اہلیہ کے ہمراہ باہر کھڑے کسی سواری کا انتظار کرتے رہے۔ بارش تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ آخر کار راقم الحروف نے منتظمین میں سے ایک صاحب کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی تب ان دونوں غیر ملکی مہمانوں کو ایک کمرے میں بٹھلایا گیا اور ٹیکسی کے لئے ایک آدمی کو غالباً دوڑایا گیا۔

محفلِ موسیقی کے شائقین پر، جنہیں باقاعدہ دعوت نامے جاری کئے گئے تھے، فلیٹ کلب کے دروازے بند کر

دیئے گئے، اور جب باہر مہمان بیگمات اور بچوں سمیت بارش میں بھیگ رہے تھے یعقوب توفیق صاحب اندر آرام سے بیٹھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حالانکہ ان کا فرض تھا کہ ان غیر معمولی حالات میں وہ اپنے مہمانوں پر بھرپور توجہ صرف کرتے!

ان تمام بدانتظامیوں سے نہ اقبال کے پیغام کے ساتھ انصاف ہوتا ہے اور نہ غیر ملکی مہمانوں کی قدر افزائی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر سال اس قسم کی بدانتظامی کیوں ہوتی ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت سے ان حضرات کو اتنا واسطہ نہیں جتنا خود اپنی شہرت سے ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ آئندہ اس نوع کے دردناک واقعات کا اعادہ نہیں ہوگا، اور اولڈ راوینز کے ذمہ دار حضرات آئندہ کسی ایک فرد کو اتنی بھاری ذمہ داری سپرد کرنے کے بجائے کراچی کی تمام ادبی انجمنوں اور ممتاز اہلِ علم کے تعاون سے واضح پروگرام اور مکمل انتظامات کے تحت "یومِ اقبال" کی تقریبات منعقد کر کے ہوش مندی کا ثبوت دیں گے۔

رائٹرز نوٹ بک — (صفحہ ۲۷ سے آگے)

یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، بچگانہ ہے۔ فی الحقیقت تاریخِ حیات میں ایک واقعہ صرف ایک بار ہی رونما ہوتا ہے۔ کسی اور واقعے سے اس کی اتفاقیہ مشابہت کے باوصف وہ واقعہ اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے واحد نوعیت کا ہے۔ جب زندگی اس قدر تغیر پذیر ہو تو اس پر روایات کا بوجھ لادلا دکر ہم اس کی ہمہ وقت سفری کیفیت کو جہنم بنا دیں گے۔

حسرت موہانی

منتخب اشعار

(پیدائش: ۱۸۷۵ء - وفات: ۱۹۵۱ء)

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

نہ سمجھا بانیٔ جور و جفا اس شوخ کو کوئی
کہ ہم نے جس کو پایا شکوہ سنجِ آسماں پایا

اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں
مایوسیٔ فراق نے دل ہی بجھا دیا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

صحبتِ اہلِ عشق و شغلِ شراب
تھا یہی مقتضائے عہدِ شباب

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور
دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

مجبورِ وفا کر کے محرومِ کرم کرنا
بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری
باطن میں وہ بے مہری، ظاہر میں یہ دلجوئی
ہم خوب سمجھتے ہیں ترکیبِ سخن تیری

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن
خوبیٔ یار کا جواب کہاں

میری محرومیوں کی حد نہ رہی
تیرے احسان بے شمار ہوئے
اب وہ شوق ہے نہ جوش و خروش
سب تری یاد پر نثار ہوئے

دیکھیں ہم بھی جو ترے حسنِ دل آرا کی بہار
اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا کیا ہو

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

اس تغافل پہ بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم
کتنے ہیں مجبور دیکھ او بانیٔ بیداد ہم

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

آپ کے حسنِ جہاں سوز کا جلوا دیکھا
ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا

عبدالعزیز فطرت

جتنے ویرانے جنوں کی راہ میں حائل ہوئے
اتنا اپنے ضبطِ بے پروا کے ہم قائل ہوئے

اِک ارادے سے بسا دیں تم نے دُنیائیں کئی
تیر ترکش میں رہا اور سب کے دل گھائل ہوئے

آنسوؤں نے تابِ گویائی زباں سے چھین لی
ہم بیانِ قصۂ غم پر اگر مائل ہوئے

عشق کی منزل دلِ آشفتہ کار آساں نہ تھی
وسوسے طوفاں بنے اور راہ میں حائل ہوئے

خون کا پیاسا تھا دشتِ شوق میں ہر ایک خار
حضرتِ فطرت کی پامردی کے ہم قائل ہوئے

محسنؔ احسان

لے اُڑی سُوئے عدم حسرتِ پرواز مجھے
پاس بیٹھا کوئی دیتا رہا آواز مجھے

مَیں نے غنچے کی طرح کِھل کے بھرم کھول دیا
وَرنہ دُنیا تو سمجھتی رہی اک راز مجھے

اب تو کانٹوں سے بھی خوشبوئے وفا آتی ہے
کس طرف لے کے چلا عشقِ خوش آغاز مجھے

ہم سفر میرے نکل جائیں گے مجھ سے آگے
یہ لگن رکھتی ہے سرگرمِ تگ و تاز مجھے

دن کے ہنگاموں میں جو ڈوب گئی تھی محسنؔ
شب کے سناٹوں سے آئی وہی آواز مجھے

مرتضیٰ برلاس

کچھ اور رنگِ تغزل نکھارنے نہ دیا
ہمیں سکوں ہی غمِ روزگار نے نہ دیا

رہِ طلب کی کڑی دھوپ میں جو حاصل تھا
وہ لطف سایۂ ابرِ بہار نے نہ دیا

خرد کے بعد جنوں کے بھی دشت چھان لئے
ترا پتہ ہی کسی رہ گزار نے نہ دیا

وہ گونج تھی کہ صدا گھٹ کے رہ گئی میری
وہ درد تھا کہ کسی کو پکارنے نہ دیا

جو کوئی اور نہیں تیرے غم نے دستک دی
کہ ایک پل مجھے تنہا گزارنے نہ دیا

سیّدہ حنا

موجِ نفس نے جن کی کِھلائے ہزار پھول
غم کی صلیب اُن کے لئے بھی گڑی رہی

چھینٹا سا پڑ گیا تھا کبھی التفات کا
تاعمر سوندھی باس فضا میں رچی رہی

تارے سے ٹوٹتے رہے پلکوں سے بار بار
شب بھر فضا میں آج عجب روشنی رہی

ہر اہلِ دل کے واسطے سقراط کی طرح
لے کر پیالہ زہر کا دُنیا کھڑی رہی

گرنے نہیں دیا کبھی معیارِ آرزو
اک عمر غم سے دل کی ہمارے ٹھنی رہی

کٹنے کو یُوں تو کٹ ہی گئی زندگی، مگر
ہر لحظہ رُوح و دل میں عجب بے کلی رہی

خارِ نفس تھا یا تھی کوئی آرزو و تمنا
سینے میں ایک پھانس ہمیشہ چبھی رہی

عنوانؔ چشتی

ہستی کے موہوم سفر میں کوئی کہاں تک تنہا جائے
رُوح کا پارہ جمتا جائے، جسم کا سونا پگھلا جائے

سپنوں کے کالے ساگر میں چاند کا سایہ بھی تو نہیں
صرف تمنّا کی لہروں پہ کوئی کہاں تک بہتا جائے

رقص میں ہے اِک ریت کا طوفاں کون کسی کو پہچانے
لوگوں کی اس بھیڑ میں یارو خود کو ابھی سے ڈھونڈا جائے

مُسکا مُسکا جامۂ عشرت، سہما سہما چہرۂ غم
توڑیئے جیون کا آئینہ ہم سے نہ اب یہ دیکھا جائے

سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں مرنے کے اور جینے کے
خیر ہو یارب خیر کہ اب تو رشتۂ دل بھی ٹوٹا جائے

خواب و حقیقت کے سنگم پر کتنی اُلجھن ہے عنوآں
جب سے پڑا ہے اس کا سایہ اپنا سراپا روٹھا جائے

احمد صغیر صدیقی

کیوں نہ اک روز یہ ارماں بھی نکالا جائے
ہاتھ اُس یار طرحدار پہ ڈالا جائے

میں وہ مضموں ہوں کہ شاید ہی سمجھ میں آؤں
میرے قصّوں کو کتابوں سے نکالا جائے

جانے کیا کچھ لئے پھرتی ہیں سمندر آنکھیں
کیوں نہ ان کو بھی کسی روز کھنگالا جائے

اُف وہ احساس کہ لفظوں میں سموئے نہ بنے
ہائے وہ درد کہ جو گیت میں ڈھالا جائے

دل، کہ رہتی ہیں جہاں چاندسی یادیں کتنی
اس دریچے پہ تو پردہ کوئی ڈالا جائے

رب نواز مائل

کیوں اپنی ہر خوشی کا مقدّر زوال ہو
کب تک لبوں پہ حرفِ تمنا سوال ہو

برسوں کسی کی سوچ میں جیسے بسا ہوا
گویا ترا وجود مرا ہی خیال ہو

کچھ تو شبِ سیاہ کے غم کا بھی ہو علاج
اس مفلسی میں بھی کوئی کسبِ کمال ہو

چاہوں بھی زندگی سے تو کٹ جاؤں کس طرح
ممکن نہیں کہ اپنا ہی سایہ وبال ہو

ہم مفلسوں کی زیست کے لمحے کڑے سہی
کیوں مختصر سی بات کا دل کو ملال ہو

اس وسوسے میں سہل گذر جائے گی خزاں
دردِ فراق میں بھی امیدِ وصال ہو

مائل خوشی کا غم میں بھی احساس یوں رہا
جیسے کہ صبح آخرِ شب کا مآل ہو

محمد نسیم قریشی

جب کبھی یاد نگر جاتا ہوں
تُو ہی ملتا ہے جدھر جاتا ہوں

کتنی ہی سوچ کی دیواریں ہیں
اِک قدم چل کے ٹھہر جاتا ہوں

جب تری آگ میں جلتا ہے بدن
میں ذرا اور نکھر جاتا ہوں

تیری ہی سوچ کی مانند کبھی
ذہن سے تیرے گذر جاتا ہوں

ٹوٹ کر ایک ستارے کی طرح
سینۂ شب میں اُتر جاتا ہوں

جب بھی چلتی ہے ترے غم کی ہوا
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں

یوں بھی ہوتا ہے کبھی صورتِ زخم
تیرے احساس سے بھر جاتا ہوں

خوف کے دشت میں دیکھا ہے نسیمؔ
اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں

مختار زمن

رفتارِ زمن

"رفتارِ زمن از مختار زمن" یہ ہے افکار کا ایک اور مستقل طنزیہ مزاحیہ سلسلۂ مضامین جسے آپ کے جانے پہچانے اردو اور انگریزی کے مشہور ممتاز ادیب و صحافی مختار زمن ہر ماہ لکھیں گے۔

مختار زمن، علی گڑھ یونیورسٹی کے مایۂ ناز سپوت ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ نہ صرف یونیورسٹی کے بہترین مقرر تھے بلکہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک سرگرم اور باعمل کارکن کی حیثیت سے انہوں نے جد وجہد آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ادھر کئی سال سے وہ بی بی سی لندن میں تھے اور اب پاکستان واپس آنے کے بعد اے پی پی سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ طنز و مزاح کی روایت بھی وہ علی گڑھ سے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ افکار کے "نئی تخلیق نمبر" میں ان کا طنزیہ بعنوان "ایک ترک کے چند ورق" شائع ہوا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب انہوں نے افکار میں مستقلاً لکھنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ ان کا پہلا مضمون "حال قسمت کی لکیروں کا" پڑھئے اور داد دیجئے۔

صہبا

حال قسمت کی لکیروں کا

کمرے میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاروں کونوں میں اگربتیاں جل رہی تھیں۔ لوگ ادب سے سر جھکائے دو زانو بیٹھے تھے اور ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عقیدت سے "اَللّٰہ ھُوْ" کا نعرہ لگا دیتا تھا۔ حاضرین میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ عبائیں پہنے ہوئے دراز ریش صوفی جن کی آنکھوں میں سرمے کی تحریر، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، انگلیوں

میں فیروزے کی انگوٹھیاں اور ریشمی رومالوں میں عطر کی خوشبو تھی۔ قیمتی سوٹوں اور جناح ٹوپیوں میں ملبوس افسر جو لمبی لمبی موٹروں میں آئے تھے، وہ اس محفل میں باادب بیٹھے تھے۔ اور اس امید میں تھے کہ خدا اسی طرح انہیں چھپّر پھاڑ کر دے گا۔ ان کے برابر موٹی توند والے سیٹھ تھے جن کے کاروبار ملک کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سرخ تھے۔ ان کی جیبیں بھاری اور تجوریاں بھری ہوئی تھیں، لیکن مزید روپے کی خواہش انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ کمرے کے دروازوں میں غریب مزدور، زرد زرد دبلی برقعہ پوش عورتیں، ناک بہتے بچے تھے، اور دروازے سے تقریباً باہر تنگ مہری کی پتلونیں اور نوکدار جوتے پہننے والے نوجوان اور بدن سے چپکی ہوئی تنگ قمیصوں والی لڑکیاں تھیں۔ بعض اچھے خاصے پڑھے، متوسط طبقے کے لوگ، بعض بالکل لٹھ گنوار، غرض سماج کا ہر نمونہ اس جگہ موجود تھا۔ لوگ حیرت زدہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن رعبِ تقدس ان کی گردنیں جھکائے ہوئے تھا۔ کہ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا ——— تمام مجمع میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ماشاءاللہ اکبراللہ اکبر کا غلغلہ بلند ہوا۔ لوگ فرطِ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ بعضوں نے درود کا ورد شروع کر دیا۔ بعض اپنی انگلیوں کو چوم چوم کر آنکھوں سے لگانے لگے۔ مولوی نما مقدس بزرگوں نے حالات کو اپنے قابو میں لے لیا۔ اور لوگوں کو باادب رہنے کی تلقین کی۔ ایک ٹیڈی کو للکارا، ایک مزدور کو دھتکارا:

" میاں صاحبزادے، ذرا تمیز سے کھڑے ہو جایئے، یہ محفل ادب ہے، ہوٹل کا ناچ گھر نہیں"

" او بھائی تہمد والے! ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو۔ دیکھو سامنے سیٹھ صاحب ہیں۔ اس محفل میں آنا تھا تو بندۂ خدا کپڑے تو دھو کر پہن لیتے"

اتنے میں ایک بزرگ لمبا جُبّہ پہنے دروازے سے برآمد ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک میلا کچیلا سا لونڈا تھا جس کے سر پر ایک پنجرہ تھا۔ پنجرے پر ایک کامدار غلاف چڑھا ہوا تھا ——— پنجرہ ایک تخت پر رکھ دیا گیا۔ لوگوں نے جھک جھک کر تعظیم دینی شروع کی: "اَللّٰہ ھُوَ۔ اَللّٰہ ھُوَ" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اور حاضرین عقیدت کے جوش میں ٹیڈی لڑکیوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان سب کو ایک ہی لگن تھی کہ محفل کی شرکت سے اپنے مطلب کی دعا قبول کرائی جائے۔ غریب امیر کا امتیاز باقی سہی مگر عورت مرد کی تخصیص مٹ رہی تھی۔ جسم گڈمڈ ہو رہے تھے۔ چغے والے بزرگ نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور یوں گویا ہوئے:

" حضرات، آپ کو جس متبرک اور مقدس ہستی کا انتظار تھا وہ موجود ہے۔ اس کی پیدائش کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ سال گذشتہ جب میں ساتویں مرتبہ حج بیت اللہ شریف کے لئے گیا تو وہاں ایک خالص عرب پیرمرد سے ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھ عاصی پر کمال مہربانی کی۔ اپنے گھر لے گئے اور کھجور اور روٹی سے تواضع کی۔ چلتے وقت انہوں نے مجھے ایک بیضۂ مرغ عطا کیا اور فرمایا کہ اسے حفاظت سے رکھیو اور واپس گھر پہونچ کر پہلی جمعرات کے دن اس پر مرغی بٹھا دیجیو، مگر شرط یہ ہے کہ سفید رنگ کا ہو ——— اس کے بعد قدرت کا کرشمہ دیکھیو ——— چنانچہ یہ گنہگار اس بیضۂ مرغ کو اپنے ہمراہ لایا اور حسبِ ارشاد پہلی جمعرات کو اُسے ایک سفید مرغی کے نیچے رکھا۔ بعد ۲۱ یوم کے انڈے سے چوزہ نکلا۔

معجزہ یہ تھا کہ چوزہ بے پھدیال تھا، لیکن اس کے دُم موجود تھی اور دُم کے اُوپر اللہ لکھا ہوا تھا۔ پڑھئے درود شریف ؟

اِس بیان کو سُن کر لوگوں نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے اور درود شریف پڑھی۔ مولانا نے پھر اپنی تقریر شروع کی :-

"چوزے کی دیکھ بھال اس گنہگار نے جس قدر ممکن ہو سکی کی، اور بہت جلد یہ چوزہ ایک مُرغِ مبارک کی شکل میں تبدیل ہوگیا! مُرغِ مبارک کی دم پر اللہ لکھا ہوا موجود ہے جو آپ ملاحظہ فرمائیے اور مجھے دعائے خیر سے یاد کیجیے" :

یہ تقریر دل پذیر ختم کر کے اس نے پنجرے پر سے غلاف اتارا، اندر ایک چھوٹا سا مرغ دکھائی دیا۔ جس کی دُم پر سیاہ لکیریں تھیں جو عربی زبان میں اللہ کی طرح تحریر تھیں۔ جیسے ہی غلاف اُترا لوگ فرطِ عقیدت سے سجدے میں چلے گئے۔ ہر شخص نے ہاتھ اٹھا کر حسبِ ضرورت اپنی ترقیٔ درجات، ملازمت، اولاد، دولت، سٹے میں کامیابی، معشوق سے وصل، عورت کو قابو میں لانے، میاں کو غلام بنانے اور سوت کے پنجے سے چھڑانے اور امتحان پاس کرنے کی دعائیں مانگنی شروع کیں۔ ایک منٹ کے بعد پنجرے پر دوبارہ غلاف چڑھا دیا گیا۔ لوگ باہر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن بعض دل جلے بڑے جز بز ہوئے — اور کانا پھوسیاں شروع ہوگئیں :

"اماں ٹکٹ کے پورے پیسے لئے اور زیارت پانچ منٹ بھی نہ ہوئی، واہ بھئی واہ"

"بھائی غنیمت سمجھو کہ زیارت ہو ہی گئی۔ مطلب تو ثواب سے ہے چاہے دُم مبارک ایک منٹ دیکھو یا پانچ منٹ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ایک صاحب صلح جویانہ انداز میں بولے۔

"بھائی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اللہ نے انہیں نوازا اور ان کے گھر میں مرغِ مبارک پیدا ہوا تو انہیں کم از کم اتنا تو چاہئے کہ خلقت کو ثواب دارین کا موقع اچھی طرح سے دیں — خاص کر جب ٹکٹ کے پیسے بھی لئے ہیں۔ میاں کوئی ہم مفت آئے ہیں یہاں؟"

ایک سیٹھ صاحب بولے : "بھائی یہ بڑا ظلم ہے۔ ہم تو دعا بھی نہیں مانگنے پائے اور غلاف چڑھ گیا۔ ہم جاستی پیسے دے گا اور الگ علیحدہ اپنے لئے دُم کھلوا کر دیکھے گا۔ مرغ کیا چیز ہے چلو سو دو سو یوں ہی سہی"

ایک صاحب چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہنے لگے : "یار سب فراڈ معلوم ہوتا ہے"

"چپ بھی رہو یار، کوئی سُن لے گا تو بیٹا وہ بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا"

غرض بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، مختلف خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لوگ رخصت ہوگئے۔

مولانا نے مکان کا دروازہ بند کر لیا۔

لونڈے نے پنجرہ اٹھا کر صحن میں رکھ دیا۔

مولانا نے اپنا جبہ اتارا اور روپیہ گننے کے لئے وہ صندوقچہ کھولا جس میں ٹکٹ کے دام اکٹھا کئے گئے تھے۔ اتنے میں مولانا کی بیوی اندر سے نکل آئیں اور بولیں :

"ہائے میرا دل تو دھک دھک کر رہا تھا۔ سب خیریت گذری نا؟"

"ہاں ننھے کی اماں پاک پروردگار نے شرم رکھ لی۔ صدقے اس کے حبیب کے۔"

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے" بیوی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"مگر تمہیں سوجھی خوب، کمال کر دیا آج تو تم نے۔ آخر وہ بلی آئی کیسے؟"

"اے ہاں۔ بس اللہ میاں کی مہربانی ہے۔ اس نامراد لونڈے نے، اس کا ناس جائے، ڈربے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ ناس پیٹی بلی رات ہی کو کھا گئی اس موئے مرغے کو۔ تم تو تھے نہیں۔ میں فوراً رکشا منگا کے لالو کھیت گئی۔ اور یہ مرغا چھانٹ کے لائی — پورے ۵ روپے لگے۔"

"بیوی خوش رہو مگر تم نے مرغا اچھا چھانٹا۔ عین مین ویسی ہی لکیریں ہیں جیسے اُس مرغے کی دُم پر تھیں۔"

"اے ہاں، میں ویسی ہی تو دیکھ کے لائی تھی — پر ویسے نہ بھی ہوں تو غور سے کون دیکھے ہے۔ بس ذرا لکیروں کے نشان چاہئیں۔"

مولانا مسکرائے اور بولے: ہاں یہی ہماری قسمت کی لکیریں ہیں۔

فیض انصاری

کنواں

"اُتم چند کا دل بھی اُس کے کنویں کی طرح گہرا تھا لیکن افسوس کہ اُس کے جیتے جی کسی نے بھی اُس کی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی:

رام داس نجانے کیوں رُک گیا، اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں دوستوں کے چہروں سے اُٹھا کر دور آسمانوں پر جما دیں، جہاں کالے کالے گھنگھور بادل سمٹ کر اور گھنے ہو رہے تھے۔

دوست بھی اُس کی اِس حرکت پر چونک کر اسی سمت دیکھنے لگے لیکن میاںجی تنہا آدمی تھا جو رام داس کی نیلی آنکھوں میں اپنی دزدیدہ نگاہیں ڈالے بیٹھا کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ آنکھوں سے اُس کے دل میں اُتر کر اس جھوٹ کو پکڑ لینا چاہتا تھا جس کے سچے ہونے کا دعویٰ اس کا افسانہ تراش دوست تمہید میں کر چکا تھا۔

"آج یہ بادل ضرور برسیں گے!" رام داس نے سکوت توڑا۔

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو!" بچا سنگھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"مگر اُتم چند والی بات!" میاںجی نے جیسے رام داس کو چیلنج دیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج سے سو برس پہلے ہمارے گاؤں میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا تھا جس کو اگر اس گاؤں کے لوگ پہچان لیتے تو اس گاؤں میں کبھی کسی دکھ کا سایہ نہ پڑتا، کوئی آفت نہ آتی اور وہ کال جو پچھلے تین چار برسوں سے ہمارے گاؤں میں ڈیرا جمائے ہوئے ہے کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرتا!"

رام داس پھر رُک گیا۔ لیکن اِس بار اُس نے گھنگھور بادلوں کو دیکھنے کے بجائے اپنے سب سے گہرے دوست اور سب سے بڑے نقاد میاںجی کی چور آنکھوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"بات اُتم چند کی چلاؤ!" میاںجی نے طنز کیا۔

"سلسلہ وہی ہے میرے دوست ــ جانتے ہو اُتم چند نے اس کنویں کے بنانے پر کتنا روپیہ خرچ کیا تھا؟"

"نہیں ــ!" ایک آواز بلند ہوئی۔

"تو سنو ــ اُس نے پورے پچاس ہزار روپے اس کنویں کی کھدائی اور بنوائی پر خرچ کئے تھے جو آج کے دو لاکھ روپے

کے برابر ہوتے ہیں ''

"دو لاکھ ـــــ !" تیجا سنگھ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں میرے سرداراں ــ اُس وقت ایک روپے میں بارہ پائیلی گیہوں ملتا تھا، اور آج ــ !"

"بات اتم چند کی ہے میرے بھائی ــ !" میاں جی نے بھٹکتے ہوئے دوست کو راستے پر آنے کا اشارہ کیا۔

"اور جانتے ہو اس دو سو ساٹھ ہاتھ گہرے کنویں کو کھودنے میں پورے دس سال لگے تھے۔"

"یہ بات بالکل نہیں پٹی رام داس جی ــ" نول کشور پہلو بدل کر بولا۔

"بھلا کیوں نول کشور جی ــ ؟" تیجا سنگھ نے سوال کیا۔

"میں نے اپنے کھیت میں اس سال جو کنواں کھدوایا ہے وہ سو ہاتھ گہرا ہے اور اس کے کھودنے میں صرف چار مہینے لگے ہیں۔ دو سو ساٹھ ہاتھ گہرا کنواں کھدوانے کو دس سال کیسے لگ سکتے ہیں ؟"

"مگر نول کشور جی، اتم چند آپ کی طرح بنیا نہیں تھا۔ اور نہ اُس نے آپ کی طرح سرکار سے کنواں کھودنے کے لئے کوئی قرض لیا تھا۔ پھر وہ رہتا بھی یہاں سے دو سو میل دور تھا۔ اور ڈاکٹری کرتا تھا۔ کنواں کھُدانے کا سارا کام تو اُس کے ایک دوست نے کرایا تھا۔ جیسے جیسے اتم چند اس کو روپیہ بھیجتا تھا ویسے ویسے وہ کھدائی کا کام کرواتا تھا۔ اُس کے پاس روپیہ ڈھالنے کا کوئی کارخانہ تو تھا نہیں۔ جیسا مولڈنگ کا کارخانہ آپ کے پتا کے پاس امرتسر میں ہے کہ وہ اس میں ایک ساتھ پچاس ہزار روپیہ ڈھال لیتا ہے اور سال بھر میں کنواں کھدوا لیتا ہے۔"

"واہ شیراں توسی منہ چوم لوں ــ !" تیجا سنگھ نے جگہ سے اُچھل کر رام داس کے سچ مچ گال چوم لئے۔ اور پھر چوپال میں اتنی زور کا قہقہہ پڑا کہ نول کشور جھلا کر اُٹھا اور چل دیا۔

"بھائیو۔ خاموش ہو جاؤ ــ" میاں جی اتنی زور سے چیخے کہ سارا شور خاموشی میں بدل گیا۔

"ہاں تو رام داس جی، اب اتم چند کے بیٹے کا قصہ سنائیے۔" اور پھر میاں جی ایک ٹک اپنے دوست کو دیکھنے لگا کہ کہیں وہ پھر بہک نہ جائے۔

"ہاں بھائی، اُس طرف آ رہا ہوں ـــ اتم چند کا بڑا بیٹا جو آٹے کی چکی سے ایک بہت بڑے میدہ مل کا مالک بن گیا تھا اُس وقت اپنے گاؤں آیا جب اتم چند ڈاکٹری کی نوکری سے ریٹائرڈ ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ اور اپنے بنوائے ہوئے کنویں میں اتنی بڑی پمپنگ مشین لگانے کی فکر میں تھے کہ گاؤں والوں کو آسانی سے پانی مل سکے ــ ۲۶ ہاتھ لمبی رسی کھینچنے سے ہمارے گاؤں کی عورتیں بچ جائیں، اور پھر سب کو اُن کی ضرورت کا پانی ملتا رہے۔ لیکن اُن کے پاس اب روپیہ کہاں تھا، اور یہ مشین جو اُس وقت لندن میں بنتی تھی اتنی مہنگی تھی کہ پندرہ بیس ہزار روپے سے کم میں نہ آتی۔ تب ہی اُن کا بڑا لڑکا ایک لاکھ روپے کی ایک اسکیم لے کر اُن کے پاس پہونچا۔ وہ اسکیم تھی یہاں دوائیں بنانے کا کارخانہ کھولنے کی، اور یہ کام اُتم چند اچھی طرح کر سکتے تھے۔ بیٹے نے جب یہ اسکیم اتم چند کے سامنے رکھی تو وہ فوراً اس کو شروع کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اُن کی سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ اس ایک لاکھ روپے میں سے اُن کو بیس ہزار روپے پمپنگ مشین منگوانے کے لئے دیئے جائیں اس کے بعد وہ کام شروع کریں گے۔ مگر بیٹے نے یہ شرط منظور نہیں کی، اس لئے کہ اس بیس ہزار روپے سے اسے بیس پیسے کا بھی فائدہ نہ ہوتا۔ اور وہ ایسے کام میں روپیہ لگانے کے لئے

بالکل تیار نہ تھا جس سے اُسے کسی آمدنی کی اُمید نہ ہو۔ بس اسی لمحے سے آخری سانس تک اُتم چند نے اپنے بیٹے سے بات نہیں کی۔ یہی نہیں بلکہ بیٹے کے اس سلوک کا اور ذہنیت کا ان پر اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔"

رام داس ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ میاں جی پھر ٹپک پڑے:

"اور وہ سونے کی گھڑی اور خلعت کا واقعہ ۔۔۔!"

"میاں جی بے چارے کو ذرا دم تو لینے دو۔" تیجا سنگھ میاں جی پر بپھرا۔

"ہاں ہاں میاں جی، ایک ایک بات سناؤں گا۔ ذرا صبر تو کرو۔"

"اور ان ساری باتوں کی سچائی کا ثبوت ۔۔۔؟" ایک کونے سے ایک نوجوان بولا۔

"برابر دینا ہوگا۔ ورنہ ہم یہ سمجھیں گے یہ بھی تمہاری من گھڑت کہانی ہے۔"

آخر میاں جی کے دل کا چور زبان پر آ گیا۔

"کیا اس کے لئے اُتم چند کا کنواں کافی نہیں ہے جسے آپ لوگوں نے نل کے آنے کے بعد سے بھلا دیا ہے؟"

"نہیں ۔۔۔!" ایک کونے سے آواز آئی۔

"بھلا کیوں ۔۔۔؟"

"اس لئے کہ تم جس اتم چند کا ذکر کر رہے ہو اُسے گاؤں کے بوڑھے نہیں جانتے۔ وہ اس اتم سنگھ کو جانتے ہیں جس نے خود سامنے رہ کر یہ کنواں کھدوایا تھا۔ جس کے کوئی لڑکا نہیں تھا، صرف ایک لڑکی تھی جو اس کنویں میں کود کر مر گئی تھی۔"

میاں جی ساری بات ایک ہی سانس میں بول گئے مگر چہرہ اس طرح دمکنے لگا جیسے اپنے دوست کے جھوٹ کو جا پکڑا ہو

"تو اس کا مطلب یہ ہوا میاں جی کہ لاہور کے گورنر کا وہ گزٹ جھوٹا ہے جس میں اتم چند کی اس عدیم المثال خدمت کا ذکر ہے ۔۔۔۔ جو اس نے پوری زندگی کی کمائی لگا کر ایک ایسے گاؤں میں کنواں کھدوایا تھا جہاں بارہ ماہ پینے کے پانی کا کال رہتا تھا، جسے خود انگریز سرکار بھی دور نہ کر سکی تھی ۔۔۔ اور جب انگریز گورنر نے اس بے غرض اور انسان دوست کو اس عوامی خدمت کے صلے میں ایک سونے کی گھڑی اور قیمتی خلعت اپنے بھرے دربار میں دینا چاہا اور اسے دعوت نامہ بھیجا تو وہ اس دعوت نامے کو ایسا بھول گیا جیسے ایک بے حقیقت کاغذ کا پرزہ ہو ۔۔۔ اس کے بعد کمشنر اور پھر تحصیل دار نے بھی اُسے ایسے ہی دعوت نامے بھیجے اور اس نے انہیں طاق نسیاں پر رکھ دیا ۔۔۔ اور یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ہم ہندوستانی آقاؤں کی ایک نظر کرم کے لئے بچانے کیا کچھ قربان کر دیتے تھے۔ اور ایک اتم چند تھا عظیم اور اُتم انسان کہ جب گورنر کا انعام اور خلعت لے کر خود بہ نفس نفیس تحصیل کا آدمی اس کے گھر آیا تو اُس نے انعام یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ:

"آدمی کی سیوا کرنا اس کا دھرم ہے۔ اور اس دھرم کا کوئی مبادلہ نہیں ہو سکتا!"

اور تب ہی بادل زور سے گرجا، اور گھنگھور گھٹا اس طرح برس پڑی جیسے آج ہی اتم چند کا سوکھا کنواں لبالب ہو جائے گا ۔۔۔!

احفاظ الرحمٰن

پیپل کا پیڑ

آج سرِشام ہی یہ کیا بھیانک اندھیرا چھاتا جا رہا تھا!

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے تاریکی کی تمام قوتوں نے مل کر زمین کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہو اور صدیوں کا حساب آج ہی چکانا چاہتی ہوں۔ یہ بڑھتا ہوا اندھیرا روح کو کیسے انجانے سے عذاب میں ڈالے دے رہا تھا۔

منظور میاں کھانستے ہوئے کھڑکی تک آئے اور وہاں کھڑے ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

باہر میدان میں بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔

انہوں نے سوچا "بڑھاپے سے بڑا عذاب اور کیا ہوگا جب انسان اپنی آرزوؤں کے لئے عمل بھی کرنے سے معذور ہوتا ہے!" وہ تھکے تھکے قدموں سے چلے اور اپنے پلنگ پر آ کر گر پڑے۔

بڑھاپا، عذاب اور تھکن ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن آج تو انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے جنم جنم کا دکھ اُن کی رُوح میں سمٹ گیا ہو اور صدیوں کی تھکن اُن کے جسم پر چھا گئی ہو۔

اُن کے بیٹے، نواسیاں، نواسے اور پوتیاں، پوتے، سب یہ کہتے ہیں کہ جب ہندوستان سے ان کے نام خط آتا ہے تو یوں ہی وہ پہلے ہی کئی دنوں تک چپ چپ سے رہتے ہیں اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو جاتے ہیں۔

اُن کے دکھ سے اُن کے بڑے بیٹے اصغر علی ہی واقف ہیں۔ واقف تو سبھی ہیں لیکن شاید سب سے زیادہ احساس انہیں ہی ہے۔

"آج موہن چاچا کا خط آیا تھا؟" وہ رات کو جب دستر خوان کا کھانا لے کر جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔

"ہاں!" منظور میاں سر جھکائے آہستہ سے جواب دیتے ہیں۔

"کیا لکھا ہے؟"

وہ خط چپکے سے ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔

سب چھوٹی چھوٹی، معمولی معمولی سی باتیں ہوتی ہیں لیکن انہیں پڑھ کر دل میں جانے کیوں ایک چبھن، ایک خلش سی رہ رہ کر ابھرتی ہے اور دیر تک تڑپاتی ہے......

"..... میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، تم بھی ہو گئے ہو گے! پیپل کا پیڑ بھی جھڑنے لگا ہے - رات کو چاندنی میں بچے اب بھی آنکھ مچولی اور آتی پاتی کھیلتے ہیں - پرکاش بیمار ہے - اصغر، اکبر اور انور کیسے ہیں؟ اب کے آم بہت میٹھے آئے ہیں، وہاں کے آم کیسے ہیں؟ کل شہر گیا تھا - اپنے اسکول کے پاس سے گذرا، ہیرا ملا تھا، تمہیں پوچھ رہا تھا. گوبند کے نواسا ہوا ہے بشمبھر کا انتقال ہو گیا ہے. گاؤں کے پاس ایک نئی پکی سڑک بنائی جا رہی ہے....."

یہ اور ایسی نہ جانے کتنی باتیں ہیں، جو ہر بار موہن چاچا لکھتے ہیں، جنہیں پڑھ کر منظور میاں کی روح میں جنم جنم کا دکھ سمٹ آتا ہے، صدیوں کی تھکن ان کے جسم پر چھا جاتی ہے -

پھر اصغر علی انہیں زبردستی کھانا کھلاتے ہیں -

"ابا میاں! آپ بیتی باتوں پر غم کیوں کرتے ہیں؟"

وہ کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیتے ہیں اور اصغر علی کو گھورنے لگتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں: تم بھی ایسا کہہ رہے ہو؟ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے. ہر بار منظور میاں کے پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں، ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں پوچھتے ہیں، "یہ دادا میاں کو اچانک کیا ہو گیا؟ کل تو آنگن میں نیم کے نیچے ہمیں کتنی پیاری سی میٹھی کہانی سنا رہے تھے!"

اور آج پھر خط آیا تھا. دونوں ملکوں کی جنگ کے بعد یہ پہلا خط تھا -

منظور میاں کانپتے ہوئے پلنگ سے اٹھے اور ایک بار پھر کھڑکی تک آئے - باہر کیسا عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا - دھندلا دھندلا سا افق اپنی دھندلاہٹ میں دنیا کی ساری خوشیوں اور ساری سچائیوں کو سمیٹے لئے جا رہا تھا - چھوٹی بڑی رنگ برنگی عمارتیں، ہرے بھرے درخت، دور تک لہراتی ہوئی سڑکیں، اڑتے ہوئے پرندے اور میدان میں کھیلتے ہوئے بچے سب کے سب اپنی اپنی چمک چھوڑ کر کہیں دور غائب سے ہوتے جا رہے تھے -

لیکن شاید یہ سب کچھ ان کا وہم تھا، ان کی اپنی کیفیات تھیں -

باہر میدان میں بچے اب بھی فٹ بال کھیل رہے تھے، جیتے جاگتے قدموں کے ساتھ ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے - افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کے ملے جلے رنگوں سے گلزار سا کھل اٹھا تھا - بائیں طرف والی عمارت کی بالکنی پر ایک ماں اپنے بچے کا منہ چوم رہی تھی - سڑکوں پر رنگ برنگی کاریں تیزی سے دوڑ رہی تھیں - درخت ہوا میں جھوم رہے تھے - ماں مسکرا رہی تھی - بچہ مسکرا رہا تھا - ہر چیز روشن اور نمایاں تھی ...

"یہ آنسو بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، ہر چیز پر تاریکیوں کی دھندلاہٹ بکھیر دیتے ہیں" - ایسا کب ہوتا ہے؟ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا - "شاید اس وقت جب انسان کے پاس روشنی کی کوئی کرن نہیں ہوتی، اور اس کی سوچ کی تمام راہیں اندھیروں میں بھٹکتی پھرتی ہیں!"

انہوں نے آستین سے پلکوں پر بکھرے ہوئے آنسو پونچھ لئے۔

یہ موہن ہر بار کیوں میرے ذہن کو اندھیروں میں بھٹکا دیتا ہے - میرے ذہن کو، میرے جسم کو اس ملک سے، اس شہر سے ہزاروں میل دور ایک دوسرے ملک میں، ایک دوسرے گاؤں میں کیوں کھینچ لیتا ہے - پیپل کا پیڑ بوڑھا ہو گیا ہے تو میں کیا کروں! ہاں ٹھیک ہی تو ہے ہم نے بچپن کا اکثر وقت وہاں گذارا ہے - اس کی چھاؤں کتنی ٹھنڈی، کتنی میٹھی ہوتی تھی - .....

گزرے ہوئے دھندلے دھندلے سے دنوں کے تصوّر نے اُن کی رُوح پر عذاب کا بوجھ اور بڑھا دیا۔ پھر بھی اُن کا ذہن
اُسی تصوّر میں اُنہیں یادوں میں ڈوبا رہا۔

روزانہ اسکول سے آکر کھانا کھانے کے بعد وہ اماں کی آنکھ بچا کر باہر نکل جاتے اور چلچلاتی دھوپ میں پیپل کی طرف
دوڑ پڑتے۔ اُن کے گھر سے ایک آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ موہن رونی صورت بنائے وہاں پہلے سے موجود ہوتا :

"ماتا جی دروازے پر بیٹھی تھیں، میں پیچھے سے آنگن کی دیوار کود کر بھاگ آیا" وہ سینہ پھُلا کر کہتا!

"اور مجھے تو اماں نے زبردستی بستر پہ ڈال دیا تھا، اور میں جھوٹ موٹ سو گیا تھا!"

دونوں ہنس پڑتے۔

"میں نے راستے میں راجو کے کھیت سے یہ ککڑی توڑی تھی" یہ کہہ کر موہن اپنی جیب سے ایک ٹیڑھی ترچھی سی ککڑی نکالتا
بیچ سے اس کے دو ٹکڑے کرتا، اور ایک ٹکڑا ان کو پکڑا دیتا۔

دونوں پیپل پر چڑھ جاتے۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے لڑکے بھی جمع ہو جاتے۔ پرکاش، فضل، گوبند، مجید، ہیرا سنگھ — اور پھر اُن کی ساری
دوپہر وہیں کھیلتے گذر جاتی۔

پیپل کا وہ پیڑ ان کے تمام کھیلوں کا محور تھا۔ اصل میں اس کے چاروں طرف کی زمین دور دور تک خالی پڑی تھی۔ وہ دن
میں گلی ڈنڈا، جھاڑ بندر اور گولیاں کھیلتے، پتنگ بازی اور لٹو بازی کرتے اور رات کو آتی پاتی، آنکھ مچولی اور کبڈی۔ سارے کھیل وہیں
ہوتے تھے۔ وہ مرکز تھا ان کے باہمی میل جول اور محبت کا۔ انہوں نے اس کے نیچے اتنے انمٹ لمحے گذارے تھے، اور اتنے دھیان
سے گذارے تھے کہ وہ اب بھی بتا سکتے تھے کہ اس کی کل کتنی شاخیں تھیں، اور ان پر کہاں کہاں کس کس کے نام کھدے ہوئے تھے،
کس شاخ پہ بیٹھے ہوئے ایک دن فضل کا پاؤں پھسل گیا تھا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا۔ کس شاخ پر ایک دن طوطے کا ایک چھوٹا سا بچہ
اڑتا ہوا آیا تھا اور موہن نے ایک ہی جھپٹے میں اُسے دبوچ لیا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ وہ آپس میں لڑ پڑتے۔ سر پھٹول ہو جاتی۔ بات چیت بند ہو جاتی۔ لیکن دوپہر کو یا رات کو پیپل کے نیچے
آکر اُن کی ساری شکایتیں دور ہو جاتیں۔ دور سے جھجکتے جھجکتے، رُکتے رُکتے وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے، پھر بے تعلق انداز
میں ایک دو باتیں ہوتیں اور پھر بات چل جاتی۔ بچپن کی ان چھوٹی چھوٹی، پیاری پیاری باتوں کی مٹھاس ان کے دلوں میں گھُل مل جاتی۔
پھر ہنسی پھر سے ان کے ہونٹوں پر بکھر جاتی۔

"چلو ہیرا، پرکاش، فضل اور گوبند کو بلا لائیں!"

"چلو — !!"

فریب سے ناواقف، حسد سے انجان قدم خلوص کے ساتھ ایک دوسرے سے مل جاتے۔

انسانی کردار کی ان برائیوں سے ان کے ناتجربہ کار ذہن پہلی بار جس بھرپور طریقے سے آشنا ہوئے تھے، وہ بھی انہیں آج تک
یاد ہے۔ ایک دن وہ اسکول سے گھر واپس آ رہے تھے، بہت سخت دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور وہ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ گھر
پہنچتے ہی ٹھنڈی لسی کے دو گلاس چڑھا جائیں گے، روٹی کھائیں گے اور کچھ دیر کے بعد پیپل کے نیچے آ ملیں گے۔

"تم فضل، ہیرا اور سنگھ کو اپنے ساتھ لے آنا!" انہوں نے موہن سے کہا تھا۔ فضل، ہیرا اور سنگھ اُس کے مکان کے پاس رہتے تھے۔

"اور تو، پرکاش، گوبند اور مجید کو بُلا لانا!" موہن نے اُن سے کہا تھا ——— مجید، پرکاش اور گوبند اُن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔

"اچھا ——— !"

وہ دونوں راموپنساری کی دوکان سے اگلا موڑ مڑے ہی تھے کہ انہیں زور کا شور سنائی دیا۔ یہ شور ایسا نہیں تھا، جیسا انہوں نے میلے میں سُنا تھا، یا دوسرے گاؤں سے کبڈی کے مقابلوں میں سُنا تھا اور نہ ہی ایسا تھا جیسا وہ نفس کی کٹائی پر سنتے تھے، یہ تو ایسا شور تھا جو آگ لگنے پر ہوتا ہے۔

اور جب وہ دوڑتے دوڑتے وہاں پہونچے تو انہوں نے دیکھا تھا کہ گاؤں کے سارے لوگ فضل کے گھر کے سامنے ایک گھیرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ وہ آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن یہ عجیب سی سرگوشیاں تھیں جو بڑے بڑے ہنگاموں سے زیادہ ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ آگ واگ وہاں کچھ نہیں تھی۔ البتہ جب انہوں نے بلصبلے آدمیوں کی ٹانگوں میں گھس گھسا کر اندر کی طرف دیکھا تھا تو بیچ میں چھوٹے چھوٹے دو تین گڑھے سے تازہ خون سے بھرے نظر آئے۔ وہیں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک سپاہی اور بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار بیٹھا ہوا ایک رجسٹر پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ فضل کا باپ غلام رسول، اس کا چچا غلام محمد اور اس کا بھائی فتح محمد سر سے پیر تک خون میں لت پت ایک طرف کھڑے تھے، اور ان کے ساتھ گاؤں کے سارے مسلمان بھی کھڑے تھے، اور ان سب کے آگے اُونچے طرّے والی پگڑی لگائے مولوی رحمت علی کھڑے تھے، اور ان سے دھیرے دھیرے رازدارانہ انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ اور دوسری طرف گوبند کے پتا رام چند، اس کا تایا مادھو لال اور اس کا بھائی شرما خون خون کھڑے تھے ان کے ساتھ گاؤں کے سارے ہندو بھی کھڑے تھے، اور ان سب کے آگے پنڈت بدری ناتھ ماتھے پر تلک لگائے کھڑے تھے، اور ان سے دھیرے دھیرے رازدارانہ انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

انتہائی شوق سے انہوں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کے کہانی کے سارے ٹکڑے سُن لئے ——— ایک ڈیڑھ ماہ پہلے غلام رسول کسی دوسرے گاؤں سے ایک خوب صورت سی تندرست گائے خرید کر لایا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ہی وہ بیمار پڑ گئی اور لاکھ دعا دارو کے باوجود اچھی نہیں ہوئی۔ روز بروز گھلتی گئی۔ کچھ دنوں سے اس نے دودھ دینا بھی بند کر دیا تھا۔ چنانچہ آج غلام رسول نے اُس کے گلے پر چھری پھیر دی۔

رام چند اُس کا پڑوسی تھا۔ اس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن کچھ دیر بعد جب پنڈت بدری ناتھ کا وہاں سے گذر ہوا، تو انہوں نے اس سے کہا:

"گئو ماتا کا خون تمہارے گھر کے سامنے پڑا ہے، تم سیدھے نرک میں جاؤ گے!"

سُنا ہے نرک میں آگ ہوتی ہے، سانپ، بچھو ہوتے ہیں اور پیپ کا دریا ہوتا ہے۔ رام چند ایسی نرک میں جانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اپنے بیٹے اور بھائی کے ساتھ لاٹھی لے کر نکل آیا۔

ان دونوں کو سخت بھوک لگ رہی تھی اور سخت پیاس لگ رہی تھی۔ انہوں نے طے کیا کہ لسی پینے اور روٹی کھانے کے بعد

وہ پھر نہیں آ پائیں گے۔ اور اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے..... لیکن جب وہ لسّی پی کر اور روٹی کھا کر واپس آئے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تھانیدار سب کچھ ہٹا لے گیا تھا!

اس دن جب وہ پیپل کے نیچے جا کر بیٹھے تو نہ جانے کیوں پہلی بار اس کی چھاؤں ٹھنڈی نہیں لگی۔ بہت انتظار کے باوجود پرکاش، فضل، گوبند، حمید اور ہیرا میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ اور انہیں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ پیپل کی چھاؤں اور آنکھ مچولی اور کبڈی سے بڑی بھی ایک چیز ہے جس کا نام دھرم ہے اور جس کے لئے آگ پھیلتی ہے، خون برستا ہے اور انسان دو سمتوں میں بٹ جاتے ہیں۔

کئی دنوں تک کھیل کود میں ان کا جی نہیں لگا۔

موہن، فضل کے پاس جاتا تو وہ کہتا "میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گا، تم ہندو ہو!"

اور وہ خود گوبند کے پاس جاتے تو وہ کہتا: "تم تو مسلمان ہو!"

پیپل کی چھاؤں سُونی ہو گئی۔ شاید اس لئے کہ بڑوں کی چوپال بھی بے رنگ ہو گئی تھی۔ وہ سوچا کرتے "یہ بڑے لوگ جانے کیوں اپنی چوپالوں کے ساتھ بچوں کے پیڑ بھی سنسان کر دیتے ہیں!"

لیکن انہیں زیادہ دنوں تک سنسان راہوں پر بھٹکنا نہیں پڑا۔ شاید بچوں کا اپنا کوئی دھرم نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے بڑوں کا عکس ہوتا ہے۔ بہت جلد ان کے بڑے آپس میں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ کھیتوں میں، چوپالوں میں، میلوں میں، کبڈی کے مقابلوں میں، اور شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے قہقہے مشترک ہو کر گونجنے لگے تو ان کے پیپل کی شاخیں بھی آباد ہو گئیں۔

یہ نقش، یہ پہلا نقش ان کے ذہنوں پر اتنا گہرا جما تھا کہ وہ اسے آج تک نہیں بھولے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ انسان کی ابدی اور دائمی خوشیاں، دھان کے کھیتوں، پیپل کی چھاؤں، کبڈی کے مقابلوں اور چوپال کے گیتوں ہی میں چھپی ہوئی ہیں۔ یہی ان کے لئے سب سے زیادہ کشش رکھتی ہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا دھرم ہیں۔ اور چاہے مولوی رحمت علی اور پنڈت بدری ناتھ کے دھرم ان کے درمیان کتنا ہی فاصلہ قائم کر دیں، وہ آخر میں انہیں لہلہاتی فصلوں اور انہیں میٹھی تانوں کی طرف پلٹیں گے۔ دن میں ایک ساتھ فصلیں کاٹیں گے، پیپل کی چھاؤں میں بیٹھیں گے، اور رات کو آواز میں آواز ملا کر جاڑے کے گیت گائیں گے۔

انہوں نے اپنی دوستی کے سارے لمحے اسی ایک نقش کے نیچے گذار دیئے۔

بڑے ہو کر وہ اور موہن ایک ہی دفتر میں ملازم ہو گئے تھے۔ شام کو چھٹی کے بعد وہ شہر سے ساتھ ساتھ آتے۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ پرکاش، فضل، گوبند اور ہیرا بھی ہوتے۔ پیپل کا پیڑ ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ اکثر رک جاتے اور اس کے نیچے بیٹھ جاتے۔

موہن کہتا، "منظور! یاد ہے؟ اس ڈال پر میرا نام کھدا ہوا تھا، اور اس سے اوپر والی پر تمہارا!"

"ہاں!" وہ اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیتے۔ "اب تو مٹ گئے ہوں گے! اور اس ڈال پر سے فضل گر پڑا تھا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا۔"

"چلیں ؟"

"ہاں چلو !"

وہ چند لمحے اس کے نیچے گذارتے۔ لیکن ان چند لمحوں میں پچھلے تمام سالوں کی میٹھی یادیں اُن کی رُوح پر چھا جاتیں —
اور یہ واقعہ تو انہیں موہن ہی نے اپنے کسی پچھلے خط میں یاد دلایا تھا۔

ایک دن وہ اسی طرح دفتر سے واپسی پر پیپل کے نیچے آکر بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے کہ انہیں دُور سے سوہن اور اصغر اسی طرف آتے دکھائی دیئے۔ اور انہوں نے سوہن کا کندھا پکڑ کر ہلایا تھا اور کہا تھا : "موہن ! دیکھ رہے ہو' اصغر اور سوہن اسی طرف آ رہے ہیں :"

"ہاں ! چلو' اب ہم بڑے ہو گئے ہیں' اب یہ ہمارے بچوں کی جگہ ہے :" اور دونوں ہنستے ہوئے فوراً وہاں سے اُٹھ گئے تھے۔

نہ جانے کب سے ایسا ہوتا آیا تھا۔ جب بچے بڑے ہو جاتے تھے' اپنا گھر بار بسا لیتے تھے تو پیپل اور اس سے ملحق میدان سے خود بخود اپنے بچوں کے حق میں دستبردار ہو جاتے۔ یہ روایات معلوم نہیں کب سے چلی آ رہی تھیں۔ گاؤں کے سارے بوڑھے اسی پیڑ کے نیچے کھیل چکے تھے۔ اب فضل' ہیرا' مجید' پرکاش' گوبند' سنگھ' موہن اور خود ان کی جگہ ان کے بچے شیر محمد' کمار' رشید' گوپال' سُورج' کرپال' سوہن اور اصغر لے چکے تھے۔ وہ بھی ان کی طرح دن میں گلی ڈنڈا' جھاڑ بندر اور گولیاں کھیلتے اور لٹو بازی اور پتنگ بازی کرتے اور رات کو چاندنی میں کبڈی اور آتی پاتی کھیلتے۔ وہ بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے' مار پیٹ کرتے تھے' بات چیت بند کر دیتے تھے۔ لیکن ایک دو دن بعد رُکتے رُکتے' جھجکتے جھجکتے پھر ایک دوسرے سے بولنے لگتے' پھر ایک ہو جاتے۔ چلچلاتی دھوپ میں چوری چھپے اپنے اپنے گھروں سے نکلتے اور پیپل کے نیچے جمع ہو جاتے۔ کبھی کبھار ان کے بڑے بھی آپس میں لڑ پڑتے' دوستوں میں بٹ جاتے' ان کی چوپال سونی ہو جاتی' گندم کی بالیاں بے رنگ ہو جاتیں' پیپل کی چھاؤں بے کیف ہو جاتی اور وہ ایک دوسرے سے کہتے :

"تم ہندو ہو' ہم تمہارے ساتھ نہیں کھیلیں گے :"

"تم مسلمان ہو' ہم تمہارے ساتھ نہیں آئیں گے :"

لیکن انسان کی ابدی اور دائمی خوشیاں تو دھان کے کھیتوں' کبڈی کے مقابلوں اور چوپال کے گیتوں میں موجود ہیں۔ اس کا تجربہ انہیں بچپن سے تھا۔ وہ یہ دیکھتے رہتے تھے اور صرف مسلمانوں اور ہندوؤں کی آپس میں لڑائی نہیں ہوتی' بلکہ ہندو کی لڑائی ہندو سے بھی ہو جاتی ہے اور مسلمان' مسلمان سے بھی لڑ پڑتا ہے۔ اس لئے وہ پھر ایک ساتھ بیٹھنے لگتے' ساتھ ساتھ فصلیں کاٹتے اور رات کو چوپال میں چاندنی کے گیت گاتے۔

کھڑکی کے ساتھ کھڑے کھڑے منظور میاں نے چند مختصر سے لمحوں میں اتنی ساری باتوں کا عکس اپنے ذہن میں اُتار لیا ہے' اُن کی روح میں جنم جنم کا دکھ سمٹ آیا ہے' اور صدیوں کی تھکن اُن کے جسم پر چھائی ہے ..... آج آیا ہوا موہن کا خط میز پر پڑا ہوا ہے۔

'یہ موہن ہر بار جانے کیوں عجیب عجیب سے خط لکھ کر میرے ذہن کو اندھیروں میں بھٹکا دیتا ہے — پچھلے خط میں

اُس نے لکھا تھا

"ہم بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔ پیپل کا پیڑ بھی بہت بوڑھا ہوگیا ہے۔ اصغر اور سوہن بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔ انور اور کرشن رہ جائیں گے۔ ہم تم بھی لڑتے تھے، اور اصغر اور سوہن بھی لڑتے تھے، لیکن ہمارے دلوں میں پیپل کے چھاؤں کی مٹھاس بھی ہے، ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کی مہک بھی ہے۔ جو درد کے رشتے کو مضبوط کرتی ہے۔ لیکن انور اور کرشن کے درمیان اس رشتے کو مضبوط کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ تم پاسپورٹ پر کچھ دنوں کے لئے انور کو لے کر یہاں آجاؤ، اور جب تم آجاؤ گے تو ہم انور اور کرشن کا ہاتھ پکڑیں گے اور انہیں پیپل کے نیچے چھوڑ آئیں گے تاکہ وہ اس کی مٹھاس اور مہک کو اچھی طرح اپنے دل میں بسالیں۔ یہ مہک، یہ مٹھاس اُن کے درمیان فاصلوں کو کم کرتی رہے گی!"

یہ خط پڑھ کر انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ضرور جائیں گے اور اپنے پُرانے اور سچے دوست کی خواہش کو ضرور پورا کریں گے

... لیکن اس اثناء میں جنگ شروع ہوگئی۔

منظور میاں نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھا ہے۔

باہر میدان میں بچے جیتے جاگتے قدموں کے ساتھ فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے بلے جلے رنگوں سے افق پر گلنار سا کھل اٹھا ہے۔ بائیں طرف والی عمارت کی بالکنی پر ایک ماں اپنے بچے کا منہ چوم رہی ہے... درخت ہوائیں جھوم رہے ہیں۔ دودھ جیسے سفید پرندوں کی ایک ڈار ابھی ابھی سر پر سے گذری ہے .....

..... یہ آنسو بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، ہر چیز پر دھندلاہٹ بکھیر دیتے ہیں..... کھوں..... کھوں..... کھوں.... کھانسی بڑھتی جا رہی ہے۔ روح پر کیسا بھیانک اندھیرا سا چھاتا جا رہا ہے .....

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی ہے۔ شاید اصغر علی آئے ہیں۔ آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔

"ابا میاں! موہن چاچا کا خط آیا ہے؟"

وہ جواب نہیں دیتے، پھر جا کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوجاتے ہیں۔

"جنگ کے بعد موہن چاچا کا یہ پہلا خط ہے!"

اصغر علی نے کھانا میز پر رکھ کر خط اٹھایا ہے۔ صرف چند سطریں ہیں۔ لکھا ہے ....

"گاؤں کے پاس جو نئی سڑک بن رہی تھی، اس کی سیدھ میں پیپل کا پیڑ آگیا تھا، کل اُسے کاٹ کر گرا دیا گیا!"

کھوں..... کھوں..... کھوں..... کھانسی بڑھتی جا رہی ہے۔

اصغر علی اُن کے لئے پانی لینے آتے ہیں۔

(باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیں)

UNITED

ایک آہنگ
مجاز
ایک آہنگ
مجاز

کرشن چندر

سڑک واپس جاتی ہے

میرے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان
صبا لکھنوی

چاندی کی کہانی

کیونڈرز
پاکستان کا
پہلا
میگنم
سگریٹ
CAVANDER'S
NAVY CUT
CAVANDER'S
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM
خوردہ قیمت
۳۸ پیسے میں دس عدد
UNITED
10/U/PTC

خواجہ اعجاز احمد بٹ

افسانچے

زندگی میں ایک بار

دو راکٹ اکٹھے چاند پر اُترے۔ دونوں کی کھڑکیاں کھلیں۔ دونوں میں سے ایک ایک آدمی باہر نکلا۔ ہر ایک کے چہرے پر شفاف نقاب تھا۔ ہاتھ میں اسٹین گن قسم کا کوئی ہتھیار۔ پاؤں میں کسی دھات کے جُوتے — دونوں فوجی انداز میں قدم بڑھانے لگے —

جب دونوں ایک ٹیلے کے قریب ملے تو پہلے نے دوسرے سے کہا:

"ہینڈز اَپ — اگر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اُڑا دیئے جاؤ گے"

"شٹ اَپ — اگر زیادہ آواز نکالی تو تمہارا گلا دبا دیا جائے گا"

"تم کون ہو؟"

"تم کون ہو؟"

"میں نیچے کی دنیا کا انسان ہوں"

"میں اُوپر والی دنیا کا انسان ہوں" اُس نے اوپر اشارا کیا۔

"آؤ تو پھر دونوں اکٹھے چاند والے انسان کو تلاش کریں"

"عورت یا مَرد؟"

"میں تو عورت کی تلاش کروں گا"

نیچی دنیا والے انسان نے کہا!

"مجھے تو مرد کی تلاش ہے۔ ہمارے ملک میں عورتیں ہی عورتیں ہیں، مرد نہیں"

اور پھر دونوں کی آنکھیں ملیں۔

اوپر والی دنیا کے انسان نے خول اُتار دیا، اور سراپا حسن بن کر سامنے آ گیا۔

فرسٹریشن

میرے ضمیر نے مجھ سے کہا: "حلال کی روٹی کھایا کر۔"
میرے دماغ نے جواب دیا: "پھر احساس کمتری غالب آجائے گا۔"
"احساس کمتری پر غالب آجاؤ۔" ضمیر نے غصے سے کہا۔
"پھر فرسٹریشن ہوجائے گی۔" دماغ نے جل بھن کر جواب دیا۔

آکھاں وارث شاہ نوں

جب ایٹم بم نے ساری فضا کو دھواں دھار کر دیا۔ اور عظیم المرتبت انسان کے اعضا ذرّات بن کر اُڑ گئے۔ عمارات زمین پر آرہیں۔ تو بچے کچھے ملبے سے ایک ادھیڑ عمر عورت نے سر اٹھاتے ہوئے ——— ایک کٹے ہوئے سر پر اپنے ہونٹ جما دیئے اور اپنی سوکھی سوکھی آنکھیں جھپکا کر گویا اشاروں سے کہنے لگی ———
"اج آکھاں وارث شاہ نوں۔"

ارے دلغریبا

انور نے تہیہ کر لیا کہ وہ دفتر کی ٹائپسٹ کو بیاہ کر لے آئے گا۔ ماں باپ پر سول میرج کی دھمکی کارگر نہ ہوئی۔ گاڑی تلے سر دینے کا ارادہ ظاہر کرنے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے ——— تو وہ ٹائپسٹ کو دوست کی حیثیت سے گھر لے آیا۔
"ماں ——— یہ بے چاری غریب ہے۔ اور اس کا گھر اور ٹھکانہ بھی کوئی نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں "پے انگ گیسٹ" (Paying Guest) کی حیثیت سے رہے گی۔"
تو ماں انگلیوں پر گننے لگی:
"پہلی میں کتنے دن رہ گئے ہیں بیٹا!"

چند سال اور

مال روڈ کراسنگ گذرنے کے بعد اس نے اپنے لائیٹ بلیو کوٹ کو دونوں ہاتھوں سے درست کیا، اور حسب عادت گردن کو جھکا دیا۔
فٹ پاتھ کے قریب کھڑے کار کے شوفر نے آداب بجا لاکر دروازہ کھول دیا۔
"سر"
"ابھی نہیں، اس کے لئے مجھے چند سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔"
لائیٹ بلیو کوٹ والے نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

(باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

ایم۔ یوسف ہستی

دو ہاتھ۔ ایک لکیر

اور ـــــ اب جو ذرا بے تکلفی بڑھی تو دونوں نے کھل کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکنا شروع کر دیا۔ محبت بھری نگاہوں کے دائرے چکنی اور چمکدار جلد سے پھسل پھسل کر استوار ہوتے چلے گئے، اور ـــــ وہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی ماحول سے بے خبر بنتے گئے!

کتاب دیدہ زیب ہو تو یوں بھی قاری کو ورق گردانی کی خواہش سی پیدا ہوتی ہے، پھر ـــــ وہ تو سروری تھی، ماڈرن، بے باک، نازک نازک انگلیوں والی! چکنے رخسار پر تل والی ـــــ! یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت نے گوندھے ہوئے میدے سے بنے جسم پر دو تازہ گلاب رکھ دیئے ہوں اور ـــــ ایک گلاب کے کنارے پر، ایک سیاہ چیونٹی اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے گلاب کا چوری چوری مسلسل رس پی رہی ہو اور ـــــ سروری کو جیسے کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں!

ـــــ تو مرزا بھی اگر اس پر ریجھ گئے ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

ایک سہ پہر جب کہ سیکشن میں کوئی بھی نہ تھا، مرزا نے سروری سے رازدارانہ لہجے میں کہا ـــــ

"جانتی ہو! رخسار کے سیدھے جانب جو تل ہوتا ہے، وہ کس بات کا پتہ دیتا ہے؟"

"شاید حسین سے حسین تر ہونے کا!" سروری نے بے باکی سے کہا۔

"نہیں محبت اور صرف محبت کی نشانی کا!"

"اس دھبہ کو محبت کی نشانی سے کیا واسطہ؟"

"ہے! ورنہ یہ دھبہ کسی اور جگہ بھی تو ابھر سکتا تھا؟!"

اتنا کہہ کر مرزا اپنے آپ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، اور ـــــ سروری جو خود "پامسٹری" میں تھوڑا بہت دخل رکھتی تھی غور کرنے لگی ـــــ

"یہ بات تو پامسٹری کی کسی کتاب میں نظر نہ آئی ـــــ ہاں! فیس ریڈنگ (Face Reading) کے سلسلے میں ہو تو ہو! البتہ محبت کی وہ لکیر جو ہتھیلی میں ابھرتی ہے ـــــ ابھرنے اور ڈوبنے والی محبت کا پتہ

دیتی ہے! خدا نہ کرے میری محبت ڈوبے! میں نے خود ان دنوں کئی مرتبہ دیکھا ہے
کہ محبت کی لکیر طلوعِ آفتاب کی طرح چڑھ رہی ہے ــــ جانے کیوں! کل جب مرزا
ہنس رہے تھے تو میں نے غور سے دیکھا ــــ ان کے نچلے ہونٹ کے سرے پر ایک گہرا
تل ہے، جس کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہے کہ ــــ یہ جذباتی انسانوں کی علامت
ہے ــ خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے؟!"

آج صبح سے اس طرح بارش ہو رہی تھی جیسے آسمان سے پانی کی بوندیں نہیں، بھاری بھاری شہتیریں گر رہی ہوں! مرزا جو کسی نہ کسی طرح دفتر پہنچ چکے تھے، سیکشن میں اکیلے بیٹھے، بارش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، تصور میں سروری کا تنہا آنا ہوا تل دیکھ رہے تھے کہ ــــ اچانک سروری وارد ہوئی ــــ پہلے تو وہ حیران سے ہوئے، پھر ان نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا جس میں مصنوعی حیرانی بھی تھی اور شادمانی بھی! محبت کے ابتدائی مرحلوں میں، محبوب کا تنہا ملنا ایک نعمت سا ہوتا ہے، تو مرزا کو سروری کا تنہا مل جانا، دوسرے کلرکوں کی آمد کی توقع نہ رکھنا، اُس خیالِ مسلسل کی ایک کڑی تھا جس میں محبوب صرف اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے!

"ارے! آپ اس قدر تیز بارش میں بھی دفتر نہ بھولیں؟!" مرزا نے اداکارانہ انداز میں حیرت کا اظہار کیا۔

"بس آگئی۔ خیال تھا تنہا ہوں گی۔ اور کچھ پڑا ہوا کام سمیٹ لوں گی۔ یہ جانتے ہوئے کہ طوفانی بارش ہے، کون آئے گا چلی آئی!"

"اچھا ــ! تو کام کی یاد آئی ....؟"

"بس یہی سمجھئے ــ!"

"میں تو تنہائی سے بور ہو رہا تھا، دیکھئے نا ــ بدھوؤں کی طرح آسمان کی آنکھوں سے برستے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا اب آپ کے ساتھ دیکھوں تو یہ آنسو چمکتے ہوئے موتی نظر آئیں!" مرزا نے شاعری کی۔

"دیکھئے تو ــ! اس پانی کے بیچ بجلی کس طرح چمک رہی ہے؟!" سروری نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بجلی! اس کا کام ہی چمکنا اور گرنا ہے! اس کو کیا پتہ ــ اس کی یہ کڑک، یہ چمک اتنی "دوری" کے باوجود زمین والوں پر کیا کیا غضب ڈھاتی ہے؟!" مرزا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"کڑ ــ کڑ ــ کڑ ــ کڑ ــ!" سروری سہم سی گئی، اور ــ اپنی کرسی کو چھوڑ کر مرزا کے قریب دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" مرزا نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"بُرا ماننے والی بات ہوگی تو ضرور بُرا مانوں گی!" سروری نے اوڑھنی کی سلوٹیں ٹھیک کرتے ہوئے چپکے سے جواب دیا،

"لائیے ــ! میں ذرا آپ کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھوں! شاید اس طرح کچھ وقت بھی اچھا کٹے اور ...... !" مرزا نے یہ کہہ کر سروری کی طرف ان نگاہوں سے دیکھا جس میں بھرپور آس ہوتی ہے۔

"لیجئے! لیجئے! مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ تیل راجہ بھی ہیں!" سروری نے مسکراتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ مرزا کے سامنے

پھیلا دیا۔

مرزا بہت دیر تک سروری کے ہاتھ کی نازک نازک لکیروں کو گھورتا رہا اور مطلب نکالتا رہا، ایسے جیسے کوئی بچہ حرفوں کو جوڑ جوڑ کر ہجے کرنے کی مشق کر رہا ہو! ہتھیلی کے دونوں طرف کے ابھار، انگلیوں کی خوب صورت تراش، ان کی نرم نرم، ابھری ابھری پوریں اور — جانے کیا کیا دیکھتا رہا — خود ہی مسکراتا رہا — مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکا، شاید وہ انگلیوں کے حسن میں کھو کر دور نکل گیا تھا!

سروری، مرزا کا چہرہ، نچلے ہونٹ کا تل اور داہنے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے پڑھ رہی تھی جو — اس کے آگے بے خیالی میں رکھ دیا گیا تھا۔

"آپ تو کچھ کہتے ہی نہیں۔ کہیں میرے ہاتھ کی لکیریں بھی گونگی تو نہیں؟" سروری نے مرزا کی خاموشی پر طنز کیا۔

"میں نوآموز ہوں! بس سمجھئے کہ اسٹیڈی کر رہا ہوں۔ مشق کے دوران کوئی اپنا فن کہیں کسی کے آگے پیش کرتا ہے؟!"

مرزا نے سلیقے سے اپنی جہالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"تو یوں سمجھوں کہ — مجھے ہی تختۂ مشق بنایا گیا؟!" سروری نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے غضب کرتی ہیں آپ — آپ کا ہاتھ بڑا ہی خوب صورت ہے!" مرزا نے سروری کے ہاتھ کا سہارا لیتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میں لکیروں کی خوب صورتی کی بات کر رہی ہوں، ہاتھ کی خوب صورتی کی نہیں —! آخر یہ کتنی خوب صورت نکلیں؟"

"یہ لکیریں بھی ہاتھ کی طرح حسین ہیں — خوب صورت! ......"

مرزا نے اتنا کہا ہی تھا کہ —

"کون حسین ہے؟ کون خوب صورت ہے؟" کہتے ہوئے حسینی کمرے میں داخل ہوا۔ اور سروری پر بے پروائی سے نظر ڈالتے ہوئے اپنا واٹر پروف اُتارنے لگا۔

سروری یوں ٹھٹھر گئی جیسے واقعی ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کو چھو کر گذر گیا ہو!

حسینی نے اپنی کرسی مرزا کے برابر سرکا کر بیٹھتے ہوئے کہا:

"کون خوب صورت ہے؟ تُو کہ میں؟"

"وقت!" مرزا نے کہا۔

اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

اور سروری کی مسکراہٹ تھمتی ہوئی بارش کی طرح اس کے ہونٹوں پر رک سی گئی!

مرزا اپنے گھر آ کر خیالوں کی دنیا میں پہونچ گیا —

"کتنی شاندار لکیریں ہیں سروری کی؟! ہزاروں ہاتھ دیکھ ڈالے مگر — یہ بات کہاں؟ دولت اور محبت کی لکیریں اس طرح چڑھ رہی ہیں جیسے چڑھتی ندی! یہ ایک جسم حاصل ہو جائے تو گھر جنت بن جائے! وہ گھر ہی کیا، جس میں محبت اور

دولت نہ ہو؟! لکیروں سے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں بھی محبت رینگ رہی ہے۔
بلکہ دوڑ رہی ہے! اب میرے سوا کس کی طرف بھاگ رہی ہوگی؟ کون ہو سکتا ہے
میرے مدِ مقابل؟ — میرے سوا اُس نے کسی کو بھی سکشن میں لفنٹ ہی نہیں دی؟
دوسرے جلتے ہیں، جلا کریں۔ میں کب سے جل رہا ہوں ان فاصلوں کی آگ میں جو
میرے اور سروری کے درمیان بھڑک رہے ہیں! کون جانتا ہے؟ چہرے کبھی کبھی
گونگے ہو جاتے ہیں، ہر چہرہ دل کا حال نہیں کہتا؟ میرا کوئی دوست بھی تو نہیں
سوائے سروری کے! وہی تو اب غم خوار ہے —— اُس بچہ سے بھی زیادہ' جو برسوں
قبل میرے پلّے باندھ دی گئی تھی، اور —— اب دُور بیٹھے صرف منی آرڈر کا انتظار
کرتی ہے ——!"

"کتنی بھوکی ہوتی ہے عورت روپیہ پیسہ کی ——؟" مرزا کو اُس کی پچھلی زندگی کی یادوں نے اُداس کر دیا —— جانے کب
اُسے نیند آ گئی اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سروری اپنے گھر میں بستر پہ لیٹی اپنا ہاتھ دیکھتی رہی جیسے یہ ہاتھ اُس کا نہ ہو کسی اور کا ہو! کیا عجب مرزا ہی کا ہو!

"اُف کتنا عظیم ہاتھ ہے؟ — دولت، عزت اور شہرت جیسے اس کے غلام ہیں!
مگر ہے وہ خود عورت کا غلام! —— مگر اس میں برائی کیا ہے؟ زن مُریدی' مرد
کے لئے بری ہو تو ہو مگر عورت کے لئے تو حکمرانی کی اَمِٹ نشانی ہے! کون عورت
نہیں چاہتی کہ اس کا محبوب یا شوہر صرف اس کے لئے مر مر نہ جائے؟! بڑی پیاری
قسمت ہے اُس کی! اتنی نمایاں اور گہری لکیریں تو میں نے آج تک کسی کے ہاتھ میں
نہیں دیکھیں! اگر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ جائے تو کیسا رہے؟!"

اُس کے ذہن میں یہ سوال یوں پیدا ہوا جیسے انجانے میں کسی نے پتھر مار دیا ہو ایک چھوٹی سی جھیل میں!

صبح جب سروری بیدار ہوئی تو اُس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے — وہ چاہتی تھی کہ یہ ہاتھ یونہی
جُڑے رہیں!

اس طرح کی "اسٹینڈیز" نے محبت کو پروان چڑھایا، اور —— دونوں نے اندازہ کر لیا کہ —— اب اُن کا الگ الگ رہنا
مشکل ہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی ہاتھ کی لکیروں کو پوری طرح پڑھ چکے ہیں اور کچھ نتیجہ نکال چکے
ہیں —— اور —— شاید وہی منشا و مقصد حقیقتاً ان لکیروں میں بھی پوشیدہ ہو!

لوگ ان باتوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں؟ علم علم ہوتا ہے اور نظر نظر ہی!

مرزا کے ہاتھ کی لکیروں اور ابھرے ہوئے تل نے تیزی سے نمایاں ہونا شروع کر دیا، اور —— ثابت کر دکھایا کہ وہ بدلتی
ہے —! ماحول کو بنانے میں کیا دیر لگتی ہے؟ دونوں پڑھے لکھے تھے اور مزے سے کما رہے تھے، ٹھاٹ کی زندگی گذر رہی
تھی اور —— دونوں اپنی یکجائی اور شاندار زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے ——

جب مرزا اور سروری نے ایک دوسرے کو جذباتی اور ذہنی طور پر پوری طرح پڑھ لیا ـــــ دونوں نے شادی رچا ڈالی ـــــ زندگی پورے شباب پر آئی، اور ـــــ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مرزا دُہرے ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں جیسے ہر آنے والی گھڑی گوشت یا چربی کی ایک تہہ ان پر مڑھتی ہی جا رہی ہے اور ـــــ سروری کا تل جیسے اور بلندی پر چڑھتا ہی جا رہا ہو!

شادی کے چار ہی مہینے بعد، مرزا نے سروری کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا پروگرام بنایا۔ خوب صورت دعوت نامے تقسیم کئے گئے۔

سالگرہ سے دو گھنٹے پہلے حسینی، مرزا کے گھر پہونچنے کے لئے نکلا۔ خود مرزا نے اُسے کچھ دیر پہلے ہی آجانے کو کہا تھا ـــــ وہ ابھی گھر کی دہلیز پر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ ـــــ مرزا کی گرجدار آوازوں نے اُس کے قدموں کو منجمد کر دیا۔

"میں پھر کہتا ہوں سروری! میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا ـــ مجھ سے تعلق تو ہے ہی مگر ـــ اُس کا میرا اب اتنا ہی تعلق ہے جتنا کبھی ـــــ خود تمہارا حسینی سے رہا!"

حسینی اپنے ماتھے کا پسینہ رومال میں جذب کرتا ہوا بوجھل بوجھل قدموں سے لوٹ گیا اور ـــــ اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے اُس کا دل سالگرہ کے کیک کی طرح کاٹ دیا گیا ہو!!

پیپل کا پیڑ

(صفحہ ۴۶ سے آگے)

سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں ـــــــ سرور برآمدے میں اپنے بچے کو کھلا رہا ہے۔ اس کا بیٹا امجد محسن کی نیم پر چڑھا ہوا ہے، اور اس کی ماں غصے میں اُسے اُترنے کے لئے کہہ رہی ہے۔

"مغرب کے وقت پیڑ پر نہیں چڑھتے۔"

خود اُن کا بڑا بیٹا انتظار اپنی اسکول کی یونیفارم پر استری کر رہا ہے ـــــــ شمیم اسٹور سے آٹا نکال کر لے جا رہی ہے ـــــــ

انور اپنے چچا زاد بھائی شمشاد سے کہہ رہا ہے:

"یہ آج دادا جان کو کیا ہو گیا ہے۔ کب سے اپنے کمرے میں بند ہیں۔ کل تو آنگن میں نیم کے نیچے بیٹھ کر ہمیں کتنی پیاری سی میٹھی سی کہانی سنا رہے تھے!۔

ہر چیز پہ دھندلاہٹ سی کیوں بکھر گئی ہے۔

کھوں ..... کھوں ..... کھوں ..... کھانسی بڑھتی جا رہی ہے۔

روڈرولف

ترجمہ

علی ناظم

مکان کے پچھواڑے

(جرمن کہانی)

روڈولف (Ror Wolf) جرمنی کی نئی نسل کے لکھنے والوں میں ہے۔ وہ سنہ ۱۹۳۲ء میں جرمنی کے مقام زال فیلڈ میں پیدا ہوا۔ ثانوی تعلیم سے فراغت کے بعد دو سال تک تعمیرات کی تعلیم حاصل کی لیکن بعد میں اس کو ترک کر کے فرینکفرٹ اور ہیمبرگ کی درس گاہوں سے ادب، عمرانیات اور فلسفہ کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے کے لئے جرمن ریڈیو سے بھی وابستہ رہا۔ جس کے بعد سے ادب کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ آج کل پیشہ ور ادیب کی حیثیت سے فرینکفرٹ میں مقیم ہے۔

ولف کا ادبی سرمایہ بہت قلیل ہے تاہم اس کی تخلیقات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والے دور میں اپنے لئے ایک مستقل مقام حاصل کر لے گا۔ زیر نظر تخلیق "مکان کے پچھواڑے" (Ente deckung hinter dem Haus) ولف کی پہلی نثری تخلیق ہے جس کے پس منظر میں فن کار کے اعلیٰ شعور اور اس کی فنی پختگی کا پورا احساس ملتا ہے۔

جرمن فکشن میں جدید نفسیاتی بصیرت کا استعمال اس صدی کے ربع اول سے جاری ہے جس کا آغاز کافکا سے ہوا تھا۔ چنانچہ موجودہ جرمن مختصر افسانہ کا ایک بڑا حصہ آج نفسیاتی مدرسۂ فکر سے ہی وابستہ ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور خاتون جرمن افسانہ الزبیتھ لنگیسر (Elisabeth Langgäser) کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس کے یہاں افسانہ کی ہیئت میں بھی شعوری رو کے کامیاب تجربے پائے جاتے ہیں۔ ولف کا موضوع بھی خالص نفسیاتی تحلیل ہے جس کے ذریعہ وہ کردار کے نفس لاشعور کا ایک پورا سلسلہ قائم کرتا ہے اور پھر اس کو کمال فن کاری سے اس طرح ترتیب دیتا ہے جس سے قاری پر کردار کی مختلف ذہنی کیفیات از خود واضح ہو جاتی ہیں۔ تخلیق میں اس کی پیش کش کا انداز ایک فن کارانہ تاثر پیدا کرتا ہے۔ (مترجم)

اپنے مکان کے پچھواڑے حال ہی میں میں نے ایک تالاب دریافت کیا ہے۔ یاد نہیں پڑتا کہ میں اس کو اس سے پہلے بھی کبھی دیکھ چکا ہوں۔ لیکن کل شام کی چہل قدمی کے بعد میں یکایک اسی کے آگے کھڑا ہوا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ جرسی پہنتے ہوئے جوتوں کو پیروں میں ڈالتے ہوئے اور جیکٹ کے بٹن لگاتے ہوئے ایک ہی جست میں باہر نکل گیا۔ پھر میں نے عقب کا زینہ پکڑا، اور دروازے کو دھکا دیا۔

باہر ٹکورے لیتے ہوئے کناروں والا تالاب چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے لہروں کی گونج اور مرغابیوں کی چیخیں سنیں جو اس پر مسلسل چھپاکے لگا رہی تھیں۔ مینڈکوں کی ٹرٹر جو کنارے پر اگے ہوئے نرسلوں میں چھپے بیٹھے تھے اور مچھلیوں کی چپٹ چپٹ جو پانی کے آئینے سے نکل کر پھر اسی میں گر جاتی تھیں، میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ایک ہی جست میں میں تالاب کے کنارے جا کھڑا ہوا، اور سوچ میں ڈوب گیا۔ اس وقت میری شامہ آبی گلاب اور دلدلی گھاس کی مہک کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنا ہیٹ اتار دیا جسے میں چہل قدمی پر نکلتے وقت کبھی نہیں بھولتا۔ بلاشبہ یہ کوئی بڑا تالاب نہ تھا لیکن پھر بھی میں اسے ایک جھیل کہہ سکتا ہوں۔

اس دریافت کے لئے میں فخر کر سکتا ہوں۔ مجھے اس بات پر سخت تعجب ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ کسی اور نے آج تک اس پر دھیان کیوں نہیں دیا۔ میرے ہمسایوں نے بھی اس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی وہی رات دن والی شکلوں کے ساتھ اس کے سامنے سے گذرتے رہے۔ برسیں تنی ہوئی اور سورج مکھی کے پھولوں سے بنے ہوئے ہاروں کی جگالی کرتے ہوئے اور پھر اس کو تھوکتے ہوئے۔ وہی روزمرہ کی گفتگو ان کا موضوع ہوتی ہے جس میں نواحی شہر میں ہونے والے ذرا ذرا سے واقعات کی تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن اپنے ہی قرب میں واقع اتنے اہم تالاب کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ درحقیقت انہوں نے کبھی اس پر توجہ کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اورکوٹ پہن کر میرے گھر کے آگے سے عمداً گزرتے ہیں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں کی چھڑیاں گردش کرتی ہیں۔ وہ دور فاصلے پر ظاہر ہونے والی اشیاء کی نشان دہی کرتے ہیں جو قریب آنے پر یا تو کوئی سائیکل سوار نکلتا ہے یا پھر کوئی پیدل رہرو۔ لیکن یہ محض ایک فریب ہے۔ وہ مجھے دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ درحقیقت وہ میری ہی کھڑکی کی جانب اشارا کرتے ہیں جس کے پیچھے میں کھڑا ہوتا ہوں۔ اس سیاہ لیکن چاندنی سے روشن رات میں وہ اپنی چھڑیوں کی بیضاوی گردشوں سے زمین پر تالاب کا فرضی خاکہ بناتے ہیں، اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں کس طرح چھلانگ لگا کر عقبی زینے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر وہ اپنی چھڑیوں کو جن کی آہنی شامیں دھوپ میں چمکتی ہیں بڑے اطمینان سے اپنے کندھے پر رکھ لیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں ـــــ اور ان کے روپوش ہو جانے کے بعد میں دور فاصلے پر اپنے عقبی دروازے والی چھلانگ کا تصور کرنے لگتا ہوں۔

ان کی چھڑیاں یکے بعد دیگرے میرے سارے جسم کو زخمی کئے دیتی ہیں۔ میں اب اس تصور سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ تصور میرے ذہن کے لئے بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن اس پر بھی جب یہ مجھ پر غالب ہوتا ہے تو باقی تمام تصورات ختم ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر گداز تکیہ پر دراز ہو جاتا ہوں اور کچھ نہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں گو اس وقت تصور یک لخت ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن انگلیوں کی درمیانی جھریوں سے دیکھنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں

عموماً اپنے ہمسایوں کو آتا دیکھ کر چھپ جاتا ہوں۔ وہ اُچھلتے ہوئے، چھڑیاں گھماتے ہوئے اس طرف آتے ہیں اور پھر اُن کے ہلتے ہوئے اُورکوٹ میرے مکان کے پیچھے غائب ہو جاتے ہیں۔ میں کونے میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے عقبی دروازے میں داخل ہوتا ہوں اور ایک ہی جست میں زینہ طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہونچ جاتا ہوں، اور پھر بستر میں دبک رہتا ہوں۔

اس طرح میں رات کو بستر پر ہوتا ہوں۔ میرا کمرہ سیاہ ہے اور یہ پورا کا پورا لکڑی کا ایک خول ہے جس میں میں سوتا ہوں یا نہیں سوتا۔ جاگتا ہوں یا نہیں جاگتا، بلکہ ادھر اودھر ٹہلتا رہتا ہوں، اور اپنی بیوی کے خراٹے سنتا ہوں جو برابر والے کمرے سے مسلسل سنائی دیتے رہتے ہیں۔ اور مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

میں کمرے سے باہر باغ میں نکل آیا۔ تیز ہوا چل رہی ہے جس سے پانی کے اوپر کی پرت جس میں چاند جھلملا رہا ہے تہہ و بالا ہو رہی ہے۔ میں نے اپنا ہیٹ اتار لیا۔ یہ میرے تصورات ہیں، اور میں مزید سوچتا ہوں کہ جب سے میں نے تالاب دیکھا ہے مجھے یہ گمان گذرنے لگا ہے کہ میں ایک عرصے سے خاموش راتوں میں لہروں کو اپنے گھر کی دیواروں سے ٹکراتے سنتا رہا ہوں۔ پانی کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں کی آواز اور آبی پرندوں کا شور، اس کے ساتھ اپنی بیوی کے کراہنے کی آوازیں مجھے اکثر سنائی دیتی رہی ہیں اس کے بے چینی سے بستر پر ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کی آوازیں اور اکثر چیخیں میرے کمرے میں واضح طور پر سنائی دیتی ہیں، اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری بیوی اپنے سرخ چہرے، ڈھلے ہوئے سینے اور گنبد نما بالوں کے ساتھ ایک عرصے سے گھر میں موجود نہیں ہے۔ باورچی خانہ خالی پڑا ہے۔ میں اس میں اکثر جھانک کر دیکھتا ہوں۔ برتن نل پر بکھرے پڑے ہیں۔ پلیٹوں میں جھوٹن کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ تسلے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے چکنائی میں سنا پڑا ہے۔ پیالوں میں باقی بچی ہوئی کافی بہہ بہہ کر جم چکی ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں باورچی خانے میں داخل ہو کر نل کے پاس گیا تھا تاکہ اس کو مکمل طور سے بند کر دوں، اس لئے کہ پانی کے گرنے کا شور ہی مجھے بستر سے اٹھا کر یہاں لایا تھا۔ میں اس لمحہ چلّایا تھا، اور فوراً نل سے واپس آگیا تھا ـــــ میں نے چلّا چلّا کر اپنی بیوی کو آواز دی تھی ـــــ اور جب مجھے کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں واپس بستر میں دبک گیا تھا ـــــ میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا تھا۔

"تم کہاں ہو ـــ تم کہاں ہو؟" میں چلّایا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ شاید نہیں ہے۔ میں نے خیال کیا۔

وہ کہاں گئی ہوگی؟ میں نے سوچا۔

اور میں ایک مرتبہ پھر چلّایا: "تم کہاں ہو؟"

وہ بدستور غائب رہی۔

اس لمحہ میں نے بستر کو اس کی ہٹتی ہوئی چھت سمیت اپنے جسم کی حرارت سے گرم محسوس کیا۔

میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا تھا، لیکن اب جب کہ میں دوبارہ ان باتوں کا خیال کرتا ہوں تو تمام تصویریں بکھرے بے ہودگی سے میرے سامنے اُبھرنے لگتی ہیں ـــ

خالی باورچی خانہ، خالی راستہ، کھلا دروازہ، میں سوچتا ہوں، مگر —— نہیں، اُس نے تو کبھی تالاب کا رُخ بھی نہیں کیا، حالانکہ وہ ناشپاتیاں اور ناشپاتی جیسی شکل کے پھول یا حقیقتاً باورچی خانہ کے آرائشی پھول لانے کے لئے ضرور ادھر سے گذرتی تھی میں سوچتا ہوں، میرے خیال میں وہ اپنے پھیلے ہوئے لبادے کے ساتھ اسی تالاب میں ڈوب گئی۔

میں اپنے ہمسایوں سے کہوں گا کہ وہ اس کی تلاش میں میری مدد کریں۔ میں اپنی چھڑی سنبھال لوں گا جو میرے پاس پہلے ہی سے موجود ہے۔ وہ گودام میں آلوؤں کے بورے کے پیچھے دھول میں اَٹی پڑی ہے۔ مجھے اپنے کام کے لئے بہت انتظار کرنا پڑا —— میں سوچتا ہوں بھلا کوئی روز روز میرے مکان کے پچھواڑے کیوں ڈوبنے لگا۔ اور یہیں پر میرے خیالات ایک بھیانک راستے پر بھٹک جاتے ہیں جب میں ان کو یکجا کرتا ہوں اور ان سے اپنی بیوی کے بارے میں نتیجہ نکالتا ہوں۔

ہمسائے یکجا ہو کر بیٹھتے ہیں۔ میں اُن کے فلک شگاف قہقہے سنتا ہوں، اور پھر شراب نوشی کے بعد خالی بوتلوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ مجھے اُن کی یہ خوش وقتی بالکل نہیں بھاتی۔ اس سے قبل میری بیوی بھی ان کی میزوں پر بیٹھتی تھی ان کے جگوں سے پیتی تھی۔ ان کے برتنوں سے کھاتی تھی۔ سب پیتے تھے، سب کھاتے تھے، آخر میں کچھ نہ رہتا تھا، سب پی لیا جاتا تھا، سب کھا لیا جاتا تھا —— اور پھر وہ جھومتی جھامتی گھر کا رخ کرتی تھی۔ دروازہ چرچراتا تھا، اور پھر میں بستر کے ہلنے کی آوازیں سُنتا تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں ایک طرح سے مطمئن ہو سکتا ہوں کہ وہ ڈوب گئی۔ بلکہ میں تو مطمئن ہوں۔ اب میرے گھر میں سکون ہے۔ بہت سکون ——

میں اپنے بستر پر لیٹا ہوں، اور اپنے حالات پر غور کرتا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ کوئی شکایت نہیں۔ درحقیقت مجھے قسمت کا گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آخر میرا اپنا مکان ہے۔ اس سے ملحق ایک وسیع باغ ہے جو دائیں جانب کافی دور تک پھیلا ہوا ہے اس میں ناشپاتی کا ایک درخت ہے جو اس سال جڑ سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ آگے سائبان ہے۔ جس میں کدال، پھاوڑا اور زمین ہموار کرنے کا آلہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑھ کر میرے گھر کے پچھواڑے تالاب ہے۔ اب بھلا کس بات کی کمی ہے —— پچھلے کمرے سے دیکھئے تو یہ طول میں بیضاوی نظر آتا ہے اور میں ایک آزاد منش ہوا میں تکنے والا، سیر گشت کا شوقین، آوارہ گرد —— اسی کھڑکی سے جہاں میں اس وقت کھڑا ہوں اس کو تکتا رہتا ہوں۔ بدن پر ایک قمیص ہوتی ہے، سر پر چہل قدمی والا ہیٹ، اور سبز رنگ کا ایک گون سارے جسم سے لپٹا ہوتا ہے اور میں چہل قدمی کے ہلکے جوتوں کے ساتھ کھنکھناتے ہوئے سنگ ریزوں پر اپنے آپ کو اچھلتا ہوا خیال کرتا ہوں۔

ایک ایسے ہی دن میرا خیال ہے جس وقت میں نے سائبان کا دروازہ کھولا، پھاوڑا ہاتھ میں لیا اور کدال کندھے پر رکھی تو لوگوں نے مجھے ضرور چہل قدمی کو جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن جیسا کہ میں نے پچھلے کمرے میں کھڑے ہو کر اندازہ لگایا ہے۔ شام کو میرے ہمسایوں کا شور سنائی دیا۔ تاش کے پتے پھینٹنے اور شراب کی ڈبیوں کے بند ہونے کی آوازیں مجھ تک آئی تھیں، اور میں بہت دور چڑیوں کی چہچہاہٹ، تالاب میں پانی کے شور اور اس کی اوپری سطح پر مچھلیوں کی کھڑکھڑاہٹ سن رہا تھا۔

لیکن اسی تالاب میں، پانی کے اندھیرے میں اور سب سے نچلی تہہ میں میری بیوی پڑی ہے۔ اس کا ڈھلا ہوا جسم سنبھلا ہوا

بادہ، ناشپاتی جیسا چہرہ، کھلا ہوا منہ، زبان، ہونٹ، پھولا ہوا پیٹ، کھلا ہوا بلاؤز اور اس کے ساتھ خونخوار مچھلیاں، ان کے جبڑے ان کے آری جیسے تیز دانت، دلدلی کیچڑ، خودرو آبی پودے اور نوکیلے پتھر، سب پانی کی دبیز تہہ میں یک جا پڑے ہیں، اور اوپر کی سطح پر وہی باورچی خانے میں لگائے جانے والے پھول تیر رہے ہیں۔

اب اگر میں اس حالت میں چھتری کی مدد سے اپنی بیوی کو تلاش کرنے لگوں، اُسے اپنی کشتی پر لادلاؤں اور اپنے ہمسایوں کو دکھاؤں جو پہلے ہی سے کنارے پر کھڑے ہیں، تو وہ یہ خیال کریں گے کہ میں نے ہی اس کو تالاب میں ڈبویا ہے۔ کسی بھی دن شام کو ٹہلتے ہوئے میں نے گردن میں پتھر باندھ کر اس کو پانی کی گہرائیوں میں اتار دیا۔ پھر اس وقت یقیناً ان میں سے کسی کو کبھی کی سنی ہوئی ایک چیخ بھی یاد آجائے گی، اور دوسرا اس بات کا بھی گواہ بن جائے گا کہ ہاں اس نے پانی میں کسی چیز کے گرنے کا دھماکہ سُنا تھا اور شاید تیسرا اس بات کا بھی گواہ بن جائے گا کہ اس نے راستہ چلتے ہوئے مجھے وحشیانہ قہقہہ لگاتے دیکھا تھا — جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پہلا کہے گا 'ایسا ہی ہوا تھا' اور اس کا بیان دوسرے کی یادداشتوں کی حرف بہ حرف تصدیق کرے گا پھر تیسرے کا بیان اس رات کی پوری کارروائی کو واضح کر دے گا — میرا مات کو نکلنا، میری بیوی کا جسم، دھماکہ، پانی کا تہہ و بالا ہونا، غرقاب ہوتا ہوا جسم — غرض تیسرے کے بولنے کے بعد تو اس کارروائی کے کردار، وقت اور جگہ سب ہی کا تعین ہو جائے گا۔ وہی شخصیت، وہی اثباتت — رات، چاندنی، تالاب اور میرے گھر کا پچھواڑا۔

نہیں میں اس کو تلاش نہیں کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ وہیں رہے جہاں وہ ہے اس لئے کہ اگر وہ باورچی خانے میں نہیں ہے تو کمرے میں ہوگی اور وہ وہاں پر بھی نہیں ہے تو کہیں اور ہوگی۔ آخر یہ تو اس کی پسندیدہ بات تھی۔ چھتری کھولی، منہ میں چاکلیٹ ڈالی، سینہ بند درست کیا اور چل دی۔

نہیں میں جوتی پاؤں میں ڈالے شب خوابی کا لبادہ اوڑھے عقبی کمرے میں کھڑکی کے پٹ کے پیچھے جا کھڑا ہوں گا، اور اس کو نہیں ڈھونڈوں گا۔ اس لئے کہ اس کو وہیں رہنا چاہئے جہاں وہ ہے خواہ وہ کسی کی میز پر ہو، سفر میں ہو، چہل قدمی کر رہی ہو یا فوجی موسیقی سن رہی ہو یا پھر ریل میں ہو، وہ بھی خاص کر تیا کو نوشی کے کمرے میں کسی ساتھی کے سامنے، جھومتی ہوئی اور تیز رفتار پہیوں کی اونچ نیچ سے فائدہ اٹھاتی ہوئی —

چھتری واپس اپنی جگہ پر چلی گئی۔ گودام کے کونے میں آلوؤں کے بورے کے پیچھے۔ ہوں۔ عقبی کھڑکی بند کرتے وقت میں سوچتا ہوں، اب کیا کیا جائے۔ میرا مطلب ہے یہ تالاب جس کی اوپری سطح کو میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہوں کھنگال دیا جائے اس کو کہیں غائب کر دیا جائے کسی بھی طویل رات کے دوران جیسی آج کی رات ہے مجھے واقعی اس کو مٹا ڈالنا چاہئے۔

لیکن تالاب خاموش ہے اور میرے ہمسائے — یہ اب کیا چاہتے ہیں، انہیں اب کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے انہیں کچھ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں قیاس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ اندرونِ ملک چلا جاؤں گا۔ اب مجھے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ وہ موقع آچکا ہے۔ میرا مکان خالی پڑا ہے۔ میرا باغ جو دائیں جانب بہت وسیع ہے خاموش ہے۔ میرا تالاب جو لبالب ہے وہ بھی پر سکون ہے۔ میں جا سکتا ہوں۔

عقبی کھڑکی سے نکلتے ہوئے سورج کی کرنیں اندر داخل ہو رہی ہیں۔ میں دستانے پہنتا ہوں۔ یہی وہ وقت ہے میں سوچتا ہوں۔ موزے کی گیٹس چڑھاتا ہوں۔ میرے ہمسائے۔ میں سوچتا ہوں۔ بیٹھے ہوئے خیالات کا سیلاب امڈ آتا ہے۔

ہیں ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوں ۔ وہ شاید یہ گمان کریں گے کہ میں نے تالاب کو لبریز کیا ہے تاکہ اپنی بیوی کی میت کو چھپا سکوں۔ سر پر ہیٹ رکھتا ہوں ۔ چڑھتے ہوئے سورج سے کھوپڑی گرم ہوتی جاتی ہے ۔ اگر سب کچھ اسی طرح نہ ہوا جس طرح سوچا تھا۔ ہیں خیال کرتا ہوں ۔ کوٹ گھسیٹ رہا ہوں ۔ کوٹ کہاں ہے ؟ سیاہ کوٹ ۔ راستے کے لئے کچھ رقم بھی جیب میں ڈال لوں ۔ یہ حقیقت ہے ۔ میں سوچ رہا ہوں مجھے جلدی کرنا چاہئے ۔ دیوار سے چھتری اتارتا ہوں ۔ اگر کہیں راستے میں بارش ہو گئی تو خواہ مخواہ بھیگنا پڑے گا ۔ مجھے پانی سے کوئی محبت نہیں ۔ میرا سب سے بھیانک تھوڑا سی پانی سے وابستہ ہے ۔ تالاب میں لکی ہوئی ذرا سی چیز بھی مجھے متوحش کر دیتی ہے ۔

میں سوچ رہا ہوں مجھے وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہئے ۔ جھٹ پٹ زینہ طے کرتا ہوں ۔ اب میں سڑک پر کھڑا ہوں ۔ بھاگ لوں ۔ میں سوچتا ہوں ۔ یہی اس وقت سب سے زیادہ کام کی بات ہے ۔ جیبوں میں بھولی بھٹی چیزوں کا جائزہ لینے کے لئے ایک مرتبہ پھر ہاتھ ڈالتا ہوں۔

' اُف ' میں سوچتا ہوں ' میرا ٹکٹ ؟ ' میں اسے گھر ہی بھول آیا ۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہوگی ۔ پھر گھر واپس بھاگتا ہوں اور اوپر چڑھتا ہوں ۔ الماری پر پہونچتا ہوں ۔ لانڈری سے آئے ہوئے کپڑوں کے نیچے رکھا ہوگا ۔ الماری کو ٹٹولتے ہوئے ایک اچٹتی ہوئی نظر کھڑکی پر بھی ڈال لیتا ہوں ۔

اب صبح ہو چکی ہے ۔ ایک خوش گوار دن ۔۔۔ ہمسائے پلنگ چھوڑ چکے ہیں ۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی چھڑیاں ہیں ، جن کو وہ بڑے دھمکی آمیز انداز میں گھماتے ہوئے میرے گھر کی طرف آ رہے ہیں ۔ ان میں سے پہلا ، جو شراب کا کاروبار کرتا ہے ، باغ میں پہونچ چکا ہے ۔ اس کی داڑھی میں اب تک بیئر کے جھاگ لگے ہوئے ہیں ۔ اس نے چھڑی اٹھا رکھی ہے جیسے مجھے دیکھ لیا ہو ۔۔۔ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا ، اس لئے کہ میں تو پہلے ہی سے نیچے جھک گیا ہوں ۔ اور کونے میں چھپا ہوا اپنی گیلی انگلیوں سے ٹکٹ تلاش کر رہا ہوں ۔ پانی کے قطرے باورچی خانے کے نل سے آ رہے ہیں ۔ میری بیوی یہیں ہے ۔

" اے تم ۔۔۔ ؟ " شراب کا کاروبار کرنے والے نے آواز لگائی ۔ " ہم تمہاری بیوی کو ڈھونڈنے آئے ہیں ۔ وہ کہاں ہے ؟ کہاں ہے تمہاری بیوی ۔۔۔ ؟ "

میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں ۔ پچھلے راستے سے بھاگتے ہوئے ، نہیں بلکہ گرتے ہوئے زینہ طے کرتا ہوں ۔ سانس روک کر دروازے سے باہر چھلانگ لگا دیتا ہوں ۔

باغ سے تالاب صاف نظر آ رہا ہے ۔۔۔ بھرا ہوا تالاب ۔۔۔

میں سوچتا ہوں ۔ میں بھاگ رہا ہوں ۔۔۔ میں سوچ سکتا ہوں ۔۔۔ مجھے بیان بھی کرنا چاہئے ۔۔۔ اپنے پیچھے مجھے اُن کے قدموں کی چاپ اور ان کے ہانپنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں ۔۔۔

درخت کے پاس شراب کا کاروباری جس کا عام نام بے مَن ہے چلاتا ہے ۔۔۔ وہ اپنی چھڑی درخت پر مار رہا ہے ۔ مجھے درخت صاف دکھائی دے رہا ہے جس میں زرد زرد ناشپاتیاں لگی ہوئی ہیں ۔۔۔ یہ کافی بلند اور تناور درخت ہے اس لئے کہ میں نے اس کی برسوں نگہداشت کی ہے ۔ اس کو پانی دیا ہے ۔ اس میں قلمیں لگائی ہیں اور اس کے تنے میں ایک سفید چھلّا بھی باندھا ہے ۔ پھر فصل تیار ہونے پر چڑیوں کو ہانکا ہے اور جنگلی چوہوں کو مارا ہے ۔

یں بھاگ رہا ہوں ، اور بھاگتے ہوئے سوچ رہا ہوں ۔ مجھے کُدال کا چلنا یاد آرہا ہے ۔ چھوٹے سے جسم کا چیں چیں کرنا اچھل
زنے والے اوزار کی آواز ـــ میری بیوی کی چیخ اور اس کا سنبھلا ہوا لبادہ ، اس کے ساتھ ناشپاتیاں ، شام کی چہل قدمی ـــ یہ
ب میرے تصورات ہیں ۔

میں بھاگ رہا ہوں ـــ
سائبان گذر گیا جس میں کُدال ، پھاوڑا اور زمین ہموار کرنے کا اوزار رکھا ہوا ہے ۔
اور آگے ـــ درخت بھی گذر گیا ۔
اور آگے ـــ میرا مکان ہٹا اور پھر پس منظر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔
اور میں آگے ہی آگے بھاگتا چلا جا رہا ہوں !

افسانچے - (صفحہ ۶۶ سے آگے)

محبت ـ بم اور سائنسداں

جب ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم عورت کی زلفوں کو تہ و بالا نہ کر سکے تو ایک سائنس داں نے آگے بڑھ کر سوال کیا ،
" اے حوا کی بیٹی ۔ تیرے پاس وہ کون سا جادو ہے جس سے تیری جان محفوظ ہے ؟ "
حوا کی بیٹی نے جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر سائنس داں پر ایک بھرپور نظر ڈالی ـــ
تو وہ پکار اُٹھا ـــ
" نہیں نہیں ـــ یہ عظیم ہے اس پر بم مت پھینکو "

انٹر کالجیٹ مباحثہ سے اقتباس

جناب صدر پاگل ہیں
جناب صدر بے وقوف ہیں
جناب صدر بے شعور ہیں
جناب صدر کم عقل ہیں ـــ وہ لوگ ـــ
جو یہاں مباحثہ سننے آئے ہیں ۔
جو یہاں اکٹھے ہو کر بیٹھے ہیں ۔
جو میری تقریروں پر تالیاں بجائیں گے !

(او ر ہال میں تالیاں بجنے لگتی ہیں)

پنجابی

بشیر منذر
ترجمہ
احمد طاہر

جیون ندیا

نیں جیون دی وگدی جاوے
ڈبدا سورج چڑھدا سورج
اک دن جاوے اک دن آوے

پلاں دی کن من کتھوں دسے
کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے
دور پیا کوئی کھڑ کھڑ ہسے

کیہڑے شوہ دریا وچ پیندی
گھٹدی ودھدی ودھدی گھٹدی
رڑھدی رڑھدی ڈگدی ڈھیندی

پل پل جندڑی مکدی جاوے
چڑھدا سورج ڈھلدا سورج
نیں جیون دی سکدی جاوے

جیون ندیا بہتی جائے
ڈھلتا سورج، چڑھتا سورج
اک دن جائے اک دن آئے

لمحوں کی رنگینی کیا ہے
کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے
دور کھڑا کوئی ہنستا ہے

دریا میں جیسے طغیانی
گھٹتی بڑھتی، بڑھتی گھٹتی
چلتی پھرتی، گرتی پڑتی

پل پل ٹوٹے سانس کا رشتہ
چڑھتا سورج، ڈھلتا سورج
سوکھی جائے جیون ندیا

لوک گیت
ترجمہ
عطا شاد۔ عین سلام

بلوچی

آ بھی جا

وسطی بلوچستان میں "لیلی مور" بے حد مقبول ہے، اور بیک وقت دو زبانوں بلوچی اور براہوی میں گایا جاتا ہے۔ اس گیت میں ہر نوع کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس صنف کی وجہ امتیاز اس کی مخصوص دھن ہے۔

بیائے منی او لیلیٰ دل منی جوش کنت
تئی در نائی کلیں اء مردماں بے ہوش کنت

روچ ء ترا پولگاں، شپ ء ترا گندگاں
دل منی گوں تو انت من درا رولفاں

اے جہاں کے بزانت گو من ء چوں کنت
ارس کنت دیدگاں کہ دل ء خوں کنت

دل ترے عشق میں مست و سرشار ہے
سامنے آ بھی جا کون ہشیار ہے

دن کو تیری لگن، شب کو دیدار ہے
تو ہی دلبر مرا، تو ہی دلدار ہے

مجھ کو دنیائے دوں راس کب آئے گی
آگ برسائے گی، خوں اُگلوائے گی

مخدوم قلی خاں
ترجمہ
منصور قیصر

ترکمانی

سچ کی آشا

مخدوم قلی خاں ۱۸ ویں صدی کے اس دور کا انقلابی شاعر ہے، جب ترکمان پر بیرونی حملہ آوروں کا قبضہ تھا!

شہرت ہاروں رشید کی
کھو جانے کا ر—
اس دھرتی پر روز کرے ہیں
ظالم اَتیا چار
چاروں کھونٹ ہے اس دھرتی پر
اندھیارے کا راج
نردھن کی نینوں میں چبھتا
راجے کے سر تاج

لہو پی کر موج کریں سب
کیا ملا کیا گیانی

کٹی زبانیں نردوشوں کی
گائیں دکھ کی بانی

میں نے سچ کی آشا کر کے
اپنی جان گنوائی —
سَت جُگ کی تم بات نہ کرنا
یہ کلجگ ہے بھائی
سندرتا پر پاپ کی چھایا
راجہ ناگ سمان
کرودھ کپٹ کی راس رچائیں
اتیا چاری — خان

انگریزی

اے۔ای۔ہاؤسمین
ترجمہ
سحر انصاری

بچہ

میں جب پہلے پہل میلے گیا تھا
مرے کیسے میں کچھ پیسے پڑے تھے
مگر میں بیشتر اشیا کی جانب
بڑی حسرت سے تکتا جا رہا تھا
کہ ان پیسوں میں ہر جنس گراں کی
خریداری مرے بس میں نہیں تھی

رُتیں بدلیں زمیں نے کروٹیں لیں
وہ لمحے ہو چکے رخصت کبھی کے
یہ پیسے ہیں، یہ میلہ ہے، یہ میں ہوں
اگر چاہوں تو میں اب حسبِ منشا
ہر اک جنس گراں کو مول لے لوں
مگر میں دل میں یہ بھی سوچتا ہوں
جو بچہ مجھ میں تھا اب وہ کہاں ہے

رُوداد نگار

پاکستان میں اُردو ناول

اردو مجلس کی ماہانہ نشست
ایک مقالہ۔ ایک مذاکرہ

اردو مجلس کی ماہانہ نشست ۱۹ رمئی سنہ ۱۹۶۷ء کو آغا افتخار حسین صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی جس کی صدارت صہبا لکھنوی نے کی۔ نشست کے شرکا، یہ تھے: سید قمر ہاشمی، شاہد عشق، آغا افتخار حسین، عتیق احمد، انجم اعظمی لطیف اللہ، سحر انصاری، اشفاق نقوی، عبدالسلام، امان علی نقوی، حبیب اللہ،

"پاکستان میں اردو ناول" کے عنوان سے انجم اعظمی کو ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ لیکن اس سے قبل ہی اردو ناول پر گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آغا افتخار حسین صاحب حسب معمول شرکائے مجلس سے ان کے تصنیفی اور تحقیقی پروگرام پر کرید کرید کر گفتگو کر رہے تھے۔ (اس طرح کی گفتگو سے آغا صاحب اپنے دوستوں کو زیادہ باعمل اور مستعد بناتے ہیں)

اسی گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر عبدالسلام صاحب اردو ناول پر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ آغا صاحب نے ان سے اردو ناول کے ارتقاء، اس کے امکانات اور جدید اردو ناول پر بات چیت شروع کر دی۔ اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ اردو میں مجموعی اعتبار سے صفِ اول کے ناول اور ناول نگار گنے چنے ہیں۔ نیز یہ کہ فکری اعتبار سے "آگ کا دریا" کے سوا کوئی اور ناول گہرا اثر مرتب نہیں کر سکا ہے۔

اس کے بعد انجم اعظمی نے اپنا مقالہ "پاکستان میں اردو ناول" پڑھا۔ اس میں قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والے ناولوں کا جائزہ لیا گیا تھا، اور پیشِ نظر صرف ایسے ناول رکھے گئے تھے جو ادبی حیثیت سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے جن ناولوں کا احاطہ کیا ان میں "میرے بھی صنم خانے"۔ "شبنم"۔ "ایسی بلندی ایسی پستی"۔ "آگ کا دریا"۔ "خدا کی بستی"۔ "خونِ جگر ہونے تک"۔ "تلاشِ بہاراں"۔ "گمراہ نسلیں"۔ "ملی پورکا ریل"۔ "آبلہ پا"۔ اور "آنگن" شامل تھیں۔

اس مقالے پر بحث کا آغاز اشفاق نقوی صاحب نے کیا۔ انہوں نے انجم صاحب سے کہا کہ:

آپ کے مضمون میں تقسیم ہند و پاک سے

بارے میں ایک بات بڑی شدت سے کہی گئی ہے کہ سنہ ۴۷ء میں ایک سانحہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم قوموں نے ہندوستان کو دو ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مذہباً ہم سب مسلمان ہیں، لیکن علاقوں کے لحاظ سے ہمارا کلچر مختلف ہے۔ مثلاً عرب، پاکستان اور انڈونیشیا کو لے لیجئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے فیصلہ کیا کہ غیر مسلم غلبے سے دور رہنے کے لئے ایک علیحدہ ملک بنائیں۔ اب آزادی کے بعد ہم ایک قوم بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھ کر ایسی تحریریں پیش کریں جن میں یہ بتایا جائے کہ ہم نے کھونے سے زیادہ پایا ہے۔

انجم اعظمی: نقوی صاحب، سانحے کا لفظ میں نے استعمال نہیں کیا ہے۔ خود قرۃ العین حیدر نے اسے سانحے کی حیثیت دی ہے اور اسے میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہندوستان سے ہمارا بہرحال ایک تہذیبی تعلق ہے، ہند میں جو مسلم تہذیب پروان چڑھی تھی یہاں اُسے disown نہیں کرنا چاہئے۔

اشفاق نقوی: اس تہذیب کو یہاں disown تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ البتہ ایک چیز یہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندوستان جو سنہ ۴۷ء میں تقسیم ہوا وہ برٹش انڈیا تھا ویسے دیکھا جائے تو تقسیم کا عمل تو پہلے سے جاری تھا، کیونکہ پہلے ہندوستان کا نقشہ کچھ اور تھا۔ اس سے پہلے تو برما الگ ہوا پھر نیپال اور پھر پاکستان الگ ہوا۔

امان علی نقوی: تقسیم کے مسئلے سے قطع نظر، اس مضمون میں ہر جگہ اشارے سے کام لیا گیا ہے اس مضمون میں بعض اعتبار سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں ناول کی حد مقرر کرنا چاہئے اور موجودہ معاشرے کا جو اب پیدا ہوا ہے تعین کرنا چاہئے۔ اور ناول کی ٹکنیک کے بارے میں کچھ لکھنا چاہئے۔ آپ نے اس مضمون میں سیاست اور معاشرے کو الگ کر دیا ہے حالانکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔

انجم اعظمی: میں انہیں لازم و ملزوم نہیں سمجھتا۔

سحر انصاری: مضمون لکھنے سے قبل غالباً یہ فرض کیا گیا ہے کہ ناول کی ابتدا اور اس کی ٹکنیک وغیرہ سے سب حضرات واقف ہیں۔ ان کو چھوڑ کر پاکستان میں شائع ہونے والے اردو ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول کی حد مقرر کرنے اور دیگر امور پر روشنی ڈالنے سے مضمون طویل ہو جاتا اور یہ موضوع سے بھی ہٹ جاتا۔

امان علی نقوی: لیکن بعض ناولوں پر اس میں خاص توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً "آگ کا دریا" پر مقالہ نگار نے زیادہ حصہ صرف کیا ہے۔

عبدالسلام: "آگ کا دریا" پر تفصیل سے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اردو ناول میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

رضا افتخار حسین: پاکستان میں اردو ناول پر کچھ

لکھتے وقت آپ کو تکنیک کے علاوہ اس پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے تھی کہ تقسیم سے پہلے معاشرتی حالات کیا تھے اور تقسیم کے بعد ان میں کیا فرق پیدا ہوا ہے، اور ناول نے اس سے کیا اثر قبول کیا ہے۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ تبدیلی تو ضرور واقع ہوتی ہے۔

انجم اعظمی: میں نے اسے دانستہ نہیں لکھا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں نامیاتی رو یا تہذیبی رو کبھی نہیں ٹوٹتی ہے۔ مثلاً ہم بابل اور یونان سے اب تک اپنا تعلق نہیں توڑ سکے ہیں۔ پھر اس ضمن میں بہت سی ایسی باتیں آئیں گی جنہیں میں فی الحال نہیں لکھ سکتا۔

اشفاق نقوی: جہاں تک ہمارے معاشرے کا تعلق ہے سنہ ۴۷ء سے پہلے اور سنہ ۴۷ء کے بعد معاشرتی تبدیلی یقیناً ہوئی ہے اور اس کا ذکر ناول کے ضمن میں کرنا چاہئے تھا۔

سحر انصاری: "میرے بھی صنم خانے" اور "آگ کا دریا" کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے، کہ ان ناولوں میں آزادی کے بعد ہونے والی معاشرتی تبدیلی کا عکس اور اس کا کرب ملتا ہے۔

صہبا لکھنوی: سوال یہ ہے کہ کیا معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے وقت ناول سے ہٹ کر عام سیاسی فضا کا تذکرہ بھی ضروری ہے؟

سحر انصاری: عام سیاسی فضا کا ذکر بھی ناول میں ہوا ہے۔ اور ایسے ناول کا ذکر کرنے سے پہلے ملک کی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا، اسی لئے انجم صاحب نے اپنے مضمون میں سیاسی اور معاشرتی پس منظر کا احاطہ کرنے کے بعد "خدا کی بستی" کا ذکر کیا ہے تاکہ اس کی روشنی میں اس ناول کا تجزیہ کیا جا سکے۔

صہبا لکھنوی: لیکن شوکت صدیقی اس ناول میں خود کنفیوزڈ (confused) ہیں انہوں نے "خدا کی بستی" میں اسکائی لارک کی تحریک کو پیش کرتے ہوئے کوئی واضح لائحہ عمل متعین نہیں کیا ہے۔

سحر انصاری: صدر محترم! اس مضمون میں کہا گیا ہے، کہ اسکائی لارک کا کوئی انقلابی پس منظر نہیں ہے اور یہ تحریک کوئی انقلابی فضا تیار نہیں کر سکی۔ اس کا انداز اصلاحی ہے۔

حیدر اسلام: اسکائی لارک میں جماعت اسلامی کے اراکین کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ بھی جماعت اسلامی کی طرح شفاخانے کھولنے اور تعلیم بالغاں کا انتظام کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

عتیق احمد: صاحب صدر کی وساطت سے میں اس مضمون کے سلسلے میں عرض کروں گا کہ اس میں موضوع سے پورا انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع پاکستان میں اردو ناول ہے لیکن پورے ناولوں کا اس میں جائزہ نہیں لیا گیا اور پیچھا چھڑانے کے لئے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ غیر معیاری ناولوں پر اس مضمون میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ انہوں نے اس میں ایک پورے Trend کو نظر انداز کر دیا ہے جو پاکستان بننے کے بعد اردو ناول

میں پیدا ہوا۔ اس مضمون پر میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔

سحر انصاری: میرے خیال میں کسی مضمون میں سب سے اہم چیز مصنف کا نقطۂ نظر ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اس مضمون کی خوبی ہی سمجھی جائے گی۔ پھر یہ کہ جب ہم ادبی سطح پر ناول نگاری کا ذکر کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم صرف انہی ناولوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں جن کی کوئی ادبی حیثیت ہوتی ہے۔ ورنہ یوں تو بے شمار تحریکی، اصلاحی، تاریخی اور جاسوسی ناول ہر روز یہاں لکھے جا رہے ہیں۔

عتیق احمد: کسی موضوع پر لکھتے وقت اس کے خراب اور اچھے پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ مضمون تشنہ ہے کہ اس میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ناول کی تکنیک یا اسلوب کے سلسلے میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ یہاں تک کہ قرۃ العین حیدر کے سلسلے میں بھی کسی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ورجینیا وولف سے تو وہ قیامِ پاکستان سے پہلے بھی متاثر تھیں اور شعور کی رو (Stream of Consciousness) کی تکنیک تو وہ بہت پہلے سے افسانوں میں استعمال کر رہی ہیں۔

قمر ہاشمی: اس مقالے میں "میرے بھی صنم خانے" کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ناول ہندوستان میں لکھا گیا تھا۔ اس میں تقسیم کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن قرۃ العین نے اس میں پپو کا کردار شمن سے متاثر ہو کر لکھا ہے جو عصمت چغتائی کے ناول "ٹیڑھی لکیر" میں ہے اور جو میرے خیال میں امراؤ جان ادا کے بعد سب سے بڑا کردار ہے۔

سحر انصاری: "میرے بھی صنم خانے" کے بارے میں انجم صاحب نے یہ نہیں کہا کہ وہ پاکستان میں لکھا گیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہوا ہے۔

انجم اعظمی: ابھی یہ کہا گیا ہے کہ میں نے اس موضوع میں تکنیک پر کچھ نہیں لکھا۔ میں نے دانستہ طور پر ایسا کیا ہے۔ کیونکہ اگر سارے موضوعات پر لکھتا تو مقالہ بہت طویل ہو جاتا۔ اسی لئے صرف اہم ناولوں کو اس میں discuss کیا گیا ہے۔

عتیق احمد: تو صاحب پھر آپ کو اس مضمون کا عنوان تھوڑا سا بدلنا ہوگا۔ کیونکہ اس کوشش کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ناول کی تکنیک اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو بیان کیا ہوگا۔

انجم اعظمی: تکنیک کا ذکر میرے خیال میں اسی لئے مناسب نہیں تھا کہ جن ناول نگاروں کا میں نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر سنہ ۴۷ء سے پہلے بھی لکھ رہے تھے اور وہ ناول نگاری کی انفرادی تکنیک کو پہلے سے برت رہے تھے: "خدا کی بستی" میں بھی شوکت صدیقی کا وہی انداز ہے جو

اُن کے بعض پُرانے افسانوں کا ہے

شاہد عشقی : عتیق صاحب نے مقالہ میں اصلاح کا جو مشورہ دیا تھا وہ میرے خیال میں اس لئے مناسب نہیں کہ کچھ لوگوں کی تحریر کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ بعض لوگ عبادت بریلوی کے انداز میں لکھتے ہیں جس میں ہر چیز کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ بعض نقاد تمام ناول نگاروں کے نام تلاش کر کر کے لکھ دیتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ چند شوخ رنگوں سے تصویر ابھاری جائے۔ انجم صاحب کا انداز یہ ہے کہ وہ شوخ رنگوں سے تصویر کے خدوخال واضح کر دیتے ہیں۔ انہوں نے جن ناولوں کا ذکر کیا ہے انہی سے پاکستان میں ناول کا ارتقا مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ ناول رہ گئے ہیں تو وہ جاسوسی یا اسلامی یا اصلاحی ناول ہیں جنہیں ایم اسلم جیسے ناول نگاروں نے لکھا ہے۔ لکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم کچھ ناول لے لیں جو نمائندگی کرتے ہیں۔ تکنیک کے سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مقالے کے عنوان میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ناول کی تکنیک کا موضوع ایک علیحدہ مضمون ہے جس پر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ تصور یہ کیا جاتا ہے کہ لوگ موجودہ ناول کے تمام پیٹرن اور تکنیک سے واقف ہوں گے۔ انجم صاحب اپنے ماضی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے ہر اہم ناول کا پس منظر دیتے جاتے ہیں وہ تقسیم کو بُرا نہیں کہتے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ آورش ضرور ٹوٹے ہیں۔

عتیق احمد : شاہد صاحب کے توسط سے میں عرض کروں گا کہ جب میں نے انجم صاحب کے مقالے کے بارے میں یہ کہا تھا تو میں نے نقاد کی ذمہ داری کی بات کی تھی انجم صاحب کی نہیں۔ کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر چیز سے لوگ واقف ہیں تو پھر کسی تنقید کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جب سب یہ جانتے ہیں کہ شاعری ہو رہی ہے، ناول لکھے جا رہے ہیں تو ان پر کسی کے کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ محض اپنے شوخ جملوں سے رنگ آمیزی کر کے سرسری طور پر نہیں گذرنا چاہیے۔ تکنیک تو ہر حال میں زیرِ بحث آتی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر میری یہ رائے ہے کہ ادھر چار پانچ سال میں ایسا کوئی مضمون ناول پر میری نظر سے نہیں گذرا، جیسا کہ انجم صاحب نے لکھا ہے اسی لئے مجھے ان سے توقع تھی کہ انہوں نے مواد اور خیالات کے سلسلے میں جو اشارہ دیا تھا، اسی کے مطابق وہ ناول کی تکنیک کے سلسلے میں بھی کچھ کہتے۔ اس طرح یہ جائزہ جو بڑی کاوش سے لکھا گیا ہے اور اچھا ہو جاتا۔ مضمون کے طویل ہونے میں کوئی قباحت نہیں۔

ابوالافتخار حسین : میں عتیق صاحب کی تجویز میں صرف اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ انجم صاحب کو یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد تکنیک کے علاوہ موضوع اور فکر

میں کوئی اضافہ یا تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں۔
مجھے یقین ہے کہ نظرثانی کرتے وقت انجم
صاحب اس پر ضرور غور کریں گے۔ میں اصل
میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہندوستان کے
مقابلے میں پاکستان میں کیا تبدیلی ہوئی
ہے؟ اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ کسی
اور ناول نگار نے فکر کو، خیال کے کسی نئے
رُخ کو یا کسی تحریک کو اپنے ناول میں پیش
کیا ہے یا نہیں، یا خیال کا کوئی نیا پن کسی
کے ہاں پایا جاتا ہے یا نہیں؟

انجم اعظمی: دنیا کے ہر ادب میں آپ دیکھیں گے کہ عظیم
چیزیں صرف چند ہی ملتی ہیں۔ آپ کے اس
سوال کی وجہ یہ ہے کہ فکر چونکہ کہیں اور
نہیں ملتی اس لئے ہم ادب کی ہر صنف
میں اسے تلاش کرتے ہیں۔

آغا افتخار حسین: ہم لوگ چونکہ Systematic
فکر کے عادی نہیں رہے۔ اس لئے شاعری
اور افسانہ میں بھی فکر نہیں ملتی۔

انجم اعظمی: آغا صاحب پھر یہ ناول اور شاعری کی
بات نہیں رہے گی، بلکہ معاشرے کے پورے
concept کی بات ہوگی — ہم
فرسٹریشن کی وجہ سے فکر تلاش کرتے ہیں
شاعری میں ہمارے یہاں فکر کا بڑا سرمایہ
ہمیشہ سے موجود رہا ہے کیونکہ حکمت اور
فلسفہ کی زبان شاعری ہی رہی ہے۔

آغا افتخار حسین: سوال یہ ہے کہ سنہ ۴۷ء کے بعد
کیا ہوا؟

انجم اعظمی: سنہ ۴۷ء کے بعد بھی بہت سی چیزیں لکھی
گئی ہیں لیکن سامنے نہیں آئی ہیں۔ جوش
صاحب کا ایک طویل رزمیہ غیر مطبوعہ ہے
ایک طویل مرثیے میں انہوں نے کہا ہے کہ
جو حسین کی طرح جان نہیں دے سکتا، وہ
حسین کا نام نہ لے اور اس مثال کو قائم کر
کے وہ موجودہ دور تک آئے ہیں اور اس میں
انہوں نے موجودہ دور کی فکر کو سمیٹنے کی
کوشش کی ہے۔

عتیق احمد: عزیز حامد مدنی کی شاعری میں ٹیکنالوجی
اور جدید دور کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔

آغا افتخار حسین: کیا انہوں نے ٹیکنالوجی سے پیدا
ہونے والے فرسٹریشن کا کوئی علاج بھی
بتایا ہے؟

عتیق احمد: جی نہیں۔ اس لئے کہ ادب میں کوئی نسخہ
نہیں لکھا جاتا ہے۔

آغا افتخار حسین: ادب اور شعر کا کام ہے کہ وہ دکھوں
اور مصائب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ
ان کا مداوا بھی بتائے۔

انجم اعظمی: فکر کی سطح تک تو ہمارے یہاں ٹیکنالوجی
کی ایک اہمیت تسلیم کی گئی ہے لیکن ٹیکنالوجی
کو فکر کی سطح سے محسوس کی سطح تک لانے
میں مدنی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مدنی نے
اس دور سے پیدا ہونے والے فرسٹریشن کو
دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

آغا افتخار حسین: میں نے مدنی صاحب کی شاعری کا
زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی
کے بارے میں اُن کا رویّہ کیا ہے، کیا انہوں
نے یہ کہا ہے کہ ہمیں ٹیکنالوجی کو قبول کرنا

چاہئے یا اس کی مخالفت کرنی چاہئے ؟

سحر انصاری : مدنی نے اپنی شاعری میں ٹیکنالوجی سے تاثر کو مثبت انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں ٹیکنالوجی کا Accep- tance ہے۔ انہوں نے اس کی مخالفت نہیں کی ہے۔ صنعتی عہد سے پیدا ہونے والے کرب اور مشینوں کے درمیان پس جانے والے انسان کا ذکر اُن کی شاعری میں بڑے خوبصورت انداز میں ملتا ہے، لیکن وہ اس سے مایوس ہونے یا اپنے خول میں سمٹ جانے کا درس نہیں دیتے، بلکہ ایک بہتر انسانی سماج کی تعمیر اور کائنات کی تسخیر کا حوصلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اس عمل میں ان کی شاعری سردار جعفری، ساحر یا فیض کی طرح براہ راست نہیں ہے لیکن اُن کی شاعری کا تاثر دیرپا ہے۔

آغا افتخار حسین : کیا ناول میں اس قسم کی فکر آئی ہے ؟

انجم اعظمی : "آگ کا دریا" میں کاسموپولیٹن زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں اس کا بھرپور تاثر شاید اس لئے نہیں اُبھرتا کہ ناول میں لفظ کا اتنا شدید ردِ عمل نہیں آتا ہے جتنا کہ شاعری میں۔

عتیق احمد : یہ ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایچ۔جی ویلز کے یہاں مشین کے سلسلے میں جو کرب آیا ہے وہ عدیم المثال ہے، ویسے پچھلے دنوں شاعری میں ایک distorted قسم کی تجرید بھی آئی ہے۔ کراچی کے شعرا نے تو ابھی اس طرف توجہ نہیں دی ہے، کیونکہ یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ لیکن لاہور اور ہندوستان کے شعرا اس میں پیش پیش ہیں۔ وہ یہ تحریک شاعری میں چلا رہے ہیں کہ لفظ سے اس کے لغوی اور سطحی معنی ہی لینے چاہئیں اس کو علامت کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ ہمیں لفظ کو اس کے conception سے الگ کرکے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ایک اور چیز نہ جانے کس طرح آ رہی ہے اور وہ ہے تصوف کی طرف مراجعت۔

آغا افتخار حسین : یہ تو مدنی صاحب کا 'Anti-thesis' ہوا۔

عتیق احمد : ممکن ہے مدنی صاحب کی ضد ہی میں یہ بات شروع ہوئی ہو تاکہ ان کی شاعری کو رد کرکے شہرت حاصل کی جاسکے۔

صہبا لکھنوی : میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ اب ہم انجم صاحب کے فکر انگیز مضمون کا احاطہ کریں' انجم صاحب نے جن ناولوں کا تجزیہ کیا ہے اس میں انہوں نے بہت خوبصورتی سے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ویسے تو ایک بات ہم کوئی بیس پچیس سال سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ کسی بھی مضمون کو سن کر یہ کہہ دیا جائے کہ مضمون بڑی محنت سے لکھا گیا ہے لیکن اس میں کچھ تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں اس قسم کی سرسری اور بے معنی تنقید سے پرہیز کرنا چاہئے۔ انجم صاحب نے بلاشبہ بڑی محنت سے یہ مضمون

لکھا ہے اور پوری دیانتداری سے پاکستان میں شائع ہونے والے معیاری ناولوں کا جائزہ لیا ہے۔

سحر انصاری: عبدالسلام صاحب چونکہ اردو ناول پر کام کر رہے ہیں اس لئے ان کی رائے اس مضمون کے سلسلے میں معلوم کرنا میرے خیال میں مناسب ہوگا۔

عبدالسلام: میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں اور انجم صاحب کی رائے سے متفق ہوں کہ ادیب کو اپنے شعور کے مطابق اور تصورات کے لحاظ سے لکھنا چاہئے۔ انجم صاحب اگر ایسے دو چار مضامین ناول پر اور لکھ دیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا اور میں ان کا حوالہ دے سکوں گا۔

سہیا لکھنوی: اردو ناول پر واقعی بہت کم لکھا گیا ہے میرے خیال میں یہ مضمون اس کمی کو پورا کرتا ہے۔

نجم اعظمی: مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ ناول پر بہت کام ہو رہا ہے۔ یہاں سلام صاحب ناول کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ بیگم افضل کاظمی بھی ناول پر ایک کتاب لکھ رہی ہیں اور ہندوستان میں بھی کچھ لوگ اس موضوع پر کام کر رہے ہیں۔

آغا افتخار حسین: میرے خیال میں ہمیں اپنے ادب میں کچھ نئے خیالات کو متعارف کرانا چاہئے، خواہ وہ یورپ سے ہی درآمد شدہ کیوں نہ ہوں۔ اس ضمن میں میں جاننا چاہوں گا کہ ہمارے یہاں کسی فکر یا تحریک کا اثر ہوا ہے یا نہیں؟

سحر انصاری: آغا صاحب ناول میں تو نہیں البتہ بعض لوگ وجودیت کی تحریک سے متاثر ہو کر اردو میں نظمیں اور افسانے لکھ رہے ہیں، جن میں زیادہ تر سارتر اور کامیو کی تحریروں کے اثرات ملتے ہیں۔

عتیق احمد: یہ چیزیں تو پرانی ہو گئیں آغا صاحب! آپ یورپ ہو آئے ہیں، آپ بتایئے کہ وہاں کی نئی چیزیں کیا ہیں؟ ویسے بعض جدید ترین چیزیں بھی بحمداللہ ہمارے یہاں آ گئی ہیں، مثلاً نائٹ کلب، سٹینک اور نائٹ پلز وغیرہ۔

آغا افتخار حسین: صاحب، دیکھئے اس موقع پر میں ایک الگ لیکن اس گفتگو سے متعلق ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ تہذیب کی تاریخ میں میری رائے میں چار اہم سنگ میل آئے ہیں اور بیسویں صدی کے دور میں یہ چوتھا سنگ میل ہے۔ پہلے تین میں سے ایک مشرق کا مغرب پر اثر، ابتدا میں ہمیں مشرق کا اثر مغرب پر ملتا ہے، مثلاً آریاؤں کا مغرب میں جانا اور   کی ثقافت کا اثر۔ اس کے بعد کئی صدیوں بعد مشرق کی طرف سے اسلام نے مغرب پر تسلط قائم کیا۔ پھر یہاں سے الٹی طرف بہاؤ شروع ہوا۔ اس ضمن میں سنہ ۱۴۹۲ء اہم ہے۔ اسی سال غرناطہ کے زوال کے ساتھ مسلمانوں کا زوال شروع ہوا۔ چھ سال بعد سنہ ۱۴۹۸ء میں ایک طرف کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور اسی سال واسکوڈی گاما نے ہندوستان کے ساحل پر

قدم رکھا۔ ان تاریخوں سے مغرب کے مشرق پر تسلط کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے مشرقی ممالک مغرب کی نوآبادیات بنتے رہے۔ اب بیسویں صدی میں مشرق کی قومیں کم از کم مغرب کے سیاسی تسلط سے آزاد ہوتی جا رہی ہیں۔ اب ہمیں اس موڑ پر پہونچ کر یہ سوچنا چاہئے کہ جب غلام قومیں ٹیکنالوجیکل دور میں آزاد ہوتی ہیں تو اس کا ثقافتی مظہر کیا ہوتا ہے۔ یہ بات اس لئے اہم ہے کہ اس کی کوئی مثال گذشتہ تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ صورت حال یہ ہے کہ مشرق کی اقوام تہذیبی طور پر اور اقتصادی طور پر تو غلام ہیں لیکن سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ صرف مشرق ہی کے نہیں، مغرب کے دانشور بھی اس پر سوچ رہے ہیں کہ ہمارا رویہ اب کیا ہونا چاہئے۔ سوئز کے ادھر اور بحیرۂ روم کے جنوب میں رہنے والے ہم سب لوگوں کا یہی مسئلہ ہے، کہ تہذیبی آزادی کے حصول کے لئے ادیبوں کو کیا کچھ لکھنا ہے۔

صہبا لکھنوی: میری تجویز ہے کہ آغا صاحب اس موضوع پر کوئی مختصر مقالہ تحریر فرمائیں کیونکہ اس پر آپ کی نظر ہے۔

سحر انصاری: صاحب اس انداز سے تاریخ کے مطالعے کی ایک جھلک برٹرینڈ رسل کے ایک مضمون میں بھی ملتی ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ مغرب پر مشرق کے تسلط کا دور ہے اور مشرق کے نوآزاد ممالک کو چاہئے کہ وہ برتر کلچر کے نام پر یا تہذیب کے ارتقا کے نام پر مغرب کے کلچر کو اپنانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اپنی قدیم روایات کے خزانوں کو ٹٹولیں اور اپنے ورثے کی حفاظت کریں۔

آغا صاحب: یہ تجویز اچھی ہے۔ تہذیب کا ایک موضوع لے کر مضمون لکھا جا سکتا ہے تاکہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر گفتگو ہو سکے۔

آخر میں طے پایا کہ آئندہ نشست میں عتیق احمد صاحب "ترقی پذیر ممالک میں تہذیبی عناصر کی تلاش" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھیں گے۔

ادارہ

تبصرہ و تعارف

نئی کتابیں

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

○ عہدِ اسلامی میں علمی ترقی

○ دردِ آشوب ○ دستک نہ دو

عہدِ اسلامی میں علمی ترقی

مصنف : ڈاکٹر این۔ این۔ لا

مترجمہ : اخلاق حسین زبیری۔ ایم اے
سلطان فاطمہ بلخی۔ ایم اے

ناشر : اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ناظم آباد کراچی ۱۸

صفحات : ۳۰۸ - قیمت : آٹھ روپے۔

پروفیسر این۔ این۔ لا کی کتاب کا یہ ترجمہ علمی کتابوں کے ترجمے کی نئی صاف ستھری اور بامحاورہ زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ کتاب بجائے خود ایسے اہم موضوع پر ہے جس سے مکمل واقفیت برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے انتخاب کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کا یہ سلیقہ اس زبان میں بھی موجود ہے جو ترجمے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

تاریخ کی بے شمار کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں کچھ طبع زاد ہیں اور کچھ ترجمے۔ لیکن بہت اچھی کتابیں ہمارے ہاں بہت کم ملتی ہیں۔ یہ کتاب ترجمہ سہی لیکن ایک اچھی کتاب ہے —— اچھی اور مفید —— مفید اس لئے کہ تقسیم کے بعد ہمیں ایک قومی کلچر کی تشکیل کرنی ہے، جس کی بنیادیں برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں تلاش کرنی ہوں گی۔ آج کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں

تہذیب کی تلاش میں ہیں کل دِلّی میں وہی لوگوں کی بود و باش، رہن سہن بنی ہوئی تھی۔ ہمیں اپنے لکھنؤ اور اپنی دہلی کو ان کتابوں میں دریافت کرنا ہوگا، جو تاریخ کے موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

یہ ترجمہ ایک قابلِ قدر کام ہے۔ اس کے مترجمین قابلِ ستائش ہیں۔ جنہوں نے بعض گم شدہ کڑیوں کو ڈھونڈ لیا، اور بعض منتشر اجزاء کو این این لا کی کتاب کے ترجمے کے ذریعے مرتب صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا۔

درد آشوب

مصنف : احمد فراز
ناشر : کتاب نما - ۵۲ - بی سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی
صفحات : ۲۴۰ — قیمت : پانچ روپے

مشہور نوجوان شاعر احمد فراز کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ "درد آشوب" سرورق کے فلیپ پر فراق گورکھپوری کی رائے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پشاور سے فارغ بخاری نے کچھ دنوں پہلے اردو کا ایک معیاری ماہنامہ نکالا تھا جس نے ہند و پاک کے رسالوں میں خاص اہمیت حاصل کرلی تھی۔ اس کے ذریعہ فارغ بخاری اپنے شہر کے اندر ایک اچھا ادبی حلقہ بنانے میں بھی کامیاب ہوئے تھے۔ احمد فراز بھی اسی ادبی حلقہ کا ایک نوجوان شاعر ہے۔ اس کے یہاں اچھے شعر اور اچھی نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن فیض کا اثر اس پر غالب ہے۔ جس سے نکلنے کے بعد ہی اُس کی انفرادیت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اُس کے کلام میں احساس، جذبہ اور خلوص کی کمی نہیں ہے۔ توقع ہے کہ ضبط و توازن حاصل کرنے کے بعد اس کی شاعری کو صحیح مقام مل جائے گا۔ ویسے "درد آشوب" کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس مجموعے کو حال ہی میں آدم جی ادبی انعام رائٹرز گلڈ کی جانب سے مل چکا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے قیمتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اٹھا کے مجھے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے

"غریبِ شہر کے نام"

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کروگے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

دستک نہ دو

مصنفہ : الطاف فاطمہ
ناشر : فیروز سنز لمیٹڈ۔ ۶۰۔ مال روڈ۔ لاہور
صفحات : ۴۸۷　　قیمت : ۱۲ روپے

الطاف فاطمہ شعبۂ تعلیم سے متعلق ہیں۔ اُن کا ناول "دستک نہ دو" سات سو ستاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے حصے میں یوپی اور پنجاب دونوں ہی کی روایات آگئی ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کے باب میں حسرت موہانی کے پرچے میں اُن کے والد کی تحریر کی اشاعت کا واقعہ بے حد ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریر کا تعلق تحریکِ آزادی سے تھا۔ آزادی ملنے کے بعد الطاف فاطمہ اس روایت کو ادب میں بت شکنی کے ذریعے آگے بڑھا سکتی ہیں ممکن ہے بت شکنی پہنچنے کے بعد وہ خود بھی اپنے اس ناول کو زیادہ پسند نہ کریں۔

انہوں نے اس ناول میں کسی خاص تکنیک کا استعمال نہیں کیا ہے۔ پلاٹ اور کرداروں کو پیش کرنے کا عام انداز اس میں بھی ہے۔ لیکن ڈیڑھ سو صفحات تک کسی کردار کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی جو اسے تھوڑا بہت بامعنی بنا سکے۔ کرداروں کے ارد گرد وہ ماحول بھی نہیں ملتا۔ جو کرداروں کی معنویت کو گہرا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی ایک کردار کی کہانی ناول میں لکھنا اُس وقت تک سود مند نہیں ہے جب تک اُس کے بہانے زندگی کی اقدار اور زمانے کی کشمکش ناول نگار نہ دکھا دے۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول کے خاص کردار کو پوری طرح سمجھے بغیر موضوع بنا لیا ہے اور یہی بات ناول کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔

"آگ کا دریا" جیسے عظیم ناول کے بعد ایک ایسے ناول کی تخلیق کے سارے امکانات ہماری زندگی میں موجود ہیں جو برصغیر کی روایات پر مبنی جدید دنیا کا ترجمان ہو۔ الطاف فاطمہ سے قوی اُمید ہے کہ وہ آئندہ اردو ادب میں کسی اچھے ناول کا اضافہ کریں گی۔ آدمی کئی بار کی ناکامی اُٹھا کر اور مسلسل کوشش کر کے جب اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کی خوشی بے حد و حساب ہوتی ہے۔ اس خوشی کو الطاف فاطمہ حاصل کر سکتی ہیں۔ ان کے یہاں لکھنے کی سچی لگن پائی جاتی ہے۔

ص - ل

فنارِ علم

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

اردو کے صاحبِ طرز ادیب شاہد احمد دہلوی کا انتقال ہو گیا

جدید اردو ادب اور فنِ موسیقی پر ان کے احسانات ناقابلِ فراموش ہیں

وہ ایک خوددار مخلص اور وضعدار انسان تھے اور آخر دم تک صبر آزما حالات کا مقابلہ کرتے رہے

اس کی ناوقت موت سے دنیائے ادب اپنے ایک عظیم محسن سے محروم ہو گئی

کراچی - برصغیر پاک وہند کے ادبی، علمی اور صحافتی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور و ممتاز رسالہ "ساقی" کے مدیر، صاحبِ طرز ادیب و انشا پرداز اور ماہر موسیقی شاہد احمد دہلوی کا بروز اتوار بتاریخ ۲۷ر مئی ۱۹۶۷ء شب کو ۶۱ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔

اِس سے قبل ۱۰ر فروری ۶۷ء کو بھی اُن پر ل کا پہلا دورہ پڑا تھا، اور وہ جناح اسپتال میں اخل کر دیئے گئے تھے جہاں دو ہفتے تک وہ موت و سیت کی کش مکش میں مبتلا رہے اور دو ہفتے کے بعد ت کی حالت سنبھل گئی۔ لیکن ۲۷ر مئی کا حملہ بالآخر ن لیوا ثابت ہوا، اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو ئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

شاہد احمد دہلوی بتاریخ ۲۲ر مئی سنہ ۱۹۰۶ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن، علی گڑھ اور دہلی میں حاصل کی، اور سینٹ اسٹیفن کالج سے انگریزی میں بی اے (آنرز) کرنے کے بعد انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کے درس کی تکمیل کی۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والد مولوی بشیر الدین جو خود بھی ایک ممتاز اہلِ قلم تھے اور ان کے نامور دادا ڈپٹی نذیر احمد کی نگرانی میں ہوئی

جس کے سبب وہ آخر دم تک خاندانی ورثے کے امین رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے رسالہ "ساقی" دہلی سے جاری کیا، اور ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد اُس کے سرگرم رکن رہے۔ "ساقی" کے ذریعہ انہوں نے اَن گنت نئے لکھنے والوں کو اردو ادب سے متعارف کرایا۔ جن میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب، ابراہیم جلیس وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے "ساقی بک ڈپو" قائم کرکے ۰۰ ہ کے لگ بھگ کتابیں بھی شائع کیں، اور ضرورت مند ادیبوں کی ہمیشہ مدد کی — آزادی سے قبل "ساقی" برصغیر کا ممتاز ترین جریدہ تھا، اور اُس نے جدید ادب کی جو مثالی خدمت انجام دی ہے۔ ادب کا مورّخ اُسے کبھی نظر انداز نہیں کرے گا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں شاہد صاحب پاکستان آگئے کچھ دن لاہور میں رہے پھر مستقلاً کراچی میں آباد ہوگئے۔ اور پیر الٰہی بخش کالونی میں جو مکان انہوں نے خریدا عجب اتفاق ہے کہ اس کا نمبر بھی ۱۹۰۶ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری سنِ پیدائش کے لئے مکان کا نمبر یاد رکھنا کافی ہے۔ ۴۸ء سے ۶۷ء تک "ساقی" کی زندگی کے لئے انہوں نے جو تکالیف برداشت کیں وہ ان کے قریب کے احباب بخوبی جانتے ہیں۔ انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کرکے، موسیقی کے پروگرام ایس۔ احمد کے نام سے نشر کرکے، کتابوں کے ترجمے کرکے اور اخبارات میں مضامین لکھ لکھ کر "ساقی" کو جاری رکھا۔ ان کی صحت عرصے سے جواب دے گئی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ نہایت ذمہ داری کے ساتھ ریڈیو کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور باقی وقت "ساقی" پر صرف کرتے تھے۔ انجمن ادبی رسائل، پاکستان رائٹرز گلڈ، بزمِ افکار اور کئی دوسری علمی و ادبی جماعتوں

میں انہوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ ان اداروں کے کارکنوں کا ہمیشہ حوصلہ بڑھاتے اور ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ سچ پوچھیے تو ادب و موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا فنِ موسیقی پر انہیں کامل دسترس حاصل تھی۔ اور علمی و فنی رموز میں اُن کی ذات سند کی حیثیت رکھتی تھی۔ دلّی کی ٹکسالی زبان میں اُن کی مثالی تحریریں آج اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ صاحبِ طرز ادیب اور ماہر موسیقی کے علاوہ آپ بہترین مترجم بھی تھے۔ اور ان کے ترجموں پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔

آپ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ چند مشہور تصانیف یہ ہیں: دلّی کی بپتا، گنجینۂ گوہر، اُجڑا دیار۔ ترجموں میں: حیرتناک کہانیاں، فاؤسٹ، کامیاب باپ، والدین اور معلمین، بچوں کی خودشناسی، بچوں کی اخلاقی قدریں، انتخابِ معاش، آپ کے بچّے کی صحت، بچوں کی معاشرتی زندگی، وغیرہ۔

شاہد احمد دہلوی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے مشہود احمد اور مسعود احمد ہیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے عاصمہ بیگم سے شادی کی جن سے ایک لڑکا اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ ایک لڑکی کا گذشتہ سال بعارضۂ سرطان انتقال ہوگیا۔ مشہود احمد ریڈیو پاکستان میں نیوز ایڈیٹر اور مسعود احمد کینیڈا میں لائبریرین ہیں۔ ان کی شادی مشہور افسانہ نگار غلام عباس کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ تیسرا بیٹا محمود احمد پٹرولیم کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ تین بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے، دو غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کی بیوہ عاصمہ بیگم جو عرصہ سے "ساقی" کی ادارت میں اُن کا ہاتھ بٹا رہی ہیں' اردو کی ایم اے اور ایک مقامی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں شاہد احمد دہلوی کو اُن کی گرانمایہ

خدمات کے اعتراف میں اعلیٰ کارکردگی کا صدارتی تمغہ ملا تھا۔ انہوں نے سنہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے پہلے لیکچرار کی حیثیت سے سیٹو کی طرف سے فلپائن اور تھائی لینڈ کا دورہ بھی کیا تھا۔ اور مشرقی پاکستان کی متعدد کانفرنسوں اور ادبی اجتماعات میں بھی انہوں نے شرکت کی تھی۔ وہ رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں تھے، اور گلڈ کی سود و بہبود کے لئے ہمیشہ انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔

غالب کے اُڑیں گے پُرزے

پاکستان کا پہلا مثالی اور کامیاب ادبی محاکمہ

کراچی۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام آرٹس کونسل میں جسٹس ایس اے رحمٰن کی صدارت میں "غالب کے اُڑیں گے پُرزے" کے عنوان سے گذشتہ دنوں جو ادبی محاکمہ منعقد ہوا، وہ کئی لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں یادگار اور مثالی قرار دیا جائے گا۔ ۶، ۷ ہزار کے عظیم اجتماع میں ڈھائی گھنٹے سے زائد "سخن فہموں" اور "غالب کے طرفداروں" نے جو دلچسپ، پرجوش اور پرمغز تقریریں کیں۔ اور اتنے عظیم اجتماع نے جس نظم و ضبط اور صبر و تحمل سے اس ادبی محاکمہ میں حصہ لیا۔ اس کی یاد عرصے تک باقی رہے گی۔ اور یہ سب کچھ صرف مرزا ظفر الحسن سکریٹری انجمن کی اردو زبان و ادب سے بے پناہ محبت، جودتِ طبع اور پرخلوص سعی و جہد کے نتیجہ میں ممکن ہو سکا۔

سخن فہموں کی جانب سے جن حضرات نے غالب کی زندگی، شخصیت اور فن پر ہر قسم کے اعتراضات کو روا رکھا اُن میں نواب شیفتہ کے پوتے افتخار احمد عدنی (جنہوں نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے غالب پر شخصی اور ذاتی کمزوریوں کے الزامات عائد کرکے فردِ جرم لگائی) وحیدہ نسیم، پروفیسر کرار حسین، سید محمد تقی، مہدی علی صدیقی، شان الحق حقی، اور سید محمد جعفری شامل تھے۔ غالب کے طرفداروں میں جن حضرات نے سخن فہموں کے ہر الزام کی نہ صرف تردید کی بلکہ غالب کی بے ریا زندگی اور شاعرانہ عظمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی، ان میں پروفیسر ممتاز حسین، بیگم سلمیٰ حقی، سید سبطِ حسن، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ذوالفقار علی بخاری اور رئیس امروہوی شامل ہیں۔

ادبی محاکمہ کے آخر میں صدرِ ادبی عدالت جسٹس ایس اے رحمٰن نے نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ غالب زندگی کے شاعر تھے اور زندگی منطقی نہیں ہوتی۔ آدمی جس کیفیت میں شعر کہتا ہے وہی شعر میں جھلکتی ہے۔ اور کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ غالب کے اشعار میں حکیمانہ بصیرت بھی ہے اور معمولی اور ادنیٰ خیالات بھی۔ لیکن اس کے باوصف ان کی شاعری میں رُوحِ عصر ملتی ہے۔ اور اُن کا اندازِ بیان صرف اُن ہی کے لئے مخصوص ہے۔ بالآخر عوام کے متفقہ فیصلے سے غالب کے پرزے نہیں اُڑ سکے۔

یہ ادبی محاکمہ بلاشبہ پاکستان کی ادبی و تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انجمن طلبائے قدیم اور اس کے سرگرم سکریٹری مرزا ظفر الحسن اس دلچسپ ادب آموز اور زندگی آمیز ادبی مقدمے کی بے مثال کامیابی کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔

فیض۔ ماسکو میں

ماسکو۔ سوویت روس کے ادیبوں کی چوتھی کانگریس میں شرکت کے لئے فیض احمد فیض ماسکو پہونچ گئے ہیں۔ ادیبوں کی کانگریس جس کا اجلاس کریملن میں ہو رہا ہے، کمیونسٹ معاشرہ کی تعمیر میں روسی ادب کے کردار پر غور کر رہی ہے۔

شاہد احمد دہلوی کا آخری خط

مدیرِ "افکار" کے نام!

کراچی۔ گذشتہ دنوں روسی ادیبوں کے وفد کے اعزاز میں پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک عصرانہ دیا تھا جس میں شاہد احمد دہلوی بھی شریک ہوئے تھے۔ عصرانہ کے بعد وہ حاذق الخیری کی کار میں گھر واپس ہوئے۔ ان کے ساتھ مولانا رازق الخیری اور صہبا لکھنوی تھے۔ دورانِ گفتگو شاہد صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنے خاکوں کا دوسرا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ اس کے لیے حفیظ صاحب پر جو مضمون ــــ حفیظ نمبر میں شائع ہوا ہے، اُس کا تراشہ درکار ہے تلاش کر کے بھیج دیں۔ صہبا لکھنوی نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور بھیج دیں گے۔ پھر انہوں نے "کرشن چندر نمبر" کا پوچھا کہ ابھی تک چھپا یا نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کرشن پر بھی انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے۔

کوئی دو ہفتہ بعد مدیرِ "افکار" نے حفیظ صاحب پر مضمون کا تراشہ تلاش کر کے انہیں ۲۵ رمئی کو پوسٹ کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تراشہ انہیں وفات سے ایک روز قبل یعنی ۲۶ رمئی کو ملا اور انہوں نے ۲۷ رمئی بروز اتوار ذریعۂ کارڈ تراشہ کی وصولی کی اطلاع دی۔ اُسی روز شب میں اُن پر دل کا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

اُن کی آخری تحریر کا عکس بطور یادگار پیش کیا جا رہا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ دن میں وہ اچھے بھلے تھے اور حسبِ معمول کام کر رہے تھے کہ شب میں اچانک قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ افسوس

بخدمت صہبا لکھنوی
مدیر "افکار"
ایلفنسٹن روڈ
Karachi

THE "SAQI" MONTHLY,
KARACHI-5

27/5/67

برادرم۔ سلام مسنون۔
حفیظ صاحب پر میرے مضمون
کا تراشہ مل گیا۔ شکریہ۔
زحمت معاف فرمائیں۔

خادم
شاہد احمد

ڈاکٹر یان مارک کے اعزاز میں دو شامیں

رائٹرز کلب کا اجتماع

چیکوسلواکیہ کے مشہور مستشرق ڈاکٹر یان مارک کے اعزاز میں رائٹرز کلب کراچی نے ایک شام منائی۔ تقریباً دو گھنٹے تک اردو اور ادبی مسائل پر یان مارک نے مختلف سوالات کے اردو میں جوابات دیئے۔ انہوں نے بتایا کہ پراگ میں کوشش کے باوجود اردو طلبہ میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پاکستان میں تجارتی روابط کے لئے انگریزی سے کام چل جاتا ہے۔ اس لئے اردو سے دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس ایران والے خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں چنانچہ تجارتی اور ثقافتی روابط کو مستحکم کرنے کے لئے فارسی کی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے — یہ انکشاف ہر اردو دوست پاکستانی کے لئے تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاش اردو کے مخالفین اس سے درس بصیرت حاصل کر سکیں، اور غلامی کی یادگار انگریزی سے جتنا جلد ممکن ہو چھٹکارا پالیں۔

شامِ ہمدرد

ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر یان مارک کے ساتھ ایک شام ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں منائی گئی جس میں کراچی کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اور معززین شہر نے شرکت کی۔ حکیم محمد سعید صاحب نے یان مارک کا تعارف کرایا۔ یان مارک نے اردو غزل پر انگریزی میں اظہار خیال کیا، اور غزل کو مثلث کی صورت میں سمجھایا مثلاً عاشق معشوق اور رقیب۔ اسی طرح شراب، رندا، محتسب۔ یا نظر، رُخ محبوب اور پردہ۔ اُن کے دلچسپ استدلال سے حاضرین کافی محظوظ ہوئے۔ پھر انہوں نے غزل کی تعریف کی اور مختلف اشعار سے اپنے معانی الضمیر کو ادا کیا۔ یہ ساری کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ جس کے بارے میں یان مارک نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ابھی وہ اردو میں اتنے اہم موضوع پر تفصیلی تقریر سے قاصر ہیں ویسے یان مارک نہایت شستہ اردو میں جلسہ کے بعد ہر ایک سے گفتگو کرتے رہے۔ پاکستان میں دو ماہ سے زائد قیام کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ وہ دوسری بار پاکستان کے مطالعاتی دورے پر آئے تھے۔

یادیں اور آنسو

○ ۱۳ مارچ کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں زیر صدارت حکیم محمد سعید دہلوی تحریک آزادی کے بے باک رہنما اور اردو کے صاحب طرز شاعر مولانا حسرت موہانی کی یاد منائی گئی۔

○ ۲۶ مئی کو سندھ مسلم کالج کراچی میں زیر صدارت ممتاز حسن علامہ نیاز فتح پوری کی چھٹی برسی منائی گئی۔

○ ڈھاکہ کی متعدد ادبی و ثقافتی انجمنوں کے زیر اہتمام رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک سو چھ ویں سالگرہ کے موقع پر رنگا رنگ تقریبات منعقد ہوئیں۔

○ کراچی اور ڈھاکہ میں نذر الاسلام اکیڈمی کے زیر اہتمام قاضی نذر الاسلام کا اڑسٹھواں یوم پیدائش منایا گیا اس موقع پر صدر ایوب نے بنگلہ کے باغی شاعر اور آزادی کے علمبردار رہنما کو ایک بیان میں خراج تحسین پیش کیا۔

○ بھٹ شاہ کلچرل سنٹر کے زیر اہتمام سندھ کے باکمال صوفی شاعر شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی دو سو ۱۵ ویں برسی منائی گئی۔ [illegible] جناب محمد [illegible] نے تقریب کی صدارت کی۔

ڈاکٹری معائنے کے بغیر ہی۔
پانچ ہزار روپے تک کی
بیمہ پالسی حاصل کیجئے

آج ہر شخص —— جی ہاں، عموماً
ہر شخص —— آسان ترین شرائط پر
اپنے اہل و عیال کی بہبود کے لئے
زندگی کا بیمہ کرا سکتا ہے۔

• سالانہ شرح منافع سب سے زیادہ
• ... ۵ روپے تک کے بیمہ کے لئے
ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں
• معیاد مکمل ہوتے ہی کلیم کی فوری ادائیگی

ملک میں زندگی کے بیمے کا سب سے بڑا ادارہ

D.F.P 200

ORIENT

"سیرتِ رسول اللہ" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت خاص مشہور ہوئی اور برسوں ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہی۔

اِس کتاب کی شانِ نزول یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء میں مصنف نے مرہٹی انسائیکلو پیڈیا میں ایک مضمون آنحضرتؐ کے متعلق پڑھا جس میں آپؐ کی سیرت پاک کو قدیم ماخذوں کے حوالے سے مسخ کیا گیا تھا پروفیسر (سیّد نواب علی) صاحب پہلے ہی اُن مستشرقین سے بیزار بیٹھے تھے، جنہوں نے تعصب پر کمر باندھ رکھی تھی۔ پس انہوں نے اس مقدس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ تیسری صدی ہجری تک کے محدثین اور ارباب سیر کی تصانیف اور اُن کے شارحین کی تالیفات کا مطالعہ کر کے اور مخالفین اسلام کی انگریزی تصانیف اور نیز بانیانِ مذاہب کی سوانح عمریاں پیش نظر رکھ کر واقعات کو اس طریقے سے قلم بند کیا کہ مخالفین کے اعتراضات بھی رفع ہوئے اور اصل حالات آئینہ ہو کر اردو زبان میں بھی ایک مختصر اور معتبر کتاب کا اضافہ ہو گیا۔

—————— (کتاب، لاہور)

افکار دوستوں سے

ایک درخواست

خریداری مہم میں سرگرمی سے حصہ لیجیے

اچھے اور معیاری ادب کی حوصلہ افزائی کیجیے

افکار خود بھی پڑھیے
اور عزیزوں اور دوستوں
کو بھی اس کے
مطالعہ کی دعوت دیجیے

زرِ سالانہ صرف بارہ روپے

ادا فرما کر آپ اور گھر کا ہر فرد افکار سے استفادہ کر سکتا ہے

افکار، اردو ماہناموں کی آبرو ہے

افکار آپ کا اپنا رسالہ ہے

افکار کی

توسیعِ اشاعت میں حصہ لے کر تعاون کیجیے

زرِ سالانہ اس پتہ پر بھیجیے:

مینیجر ماہنامہ افکار

رابسن روڈ کراچی

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی

طابع: مطبعہ آفسٹ پریس، کراچی

دفتر: رابسن روڈ، کراچی

اپنے عزیز مہمانوں اور دوستوں
کو روح افزا پیش کرنا موسم گرما
کے آداب میں شامل ہے۔

روح افزا

اب بآسانی دستیاب ہے

مشروبِ
مشرق

ہمدرد فروٹ پروڈکٹس – لاہور۔ کراچی

united HRA-8/1071

اس بار

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈکوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون: ۴۳۹۹۳

سال: ۲۳ ○ شمارہ: ۱۹۱

مدیر

صہبا لکھنوی

زر سالانہ	بیرونی ملکوں سے		قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ	۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

لندن کا دفتر

۱۴-پرنسز ایونیو- لندن- این-ڈبلیو ۹.

جولائی ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

اشاریہ
ضیا لکھنوی

آپ زندگی کا بیمہ اور کمپنیوں سے کرا سکتے ہیں

یا الاکو سے،

اس میں ذرا فرق ہے!

ذرا غور فرمایئے ، الاکو کی پالیسیاں پچھتر سالہ تجربات کی حامل ہیں

ذرا دوبارہ غور فرمایئے ، الاکو نے مستعدی سے اور بروقت کلیموں میں

۳,۴۰,۰۰,۰۰۰ روپیہ سے زائد رقم ادا کرکے مثال قائم کی ہے۔

اور ذرا مزید غور فرمایئے ، الاکو کے پریمیئم کم، بونس زیادہ

(-/۲ روپیہ فی ہزار تک) پیڈ اپ پالیسیوں پر بھی بونس

(الاکو پاکستان کی واحد کمپنی ہے جو پیڈ اپ پالیسیوں پر بھی بونس ادا کرتی ہے)

اور ایسی خدمت جو پالیسی خریدنے کے بعد ختم نہیں ہوتی بلکہ مستقل

جاری رہتی ہے۔

آپ یقیناً الاکو ہی سے بیمہ کرانا پسند کریں گے

ا	ل	ا	ک	و

آئیڈیل لائف اشورنس کمپنی لمیٹڈ

آپ کے مستقبل کے ساتھی

ادارِیہ

ادیب اور مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ

مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ سے یہ حقیقت پھر ایک بار دنیا کے سامنے واضح ہوگئی ہے کہ سامراجی طاقتیں جب اور جہاں چاہتی ہیں جنگ برپا کرکے انسانیت کو آگ اور خون کے سیلاب میں بہادیتی ہیں۔ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ ظالم نے ہمیشہ ہزار بہانے تراش کر ظلم، جارحیت اور بربریت کے مظاہرے کئے ہیں۔ چنانچہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے آج تک برابر دنیا میں کہیں نہ کہیں ——— کسی نہ کسی بہانے جنگ اور بربریت کا بازار گرم ہے ——— فلسطین، قبرص، کوریا، کانگو، کیوبا، کشمیر اور ویت نام کے بعد مشرق وسطیٰ میں اسرائیل ایسے حقیر و بے نام ملک کا عربوں پر ننگ دلانہ حملہ سچ پوچھئے تو سامراجی طاقتوں کی پشت پناہی اور بھرپور امداد سے ہی ممکن ہوا ہے۔ جو واقعات دنیا کے سامنے آچکے ہیں اور جو واقعات ابھی دنیا والوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں ان کا تجزیہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ یہ سب کچھ درحقیقت بڑی طاقتوں کی باہمی ریشہ دوانیوں، ایٹمی اسلحہ کی دوڑ، ایک دوسرے پر سبقت اور فوقیت حاصل کرنے کے مجنونانہ جذبے اور نوآزاد و ترقی پذیر ملکوں پر اپنے اثر و اقتدار کو قائم رکھنے کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اسرائیل کے عربوں پر جارحانہ حملے کے بعد سامراج جس طرح آج بھی اس کی حوصلہ افزائی کررہا ہے اور عربوں کے علاقوں پر ناجائز اور غاصبانہ قبضہ کو جاری رکھنے کے لئے جو عیارانہ چالیں چل رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ ان حالات میں ساری دنیا کے ادیبوں اور خصوصاً پاکستان کے باشعور ادیبوں کا متاثر ہونا اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ——— ایک فطری امر ہے ——— لیکن آج چند بیہودہ نواز ادیب بھی ہمیں ظالموں کے کیمپ میں نظر آگئے ہیں اور ہم نے ان ضمیر فروش، موقع پرست، استحصالی طاقتوں کے ہمنوا ادیبوں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب دیکھ لیا ہے جنہیں دنیائے انسانیت کبھی معاف نہیں کرے گی ——— عربوں پر اسرائیلی جلادوں، قاتلوں اور درندوں نے جو مظالم اب تک روا رکھے ہیں ——— وہ دنیا کے ہر سچے، حساس، غیرت مند اور باضمیر ادیب کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں ——— ادیبوں نے دنیا میں ہمیشہ آزادی،

صہبا لکھنوی

ادیب اور مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ

امن، انصاف اور سچائی کے تحفظ کے لئے لڑائی لڑی ہے ـــــ جنگ، بربریت، ظلم اور قتل و غارت گری کا کبھی ساتھ نہیں دیا ہے لیکن بیسویں صدی میں جو ارتقا کی انتہائی منزلوں میں ہے ـــــ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ آج چند نامی گرامی ادیب اور فن کار بھی یہودیوں کی ـــــ دوسرے معنوں میں ظالموں اور غاصبوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں ـــــ آج ساری دنیا کے حق پسند اور سچے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ پاکستانی ادیبوں اور فن کاروں کی ہمنوائی کریں اور اس کھُلی ناانصافی، بد دیانتی، موقع پرستی، ضمیر فروشی اور ظلم دوستی پر شدید احتجاج کریں۔

ہمیں یقین ہے کہ سامراج خواہ کسی روپ میں سامنے آئے ـ لیکن مستقبل قریب میں اُس کی موت لازمی اور یقینی ہے۔ پاکستان کی حکومت، پاکستان کے عوام، پاکستان کے ادیب، فن کار اور دانشور ـــــ بیک آواز سامراجیوں کے آلۂ کار نام نہاد اسرائیل کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ اور ساری دنیا کے صاحبِ ضمیر اہلِ قلم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کھُلی جارحیت، انسانیت سوز مظالم اور جنگ پسندی کے خلاف متحد ہوکر آواز بلند کریں، اور سامراجی ملکوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کرکے انسانیت کی بقا کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔ تاکہ جنگ بازوں کا نام ونشان مٹایا جاسکے جو کبھی مشرق بعید میں، کبھی مشرق وسطیٰ میں اور کبھی ایشیا میں جنگ کے شعلے بھڑکا کر انسانیت کی تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور ظلم و بربریت کے تماشے دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں۔ آج دنیا کے تمام سچے، دیانت دار اور حق پسند ادیبوں کو یہ فیصلہ کرلینا ہے کہ آیا وہ سامراج اور اس کے حاشیہ نشینوں کو جبر و استحصال کی کھُلی چھوٹ دینا پسند کرتے ہیں یا دنیا کے ہر ملک اور سارے عوام کو آزادی و خودمختاری سے جینے کا حق دینا پسند کرتے ہیں! اب دنیا میں صرف دو ہی کیمپ نظر آتے ہیں جنگ بازوں کا کیمپ اور امن پسندوں کا کیمپ ـــــ آج فکر و قلم، علم و کتاب اور دانش و بینش کی آزمائش ہے۔ دیکھنا ہے کہ اس کڑی آزمائش میں کون کون کس کیمپ کا ساتھ دیتا ہے کہ اسی پر عالمی امن ـــــ انسانیت کی بقا اور ساری دنیا کے عوام کی آزادی اور خوش حالی کا انحصار ہے۔

جوش ملیح آبادی

علم و فکر

نگاہِ بدبیں

اس منظرِ عبرت کو بھی دیکھ اے فن کار
بدبیں کی نظر، وہ انگنی ہے پُرخار
جس پر لٹکے ہیں مثل کاہ و خاشاک
ریحان و بنفشہ و گل و سرو و چنار

خوشامد

جو حرفِ تملق سے، ہوا دیتے ہیں
جاگی ہوئی عقل کو، سُلا دیتے ہیں
ہوتے ہیں وہ بونے، یہ خوشامد خورے
اُونچوں اُونچوں کو جو تخپا دیتے ہیں

پی ایچ ڈی

یہ لوگ جو "ڈاکٹر" جٹا دھاری ہیں
ناواقفِ شیوہ ہائے فن کاری ہیں
ان کو سمجھو نہ تاج دارانِ علوم
یہ کشتِ ہنر کے صرف پٹواری ہیں

نیرنگیٔ عالم

دنیا کبھی ہموار نہیں ہوتی ہے
اک وضع پہ طیار نہیں ہوتی ہے
تھالی، کوٹھے سے، فرشِ سنگیں پہ، کبھی
گرتی ہے تو جھنکار نہیں ہوتی ہے

سبو

شیشے، کبھی نظروں سے کھنک جاتے ہیں
لگتی نہیں ٹھیس اور درک جاتے ہیں
دیکھا ہے کہ ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی سبو
بھرنے نہیں پاتے کہ چھلک جاتے ہیں

پروفیسر اختر انصاری دہلوی

رُباعیات

اندوہ و تپش، کیف و طرب، فکر و مذاق
رعنائیٔ غم، دردِ جنوں، سوزِ فراق
چھپ چھپ کے یہ افسانہ میں لکھتا ہی رہا
اللہ رے تاریک شبوں کے اوراق

یہ کیفِ جوانی کہ سُرورِ مَے ہے
یہ دردِ تمنّا کہ سرودِ نَے ہے
سوئی ہوئی یہ ساعتیں بیداری کی
جاگی ہوئی یہ شبوں کی نیندیں ہے ہے

سانسوں میں لئے کرب و بلا جیتا ہوں
سِلتے نہیں جو زخم انہیں سیتا ہوں
جی بھر کے زمانے نے پیا خون مرا
باقی جو بچا اس کو میں خود پیتا ہوں

اے بارِ الٰہا! یہ مری ہستیٔ زار
لائق نہیں اس تیرے جہاں کے زنہار
یا اس کو پٹک دے غمِ دل کے سر پر
یا گردشِ تقدیر کے منہ پر دے مار

ہر دل کو مرا سوزِ جگر دے ساقی
ہر آنکھ کو میری سی نظر دے ساقی
سب کا ہو بھلا جس میں میں اس میں خوش ہوں
ہر جام کو اس زہر سے بھر دے ساقی

قمر ہاشمی

یروشلم رو رہا ہے

اُداس نظریں خلا کی جانب
دلوں پہ غم کے مہیب سائے
ہر آنکھ جیحونِ خوں بنی ہے
ہمارے اشکوں کے سیل میں
شام و اردن و مصر بہہ رہے ہیں
عراق بھی سیلِ گریۂ خوں میں ہم سفر ہے
جہاں بھی یہ دل کا درد، یہ غم کی بات پھیلی ہوئی ہے
سر ہیں ہتھیلیوں پر
عرب شہیدوں کا تذکرہ ہے
جو عزم و ایقاں کے اسلحوں سے لڑے ہیں
اور تھک کے سو گئے ہیں
یہ اپنے اُن دوستوں کا زہر فریب کھا کر
ہوئے صف آرا
جو کہہ رہے تھے کہ تم ہمیں ہر محاذ پہ اپنے ساتھ پاؤ گے
خود کو تنہا نہ جان لینا
مگر یہ سب دوست آستیں کے سانپ نکلے
انہوں نے انسانیت کی شہ رگ پہ ضرب کاری لگا کے
دیکھا ہے رقصِ بسمل
یروشلم کی تباہی آنکھوں سے دیکھتے ہیں
تو خون روتے ہیں اس کی تخریب آب بعد ہم

فغاں کہ تقدیسِ بیتِ مقدس برہنہ سر ہے
کہ ارضِ قدسی یہود فسطائیت سے پامال ہو رہی ہے
مسیح کا شہر[1] جل رہا ہے
کنارِ اردن ہزاروں لاشیں جلی پڑی ہیں
شہید آرام کر رہے ہیں
حسین کی بے گناہ و معصوم بیٹیوں کی ضعیف چیخیں
سنائی دیتی ہیں دل شکستہ بنہ گزینوں کے قافلوں سے
سنائی پیاسوں کے واسطے بن گیا ہے کوفہ

یہ شرق اوسط کے خوں چکاں واقعات
ہر ذی شعور، ہر با ضمیر کا دل ٹٹولتے ہیں
یہ جنگ امریکی سازشوں کا کھلا ہوا باب
اس کی در پردہ جارحیت کا اک ورق ہے

ہم اپنی جنت نما فضاؤں میں
اڑنے دیں گے نہ دشمنوں کو
ہمارے شہروں پہ
لے کے اپنی قضا ہی بمبار آسکیں گے
ریاض و لاہور و انقرہ میں
بلند ہوتے ہوئے دعاؤں کے ہاتھ
نیپام بم لئے ہیں

سلام اے ارضِ شام و اردن کے جاں سپارو
سلام اے مصر کے شہیدو
تمہارا بدلہ نہ لیں گے جب تک
وبال سمجھیں گے دوش پر ہم سروں کو اپنے

---

[1] بیت اللحم

سحر انصاری

یروشلم جل رہا ہے!

(۱)

خدا نے جب نوح سے کہا تھا
کہ اب کے طوفان آبِ سرکش کا تندسیلِ رواں نہ ہوگا
کہ اب کے طوفان آگ کے قلب سے اٹھے گا
تو اس کی نظروں میں اک جہنم تھا
جس کے شعلوں میں لمحہ لمحہ
یروشلم آج جل رہا ہے
یروشلم جس کا ذرہ ذرہ ہے ایک تاریخ زندگی کی،
گزرتے لمحوں کی زخم خوردہ سماعتوں نے
یہیں یوحنا، مسیح، موسیٰ کے پاؤں کی آہٹیں سنی ہیں
یہیں پہ انسانیت نے امن و سکون کی آیتیں لکھی ہیں
یروشلم کی تباہ و مظلوم سرزمیں پر
کہے سلیماں سے کون جاکر
کہ تیری ہیکل بھی خونِ انساں سے تربتر ہے
وہ بابِ اقصیٰ بھی گر چکا ہے
جہاں سے صلح و سلامتی کے جلوس نکلے
اور آج دیوارِ گریہ خود گریہ کر رہی ہے
مرگِ صلح و سکون پہ گریہ کر رہی ہے
تقدس و عظمت و جلالت کے نام دھندلا گئے ہیں سارے

اُجڑ گیا دارِ اجتماعِ حقوقِ انساں
فصیل و دیوار غم زدہ ہیں
شہر کا دل لہو کے مانند خاک پر بہہ رہا ہے ہر سُو
کہ استخواں سوز آگ پھر آسماں سے نازل ہوئی ہے جس نے
زمین کی ہڈیوں کو یکسر جلا دیا ہے۔
ہوس کی پیکار زرگری سے
جو آگ ویت نام میں لگی ہے
وہ آگ، خونخوار آگ قلبِ یروشلم کو چبا رہی ہے
اس آگ میں درد کی پناہیں بھی جل رہی ہیں
وہ دیدگاہیں بھی جل رہی ہیں
جو امن کے آفتابِ تازہ کی منتظر تھیں
وہ دیدگاہیں بھی جل رہی ہیں

(۲)

یروشلم! تیرا غم سمندر سے بیکراں ہے
یروشلم! آج تیرے بیٹے
اسیر ہیں دشمنوں کے کیمپوں میں رو رہے ہیں
کٹے ہوئے ہات اور مجروح پاؤں کیمپوں میں رو رہے ہیں
یروشلم! وہ سفینہ جن کی سفاہتوں نے
مسیح کو کر دیا تھا مصلوب، آج اُن کے تمام فتنے
یہ چاہتے ہیں کہ لُوٹ لیں پھر سہاگ تیرا
یروشلم: زرگری کے خونخوار بھیڑیئے یہ بھی سوچتے ہیں
کہ اب اگر یہ سیاہ آنسو بہائے مرگِ یروشلم پر
تو اُس کی آنکھوں کو آگ کی لَو سے خشک کر دیں
اُس آگ کی لَو سے خشک کر دیں
جس آگ سے نوح کو ڈرایا گیا ہے اب تک
جس آگ میں زیست کو جلایا گیا ہے اب تک

حمایت انصاری

سامراجیوں کے نام

"خوش نظر" "امن کشو" "جادہ نما" "راہزنو
اتنے ناواقفِ بربادیٔ دوراں نہ بنو
تم نے بانٹی ہے زمانے کو غم و درد کی رات
تم سے دنیا کو ملی جنگ و جدل کی سوغات
تم سے اقلیم محبت کے افق پر اندھیر
تم ہو اک آگ اگلتے ہوئے بارود کا ڈھیر
خود کو معروف کیا خلق کا رہبر تم نے
کارواں لوٹ لئے بھیس بدل کر تم نے
تم نے تخریب کی ظلمت میں بدل دی تابش
کھا گئی کتنے ستاروں کو تمہاری سازش
آدمیت پہ کئے ظلم بنام تہذیب
اپنا حق مانگنے والوں کو دیئے دار و صلیب
خونِ انساں کا پیا نفس کی راحت کے لئے
قتل کس کس کو کیا اپنی مسرت کے لئے
یہ مظالم نہ فراموش کرے گی تاریخ
مجرمِ نوعِ بشر تم کو کہے گی تاریخ

تم نے شر کے لئے تخلیق کیا اسرائیل
تم نے یہ چاہا کہ بجھ جائے عرب کی قندیل
غضب تم نے کیا رہوڈیشیا کس چال کے ساتھ
فارموسا کو لیا، کاٹ دیا چین کا ہاتھ

مصر کو جبر و تشدد سے دبانا چاہا
کوریا صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہا
تم نے کیوبا کی بغاوت کو کچلنے کے لئے
امن عالم کو جلا دینے کے اقدام کئے
تم نے راحت گہِ لاؤس پہ بم برسائے
تم نے کمبوڈیا والوں پہ اَلم برسائے
تم ویت نام میں سیلاب بلا لائے ہو
تم عدن کے لئے آزار اُٹھا لائے ہو
کتنے سورج ہیں کہ بے نور بنا رکھے ہیں
سینۂ دہر پہ ناسور بنا رکھے ہیں

تم منافق ہو تمہیں جان گئی ہے دنیا
مفسدو، اب تمہیں پہچان گئی ہے دنیا
اب ہیں آزادیٔ افکار کے چرچے ہر سُو
ہر طرف پھیل رہی ہے گُل نو کی خوشبو
ایشیا جاگ اُٹھا چین ضیا ریز ہوا
ارضِ افریقہ کی شہ رگ میں لہو تیز ہوا
سینۂ شرق سے اُبھرا ہے اُجالا کیا کیا
خشک دھرتی سے اُبلنے لگے دریا کیا کیا
آ گئے کارگہِ زیست میں بیدار سپوت
ٹوٹ کر رہ گیا اک آن میں برسوں کا سکوت
موج در موج نئے عزم سے جمہور بڑھے
جیسے ہنگامِ سحر وسعتِ فلک نور بڑھے
اس نئے ذہن سے کگبار مرادیں بھی ہے
آج اس فکر سے سرشار مرادیں بھی ہے
فکر کو جہل سے مانوس نہیں کر سکتے
تم نئے ذہن کو محبوس نہیں کر سکتے

محمود شامی

میں اُجالے کا احساس ہوں !

یہاں بھی
وہاں بھی
ہر اک سمت ہی ننگی خواہش کا طوفان ہے
میرے چاروں طرف اک لہو رنگ ہیجان ہے
کون ہے ؟
کون ہے ؟
جس کا سایہ مجھے بستیوں، شہروں، ملکوں میں در در لیے پھر رہا ہے
مرے چاروں جانب صدائیں ہیں
اندھی صدائیں کہ جن کے بھنور میرے پاؤں کی زنجیر ہیں
یا گھٹا ٹوپ تاریکیاں ہیں —
بس اک میں ہی ان ظلمتوں میں اُجالے کا احساس ہوں
میں اُجالے کا احساس ہوں
میرے لب روشنی کا سمندر ہیں
میں بولتا ہوں کہ "امریکیو جاؤ"
لاہور کہتا ہے "انساں بنو"
اور سنو قاہرہ کی فضائیں بھی میری صداؤں سے ہی گونجتی ہیں
ہنوئی کے بازار بھی میرے الفاظ ہیں
میرے الفاظ — یہ میرے بازو ہواؤں کی مانند پھیلے ہوئے ہیں
ستاروں کی مانند روشن ہیں
لاہور، بغداد، پیکنگ، ہنوئی
نئے دور کی روشنی کے نشاں ہیں
نئے دور کی صبح ظلمت کی ہر شکل کی موت ہے
موت انگڑائیاں لے رہی ہے

ش۔ ح۔ عبّاسی

دو نظمیں

گردشِ ایّام

آدمی گردشِ ایام کا ٹھکرایا ہوا
آج احساس کی دیوار پہ آویزاں ہے
آگہی گُنگ ہے، افکار کے لب زخمی ہیں
ذہن میں روشنیٔ طبع کی لَو بے جاں ہے
خامشی حرف کی تقدیر بنی ہے کب سے
بے بسی پاؤں کی زنجیر بنی ہے کب سے
آنکھ عنوانِ بہاراں سے بھی گھبراتی ہے
غنچے ہنستے ہیں تو ہر شاخ لرز جاتی ہے
اب اشاروں میں بھی کچھ بات نہیں ہو سکتی

جواب

لوگ پھر پوچھتے ہیں اب مجھ سے
کیوں جوانی کی اس حقیقت کو
اک کہانی بنا رہے ہو تم ؟
کس نے ٹھکرا دیا محبت کو؟
سوگ کس کا منا رہے ہو تم؟
چاہتا ہوں جواب دوں ۔ لیکن
نام لب پر مرے نہیں آتا
لوگ کیا کیا نہ دیں گے نام ترا!

ابراہیم جلیس

دُنیا کے صاحبِ ضمیر ادیبوں سے ایک سوال

۲۰ر جون ۶۷ء کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام کراچی کے ادیبوں کا ایک جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس میں مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ جنگ، عربوں پر اسرائیل کی کھلی جارحیت اور بربریت اور سامراجی ملکوں کی پُشت پناہی سے تیسری عالمگیر جنگ کے جو خطرات پیدا ہو گئے ہیں، اس پر کراچی کے ادیبوں نے شدید غم و غصہ کا اظہار کیا اور متعدد تجاویز منظور کی گئیں۔ ذیل کا مضمون بھی اسی جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ (ص)

"آج میں دنیا کے ہر ادیب، ہر شاعر، ہر فن کار اور ہر دانشور کے دل کا دروازہ کھٹکھٹانے آیا ہوں اس ارادے اور اس تمنا سے کہ اگر کوئی حق گو، منصف مزاج، انسانیت دوست اور جرأت مند ضمیر اس دل کے اندر رہتا ہے تو وہ میری دستک پر باہر نکل آئے:"

ہم قلم رفیقو!
آج اگر ولیم شیکسپیئر زندہ ہوتا تو وہ اپنی مشہور کہانی "مرچنٹ آف وینس" کے کرداروں کو بالکل عجیب روپ میں دیکھ کر حیران رہ جاتا۔
مرچنٹ آف وینس کی کہانی یوں ہے کہ ایک سنگ دل سُود خور یہودی تاجر شائیلاک تین ہزار روپوں کے عوض قرض ایک نوجوان انطونیو کے دل کے پاس سے ایک پونڈ گوشت کاٹ لینا چاہتا ہے لیکن انطونیو کے دوست بسانیو کی آئندہ بیوی پورشیا ایک وکیل کے بھیس میں آتی ہے اور یہ شرط رکھ کر انصاف کا تقاضا پورا کر دیتی ہے کہ :

"سنگ دل یہودی شائیلاک انٹونیو کے دل کے پاس سے گوشت کا ٹکڑا
ضرور کاٹ سکتا ہے بشرطیکہ انٹونیو کے جسم سے لہو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکے "
دانش مندانہ اور منصفانہ فیصلہ سن کر شائیلاک اپنا مقدمہ ہار جاتا ہے۔

لیکن آج شائیلاک یہ مقدمہ جیت گیا ہے۔ آج شیکسپیئر کی یہ کہانی بالکل بدل گئی ہے۔ اس کے کرداروں نے
روپ دھار لئے ہیں۔

انٹونیو ——— مشرق وسطیٰ

شائیلاک ——— اسرائیل

پورشیا ——— اتحادی انجمن (U.N.O)

انٹونیو کی جگہ مشرق وسطیٰ جو سارے کرۂ ارض کا دل بھی ہے۔
اسرائیل کے روپ میں شائیلاک نے دنیا کے اس دل سے بہت بڑا ٹکڑا کاٹ لیا ہے اور دنیا کی چھاتی ایسی لہولہان
ہے کہ کہیں یہ پیاری دنیا مر نہ جائے!
اسی لئے تو اتحادی انجمن کی پورشیا دم بخود ہو کر سوچ رہی ہے کہ:
"دل کا ٹکڑا تو کٹ چکا۔ لہو کے قطرے تو کیا، لہو کے دریا بہہ گئے۔ اب
وہ فیصلہ دے تو کیا دے؟ اور انصاف کرے تو کیا انصاف کرے!؟"

ظلم دشمن ادیب ولیم شیکسپیئر زندہ تھا تو ظالم شائیلاک کا سر نیچا ہو گیا تھا۔ لیکن آج ظالم شائیلاک سر بلند ہو گیا ہے
اپنے ہم مشرب دنیا بھر کے رفیقانِ قلم سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ:
"کیا ظلم کا سر اسی لئے بلند ہوا ہے کہ اب دنیا میں ولیم شیکسپیئر جیسا
ظلم دشمن ادیب کوئی نہیں رہا۔!؟"
میں یہ سوال اس لئے بھی پوچھنے پر مجبور ہوا ہوں کہ دنیا کے بعض مشہور انسان دوست ادیبوں اور فن کاروں کا ایک
ظلم کی حمایت میں میری نظر سے گذرا ہے۔ ان دانشوروں میں مجھے ژاں پال سارتر، پابلو پکاسو، آئینسکو اور فرانس فینڈر
دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور بڑا دکھ ہوا۔
اب سے چند سال پہلے اسی ژاں پال سارتر نے اپنی ہی حکومت اور اپنے ہی وطن فرانس کے خلاف الجزائری مجاہدین
کی حمایت میں حق کی آواز بلند کی تھی، تو میں قائل ہو گیا تھا کہ:
"صاحب ضمیر ادیب کے لئے مظلوم کی حمایت وطن کی محبت سے بھی کہیں
زیادہ پیاری ہوتی ہے"
لیکن آج وہی ژاں پال سارتر ظلم کا قصیدہ پڑھ رہا ہے اور آئینسکو ظالم کی زبان بنا ہوا ہے کہ:

"یہودی قوم کو نیست و نابود کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ حالانکہ یہ
مظلوم قوم سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتی کہ اسے زندہ رہنے کے لئے تھوڑی سی
زمین مل جائے ۔"

بہ حیثیت انسان میں بھی آئینسکو کا ہم زبان ہوں۔ یہودیوں کو بھی زندگی بسر کرنے کے لئے تھوڑی سی زمین ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن انہیں یہ زمین فرانس میں ملنی چاہیئے۔ برطانیہ میں ملنی چاہیئے۔ امریکہ میں ملنی چاہیئے۔
مشرق وسطیٰ میں نہیں — ہرگز نہیں — ہرگز نہیں۔
ان "مظلوم" یہودیوں کا زندگی بسر کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ میں "تھوڑی سی زمین" مانگنا بالکل ایسا ہی مضحکہ خیز امر ہے جیسا کہ کوئی چور کسی گھر میں چپکے سے داخل ہو، اور اس کے بعد اس گھر کے رہنے والوں پر پستول تان کر اعلان کرے کہ زمانے کے ظلم و ستم نے مجھے چور بنا دیا ہے۔ میں بڑا مظلوم ہوں۔ میرے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں، اس لئے میں اب اس مکان کا مالک ہوں۔
اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی کہ ۲۵ لاکھ یہودیوں کے لئے ایک وطن چاہیئے تو یہ مطالبہ کوئی ناجائز مطالبہ نہ تھا لیکن دھوکہ اور فریب تو یہ ہے کہ بہ ظاہر تو "یہودیوں کا وطن" ہے لیکن اصل میں دنیا کی بڑی سامراجی طاقتوں کا وہ "ٹروجن گھوڑا" ہے جو مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی دولت یعنی اس کے سیال سونے پٹرولیم کو لاد کر لے جانے کے لئے یوں بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ٹروجن گھوڑا اس لئے نہر سوئز کے ساحل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ پٹرولیم کی ہیلن کو اڑا لے جانے کے لئے ایک ہزار جنگی جہازوں کو راتوں رات پھر واپس بلوا لے۔
یہ ٹروجن گھوڑا اس لئے بدقسمتی سے اچھل کود رہا ہے کہ دس کروڑ عربوں کے اتحاد کی طاقت کو اپنے ٹاپوں سے کچل کر رکھ دے تاکہ پھر اس کا آقا سامراج پٹرولیم کی ہیلن کے ساتھ اس گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ دس کروڑ عرب اس کے سائیسوں اور غلاموں کی طرح اس کی لگام پکڑے آگے پیچھے دوڑتے رہیں۔ اور سامراج اس ٹروجن گھوڑے پر سوار سارا مشرق وسطیٰ پر روندتا پھرے۔
یہودیوں کو مشرق وسطیٰ میں رہنے سے کبھی نہیں روکا گیا، لیکن مشرق وسطیٰ کا شاید ہی کوئی غیرت مند انسان یہ گوارا کرے گا کہ :

"مشرق وسطیٰ دس کروڑ آزاد عربوں کے وطن کے بجائے سامراج کے اس
ٹروجن گھوڑے کے لئے محض ایک اصطبل بن کر رہ جائے !"

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ خواہش صرف اتنی معصوم نہیں ہے۔ کیونکہ بعض یہودی اخبارات، رسائل اور ریڈیو کمپنیوں کے شرانگیز اشتہارات کا بھی پتہ چلا ہے جن کی عبارت ایسی شرانگیز ہے کہ :
"اسرائیل آیئے اور مکہ کی زیارت کیجئے !"

Visit Israel & See Mecca

اس اشتہار سے صاف ظاہر ہے کہ اسرائیل اور اس کے سرپرست زندگی بسر کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی زمین میں چاہتے بلکہ تل ابیب سے دمشق تک اور قاہرہ سے مکہ معظمہ تک سارا مشرق وسطیٰ ہڑپ کر جانا چاہتے ہیں، ورنہ اس اشتہار کے کیا معنی ہیں کہ:

Visit Israel & See Mecca

اسی نام نہاد تھوڑی سی زمین کے لئے آج سارے مشرق وسطیٰ کو نیپام بموں سے دہکتا ہوا ایک جہنم، ایک بھیانک کھنڈر اور ایک سنسان قبرستان بنا دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اسی زمین پر ہر مذہب نے انسان کی اچھی زندگی کے چراغ جلائے اور آج اسی سرزمین پر موت کا بھیانک اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔

اس زمین کی خوب صورت مسجدوں، گرجاؤں اور مقبروں میں ابراہیمؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ سے لے کر نبیٔ آخرالزماںؐ تک سارے خدا دوست پیغمبر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور آج انہی کے مقبروں کے ارد گرد اُن کے معصوم اُمتی سڑکوں، میدانوں، کھنڈروں اور ریگزاروں میں بے گور و کفن پڑے سڑ رہے ہیں۔

ایسے گھر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں ہیں جہاں کل تک زندگی کے چراغ جلتے تھے، اور ان گھروں میں ہنسی خوشی کا اُجالا پھیلا ہوا تھا — لیکن اب یہاں کا ہر گھر ایک مقبرہ ہے۔ ہر دیوار — دیوارِ گریہ ہے۔ ہر لاش ابوالہول ہے۔ اور ہر میدان — میدانِ کربلا ہے۔

دامنِ ہمیشہ کے لئے تہی آغوش ہو چکا ہے۔ عذرا کے ہونٹ بوسوں کے لئے ہمیشہ ترستے رہیں گے۔ اب ان بندرگاہوں میں کوئی سندباد جہازی نہیں آئے گا۔ اب ان بازاروں میں علی بابا بھی قتل کر دیا گیا ہے۔

یوں نظر آتا ہے جیسے ظالموں نے کہانیوں کی اولین کتاب "الف لیلہ" کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر کے سارے مشرق وسطیٰ پر بکھیر دیا ہے۔

اب نازک الملائکہ کے ہونٹوں کے گیت چوری ہو گئے ہیں۔ رضا الشبیبی کا قلم کھو گیا ہے۔ اور رشیدہ رضویہ اپنے ناول "لڑکی ایک ولی کے ویرانے" کے بجائے "انسانیت کی لاش کو مشرق وسطیٰ کے ویرانے میں" دیکھ رہی ہے اور دم بخود ہو کر رہ گئی ہے

اب مشرق وسطیٰ کے سارے اہلِ قلم ان کھنڈروں میں انسانیت کو کریدتے پھر رہے ہیں، ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

میری تلاش بھی یہی ہے۔

نئے شائیلاک کے لئے نیا ولیم شیکسپیئر۔

اے میرے ہم مشرب رفیقو! اے ہم قلمو! میں آج آپ لوگوں میں اسی شائیلاک شکن ولیم شیکسپیئر کو ڈھونڈنے آیا ہوں "کہاں ہو —؟ — آواز دو"

انجم اعظمی

پاکستان میں اردو ناول

چند اہم اور قابلِ ذکر ناولوں کا ایک جائزہ

۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی درمیانی دہائی میں برصغیر ہند و پاک کے ادیب دو بہت بڑے ذہنی حادثوں سے گزر گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہی اور برصغیر کی آزادی کا المیہ۔ اسے آزادی کا المیہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے فوراً بعد ہمارے ملک کے انسانوں کا ہو بڑا ارزاں ہو گیا تھا۔ جنگِ عظیم کی تباہی کو یہاں فوری طور پر کم محسوس کیا گیا تھا۔ اس کے بعض اسباب تھے۔ اول تو اس جنگ نے اپنی ہولناکیوں کا مظاہرہ ہماری سرزمین سے بہت دور کیا تھا۔ دوسرے اس وقت ہمارے ذہنوں پر جدوجہدِ آزادی کا نشہ طاری تھا۔ جس نے اس جنگ کے اثرات کو دھندلا دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو آزادی ملنے کی بے انتہا خوشی کے دوران ان لاکھوں انسانوں کے سفاکانہ قتل کا غم ہمارے حصے میں آپڑا۔ جو ہمارے ہم وطن اور ہمارے ہی جیسے انسان تھے۔ لیکن ہم نے اپنی وحشت اور بربریت کو چھپانے کے لئے انہیں انسانوں کے بجائے ہندو، سکھ اور مسلمان کہا۔

ہندوستان کی تاریخ میں مغل تہذیب کا زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اجنتا اور ایلورا دیکھنے کے بعد تاج محل دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ مغلوں نے ہندوستان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور مغلوں سے بھی پہلے سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے ہی میں مسلمانوں کی ثقافت پورے ہندوستان کی ثقافت کا ایک اہم اور غالب جز نظر آتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ سیاسی اختلافات کے باوجود اس ثقافت سے رشتہ ٹوٹنے نہ دیں۔ بدقسمتی سے ہماری قوم میں بعض ذہنوں کی کم مائیگی اور تنگ نظری۔ انہیں یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتی کہ سیاسی تقسیم ہماری ضرورت سہی لیکن اس سے ایک تہذیبی غم بھی وابستہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آباد ہونے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک سماجی زندگی نے جنم لیا تھا۔ جسے برہمن اور مولوی ناپسند کرتے تھے۔ اور عوام برت رہے تھے۔ اس تہذیب کو اس کی انفرادی خصوصیات کی بناء پر قدیم تاریخ کے پس منظر میں ہندوستان کی مسلم تہذیب کہا گیا ہے برصغیر کے تہذیبی ارتقاء کی ایک بے حد اہم کڑی تھی معلوم نہیں بن سکی

اور مسلم لیگی تاریخ سے واقفیت کو کوئی اہمیت دیتے ہیں یا نہیں۔ لیکن برصغیر کے دونوں ملکوں بھارت اور پاکستان میں جو لوگ آباد تھے یا ہجرت کر کے آباد ہوئے مشترکہ تہذیبی عناصر کی بناء پر ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کے فطری غم کو اپنی روحوں سے نہیں نکال سکتے تھے۔ جسے چھپانے کی کوشش میں ہم اب تک ماضی اور تہذیبی وراثت سے انکار اور انحراف کرتے رہے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک تہذیبی عناصر ہی سے ہندوستان کی مسلم تہذیب عبارت تھی۔ جس میں کچھ مغرب کے اثرات بھی مل گئے تھے۔ جو انگریز کی صد سالہ دورِ حکومت کی یادگار اور علومِ جدیدہ کی کارفرمائی کی خبر دیتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سیاسی افراد بازوں نے ہر قدیم اور جدید روایت کو ترک کر کے ایک ایسا تہذیبی بحران پیدا کیا۔ جس نے فی الوقت ہمیں اپنی تاریخ، ثقافت، علوم وفنون اور معاشرت کے آداب سے بیگانہ کر دیا ہے۔

آزادی کے بعد کے اس ماحول میں جو ناول ہمارے ہاں لکھے گئے ان میں اس ماحول کی المناک تصویریں اس کی مسرتیں اور نفرتیں اور اس کا تہذیبی پس منظر واضح طور پر ملتا ہے۔ یہاں ایک لمحے کے لئے رک کر ہمیں ان ادیبوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ جن کی ذمہ داری ادب کی تخلیق کے بہانے زندگی کی اقدار کو دریافت کرنا اور انکی تعمیر وتشکیل ہے۔ اس دور کے اچھے لکھنے والے ہمیں دو گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ جو تحریریں ادب کے معیار سے کمتر ہوتی ہیں۔ ان کا مطالعہ ادب کا مطالعہ نہیں بن سکتا۔ اردو میں یوں تو بے شمار تاریخی، معاشرتی، اور نفسیاتی ناول اس زمانے میں بھی لکھے گئے۔ لیکن انہیں ناول کہنا اس فن کے ساتھ اچھا خاصا مذاق ہوگا۔ ان کے مصنفین سے بہتر مصنف ابن صفی ہے۔ جس کے بعض جاسوسی ناولوں میں ایڈونچر بھی ملتا ہے اور مزاح بھی ——— اسے پلاٹ کی ترتیب اور زبان لکھنے کا بھی سلیقہ ہے۔ لیکن ان سب سے قطع نظر ادیبوں کا ایک گروہ ہمارے سامنے تھا۔ جو ادب میں وطن پرستی کے جذبے کی مکمل ترجمانی چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ ثقافت کو ناقابل تقسیم سمجھتا تھا۔ ایک نے قومی سیاست کو ادب کا سب سے اہم موضوع قرار دیا تھا۔ دوسرا اس جذباتیت سے خوف کھاتا تھا جو نفرت کو محبت کا بدل سمجھ رہی تھی۔ یہ دونوں جذبے بعض اوقات الگ الگ بھی ملتے تھے اور اکثر ایک کشمکش کی صورت میں ایک ساتھ ادیبوں اور شاعروں کے اندر موجود تھے کسی کی ذات میں ایک کا پلہ بھاری ہوتا۔ کسی میں دوسرے کا۔ اس کشمکش کے نتیجہ میں بعض ادیبوں کو چپ کی بیماری لگ گئی۔ لیکن بیشتر کے یہاں اس کا اظہار ناولوں، افسانوں اور نظموں میں مسلسل ہوتا رہا۔

پہلا اہم ناول جو آزادی کے فوراً بعد پاکستان سے شائع ہوا قرۃ العین حیدر کا "میرے بھی صنم خانے" ہے لکھنؤ کی تہذیب اور اس کے جدید وقدیم عناصر ایک بار پھر کچھ قدروں کی شکست وریخت، کچھ اداسی اور کچھ مایوسی کی شکل میں ہمارے سامنے سوال بن کر موجود ہوتے۔ اس تہذیبی پس منظر میں برصغیر اپنی سیاسی اور سماجی شادکامیوں اور نامرادیوں کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ کچھ کردار بہت نمایاں ہو کر آنکھوں کے سامنے آگئے تھے۔ کچھ کے دھندلے خاکے قاری مکمل کر لیتا تھا۔ کچھ باتیں موسم اور شہر کے رہن سہن کے آداب، شادی بیاہ کے ہنگاموں اور تہواروں کی دھوم دھام کے بہانے کہہ دی گئی تھیں۔ اس ناول میں خوشی کے احساس پر آنسوؤں کا حسن غالب آگیا تھا۔ اس میں ان نوجوان ذہنوں کا غم زیادہ شامل تھا۔ جنہیں آزادی کے بعد اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس ماضی کی یاد میں گنوانا تھا۔ جہاں اس کے خواب رہ گئے تھے اس ناول میں اوپری متوسط طبقے کے لوگ بہت قریب سے زیرِ مطالعہ تھے لیکن ان کے آس پاس اور ان کے چاروں طرف

روساکی پرچھائیاں موجود ہیں۔ جنہیں بچھڑ جانے والوں نے چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے دیکھا تھا۔ اس میں ان لوگوں کی صدا ئے بازگشت ملتی ہے جو پہلے ایک شہر میں آباد تھے۔ اچانک ایک دن انہیں یہ خبر ملی کہ وہ کہیں اور کے ہوگئے۔ کچھ نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ ان کی روح کا ایک حصہ ان سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو مطمئن اور آسودہ حال تھے۔ قراۃ العین حیدر کے اس ناول میں ان لوگوں کی ذہنی اور روحانی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کو اپنی روحوں میں اس دکھ کے ساتھ جگہ دی تھی کہ ہماری زندگی کی آدھی لذتیں اور آدھے غم سرحد کے اس پار رہ گئے ہیں۔ ادھوری زندگی کا یہ احساس "میرے بھی صنم خانے" کا وہ بنیادی موضوع ہے جو اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا

اس شعر سے ملتی جلتی شعریت اس ناول کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ جدید ہندوستان میں آزاد ملک کے فوراً بعد جو بہت بڑا تہذیبی حادثہ رونما ہوا تھا۔ اس کی خبر ہمیں "میرے بھی صنم خانے" سے ملتی رہے گی۔ یہی اس ناول کا بنیادی خیال ہے۔ اس کی اشاعت سے قراۃ العین حیدر کا نام ابھر کر ایک اہم ادبی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے ہی نے چند کہانیاں لکھی تھیں۔ جن میں مغربی ماحول اور انگریزی الفاظ بلور کے ٹکڑوں کی طرح ملتے تھے۔ اس کے علاوہ خوشبوئیں اور حسن و رعنائی کی لہریں کہیں کہیں سے اٹھتی تھیں لیکن کوئی مکمل چہرہ یا کوئی مکمل بات سامنے نہیں آتی تھی۔

کم و بیش اسی زمانے میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے "شام اودھ" لکھا یہ ناول بھی لکھنؤ کی معاشرت سے متعلق ہے اور کامیاب ہے۔ لیکن اس کے کردار اپنے ماحول میں بند ہیں۔ قدروں کے بننے بگڑنے کے اسباب پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا موضوع محدود ہے۔ مجموعی طور پر یہ ناول ڈاکٹر احسن فاروقی کی قدامت پسندی کا اچھا نمونہ ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کے بعد عزیز احمد کے دو ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" شائع ہوئے۔ "شبنم" صرف ایک اسکینڈل کی حیثیت سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہ گیا ہے۔ حیدرآباد دکن کی ثقافتی زندگی میں جو تصنع اور روایتی انداز ملتا تھا۔ اس ناول میں اس پر جابجا طنز ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ "شبنم" جنسی اور سماجی ناآسودگی اور حیدرآباد دکن کی تہذیبی زندگی کی آلودگیوں کی کہانی ہے لیکن فنی اعتبار سے یہ ناول بے حد کمزور ہے۔ عزیز احمد جتنے اس ناول میں ناکام ہیں اور کسی ناول میں نہیں۔ ویسے عزیز احمد کے یہاں فن کو برتنے کا بہترین سلیقہ ملتا ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ کئی کامیاب ناول "ہوس" "آگ" اور "گریز" لکھ چکے تھے۔ ان کا یہ فنی تجربہ اور سلیقہ "ایسی بلندی ایسی پستی" کی تخلیق میں کام آیا۔ جسے عزیز احمد کا سب سے اچھا ناول کہنا چاہیے اور جس کا شمار ہمیشہ اردو کے اچھے ناولوں میں ہوتا رہے گا۔ عزیز احمد کی سب سے پہلی اہمیت تو یہ ہے کہ انہوں نے جدید ناول کو اس وقت ہمارے ادب میں فروغ دیا جب کہ ہمارے یہاں زیادہ تر افسانے لکھے جا رہے تھے۔ یورپ میں قیام اور وہاں کی تعلیم کے زمانے ہی میں انہوں نے ناول کے فن کو سلیقہ سے برتنا سیکھا۔ وہیں "گریز" کا سارا مواد اکٹھا کیا۔ لکھنے کی گہری امنگ بھی ان میں وہیں پیدا ہوئی۔ پیرس میں جو اجتماع ۳۵ء میں دنیا کے دانشوروں کا ہوا تھا۔ اس میں ادب کے ایک پرجوش طالب علم کی حیثیت سے عزیز احمد بھی شریک تھے۔ آزادی کے بعد جب وہ پاکستان چلے آئے تو حیدرآباد

دکن کی سماجی زندگی اور جاگیردارانہ مزاج پر کھل کر انہیں لکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے "ایسی بلندی ایسی پستی" میں ایک کھوکھلے جاگیرداری سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس ناول سے ان کے طبقاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ناول فنی اعتبار سے بے حد مکمل ہوتے ہیں۔ پلاٹ مکمل اور کرداروں کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن وہ تڑپ، اضطراب، کیفیت اور آورش ہمیں ان کے ناول میں نہیں ملتے جو قرۃ العین کے پہلے ناول ہی میں مل جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" تہذیبی زندگی کا حصار توڑ کر جدید عہد کے انسان کی بے قرار روح کا ترجمان بن جاتا ہے۔ عزیز احمد کے ناول فنی تکمیل کے باوجود جدید انسان کی ایسی کوئی تصویر نہیں ابھارتے۔ ان کے یہاں تہذیبی زندگی کی شکست و ریخت میں ماضی کے مٹنے کی داستان تو ملتی ہے لیکن مستقبل کے خوابوں کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے اُس آدمی کا پورا خاکہ نہیں بنتا۔ جس نے جاگیرداری سماج کے زوال کو اپنی کوششوں سے مکمل کیا۔ جس کی بدولت ایک عہد کی ناکامیاں اور نامرادیاں دوسرے عہد کی امیدوں میں ڈھل جاتی ہیں۔

درمیان میں اس سیاسی ادبار پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جس نے پاکستان میں رہنے والوں سے آزادی کی خوشی، چھین لی۔ شرنار تھیوں کی بربادی۔ تعلیم کی گراوٹ، نودولتوں کا عروج، مسلم لیگیوں کی اقتدار پسندی، اہل فکر کی مایوسی، ترقی پسندوں کی جذباتیت یہ سب رنگ آپس میں ایسے گڈمڈ ہو گئے کہ صرف جھوٹ، رشوت، بے شعوری، بے ضمیری اور بے ایمانی کے نام معاشرہ کے ترجمان بن گئے۔ ایک ایسی بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوئی۔ جس نے ہر آدمی کا دوسرے آدمی سے رشتہ کاٹ دیا۔ البتہ منافقانہ اتحاد اور چھوٹے ملاپ کے کچھ رشتے موجود رہے۔ جن سے نجات ممکن نہیں تھی۔ صوبائی تعصب، خاندانی تفرقہ، مختلف فرقوں کی عصبیتیں اس دوران میں شدت اختیار کرتی رہیں۔ کبھی قادیانیوں کو انسان نہیں سمجھا گیا کبھی شیعہ سنی صرف شیعہ سنی رہ گئے۔ کبھی مہاجر کا لفظ ایک گالی بن گیا۔ یہ سیاسی ادبار کی ایک ادھوری تصویر ہے اس کی تہہ میں غلط معاشی رشتوں کی کارفرمائی تھی۔ جو مختلف رنگ اختیار کرتی رہی۔ اسلام کے نام پر پاکستان حاصل کیا گیا۔ اس نام پر ہر ابن الوقت نے جھوٹ کو اس طرح فروغ دیا کہ اب کوئی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ کون کافر ہے کون مسلمان۔ اس مصیبت میں ایک اور بڑی مصیبت آکر شامل ہو گئی۔ جسے ہم لوگ سرد جنگ کا نام دیتے ہیں۔ اور جس کے محاذ ساری دنیا میں کھلے ہوتے ہیں۔ سرد جنگ کے دروازے ہی سے دوسری جنگِ عظیم کی تباہیوں کے بھرپور اثرات کا ہمارے معاشرہ کو پتہ چلا۔ اور لوگوں کو جنگ اور سرمایہ داری کے قریبی تعلق کا شدید ترین احساس ہوا۔ سرد جنگ ہی کے وہ گرم محاذ ویٹ نام اور مشرقِ وسطیٰ میں تیسری عالمگیر جنگ کے بھیانک اندیشوں کو ہوا دینے کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ دراصل دوسری جنگِ عظیم میں یورپ کی تباہی نے امریکہ کو آزاد دنیا کی سب سے بڑی قوت بنا دیا۔ جنگ کے دوران یورپ کے ملکوں نے اپنا سارا سونا امریکہ منتقل کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈالر کی قیمت بڑھی اور امریکہ نے آہستہ آہستہ ان ملکوں کو بھی اپنا معاشی غلام بنا لیا۔ جن کا سونا اس کے بنکوں میں محفوظ رہنے کے لئے جمع کرایا گیا تھا۔ اور اب تک وہیں جمع ہے۔ دولت کی بے انتہا فراوانی نے اقتدار حاصل کرنے کا جنون پیدا کر کے بساطِ عالم پر امریکیوں کو سو فیصد لیڈر بنا دیا۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا براہِ راست اور مسلسل ٹکراؤ ہے اس فضا میں اہلِ فکر اپنے آپ کو معاشرے سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگے۔ دنیا میں چند ادھوری تحریکوں نے مایوسیوں کو اور گہرا کر دیا۔ لے دے کر صرف اس جملہ کا سہارا باقی رہ گیا کہ آزادی ایک بڑی

ذمہ داری ہے ۔ لیکن اس جملہ کا استعمال بھی بے خوف وخطر کیا گیا۔ ان حالات میں جب زندگی کی بنیادیں اتنی کمزور ہوں تو زبان وادب کے مسائل سے دلچسپی چند لوگوں تک محدود ہو جاتی ہے اور ضمنی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ۔ اس پوری فضا کو سمیٹ کر جن لوگوں نے کچھ عرصہ کے بعد ناول لکھے ان میں اندھیرا زیادہ ہے روشنی کا حصہ کم کم ہے۔ لیکن اندھیرے میں روشنی کی ایک مسلسل تلاش ہے خدا کی بستی " خونِ جگر ہونے تک " اور آگ کا دریا کا مطالعہ اس عہد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

" خدا کی بستی " میں تمام تر یہی فضا ہے ۔ اس کے کردار ہمارے شہر اور عہد کے چلتے پھرتے کردار ہیں ۔ اس کا موضوع صنعتی شہر ہے ۔ اس کی خوبصورتی اور بدصورتی سے ہماری تہذیب کے مختلف چہرے ابھرتے ہیں ۔ شوکت صدیقی کے فن کا کمال اس بات میں مضمر ہے کہ وہ کرداروں کے چہروں کا سارا مصنوعی رنگ روغن ہٹا کر اصل خط وخال دکھاتے ہیں لیکن اس ناول میں دو بڑی خامیاں ہیں انہیں چھوٹے اور بڑے شہر کی زندگی میں کوئی فرق نہیں دکھایا گیا ہے اس نقص کی وجہ سے ناول کا اتار چڑھاؤ جس حد تک ہونا چاہیے نہیں ہوتا ۔ دوسری خامی یہ ہے کہ ایک ایسے اصلاحی گروہ پر بے شمار ابواب لکھے گئے ہیں ۔ جس کے افراد اپنی جذباتیت کے سبب ہمارے بڑے تہذیبی اور فکری نمائندے نہیں بن سکتے حالانکہ شوکت صدیقی نے اپنے ناول میں اس گروہ کو اس انداز اور اعتماد سے پیش کیا ہے گویا وہ ہمارے بہترین نمائندے ہیں ۔ نتیجہ کے طور پر وہ چند لوگوں کو اپنے محدود حلقہ میں بعض خطرات سے نجات دلا دیتے ہیں ۔ لیکن ہماری قومی زندگی پر جو بہت بڑا عذاب نازل ہے اپنے ضمنی اصلاحی کاموں سے اسکے عکس کو دھندلا دیتے ہیں ۔ وہ معاشرہ جو " خدا کی بستی " کا موضوع ہے ۔ ایک بڑا انقلاب چاہتا ہے ۔ اس ناول میں کوئی ایسا کردار نہیں جس کی تعمیر میں ایسی آدرش ، تپش اور لگن کا ساتھ ہو ۔ جو انقلاب کے قریب یا مفید ہونے کی خبر دیتی ہو ۔ البتہ شوکت صدیقی کے ناولٹ " کوکا بیلی " کے مقابلے میں اس کا ناول " خدا کی بستی " یقیناً ایک کامیاب تصنیف ہے ۔ " کوکا بیلی " ایک دلچسپ لیکن بے مقصد کہانی ہے ۔ لیکن " خدا کی بستی " میں ایک مقصد نظر آتا ہے ۔ اسی مقصد میں اس کی عظمت پوشیدہ ہے ۔

" خونِ جگر ہونے تک " مشرقی پاکستان کی سماجی زندگی پر اردو کا سب سے کامیاب ناول ہے ۔ مشرقی پاکستان بھوکے ننگے اور مسائل سے الجھے ہوئے انسانوں کا دیس ہے ۔ فضلی نے بنگال کی بھوک کو اتنی ہی شدت سے پیش کیا ہے جتنا بڑا اس کا مسئلہ ہے ۔ اس ناول میں قحط بنگال کے المیہ کی ایسی تصویر کھینچ گئی ہے ۔ جس کا تاثر کبھی زائل نہ ہوگا ۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اشتراکیت بھوکے ننگے انسانوں کا مداوا بن کر نہ آجائے ۔ فضلی اشتراکیت کے خلاف وعظ کی صورت میں اکثر بیشتر جگہ صفحے پر صفحے سیاہ کرنے چلے گئے ہیں ۔ اور جا بجا اسلام پر اچھا خاصا لیکچر دے جاتے ہیں ۔ اگر یہ حصے ان کے ناول سے نکال دیئے جائیں جو ناول کی تعمیر اور پلاٹ کو مجروح کرنے اور اصل قصے سے بالکل الگ نظر آتے ہیں اور کرداروں کے ارتقاء میں کوئی حصہ نہیں لیتے ۔ تو ان کا ناول زیادہ اہم ہو جائے گا ۔ دراصل ناول نگار کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے میں بے حد فنی احتیاط سے کام لینا چاہیے ۔ اگر ناول کے پلاٹ اور کردار فطری سے اصول نہیں ابھر سکے تو وہ چاہے اشتراکیت کے ہوں یا اسلام کے ۔ نہ صرف فن کی بنیادیں کمزور کر جاتے ہیں بلکہ زندگی کے براہ راست مطالعہ اور مشاہدہ میں حائل ہو جاتے ہیں ۔ " خونِ جگر ہونے تک " کا یہ نقص اسکی اہمیت ، افادیت اور عظمت کو گھٹا دیتا ہے ۔

دراصل اس عہد کے کسی ناول کو وہ عظمت نصیب نہیں ہوئی جو قرۃ العین کے ناول " آگ کا دریا " کو حاصل

ہوئی ۔ جس سے ایک قوم کی چار ہزار سالہ تاریخ کے پس منظر میں اِس سرزمین کی ساری تباہیوں کے باوجود وہ روشنی جو ہمیشہ سے آدمی کا سہارا ہے اور جس نے ہر حال میں اِسے زندہ رکھا ہے۔ دکھ اور سکھ کی تمام گھڑیوں میں زندگی کو مکمل طور پر اپنائے رہنے کی تمنا بن کر ابھری ہے۔ اِس ناول میں زمین سے انسان کا بہت گہرا رشتہ ملتا ہے ۔ اپنی زمین سے بچھڑ کر آدمی کو جو غم اٹھانے پڑتے ہیں ۔ ان کا جتنا شدید احساس اِس ناول میں موجود ہے۔ ہمارے ادب میں اِسکی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ۔ اور آدمی موسموں اور زمین کی برکتوں کے سہارے جن مسرتوں کو پالیتا ہے ۔ یہ ناول دوسری کتابوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہری باتیں بتاتا ہے ۔ اِس میں ہندوستان کے معاشرہ اور اِس معاشرہ میں آباد انسانی روح کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ آدمی کے سارے گہرے دکھ سمجھ میں آنے لگتے ہیں ۔ اِسکی وہ جستجو بھی جو اسے کسی منزل پر ٹھہر جانے سے روکتی ہے مجسم ہو کر سامنے آتی ہے اور ہر حصار کو توڑتی ، منزلوں کو گرد بناتی اِسے ہر منزل سے آگے لے جاتی ہے گوتم ایک بے قرار روح کا نام ہے ۔ جس نے آدمی کو سمجھنے اور اپنی ذات کے مرکز کو پانے کے لئے نہ صرف معاشرے کے سارے جھوٹ ترک کئے ۔ بلکہ گیان ، نروان جیسے بڑے ناموں سے بھی چھٹکارا حاصل کیا ۔ ان سارے علوم کو جن کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں حاصل کرنے کے بعد ہی زندگی کی سچی لگن پیدا ہوتی ہے ۔ گوتم راہ میں چھوڑتا ہوا آگے اِس جانب نکل جاتا ہے ۔ جو انسان کی خالص جستجو کی منزل ہے ۔ قرۃ العین حیدر نے اِسے مسلسل سفر کا نام دیا ہے ۔ ہند کی چار ہزار سالہ تاریخ کو اپنانے کا سبب بھی یہی ہے کہ آدمی کے نقشِ قدم مسلسل سفر میں ڈھونڈے جاسکیں ۔ ہندوستانی لباس ، وضع قطع ، رہائش کے آداب اور ماحول کے بارے میں قرۃ العین حیدر کے ناول کا یہ جملہ نہیں بھولنا چاہیے کہ "یہ سب جگہوں کا سحر ہے" ـــــ ہر زمین اپنا جادو جگاتی ہے ۔ جس کی خوشبو الگ اور پھولوں کے رنگ جدا ہوتے ہیں لیکن آدمی اس طلسم کو بھی توڑ کر آگے نکل جاتا ہے ۔ وطن سے گہری محبت کے باوجود آدمی کے لئے یہ ایک ضمنی شئے ہے کیونکہ اصل شئے خود محبت ہے ۔ اِس ناول میں آدمی کی محبت ایک بے کنار سمندر کی مانند ہے ۔ جو کائنات کی ہر شئے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہے ۔ ہمارا لٹریچر پہلی بار اِس ناول کے ذریعہ Myth سے آشنا ہوا ۔ اِس کا اساطیری انداز اِسی محبت کا کرشمہ ہے

اِس ناول میں قاری کی ملاقات ناقابلِ فراموش کرداروں اور انسانی روح کی قلمرو میں نئے نئے حقائق سے ہوتی ہے ۔ ایک بھکشنی جس کی عمر سو سال سے زیادہ ہے اپنی عبادت اور ریاضت کے لئے دُور دُور تک شہرت رکھتی ہے ۔ اس نے سولہ سال کی عمر میں ایک شہزادی کے حسین خوابوں سے منہ موڑ کر دنیا کو تیاگ دیا تھا ۔ وہ شانتی اور نروان کی باتیں بتاتی ہے ۔ لیکن اِسکی آنکھوں میں بھیانک خلا ہے جو روح میں شانتی کے بجائے گہرے سناٹے کی خبر دیتا ہے ۔ کتنا بڑا روحانی تضاد قراۃ العین حیدر نے دریافت کیا ہے ۔ چمپک کو ان آنکھوں میں دیکھنے سے بے انتہا خوف محسوس ہوا یہاں چمپک کو دنیا چھوڑنے کے پیچھے چھپے ہوتے اِس جھوٹ کا پتہ چلا جس نے ہمیشہ سے روحانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے چمپک دنیا میں لوٹ آتی ہے ۔ دنیا کو اپنانے کیلئے نہیں بلکہ گوتم کی محبت کو پروان چڑھانے کے لئے ـــــ گوتم جو ایک فنکار ہے ۔ وہ کسی جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتا ۔ لیکن اجودھیا کے نگار خانے سے نکلتے ہی اِسے چندر گپت کی فوجوں سے لڑنا پڑتا ہے ۔ یہ جبر اتفاقی نہیں تھا بلکہ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انسان اِسی جبر سے نکلنے کی مسلسل

کوشش میں مصروف ہے۔ یہاں ناول کا ایک نقطۂ عروج ملتا ہے۔ دو سطروں میں ایک مکمل رزمیہ سمو دیا گیا ہے۔

ہندو مسلمان سکھ عیسائی بدھ جینی سبھی اِس زمین کے بیٹے ہیں۔ علم تلوار اور سیاست سب کی شکست اِس ماں کی گہری محبت کے سامنے لازمی ہے۔ اسی لئے تقسیمِ ہند کی حیثیت اِس کتاب میں ایک سانحہ کی ہے زمین کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں وہ محبتیں جو زمین کی محبت کا حصہ تھیں تقسیم ہو کر نہ صرف ادھوری رہ گئیں بلکہ ان کے چہرے بگڑ گئے۔ گہری اور اداسی ان پر مسلط ہو گئی۔

وہ سارے بنیادی سوالات جو آدمی اپنے آپ سے پوچھتا آیا ہے۔ اِس ناول میں اٹھاتے گئے ہیں۔ ہر آدمی کیوں تنہا ہے۔ اِس روحانی تنہائی کے بعد معاشرہ اور محبوب کے کیا معنی ہیں۔ دھرتی آدمی کو کیا دیتی ہے آدمی دھرتی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ عورت اور مرد کے کتنے روپ ہیں۔ ان میں ان کا آخری روپ کیا ہے۔ علم سے آدمی کو کیا ملا۔ تاریخ نے آدمی کو کیا دیا۔ بڑی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ خدا کون ہے اور کہاں ہے۔ کس آگ نے انسان کا روپ دھارا ہے۔ غم کیا ہے مسرت کہاں ملے گی۔ ان سب سوالوں سے لپٹی ہوئی جب ایک فریاد ابھرتی ہے کہ آدمی ازل ہی سے ہنس بول کو جینے اور زندگی گزارنے کی معصوم آرزو رکھتا ہے تو تاریخ سمٹ کر چند لمحوں میں سما جاتی ہے جہاں آدمی آدمی کو پہچانتا ہے۔ اِس ناول کے کئی کردار یکے بعد دیگرے سامنے آکر بتاتے ہیں کہ زندگی اور موت سب بے معنی ہے البتہ جو لمحے مسرت اور محبت کے آدمی گزار لیتا ہے انہیں میں سکون بھی ہے موسم اور دھرتی کے سارے رنگ بھی وہی آوازوں کو بامعنی بناتے ہیں۔ انہیں سے انسانی روایت عبارت ہے۔ ان لمحوں کے گزارنے کا نام انسان کا روحانی سفر، روایت کی تازگی اور تجربہ ہے۔

بڑی کتابوں، اعلیٰ علوم اور مقدس اصولوں کو توڑ کر قرۃ العین حیدر نے آدمی کو ایسے سچے لمحوں میں تلاش کر لیا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ دوسروں کا بھی شناسا ہے۔ ذات کی معرفت کی اِس منزل میں آدمی جو کہتا یا کرتا ہے۔ سب صحیح بن جاتا ہے اسی لئے وہ یارستی گوتم جب ساری رات چمپک کے ساتھ رقص کر کے اور گوشت کھا کر صبح اپنے ساتھی طالب علم سے کہتا ہے کہ وہ صبا کے کنارے رات بھر تپسیا کرتا رہا ہے تو اِس پر اچانک انکشاف ہوا کہ وہ یہ جھوٹ بول کر علم و آگہی کے سفر اور تجربے کی دنیا میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے سینکڑوں میل آگے نکل گیا ہے۔

اِس ناول میں زندگی کی لذتوں سے یک گونہ بے نیازی برتی گئی ہے خیال و خواب کی تصویریں بے حد مکمل ہیں لیکن راتیں خوبصورت ہونے کے باوجود تنہا اور بستر سونے ہیں۔ راگ رنگ کا ذکر بہت ہے روحانیت اور مادیت کی چپقلش بھی ہے۔ لیکن وصل کی ساعت اور جسم کی خوشبو اِس ناول میں کم کم ہے۔ ایک طرف اِس ناول میں دھرتی موسموں کا روپ دھارے مسلسل ہنستی اور مسکراتی ہے۔ دوسری طرف انسانی جسم کی آگاہی سے جو دھرتی ہی کی مٹی، مہک اور بوباس سے تخلیق ہوا ہے گریز کیا گیا ہے۔ دھرتی نے کیچڑ سے آدمی کے جسم کو کنول کی طرح کھلایا ہے۔ اِس سلسلے میں پورے ناول میں صرف ایک جملہ چمپک کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ جو گوتم کے پاس ایک عورت سے یکھلا کر سمجھتی ہے کہ وہ کیا جانے پتی ورتا عورت کسے کہتے ہیں۔ چمپک کا یہ جملہ رسم و رواج کی قیود سے آزادی ملا کر انسانی مسرت کی تلاش میں ہمیں دور تک لے جاتا ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ محبت کے افسوں کو ناول نگار نے جسم اور آغوش سے الگ رکھا۔ یہ بات قرۃ العین کے علاوہ کوئی دوسرا کیسے بتائے گا۔ کیونکہ ناول نگار کی زندگی ہی میں اِس کا سبب پنہاں ہو سکتا ہے۔

قرۃ العین نے اور بھی کئی اہم باتیں چھوڑ دی ہیں۔ یا وہ اِس سے ہٹ گئی ہے۔ اِس نے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ

بادشاہوں سے شروع کرنے کی غلطی کی ہے اور اس عہد کا آغاز دربار کے ایک معمولی کردار سے کیا ہے۔ جس تہذیب کے نمائندے
خسرو، ابوالفضل، فیضی، عبدالرحیم خانخاناں، ملک جائسی، کبیر داس، میر اور غالب ہیں۔ اسے بھی ناول نگار نے اگر ناول
کے صفحات پر مناسب جگہ دی ہوتی تو ہندوستان کے موسموں کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہوتا۔ اس میں تاج محل کی خوبصورتی اور
اور تان سین کی موسیقی بھی شامل ہو گئی ہوتی۔ جہانگیر اور اس کے ماموں مان سنگھ اور ملکہ نور جہاں کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ
مغلوں نے ہندوستان کو کس تہذیب سے آشنا کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین ناول کا دوسرا حصہ لکھتے وقت پاکستانی مسلمان
کے کردار سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔

اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی دو باتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اس میں شعور کی رو Stream
of Consciousness ملتی ہے اور قرۃ العین حیدر ورجینا وولف سے متاثر ہیں۔ ان کی تنقید پڑھ کر اس احساس سے
دل کانپ جاتا ہے۔ ہمارے ملک کا ہر انگریزی کا ایم اے اور پی ایچ ڈی اپنے آپ کو تخلیق کرنے والوں سے افضل سمجھنے اور نا سمجھی باتوں کو ادبی
تنقید کا درجہ دینے لگا ہے۔ قرۃ العین کے اس ناول میں شعور کی رو کے ساتھ ساتھ لاشعور کی رو بھی ملتی ہے کیونکہ یہ ذہن کی کتاب ہے یہاں
شعور و لاشعور پر پابندی نہیں ہے۔ دراصل ناول کی ٹیکنک کے نام سے انگلستان والوں نے بہت سی بحثوں کا آغاز کیا ہے
لیکن فرانس اور روس کے لوگ دنیا کے ادب میں مسلسل بڑے ناولوں کا اضافہ کرتے رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے
ناول کو ناول ہی لکھا اور زندگی کے تازہ بڑے اور بے باک تجربات ہی پر ہمیشہ فن کی بنیاد رکھی۔ "آگ کا دریا" بھی ٹیکنک
کے تجربے کے بجائے زندگی کے ایک بڑے تجربے کو پیش کرتا ہے۔ اس میں انسانی عظمت اور زندگی کے ادراک کی بہت اعلیٰ
سطح ملتی ہے۔

"آگ کا دریا" کے بعد تین چار سال کے عرصے میں پاکستان میں کئی ناول لکھے گئے۔ لیکن ان میں خلوص، مشاہدہ
تجربہ اور احساس سبھی کی بے حد کمی ملتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم جی انعام کے حصول کی خواہش نے کچھ لوگوں کے قلم کو
صبا رفتار بنا دیا ہے۔ ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" بے حد ضخیم ناول ہے۔ جسے جیسا کہ سنا گیا ہے۔ صرف ایک سال
کے عرصہ میں جلدی جلدی مکمل کیا گیا تھا۔ اس ناول کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس سال یہ چھپا اس سال کا
آدم جی انعام اس کے بجائے ایک اور ناول "تلاشِ بہاراں" کو دیدیا گیا۔ جسکی مصنفہ جمیلہ ہاشمی ہیں۔ "تلاشِ بہاراں"
کی کہانی دو چار ابواب میں مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صرف کہی ہوئی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ وہی مناظر، وہی
کیفیات، وہی رشتے لوٹ لوٹ کر سامنے آ جاتے ہیں جنہیں شروع میں بیان کر دیا گیا ہے۔ زندگی کے تصنع اور فریب
سے نکلنے کے لئے جو راہ نکالی گئی ہے۔ وہ موجودہ عہد کے عریاں جھوٹ سے بھی زیادہ مکروہ ہے "تلاشِ بہاراں" ایک
بیمار ناول ہے۔ اسکے کردار ادھورے اور نامکمل ہیں۔ ناول کے اختتام پر سارے تاثرات گڈمڈ ہو جاتے ہیں "علی پور کا
ایلی" اس سے بہتر ناول ہے۔ اس میں تفصیلات کی بے جا طوالت تو ضرور ہے۔ لیکن زندگی کی کہانی مسلسل ارتقا پذیر
رہتی ہے۔ قصہ بہت فکر انگیز اور دلچسپ نہ سہی لیکن سچا ضرور ہے۔ ممتاز مفتی جن جنسی الجھنوں پر افسانے لکھتے رہے
ہیں۔ ان کے مطابق اس ناول میں بھی کردار ملتے ہیں۔ لیکن ناول تمام کرداروں کے مجموعی عمل سے اگر ایک بڑا نتیجہ
اخذ کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ تو اسے اہم ناول نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے یہ گھٹیا ناول ہے۔ جس میں ایک مخصوص

ماحول کی تھوڑی بہت عکاسی ملتی ہے۔ ایک مخصوص کردار کے گرد چند اور کردار بھی کچھ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ کام طویل افسانے سے بھی لیا جا سکتا تھا۔ ناول کے پھیلاؤ میں کسی قوم کا نوحہ، کسی تہذیب کے عروج و زوال کی داستان، یا انسانی جدوجہد کی کوئی بڑی کہانی ہی سما سکتی ہے۔

"اداس نسلیں" ایک ایسے شخص کی تحریر ہے۔ جس نے پہلی بار ادب کی دنیا میں قدم رکھا ہے اور قدم رکھتے ہی اسے ادبی انعام سے نواز دیا گیا۔ اس کے ناول کا عنوان اِس عہد کے آدمی کے لئے بے حد کشش رکھتا ہے۔ ہمارے عہد کی کہانی اداس نسلوں کی بھی کہانی ہے۔ وہ جنگوں کے تھکے ہوئے لوگ جن کے حصے میں نہ تو خدا آتے اور نہ رسول نہ زندگی کے عیش کی فراوانی آتی اور نہ آرام و سکون کے لمحات۔ یہ لوگ یا تو شہروں کے ہجوم میں کھو گئے ہیں یا دیہات کے افلاس میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر عبداللہ حسین نے عنوان کے ساتھ انصاف کرتے ہوتے ناول لکھا ہوتا تو اس کے حصے میں روح عصر کا بھی کچھ حصہ آجاتا۔ لیکن اس نے موجودہ نسل کی اداسی کو اتنا چھوٹا کر کے دکھایا ہے کہ نہ اس نسل کی کوئی تصویر بن پاتی ہے اور نہ ماضی اور حال کی روایت سے اِس نسل کو کوئی پیغام ہی ملتا ہے۔ انسانی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوئی بڑی کوشش اِس ناول میں نہیں ملتی ایک معمہ ضرور سامنے آتا ہے کہ آدمی، آدمی کا ماضی یا اس کا ماحول کون اِس نسل کی اداسی کا ذمہ دار ہے ہونا یہ چاہیئے تھا۔ کہ کرداروں کی آویزش سے خود بخود وہ روشنی نمودار ہو جاتی جو اِس ناول میں نہیں لیکن موجودہ دور کی اداس نسلوں کو مستقبل کی طرف لئے جا رہی ہے۔ کسی دوسرے ناول نگار کو چاہیئے کہ اِس عہد کی اداس نسلوں کی کہانی لکھے۔ سرد جنگ کی تباہی، اشتراکیت اور سرمایہ داری کی خوفناک کشمکش، اصول پرستی اور انسان دوستی کے تضاد سے اِس عہد کے ناول اور فن کا خوبصورت آغاز ممکن ہے۔ لیکن یہ ذمہ داری عبداللہ حسین نے اپنی حد تک دوسروں پر ڈال دی۔ ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ایسی ویسی نہیں ہیں۔ انکو دیکھکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین تحریر اور آدمی کے رشتے کا قائل ہی نہیں ہے۔

"آنگن" اور "آبلہ پا" اِس کے بعد کے ناول ہیں۔ "آبلہ پا" ایک کچے ذہن کی پیداوار ہے۔ جو رومان پسند ہے رضیہ فصیح احمد زندگی کے دکھوں سے ناآشنا ہے۔ اِس کے ناول کے کردار رقت آمیز انداز میں زندگی کے دکھوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ناول کی کہانی فرسودہ ہے۔ یہی کہانی ہمارے یہاں کے تفریحی اور گھریلو ناولوں میں بار بار دہرائی گئی ہے چند گھرانے جو ایک خاص وضع قطع کی زندگی گزارتے ہیں۔ کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کو ملا کر رہن سہن کا ایسا ماحول بنا لیتے ہیں جس میں رسم و رواج کی شدت سے پابندی ہوتی ہے۔ بعض کرداروں کو بہتر سماجی حیثیت حاصل ہونے کے سبب یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو لبرل ظاہر کریں۔ ان میں اچھے اور بے تکلف کرداروں کے دوش بدوش خراب اور بد خلق کردار بھی ہوتے ہیں۔ یہ سارے کردار آپس میں خالہ زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، چچا زاد بھائی ہیں۔ اور خود پھوپھی پھوپھا، خالہ خالو، ممانی ماموں، چچا اور چچی وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان سے جو کہانی بنتی ہے وہ یہ کہ ایک بے شعور طبقہ اپنی ذہنی کم مائگی کو خود سے چھپا کر ہنسنے بولنے کے ہزار پہلو نکال لیتا ہے اور مجبوری پر اِس بے شعوری کو شریفانہ زندگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ کھاتے پیتے متوسط طبقے کے خوش باش گھرانوں کی داستان ہے۔ "آبلہ پا" میں اِس کہانی کے ساتھ عورت کی کہانی بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن صرف اِس حد تک کہ وہ مرد کے ظلم کا شکار ہے۔ مرد اور عورت کی زندگی کو پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ مصنفہ نہ محبت کی سپردگی سے واقف ہے اور نہ انسانی فطرت کے رموز سے عورت کی

تصویر مرد کے ظلم کے ردِ عمل کے ذریعہ پیش کرنا عورت اور مرد دونوں کے ساتھ نا انصافی ہے۔ ظلم ہی کی بنیاد تلاش کرنا ہے تو یہ دیکھیں کہ تاریخ کے صفحات پر عورت اور مرد دونوں نے کس کس طرح ظلم برداشت کیا ہے اور یہ سوچیں کہ ظلم کس خواب کے سہارے سہا گیا اور انسانی جد و جہد ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے۔ اسی لئے "آبلہ پا" میں گھٹی ہوئی زندگی کا عکس تو ملتا ہے لیکن اس سے کوئی سچائی نہیں ابھرتی۔

"آنگن" یقیناً ایک اچھا ناول ہے چھمیا کا کردار اس ناول میں بڑا جاندار ہے۔ اس میں بڑی قوت ہے اور عالیہ خیال کی لطافت اور حسن کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ چھمیا زندگی گزارتی ہے۔ اس کے نشیب و فراز سے بے دھڑک گزرتی چلی جاتی ہے۔ عالیہ خواب دیکھتی ہے یہ دو کردار ناول کی دو سمتیں ہیں۔ جن سے ہمیں اپنے معاشرے کی وسعت اور حدود کے علاوہ آدمی کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے لیکن "آگ کا دریا" کے بعد ایک ایسے ناول کی فضا ہموار ہے۔ جس میں اداس نسلوں کی کہانی پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کے سہارے بیان کی جا سکتی ہے۔ جس میں "خدا کی بستی" کے نوشا اور گنوران کے کرداروں ہریا اور دھنیا کی قوت کو ایک نئے آہنگ کی صورت میں آزمایا جا سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر عصری شعور کے عذاب سے دامن بچا کر گزر گئیں۔ آج محنت کشوں کی زندگی میں انقلاب کی وہ قوت پوشیدہ ہے جو کسی چابک دست ناول نگار کی توجہ کی منتظر ہے۔ ہمارے عہد کی بے شمار ایسی کہانیاں ہیں۔ جن کی کوکھ سے نئی دنیا جنم لے گی۔ آج کے ادیب انہیں کہانیوں کی تلاش میں کبھی اپنے آپ سے خفا نظر آتے ہیں۔ اور کبھی یورپ کے تہذیبی زوال کے دائرے سے نکل کر اس مٹی کو اپنانا چاہتے ہیں۔ جو انہیں نئے خواب دکھلا رہی ہے اور مغرب و مشرق کی تفریق مٹا کر انسان کو ایک نیا مستقبل عطا کرنے والی ہے۔ ہمارے ناولوں میں بھی آئندہ وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ تیسری جنگ کے اندیشوں سے ایک پیکار میں مصروف زندگی کی وہ اقدار ملیں گی۔ جن سے ایک بین الانسانی معاشرہ کا تصور اور اسکے عزائم وابستہ ہیں۔

آغا افتخار حسین

ہیلی بری کالج میں مشرقی علوم کی تعلیم

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کا تربیتی ادارہ

اٹھارویں صدی کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی حیثیت تجارت پیشہ افراد سے بڑھ کر حاکموں کی ہو گئی تھی۔ ان ملازمین نے ملک کی غیر یقینی سیاست اور خاندان مغلیہ کی حکومت کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کے نظم و نسق میں کافی موثر طور پر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اب ملازمین کے دائرۂ اختیار و عمل میں عدالت، مال، سیاست اور خزانہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت لارڈ ویلزلی نے محسوس کیا کہ ان فرائض کی ادائیگی کے لئے ایک مخصوص تعلیمی اور تہذیبی پس منظر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے کمپنی کے ڈائرکٹرز کی توجہ اس طرف دلاتے ہوئے لکھا کہ کمپنی کے ملازمین کو ایک ایسے ملک میں انصاف اور انتظام کے فرائض انجام دینا ہیں جس میں کروڑوں انسان آباد ہیں اور جس کے مختلف حصوں کی زبانیں، طرز رہائش، مذہب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک مخصوص تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ لارڈ ویلزلی ڈائرکٹرز کے نام اپنے مراسلے میں لکھتا ہے[۱]:

---

1) "Extracts from the Governor General's Notes for an official despatch to be forwarded to the Court of Directors, with respect to the Foundation of a College at Fort William" July 10. 1800.
A. K. Ghosal,
Civil Service in India under the East India Company. (Calcutta, 1944) ۲۹

"کمپنی کے ملازمین کی تعلیم سائنس اور ادب سے متعلق عام معلومات پر
مبنی ہونی چاہیئے جو عموماً یورپ میں اس قسم کے عہدوں کے لئے ضروری ہے
لیکن اس بنیاد کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ لوگ ہندوستان کی تاریخ،
زبانوں، رسم و رواج، اور اخلاق و عادات سے واقف ہوں ــــ اس کو اس
قسم کی عادات اختیار کرنی چاہئیں کہ محنت، دور اندیشی، دیانت اور مذہب
کی بنیادیں ان کے ذہنوں میں مضبوط ہو جائیں، اور وہ ان ترغیبات، اور
تحریصات کا مقابلہ کرسکیں جو ملک کی آب و ہوا اور ہندوستان کے لوگوں کے
فسق و فجور کی وجہ سے تقریباً ہر مقام پر انہیں دعوت دیں گی" [1]

چنانچہ کمپنی کے ملازمین کی تعلیم و تربیت کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوگیا، جس میں دیگر مضامین کے علاوہ اردو کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ اور تصنیف و تالیف کا بھی انتظام تھا۔ اس کالج کے کارناموں سے اردو زبان کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

[1] ان "تحریصات" سے غالباً لارڈ ویلزلی کمپنی کے ملازمین کی رشوت ستانی کی اس قابل مذمت روایت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی وجہ سے کمپنی کے اعلیٰ افسر بھی واپس انگلستان جاکر بدنام ہوئے۔ مثلاً سراج الدولہ کے خلاف میر جعفر کی مدد کرنے کے سلسلے میں لارڈ کلائیو نے دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ رشوت لی۔ کمپنی کے دیگر ملازمین نے ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ لئے۔ دیکھئے:

A. Mervyn Davies, Clive of Plassey (London 1939) صفحہ ۲۳۴

اس بداعمالی کی ذمہ داری ہندوستانیوں کے فسق و فجور پر کس حد تک ڈالی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں ملازمت کرنے کے لئے منتخب کئے جانے کے لئے عموماً ایک "قیمت" ادا کی جاتی تھی جو کمپنی کے ڈائرکٹرز وصول کرتے تھے۔ مثلاً انگلستان کے دارالعوام کی تقریروں میں کم از کم دو مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں یہ عہدے "فروخت" کئے گئے۔ ان میں سے ایک عہدہ مدراس کے لئے تھا جو تین ہزار پونڈ میں "فروخت" ہوا۔ اور دوسرا عہدہ بنگال کے لئے تھا جس کا سودا "تین ہزار پانچ سو پونڈ" میں طے ہوا۔ دیکھئے:

House of Commons, Parliamentry Papers 1809, "Report from the Committee appointed to inquire into the existence of any abuses in the disposal of patronage of the East India Company."

۱۸۰۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے محسوس کیا کہ کمپنی کے ملازمین کی تربیت کے لئے ایک کالج انگلستان میں قائم کرنا چاہئے۔ چنانچہ چارلس گرانڈ نے اس مسئلے کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی جس میں رائے دی گئی کہ جن انگریزوں کو ہندوستان میں ملازمت کے لئے بھیجا جائے انہیں کلاسیکی (یونانی اور رومن) انگریزی اور یورپین ادب اور سائنس، سیاسی معاشیات کے علاوہ مشرقی علوم کی بھی تعلیم دی جانی ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۸۰۵ء میں لندن سے بیس میل دور ہیل بری کالج کا قیام عمل میں آیا۔

اس کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے سب سے پہلے جوناتھن اسکاٹ کا تقرر ہوا۔ لیکن جلد ہی کالج کے ارباب حل وعقد سے اختلاف کی وجہ سے اسکاٹ نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد جان گلکرسٹ نے اسکاٹ کی جگہ لی، اور اس کے بعد چارلس اسٹوارٹ فارسی اور ہندوستانی کے استاد مقرر ہوئے۔

یورپین پروفیسروں کے علاوہ پٹنہ کے غلام حیدر فارسی کے اور عبدالعلی ہندوستانی کے استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد کلکتہ کے مرزا خلیل بھی ہندوستانی کے اساتذہ میں شامل ہوگئے۔ کالج میں ملازمت کرنے کے کچھ ہی عرصے بعد غلام حیدر اور میر عبدالعلی نے انگریز عورتوں سے شادیاں کیں اور کالج کے قریب ہی آباد ہوگئے۔[1] عبدالعلی کی موت نہایت عسرت میں ہوئی۔ انہوں نے ایک بیوہ اور کئی بچے چھوڑے۔ لیکن بیماری کے دوران علاج اور کفن دفن کے لئے رقم بھی پس انداز نہ کر سکے۔[2]

ہیل بری کالج میں فارسی اور ہندوستانی کی تعلیم جس انداز سے دی جاتی تھی اس کا ذکر ایچ. جی. کین (H.G. Keene) نے اس طرح کیا ہے:-

---

1) Bernard S. Cohn, "Recruitment and Training of British Civil Servants in India, 1600-1860:" in, Ralph Braibanti; Asian Bureaucratic systems Emergent from the British Imperial Tradition. (Durham U.S.A. 1966)

(صفحہ — ۱۲۱)

2) Commonwealth Relations office, Committee on College References. Vol. 25, 1812, Henley to Committee, October 14, 1812, "Petition of Moonshee Ghoolam Hyder" Sept. 4, 1812; Dr. Samuel Jones to Committee, November 24, 1812, "Petition of Elizabeth Moolvey."

"جب طلبہ کالج میں تعلیم شروع کرتے ہیں تو پروفیسر انہیں ہر حرف کی شکل
اور مخصوص آواز سمجھاتا ہے۔ خصوصاً اس فرق کی وضاحت کی جاتی ہے جو مشرقی
زبانوں اور ان الفاظ کے تلفظ میں ہے جن سے طالب علم پہلے سے مانوس ہے۔
پروفیسر تلفظ کو باربار دہراتا ہے اور اس مشق میں آہستہ آہستہ طلبہ الفاظ کا تلفظ
اس حد تک صحیح اور روانی سے ادا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس کی ان سے توقع
کی جا سکتی ہے۔ اسی عرصے میں کالج کا منشی (جو بنگال کا رہنے والا ہے) طلبہ کو
حروف لکھنا سکھاتا ہے۔ اور ان کا تلفظ درست کرتا ہے۔ جب طلبہ حروف اور
قواعد کے عام اصولوں سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں تو وہ آسان عبارتیں پڑھنا
اور ان کا ترجمہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پروفیسر ہر لفظ کے تلفظ کو صاف صاف
بیان کرتا ہے اور قواعد کی تراکیب سمجھاتا ہے۔ ان سے انگریزی سے ترجمہ بھی کرایا
جاتا ہے جو وہ زبان کے مخصوص رسم الخط میں لکھ کر پروفیسر کو دکھاتے ہیں۔
اور اس طرح ان کی تحریروں میں قواعد اور املا کی غلطیوں کی تصحیح کی جاتی ہے۔"[17]

ہر طالب علم کے لئے تین یا چار مشرقی زبانیں سیکھنا ضروری تھیں۔ سنسکرت اور فارسی ہر طالب علم کے لئے ضروری تھی۔ اس کے علاوہ جس پریذیڈنسی میں طالب علم کا تقرر کیا جانا مقصود ہوتا تھا اس کی زبان بھی سیکھنا ضروری تھی۔ بعض طلبہ عربی بھی پڑھتے تھے۔

اگر کسی طالب علم کا تقرر بنگال میں کیا جاتا تھا تو اسے ہندی اور بنگالی سکھائی جاتی تھی۔ ہفتے میں دو گھنٹے سنسکرت اور دو گھنٹے بنگالی یا ہندوستانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدا میں سنسکرت کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا۔ لیکن بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں سرکاری کام کے لئے یہ زبان سیکھنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ چنانچہ سر چارلز میکل جو سنسکرت کو

---

17 East India Company Proprietors, General Court Papers Respecting the System of Education in the Oriental Languages Adopted at the East India Company's College and Seminary in England (London: Printed by Order of the General Court of Proprietors' December 19, 1821)

H. G. Keene to Wilkins, December 10, 1821. P. 10.

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

عتیق احمد

ترقی پذیر ممالک میں تہذیب کا مسئلہ

یہ عنوان سرسری مطالعے میں ایک غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہے۔ یعنی اِس موضوع سے جو بات پہلے پہل سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے۔ کہ یہ دنیا جس میں آج کل ہم بستے ہیں۔ دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ وہ جو ترقی یافتہ ہے اور دوسرا وہ جو ترقی پذیر ہے اِس تقسیم کے اعتبار سے اور موضوع زیرِ بحث کی رو سے مطلب یہ نکلے گا۔ کہ وہ ممالک جو آج ترقی یافتہ ہیں۔ وہ پورے طور پر متمدن اور مہذب ہیں۔ لہٰذا وہ اِس قسم کا کوئی غم نہیں پالتے۔ اب ہر وہ ملک جو آج کل کی زبانیں ترقی پذیر کہلاتے ہیں۔ وہ چونکہ غیر متمدن اور غیر مہذب ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ ان ہی کا دردِ سر ہے کہ وہ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونے کے لئے مہذب اور متمدن بنیں۔ اور اِس کے لئے انہیں اپنی ایک تہذیب کی تلاش درپیش ہے۔ یہ اِس موضوع کے سرسری مطالبات ہیں۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ ہم میں سے بعض ان خطوط پر سوچتے ہی ہوں۔ مگر جیسا کہ میں نے دو مرتبہ عرض کیا ہے۔ کہ یہ صرف ایک سرسری مطالبہ ہے۔ اِس لئے کہ صورتِ حال یہ ہے کہ اِس کرۂ ارض کا اِس حصے میں جسے ہم نہ جانے کن غلط فہمیوں کے تحت مکمل اور مہذب دنیا کہتے ہیں۔ گذشتہ تیس پینتیس سال سے ہر دو چار سال کے بعد "تہذیب کی تلاش" پر کوئی نہ کوئی زبردست طعینا ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ قریب قریب ہر سال ہی دو چار کتابیں اِس موضوع پر چھپتی رہتی ہیں۔ گویا یہ متمدن اور مہذب دنیا بھی بالکل ہم "غیر مہذب" لوگوں کی طرح ہی تلاش تہذیب کے خلجان سے دو چار ہے۔ لہٰذا موضوع زیرِ بحث کی یہ تشریح اور تفہیم غیر منطقی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس صدی کی پانچویں دہائی کے نصف آخر سے اب تک جن ممالک نے بیرونی طاقتوں کی نوآبادی ہونے کا جوا اتارا ہے۔ یا شہنشاہیت سے نجات پائی ہے۔ یہ مسئلہ دراصل ان کا ہے۔ مثلاً چین نے سن یات سن کی قیادت میں جو جدوجہد ۱۸۹۵ء میں (CHINA REVIVE PARTY) کے جھنڈے تلے شروع کی تھی۔ وہ ۱۹۴۹ء میں جا کر کہیں بارآور ہوئی ہندوستان کی جدوجہد آزادی جو لگ بھگ اسی دور سے شروع ہوتی ہے وہ ۱۹۴۷ء میں جا کر کہیں کوئی شکل پا سکی۔ پھر انڈونیشیا ملایا کی باری آئی۔ ادھر گذشتہ دس سالوں سے ایسے ممالک کی تعداد میں ہر سال دو چار کا اضافہ ہو رہا ہے۔ الجیریا۔ تیونس مراکو سے کر شمالی اور جنوبی افریقہ کی بیسوں نئی مملکتیں وجود میں آ چکی ہیں۔ اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ جب کوئی ملک اپنی نئی زندگی شروع کرے گا۔ تو اس کے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہونا لازمی ہے کہ وہ اپنے ثقافتی ورثے کی اِس طرح تشکیل کرے جو اُس کے اندر سے تمام بیرونی اثرات کو دور کر سکے یا ان اقدار کی اپنے ثقافتی ورثے کی روشنی میں تشکیل نو کر سکے

رکھنے کی نیت سے ٹھونپ دیتے تھے۔ اور یہی اِس
بیرونی قوتیں اپنی برتری مسلط رکھنے کی خاطر یا اپنے ثقافتی اثر کو بالادست
موضوع کی حدود اور وسعتیں ہیں۔ چنانچہ آج کی مجلس میں یہ غور کرنا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد اور ترقی پذیر ملکوں میں
اِس سلسلے میں کیا رجحانات پائے جاتے ہیں؟ اور یہ کہ کیا یہ ممالک تشکیل تہذیب کے کچھ اشارے پا سکے ہیں؟ ان اشاروں کی
نوعیت کیا ہے۔؟ اور مستقبل میں کس قسم کی تہذیب کے پنپنے کے امکانات ہیں؟ اور کیا یہ تہذیب خالص مشرقی ہوگی یا دونوں کے
امتزاج کی کوئی نئی شکل؟

جن ممالک کا موضوع سخن سے تعلق ہے ان کی نوعیت یہ رہی ہے کہ وہ یا کسی بیرونی طاقت کے براہِ راست زیرِ اقتدار
تھے۔ یا بالراست طور پر اندرونی اور ملکی عناصر کے توسل سے بیرونی اثرات کی بالادستی کے شکار تھے۔ انڈونیشیا، ملایا
ملائشیا، ہندوستان، پاکستان اور تمام افریقی ریاستوں پر انگریز، ولندیزی، فرانسیسی اور امریکی تسلط اقتدار اور اثرات
کی حکمرانی کہیں سو، کہیں دو سو اور کہیں اِس سے بھی زیادہ سالوں کی مدت سے چلی آتی تھی۔ چین کی صورتِ حال البتہ قدرے
مختلف تھی۔ مگر یہاں بھی شہنشاہی بالادستی کے توسل سے وہی کچھ ہو رہا تھا۔ جو دوسرے ملکوں میں تھا۔ صدیوں سے ان
ممالک کے افراد غیروں کی نام نہاد فلاحی اور تعمیری اصلاحات اور کوششوں کے نام پر زندگی کی مراعات اور سہولتیں اِس بھیس
میں وصول کر رہے تھے۔ کہ ان کی تعلیم، تربیت، اخلاقیات، ذوقِ جمال، اقدارِ نیک و بد سے لے کر فلسفہ، عمرانی علوم سیاست
اور تصورِ حیات و کائنات کا حلیہ بگاڑا جا رہا تھا۔ بیرونی واعظانِ بہار کی چالیں کچھ اتنی باریک تھیں کہ محکوم ممالک کا ذہن ان
ٹیڑھی اور چلتر کاریوں کے دائرے کے خطوط کو جانچنے اور پہچاننے سے عاجز تھا۔ یہ قوتیں ایک عام حربہ ہمیشہ ہی برتتے کار لاتی رہی
تھیں۔ وہ ہر مقامی رنگِ حیات پر اپنے شوخ و تند رنگ کی وہ ملمع کاری تھی۔ جس کی چمک دمک کے سامنے وہ رنگ پھیکے
پڑ جاتے تھے۔ جن کی ننھی منی ہزار صد شعاعوں اور کرنوں میں مقامی زندگی کی روح جلوہ گر ہوتی یا نبض کی دھڑکن بنی جاتی
تھیں۔ اپنے اِس کھیل میں ہمیشہ انہوں نے یہ چال روا رکھی کہ ممالک محروسہ کے کسی ایسے زوال پذیر عنصر یا فلسفے کی پیٹھ ٹھونکتے
رہے۔ جس میں وہ ملک یا قوم خود ہی نئے حالات اور زمانے کے تحت ضروری تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ مثلاً یہ عجیب و غریب
بات تھی کہ چینی قوم جو کنفیوشس کے فلسفۂ حیات کی ڈھائی ہزار سالوں سے رہینِ منت رہتی چلی آئی تھی۔ اور جس فلسفے نے
چینی قوم کو اس دور میں دنیا کے لئے علم اور آگہی کی روشنی کا منارہ بنا دیا تھا۔ جب ابھی کرۂ زمین پر انسان کی تہذیب کی تاریخ
کے اولیں نقوش ڈھنگ سے مرتب بھی نہیں ہونے پاتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہی چینی قوم بار بار کنفیوشس کے
نظریہ خاندان کے اِس حصار سے نکلنا چاہتی تھی۔ جس نے خاندانی اکائی اور وحدت کی شکل میں تے او (TAO) اور مانچو
قبیلوں کے نالائق اور ناکارہ افراد کو ان کی گردن پر پیر تسمہ پا کی حیثیت سے "سورج کا بیٹا" بنا کر بٹھا دیا تھا۔ مگر انگریز
اور جاپانی تجار بالکل ایسٹ انڈیا کمپنی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوتے اپنی تجارتی مراعات کے لالچ میں اگر ایک طرف بار بار
اِس حصار کی گری پڑی اینٹوں سے شہنشاہیت کی گرتی ہوئی دیوار کے رخنے اور دراڑیں بھرنے میں لگے ہوتے تھے۔ اور اِس
طرح کنفیوشس کے فلسفے کی آڑ میں جدید چین کی انقلابی جد و جہد کی راہ میں بند باندھ رہے تھے۔ تو دوسری طرف یہی
تجار اور غیر ملکی مبلغین آہستہ آہستہ عیسائی تہذیب اور تمدن کی ملمع کاری بھی کرتے جا رہے تھے۔ برِصغیر پاک و ہند میں
بھی یہی باریک چالیں چلی جا رہی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ولندیزی اور فرانسیسی تجار نے برصغیر کی ثقافتی، معاشی اور تجارتی

سگی کی تباہی کا جو جال اٹھارہویں صدی میں بچھایا گیا تھا۔ اس کی تہہ میں ریشہ دوانیوں کا حال ہم پر جب کھلا جب انگریز ایسٹ
یا کمپنی کے مرداِ خورگدھ نے ولندیزی اور فرانسیسی تاجروں سے ہندوستان کے شمالی و جنوبی ساحل کو آزاد کرانے کے بہانے
یغر کے جسم و ذہن پر اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ شہزادہ بخت عالم کا خون پی جانے کیا پایا کہ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کے ہیروں
، شرافت، نجابت، مروت اور یگانگت کے سرخ ذرات قطرہ قطرہ بکھر گئے۔ اور عیسائی تہذیب کا وہ خون ان کی رگ و پے میں
ڈیا گیا۔ جو شقاوت، مذہب دشمنی اور فرقہ پرستی کے جراثیم کی پرورش کرتا رہا ہے۔ مغلیہ دورِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہی
ا۔ کہ اس نے ہندوستان کو تعصبات کی جس جنگ سے عوام کو چھٹکارا دلایا تھا برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے عوام دوستی کا لبادہ اوڑھ
ن ہی عناصر کو ہوا دینا شروع کی کہ کم و بیش سارے برطانوی دورِ حکومت مذہبی تعصبات، فرقہ وارانہ منافرت اور مذہبی فسادات
، خون سے رنگین ہے۔ جزائر انڈونیشیا میں ولندیزی عہدِ حکومت کا سارا زور مقامی مذہب کے توہمات سے آزادی کے نام پر
، مذہب کی زنجیروں میں گرفتاری اور جکڑ بندی پر رہا۔ آزادی افکار و خیال کی ترویج کی آڑ میں شہنشاہی آمریت کے شکنجوں میں
م لگنا اور خاندانی برتری کے نام طور پر جبر و ظلم میں پھوٹ ڈالنے اور تفرقہ پھیلانے کے کارِ خیر انجام دیتا رہا۔ افریقہ کی تاریخ ان
ب ہتھکنڈوں کے آزماتے جانے کی تاریخ ہے جو ایشیا میں پہلے ہی تجربہ کر کے کامیاب پاتے گئے تھے۔ افریقہ کی وہ تہذیب
سارے کرۂ ارض پر سب سے زیادہ فطری تہذیب (NATURAL CIVLIZATION) تھی۔ ان معنوں میں ایشیا
مذہبی تباہی سے زیادہ سخت تباہی کے مراحل سے گذری ہے کہ وہاں جدیدیت کے نام پر جس عہد تاریک کی بہیمیت اور قتل
ا رتگری کا خونی کھیل کھیلا جاتا رہا ہے۔ بلکہ ابھی تک جاری ہے۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انسانی فطرت کے جیسے سیدھے
ے اور فطری طور پر زندگی گذارنے کے جو مقامیم افریقی تہذیب نے تراشے تھے۔ وہ ہم مغربی افراد کے پالے ہوئے متمدن
ں کی نظروں میں بڑے جہالت آمیز اور وحشیانہ صفت ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کے علاقے کے گنتی جیسے سیاحوں اور ذاتی مشاہدات
بنا پر ڈیوڈسن جیسے براعظم افریقہ کے مورخوں کی نظر سے دیکھئے تو اس میں سادگی اور فطری معصومیت کے ایسے ایسے مرقعے
ملتے ہیں۔ جن کی بنا پر ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کاش ان "جاہل افریقیوں" کو اپنی تہذیب اور معاشرت کی تشکیل کی آزادی
ہوتی تو ان کا یہ دعویٰ ہرگز غلط ثابت نہ ہوتا کہ ایک دن وہ آئے گا۔ جب افریقی تہذیب پورے کرۂ ارض کی تہذیب
، یوں یہ بات گوش گذار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ تمام مشکلوں کے باوجود افریقی ابھی تک اسی دعویٰ پر مصر ہیں کہ
۔ وہ انہی کی تہذیب عالمی تہذیب کا درجہ حاصل کرے گی۔ (بقول بیسل ڈیوڈسن)

مراد اس طول کلام سے یہ تھی کہ وہ نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک جو اس موضوعِ سخن کا محور ہیں۔ ان میں تہذیب کی تشکیل
ملاش کی وہ وجوہات تلاش کرتا ہیں۔ جن پر آئندہ کی تلاش اور تشکیل کا دار و مدار ہے۔ اس ضمن میں پہلے ہمیں اس بات
ننا ہے کہ آزادی کے بعد سے ان ممالک کے عوام، خواص اور دانشوروں کے ذہن ایک معنیٰ میں بے محور ہو گئے تھے۔
ہوتا ایک تاریخی تقاضا تھا۔ اور ہمیں اس بات کو کسی نوع بھی ہدف ملامت نہیں بنانا چاہیے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے
نکہ ڈیڑھ دو صدیوں سے یہ ممالک ایک ایسے خاص بیرونی اثر کے تحت جی رہے تھے۔ جس نے جانے بوجھے لائحہ عمل کے
ملا ان سب ممالک کی تعلیمی اور ثقافتی زندگیوں کو بالخصوص کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر ان میں سے کوئی ملک بھی ایسا نہیں
جس کو آزادی بلا جدوجہد یا تحفتاً دی گئی ہو۔ ان دونوں حقیقتوں کا اثر یہ پڑا کہ غیر ملکی تسلط سے آزادی کے فوراً بعد

ن تمام ملکوں کو ایسے خلا سے دوچار ہونا پڑا کہ نہ سر پر آسمان تھا نہ پیروں تلے زمین سر پر آسمان کا بار تو انہوں نے خود ہی بڑی جدوجہد اور خون خرابے کے بعد بمشکل اتارا تھا۔ مگر آزادی کے پہلے دن ہی ہر ملک کو اس کا شدید احساس بھی ہوا ہوگا۔ کہ غیر قوم کی حاکمیت نے ان کے پیروں تلے کی زمین بھی نہ چھوڑی تھی۔ ماضی کا ورثہ ہر چند عمارت کے شاندار ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ مگر بہر حال اب ایسا کھنڈر تھا۔ جس کی ایک ایک اینٹ خاک ہو چکی تھی۔ حال کی بے حالی کا وہ عالم تھا۔ کہ پاؤں ٹکانے کو جو بالشت دو بالشت زمین مل سکی تھی۔ اُس پر بھی غیر ملکی بوم کی نحوست کے تلے قومی اخلاق کے دیوالیہ پن اور کردار اور گفتار میں منافقت کا کھلا باب سکھا گیا تھا۔ ایسی صورت حال میں کہ قوم کا ماضی کھنڈر ہو اور حال بادِ پا تصورات اور تخیلات کا کاغذی پیرہن پہنے کس کی شوخیٔ تحریر کا نمونہ تو اس قوم کے حال کے لئے الترااماً اور مستقبل کے لئے لازماً کسی ایسے سہارے کی تلاش میں جادہ پیما ہونا لازمی ہے۔ جو اُسے اس خلا میں پاؤں ٹکانے بھر کا سہارا مہیا کر سکے۔ اور یہ سہارا تہذیب اور ثقافت کے سوا نہ سیاست دے سکتی ہے نہ صنعت و حرفت اور نہ تجارت، سیاست، صنعت و حرفت اور تجارت زندگی کے وہ رُخ ہوتے ہیں جن کی پشت پر کوئی نہ کوئی فلسفۂ حیات ان اپنے اقدام کی جراحتوں اور قباحتوں کو اعتدال خوشگواریت اور مثبت نظری کا سبق پڑھاتا رہتا ہے۔ مختلف شعبہ ہائے حیات کا یہ استاد (یعنی فلسفہ) اپنی بنیاد اُس ثقافت اور اُس تہذیب کی زمین پر رکھتا ہے۔ جس پر قوم کے مادی اور روحانی وجود کی جڑیں جمتی ہیں۔ پھیلتی ہیں اور قومی شجر زندگی کو حیات آفرین رس اور جس مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ نوآزاد اور ترقی پذیر ممالک میں یہ تلاش اور یہ جستجو بے معنیٰ نہیں ہے بلکہ قومی وجود کی پکار اور اس زخمی روحِ عصر کا مرہم تلاش کرنا ہے جو صدی ڈیڑھ صدی تک نہ جانے کیسے کیسے چرکے کھاتی رہی ہے۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد کہ نوآزاد، ترقی پذیر ممالک کا یہ سفر انکی بقائے حیات کا سفر ہے۔ اور اس لحاظ سے اس تلاش و جستجو کی بنیاد فیشن پرستی پر نہیں بلکہ بڑی اہم ضرورت پر مبنی ہے۔ ہمیں اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سفر کا رخ کیا ہوگا؟ لیکن یہ سوال ابھی قبل از وقت ہے اور وہ اِس لئے کہ ہمیں اجمالاً پہلے یہ بھی سامنے رکھنا ہوگا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنی تہذیب کی تلاش اور تشکیل کا سفر درپیش ہے تو اس کے معنیٰ دراصل کیا ہوتے ہیں؟ عہدِ حاضر میں اِس سوال کا جواب یوں بھی ضروری لگتا ہے کہ یہ عہد ان ممالک کے لئے جنہیں ہم ترقی پذیر کہتے ہیں۔ ایک بڑی قباحت اپنے دامن میں لئے بیٹھے ہوتے ہے۔ یہ قباحت ہمارے جیسے ملک کے لئے ہی نہیں بعض ایسے ترقی یافتہ ممالک کی راہ بھی روکے ہوتے ہے۔ جو سیاسی معاشی معیشتی سائینسی غرض کسی نہ کسی میدان میں اپنے سے بڑے اور ترقی یافتہ ملک کی باجگزاری پر مجبور ہیں مثلاً یورپی ممالک میں برطانیہ، اسکاٹ لینڈ اور ترکی بالخصوص امریکہ کی ہر حیثیت میں قوی دستی کے باج گذار ہیں۔ اور وہ قباحت یہ ہے کہ ایسے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں جدید تر رجحان اشیاء کی دریافت سے ہٹ کر ان کو اپنانے کی طرف مائل ہے۔ نوآزاد اور ترقی پذیر ممالک (چین کو چھوڑ کر) کے لئے یہ قباحت گلے کا پٹو بن کر رہ گئی ہے۔ اِس میں کچھ ترقی ترقی پذیر ممالک کے پاس وسائل کی کمی بھی ہے اور کچھ صدیوں کی کچلی ہوئی غلام ذہنیت بھی کہ ایسے سارے ممالک اپنے وسائل زر اور خام مواد سے کہیں زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا رجحان بے لگام چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اِس رجحان کے پنپنے کی وجوہات بے شمار ہیں۔ لیکن اِس میں سب سے بڑی وجہ ان ممالک کا وہ نظام زر اور نظام زر کاری ہے۔ جو پیسے والی بورژوازی کو جنم دینے کا اعلیٰ ترین ذریعہ بن گئے ہیں۔ اور زرگیری کی ہوس کا منہ جب ایک مرتبہ کھل جاتا ہے۔ تو پھر اس

انتہا کی ابتدا ہی ابتدا ہوتی ہے اور انتہا نامعلوم۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ ملک اگر بڑا ہے اور وسائل لامحدود ہیں تو ہوس ملک گیری، استحصالی ہتھکنڈے، چنگیزیت کا روپ دھار لیتے ہیں اور پھر انسان کی ستر پوشی کی ذمہ دار ننھی منی سوئی کا مصرف بھی معصوم انسانیت کا کفن بینا رہ جاتا ہے اور اگر ملک چھوٹا ہے وسائل محدود ہیں۔ پھر چاہے قومی سطح کا ہر شعبۂ حیات کسی گدلے بے تلے کا شتی ہی کیوں نہ ہو زردار بورژوازی کے ہتھکنڈے قومی مزاج سے تلاش، تجسس، سخت کوشی اور فقر و غنیٰ کے جذبات کو مٹی رستی پکڑ لیتے ہیں۔ اور قوم محض فیشن پرست بن جاتی ہے اور ایسی ایسی اشیاء دوسرے ممالک سے اپنانے پر اتر آتی ہے جو کھلے عام اُس کے لئے زہر ہلاہل کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ آج یہ تشویش بڑی برحق ہے کہ ہمارے ترقی پذیر ممالک کی تشکیل تہذیب کا رخ تلاش و جستجو کے خارزاروں سے ہو کر گزرے گا۔ یا ہم اپنی مشینی احتیاجات کے دباؤ کے تحت اِس اہم مسئلہ کا حل بھی اشیاء کو اپنانے والے رجحان ہی کی سہل پسند شاہراہ پر ڈال دیں گے

اتمام حجت سمجھئے یا نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے ہمیں تشکیل تہذیب کے اِس رخ پر نظر ڈالنا ہی ہوگی۔ جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے اِس صورتِ حال کا جواز یہ ہے کہ ہمارا آج کا عہد بہت برق رفتار ہو گیا ہے بعض اشیاء ابھی یورپی ممالک سے ترقی پذیر ممالک پہنچ ہی پاتی ہیں۔ کہ خبر آجاتی ہے کہ وہ آوٹ ڈیٹ ہو گئیں۔ یہ محض قیاس کی بات نہیں ہے۔ ہماری مارکیٹیں ایک ہی کپڑے کے درجنوں رنگوں۔ ڈیزائنوں اور ڈیزائنوں سے بھری ہیں۔ کپڑوں کی تراش خراش کا ایک ڈیزائن روز نکلتا اور فیشن باہر ہو جاتا ہے۔ یہی حال ٹیکنالوجی کے میدان میں ہے۔ نئے نئے ایٹمی ہتھیاروں کی ساخت اور ان کی کارکردگی میں اضافوں اور تبدیلیوں نے ان ممالک کو سرگرداں کر رکھا ہے جو دفاعی معاملات میں دوسروں کے دستِ نگر ہیں۔ منڈیوں میں اشیائے ضرورت کی کمیابی۔ نایابی اور بحرانات ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے جو ایک طرف چھوٹے تاجروں اور خوردہ فروشوں کی ذہنیتوں کی تباہ کاری پر آمادہ ہے تو دوسری طرف صارفین کی جان ضیق میں ڈالے ہوتے ہے۔ اور یہ سب کچھ کئی بڑے پیٹ والے ملک کے کسی زرگر کی ہوس کا ابرو کے ایک اشارے پر ہو جاتا ہے اِس صورتِ حال میں کوئی ترقی پذیر ملک جب تک اپنے بل پر کسی شئے کی دریافت اور تشکیل تک پہنچے گا تو یا تو اُس کا ساتھی ملک جو کسی بڑی طاقت کا شہ نشین ہوگا اس سے دس بیس سال آگے نکل چکا ہوگا یا پھر یہ ملک اپنے اُسی ہمسایہ ملک کی کالونی بن چکا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اِس تیز رفتار عہد نے یہ ایک ایسی الجھن نو آزاد اور ترقی پذیر ملکوں کے لئے پیدا کر دی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بڑے ملک سے اپنا دامن باندھنے پر مجبور ہے۔ اِس مجبوری کے تحت جو کچھ سامنے آرہا ہے وہ بڑے الذاتین پڑھ کے رکھنے والا تحفۂ درویش ہے۔ یہ بات بلا خوف

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

بہت زیادہ تشویشناک اس لئے بھی نہیں ہے کہ تہذیب بہر حال ہر عہد میں بڑھتی، پھیلتی اور دوسروں کو متاثر کرتی ہی آئی ہے۔ مگر یہاں سے تشویش اور اندیشوں کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ وہ یہ کہ جو کچھ آرہا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اور آیا وہ کسی دوسری سرزمین میں پھلنے پھولنے کی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ کچھ مقامی اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اُس سرزمین کے تہذیبی ورثے کے مرحلے کا جزو بن سکے گا۔ یا پھر یہ مقامی تصورات نظریات اور اقدار

اقدارِ حیات، ذوقِ جمال اور شوقِ تخلیق کی جڑیں کاٹنے پر آمادہ رہے گا۔ اس سلسلے میں یہ موقع مناسب ہے کہ ہم ایک نظر پھر بھی ڈال لیں جو جملہ ترقی پذیر اور نو آزاد ممالک کا قبلہ و مرجع بن گیا ہے۔ کہ وہاں تہذیب اور ثقافت کا کیا رخ ہے اور اپنی تہذیب کی روایات اور تشکیل کے رخ کو اس کا نعم البدل بنا سکیں گے یا نہیں۔

عہدِ حاضر کی مغربی تہذیب کے عناصر کو سمجھنے کے لئے یورپ کے موجودہ مزاج کو سمجھ لینا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظر اس صدی کے آغاز پر پڑتی ہے تو پہلی جنگِ عظیم کا دھماکہ ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پہلی جنگ کا یہ دھماکہ نہ اچانک تھا اور نہ بلا وجہ اس کی پشت پر فرانس کا خونی انقلاب اور امریکہ کی بوسٹن ٹی پارٹی دو عناصر ایسے تھے جس نے یورپ کے عسکری نظام کی داغ بیل ڈالنے میں اساسی کردار ادا کیا ہے۔ فرانسیسی انقلاب اور امریکہ کی جنگِ آزادی بنیک دونوں ہی اپنی اپنی سرشت میں آزادی پسند عوام کی جدوجہد کے وہ مظاہر ہیں جن کا جواز آزاد تہذیب اور ثقافت کی تشکیل اور تعمیر کی خواہش میں ہمیشہ ہی ملتا رہے گا۔ مگر غالباً تاریخ کا یہ بہت فطری بہاؤ ہے کہ ہر جدوجہدِ آزادی میں غیر محسوس طور پر بالآخر عسکری قوتوں ہی کا نصیبہ جاگتا ہے پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں فاشی ہیبناز قوتوں کی سرکوبی کا جواز پیش کرتی ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کہ ان جنگوں میں اگر فاشست عساکر کی فتح ہو جاتی تو آج دنیا کی تاریخی اور جغرافیائی شکل اتنی مسخ ہوتی کہ شاید پہچانی نہ جاتی مگر یہ تلخ حقیقت پھر تاریخ نے دہرائی ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ بھی وہی نکلا کہ آج پورے یورپ پر ورد‌ی پوش عسکری، ذہن حاوی اور طاری ہے اور اس سے زیادہ بڑی تلخ حقیقت یہ ہے یہ کہ مزاج اپنی بقا اور بالادستی کی معصوم سی تمنا میں یوں الجھ گیا ہے۔ کہ ہر سال دو سال بعد اس تیسری جنگ کا قیامت خیز نقشہ کسی نہ کسی معصوم سی تمنا ملک کی سرزمین پر کھینچنے کا اہتمام کر لیتا ہے۔ جس جنگ کے نتائج کا ہلکا سا تصور پوری دنیا کے دل اور دماغ میں اضطراب اور بے چینی کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اور آج یہ حال ہے کہ یورپ کی ہر چھوٹی بڑی ریاست اور ہر اہم اور غیر اہم سوسائٹی کو جنگی جنون زدگان نے فوجی بارکوں میں ڈھال کے رکھ دیا ہے۔ اور مغرب کی کبھی شریف اور متمدن سوسائٹی کے ارتقائی عمل کے منطقی تسلسل کو ذلالت اور رسوائی کی صلیب پر چڑھا دیا ہے۔ اب یورپ کے معصوم شہری باشندے جو کبھی اپنا سوسائٹی کے ارتقائی عمل اور منطقی تسلسل کا ذریعہ تھے۔ آج ان ہی بارک نشینوں کے ہاتھوں میں خود اپنی تباہی اور بربادی کا پیغام مجسم بنے　　　کا نقشِ فریادی بنے ہوئے ہے۔ مغرب کے اس عسکری عہد کی داستان بڑی زہرہ گداز ہے۔ جس نے آدمی کو تباہ کار ذہنیت کا بے وقعت نوالہ ایک اور اسی بسی تہذیب کے تانوں بانوں کو مکڑی کا جال بنا دیا ہے۔ ایک ایسی تہذیب میں جو دھیرے دھیرے پختگی اور سنجیدگی کی طرف قدم بڑھا رہی ہو جب عسکری نظام کی فولادی جھنکار سنائی دینے لگے تو اس کے سینے میں بھی ایسی ناقابلِ لچک فولادی سختی آ جاتی ہے جو اس کیلئے اپنے افکار و خیالات میں نرم رو انسانی اقدارِ حیات سے سمجھوتے کی ساری راہیں بند کر دیتی ہے روما، اسیریا اور مصر کی قدیم تہذیبوں کا زوال آج بھی عسکری ذہنیت کے لاتے ہوتے اس ہی انسان دشمن رویئے کا نوحہ بن کر تہذیبِ انسانی کی تاریخ کے اوراقِ پریشاں مٹے حروف کی شکل میں لکھا ہوا ہے۔ ان حروف میں ہمیں یہ داستان بھی لکھی ہوئی ملتی ہے کہ جب ایک بار عسکری ضابطہ فکر اپنی جڑیں جما لیتا ہے تو سوچنے سمجھنے کے سارے مخارج اور زندگی گذارنے کے سارے ڈھنگ خاکستری پیرہن میں ملبوس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر ایک بیوروکریسی جنم لیتی ہے۔ جو انسدادِ خسارہ

مسائل کی جزئیات سے لے کر بیرونی تعلقات اور خارجہ پالیسی کی چھوٹی بڑی تفصیلات پر حاوی اور جکڑ بندی ہوتی چلی جا
ہے۔ چنانچہ آج یہ حال ہے کہ امریکہ جو پوری تہذیب کا گہوارہ اور گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھر
بولنے بتلانے سے لے کر تعلیم و تربیت کے ہر شعبے پر اس ذہنیت کی چھاپ یوں لگ چکی ہے کہ معصوم اور بے گناہ عوا
اس کو کلنک کا ٹیکہ سمجھ کر چھپائے پھرتے ہیں۔ اس ذہنیت کی ہمیشہ ہی سے یہ بڑی زیرک چال رہی ہے کہ یہ سب سے پ
تعلیمی میدان پر محاذ مارتی ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں پر اپنی گرفت کو حاوی کرتی ہے۔ پھر یہ دائرہ عمل کسی سود خوار بنئے
رقم کی طرح پھیلنے لگتی ہے اور سائنسی تحقیقات ٹیکنالوجیکل اختراعات کے میدانوں میں اس کے منحوس قدم پہنچنے لگتے ہیں۔ ع
کے گاڑھے پسینے سے کمایا جانے والا سرکاری روپیہ ان ایجادات اور اختراعات کی ہلاکت خیز اشکال پر بے دریغ لٹایا جا
لگتا ہے۔ ہلاکت خیزی کے نت نئے راستے متعین کئے جاتے ہیں۔ اور سائنس ٹیکنالوجی کو انسان دشمن مشینوں
بموں اور تباہی پھیلانے والے آلات حرب میں ڈھلوایا جاتا ہے۔ قومی خزانے سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طبا
ذہنوں کی خرید عمل میں آتی ہے اور انہیں ڈالر کا چکمہ دکھا کر انسان دوست جذبات اور انسانیت کی راہ سے ہٹا دیا جا
ہے۔ عسکری درسگاہیں جب ان کچے ذہنوں کی تربیت کا بیڑہ اٹھاتی ہیں تو وہ اپنی تمام انسانی دوستی کا ڈھونگ رچانے
باوجود کسی دکھیا امریکی افسر سے یہ تلخ حقیقت اگلوا ہی دیتی ہے کہ "عسکری تنظیمیں آج امریکہ میں سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ب
چکی ہیں" جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امریکہ اب اپنی آئندہ نسل سے طباع ذہنوں اور اخلاقی اقدار حیات کا احترام کرنے وا
کو نسل سے ہاتھ دھو لے۔ اس لئے کہ ایک فوجی قواعد و ضوابط کے تحت منظم اور تربیت یافتہ نسل کا مطلب اس کے عل
اور کیا نکلیگا وہ تمام عناصر جو آزادی رائے، ڈیموکریسی اور انسان نواز اور انسان دوست اقدار حیات کا بنیادی جزو ہیں۔ ا
کا انسان سے تعلق قطع ہو چکا ہے۔ مغربی معاشروں کے کاندھوں پر جنگجوئیت کا تسمہ پا کی یہ سواری صرف ان ہی کے لئے نہیں ہم عصر
کے لئے بھی اندیشوں کی وجہ بن چکی ہے۔ ان اندیشوں میں تیسری عالمگیر جنگ کا ہولناک تصور تو خیر سر فہرست ہی ہے لیک
اس سے بڑا تردد یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے جس نئی دنیا نے جنم لینا شروع کیا تھا۔ وہ روز بروز عہد بربریت
کی جانب الٹے پاؤں لوٹنے پر مائل ہوتی جا رہی ہے اور اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب اپنی وسیع النظری او
وسیع التعلیمی کے تمام دعووں کے باوجود ایک وسیع النظر اور وسیع القلب معاشرہ پیدا کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ مغ
کی اس تنگ نظری کی بڑی وجہ بھی دو عالمگیر جنگیں ہی ہیں۔ اس لئے ان دو لڑائیوں نے وہاں کی معیشت میں جو تبا
کاری پھیلائی تھی اس کی از سر نو تعمیر اور تشکیل کی کوششوں نے مغرب کی نئی تہذیب کی بنیاد منفعت اندوزی کے جذ
پر استوار کرنا شروع کی تھیں۔ اور دوسرا رجحان جو ان جنگوں نے مغرب کی تہذیب کا جزو بنا لیا ہے اور جسکا اثر اب ت
جا چکا ہے وہ حد سے بڑھی ہوئی عسکری ذہنیت ہے۔ انسان دشمن عناصر نے یورپی اقوام کے ارتقائی تسلسل کی ر
میں بڑے بڑے بند باندھے ہیں۔ چنانچہ عہد حاضر یورپی معاشرے میں عقلمند بیوقوف اور احمق سب ہی ایک مس
جنگ کے خوف سے گھرے ہوئے ہیں۔ ایک اضطراب اور فرار زندگی کا سبب ہے۔ جس کی لپیٹ میں ساری انسانی متا
اور سب انسانی سعی مسلسل غیر انسان دوست سعیوں میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔ ایک بڑی بدقسمتی کی بات اس عہد
یہ ہے کہ آج وہ تمام ادارے جن سے کبھی انسانی فلاح و بہبود کے سرتے تمام تصورات وابستہ تھے۔ وہ آج اپنا یکر

رکھنے کے اہل نہیں رہے۔ سب سے زیادہ تبدیلی جس ادارے کے تصور میں آئی ہے۔ ریاست جس نے کبھی انسان کو دیہی
شیت کی پسماندگی سے نکال کر صنعتی اور پھر شہری معشیت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اب وہی نو مطلق ریاست کا آلۂ کار بن گئی ہے
جبکہ قومی یکجہتی کا یہی وہ سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ جس کے تصور کے ساتھ معاشی وسائل کی مساوی تقسیم و تنظیم کی امنگیں وابستہ
تھیں۔ عہدِ حاضر کے سائنسی انکشافات اور ان کے عملی روپ ڈھلنے کے ساتھ ساتھ فاصلے کی اہمیت گھٹی تو جغرافیائی حدود
کا تصور بھی ختم ہوا۔ قومی کردار کی کہانیاں پارینہ قصوں کا روپ دھار گئیں۔ مقامی ثقافتوں کی نشانیاں آہستہ آہستہ بین الاقوامی
رجحانات کے ٹریڈ مارک کے تلے دبنے لگیں۔ معاشرتی وسائل اور خام مواد نے عہدِ جدید کی ٹیکنالوجی کے زیرِ اثر تکمیل اور تجسیم
کے وہ مراحل طے کر لئے ہیں کہ ہر لمحہ یہ گمان ہوتا ہے کہ بس اب ہر چیز اپنی آخری حد تک پہنچ گئی ہے اور اس کے بعد زوال ہی
زوال ہے۔ تصورات اور نظریات کا معاملہ بھی کچھ ان سے جدا نہیں ہے۔ مثلاً یہی دیکھ لیجئے کہ عہدِ جدید کا یورپی نظریۂ معاشیات
اپنی ایسی انتہا تک پہنچ گیا ہے کہ اب اِس کے اندر بے عملی کا گورکھ دھندا شروع ہو گیا ہے۔ اپنے انتہائی عروج پر ہونے
کے باوجود انسان کی بنیادی ضرورتوں کی کفالت کے سارے تصورات اور منصوبے ڈھے کر خاک ہوگئے ہیں۔ بے گھر
بے در ہونے۔ فاقہ زدگی اور بیماریوں کی لعنت سب کچھ اِس کی زد سے گویا تیر کے کمان کی طرح چھوٹ کر بے قابو
ہو چکی ہیں۔ عہدِ حاضر کے مشینی دور میں دولت کمانے کے جتنے مواقع اور سہولتیں حاصل ہیں اس کے مقابلے میں تقسیم زر
کا کوئی ایک بھی کارگر اصول یورپ کی جدید معاشیات کے پاس نہیں ہے جو معاشی ناہمواری کا سدِ باب کرنے کا تصور
ہی دے سکے۔ موجودہ صدی کی تیسری دھائی میں۔
کے نام سے
یورپی اقوام کی معاشی ناہمواری کا جو منصوبہ بڑے دھوم دھڑکے سے شروع ہوا تھا بے شک وہ ایک یورپی ممالک کو تو
تھوڑا بہت فائدہ اس سے پہنچا۔ بالآخروہ بھی زر دار ذہنیت کی چپقلش کا شکار ہو کر رہ گیا۔ مختصر یہ ہے کہ سیاسی میدان
سے لے کر معیشی، معاشرتی، تعلیمی اور سائنسی شعبوں تک کوئی بھی ادارہ اس جدید یورپی سوسائٹی کا ایسا نہیں ہے
جو آج وہاں کی موجودہ کشمکش کی تاریک بھول بھلیوں میں بھٹکی ہوئی تہذیب اور ثقافت کو روشنی دکھا سکے۔
مغربی معاشروں کی یہ صورتِ حال ہمارے لئے ہی نہیں ان کے لئے بھی بہت اندیشوں اور تشویشوں کا باعث
بنتی جا رہی ہے آج مغرب کا عام شہری اور ہر دانشور گھبرا کر بار بار ماضی کو ٹٹول رہا ہے اور اپنی پرانی تہذیب سے ناطے
جوڑنے کا نعرہ لگا رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ سب کچھ باعثِ تردّد یوں ہے کہ چین کو چھوڑ کر سارے ہی نو آزاد اور ترقی پذیر
ممالک اپنی معاشی اور دفاعی ضرورتوں کا سبب خواہی نخواہی مغربی بلاک ہی سے منسلک ہیں اور ان مراسم اور روابط کا
لازمی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ وہاں کا معاشی اور اخلاقی نظام یہاں تیزی سے ہمارے ذہنوں پر مسلط ہوتا چلا جا رہا ہے ایسی
نازک صورتِ حال ترقی پذیر ممالک میں تہذیب کی تشکیل اور تعمیر کا مسئلہ بہت پیچیدہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ جو اقدار و
روایات ہمیں اپنے ماضی سے ورثے میں ملی ہیں۔ ان کا جادو تقریباً ٹوٹ چکا ہے۔ جو اقدار و روایات ہمیں اپنے حال
سے مل رہی ہیں۔ ان پر چلنے والوں کا حشر ہمارے سامنے ہے اور جب ماضی و حال دونوں ہی گرفت سے بار بار نکلتے جا
رہے ہیں تو پھر مستقبل کی تعمیر کا مسئلہ جتنی قباحتوں کا حامل ہو وہ کم ہی ہوتی ہیں۔ پھر بھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دل کی تسلی ہی
ہی۔ آخر زندگی گزارنے کا کوئی حیلہ کوئی بہانہ تو ایسا ہمارے پاس ہونا ہی چاہیے۔ جسے ہم برا بھلا ضابطۂ حیات کہہ

کہ اپنی آئندہ تہذیب اور ثقافت کی بنیاد کے طور پر دوسروں کے سامنے رکھ سکیں :

ترقی پذیر ممالک میں انڈونیشیا سے لے کر نو آزاد افریقی ریاستوں تک آج کے ذہن میں ایک بات ہر جگہ یکساں طور پر محسوس کی جا رہی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ مشرق اور مغرب میں تہذیبی اور ثقافتی افراتفری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اقدار اور روحانی اوامر کی شکست و ریخت کا سلسلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ روحانی نظام کی پہلی آماجگاہ خاندان کی وہ ہیئتِ ترکیبی ہوتی ہے۔ جس میں کسی ایک یا چند بزرگوں کا زندگی بھر کا تجربہ چھوٹی پود کے لئے چراغِ راہ بنتا ہے۔ پھر ایک خاندان دوسرے خاندان کے درمیان ان تجربوں کی یکسانیت یا مشابہت ایک دوسرے بڑا روحانی دائرہ تعلق پیدا کرتی ہے اور سلسلہ در سلسلہ بستیوں سے گاؤں، گاؤں سے قصبوں اور قصبوں سے شہر تک تعلقِ خاطر کا ایک دائرہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اس دائرے کے حصاروں میں چھوٹے بڑے تجربات کے وہ روحانی عناصر ہوتے ہیں جو فرد کو فرد سے متعلق اور منسلک رکھتے ہیں۔ آج بھی جب ہم نو آزاد ممالک میں کبھی تہذیبی اور ثقافتی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے اندیشوں اور تشویشوں کی تہہ میں اس روحانی حصار کی شکست و ریخت ہی کا کرب ہوتا ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک آج کے مسئلے کا پہلا اہم نقطۂ گفتگو یہ ہے کہ ہمارے ہاں تہذیب کی تلاش اور جستجو کا مرکز ایک ایسے روحانی نظام کی تلاش ہونا چاہیے جو ہم نو آزاد ممالک کی تلاشِ مستقبل میں معاونت کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے نظام کی تشکیل اور تعمیر کے امکانات کیا ہیں؟

کنفیوشنزم (CONFUCIANISM) ۔ عیسائیت ۔ اسلام ۔ ہندومت ۔ بدھ مت اور مارکسزم یہ پانچ بڑے مسلک کہیں علیحدہ علیحدہ اور کہیں ایک یا دوسرے کی سنگت میں آج بھی ترقی پذیر ممالک میں ایک ضابطۂ حیات کا ڈھانچہ فراہم کر رہے ہیں۔ جہاں ان میں سے کسی ایک مسلک کو مذہبی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں بھی ان ممالک ہی کی طرح جہاں کوئی غیر مذہبی مسلک حیات اپنا لیا گیا ہے۔ خاندان کی اکائیاں نیم شکست حالت کی غمازی کر رہی ہیں۔ چین نے بڑی حد تک کمیون سسٹم کو اپنا کر اس اکائی کو از سر نو استوار کرنا شروع کر دیا ہے۔ افریقی ریاستوں میں ابھی جادو ٹونوں کا خوف افراد کے ذہن پر اتنا حاوی ہے کہ وطن قبائلی طرز پر خاندان بلکہ بستیوں تک میں بزرگی کا سلسلہ احترام باقی ہے انڈونیشیا۔ ملائیشیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں صورتِ حال اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ تینوں ممالک ایک لمبے عرصے تک عیسائیت کے پیروکار حکمرانوں کے تحت رہتے چلے آتے تھے۔ اور عیسائیت بحیثیت فلسفہ زندگی اٹھارہویں صدی کے آخری ربع سے جس طور صنعتی اور تجارتی منڈیوں سے متاثر ہو کر وسعت گیری کے طلسم میں اسیر ہوئی۔ اسکا بحران ہم سب کے سامنے ہے۔ لہٰذا ان تینوں ممالک میں خاندانی اکائیوں کی تشکیل اور تعمیر کا مسئلہ افریقی ریاستوں کے مقابلے میں تھوڑے کم اور چین کے مقابلے میں بہت زیادہ محنت طلب مرحلہ ہے۔ کارل مارکس نے ہیں ایک جگہ لکھا ہے کہ افراد کی روحانی قوت کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ وہ آپس میں کس قسم کے رشتوں سے منسلک ہیں۔ مارکس کے نقطۂ نظر سے یہ رشتہ مادی وسائل اور ترقی میں برابر کی شرکت پر ضرور منحصر ہے۔ لیکن اس نے اس شرکت کو روحانی تعلق اور روحانی رشتوں کی بنیاد بھی مانا ہے۔ اس ہی بنا پر اس کے فلسفۂ معاشیات میں ایک روحانی نظام کی تخلیق پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے۔ جتنا کہ مادی نظامِ حیات کے تحت وسائل میں افرادِ ملک کی برابر شرکت پر۔ چین نے اس فلسفۂ حیات کی روشنی میں اپنے یہاں ایک نئی تہذیب

کا آغاز کر دیا ہے۔ نئی چینی تہذیب کے عناصر میں مادی اور روحانی اقدارِ حیات پر برابر سے زور دیا جا رہا ہے ماؤزے تنگ نے اپنے افکار و خیالات میں جتنی اہمیت کمیونسٹ پارٹی، طبقاتی کشمکش کے مادی اور معاشی پہلو سیاسی عقائد و نظریات افسروں اور عوام کے رشتوں، حب الوطنی اور بین الاقوامیت اور قومی اتحاد کو دی ہے اتنی ہی اہمیت کلچر، آرٹ، حسنِ سلوک اور مطالعے کو بھی دی ہے۔ ماؤ کا یہ قول بڑا حیرت انگیز ہے کہ "ثقافتی اقدار سے عاری فوج سے زیادہ کند ذہن اور غبی طبقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا" ایک اور جگہ چینی ثقافت کے اجزاء پر خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اگر ہم صحیح معنوں میں نو سلسٹ کلچر کی تشکیل چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس وسیع النظری سے کام لینا ہوگا کہ ہمارے یہاں مختلف قسم کے مکتبہ ہا تے خیال کو پنپنے کا موقع دیا جائے۔ اور آرٹ اور سائنس کی ترقی پر کوئی قدغن نہ لگایا جائے۔ ماؤ کے افکار میں علم کا مرتبہ اور علمی لگن کا مطالبہ اتنا ہی قوی ہے جتنا کہ کمیونسٹ نظریات کی ترویج اور تشریح مثلاً ماؤ کا یہ قول کہ تحصیلِ علم ایک سائنسی عمل ہے اور اس کے حصول میں بے ایمانی یا دھوکہ دہی کا جذبہ ہرگز نہیں پنپنا چاہیے۔ حصولِ علم کے لئے ایمانداری اور شدید لگن بھی ضروریات ہیں۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ تن آسانی علم کی سب سے بڑی دشمن ہے اور اس لعنت سے چھٹکارا پاتے بغیر ہم علم حاصل نہیں کر سکتے۔ حصولِ علم میں ہمارا رویہ ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم کبھی یہ نہ کہیں کہ بس اتنا علم کافی ہے۔ اور دوسروں کی تعلیم کے سلسلے میں انتھک کوشش کریں"۔

ہم سب ہی اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ شہنشاہیت کے دور میں چین میں بھی توہم پرستی سے لے کر عیش کوشی تک سب ہی لعنتیں وہاں عروج ہی پر نہیں بلکہ برسرِاقتدار بھی تھیں۔ لیکن جس لگن سے وہاں عہدِ نو کی تعمیر کا کام شروع ہوا ہے۔ بیس سال کے مختصر عرصے میں اس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تیز رفتاری کے اس دور میں بھی ایک شریف انسانیت نواز اور دکھ درد میں کام آنے والی قوم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور بلاشبہ یہ بنیاد ایک خلیق اور اعلیٰ روحانی نظام کی حامل تہذیب اور ثقافت کے بغیر ناممکن ہے۔ مادی وسائل اور ذرائع تو آج جتنے مغرب کے پاس ہیں۔ اسکا عشرِ عشیر بھی شاید ابھی چین کے تصرف میں نہیں آیا ہے۔ لیکن مغرب کے اخلاقی دیوالیہ پن نے اپنے وسائل اور ذرائع کو جنگ کی بھٹی کا ایندھن بنا رکھا ہے۔ چین سے ہٹ کر باقی ترقی پذیر ممالک پر نظر ڈالیئے تو کوئی ایسا ملک نہیں ہے۔ جس کا ماضی ایک شاندار تہذیب کا گہوارہ نہ رہ چکا ہو۔ انڈونیشیا میں اسلامی تہذیب۔ ہندوستان میں آریائی تہذیب پھر ہندو تہذیب اور بعد کو مسلم تہذیب۔ پاکستان میں وادی سندھ کی تہذیب اور پھر مسلم تہذیب۔ افریقی ریاستوں میں ان کی اپنی فطری تہذیب کے تو اتنے رنگ ہیں کہ آسیریا، میسوپوٹامیہ سے کر وادیِ تہذیب مصر تک لاتعداد رسوم و رواج۔ قربانیوں کے مظاہر۔ دیومالائی تصورات بکھرے پڑے ہیں۔ آج سائنسی عہد میں بھی انڈونیشیا سے لے کر افریقی ریاستوں تک پرانی تہذیب کے آثار انسانی رویوں۔ افعال و اعمال اور رسوم و رواج۔ طرزِ تعمیر اور لباس و خوراک میں ابھی تک نمایاں ملتے ہیں۔ اور اس بات سے یہ تقویت مزید پہنچتی ہے کہ عہدِ جدید میں پرانی تہذیب سے کچھ نہ کچھ عناصر ابھی اور زندہ رکھے جا سکتے ہیں۔ تاکہ وہ اس خلا کو پُر رکھیں جو پرانی تہذیب کے مٹنے اور مستقبل کی تہذیب کے پیدا ہونے کے درمیانی وقفے کیلئے ناگزیر ہوتا ہے۔ جس طرح چین نے ابھی تک بہت سے شعبہ ہائے حیات میں کنفیوشس کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کر کے اپنے یہاں اقتصادی اور روحانی ستونوں پر اپنی تہذیب کی عمارت کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ہی طرح

سے دوسرے ممالک کے لئے بھی بلا آخر یہی طریقہ کار اختیار کرنا ناگریز ہوگا۔ بات یہ ہے کہ خواہ اسلام کی تعلیمات کو آپ اپنی
بنیاد بنائیں یا ہندو ازم کو یا بدھ مت کو یا کمیونزم کو فلاحی ریاست کی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ معاشی ضروریات کی
کفالت کا کوئی نہ کوئی ایسا تصور اپنایا جائے جو ملکی وسائل اور ذرائع سے حاصل شدہ زر کی ممکن حد تک مساوی تقسیم کا سبب بن
سکے۔ اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں اس مساوی گردش کو بہت بڑی اہمیت دی گئی ہے اور مارکسی فلسفہ معا
کی تو جڑ ہی یہی نظریہ ہے اور ایسا نظامِ معاشیات ہم نو آزاد ترقی پذیر ممالک اُس وقت تک اختیار نہیں
کر سکتے۔ جب تک مغرب کا سیاسی اور معاشی تسلط ہمارے سروں پر ہے۔ اُس کی اہمیت یوں اور محسوس ہو
ہے کہ وہ ممالک جو خود اپنے وسائل اور اپنی محنت سے اشیاء کی دریافت ایجاد اور ساخت کے مراحل سے گزرتے
ہیں۔ وہ خود ساختہ اشیاء سے ایک روحانی اور قلبی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔ مغرب روحانی طور پر بہت دیوالیہ ہے۔ لیکن
مغرب کی حب الوطنی پر آپ شک نہیں کر سکتے۔ اِس کے برعکس ہمارے یہاں سوائے وطن کی خام مٹی کے اور کوئی چیز ایسی
نہیں ہے۔ جو اپنی زمین سے ہماری محبت کا رشتہ استوار رکھ سکے۔ ہماری زمین جو کچھ ہمیں دیتی ہے۔ وہ سب ہم
کے تیار سے یا تیاری کے لئے دوسروں کو دیدیتے ہیں وہاں سے جو کچھ آتا ہے اس
میں ہمارا خونِ جگر چونکہ شامل نہیں ہوتا۔ اِس لئے ہمارے اندر وہ چھوٹا سا روحانی چراغ بھی نہیں ٹمٹا پاتا۔ جس کی رو
میں ہمیں اپنی کسی کاوش یا کوشش کا عکس نظر آ سکے۔ آج تمام ترقی پذیر ممالک میں اخلاقیاتِ زندگی سے لے کر خود زندگ
تک ہر چیز برائے فروخت کی حیثیت میں ڈھل چکی ہے۔ نئی تہذیب کی تشکیل اور تعمیر کے لئے ہمارا اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے
کہ ہم اپنے وسائل سے اپنی ضرورتوں کی کفالتوں کا نظام استوار کریں۔ اِس سے ہمارا یہاں بیرونی ملمع کاری کا رجحان
ختم ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں سے پیار ہوگا۔ اور جب کوئی شے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں میں منتقل
ہوگی۔ تو وہ صرف جنسِ تجارت نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں ایک روحانی رشتہ بھی ایک ہاتھ کے ذریعے دوسرے کے دل تک
پہنچے گا۔ نئی تہذیب میں کچھ نہ کچھ عناصر بہر حال پرانی تہذیب کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ماضی سے بھی ایک مسلسل
اور پائندہ رشتہ قائم رکھنا ہوگا۔ لیکن اِس میں بھی ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ آج کل مغرب کے دانشور ہم مشرقیوں
کو بار بار یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ کہ مشرق کا ماضی بہت شاندار ہے۔ لہٰذا مشرق کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماضی کو اپنائے
مغرب نے جو رویہ آج تک ہم سے روا رکھا ہے اسکے پیشِ نظر یہ نعرہ یوں مشتبہ نظر آتا ہے کہ ماضی کے بہانے وہ شائد
مشرق کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ایسے عہد میں داخل ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ جو اس کا اپنا ایجاد کردہ عہد ہو
بلکہ ماضی کے نام پر وہ ہمیں پھر توہم پرستی۔ گنڈے۔ تعویذ اور پیر فقیروں کے جال میں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ
مشرق معاشی سیاسی اور دفاعی ضروریات میں اُن کا دست نگر رہے۔ چنانچہ ماضی سے رشتہ استوار کرنے
کا مفہوم مراجعت بہ ماضی نہیں ہے۔ بلکہ اِسکا مفہوم ماضی کے ان تجربات سے سبق لینا ہے۔ جن کا اعادہ ہمیں پھر کسی نئی
غلامی میں گرفتار نہ کرا دے۔ یہ بہر حال طے ہے۔ کہ کوئی تہذیب اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات
اور انکشافات سے پہلو نہیں چرا سکتی۔ لیکن کسی بھی نئی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہوگا۔ کہ وہ سائنس اور
ٹیکنالوجی کو اپناتے بھی اور اس کے کمرشل رجحانات کو ایک ایسا روحانی رخ دے سکے جو تہذیب اور ثقافت کو بنانے

اور سنوارنے میں شائستگی کا کردار ادا کر سکے۔ اور یہی کام ہم ترقی پذیر ممالک کو انجام دینا بھی ہے لیکن یہ بات اُس وقت تک ادھوری رہتی ہے۔ جب تک کہ اِس کا یہ رخ پیشِ نظر نہ رہے۔ کہ نئی تہذیب کے عناصر کی تلاش اور جستجو کا اہم سنگ میل یہ ہو کہ تمام نو آزاد ممالک، سیاسی، معاشی اور دفاعی کفالتوں میں مغرب کی محتاجی کا جوا اتار پھینکیں۔ جیسا کہ میں بار بار یہ بات دہراتا رہا ہوں یہ یوں ضروری ہے کہ جب تک بیرونی اشیاء آتی رہیں گی۔ بیرونی ممالک کے تصورات اور طرزِ زندگی ہمارے اندر منتقل ہوتی رہیں گی۔ بظاہر یہ بات بھی ایک رجعت قہقری کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہم مغرب کی اعلیٰ اور سستی چیزوں کو چھوڑ کر ملکی ساخت کی گھٹیا اور مہنگی چیزوں پر گزارا کریں۔ ہوائی جہاز کار اور بس کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ بائی سیکل اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرنا شروع کر دیں۔ واقعی یہ بات بڑی زیادتی کی ہے۔ لیکن آج سے ۳۷ سال پہلے کا روس کا یہ رجحان ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ کہ وہاں ایک اہم کمیونسٹ لیڈر نے بہت بڑے مجمع کے سامنے یہ بات کہی تھی کہ "ہم صدیوں کو ابھی اپنے قدیم ورثے ہی سے کام چلانا ہے ہمیں اپنی پروازی مشینوں اور صنعتی کلوں کو ان طریقوں پر ڈھالنا ہے جس طرح کہ ہوا باز اور کارکن ہمارے ہاں موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد جس حد تک ہم اپنا اپنا آدمی تخلیق کر سکیں گے سا[illegible] انداز پر ہم اپنے خام وسائل کو نت نئی شکلیں دیتے رہیں گے۔ اور آج ۳۷ سال بعد روس کی طاقت کسی مغربی حریف سے کم یا کم جدید نہیں ہے۔ ان معمولی الفاظ میں یہ بہت بڑی حقیقت پوشیدہ ہے کہ کسی بھی جدید ترین مشین کی موجودگی اس وقت تک لاحاصل ہے۔ جب تک کام کرنے والا ذہن پرانا ہے۔ اور جدید کی پیچیدگی کو نہیں سمجھ پاتا۔ ترقی پذیر ممالک کے معاشروں میں جو ایک ذہنی انتشار ہے۔ اس کی ایک سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ کچھ ایسے ماحول میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ جس کی پیچیدگی اس کے قدرے پرانے ذہن کی پہنچ سے باہر ہے۔ نئی تہذیب کا ایک اور اہم سنگِ میل یہی ہونا چاہیے کہ جدید تر کی الجھن سے بچنے کے لئے تعلیم کی اساس جدید ترین علوم کی اعلیٰ سطح پر رکھی جاتے اور تعلیمی نصاب میں زیادہ سے زیادہ سخت کوشی کو دخل ہو۔ اور جب تک ایک جدید تر ذہن ان ممالک کو میسر نہ آتے اس وقت تک جو کچھ موٹا جھوٹا اندرونِ ملک میسر ہو۔ اُس کو زندگی کا لازمہ بنا دیا جائے۔ اِس سے آگے کی منزل پھر اسی ہی طرز پر از خود متعین ہوتی رہے گی۔ ورنہ تو دساور سے قومی ضروریات کے نام پر نت نئے فیشن اور نت نئی الجھنوں کا بیوپار جاری رہے گا۔ اور نئی تہذیب کی تشکیل اور تعمیر کا نعرہ بھی باہر سے آتے ہوتے دوسرے فیشنوں میں سے ایک فیشن ہوگا۔

(اردو مجلس کی ماہانہ نشست میں پڑھا گیا)

علی جواد زیدی

جو نامراد کشاکش میں مبتلا نہ رہا
خودی تو کیا وہ خدا کے بھی کام کا نہ رہا

بجھے گا کوئی دیا، کوئی پھول ٹوٹے گا
مجھے بھلا کے نہ سمجھو کہ مسئلہ نہ رہا

ہزار آندھیوں میں اک چراغ فکر و نظر
گھڑی گھڑی یہی دھڑکا رہا خدا نہ رہا

یہ پیلا چاند، یہ شبنموں کا بے زباں شاہد
اداس ہے کہ جوانوں کا قافلہ نہ رہا

وہی ہوا، وہی قطرہ، وہی سمندر ہے
جو سر اٹھا کے چلا تھا وہ بلبلا نہ رہا

سنا ہے تیرے سوا اے غرورِ بے باکی
جہانِ نو کے لئے کوئی آسرا نہ رہا

وہ ناشناسوں کا جمگھٹ تھا جلوہ گاہوں میں
ادا شناسوں کو چلنے کا راستا نہ رہا

وجودِ ہوش تھا اک رہگذار کا جھونکا
سرکتی ریت پہ دم بھر بھی نقشِ پا نہ رہا

میں ایک زخم ہوں دل اجنبی سہی لیکن
جو مڑ کے دیکھ لیا تم نے پھر گلا نہ رہا

مجھے مٹا دو، مگر سن لو میں گوئی بھی
یہی کہو گے کہ ہستی میں ہمہمہ نہ رہا

ادب کی قدر کسی مشتری کے بس کی نہیں
یہ قدر کم ہے کہ غیروں کو حوصلہ نہ رہا

شعورِ سوز کو ترسے ہوئے زمانے میں
کمی ہی کیا ہے جو زیدی سا بے نوا نہ رہا

افسر ماہ پوری

کسی نے زلف بکھرا دی طلوعِ جام سے پہلے
اندھیرا چھا گیا صحنِ چمن میں شام سے پہلے

کبھی جب یاد کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے
وہ دن گذرے ہوں شاید گردشِ ایّام سے پہلے

نہ کیوں ہم کو ملے گی ایک دن دادِ وفا اُن سے
خیال آئے ہزاروں اس خیالِ خام سے پہلے

تڑپنا، لوٹنا، خاموش رہنا، مسکرا دینا
ہمیں معلوم ہے انجامِ دل، انجام سے پہلے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے رہ و رسمِ محبت میں
سزا ملتی ہے اہلِ شوق کو انعام سے پہلے

یہ ذرّے خاک کے کیا کیا فسوں کاری دکھاتے ہیں
اُتر کر آئیے تو بندہ پرور بام سے پہلے

یہی تو سوچ کر نکلے ہیں راہِ شوق میں افسرؔ
پہنچ جائیں گے منزل پر سوادِ شام سے پہلے

فضا ابن فیضی

دن سنہرے رخِ ارغواں کی طرح، شب جواں گیسوئے مشکبو کی طرح
زندگی باوجودِ تقاضائے غم شوخ ہے دلبرِ خوبرو کی طرح

دل میں گیتوں کی کلیاں چٹکنے لگیں آرزوؤں کی کلیاں مہکنے لگیں
دشتِ جاں میں تری یاد ہے خیمہ زن کاروانِ گل و رنگ و بو کی طرح

مجھ کو سنگِ سرِ رہگزر جان کر یوں نہ پیروں سے ٹھکرا کے آگے بڑھو
میں ہوں اک دجلۂ کیف دیکھو مجھے اپنے ہاتھوں میں لیکر سبو کی طرح

شکر ہے آپ کا درد ہے ہم سفر عشق کی منزلوں میں میں تنہا نہیں
پھر رگِ جاں سے اٹھی ہے اک موج سی گنگناتی ہوئی آبجو کی طرح

میں بھلا اس کو کس منہ سے قاتل کہوں کیسے برہم زنِ رنگِ محفل کہوں
واسطہ جس نظر کو رہا زخم سے چارہ سازوں کی سعیٔ رفو کی طرح

لہلہاتی کوئی کشتِ لوح و قلم ان کے چہرہ کا دُسے تو کوئی بات تھی
جذب ہونا انہیں دامنوں میں ہے جب کرن آنکھوں سے ٹپکے لہو کی طرح

بوجھ الفاظ کا کون ڈھوتا پھرے، فکر شرح و بیاں میں اُلجھتا پھرے
خامشی بھی اک اسلوبِ اظہار ہے اہلِ دل کے لئے گفتگو کی طرح

اے رفیقانِ روشن جبیں کچھ کہو کن چراغوں کو ایسے میں آواز دوں
زندگی اتنے تاریک حالات میں بجھ گئی شعلۂ آرزو کی طرح

درد کی دھوپ منزل بہ منزل سہی، آتشیں تیری دنیا کا موسم سہی
میرے ہاتھوں میں رقصاں ہے اب بھی قلم ایک سروِ لبِ آبجو کی طرح

حزیں لدھیانوی

دل کی آگ بھڑک کر بن گئیں مہر درخشاں میری غزلیں
کرتی ہیں تاریک دلوں میں جشنِ چراغاں میری غزلیں

سایۂ دار میں بیٹھ کے میں نے لکھی ہیں اے سرو خراماں
زیرِ صنوبر بیٹھ کے سننا خنداں خنداں میری غزلیں

وقت کے بہتے دریا کی لہروں کا ترنم میرے نغمے
ہنستے رہتے آدم کی تاریخِ پریشاں میری غزلیں

اے گل سوکھے خار کے ساتھی اے غمگیں فنکار کے ساتھی
بن کے رہیں گی تیرے میرے درد کا درماں میری غزلیں

فصلِ بہاراں کی شہزادی ناچے گی پھر گلشن گلشن
تیرے مہکتے ہونٹوں پر پھر ہوں گی رقصاں میری غزلیں

تم نے بنا دیں فیض سے اپنے آئینہ دارِ حسنِ فطرت
اے غمِ جاناں میری غزلیں، اے غمِ دوراں میری غزلیں

غم کے سارے توڑ کے حلقے آخر کار حزیں جا پہنچیں
میرے ظلمت خانے سے تا شہرِ نگاراں میری غزلیں

مظفر حنفی

سُن کر ہمارے شعر کبھی تو ہنسا کرو
فطرت پہ اختیار نہیں، تم بھی کیا کرو!
ممکن ہے تلخ بات میں شامل خلوص ہو
ٹھنڈے دماغ سے تو ذرا سُن لیا کرو
حساس ایک تم ہی نہیں دوسرے بھی ہیں
بے وجہ دوستوں سے خفا مت ہوا کرو
تلقینِ صبر زہرِ ہلاہل سے کم نہیں
خود ہی پتہ چلے گا، محبت ذرا کرو
تم ہی، جو اتحاد کے حامی ہو اس جگہ
موقع ملے تو گوشت سے ناخن جُدا کرو
اپنی سُنا رہا ہے تمہیں ہر تماش بین
مقتول سے حقیقتِ قاتل سُنا کرو
ہم سر پھروں کی قید ہے بزمِ تکلفات
دَم گھٹ رہا ہے حبس کے مارے ہوا کرو
بیٹھے بٹھائے لوگ مجھے گھورنے لگے
یُوں اپنی انجمن سے نہ غائب رہا کرو
ویسے تو دستِ شوق سے بے حد خفا تھا وہ
لیکن نگاہ بول رہی تھی، خطا کرو
کانٹے نہیں کہ گرتے ہوئے تھام لیں تمہیں
آسان راستوں پہ سنبھل کر چلا کرو
پہلو بچا کے طنز مظفر نے کر دیا
ہم سے نہیں تو غیر کسی سے وفا کرو

حامد سروش

ٹوٹا پھوٹا دل لے کر ہم شہر میں تیرے آئے تھے
تجھ کو بھی اپنا دوست نہ پاکر ہم کتنا گھبرائے تھے

چہرے پہ اُمڈتی زلفوں کو جھٹ سے اس نے سنبھال لیا
ورنہ شاعر لوگ یہ کہتے چاند پہ بادل چھائے تھے

اُجلے اُجلے چہروں والے من کے میلے لوگو!
ہم کو زد پر دیکھ کے تم نے کتنے تیر چلائے تھے

سانولی شاموں میں اب بھی وہ سانولی لڑکی ملتی ہے
پیارے جس کے بالوں میں ہم نے اُجلے پھول سجائے تھے

اپنے حسد کی آگ میں جل کر ناحق ہم پر ظلم کئے
کیا اپنوں کی اس محفل میں ہم ہی صرف پرائے تھے

وقت کی دھول اور گردشِ دوراں کوئی انہیں کجلا نہ سکی
ہم نے اپنے خون سے یارو کیسے نقش بنائے تھے

حامدؔ جی بال سفید ہوئے من کی بھی سیاہی دھو ڈالو
عقبیٰ کو تم بھول گئے، ہم یاد دلانے آئے تھے

یونس رمزی

آصفہ باجی

رشبِ انتظار" ـــ سولہویں صدی کے ویران آرٹ کا ایک مرقع اکثر میری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، اور میں سوچتا
شبِ انتظار کی اس خوب صورت لڑکی کی محض آنکھیں اس تصویر کے عنوان کی کتنی عمدہ مبصر ہیں۔ اس لڑکی کی
ں میں شبِ انتظار واقعی کارواں والی شب کی طرح ٹھہر گئی تھی۔ دبے پاؤں پھولوں کی شاہراہ سے گذرنے والی
کشاں کے جگر سے بھی پھوٹ کر کبھی کبھی کس قدر یاس انگیز بن جاتی ہے۔

شام کا سُرمئی اندھیرا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ مینشن میں پرچھنے والی مانوس زرد دھوپ حسبِ معمول شاہد
یر تک پہونچی۔ مسکرا کر اُسے دیکھا اور چپکے سے دبے پاؤں نکل گئی۔ لوٹو پارک سے واپسی پر آپا سے اُلجھ رہا تھا" دودھ
ے" ــ اور آپا کہہ رہی تھی "اچھے بچے چائے نہیں پیتے"۔

میں ٹہلتا ہوا بالکونی میں نکل آیا۔ شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ کھیل کے میدان سے بچے واپس آرہے تھے۔
والی عمارت کی لان میں لڑکیوں نے آرک لیمپ جلا کر کھیلنے کی تیاری کر لی تھی۔ مسٹر اور مسز کواس جی حسبِ معمول
رمی کے بعد واپس آرہے تھے۔ گذرنے والی گاڑیوں کے لائٹ جل چکے تھے اور عمارتوں میں برقی قمقموں کی روشنی
لی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کر چاروں طرف اس طرح پھیل رہی تھی جیسے پانی کی سطح پر کنکر اُچھلنے کے بعد قوسیں
یسے اُبھر اُبھر کر پھیل جاتے ہیں۔ یہ دائرے رات گئے تک پھیلتے رہتے ہیں حتیٰ کہ شہر کی مہذب آبادی ان قوسوں
رُوں میں سمٹ آتی ہے۔

میں نے سگریٹ جلایا اور دور دور دیکھنے لگا۔ خصوصاً اُس سڑک کی جانب جو چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح
تی ہوئی دور پہاڑیوں کی طرف نکل گئی تھی۔ اور پہاڑیوں پر رات کے اندھیرے نے ایک چم کے ساتھ اپنا پاؤں جما
۔ اچانک میری بھٹکتی ہوئی نگاہیں مقابل کے بالکونی میں جم گئیں۔ بالکونی کے اندھیرے میں کوئی لڑکی کھڑی تھی ـــ
لی سی تنہائی کا جلتا ہوا دامن تھامے ـــ وہ میری بالکونی کی روشنی سے بھی ہراساں نظر آرہی تھی۔ اور کچھ یہی
ے کہ وہ بائیں جانب بالکونی کے قدرے اندھیرے گوشے میں کھڑی تھی۔ بہار میں کھلنے والے اکیلے پھول کی طرح جس
ئی اسے ڈس کر موت کی نیند سلا دیتی ہے :

"کون ہے یہ لڑکی ؟ — میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، وہ اتنی اداس اور چُپ چُپ سی کیوں ہے ؟"
میں نے اپنی بالکونی کی روشنی بجھا دی - اس اندھیرے میں پتہ نہیں کیوں میری دھڑکنوں کے پھول کھل اُٹھے
ری چوری اس کی طرف کیوں دیکھ رہا ہوں — کہیں اندھیرا نہ مہک اُٹھے، کہیں میری دھڑکنوں کی چند خوشبو اس
نہ پہونچ جائے — مگر میں کتنا چیپ انسان ہوں - غالبًا ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے - یہ بڑی ذلیل حرکت ہے "
اور اس مجرمانہ احساس نے دھڑکنوں کے پھول کو مرجھا دیا - ذہن سے پھیلنے والی روپہلی سرد چاندنی دوپہر کی چلچلاتی
یں ڈھل گئی - میں فورًا اپنے کمرے میں آگیا - مینٹل پیس پر شاہدہ کی تصویر مسکرا رہی تھی :

"Life without woman is endless torture"

(عورت کے بغیر زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت ہے)

میں نے یہ جملہ شاہدہ کو کئی بار لکھا تھا - اور بستر مرگ پر پڑی ہوئی شاہدہ نے آخری لمحات میں میرا ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں
کر کہا تھا: " وعدہ کرو کہ تم دوسری شادی کرلوگے — وہ جملہ تمہیں یاد ہوگا

"Life without woman is endless torture"

(عورت کے بغیر زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت ہے)

خلجان کا مداوا ایک عورت ہے "

"مگر یہ سب کچھ میں کیوں سوچ رہا ہوں - بالکونی والی لڑکی کی سی ہزاروں لڑکیاں روزانہ نگاہوں کی ترازو میں تُلتی ہیں
س سے کیا ہوتا ہے - اَبروؤں کے تیر اور مژگاں کی سنانیں سینے کے پار ہو جاتی ہیں ہوا کریں - رخساروں کے پھول کھلتے
ہونٹوں کی شفق پوری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے ہوا کرے - تن و پیراہن کی خوشبو رگِ جاں کو چھیڑتی ہے اور بس
مگر — مگر یہ سب کچھ میں کیوں سوچ رہا ہوں - مجھے یہ سب کچھ سوچنے کی ضرورت کیا ہے "
دوسری صبح جب میری آنکھیں کھلیں تو دریچے سے سویر کی خوشگوار ہوا آ رہی تھی - اور سورج کی کرنوں کے جال بچھاؤں
، بار ہو رہے تھے - چائے کپ کی ٹھنڈی ہو چکی تھی، اور میرا لڑکا لولو ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کی میز پر میرا منتظر تھا - اتنی
ی جان کو بھی انتظار کرنا پڑتا ہے
"لولو تم ناشتہ کرلو — مجھے دیر ہوگی "
اور اُس نے بڑی سنجیدگی سے گردن ہلا کر کہا "اچھا پاپا" — اور دودھ میں سلائس کے ٹکڑے ڈالنے لگا -
میں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا — اور واش بیسن سے پلٹ کر جب دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو گذشتہ شام والی
پھر بالکونی میں کھڑی تھی - وہی یکساں اداسی اور تنہائی کا جلتا ہوا دامن تھامے - اُس نے بالوں کو گوندھ کر بڑے سلیقے سے
ٹیاں بنائی تھیں - اور سپید دوپٹے میں قدرے زرد رخساروں کو چھپائے نیچے شاہراہ کی طرف دیکھ رہی تھی - مگر اُس
نکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی سُرخی بڑی منفرد تھی - جیسے زرد چاند کی سطح پر شفق کی دو لکیریں کھینچ دی گئی ہوں، اور
وں کی چمک بڑی متجسس، اُبھرتی ہوئی تیز اور شوخ تھی جو احساس کے ہر پردے کو چیر جائے، تاریکی کے سینے میں جگنو
ہے اور پھر ان جگنوؤں سے رات کی مانگ سجا دے - میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اپنے دل کے قریب ایک اُجالا سا

محسوس کیا۔ نہایت ملائم سا اُجالا، جیسے سورج کی کرنوں میں گرتے ہوئے آبشار کی روشن چادر میرے چاروں طرف پھیل گئی ہو اور میں سوچنے لگا، ان خوب صورت متجسس آنکھوں کو کس کا انتظار ہے۔

اور معاً مجھے خیال آیا میرے کمرے میں آویزاں ایرانی آرٹ کے مرقع میں کہیں جان تو نہیں پڑ گئی۔ وہ شبِ انتظار کی لڑکی تو نہیں جس کی پلکوں کی چلمنوں کے پیچھے آنکھوں کی کافوری شمعیں روشن ہیں۔

لڑکی کی نظر اچانک مجھ پر پڑی اور وہ سہم کر ہٹ گئی۔

اتنے میں ٹوٹو بھی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"اور میں نے دیکھا، ٹوٹو کے آتے ہی 'شبِ انتظار' والی لڑکی دوبارہ بالکونی میں پلٹ آئی۔ اُس نے مسکرا کر ٹوٹو کی طرف دیکھا۔ ٹوٹو نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

اور یہ سب کچھ دیکھ کر میں حیران رہ گیا:

"تم انہیں جانتے ہو ٹوٹو ۔۔۔؟"

"ہاں میری آصفہ باجی ہیں"۔

"اچھا وہ باجی ہیں تمہاری ۔۔ کب سے؟"

اور جب میں نے آیا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ٹوٹو ایک ہفتہ سے میری غیر موجودگی میں آصفہ کے ساتھ ہی رہتا ہے۔

"ٹوٹو ۔۔ تم بہت اچھے ہو" ۔۔ میں نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا، حتیٰ کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے بوجھل پلکوں سے شاہدہ کی تصویر کی طرف دیکھا، "دیکھتی ہو شاہدہ، ٹوٹو کو بھی سہارا مل گیا ہے ۔۔ لیکن اس دنیا میں تنہا تو صرف میں ہوں"۔

اور شاہدہ نے جیسے پھر میرے کانوں میں سرگوشی کی ۔ "Life without woman is endless torture" ۔ (عورت کے بغیر زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت ہے)۔

"یہ بکواس، یہ محض بکواس ہے" ۔۔ میں نے دریچہ بند کر دیا۔ اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اور جب میں اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر رہا تھا، آیا ٹوٹو کو لئے ہوئے سامنے والے مکان کے دروازے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا کام بھی کس قدر آسان کر لیا تھا۔ مجھے قدرے آیا پر غصہ آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کون ہے یہ خبطی لڑکی جو ٹوٹو کو خواہ مخواہ اپنانا چاہتی ہے۔

دفتر سے واپسی پر ٹوٹو بس اپنی آصفہ باجی کے ہی تذکرے کرتا رہتا۔

"آج انہوں نے کارڈ بورڈ کا مکان بنا کر دیا ہے"۔

"آج ہی ٹوکی فال بازار سے جا کر دلائی ہے"۔

"یہ ایئرگن بھی انہوں نے ہی دی ہے"۔

"بُری بات ہے ٹوٹو تم ان سے اتنی چیزیں نہ لیا کرو"۔ میں اُسے اکثر سمجھاتا۔

لیکن دیکھتے دیکھتے ٹوٹو نے اپنے کمرے میں کھلونوں کے انبار لگا دیئے۔ وارڈروب، الماری، شلف، صوفہ، میزیں ۔۔۔ جہاں دیکھو کھلونے پڑے ہیں۔ اور ایک دن ٹوٹو نے خوش خبری سُنائی کہ وہ اُسے پڑھانے بھی لگی ہیں۔

میرے دفتر سے آنے کے بعد ٹوٹو وہاں سے چلا آتا تھا، اور آصفہ بالکونی میں آکر کھڑی ہو جاتی۔ وہی یکساں اُداسی اور ...ائی کو ہمراز بنائے۔ لیکن میں جب بھی اُس کی آنکھوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرف دیکھتا ہوں دل کے قریب نرم ریشمی اُجالا ...یل جاتا ہے۔

دھیرے دھیرے ٹوٹو نے مجھے آصفہ کے بے حد قریب کر دیا تھا۔ اب ٹوٹو میرے پاس کھڑا ہو کر بالکونی سے بھی چیخ کر باتیں ...لیتا تھا۔

ایک شام جب وہ آصفہ سے اس طرح باتیں کر رہا تھا میں نے اُس سے سرگوشی کے لہجے میں کہا:

"ٹوٹو، ان سے کہو یہاں آجائیں"

لیکن میں نے محسوس کیا کہ دھڑکنوں کے پھول پھر کھل اُٹھے ہیں۔ اور اُن کی چور خوشبو آصفہ تک پہنچ گئی ہے۔

ٹوٹو نے چیخ کر کہا۔ "پاپا کہتے ہیں باجی سے کہو یہاں آجائیں"

میں اُس کے اِس جملے پر جھنجھلا سا گیا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا — اور ڈانٹتا ہوا اندر آکر چیدروں کی طرح بستر پر ڈھے گیا۔ ٹوٹو ہنوز بالکونی میں کھڑا تھا۔ وہ آصفہ سے اب بھی باتیں کر رہا تھا، اور مجھے اپنی بے بسی اور تنہائی پر رونا آرہا تھا۔

"پاپا، سو گئے پاپا —" ٹوٹو نے بڑی بے چارگی سے پکارا۔

"ہاں!" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"پھر تو میں نے بے کار ہی باجی کو بُلایا —!"

"باجی کو بلایا ہے — پاگل —!" میں نے اس کے رخسار پر ہلکا سا طمانچہ مار دیا۔

ٹوٹو گم سم قالین پر بیٹھ گیا، اور میں پسینے سے شرابور چادر میں یوں ہی لیٹا پڑا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے کمرے میں کسی کے ٹُھک قدموں کی چاپ سنائی دی —۔ وہ آصفہ ہی تھی۔

"اوہ آپ؟" — میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"ٹوٹو تم نے انہیں ناحق تکلیف دی۔"

"آپ ہی نے تو انہیں بُلانے کو کہا تھا"۔ ٹوٹو اِٹھلا کر بولا۔

"بڑا شیطان ہے یہ ٹوٹو —" میں نے خجل ہو کر کہا۔

"دراصل میں خود ہی آنا چاہتی تھی"۔ اُس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اور صوفہ پر بیٹھ گئی۔

میرے دل کے قریب ریشمی اُجالا پھرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی شفق لچک کر پورے ماحول پر ٹوٹ گئی تھی۔ میری دھڑکنوں کے پھول مہک اُٹھے تھے۔ اُن کی چور اور آوارہ خوشبو کو آصفہ نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

شبِ انتظار کی لڑکی تصویر کے نہاں خانہ سے اچانک میرے سامنے آگئی تھی۔ اور جب شاہدہ کی مسکراہٹ نے مجھ سے کہا "Life without women is endless torture" (عورت کے بغیر زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت ہے) — تو میں بھی جواباً مسکرا کر رہ گیا جیسے میں نے پہلی بار اس کا اعتراف کر لیا ہو — جیسے میں نے شکست تسلیم کر لی ہو — میں نے دل ہی دل میں کہا: "شاہدہ — شاہدہ، یہ واقعی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ شاہدہ،

یہ ٹوٹو سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور.......

"یہ تصویر کس کی ہے؟" — آصف نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ممی کی —" ٹوٹو نے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ تمہاری ممی کی تصویر ہے — یہ!"

"ہاں باجی — میں نے کہا تھا ناکہ کسی دن ممی کی تصویر لے کر آپ کو دکھاؤں گا"

اتنے میں آیا جس نے آصف کو آتے ہی دیکھ لیا تھا چائے بنا کے لے آئی اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا کر چائے کی ٹرے آصف کی جانب بڑھا کر بولی:

"لو بٹیا اب سنبھالو اسے"

"ٹوٹو بڑا ہی شریر ہے کافی پریشان کرتا ہوگا آپ کو" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو — مجھے تو اس کی ہر ادا پسند ہے" اس نے بڑی محبت بھری نظروں سے ٹوٹو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تقریباً گھنٹہ بھر تک بیٹھی ٹوٹو ہی کی تعریف کرتی رہی — یہاں تک کہ وہ اس کی گود میں سو گیا۔ اُس نے آہستہ سے اُسے بستر پر لٹا دیا، اور بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی — "اچھا اب چلتی ہوں" اُس نے تقریباً سرگوشی کے لہجے میں کہا "کہیں ٹوٹو کی آنکھ نہ کھل جائے"

"پھر کب آئیں گی —؟"

"جب ٹوٹو بلائے —" اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

دل کے قریب پھیلنے والا اُجالا پھیلتا گیا۔ ذہن کے دریچے میں، شب انتظار والی لڑکی کے پلکوں کی چلمن اُٹھتی اور گرتی رہی۔ پھر شبِ انتظار والی میرے قریب آتی گئی۔ اس کے سبک قدموں کی چاپ پر میری روح جاگ پڑتی تھی۔

ایک رات کا ذکر، اچانک بارش ہونے لگی۔ وہ ٹوٹو کو لے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور کھانا بنانے لگی۔ میں اُس کے قریب ہی کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ پیتا اور اُسے دیکھتا رہا — وہ بالکل شاہدہ کی طرح بیٹھی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اُس کی صبیح پیشانی پر مچل کر آگئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح اُس کے ننھے سرخ ہو گئے تھے۔ چوڑیوں کی وہی یکساں جھنکار تھی۔

پھر آصف نے لائٹ بجھا کر ایک زمانے کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر رکھی ہوئی شمعدان روشن کر دی — میں اچانک بہت اُداس ہو گیا — یہ لڑکی تو ایک دم سے شاہدہ بن گئی تھی۔ وہ بھی ایسے ہی پرسکون ماحول میں کھانا پسند کرتی تھی۔ شمعدان کی روشنی آج شاہدہ کے بجائے آصف کے رخساروں پر پڑ رہی تھی، سہانے بھور کے اُجالے کی طرح۔ اُس کے ہونٹوں کی سُرخی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

ہم سب بڑی خاموشی سے کھاتے رہے حتیٰ کہ کھانا ختم ہو گیا، لیکن بارش کی رم جھم رکنے کو نہ آتی تھی۔

ٹوٹو تھوڑی دیر بعد ہی اس کی گود میں سو چکا تھا۔ وہ اُسے بستر پر لٹا کر اس کے قریب کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی اُس کی پیشانی سہلا رہی تھی۔

"آیئے، اِدھر آجایئے — ہم باتیں کریں" میں نے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

وہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

"بارش رُکنے کو نہیں آتی، مجھے اب چلنا چاہئے"۔

"ابھی تو دس ہی بجے ہیں ــــ ٹھہرئیے ــــ اتنی جلدی بھی کیا ہے"۔

لیکن ہمارے درمیان بڑی اتھاہ اور گہری خاموشی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں کئی بار جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس لمحہ میں نے محسوس کیا، ان آنکھوں کی پنہائیوں میں بھی اداسی اور تنہائی کی راکھ ہے۔

"آپ اس قدر اُداس کیوں رہتی ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں تو ــــ آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے ــــ" اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ صبح میں ڈوبنے والے آخری ستارے کی طرح ــــ میرے اس سوال پر جیسے وہ خاموشی اتھاہ سمندر میں پایاب ہوتی چلی گئی، اور میرے روکنے کے باوجود وہ بارش میں بھیگتی ہوئی چلی گئی۔

دوسری شام ٹوٹو نے بتایا: باجی کو بڑا بخار ہے' وہ بہت رو رہی تھیں"۔ اُس کا گلا رُندھ آیا ــ اُس نے آصفہ کے ہاں جانے کی فرمائش کی، اور میں اسے دروازے تک چھوڑ آیا۔

اُس رات ٹوٹو آصفہ کے ساتھ ہی رہا۔ اور اس کی عدم موجودگی میں میری تنہائی میرے لئے اور بھی سوہانِ روح بن گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی سوتا تھا۔ میں بار بار بالکونی میں آجاتا، شاید ٹوٹو نظر آجائے، شاید کہ آصفہ وہاں کھڑی ہو ــ اور مجھے یاد ہے اُس رات میں بالکل نہ سو سکا۔ بس صبح آنکھ لگی تھی کہ ٹوٹو مع اپنی باجی کے میرے سرہانے کھڑا تھا۔

"ہم آگئے" ــ

اور میں اُٹھ بیٹھا۔

"کیسی ہے طبیعت آپ کی ــ؟"

"میں تو بالکل اچھی ہوں"۔

"مگر ٹوٹو نے تو ــــ"۔

"جی بس یونہی طبیعت نڈھال تھی"۔

"بہرحال آپ نے تو مجھے خاصا ذہنی خلجان میں مبتلا رکھا"۔

"اچھا!" ــــ وہ ہنسنے لگی ــــ "لائیے آپ کے لئے چائے بنا دوں"۔

اور اُس دن ٹوٹو اور آصفہ نے مجھے اس طرح رخصت کیا جیسے شاہدہ کیا کرتی تھی۔

پھر ایک سال بعد کا ذکر ہے ــــ وہ دن بھی آئے کہ آصفہ صبح سویرے آجاتی، چائے بناتی، ناشتہ تیار کرتی، زبردستی میرے جوتوں پر پالش کرتی۔ وارڈروب سے کپڑے نکالتی، اور مجھے دفتر رخصت کرکے ٹوٹو کو ساتھ لے کر اپنے گھر چلی جاتی اور جب میں دفتر سے آتا تو کمرے صاف ستھرے نظر آتے۔ چیزیں قرینے سے سجی ہوتیں اور چائے تیار ملتی۔ ٹوٹو، میں اور وہ رات گئے تک کیرم کھیلتے رہتے اور وہ ٹوٹو کو لے کر اپنے گھر چلی جاتی یا کبھی میری ضد پر چھوڑ جاتی۔ لیکن ٹوٹو کو چھوڑتے وقت اس کے چہرے پر زردی سی کھنڈ جاتی تھی ــ اور کچھ یہی وجہ تھی کہ ایک شب میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

"آصفہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہیں یہاں سے جانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے "

اور میرے اس جملہ نے اچانک ہلچل سی مچا دی ۔ اُس کے چہرے کا تاثر ایک دم بدل گیا ۔ آنکھوں میں چھپی ہوئی ویرانی اُبھر آئی اور رخساروں کے پھول زرد پڑ گئے ۔ میرا یہ جملہ جیسے ایک طوفان تھا جس میں وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈگمگا رہی تھی ۔ اور میری دھڑکنوں کے پھول مُرجھا گئے ۔ آصفہ کی اُداسی نے انہیں ڈس لیا ۔ اور دل کے قریب پھیلنے والا اُجالا جو اس عرصہ میں اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ سمٹ کر میرے دل کے نہاں خانے میں چھُپ گیا ۔ میں نے اس کا ہاتھ اس طرح چھوڑ دیا جیسے سرسبز شاخ سے کوئی پھول ٹوٹ کر لڑھک جائے ۔

بڑی دیر بعد اُس نے اُداس لہجے میں کہا :

" ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اشرف صاحب ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ..... "

" کیوں نہیں ہو سکتا " میری آواز میں لرزش تھی ۔

" میں ٹولو کی سوتیلی ماں بننا نہیں چاہتی ---"

اور قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور میرے گرد سناٹا پھیلا کر چلی گئی ۔ سناٹے کی وہ دیوار جسے میں کبھی عبور نہ کر سکوں ---

اور میں نے محسوس کیا کہ شبِ انتظار والی لڑکی پھر تصویر کے چوکھٹے میں سما چکی ہے ۔ وہ شیشے کے پیچھے شبِ انتظار کے مرقع میں ڈھل گئی ہے --- اور ظاہر ہے کہ اسے حاصل کرنے کی تمنا نہیں کی جا سکتی ۔ میری نگاہیں بڑی دیر تک شبِ انتظار والی لڑکی کے مرقع پر جمی رہیں ۔ کل پھر یہ تصویر سامنے والی بالکونی میں ہوگی ، اور نیلے آسمان میں اکیلے ستارہ کی چاہت میں ہاتھ بڑھا بڑھا کر میں تھک جاؤں گا ---

اور میں نے جھنجلا کر تصویر پلٹ دی ---

میں نے فیصلہ کر لیا کہ ٹولو کو اب اُس کے پاس جانے سے روک دوں گا ۔

اور اسی لمحہ میرے ضمیر نے مجھ سے کہا " تم کتنے خود غرض ہو ۔ ٹولو کو تم نے ایک سہارا بنایا تھا "

" ہاں بنایا تھا --- " میں نے جلتا ہوا سگریٹ جُوتے سے مسل دیا ۔

اور دوسری صبح جب ٹولو آصفہ کے ہاں جانے کے لئے مچلا تو میں نے اُسے ڈانٹ کر منع کر دیا ۔ آیا کو تاکید کر دی کہ وہ اس کے گھر نہ جائے ورنہ میں اُسے نکال دوں گا ۔

دفتر سے واپسی پر میں نے دیکھا ، ٹولو روتے روتے سو چکا تھا ۔ میں نے اُسے جگا دیا ۔ پیار کیا ، ٹہلانے لے گیا ، لیکن اس کی اُداسی ختم نہ ہوئی ۔ اُس نے پھر آصفہ کے یہاں جانے کے لئے ضد کی --- میں نے پھر اُسے ڈانٹ دیا ۔ حالانکہ ایسا کرتے وقت میرا دل خون ہوا جا رہا تھا ۔

اُس نے رات کا کھانا نہ کھایا ، اور نہ ہی مجھ سے بات چیت کی ۔ چُپ چاپ میری کرسی کے قریب ہی قالین پر سو گیا ۔

صبح اُس نے پھر ضد کی ، اور اس بار مچل مچل کر رونے لگا ۔ میں نے بھی غصے میں اسے جھنجوڑ ڈالا ۔ اُس کے نرم و نازک رخساروں پر تھپیڑوں کی بارش کر دی ۔ یہاں تک کہ آیا اُسے زبردستی گھسیٹ کر مجھ سے دور لے گئی ۔ میں دفتر چلا آیا ، لیکن تمام

دن میری ہتھیلی پر ٹوٹو کے رخساروں کے پھول جلتے رہے — کتنی سوزش تھی ان میں ۔ میں کانپ گیا ، رو رو اٹھا۔ لیکن یہ خلش بڑی لازوال تھی ۔

میں نے واپسی پر اُسے سینے سے چمٹا لیا ، اور میرے آنسو بے اختیار بہہ نکلے ۔ میں اُسے گود میں لئے بالکونی میں آ گیا۔ شب انتظار والی لڑکی آصفہ یکساں انداز میں تنہائی کا جلتا ہوا دامن پکڑے اپنی بالکونی میں کھڑی تھی ۔ آج اُس کے ہونٹوں کی شفق بھی مرجھا چکی تھی ۔ اُس نے بڑی حسرت آگیں نظروں سے ٹوٹو کی طرف دیکھا اور ٹوٹو اسے دیکھتے ہی مچل پڑا۔

" میں باجی کے پاس جاؤں گا — میں باجی کے پاس جاؤں گا — "

اور جب میں زبردستی اسے گھسیٹ کر کمرے میں لا رہا تھا تو میں نے دیکھا شب انتظار والی لڑکی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی ۔

ٹوٹو میری گود میں ایک بے بس پرندہ کی طرح مچلا ، تڑپا ، اُچھلا ، کودا ۔ میں نے مار مار کر اُسے اَدھ موا کر دیا ، لیکن اسے آصفہ کے یہاں نہ جانے دیا ۔ وہ گھنٹوں سسکتے سسکتے پھر بغیر کھائے پیئے سو گیا۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مکان کو کرایہ پر دے کر کہیں اور چلا جاؤں گا ۔ مگر حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ایک ہی ہفتہ میں ٹوٹو زرد پڑ گیا ۔ روتے روتے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ۔ اُس نے میرے پاس آنا بند کر دیا تھا ۔ ہمیشہ بالکونی میں اُداس بیٹھا رہتا ۔ یہاں تک کہ نویں دن اُسے زور کا بخار چڑھا ۔ بخار کی حالت میں وہ بار بار آنکھیں کھولتا اور اس کے ہونٹ ہلنے لگتے ۔

" باجی — میری اچھی باجی کو بُلا دو "

رات بھر وہ بخار میں جلتا اور ہانپتا رہا — تمام رات میں نے آنکھوں میں گذار دی ۔

صبح آیا نے روتے ہوئے کہا : " صاحب بی بی جی کو بُلا دوں ، ورنہ ننھا مر جائے گا "

میں نے اُسے ڈانٹ دیا : " ننھا نہیں مرے گا آیا ، یہ تمہارا خیال ہے "

" مر جائے گا صاحب — اور بی بی جی کو بھی تو دیکھئے — کیا حالت ہو گئی ہے اُن کی " " ہونہہ بی بی جی — " میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ۔

" صاحب بی بی پہلے ہی بڑے دکھ جھیل چکی ہیں — اُن کے صاحب ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں مر گئے ۔ ایک بچہ تھا ، وہ بھی جاتا رہا ، بالکل ٹوٹو کے جیسا تھا "

" تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا "

اور جب شام کے وقت میں دوا لے کر گھر واپس ہوا تو ٹوٹو ہنس رہا تھا — " پاپا — پاپا اب میں اچھا ہو جاؤں گا — باجی خود ہی آئی تھی "

" ہاں اب تو ضرور اچھا ہو جائے گا میرے لال " میں نے سینے سے چمٹا لیا۔

ٹوٹو کی تیمارداری میں آصفہ نے دن رات ایک کر دیئے ۔ آخر ایک ہفتہ بعد وہ صحت مند ہو چکا تھا ، اور اسی دن میں اپنا گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا تھا۔

شاہدہ کی تصویر اب بھی مینٹل پیس پر مسکرا رہی تھی :

"Life without woman is endless torture"

(عورت کے بغیر زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت ہے)

"ہاں — ہاں، یہ ایک حقیقت ہے مگر میں یوں بھی زندہ رہ سکتا ہوں" میں ہولڈال کا بند کستے ہوئے بڑبڑایا رات کے دس بجے تھے، اور میں نے آصفہ کو مخاطب کر کے کہا: "سنو آصفہ، میرا تبادلہ لاہور ہو گیا ہے۔ ٹولو تمہارے ساتھ رہے گا۔ اسے سنبھال کر رکھنا"

"ہاں ہاں میں باجی کے ساتھ رہوں گا" ٹولو نے تالی بجا کر میرے فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ اور میرے اس فیصلہ کو سننے کے بعد اُس نے ٹولو کو سینے سے چمٹا لیا۔

اُس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے تھے۔

پھر میں نے بڑی حسرت بھری نظروں سے ٹولو کو دیکھا جسے ماں کی ممتا کی ضرورت تھی، آصفہ کو دیکھا جس کی زندگی کا واحد سہارا ٹولو بن گیا تھا۔ اور اس گھر کی طرف دیکھا، جس کے مینٹل پیس پر شاہدہ کی تصویر ہنوز مسکرا رہی تھی — اور زینے طے کرتا ہوا نیچے چلا آیا۔

آج اس واقعہ کو دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ آصفہ میرے ہی مکان میں رہتی ہے — میں اُس کے لئے لاہور سے نہیں لوٹا ہوں۔ حالانکہ میں اب بھی اسی شہر میں رہتا ہوں، ٹولو بھی اسی شہر میں رہتا ہے، اور آصفہ باجی بھی — جو ٹولو کی ماں ہے مگر میری بیوی نہیں ہے۔

رشیدہ رضویہ

خالہ نبیلہ

معروف افسانہ نگار خاتون رشیدہ رضویہ کا یہ افسانہ مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ جنگ سے متعلق اپنی نوعیت کا پہلا اور کامیاب افسانہ ہے جسے افکار فخر و مسرت کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ رشیدہ رضویہ کافی عرصہ تک مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں رہ چکی ہیں اور آپ کے افرادِ خاندان اب بھی وہیں مقیم ہیں۔ خود موصوفہ کئی بار بیت المقدس کی زیارت کر چکی ہیں۔ آپ کا تازہ ناول "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں" اسی پس منظر سے متعلق ہے۔ (ص)

●

صبح کا سپیدہ ابھی زمین پہ پوری طرح نہ پھیلا تھا۔ افق کے کناروں پہ سورج ذرا ذرا ابھر رہا تھا۔ اور سُرخی آسمان پہ یوں پھیلی تھی۔ جیسے بہت سے سُرخ گلاب ایک ساتھ کھلے ہوں۔ اس سُرخی مائل سپیدے میں پیلی زمین ستاروں کی طرح دمکتی تھی۔ اور بہار حسن اور امن و سکون کا احساس دیتی تھی۔ اس بہار میں جب بادِ سحر اپنے ساتھ اذان کی آواز کو لاتی تھی۔ تو یہی جی چاہتا تھا کہ اپنے غم سینہ میں چھپا کر انسان معبودِ حقیقی کے حضور میں جھک جائے۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔ خالہ نبیلہ اس لمحہ اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھی اللہ اکبر کی پکار سنتی تھی۔ اس کا شوہر اور دو جوان بیٹے پچھلی شب سے مسجد میں ہی تھے۔ شہر کے مرد اور لڑکے بالے جوق جوق مسجد کی طرف گئے تھے۔ ادھر چند دنوں سے مسجد سیاسی آماجگاہ بھی بن گئی تھی۔ اور تمام تر وطنی مسائل یہاں حل کئے جانے لگے تھے۔ پچھلی شب کی ہی تو بات ہے کہ بعد نمازِ عشاء یہاں لوگ بیٹھے مشورے کرتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ پچھلی پہر کا چاند دھیرے دھیرے شہر کی دیوار پہ اترنے لگا تھا۔ دیوار کس قدر مضبوط اور اونچی تھی۔ خالہ نبیلہ نے جب دھندلی نظر آتی دیوار پہ چاندنی کو پھیلتے دیکھا تھا تو دل میں یہی خیال آیا تھا — اے کاش — یہ چاندنی اس دیوار کو کاٹ کر رکھ دے۔ دیوار کے پیچھے وطن کی فوج آزادی کے جیالے اور شاندار جوان ہتھیار اٹھائے ادھر سے ادھر قدم اٹھاتے گویا شہر کی حفاظت کرتے تھے۔

دھیرے دھیرے قدم زمین پہ دھرتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ وہ زمین پہ اُتری چاندنی کو اپنے مضبوط قدموں سے ٹھیس نہ پہونچانا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قدموں کی آہٹیں دیوار کے دوسری جانب پہونچ کر دشمن کو چوکنا کر دیں۔ چاندنی میں اُن کے چہرے چمکتے تھے۔ اور ہونٹوں پہ زندگی کی جوان وخوب صورت مسکراہٹ تھی۔

"یہ جوان مسکراتے چہرے پل بھر میں معدوم بھی ہوسکتے ہیں" خالہ نبیلہ کو اپنے بیٹوں کا خیال آیا۔ وہ بیٹوں اور شوہر کے انتظار میں ہی تو گھر کے دروازے پہ بیٹھی تھی۔ محلہ کی تمام خواتین اپنے اپنے گھروں کے باہر بیٹھا شوہروں، بھائیوں اور لاڈلے فرزندوں کا انتظار کرتی تھیں۔ اور مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتِ حال پر بحث کرتی تھیں۔ شب کے خاموش اور تنہا لمحات میں ان کی آوازیں فضا میں گونجتی تھیں۔

"اگر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا؟ ہمارے زعما جنگ کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے جنگ سے خوف محسوس ہوتا ہے" ایک دوشیزہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔ اس کا عم زاد منگیتر آزادیٔ وطن کی فوج میں تھا۔ اور دیوار کے نیچے پہرہ دیتے نوجوانوں میں شامل تھا۔ اور لڑکی کا دل ہر لمحہ اپنے عم زاد کی سلامتی کی دعائیں مانگتا تھا۔

"خوف کیسا؟ دمشق کی لڑکیاں تو باقاعدہ فوج میں شامل ہیں۔ امید ہماری فتح کی ہے" دوسری لڑکی کچھ جوشیلی معلوم دیتی تھی۔ اس لڑکی کی عمر محض انیس سال کی تھی۔ اور یہ خالہ نبیلہ کے چھوٹے لڑکے کی منگیتر تھی۔

"امید — امید تو اس چاند کی طرح ہے لڑکیو۔ سامنے بھی آتی ہے اور چھپ بھی جاتی ہے تو روشنی بھی دیتا ہے اور تاریکی بھی دے کر چلی جاتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بھی ہم نے اپنی فتح کی امید کی تھی۔ لیکن مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اُنیس سالوں سے برابر ہم وطن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ دیوار برابر ہمیں اپنے سامنے نظر آتی ہے۔ اور ہم اس قدر بے بس ہیں کہ آگے بڑھ کر اس دیوار کو نہیں توڑ سکتے" خالہ نبیلہ کی نگاہیں دیوار کی طرف تھیں۔

"خالہ نبیلہ دیواریں توڑنا اس قدر آسان تو نہیں۔ گذشتہ ۱۹ سالوں میں ہمارے اعمال کیا رہے ہیں —؟ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے سوا ہم نے اور کیا کیا ہے؟ ہم آج تک اپنے پاؤں پہ نہ کھڑے ہوسکے۔ اور اپنے مزاروں اور گنبدِ صخرا کو ہی ذریعۂ نجات سمجھتے رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بے حد افتخار ہے کہ ہماری زمین تمام تر پیغمبروں اور نبیوں کی آخری آرام گاہ ہے۔ لیکن ہماری عرب قوم ہمیں اپنے جگر کا ایسا ناسور کہتی ہے جسے نہ کاٹ کر پھینکا جاسکتا ہے نہ جس کا کوئی علاج ہی ہوسکتا ہے۔ جو محض رستا رہتا ہے۔ اور خون کے دھبے جسم پر پھیلاتا ہے۔ ہم خود کو مظلوم کہتے ہیں۔ ۱۹ سالوں سے ہم مظلوم چلے آرہے ہیں۔ لیکن ہماری قوم ہمیں بزدل کہتی ہے۔ ہم بزدل ہیں خالہ نبیلہ"

وہی جوشیلی لڑکی جو خالہ نبیلہ کے بیٹے کی منگیتر تھی، اپنے گھر کے دروازے سے اُٹھ کر گلی کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ اور پھر کی اس دیوار کی جانب دیکھنے لگی جو ایک شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔

"خالہ نبیلہ —" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی خالہ نبیلہ کے قریب آئی۔ اور عین سامنے کھڑے ہوکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ خالہ نبیلہ نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

"خالہ نبیلہ۔ نگاہیں جھکا کر آپ حقیقت سے گریز نہیں کر سکتیں۔ میرے والدین دیوار کے اس پار رہتے تھے ۱۹۴۸ء کی جنگِ آزادی کے بعد وہ ہجرت کرکے بغداد چلے گئے تھے۔ میں بغداد میں پیدا ہوئی تھی۔ اور عراق کو اپنا وطن کہتی تھی۔ ہمارا گھر شارع الرشید کے ایک محلّہ "تحت التکید" میں تھا۔ یہاں فلسطینی مہاجرین کی آبادی تھی بغداد کے باشندے اس آبادی سے گذرتے گھبراتے تھے۔ ہمیں خائن اور بزدل کہتے تھے۔ ہمیں یہودیوں کی اولاد کہہ کر ہم پہ شک کرتے تھے۔ آخر ہم نے مراجعت کی اور یہاں آگئے۔ یہاں آپ کے بیٹے سے میری منگنی ہوئی ہے۔ اور میں اپنا گھر یہاں بناؤں گی۔ گو ہمارے گھروں کا بوجھ اردن نے سنبھال رکھا ہے۔ ہم اپنے پاؤں پہ کب کھڑے ہوں گے۔ خالہ نبیلہ۔ اپنے ہاتھوں سے یہ دیوار کب توڑیں گے؟"

جوشیلی لڑکی غصہ سے چلّائی۔ اُس کی آواز گونجتی مسجدِ اقصیٰ تک جا پہونچی۔ اور میناروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی —

خالہ نبیلہ نے افسردگی سے اپنی ہونے والی بہو کو دیکھا۔ پچھلے پہر کا چاند آہستہ آہستہ سفید ہو رہا تھا۔ دیوارِ یروشلم موت کی طرح بے رنگ اور اُجڑی اُجڑی سی نظر آنے لگی تھی۔ تمام عورتیں اور لڑکیاں چپ چاپ بیٹھی خالہ نبیلہ اور اس کی ہونے والی بہو کو دیکھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جب شب کا دھندلکا چھٹ گیا۔ اور اذان کی آواز گونجی، تو خالہ نبیلہ کی نگاہیں بے اختیار دیوارِ یروشلم پر پڑ گئیں۔ دیوار میں خالہ کو شگاف پڑتے اور جیسے دیوار ٹوٹتی نظر آنے لگی۔

"دیوار ٹوٹ گئی" خالہ نبیلہ بے اختیار پکار اٹھیں۔

"کس نے توڑی ہے؟ اسرائیل نے۔ جس طرح ایران کے سائرسِ اعظم نے فرات کے کنارے تعمیر شدہ دیوارِ بابل توڑ کر تمام بابل پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح ہمیں اسرائیل —" لڑکی کہتے کہتے رک گئی۔ خالہ نبیلہ نے اُس کی بات کاٹ دی تھی:

"بچی۔ میری بچی۔ اس قدر تیزی (تندی) مناسب نہیں۔ مت بھولو کہ ہم اپنی قوم میں سب سے زیادہ پرسکون سرد مزاج اور صابر و شاکر کہے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ خالہ۔ ہمارا خون جون جولائی جیسے مہینوں میں بھی سرد اور جامد ہی رہتا ہے۔ جب کہ دیگر عرب ممالک میں خونی انقلاب آجاتے ہیں۔ لیکن ہم یروشلم سے۔ یروشلم تک نہیں جا سکتے۔ ہر سال حکومت اردنیہ سے اجازت لے کر آنے والے یہودیوں کو دیوارِ گریہ کے نیچے روتے دیکھ کر ہم ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے بھی تو دیوارِ یروشلم کو دیوارِ گریہ بنا رکھا ہے۔ جس کے نیچے کھڑے ہو کر ہم ۲۵ لاکھ اسرائیلیوں کی حیرت انگیز ترقی پہ آنسو بہاتے ہیں۔ اور چلّاتے ہیں کہ اسرائیل کو مغرب اسلحہ اور روپیہ دے رہا ہے۔ جب کہ ہم بھوکے ننگے ہیں۔ ہم سدا بھوکے ننگے ہی رہے ہیں۔"

"مت بھول میری بچی کہ کلام اللہ میں واضح طور پر لکھا ہے — لُعِنَ الَّذِینَ کَفَرُوا مِن بَنِی اِسرائیلَ عَلیٰ لِسانِ داؤدَ وَعیسَی ابنِ مریمَ " (بنی اسرائیل پہ داؤد اور عیسیٰ فرزندِ مریم کی

لعنت ہے)۔

خالہ نبیلہ نے یہ الفاظ ادا کئے تو دیگر خواتین نے خالہ کا ساتھ دیا۔ اور بار بار یہی الفاظ دہرانے لگیں۔ ابھی اُن کے مَرد مسجد سے نہ آئے تھے۔ ابھی انہوں نے خود کو نماز کے لئے تیار نہ کیا تھا۔ ابھی گھروں میں صبح نہ ہوئی تھی۔ بچوں نے دودھ کے لئے چلّانا نہ شروع کیا تھا۔ ماؤں نے ناشتہ کی فکر نہ کی تھی۔ ابھی "بیتِ مریم" کے دروازوں پہ زائرین کی دستک نہ ہوئی تھی۔ اور خالہ نبیلہ کی دوست مریم ہندی کے خوش آمدیدی کلمات فضا میں نہ گونجے تھے۔

ابھی صبح میں سکون اور بہار کا تأثر تھا کہ دیوار کے اُس پار سے موت دبے پاؤں، چوروں کی مانند آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اُن کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ آسمان اور زمین پہ شعلے لپکنے لگے۔ آسمان پہ طیاروں کی دھند چھا گئی۔ اور زمین کا سینہ جھلس گیا۔ دیوارِ یروشلم سے سپاہی کود کود کر بیت المقدس میں داخل ہو گئے۔ دیوارِ یروشلم کے نیچے زندگی، خون اور آگ میں تڑپنے لگی۔

اسرائیلی سپاہی عبرانی زبان میں :

شلیخت اردیون	اے بنی اسرائیل،
ناصریون بنی اسرائیل	اردن، ناصرا ور مسلمانوں کو
شلیخت مسلمیون	کچل دو۔

کے زوردار نعرے لگا رہے تھے۔ جب کہ مسلمان سپاہی نعرۂ تکبیر بھی بھول گیا تھا۔ ریڈیو اسرائیل بھی چلّا چلّا کر یہی نعرے لگا رہا تھا۔ ایک آنکھ والا اسرائیلی فیلڈ مارشل موشی دعیان بھی اپنی قوم کو اسی نعرے سے مخاطب کر رہا تھا۔ اور بیت المقدس کے گلی کوچوں میں دریائے اردن کے پانی کی طرح خون بہتا تھا۔ بیت مریم تباہ ہو چکا تھا۔ مسجدِ اقصیٰ کے مینار شہید ہو گئے تھے۔ شارعِ داؤد پہ پھیلے خون میں اسرائیل کا نجم داؤدی اسرائیلی جھنڈا لہراتا تھا۔ اور ـــــ ہاں اور ہجرت کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو چکا تھا۔

صبح کا سپیدہ ابھی زمین پہ نہ پھیلا تھا۔ اس سپیدے میں پیلی ریت سفید پھولوں کی مانند نظر آتی تھی اور اظہار کا تأثر دیتی تھی۔ لیکن اس بہار سے محظوظ ہونے کے لئے نگاہِ انسانی باقی نہ رہی تھی۔ اور اگر کوئی نگاہ پیلی ریت پہ پڑتی۔ تو اُسے یقیناً یہی محسوس ہوتا کہ کسی نے مردہ اجسام ریت پہ پھیلا دیئے ہیں۔ خالہ نبیلہ کو کم از کم یہی محسوس ہوتا تھا۔

خالہ نبیلہ روتے بچوں اور سینہ کوٹتی عورتوں کے ہمراہ بیت المقدس سے اردن جانے والی شاہراہ کے رستے رستے پر بیٹھی مسجد اقصیٰ کے میناروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو شہید ہو چکے تھے۔ ان کا سایہ خالہ نبیلہ پہ نہ پڑتا تھا۔ سر پہ صرف آسمان کا سایہ تھا اور زمین اس کی پناہ گاہ تھی۔ جون کا مہینہ تھا جب کہ آسمان سے بھی آگ برستی ہے اور زمین سے بھی۔ اور انسان سرد و فرحت بخش مقامات تلاش کرتا ہے۔ لیکن کھلی اور ویران فضا میں

خالہ نبیلہ کیا ڈھونڈتی ؟ اُسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ وہ ریت پہ خاموش بیٹھی افق کی جانب دیکھ رہی تھی۔ افق کے کناروں پہ سورج تیزی سے اُبھر رہا تھا۔ اور آسمان کی سُرخی کم ہو رہی تھی۔ لیکن زمین کی سرخی کم نہ ہوتی تھی۔ زمین نے تو بیت المقدس کی کنواریوں کی سرخی چھین لی تھی۔ ۹۶ گھنٹے تک زمین برابر خون سے سُرخ ہوتی رہی تھی۔

خالہ نبیلہ نے دوسری جنگِ عظیم بھی دیکھی تھی۔ اور ۱۹۴۸ء کی جنگِ فلسطین بھی! اب بھی اُنھوں نے ایک جنگ دیکھی جو ۹۶ گھنٹوں میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن ان ۹۶ گھنٹوں نے خالہ نبیلہ کو وہ سب کچھ دکھا دیا تھا جو ہلاکو کے سپاہیوں نے بغداد میں کیا تھا جو عباس صفوی کے سپاہیوں نے بغداد کی عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ اور جو کچھ جرمنوں نے دوسری جنگِ عظیم میں یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ جوشیلی دوشیزہ جو چاہتوں کی شب اپنی سانس سے الجھتی تھی، خالہ نبیلہ کی آنکھوں کے سامنے گنبدِ صخرا کے سائے میں اسرائیلی سپاہیوں کی ہوس کا نشانہ بن کر ختم ہو گئی تھی۔ اس فلسطینی دوشیزہ کے ناموس کی دنیا کا کوئی مسلمان حفاظت نہ کر سکا۔

"اے مسلمانو۔ تمہاری غیرت اور حمیت کہاں دفن ہو گئی ہے۔ تم نے خود کو یہ دن دیکھنے کے لئے ہی زندہ رکھا ہے کیا؟ کہ تمہاری معصوم بیٹیاں تمہارے مقدس مقامات کے سائے میں ذلیل و خوار ہوں۔ تمہارے گناہوں کی سزا تمہاری بے گناہ بیٹیاں کیوں بھگتتی ہیں؟ کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں گی؟" خالہ نبیلہ کا دل رو رو کر کہتا تھا۔

جب اسرائیلی سپاہی بیت المقدس میں اپنے منحوس قدم لے کر آئے تھے تو ارضِ مقدس کے مسلمان زن و شو اُن پہ ٹوٹ پڑے تھے۔ لیکن یہ لوگ آگ برساتے ہوائی جہازوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ خالہ نبیلہ کا شوہر اور جوان بیٹے حرم الشریف کی حفاظت کرتے مارے گئے تھے۔ اور خالہ نبیلہ کی روتی آنکھوں نے اسرائیلیوں کو مسجدِ اقصیٰ میں اور گھروں میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جوشیلی دوشیزہ جو خالہ نبیلہ کی ہونے والی بہو تھی، اپنے گھر اور ناموس کی حفاظت کے لئے گھر کے دروازے پہ کھڑی غاصبوں کا مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن وہ تنہا تھی اور سپاہی اور درندے زیادہ تھے اس کی ماں کی لاش سامنے زمین پہ پڑی تھی۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ اور ماں کے لاشے کے سامنے انہوں نے اس دوشیزہ پہ غلبہ پا لیا تھا۔ خالہ نبیلہ اپنے کمزور ہاتھوں سے اسے بچانے آگے بڑھی تھی۔ لیکن سپاہیوں نے بندوقوں کے کندوں سے اسے دور دھکیل دیا۔ خالہ نبیلہ سر کے بل سڑک پہ جا گری۔ اور سپاہی اُسے ٹھوکریں مارتے، قہقہے لگاتے، اُس کے جسم پہ قدم رکھتے اس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ جہاں بڑے بیٹے کی بیوی اور تین ننھے منے پوتے تھے۔ ظالموں نے بہو کو بچوں سمیت مار ڈالا۔ یہ بہو اور بچے پیدا کر سکتی تھی۔ یہ بچے بڑے ہو کر عرب نسل میں اضافہ کر سکتے تھے اپنی شکست کا بدلہ لے سکتے تھے۔ انہوں نے خالہ نبیلہ کے دونوں بازو مفلوج کر ڈالے یہ بازو بوجھ اٹھانے کے قابل تھے۔ یہ ہاتھ زمین میں بیج بو سکتے تھے۔ اسلحہ استعمال کر سکتے تھے۔ اور اسرائیلیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

"کہاں ہیں تمہارے عرب بھائی۔ تمہارے مسلمان بھائی" وہ خالہ نبیلہ کو کراہتا سسکتا، شارع داؤد پہ چھوڑ کر " ھتوا انگیلا، (آؤ خوشیاں منائیں) گاتے گلی کوچوں میں بکھر گئے۔

"عرب بھائی، مسلمان بھائی" : سات جون کی اس ہولناک شب میں شارع داؤد پہ پڑے پڑے خالہ نبیلہ نے سوچا تھا۔ جب کہ پچھلی پہر کا چاند دیوارِ یروشلم پہ اتر تا تھا۔ چاندنی نے دیوارِ یروشلم کو تین ماتوں میں کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اگر عرب "امجد یا رب امجد" (اے بزرگ و برتر خدا) کی پکار کرتے "امجد عرب امجد" (عرب فوقیت رکھتا ہے) کی تکرار نہ کرتے تو آج خالہ نبیلہ کے دونوں بازو ٹوٹے نہ ہوتے۔ اور دیوارِ یروشلم کو اسرائیلی چاندنی نہ کاٹتی۔

خالہ نبیلہ لاشوں اور خون کے درمیان گھسٹتی گھسٹتی اپنے جلے ہوئے مکان کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگی۔ خالہ نبیلہ کا گھر دراصل دیوار کے اس پار تھا۔ وہ جہاں گوتھک طرز کی بے تحاشا دریچوں والی ہوٹل داؤد کی سیاہ، اونچی اور شاندار عمارت ہے نا۔ جو عرصۂ دراز سے مغربی سیاحوں کا مرکز ہے۔ اور جس کے وسیع ہال میں ڈیانیز والتز ہوتا ہے۔ بس وہیں ہوٹل داؤد کی پچھلی گلی میں خالہ نبیلہ کا گھر تھا۔ خالہ نبیلہ جب گھر کے دریچے میں کھڑی ہو کر اپنے عم زاد کو جھانکتی تو ہوٹل داؤد کے دریچوں کی طرف دیکھنا ہرگز نہ بھولتی۔ اور اکثر سوچتی کہ شادی کے بعد اپنے عم زاد کے ہمراہ اس ہوٹل میں ماہ عسل منائے گی۔

لیکن جب ہوٹل سے مغربی موسیقی کی تانیں بلند ہوتیں تو اہلِ محلہ کو سخت ناگوار گذرتا۔ یروشلم نبیوں اور ہمنیوں کا شہر تھا۔ لحن داؤدی کا مسکن تھا۔ یہاں مغربی موسیقی چہ معنی دارد؟ لیکن یروشلم کے یہودی آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ اب محض عرب نہ رہے تھے ان میں غیر ملکی خون بھی شامل ہو گیا تھا۔ خالہ نبیلہ نے اپنی آنکھوں سے جرمن، پولش، روسی اور برطانوی یہودیوں کو وہاں آباد ہوتے اور یروشلم میں ایک نئی نسل کو بنتے دیکھا تھا۔ رنگ برنگے لوگ ہر روز یروشلم آتے تھے۔ خالہ نبیلہ کے محلہ میں اور ہوٹل داؤد کے ارد گرد میں مختلف یہودی آباد ہو گئے تھے جن کے درمیان مسلمانوں کو زندگی گذارنا دشوار محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا خالہ نبیلہ کے ماں باپ مسجدِ اقصیٰ کے مقدس سایہ میں آگئے۔ خالہ نبیلہ کی شادی یہیں شارع داؤد پہ ہوئی۔ بچے بھی یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں خالہ نبیلہ کی ایک گہری دوست مریم نے "بیت مریم" کے نام سے ایک مسافر خانہ تعمیر کرایا تھا۔ جہاں ہندوستانی اور افریقی زائرین قیام کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے مریم کا نام "مریم ہندی" پڑ گیا تھا۔ مسجدِ اقصیٰ میں بھی تو ایک ہندی مجاہد محمد علی جوہر کی قبر تھی۔ خالہ نبیلہ اپنے بچوں کو اکثر محمد علی جوہر کی داستان سناتی تھی جو ہندوستانی زائرین سے اس نے سنی تھی۔ خالہ نبیلہ اپنی دوست کا ہاتھ بٹانے اکثر "بیت مریم" آیا کرتی تھی۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا، اور پھر جب ۱۹۴۸ء میں فلسطین کی جنگِ آزادی چھڑ گئی، تو مسجدِ اقصیٰ کے میناروں کی مانند بیت مریم بھی شعلے برساتے طیاروں کی زد میں آگیا۔ لیکن جب حالات درست ہوئے اور پاکستانی زائرین بیت المقدس کا رُخ کرنے لگے تو "بیت مریم" بھی دوبارہ تعمیر ہو گیا۔

"لیکن اب یہ پھر تباہ ہو گیا ہے۔ اب یہاں کوئی پاکستانی زائر نہیں آسکتا۔ آزادیٔ فلسطین کی دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ مسجدِ اقصیٰ اور بیت مریم کے دروازے ہر مسلمان کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ الٰہی میں یہ دن دیکھنے کے لئے کیوں زندہ ہوں؟" خالہ نبیلہ کراہنے لگی۔ وہ شارع داؤد پہ پڑی تھی۔ شارع داؤد پہ اگلی نکڑ پہ حضرت سلمان کا اصطبل تھا۔ جہاں امریکی گندم ہوا کرتی تھی۔ اب یہاں اسرائیلی سپاہیوں نے مورچے ڈال دیئے تھے۔ اور شہر بھر میں

تباہی مچاتے پھر رہے تھے ۔ اس شہر کو خالہ نبیلہ نے اپنے سامنے پھیلتا پھولتا دیکھا تھا ۔ والیٔ اردن نے اس شہر کو خوب صورت اور اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ یہ بیت اللحم سے ہوتا ہوا خلیلیہ تک جا ملا تھا ۔ جہاں حضرت ابراہیم اور بی بی سارہ اور یعقوب و یوسف کے مزار تھے ۔ ان مزاروں پہ بھی اسرائیلی قابض تھے ۔ ہر جگہ اسرائیلی ہی اسرائیلی نظر آتے تھے ۔ دیوار یروشلم ٹوٹ چکی تھی ، اور اسرائیلی لڑکیاں " ہوا نگیلا ۔ گاتی اور ناچتی نظر آتی تھیں ۔ بیت المقدس کے ارمنیوں اور مسیحیوں نے اسرائیلیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا ۔ لیکن خالہ نبیلہ کا جی چاہتا تھا کہ دشمنوں کے ناپاک قدم مٹا ڈالے اس نے سڑک سے اٹھنے کی کوشش کی ، لیکن وہیں گر گئی ۔ اور دھیرے دھیرے کراہنے لگی ۔

" پانی ۔ پانی " خالہ نبیلہ کے حلق میں کانٹے چبھے جا رہے تھے ۔

" پانی ـــ ہم تم سے دریائے اردن کا تھوڑا سا پانی مانگتے تھے ، تم نے نہ دیا ۔ تم نے آبنائے طیران کا پانی بند کر دیا ۔ اب ہم نے تمہارے دریاؤں پہ قبضہ کر لیا ہے تو تم پانی مانگتے ہو ۔ ہم تمہیں پانی نہیں خون دیں گے ، خون " اسرائیلی سپاہی اسے ٹھوکریں مارتے گذر گئے ۔

لیکن ایک بوڑھا اسرائیلی وہیں رک گیا ۔ یہ نیا اسرائیلی نہ تھا ۔ یہ عرب کا پرانا یہودی تھا ۔ جس کی جڑیں عرب کی سرزمین میں تھیں ۔ جو عرب کی زمین پہ خون کے دریا دیکھ کر خون کے آنسو بہا رہا تھا ۔ کہیں سے پانی لا کر اس نے خالہ نبیلہ کو سہارا دے کر اٹھایا ۔

" تمہارا گھر کہاں ہے ؟ "

" میرا گھر پہلے دیوار کے اس پار ہوٹل داؤد کی پچھلی گلی میں تھا ۔ مجھے وہاں سے غیر ملکیوں کی آمد پہ نکلنا پڑا تھا ، مجھے اب بھی اجنبیوں کی آمد پہ اپنے گھر سے نکلنا پڑا ہے "

" ہوٹل داؤد کی پچھلی گلی میں ایک شوخ حسینہ نبیلہ رہا کرتی تھی ۔ وہ اکثر اپنی کھڑکی میں کھڑی اپنے منگیتر کا انتظار کیا کرتی تھی ۔ اس کا منگیتر میری دکان سے نبیلہ کے لئے تحائف خریدتا تھا ، اور نبیلہ کا ذکر کرتے نہ تھکتا تھا ۔ نبیلہ پورے محلہ میں مقبول تھی ۔ تم یقیناً اسے جانتی ہو گی " بوڑھے نے اشتیاق سے دریافت کیا ۔

" وہ نبیلہ اس وقت تمہارے سامنے ہے "

" نبیلہ ـــ نبیلہ ـــ آہ نبیلہ ۔ ظالموں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ؟ "

" ظالموں نے میرے خاندان کا ایک ایک فرد مار ڈالا ہے ۔ میرے بازو بھلا کیسے نہ ٹوٹتے ۔ ؟ " خالہ نبیلہ بوڑھے یہودی کا سہارا لئے اپنے گھر تک آئی ۔

گھر خاکستر ہو چکا تھا ۔ وہاں راکھ اور جلے اجسام کے سوا کچھ نہ تھا ۔ خالہ نبیلہ نے اپنے ہاتھوں اس گھر کو بنایا تھا ۔ اس میں بچے پیدا کئے تھے ۔ بچوں کی شادیاں کی تھیں ۔ اور ہنستے کھیلتے پوتے اور نواسے دیکھے تھے ۔ وہ بے اختیار پھوٹ پڑی ۔

بوڑھے یہودی نے خالہ نبیلہ کو تسلی دی ، اور اسرائیلی فوجوں کی آہٹوں پہ وہاں سے اٹھ گیا ۔

اسرائیلی مسلمان عورتوں اور بچوں کا ریوڑ بنا کر اردن کی طرف دھکیل رہے تھے ۔ خالہ نبیلہ کو بھی اسی

رپورٹ میں شامل کر دیا۔

جب شب کا دھندلکا چھٹ گیا، اور سورج طلوع ہوا، تو خالہ جمیلہ نے خود کو اردن جانے والے راستے پہ پایا۔ تپتی ریت پہ بیٹھی وہ حسرت سے مسجد اقصیٰ کو، اپنے خاکستر گھر کو، اپنی زمین کو اور اپنے وطن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہیں زمین میں دفن ہو جائے۔ آگے جانے سے فائدہ؟

"خالہ جمیلہ اٹھو ــــ ہم کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے ــــ" ایک بچے نے خالہ جمیلہ کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا یہ بچہ خالہ جمیلہ کے پوتوں کا دوست تھا، اور یتیم ہو چکا تھا۔

"اٹھتی ہوں میرے بچے۔ تمہاری خاطر اٹھتی ہوں۔ غاصبوں پہ داؤد اور عیسیٰ کے علاوہ اب ہماری بھی لعنت ہے۔ ہم اپنی زمین پہ دوبارہ ضرور آئیں گے۔ اور اپنا گھر تعمیر کریں گے۔" ہمت کر کے خالہ جمیلہ اٹھی۔ بچے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

خالہ نے پلٹ کر بیت المقدس کی جانب دیکھا۔ اور پھر بچے کے ساتھ آگے بڑھی۔
تمام قافلہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ہیلی بری کالج (صفحہ ۴۴ سے آگے)

ہیلی بری کالج کا اہم ترین مضمون سمجھتے تھے، آخر میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ اور انہوں نے لکھا ہے کہ

"ہندوستان میں ایک مجسٹریٹ کے لئے سنسکرت کی اتنی ہی اہمیت ہے
جتنی انگلستان میں ایک کشنر پولیس کے لئے قدیم جرمن زبان کی۔" ؎۱

ہیلی بری کالج انگلستان میں اردو کی تعلیم کے اولین اداروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تقریباً تمام بڑے عہدہ داروں نے اس کالج میں تربیت حاصل کی۔ اس کالج کی زندگی، اور تعلیم و تربیت کے بارے میں کافی مواد موجود ہے۔ جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ؎۲۔ برصغیر ہند و پاکستان میں کمپنی کے اقتدار کے عروج کے ساتھ انگریز افسروں کے انتخاب اور تربیت کے طریقے بھی بدلتے گئے۔ سنہ ۱۸۵۳ء سے انڈیا ایکٹ کے مطابق انڈین سول سروس کے لئے انتخاب کا قاعدہ رائج ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جنگ آزادی ہوئی۔ اور اسی سال دسمبر میں یہ کالج بھی بند کر دیا گیا۔

---

1) George Campbell, Modern India (London 1852) page 265. 2) Bernard S. Cohn

؎۲ اس کے بارے میں کسی قدر مفصل کتابیہ دیکھئے۔ 2) Bernard S. Cohn کا مضمون جس کا حوالہ مضمون ہذا کے صفحہ ۴۲ کے فٹ نوٹ نمبر ۱ میں دیا گیا ہے۔

خالدہ شفیع

بچہ اور پیار

نصرت جبیں ایک عرصے سے زمان خاں کی بے ڈھنگی حرکتوں سے سخت عاجز تھیں، اس نے نصرت جبیں کے نظریات کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔ وہ خود بھی تو اس قدر ماڈرن ہوتے ہوئے اتنی قدیم تھیں کہ ان پر الٹرا ماڈرن ہونے کا گمان ہوتا تھا انہیں یہی اعتراض تھا کہ اُس کا نام زمان خاں کیوں ہے۔ حالانکہ وہ خاں تو بالکل ہے ہی نہیں اور زمان بھی نہیں — اتنے دھان پان لڑکے کا اس قدر غراتا ہوا نام کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نصرت جبیں نے اس کا نام بدل کر صورت حال پر قابو پالینا چاہا پھر شومیٔ قسمت نئے نوکروں کا انٹرویو لینے پر بیگم شمس جیسی خاتون مامور تھیں جن کی قوتِ سماعت کا یہ حال تھا کہ وہ خود اپنی آواز سننے کے لئے ترس گئی تھیں۔ لہٰذا نصرت جبیں کی غیر موجودگی میں جتنے نوکر آئے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بیگم شمس نے اپنا چشمہ اُتارا اور بارعب آواز میں یُوں گویا ہوئیں،

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"زمان خان"

"ایں! — زنانہ پان" — وہ بے حد بولائیں، حالانکہ معلوم تھا اچھا خاصا کہ مبتلائے سماعت ہیں۔ اگر چپ ہی رہ جاتیں تو کیا حرج تھا۔

"نہیں جناب زمان خان" وہ ایک آنکھ بند کر کے مسکرایا۔

"اے لو موا بالشت بھر کا لونڈا، اور کہہ رہا ہے مجھے "نہیں جان جوان" دور ہو جا میری نظروں سے اور اپنے ہوتو سوتوں کو بتا "جان جوان" .....

کہ نصرت جبیں نے بروقت پہنچ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

زمان خاں آٹھ نو سال کا دُبلا پتلا لاغر سا کالا بھجنگ لڑکا تھا اس پر طرّہ یہ کہ بات کرتے میں ایک آنکھ بند کر لیتا تھا، ظاہر ہے بیگم شمس کہاں تک برداشت کرتیں، وہ بے چاری کھٹک سے نام ہی نہ سمجھ پا رہی تھیں۔

"تم کسی طرح بھی زمان خاں نہیں لگتے — لہٰذا اسے میاں زمان خاں ہم ویسے بھی طویل ترین ناموں کے ستائے ہوئے ہیں، کیونکہ لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتے ہیں لہٰذا ہم تمہیں چھوٹے سے نام سے پکاریں گے جیسے "بلو"

پلو ایک آنکھ دبا کر مسکرایا، جیسے کہہ رہا ہو کہ پلو ہی کہیے۔ اتنی کسر نفسی کیسی۔ اس طرح سے پلو باوجود بیگم شمس کی ناراضگی کے رکھ لیا گیا۔

نوکروں کی اہمیت تو نصرت جبیں ہی جانتی تھیں، جوان دنوں زنانہ رسالے میں نوکروں کی نفسیات پر مضمون لکھنا چاہ رہی تھیں۔ لیکن پلو اس قدر عجیب و غریب لڑکا تھا کہ نصرت جبیں کا مضمون اس کی نئی نئی حرکات سے غلط ہونے لگا تھا اور نئے مفروضات کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

پلو کو اپنی صفائی اور کپڑوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی لہٰذا ہر وقت بدبو کے بھبکے نا کیں سڑائے ڈالتے تھے۔ البتہ بال سنوارنے کا شوق انتہا تک تھا جس کے لئے وہ اکثر فاروق احمد کے خالص چنبیلی کے تیل کو پانی میں ملا کر سر میں انڈیل لیتا تھا، اور بالوں کا یوں پلستر جماتا گویا ہفتوں بال بیکا نہ ہوگا۔

کھانوں میں دال اور مرغی کو منہ نہ لگاتا۔ بظاہر بھوکا رہ لیتا مگر موقع پاتے ہی دودھ کی بالائی اتار لیتا یا انڈا اڑا لیتا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً اگر کھانے کو جی چاہا تو بڑی بی کی اجازت کے ساتھ رکھا ہوا گڑ صاف کر جاتا۔ اس پر وہ ایسی گھناؤنی صلواتیں سناتیں کہ بے غیرت تک دہل جائیں مگر وہ یوں کھل کھلا پڑتا جیسے کوئی گدگدی کر رہا ہو۔

چھوٹے بچوں پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ ایسی ایسی آوازیں نکالتا اور شکلیں بناتا کہ بچے بجائے خوف زدہ ہونے کے بے اختیار ہنس پڑتے اور اس کی طرف لپک کر دوڑ جاتے۔

بھابی کے منو اور بابی دو ہی دنوں میں اس قدر ہل گئے تھے کہ نہ صرف نصرت جبیں بلکہ بھابی تک کو غصہ آنے لگا تھا۔ ایک بار جب ہر طرح کے لالچ دینے کے باوجود بھی منا اُن کی طرف نہ آیا تو بھابی کے پتنگے لگ گئے:

"اُتار دو اسے نیچے، فضول میں بگاڑ کر رکھ دو گے میرے بچوں کو ——— ہر وقت خود پر سوار رکھو گے تو جو ذرا سا چلنا سیکھا ہے وہ بھی بھول جائے گا۔"

اس نے دلیسی ہی ہنسی ہنستے ہوئے منے کو اُتار دیا، پر منے نے مچل مچل کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا، اور ساتھ ہی بابی بھی لگ گئیں تو بھابی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اور نصرت جبیں کو جو رومال ہاتھ میں تھامے دُھلانے کے لئے کھڑی تھیں، ڈانٹ کر کہنا پڑا:

"جا نالائق لے جا ان کو باہر۔"

دن بھر ویسے بھی پلو کا بندھا ہوا خاص کام تو تھا نہیں، بس یہی آگ جلا کر چائے کا پانی رکھ دینا، بازار سے چھوٹا موٹا سودا سلف لا دینا، نصیر احمد کے پیر دبا دینا یا بیگم شمس کے سر پر چمپی کرنا۔ نصرت جبیں نئے سرے سے مضمون لکھتیں اور کچھ دنوں بعد پرزے پرزے کر کے اُڑا دیتیں۔ وہ بیچارا ان کے مفروضات پر گولہ باری کرتا رہا۔ باوجود دو ماہ کی سخت تربیت کے وہ روزِ اول کی طرح جنگلی تھا۔

ایک دن وہ نصرت جبیں کی توقع کے عین خلاف جا کر ابتدائی قاعدہ خرید لایا۔

"نصرت جبیں خانم ہم کو پڑھائے گا۔"

"یہ پلو میاں مجھے نصرت جبیں کہہ رہے ہیں دو دو قدم ہٹ کر، بی بی جی بولو کر نالائق ——— ہاں پڑھا دوں گی۔"

فرصت کے وقت وہ اب سبق دہراتا رہتا ——"پاکستان ہمارا ملک ہے —— ہمیں اس سے پیار ہے" پھر ایک کرمنے کو اٹھا لیتا اور پیار کرنے لگتا۔

دوپہر میں نصیر احمد کے پیر دباتا تو کبھی بالی اور ستّے کو اشارے سے پاس بلا لیتا۔ ویسی ہی شکلیں بنانے لگتا کبھی رونے کی کبھی ہنسنے کی۔ نصیر احمد اس کے ہاتھوں کے غیر متوازن دباؤ سے سمجھ جاتے کہ وہ کیا کر رہا ہے مگر وہ چپکے پڑے رہتے۔ پھر وہ آوازیں بھی نکالنے لگتا اور آخر کار نصیر احمد کو کہنا پڑتا:

"لے جا ان کو باہر مردود!"

ادھر بھابی گھنٹوں کروشیہ کرکے بیٹی بچوں کا انتظار کرتی رہتیں۔ میٹھے میٹھے حربے استعمال کرتیں مگر وہ قریب ہی نہ پھٹکتے۔ اور وہ انگاروں پر لوٹ جاتیں۔ وہ بچے ہر وقت اس قدر ہنستے رہتے تھے کہ سب تنگ آ گئے تھے۔

"تم میرے بچوں کو اتنا نہ ہنسایا کرو کبھی نظر لگ جائے گی۔"

اور ایک بار واقعی نظر لگ گئی۔ پلو نے محلے کی عورتوں کے سامنے اس قدر ہنسایا کہ سب ہی نے سراہا اور شام ہوتے ہی وہ پڑ گئے۔ بھابی نے جو چھوا تو جیسے آگ پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ بھابی سخت پریشان تھیں اور پلّو کو سب کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے رہے۔

اس کے بعد سے وہ پلّو کو ان کے قریب زیادہ نہ آنے دیتیں۔ خود ہی رنگ برنگی تصویروں، ٹیڑھی میڑھی شکلوں اور بھونڈی گنگناہٹ سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔

مگر پلو بھی بلا کا ضدی تھا۔ بھابی کی رکھائی، نصرت جبیں کی ڈانٹ ڈپٹ اور بیگم شمس کی دھمکیوں کا اس پہ ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ کھانے کی دھمکی یوں فضول تھی کہ اسے اس کے متبادل طریقے معلوم تھے۔ تنخواہ چچا کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اور نکال دینے کو محض مذاق خیال کرتا تھا۔

"تم ہم کو کدھر بھی پھینکو ہم کتے کے ماف‌ق کر ڈھونڈ کے اِدھر ہی آئے گا۔"

لہٰذا وہ موقع ملتے ہی منے اور بالی کو لے جاتا اور اُن کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

پھر کبھی کبھی ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ان کی رائے بدل دیتے۔ جیسے ایک رات نصرت جبیں اور بھابی بچوں کو سوتا چھوڑ کر فلم دیکھنے گئیں۔ آتے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ جب گھر پہونچیں تو بارہ ایک بجے کا عمل ہوگا۔ دیکھا تو بالی پلو کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی اور منّا اُس کی گود میں تھا۔ پلو بے طرح نیند میں جھول رہا تھا۔ ہر بار اونگھنے پر اس کا سر دیوار سے ٹکراتا جس پر وہ آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھ لیتا، پھر منے اور بالی پر نظر ڈال کر اونگھنے لگتا اور اُس کا سر لہرا کر دیوار سے جا ٹکراتا۔

صبح نصرت جبیں نے بڑے موڈ میں آ کر پلو سے پوچھ ڈالا:

"پلو میاں تمہارے بھی چھوٹے بہن بھائی ہوں گے۔"

"نہیں ہمارا کوئی نہیں ہے۔"

"ماں —— ماں تو ہوگی؟"

"نہیں — ہماری ماں بھی ...... (اُس نے زوردار گالی بکی) اِدھر باپ مُڑا اُدھر وہ ہمارے چچا کے ساتھ بھاگ گیا۔"

"چھی چھی — گالی بکتے ہو — یہی پڑھتے ہو قاعدہ میں — ہیں!"

"ہم تو صرف گالی بکتا ہے پر وہ تو گالی کرتا ہے۔" وہ سُرخ ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں میں شعلے ہی شعلے تھے۔

نصرت جبیں گنگ کھڑی اُسے دیکھتی رہیں۔ کوئی جواب ہی نہ سُوجھا — اُن دنوں وہ نہایت اچھوتا سا مضمون لکھنے والی تھیں۔

انسانی زندگی میں تبدیلیاں کبھی کبھی خون کے آنسو رُلاتی ہیں۔ ایسے میں شدّت سے جی چاہتا ہے ایک ہی سا وقت جم کر رہ جائے۔

اور ایک دن ایسی ہی تبدیلی بھابی کے اچانک میکے چلے جانے پر واقع ہوئی۔ دوسرے لمحے گھر سُونا ہوگیا۔ پلو کا شریر ہر وقت ہنستا ہوا چہرہ یوں کُملا گیا جیسے پھولوں کو لُو لگ جائے۔ وہ ایک بار پھر نصرت جبیں کی توقع کے خلاف بے حد بدل گیا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ لڑکا کبھی اس قدر اداس نہیں ہو سکتا۔

پلو کا صبح کا ناشتہ یونہی رکھا رہا۔

فاروق احمد کا کمرہ جھاڑنا شروع کیا تو نہ جانے کب تک جھاڑتا ہی رہا۔ اُن کے میلے کپڑے اور کتابیں جُوں کی تُوں بکھری رہیں کاغذ کے پرزے جگہ بے جگہ پھیل گئے۔

بیگم شمس کی چمپی کی تو وہ بھی یونہی سی۔ وہ چلّاتی رہیں: "مُوئے ہاتھ کہاں گئے تیرے! طاقت ہی نہیں رہی — اور یہ — چمپی کر رہا ہے یا بال نوچ رہا ہے میرے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے تیرا — کس دن کا بدلہ اُتار رہا ہے جا دفعان ہو جا —"

نصیر احمد کے پَیر دبانے بیٹھا تو وہ بھی بولے: "یہ پیر دبا رہا ہے یا سہلا رہا ہے۔ میاں یہ وہی پیر ہیں کوئی اُدھار تو نہیں مانگ لایا میں کسی سے۔ کیوں سوتیلوں کا سا سلوک کر رہا ہے"

نصرت جبیں کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لڑکا ہے یا پنچ شاخہ — اِتنا سا لڑکا اور کیسی ممتا لے کر پیدا ہوا ہے۔"

فاروق احمد بھی ایسی باتوں پر اُتر آتے۔ "میڈیکل چیک اپ کراؤ! دنیا میں ویسے بھی بڑی گڑبڑ ہے۔ ممتا والی نشانی کوئی اچھا شگون نہیں۔"

سب نے باری باری ڈانٹا۔ نکال دینے کی ایک بار پھر دھمکیاں دی گئیں۔ جب پھر اُس نے دوپہر ذرا سا کھانا کھایا، مگر وہ مرے مرے انداز میں ادھورے کام کرتا رہا۔

نصرت جبیں بے حد تنگ آچکی تھیں۔ اب وہ اس سلسلے میں کچھ کتابیں پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

دوسرے دن سب انتہائی نرمی سے پیش آئے۔

بیگم شمس تک نے پیار سے سمجھایا۔ اُن کا ذرا سا پیار بڑے بڑوں کی تنی ہوئی گردنیں جھکا دیتا تھا مگر اُس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

نصیر احمد نے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی، مگر وہ چٹان بنا جما رہا۔

نصرت جبیں نے مضمون والی کاپی پھاڑ کر پھینک ڈالی ـــ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہم سب بے حد عجیب و غریب ہیں۔ اگر اتنے سیدھے سادے ہوتے تو دنیا اتنی بے ڈھنگی کیوں ہوتی۔ انہوں نے ایسے مضمون لکھنے کا خیال دل سے نکال پھینکا۔

سب ہی پلو پر کڑھتے رہے اور وہ جوں کا توں رہا۔

کچھ دنوں بعد ایک صبح جب بیگم شمس چلا چلا کر اپنا چشمہ ڈھونڈ رہی تھیں، اور نصیر احمد اخبار لئے بیٹھے تھے۔ نصرت جبیں باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں کہ صحن میں عجیب و غریب اور بے ہنگم سی آوازوں کا شور بلند ہوا ـــ

"میا ـــ ڈ ـــ ل ـــ می ـــ آؤں ـــ ہوہو ـــ بھوں ـــ بھو ـــ ل ـــ آجا ـــ آجا ـــ ہاہا ـــ ہوہوہو ـــ ہُر ـــ ررر ـــ ہر ـــ آ ـــ جھولا ـــ کھا ـــ جھولا ـــ جھولا ـــ"

یہ پلو کی آواز تھی۔

پھر ایک دم زور سے آواز آئی۔

نصرت جبیں دوڑ کر باہر آئیں۔ تو دیکھا۔ پانی کا گھڑا نل کے نیچے رکھا ہے۔ پانی اُس سے اُبل اُبل کر گر رہا ہے۔ اور پلو بھورے سے پلونگڑے کو اُٹھائے کھڑا ہے اور بالکل پہلے کے سے انداز میں پلونگڑے کو اُچھال اُچھال کر ہنس رہا ہے گدگدا رہا ہے اور جھلا رہا ہے۔ اور وہ اس کی باہوں میں لپٹا ہوا ہے۔

بن پھول

ترجمہ

سید رضا کاظمی

وصیت نامہ

(بنگلہ کہانی)

"پریم - پریم - پریم! اونہہ۔ جب گھر میں الّو بولنے لگیں گے تب پتہ چلے گا۔" اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے وینے بابو بڑبڑائے اور اپنی نظریں سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر پر مرکوز کردیں، لیکن اُن کی گھورتی نظروں کا تصویر میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی دلکش مسکراہٹ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تصویر سے نظریں ہٹا کر انہوں نے میز کی دراز کھولی اور ایک کاغذ نکالا۔ اس کاغذ کو لفافہ میں بند کرکے انہوں نے نوکر کو آواز دی:

"جگدیش، او جگدیش کے بچے۔ کہاں مرگیا؟"

"آیا سرکار" کہتا ہوا نوکر کمرے میں داخل ہوا۔

"دیکھ یہ خط رجسٹری سے جائے گا، فوراً ڈاک خانے جا۔ اور وہ بدمعاش سکھن کہاں ہے ابھی تک کافی نہیں لایا۔"

"ابھی بھیجتا ہوں سرکار" کہہ کر جگدیش لفافہ لے کر باہر چلا گیا۔

چند لمحوں بعد سکھن کافی کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ ٹرے میں صرف کافی ہی نہ تھی برانڈی میں تر کئے ہوئے انگور بھی رکھے ہوئے تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے وینے بابو صبح کی کافی کے ساتھ شراب میں بھگوئے ہوئے انگور یا برانڈی سے کھا رہے تھے۔

کافی پینے کے بعد انہوں نے سکھن سے کہا: "اب جتو کو بھیج دے۔"

تقریباً دس منٹ بعد جتو نامی نوکر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی صرف یہی ڈیوٹی تھی کہ ہر صبح تقریباً ایک گھنٹے تک وینے بابو کے جسم پر تیل مالش کرے۔ تین قسم کے تیل سے مالش کرانے کے بعد ہی وینے بابو غسل کرتے تھے، اور اُن کا غسل بھی تین قسم کے پانی سے ہوتا تھا۔ پہلے تیز گرم پانی سے، پھر نیم گرم پانی سے اور آخر میں ٹھنڈے پانی سے!

وینے بابو اپنی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ اچھی سے اچھی غذا استعمال کرتے تھے۔ گھی اور چاول پنجاب سے

براہ راست منگواتے تھے، اور مقامی چیزیں بھی وہی استعمال کرتے تھے جو بازار میں سب سے زیادہ مہنگی ہوں گرمیاں شروع ہوتے ہی وہ پہاڑ پر چلے جایا کرتے تھے۔

اپنے حلقۂ احباب میں وہ شاہ خرچ مشہور تھے، اور ہر ہفتہ شاندار پارٹی کا اہتمام کرتے تھے۔ اُنہیں روپے پیسے کی کمی نہ تھی کیونکہ وہ مشہور تجارتی ادارہ "چلو گنگو" کے مالک تھے! ــــ لیکن آج وینے بابو بے حد پریشان نظر آ رہے تھے کیونکہ اپنے مستقبل کی فکر ان کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی!

آج سے بہت پہلے وینے کمار چٹوپادھیا اور مینندر کمار گنگوپادھیا نامی دو طالب علم ایک ہی کالج میں ایک ہی کلاس میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں میں بڑا گہرا دوستانہ تھا۔ دونوں ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اور ہر وقت ساتھ ہی اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے زیادہ دیر تک جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ لیکن جب تعلیم مکمل ہو گئی تو جدائی ناگزیر ہو گئی۔ وینے کمار کو ایک کالج میں ملازمت مل گئی اور وہ کلکتہ کے باہر چلے گئے۔ مینندر کمار نوکری کی تلاش میں کچھ عرصہ کلکتہ میں ہی رہے، لیکن دوست کی یاد جب زیادہ ستانے لگی اور تلاشِ معاش میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو وہ بھی وینے کمار کے پاس پہونچ گئے!

ایک دن کالج کی سالانہ تقریب کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے آچاریہ پرفلا رائے کالج میں تشریف لائے اور اپنی تقریر میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ کالج کی ڈگری حاصل کر کے ملازمت کی تلاش میں ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے سے پان بیڑی کی چھوٹی سی دوکان کر لینا بدرجہا بہتر ہے۔

اس تقریر دلپذیر کے چند ہی ہفتے بعد مینندر کمار کے ایک بے اولاد ماموں جان انتقال فرما گئے اور اُن کے اکلوتے وارث مینندر کمار کو پانچ ہزار روپے نقد بطور حقِ وراثت دستیاب ہو گئے۔ اسی رقم سے "چلو گنگو" نامی فرم کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وینے کمار نے بھی پانچ ہزار کی رقم اُس فرم کے سرمایہ میں شامل کر دی۔ اچاریہ پرفلا رائے کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور "چلو گنگو" نامی فرم دن دونی ترقی کرتی گئی۔

معاشی حالات درست ہو جانے کے بعد دونوں دوستوں نے بیاہ کر لیا۔ پہلے وینے کمار کی شادی ہوئی اور اُس کے چار سال بعد مینندر کمار کی۔ کچھ عرصہ بعد دونوں کے ہاں اولاد ہوئی۔ وینے کمار کے ہاں لڑکے کی ولادت ہوئی، اور اُس کے کچھ عرصہ بعد مینندر کمار کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ ایک کے ہاں لڑکے اور دوسرے کے ہاں لڑکی کی پیدائش نے دونوں دوستوں کے سامنے دوستی کو مزید تقویت پہونچانے کا ایک اور راستہ کھول دیا۔ چند دنوں تک دل ہی دل میں سوچ بچار کرنے کے بعد ایک دن مینندر کمار نے وینے کمار سے کہا:

"میری بیٹی دیوی کی شادی تمہارے بیٹے اُمیش سے ہی ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے۔" وینے کمار نے فوراً جواب دیا۔

چونکہ اُس وقت اُمیش اور دیوی دونوں کم سن تھے اس لئے دونوں دوستوں نے اس رشتہ کو پکا کرنے کا پروگرام

بنا کر ایک وصیت نامہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وصیت نامہ کی رُو سے یہ طے پایا کہ اگر مہندر کمار کی بیٹی دیوی، وینئے کمار کے بیٹے اُمیش سے شادی کرلے تو تمام جائیداد، فیکٹری، فرم اور نقد روپے کے مالک وہ دونوں ہوں گے۔ لیکن ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک اس شادی سے انکار کردے گا تو انکار کرنے والا فرد اپنا حق ملکیت کھو بیٹھے گا۔ اور تمام ملکیت دوسرے فرد کو مل جائے گی۔ اگر دونوں شادی سے انکار کردیں گے تو تمام ملکیت کسی خیراتی ادارے کو سونپ دی جائے گی۔ اور اس میں سے دونوں کو ایک پائی نہ ملے گی۔

دونوں دوستوں نے مجوزہ وصیت نامے کی شرائط پر مکمل اتفاق کرلیا، اور یہ طے پایا کہ اگلے ہی دن وکیل کو بلوا کر اُسے قانونی شکل دے دی جائے گی۔

لیکن جب وصیت نامے کی تیاری کے لئے مشہور وکیل رجنی بھوشن قانون گو کو بلایا گیا تو انہوں نے کہا۔ "میری رائے میں اپنی اولاد کی پسند و ناپسند پر ایسی پابندی عائد کرنا مناسب نہ ہوگا۔ انہیں تھوڑی بہت آزادی تو دینی ہی چاہیے۔ میں اس کا معقول بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ دونوں حضرات اپنے اپنے والد صاحب کا نام بتلائیں"

"میرے والد کا نام موتی لال چٹوپادھیا تھا" وینئے کمار نے کہا۔

"اور میرے والد کا نام شری ناتھ گنگوپادھیا تھا" مہندر کمار بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں وصیت نامے کا مضمون لکھتا ہوں" وکیل صاحب نے کہا "اگر کوئی جملہ قابلِ اعتراض نظر آئے تو ٹوک دیجئے گا"

اور وکیل صاحب نے قانونی زبان میں جو کچھ تحریر فرمایا اس کا مفہوم حسبِ ذیل تھا:

"اگر شریمتی دیوی گنگولی موتی لال چٹوپادھیا کی نسل کے کسی لڑکے کو بطور اپنے شوہر کے قبول نہ کریں گی تو تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر اپنا حق کھو بیٹھیں گی۔ اسی طور پر اگر شریمان اُمیش چٹوپادھیا آنجہانی شری ناتھ گنگوپادھیا کی نسل کی کسی لڑکی سے بیاہ نہ کریں گے تو تمام جائیداد و ملکیت پر اُن کا حق ختم ہوجائے گا۔ اور اگر دونوں ہی شادی سے انکار کریں گے تو تمام ملکیت "رام کرشنا مشن" کے حوالے کردی جائے گی۔۔۔۔۔

دونوں دوستوں کو وصیت نامے کے مضمون میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر نہ آئی، کیونکہ دونوں اپنے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اگلے دن وصیت نامہ تیار کرکے اس کی رجسٹری کرالی گئی!

وصیت نامے کی رجسٹری کے ایک سال بعد مہندر کمار کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت دیوی کی عمر صرف پانچ سال تھی، اور اُن کے کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ وینئے کمار کی بیوی اُمیش کی پیدائش کے ایک سال بعد ہی مرگئی تھی، اور چونکہ انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی، اس لئے اُن کی بھی اُمیش کے علاوہ کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ مہندر کمار کی موت کے بعد اُن کی بیوہ اور اکلوتی بیٹی دیوی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی وینئے کمار کے سر پر آپڑی۔

تقریباً سولہ سال بعد!

دیوی ایم اے کی طالبہ تھی، اور امیش بی۔ایس سی کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ وینئے کمار "چنٹو گنگو" کے منافع کے تنہا مالک بن جانے کے بعد عیاشی کی جانب راغب ہو گئے تھے۔ سٹہ کھیلتے تھے۔ کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور شراب نوشی میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ ادھر اُن کا اکلوتا بیٹا اُمیش بھی لندن کی اونچی سوسائٹی میں نام پیدا کرنے کی غرض سے فضول خرچی پر اُتر آیا تھا۔ آخر ایک دن اُن کی فرم کے آڈیٹروں نے انہیں بتلایا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے حصے کی تمام رقم خرچ کر ڈالی ہے بلکہ مینندر کمار کے حصے کی کافی رقم بھی خرچ کر چکے ہیں۔ اب بقیہ ملکیت کی حقدار صرف مینندر کمار کی بیوہ اور ان کی بیٹی دیوی رہ گئی ہے خود ان کے حصہ کی کوئی رقم باقی نہیں رہی۔

یہ اطلاع پاکر وینئے کمار سکتے میں آ گئے ——

"تو اب میں مینندر کمار کی بیوہ اور اُن کی بیٹی کا قرضدار ہو گیا ہوں؟" وہ سوچنے لگے۔

اسی فکر میں انہیں دن رات نیند نہ آئی اور انہوں نے طے کیا کہ وہ مینندر کمار کی بیوہ کو وصیت نامے کی موجودگی اور اس کی شرائط سے آگاہ کر دیں گے۔ اس وقت تک وصیت نامے کا علم صرف دونوں دوستوں اور وکیل ہی کو تھا لیکن اُن کی ہمت نہ پڑی، اور معاملہ کل پرسوں پر ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن مینندر کمار کی بیوہ بھی چل بسی، اور اب تمام ملکیت کی تنہا مالک دیوی گنگولی رہ گئی!

ایک دن وینئے کمار دیوی کے کمرے میں گئے اور اُسے وصیت نامے کی بابت بتانا چاہا، لیکن دیوی نے اُن کی پوری بات سننے سے پہلے ہی کہا:

"چاچا جی، ابھی تو میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ یہ تمام باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔"

"نہیں بیٹی میں تمام باتیں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔" وینئے بابو نے کہا، اور وصیت نامے کی تمام شرائط تفصیل سے بتانے کے بعد انہوں نے دیوی سے پوچھا:

"تو تم امیش سے شادی کرنے پر رضامند ہو نا؟"

"میں اپنے والد اور آپ کی مرضی کے خلاف کیونکر کوئی کام کر سکتی ہوں۔ اصل سوال ہے مسٹر امیش کا۔ اُن کی مرضی معلوم کر لیجئے۔ کیا وہ مجھ جیسی کالی کلوٹی لڑکی سے شادی پر آمادہ ہو جائیں گے؟" دیوی نے جواب دیا۔

"میں اُسے آج ہی خط لکھ کر اُس کی رائے معلوم کر لیتا ہوں۔"

اُنہوں نے خط تو لکھ دیا، لیکن خط کا جواب بڑا حوصلہ شکن آیا۔

اُمیش نے لکھا تھا کہ محض دھن دولت کی خاطر وہ ایک بدشکل لڑکی سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ لوسی نامی ایک انگریز لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ لوسی نے اپنے پہلے خاوند سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور طلاق حاصل ہوتے ہی شادی ہو جائے گی۔ تین ماہ بعد اس کے امتحانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور وہ اور لوسی میاں بیوی بن کر ساتھ ہی وطن واپس آئیں گے!

خط پڑھ کر وینئے بابو گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

کیا اب مجھے دیوی کا دست نگر ہو کر رہنا پڑے گا؟
امیش کے انکار کر دینے کے بعد وصیت نامے کی روسے تمام ملکیت کی مالک دیوی ہو جائے گی۔ امیش تو کلکتہ آکر کوئی ملازمت کرے گا لیکن انگریز بہو کے ساتھ میری کیونکر گذر ہو سکے گی؟
تو پھر ـــ ؟
"کیوں نہ وکیل صاحب سے مشورہ لوں؟" انہوں نے سوچا "شاید وہ کوئی حل نکال سکیں!"

دیوی نے نمایاں اعزاز کے ساتھ ایم اے پاس کر لیا۔ وہ تمام صوبے میں اول آئی۔ وہ بہت خوش تھی، اس لئے کہ اب اُسے امیش پر برتری حاصل ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُمیش نے سیکنڈ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تھا۔
اسی دوران میں اُسے اطلاع ملی کہ ونئے کا رنے اُمیش کو عاق کر دیا ہے، اس لئے اب اُمیش ہندوستان واپس نہ آسکے گا ـــ!

ایک دن دیوی اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکیہ نے آکر اُسے ایک رجسٹری خط دیا۔ خط ونئے کا رنے بھیجا تھا۔ لفافے پر بھیجنے والے کا نام پڑھ کر دیوی فکر مند ہو گئی۔
"آخر چاچا جی نے میرے نام رجسٹری خط کیوں بھیجا ہے؟"
اس نے لفافہ چاک کر کے خط پڑھنا شروع کیا:

"اُمیش ایک ولایتی میم سے شادی کرنا چاہتا ہے، اس لئے میں نے اُسے عاق کر دیا ہے اور یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ تمہارے والد اور میں نے جو وصیت نامہ تیار کیا تھا اُس کی ایک نقل منسلک کر رہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرے آنجہانی والد موتی لال چٹوپادھیا کی نسل کے لڑکے نے شادی نہ کرنے کی صورت میں تمام ملکیت خیراتی ادارے کو جائے گی۔ یہ مجھے گوارہ نہیں ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں دوستوں نے جو جائیداد و ملکیت اور اتنا بڑا کاروبار بڑی جانفشانی سے قائم رکھا ہے وہ ہمارے خاندان کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ کمپنی کے آڈیٹروں کی رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ میں تمہارا قرضدار ہو گیا ہوں۔ جس قسم کے رہن سہن کا میں عادی بن چکا ہوں اُسے ترک کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک راستہ نظر آیا ہے وہ یہ کہ تم مجھ سے شادی کر لو ....."

خط پڑھ کر دیوی پر سکتہ چھا گیا!
تقریباً ایک ماہ بعد ونئے بابو کو دیوی کا جواب ملا:
"محترم چاچا جی۔ اپنے خط میں آپ نے جو بات لکھی ہے اسے قبول کرنا میرے

لیے ناممکن ہے۔ لیکن آپ کی پریشانیوں کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اپنی تمام ملکیت اور نقد رقم آپ کو تحفتاً دے رہی ہوں۔ ہبہ نامہ ساتھ بھیج رہی ہوں۔ میں اپنا گھر بھی چھوڑ رہی ہوں۔ آپ اس کا قبضہ بھی لے لیں۔ میں کہاں جا رہی ہوں یہ ابھی نہیں بتا سکتی۔

آپ کی بھتیجی
دیوی

خط پڑھ کر وینے بابو نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اونہہ۔ اگر وہ ہبہ نامہ نہ بھی بھیجتی تو کیا فرق پڑتا۔ شادی سے انکار کی صورت میں وصیت نامہ کی رو سے میں تمام جائیداد کا مالک بن جاتا۔ اُس نے کون سا مجھ پر احسان کیا ہے ......"

تقریباً دو سال بعد وینے بابو کو دیوی کا دوسرا خط ملا۔

محترم چاچا جی۔

ایک خوش خبری سنانے کے لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں یہاں کے گورنمنٹ کالج میں بنگلہ کی پروفیسر ہو کر آئی تھی۔ کچھ دنوں بعد آپ کے بیٹے اُمیش بھی فزکس کے پروفیسر ہو کر اسی کالج میں آگئے۔ اُن کا لوسی سے بیاہ نہ ہو سکا، کیونکہ لوسی کو اپنے پہلے شوہر سے طلاق نہ مل سکی۔ دو ماہ قبل اُمیش نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی، اور گزشتہ ماہ میری اُن سے شادی ہو گئی۔ ہم دونوں بہت خوش ہیں۔ دریا کے کنارے ہم نے ایک بنگلہ کرائے پر لیا ہے۔ بڑی سہانی جگہ ہے۔ اگر آپ بھی کچھ دنوں کے لئے یہاں آجائیں تو ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوگی۔

آپ کی : دیوی

پیر سید محمد شاہؒ
منظوم ترجمہ
سید ضمیر جعفری

پنجابی

من کے تار

خطۂ آزاد کشمیر کے معتبول صوفی شاعر
پیر سید محمد شاہ کے پنجابی ابیات کا پرتو

لعل، لعل ہے پربت میں گدڑیوں کی ہم تونگروں کو تُو فقیر مت کہہ
جو دینار پہ بخل کی مُہر رکھیں، اُن تھڑ حوصلوں کو تو امیر مت کہہ
گھر کے تنگ دالان میں بند ہو تو، جوئے شیر کو بھی جوئے شیر مت کہہ
دُور دیکھنے والے پہچان لیں گے، رمز رمز ہے اس کی تفسیر مت کہہ

حرص، ہوس، زینت، لوبھ، لالچ، مایہ، کتنے جال جنجال بنائے ہیں
امر رُوح کے دیپ بجھائے ہیں، فانی جسم کے طاق سجائے ہیں
قدم قدم ٹھوکر، نظر نظر دھوکا، شیشے جان کے سنگ اُٹھائے ہیں
ہلکا شاہ محمدا بوجھ جن کا، دریا تیر کے پار بھی جائے ہیں

پھول جھاڑیوں میں یا پھلواریوں میں، پات پات نشانِ بہار ہوگا
شمع طاق پر ہو یا فانوس میں ہو، رقص روشنی کا خوشگوار ہوگا
چشمہ کوہ میں ہو یا میدان میں ہو، دل آویز ہوگا، چمکدار ہوگا
پارکھ چیز کو اصل سے جانچتے ہیں، ورنہ فیصلہ سخت دشوار ہوگا

تیری یاد میں خواب، خیال میرے، نغمے تار میں ہیں، بگلے ڈار میں ہیں
کھیل کھیل دانے پیاری حسرتوں کے، پہلے کھیت میں تھے اب انبار میں ہیں
کالی رات ظالم پھر برسات ظالم، بام خام، شگاف دیوار میں ہیں
دل اندھیر تو دنیا اندھیر ساری، گرچہ لاکھ چراغ بازار میں ہیں

غلام رسول طاؤس (دایہنالی)
ترجمہ
منصور قیصر

کشمیری

تیرا دُکھ

تیرے ہاتھ جو پیلے ہوں تو ہم رنگین بیاں ہو جائیں
اب تُو جوگ لئے بیٹھی ہے ہم جوگی کیا سوانگ رچائیں

تو اس ناٹک منڈلی میں کیا سوچ کے آخر آ نکلی ہے
ہم تو چلے اِس نیت سے تھے آج کہ شہر میں جی بہلائیں

ایک وہ سُکھ کا ساتھ کہ مدہوشی میں تیرا دل بھی دُکھایا
ایک یہ غربت کے صحرا کی سوچ کہ تیرا دکھ اپنائیں

روسی

میخائل عیسیٰ کوفسکی
براہ راست روسی سے ترجمہ
عبدالجلیل قریشی

میری محبت جوان ہے

میری سُنو! میرے محبوب
میری سُنو! میرے حسین
شام کے جھٹپٹے میں
میری محبت ختم نہیں ہوئی ہے!
میں جا رہا ہوں گلی میں
چاند آسمان پر چمک رہا ہے
میں جا رہا ہوں کہ تم سے ملوں
ابھی تک تیز درانتی نے
وادیوں میں گھاس نہیں کاٹی ہے
ابھی تک چیری کے درختوں نے
پھل تمہارے لئے کھڑکی سے نہیں پھینکے ہیں
ابھی تک جوانی، تیزی سے
ہم سے رخصت نہیں ہوئی ہے
محبت کرو جب تک کہ تم محبت کر سکتے ہو
ملو جب تک کہ تم مل سکتے ہو
چلو میرے محبوب
ملو میرے حسین
شام کے جھٹپٹے میں
میری محبت جوان ہے!

★

میخائل عیسیٰ کوفسکی سنہ ۱۹۰۰ء میں موضع سمالینک میں پیدا ہوا۔ دیہی تعلیم سے فراغت کے بعد قصبہ کے اسکول میں معلم ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد صحافت میں قدم رکھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں پہلا دیوان شائع ہوا جس کو دیکھنے کے بعد میکسم گورکی نے ہمت افزائی کی یہ پہلا شاعر ہے جس نے سوویت عوام کی روزمرہ کی زندگی کو نظم کیا۔ اس کی زیادہ تر نظمیں سرمایۂ حسن و نغمہ ہیں

(مترجم)

رومانیہ

ماگدا اسانوس
ترجمہ
احمد رئیس

اگر ہم سب کا درد بانٹ لیتے!

پہاڑوں کے درّوں میں
میں کھویا کھویا سا رہتا ہوں
میرا سر چٹانوں سے ملتا جلتا ہے
جو چوٹیوں کی مدح سرائی سے گونج رہی ہیں
چوٹیاں — جنہیں میں کبھی نہ چھو سکوں گا
جو کبھی روشن نہ ہوں گی

اگر اس دنیا کا درد
ہم سب نے
منصفانہ طور پر بانٹ لیا ہوتا
کچھ دکھ اپنے لئے
کچھ میرے لئے
تو میں عین جوانی میں نہ مرتا
کافی عرصہ تک
سورج اور ہریالی سے لطف اٹھاتا
صحرا صحرا، وادی وادی
نغمے گاتا
کتنے گلناروں کی رونق مٹنے کو ہے
میں سیبوں، سنتروں اور پھولوں کی
گولائیاں ناپا کرتا

اگر اس دنیا کا درد
منصفانہ طور پر
ہم سب نے آپس میں بانٹ لیا ہوتا
تو میں اور کچھ عرصہ تک
کھیتوں کے اُجیارے کو حاصل کرتا

اپنے دوستوں کو پکاروں
شاید وہ چھپے پہاڑوں کی وہ چوٹیاں لا دیں
جو افق کی بلندی پر
ہواؤں کے پاس، میرے سر پہ لہراتی ہیں

زندگی! بعضوں کے لئے کھانوں سے سجی ہوئی میز ہے
میرے لئے گھوڑے کی سخت لگام
جو بے تحاشا اِدھر اُدھر دوڑتا ہے
تجھے خوشی کا یا ڈر کا کوئی تجربہ نہیں ہے
میں تجھ سے ملتا ہوں — دکھ پاتا ہوں
بچھڑتا ہوں — بھول جاتا ہوں!

روداد نگار

ترقی پذیر ممالک میں تہذیب کا مسئلہ

اردو مجلس کی ماہانہ نشست

ایک مقالہ - ایک مذاکرہ

اردو مجلس کی ماہانہ نشست ۸ جون ۱۹۹۷ء کو آغا افتخار حسین صاحب کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی جس کی صدارت ممتاز حسین صاحب نے کی۔ اس نشست کے شرکاء یہ تھے: صہبا لکھنوی، ممتاز حسین، رشیدہ یوسف، افتخار احمد عدنی، کرار حسین، مسعود احمد برکاتی، انجم اعظمی، آغا افتخار حسین، سحر انصاری، انوار صدیقی، اشتیاق قطب، مہدی مصطفیٰ، عتیق احمد۔

پروگرام کے مطابق عتیق احمد صاحب نے اپنا مقالہ "ترقی پذیر ممالک میں تہذیب کا مسئلہ" پڑھا۔ صدر نشست ممتاز حسین صاحب نے اس پر گفتگو کی دعوت دیتے ہوئے ابتدا میں کہا کہ اس مقالے میں جو مسائل اٹھائے گئے ہیں۔ وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ آخر نئے آزاد ہونے والے ممالک جو ترقی یافتہ نہیں ہیں، جدید دور میں کن اقدار کو اپنائیں۔ اس مضمون میں مشرق و مغرب کا جائزہ لے کر یہ کہا گیا ہے کہ مغرب میں مادی ترقی کے باوجود ایک روحانی خلا ہے، اور نئی سائنسی تہذیب کے باوجود اہل مغرب مشرق کی روحانیت کی طرف رجوع ہو رہے ہیں۔ ادھر مشرقی یا آزاد ہونے والے ممالک یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ اپنے یہاں کون سا نظام معیشت رائج کریں۔ آیا وہ اشتراکی ہو یا سرمایہ دارانہ یا کوئی اور۔ تاکہ مملکت فلاحی بھی ہو سکے۔ اس مضمون میں اس کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں کوئی واضح بات نہیں کہی گئی ہے۔ کم و بیش ہر ملک میں قومی تہذیب کے ساتھ ساتھ ایک بین الاقوامی طرز زندگی بھی ہے۔ چنانچہ آپ شنگھائی سے قاہرہ تک ایک لباس دیکھیں گے۔ اس مضمون میں یہ دیکھا گیا ہے کہ آیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں صرف نفع اندوزی ہی کوئی چیز ہے یا اعلیٰ اقدار اور زندگی کے نئے مفہوم کی تلاش کا کوئی رخ بھی اس نے متعین کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مضمون سے قطع نظر آپ بھی اپنی باتیں کہیں تاکہ موضوع کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑے۔

چند ایک جزوی سوالات کے بعد مضمون کی زبان پر گفتگو ہوئی۔

آغا افتخار حسین: عتیق صاحب کے مضمون کی زبان بہت خوبصورت ہے جو میرے خیال میں ادبی موضوع

کے لئے تو بہت اچھی ہے لیکن علمی مسائل کے لئے غور طلب ہے ۔ کیونکہ اس مضمون میں کچھ استعارے ایسے آئے ہیں جن سے استدلال کا Impact کمزور ہوتا ہے ۔ دوسرا معروضہ یہ ہے کہ آپ نے اشتراکی تہذیب اور مغربی تہذیب کا مطالعہ کرتے وقت اشتراکی تہذیب کی ہر چیز کو پسند کیا ہے لیکن مغربی تہذیب کو آپ نے بالکل رد کر دیا ۔ دنیا اس قدر چھوٹی ہوتی جا رہی ہے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن مغربی تہذیب سے متاثر ہونے پر مجبور ہیں ۔ مغرب کے Impact کو نظر انداز کر دینا کچھ بہتر نہ ہوگا ۔ مناسب یہ ہوگا کہ ہم اپنی تہذیبوں کے سابقہ سرمائے کی بنا پر عالی ظرفی کا مظاہرہ کریں ۔ اور اس کی کوشش کریں کہ مغرب والوں کے ہتھیاروں سے انہیں زیر کریں ۔ جن سے انہوں نے ہمیں زیر کیا تھا ۔

کرار حسین : اس مضمون میں مغربی تہذیب کو مطعون اور ملعون قرار دیا گیا ہے ۔ حالانکہ اس میں بہت سی اچھائیاں بھی ہیں ۔ ہم مشرقی قومیں تو بہت پستی میں جا پڑی تھیں اور ہمیں مغرب سے بہت کچھ سیکھنا ضروری تھا ۔ یہ کہنا کہ افریقی اقوام کو ان کی اپنی تہذیب کے راستے پر چھوڑ دیا جاتا تو خدا جانے وہ کیا ہوتیں ، یہ کچھ زیادہ مثبت نہیں معلوم ہوتا ۔

افتخار احمد عدنی : میں کرار صاحب کی بات کی تائید کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں بڑی کاوش کے ساتھ کاشتکار اور زمیندار کے روابط کو بڑے اچھے پیمانے پر قائم کیا حالانکہ وہ صرف مالیانہ وصول کر کے اپنا کام چلا سکتے تھے ۔ انہوں نے مقامی اور تاریخی جائزے کے پس منظر میں بہت منصفانہ اساس پر Tenancy laws کی بنیاد رکھی ۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کی روایات کو فروغ دینے میں انگریزوں کا بہت حصہ ہے ۔

کرار حسین : علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کو اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سندھی ، بلوچی ، پشتو ، وغیرہ پر پہلی کتابیں انہوں نے لکھی ہیں ۔ جو عالموں کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ جو نظم و نسق کے سلسلے میں یہاں آئے تھے ۔

انجم اعظمی : مجھے یہ کہنا تھا کہ اس مضمون کا موضوع ہمیں ایک خاص سمت میں لے جاتا ہے ۔ اس میں بعض تصورات پیش کئے گئے ہیں ۔ اور تصورات بھی یورپ سے آ سکتے ہیں ۔ انہوں نے ان میں یورپ کے علم سے انکار نہیں کیا ہے لیکن انہوں نے یہ دیکھا کہ ہمارا تہذیبی بحران ہمیں کہاں لے جائے گا ۔ مغرب کے حربے سے مغرب کو شکست دینے کا سوال اب پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اب فتح یا شکست صرف ہمیں ہو سکتی ہے ۔ اس مضمون میں خاندان کا جو سوال اٹھایا گیا ہے ، اس میں یہ سچ کہا گیا ہے کہ مغرب میں خاندان کا روحانی رشتہ کوئی نہیں ہے ،

اشتراکیت بھی یورپی تہذیب کا ارتقا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مغرب کو بالکل رد کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد خاندان اور کمیون، اشتراکیت اور مادی ترقی کے ضمن میں انوار صدیقی، صہبا لکھنوی، آغا افتخار حسین، رشیدہ یوسف، انجم اعظمی، سحر انصاری اور عتیق احمد نے طویل بحث کی جس میں جزئیات سے بحث کرتے کرتے اچھے خاصے مناظرے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک طرف ایک خیال کے لوگ بیٹھے ہیں اور دوسری طرف بالکل دوسرے اور متضاد خیال کے لوگ۔ چنانچہ افتخار احمد عدنی صاحب نے دونوں کے بارے میں اپنا یہ فیصلہ دیا کہ ایک طرف کے لوگ "کمیون" اور دوسری طرف کے لوگ "خاندان" معلوم ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ کمیون خاندان کے مقابلے میں زیادہ منظم ہے۔

آخر میں ممتاز حسین صاحب نے بحث کو سمیٹ کر تہذیب کے مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کی:

ممتاز حسین: مشرق اور مغرب کے سلسلے میں بہت سی باتیں یہاں کہی گئی ہیں، لیکن ہمیں سوچنا یہ ہے کہ ہم مغرب کی مادی ترقی کا اس قدر ذکر کرتے اور اس سے مرعوب ہوتے ہیں، لیکن خود مغرب کے ادیب مثلاً ایلیٹ اور سارتر وغیرہ مغرب میں روحانی بحران کا ذکر کرتے ہیں۔ روح کا تصور بھی ما بہ النزاع ہے۔ کچھ لوگ روح کو جسم سے الگ سمجھتے ہیں۔ مشرق میں ایک زمانے میں اس دنیا کی مادی آسائشوں کو باطل اور مایا سمجھا جاتا تھا لیکن ہندوستان میں سر سید احمد خاں نے دین و دنیا کی ہم آہنگی کا تصور دیا۔ یہی تصور حالی اور سر سید نے اختیار کیا جس سے ہماری تہذیب اور مذہب میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سر سید نے تہذیب کی ترقی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس سے اللہ کا کوئی تعلق نہیں، تہذیب انسان خود اپنے لئے بناتا ہے۔ انفرادی آزادی اور عزت نفس کا جو تصور مغربی علوم کے ذریعے ہمارے یہاں آیا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ امر بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ مغرب ایک زوال سے دوچار ہے۔ یہاں میری مراد سرمایہ دارانہ مغرب سے ہے۔ آج اقدار کی ابدیت اور تقدس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوئی اتھارٹی باقی نہیں۔ مذہب کا تقدس ختم ہو چکا ہے۔ Reason کوئی ایسی چیز نہیں جس کو اتھارٹی قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ Reason کو خود مفاد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ dogma کے ذریعے کچھ طے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کمیون کا جہاں تک تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کمیون انفرادی خاندان کا بدل نہیں ہے۔ مغرب میں خاندان کا اوسط ختم ہو رہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ میں ۵۷ فی صد لوگ میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مرد اور عورت کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ اور انہیں کوئی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا چاہئے کہ مشرق کیلئے آزاد ہونے والے ممالک اپنے لئے کون سا راستہ اختیار کریں۔

نشست کے اختتام کے بعد طے پایا آئندہ نشست میں فرد کی آزادی کے تصور پر مذاکرہ ہو گا۔

حاصل کی — یہ سب باتیں محض آپ کی اور ان دوسرے احباب کی اطلاع کے لئے ہیں جو دور ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

آپ مناسب سمجھیں تو میرا خط شائع کر سکتے ہیں۔ — احمد فراز

جوہر میر۔ پشاور

محترمی صہبا صاحب، تسلیمات

'افکار' کا تازہ شمارہ سرسری سا دیکھا ہے، تبصروں کا حصہ خاص طور پر پڑھا۔

" دردِ آشوب " پر آپ کا تبصرہ بڑا تو ہونا تھا، مگر یہاں مقامی طور پر تبصرے کے ایک آدھ جملے کی وجہ سے کچھ شک و شبہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور وہ جملہ احمد فراز صاحب کا سنگت میں سے یا سنگت میں کے حلقۂ ارادت سے متعلق رہنے کا تھا۔ اور جس تعلق کو ان کی شاعری کے تنوع کا باعث ٹھہرایا گیا تھا۔

سنگت میں کے اجراء کو ۲۰ سال، اور آپ سے بنے ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ عام قاری کے ذہن میں آپ کے مجلے سے جو بات اُبھری ہے وہ یہ ہے کہ فراز صاحب [illegible] 'سنگت میں' کا مدیر [illegible] کیا۔ [illegible] ابھی تک وہ کر بھی رہے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ ہم سب اکتسابِ علم ہی کی بدولت فن کو جلا دے رہے ہیں۔ (مستثنیٰ ہوں) ۔ لیکن متذکرہ تبصرے میں خاص طور پر اسی ایک جملے کو مخصوص توجہ دینا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جب کہ یہ جملہ تاریخی اعتبار سے درست بھی ہے۔ اس جملے کے ساتھ اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا، اور اس اٹھارہ بیس سال کے ارتقائی سفر کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا، تاکہ قاری بآسانی 'سنگت میں' اور 'دردِ آشوب' کا فاصلہ ناپ سکتے۔ اور کسی قسم کے شک و شبہے کا شکار نہ ہوتا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

جوہر میر

ص - ل

فنتاعلما

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ادیبوں کا فرض ہے

اسرائیل کی مدد کرنے والے ملکوں سے کوئی معاہدہ نہ کیا جائے

مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ پر پاکستان رائٹرز گلڈ کا جلسۂ عام

کراچی - پچھلے دنوں تھیوسوفیکل ہال میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے اسرائیلی جارحیت اور ادیبوں کے فرائض کے موضوع پر ایک جلسہ ہوا جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایسے ملکوں سے کوئی معاہدہ نہ کرے جنہوں نے جنگ کے دوران عربوں کے خلاف اسرائیل کی مدد کی -

ملک کے نامور شاعر فیض احمد فیض نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادیب معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو اس کے خلاف آواز اٹھانا ادیبوں کا فرض ہے - انہوں نے کہا جو لوگ صدر ناصر کو یا عرب افواج کو شکست کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہ غلطی پر ہیں - اس طرح کی غلط فہمی سے اصل دشمن اوجھل ہو جائیں گے - باضمیر لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اصل دشمنوں ان کے حواریوں اور ایجنٹوں کو بے نقاب کریں - انہوں نے کہا کہ عربوں کا سب سے بڑا دشمن امریکہ ہے - برطانیہ کی حیثیت اسرائیل جیسی ہے - امریکہ نہر سویز پر دوبارہ اپنا اقتدار بحال کرانے کا خواہاں ہے - انہوں نے کہا کہ ان ممالک کے اداروں سے کسی قسم کا کوئی رابطہ رکھنا غیر اخلاقی ہے - جنہوں نے عربوں کے خلاف اسرائیل کی مدد کی -

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اس پلیٹ فارم سے دنیا کے دانشوروں کو، خاص طور پر سامراجی دانشوروں پر اپنا یہ نقطۂ نظر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سامراجیوں کے خلاف

دنیا میں جو جنگ جاری ہے ، ہم اس میں شریک ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ویت نام اور مشرقِ وسطیٰ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے ، اُس کا رُخ کل ہماری طرف بھی ہوگا جیسا کہ اس سے پہلے ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس پلیٹ فارم سے واضح الفاظ میں کہتا ہوں کہ آج سامراج کے معنی برطانیہ اور امریکہ ہیں۔

ہاجرہ مسرور نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ویت نام اور مشرقِ وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ استعمار نے اپنی شکست قبول نہیں کی۔

ابراہیم جلیس نے کہا کہ بعض مغربی دانش ور بکتے ہیں کہ یہودیوں کو رہنے کے لئے "تھوڑی سی زمین" کی ضرورت ہے۔ کیا فرانس ، برطانیہ اور امریکہ میں ان یہودیوں کو "تھوڑی سی زمین" نہیں دی جا سکتی؟ انہوں نے کہا کہ سامراجیوں نے اپنی ناپاک سازش کے تحت عربوں کے قلب میں یہودیوں کو ناجائز طور پر اسرائیل میں آباد کر دیا۔ اب یہ چور پستول تان کر اصل مالک مکان کو باہر نکال رہا ہے اور اپنے حقوق کا دعویٰ کر رہا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ جن ممالک نے اس جنگ میں اسرائیل کی مدد کی ان کا ہر سطح پر بائیکاٹ کر دیا جائے۔ ابن انشاؔ نے جلسے میں اپنی نظم "دیوارِ گریہ" سنائی۔ پروفیسر اے بی اے حلیم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اسرائیل ایک غیر قانونی حکومت ہے جس وقت تک اسرائیل قائم ہے ، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کے اس جلسے میں متفقہ قراردادیں منظور ہوئیں۔ جن میں دنیا کے تمام دانشوروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسرائیلی جارحیت کے خلاف واضح طور پر آواز بلند کریں۔ اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسرائیل سے عربوں کے وہ علاقے خالی کرائے جن پر حالیہ جنگ کے دوران قبضہ کیا گیا۔ اور ساتھ ہی اسرائیل پر پابندیاں بھی عائد کرے۔ شہریوں سے اپیل کی گئی کہ وہ عرب بھائیوں کو عطیات دینے میں فراخ دلی کا ثبوت دیں۔

اسرائیلی جارحیت کی شدید مذمت

راولپنڈی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی پنڈی شاخ نے عربوں کے خلاف اسرائیل کے جارحانہ حملے کی شدید مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ اسرائیل عرب علاقوں سے اپنی فوجیں فوری طور پر واپس ہٹالے۔ حکیم یوسف حسن کی صدارت میں گلڈ کے ایک اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں عربوں کے خلاف سامراجیوں کے ناپاک عزائم کی شدید مذمت کی گئی۔ ایک اور قرارداد میں گلڈ نے حکومت پر زور

ایک شام ۔ قمر ہاشمی کے ساتھ

کراچی ۔ ۱۰ر جون کو رائٹرز گلڈ نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر میں مشہور شاعر قمر ہاشمی کے ساتھ ایک شام منائی۔ جلسے کی صدارت رئیس امروہوی نے کی۔ سحر انصاری نے قمر ہاشمی کی شخصیت اور فن پر مقالہ پڑھا۔ سرشار صدیقی انجم اعظمی اور صدرِ جلسہ نے مہمانِ خصوصی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ حکیم محمد سعید دہلوی کے علاوہ شہر کے نمائندہ شاعر ادیب ، صحافی اور پروفیسر اس شام میں شریک تھے۔

دیا کہ وہ راولپنڈی میں ادیبوں کی کالونی قائم کرے۔ اجلاس میں سید عطا حسین کلیم کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو اسی مقصد کے لئے متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کرے گی۔ اجلاس میں مشہور ادیب اور مدیر "ساقی" شاہد احمد دہلوی کی موت پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ بیگم شاہد احمد دہلوی کے نام ۷۵۰ روپے کا ماہانہ وظیفہ منتقل کرے جو شاہد احمد مرحوم کو ان کی زندگی میں مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت سے اپیل کی گئی کہ وہ ماہنامہ "ساقی" کی مسلسل اشاعت کے لئے ۵۰۰ روپے ماہانہ بطور امداد منظور کرے۔

کرشن چندر نمبر شائع ہوگیا

طلباء کا پہلا انعام احفاظ الرحمٰن نے حاصل کیا

کراچی۔ اطلاع ملی ہے کہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا "کرشن چندر نمبر" شائع ہوگیا۔ اور کرشن چندر نمبر کے سلسلے میں جو کل پاک و ہند طلبا کا انعامی مقابلہ ہوا تھا۔ اس کا پہلا انعام اردو کالج کے سابق طالب علم احفاظ الرحمٰن نے حاصل کر لیا۔ حافظ رہے کہ احفاظ الرحمٰن "افکار" فیض نمبر کے انعامی مقابلے میں بھی پہلا انعام حاصل کر چکے ہیں۔

ایک صبح - جوش کے ساتھ

جوش پر گفتگو - جوش کے روبرو

کراچی ۱۸ جون کو صبح دس بجے رائٹرز کلب کی جانب سے ایک نشست منعقد ہوئی جو اس لحاظ سے منفرد تھی کہ اس میں جوش صاحب کے روبرو جوش صاحب کے فن شاعری اور شخصیت پر گفتگو کی گئی۔ کلب کے سکریٹری سرشار صدیقی نے کلب کی سرگرمیوں کی مختصر سی روداد کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری سے صدارت کی درخواست کی۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے محمد رئیس نے "جوش اور نئی نسل" کے موضوع پر تقریر کی اور کہا کہ جوش اور نئی نسل میں بہت بُعد پیدا ہو گیا ہے اور نئی نسل جوش صاحب کو بڑا شاعر نہیں مانتی بلکہ نئی نسل جوش سے واقف ہی نہیں ہے۔ یحییٰ سلام نے کہا کہ جوش کے یہاں کوئی مربوط فلسفہ نہیں تھا، لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں کیونکہ اب مربوط اور متعلم فلسفے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ مرتضیٰ شفیع نے کہا کہ جوش کے یہاں انقلاب کا تصور بہت واضح ہے۔ سحر انصاری نے جوش کی شاعری کے تنوع اور توانائی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ جوش صرف رباعی میں خیام سے بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے رباعی کے فن کو جس طرح ترقی دی ہے اس کی مثال خیام، ابوسعید ابوالخیر اور طاہر عریاں کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ جوش کی شاعری میں سائنس کی جدید فکر بھی ملتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ ہماری کلاسیکی روایت کے بعد جوش واحد شاعر ہیں جنہوں نے نئی شاعری میں وہ مذہب مہذب انسان کو سمو دیا ہے۔

افکار

فخر و مسرت کے ساتھ

اپنی ۲۳ ویں سالگرہ پر

سالنامہ ۱۹۶۷ء

روایت، حسن اور معیار کے ساتھ

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

افکار — معمولی نہیں ہمیشہ
غیر معمولی اشاعتیں پیش کرتا ہے

سالانہ ممبر بن کر

سالنامہ ۶۷ء مفت حاصل کیجئے

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی   طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی   دفتر: رابسن روڈ کراچی

گرمیوں میں
بہار
کا لطف!
گرمی کی زحمت اور تھکن سے بچنے کے لئے
روح افزا کی تازگی بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایئے اور
اس موسم میں اس کا مسلسل استعمال رکھئے۔ یہ خوش ذائقہ
فرحت بخش مشروب ہر شخص کو بھاتا اور گرمی میں
بہار کا سماں پیدا کرتا ہے۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
روح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس
لاہور - کراچی
SHARBAT
ROOH AFZA

بس
بال بال
بچے...

خوش قسمتی سے بریک بروقت لگے
ورنہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے!
تیز رفتار بس اور اسے اوورٹیک کرتی ہوئی ٹرک
کی زد سے ذرا کم ہی بچا کرتے ہیں۔ چند لمحوں کی
دیر اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دس بیس سال
پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں۔ سڑک پر چوکنا نہ
رہنا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے!

- جہاں کہیں ممکن ہو، فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے۔
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں، وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں۔
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے۔
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے۔
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے۔
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں انتہائی محتاط رہئے۔

عمرانی علوم کی تعلیم ——— انجم اعظمی

پیرس سے ایک ایرانی کا خط ——— آغا افتخار حسین

ادبی تحریکوں کا مسئلہ ——— جمیل ملک

رائٹرز نوٹ بک ——— جوگندر پال

یوم اقبال کا آنکھوں دیکھا حال ——— سحر انصاری

پاکستان میں اردو ناول ——— ایک مذاکرہ

نیا طنزیہ مزاحیہ مستقل عنوان

رفتارِ زمن از مختارِ زمن

۵۔ افسانے، ۱۹ منظومات، ۴ دیس دیس کی نظمیں

اور مستقل عنوانات

ہر ماہ

تازہ و غیر مطبوعہ تخلیقات

افکار میں پڑھئے

ہر بک اسٹال سے ایک روپے میں خریدیے

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈکوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون: ۷۳۹۹۳-۱

سال: ۲۳، ۵ شمارہ: ۱۹۷۰

مدیر

صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ	بیرونِ ملک سے		قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ	۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

[illegible]

۱۴ - پرنسیز ایونیو - لندن - این ڈبلیو ۹

افکار

اگست ۱۹۷۲ء کی تخلیقات

شمارہ ۱۲ [illegible]

اس شمارے کی تمام تخلیقات براہ راست حاصل کی گئی ہیں۔ مضامین، نظم و نثر کی حق اشاعت محفوظ ہے۔ انہیں تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا

الله

اشاریہ

ادبی رسالوں کا بُرا وقت

اردو کے مشہور ادیب و شاعر، افکار کے دیرینہ رفیق و معاون اور نیشنل بُک سنٹر کے ڈائرکٹر ابن انشا نے مندرجۂ بالا عنوان سے مقامی معاصر "ماہِ نو" میں ایک مضمون لکھا ہے، جس کے اقتباسات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:-

"ادبی پرچوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے۔ کچھ مر گئے۔ کچھ سسک رہے ہیں۔ "ہمایوں" گیا۔ "الحمرا" گیا۔ "عالمگیر" گیا "ادبِ لطیف" کا وہ پہلا سا طلسم کہاں ہے جو عالمی جنگ کے دنوں میں تھا بلکہ قیامِ پاکستان تک رہا۔ "نیرنگِ خیال" اگلے وقتوں کی یادگار ہے جسے حکیم یوسف حسن اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کی مثال ایڈگر ایلن پو کے "ہاؤس آف اشرز" کی سی جانئے کہ جب تک مکین ہے تب تک مکان ہے۔ جب تک طوطا ہے، تب تک دیو کی جان ہے۔" ادبی دنیا" کا شباب رفتہ اب کہاں لوٹ کے آئے گا۔ سنا ہے اب بھی نکلتا ہے لیکن ؎

"اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

وہ فروغِ شمع جو "ساقی" کے دم سے تھا۔ وہ بھی شاہد احمد دہلوی کے ساتھ گیا۔ خدا "ساقی" کو زندہ رکھے۔ لیکن صاحبو! بات تلخ ہے، شاہد احمد کے بغیر "ساقی" کیا؟ صلاح الدین احمد کے بغیر "ادبی دنیا" کیا؟ نیاز کے بغیر "نگار" کیا؟ یہ پرچے ان بزرگوں کی ذاتوں کی توسیعات تھیں۔ پرانی باقیات میں سے جو لوگ رہ گئے ہیں اب تو ان کی قدر کرو غنیمت ہے اور مولانا رازق الخیری ہیں۔ "عصمت" ہے اور صہبا لکھنوی ہیں۔

یہ بات ماہناموں کی ہے اور افتاد اُنہیں پر پڑی ہے ۔ پرچہ پہلی کو آنا ہوا اور
مضامین اس ڈھنگ کے نہیں جیسے ہونے چاہئیں ۔ اب یا تو بھرتی کیجئے یا پرچہ روکئے
اس ضرورت نے دوماہی، سہ ماہی پرچوں کو جنم دیا جو فقط نام کو دوماہی، سہ ماہی ہیں
ان کی مثال ان دیہاتی لاریوں کی سی ہے کہ جب تک بھر نہ لیں تب تک نہیں چھوڑتیں ۔"
نیشنل بک سنٹر کی فرمائش پر تقریباً تین سال پہلے شاہد احمد دہلوی مرحوم نے ادبی پرچوں اور
اُن کے چند در چند مسائل کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا :

"صرف گنتی کے چند ادبی رسالے رہ گئے ہیں ، نئے ادبی رسالے جاری نہیں ہو
رہے ۔ شاید ادب اور ادبی رسالوں کی ہمارے معاشرے کو ضرورت ہی نہیں رہی ـــ اگر یہی
شب و روز رہے تو یہ گنتی کے ادبی رسالے بھی ختم ہو جائیں گے ۔"

اس سلسلے میں ابن انشاء نے ایک تجویز پیش کی ہے جو زبان و ادب ، تہذیب و ثقافت اور علم و آگہی
سے شغف رکھنے والوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے :

"ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پرچوں کی بقا اور ترقی میں مدد دینے کے لئے
جو واقعی ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور ذہنوں کی تہذیب کا ذریعہ ہیں ـــ ایک
فاؤنڈیشن قائم کی جائے ۔ دوسرے ملکوں میں کتابوں اور رسالوں کی بڑی کھپت
لائبریریوں میں ہوتی ہے ۔ ہمارے ہاں اتنی لائبریریاں کہاں ہیں ۔ بہر حال جو ہیں
ان کا نظام خریداری بھی تسلی بخش نہیں ۔ اگر یہ فاؤنڈیشن دو دو چار چار ہزار پرچے ان
رسالوں کے خرید کر لائبریریوں اور دارالمطالعوں اور درس گاہوں کو دے سکے تو کچھ سہارا
ان رسالوں کو مل سکتا ہے ۔ ادھر سرکاری اور غیر سرکاری مشتہرین کو بھی ان پرچوں کو
اخباروں اور عام مطبوعات سے الگ کر کے دیکھنا چاہئے ۔ ادبی پرچہ زیادہ ہاتھوں سے
گذرتا ہے لہٰذا ادبی پرچے کی ایک ہزار اشاعت کو اخبار کی دس ہزار اشاعت کے برابر
رکھ کر نرخ مقرر کرنے چاہئیں ـــ ادبی رسائل کو اقتصادی طور پر خود کفیل اور اچھی
خاصی یافت دینے والا ہونا چاہئے ۔ ادبی پرچے ادب کے ورکشاپ ہیں ۔ یہ نہ ہوں گے
تو کتاب نویسی بھی نہ ہوں گے کتابیں بھی نہ ہوں گی ۔"

ادبی رسائل اور اُن کے مسائل کے بارے میں یہ درد مندانہ اظہارِ خیال کسی مزید تشریح و توضیح
کا محتاج نہیں ۔ کاش ان گنے چُنے ادبی ماہناموں کی چند در چند مشکلات و مصائب کا جلد کوئی تسلی بخش
حل نکل سکے تاکہ زبان و ادب کے یہ خدمت گذار رسالے بھی زندہ رہ سکیں ۔

مسعود علی ذوقی

زمین جاگی

ہوائیں سنکیں
ستاروں کے دیپ بجھنے لگے
خنک فضاؤں میں شبنم کی تازگی دوڑی
دراز قامت و دیرینہ سال جنگل نے
لیٹی جھٹک کے اک انگڑائی لی
زمیں
پرند چونکے سرشاخ آشیانوں میں
پروں کو جھاڑ کے
اک ساتھ چہچہا اُٹھے
تو بھیرویں کے سُروں میں سرود بجنے لگا
سکوں میں جان پڑی
جنبشوں نے لب کھولے
صدائیں جاگیں
خموشی کا سحر ٹوٹ گیا
سحر کی دُھندلی، پُراسرار خواب گاہ کے گرد
اندھیرے چھٹنے لگے،
آسماں پگھلنے لگا
اُفق کے پاس گلابی غبار اڑنے لگا۔
پلک جھپکتے ہی
آواز و نور کا افسوں
بلند و پست پہ سنگیت بن کے پھیل گیا

سید ابوالخیر کشفی

فرعون کی واپسی

نیویارک ۶ جولائی ۱۹۶۷ء　　　　برادرِ محترم صہبا صاحب!

کل "افکار" ملا۔ ہمارے ڈاکیہ کو شکایت یہ ہے کہ "تمہارے دیس سے لوگ رجسٹری کے ذریعہ چیزیں کیوں بھیجتے ہیں۔ کیا ہم پر اعتبار نہیں؟" — اور میں ہنس کر چپ ہو جاتا ہوں — ایک ماہ یوں گذرا ہے جیسے ریگستان میں پیاسی قوم کا کوئی قافلہ گذر رہا ہو — مسلسل تشنہ لبی — اور آج چند قطرے اس تشنہ لبی کو ملے ہیں — "افکار" ملا — ذہن نے غم کی گرد کو جھاڑا — اور آج رات جب گرد جھڑی تو بارش کے پہلے قطروں کی طرح ایک نظم نے ذہن کی آگ کو قدرے ٹھنڈا کیا ہے — مگر یوں کہ آگ سطح سے نیچے، دل کی جگہ نئے انداز سے سلگ رہی ہے — شعلے بجھے نہیں اور "سلگنا" عمل ہے، انفعالی کیفیت نہیں۔ رات کو ایک بجے پہلا مصرع ذہن میں کلبلایا اور اب ڈیڑھ بجے ہیں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ "افکار" ستمبر کے بعد پہلا ادبی رسالہ ہے جو دیکھنے کو ملا۔ اور ایک خبر سناؤں؟ انشاء اللہ اسی مہینے نیویارک سے اردو کا پہلا رسالہ شائع ہوگا "مضراب" — وہ نام جو میرا ادبی ماضی بھی ہے اور حال بھی۔　　　　سید ابوالخیر

وادیٔ نیل میں فرعون پلٹ آیا ہے
جس کے ہونٹوں سے سُنا موسیٰ عمرانؑ کا ذکر
جس کی وحشت سے ہوا دیدۂ یعقوب بھی کور
بوئے یوسفؑ سے جسے نور نہیں مل سکتا
ابنِ مریمؑ کی زمیں پر ہے اُداسی کا نزول
شرقِ اردن کے در و بام پہ "یک چشم" کا عکس
عہدِ حاضر کے خرابوں کا پتہ دیتا ہے

شرقِ اوسط کی زمیں پوچھتی ہے:

"بیتِ ابیض ہے کہ بیتِ اسود؟"
"مجلسِ ملتِ آدم ہے کہ مچھلی بازار؟"

ٹیلی ویژن پہ نظر آتے ہیں
اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے اپنی لاشیں
وہ جہاں دوست کہ جن کے اجداد
عہدِ تاریک میں مغرب کو سبق دیتے تھے
عدل و انصاف و جہاں بانی کا

ٹیلی ویژن پہ نظر آتے ہیں
بیتِ اقدس کے منار
جن کی خاموش پکار
مجھ کو آواز دیئے جاتی ہے
میں کہ اک فرد بھی ہوں قوم بھی ہوں
جس کی میراث کا حصہ ہے یہ بیتِ اقدس

"مجلسِ فتنہ و آلام" ذرا غور سے سُن
"اپنے اجداد کی میراث کے وارث ہم ہیں"
ہم کہ گُل رنگ بھی کر سکتے ہیں دامانِ حیاتِ اغیار
ہم کہ تاریخ کا عہدِ نو ہیں
ہم کہ تاریخ کی تلوار بھی ہیں
ہم کہ ہیں حضرتِ موسٰی کا عصا
ہم کہ مستقبلِ آدم کے امیں
ہم کہ سورج کی طرح جیتے ہیں [1]

---

[1] جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں   اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے (اقبال)

فارغ بخاری

موت کے سائے

زندگی کے یہ راہزن لمحات

کس خموشی کے بن میں لے آئے

چار جانب ہیں موت کے سائے

چلتی پھرتی یہ بے صدا لاشیں

اپنی آواز کو ترستی ہیں

ان کی کچلی ہوئی حزیں روحیں

کسی ساحر کے اختیار میں ہیں

یا صلیبوں کی رہگزار میں ہیں

دفن ہونے کے انتظار میں ہیں

رضا ہمدانی

جائزہ

آسماں کی وسعتیں قریب ہیں
بال و پر اگر نہ ہوں
رفعتوں کے ہم نوا نشیب ہیں
ہم سفر اگر نہ ہوں

مطربوں سے گیت سُن رہے ہیں ہم
اس عمل کے دَور میں
مصلحت کے جال بُن رہے ہیں ہم
آندھیوں کے زور میں

کہکشاں کی منزلوں سے گھوُم کر
پستیوں کو آ لیا
موتیوں کی عصمتوں کو چُوم کر
کنکر اک اُٹھا لیا

پھر وہی ملوکیت کا راگ ہے !
پھر وہی ہے زیر و بم
پھر وہی ستم گری کی آگ ہے
اور جل رہے ہیں ہم

کب جہاں کو دَرد سے ملے نجات
کب وہ عہد جگمگائے
کب بنے نیا نظام کائنات
کب وہ انقلاب آئے

قہقہوں کی زد سے جاں بچا سکیں
مفلسوں کے بام و در
زرفشاں محل نہ مُسکرا سکیں
جھونپڑوں کو دیکھ کر

تابش اسلم

یہ عجب شہر ہے

دن پہ چھائی ہوئی درد کی ظلمتیں
دوپہر، آگ میں تلملاتی ہوئی
شام کے جسم پر
خون کی دھاریاں
رات، اشکوں کے سیلاب میں نیم جاں
لمحہ لمحہ ہے خوابوں کی اک قتل گہ
ایک اک سانس میں زہر کا ذائقہ
ہونٹ چپ، آنکھ ویران، دل مضطرب
ذہن میں غم کی رقصندہ پرچھائیاں
خامشی، یاسیت، خوف، ویرانیاں
کوئی آہٹ نہیں
کوئی لرزش نہیں
یہ عجب شہر ہے
سرد اور منجمد
زندگی کی حرارت سے ناآشنا
اپنی گمبھیر خاموشیوں کے جہنم
— میں جھلستا ہوا!!

سرور حسین

کنایہ

شبِ فراق کی تاریک شاہراہوں میں
تمہارے ہونٹ کی سُرخی اگر ہوئی کچھ کم
تو کشتِ دل کے سبھی برگ و گل سیاہ ہوئے
شبِ سیاہ کی تاریک تر فضاؤں میں
بجھے ہوئے ہیں فلک کے تمام آئینے
بجھی ہوئی ہیں نظر کی تمام قندیلیں

نمو کے زور سے گر شوخ شوخ کلیوں نے
نقاب رُخ سے اُٹھایا تو اُن پہ راز کُھلا
وہ شے کہ جس کو سحر کا جمال سمجھا ہے
سوادِ شام پہ گردِ شفق کا سایہ ہے
وہ شے کہ جس کو شبِ اتصال سمجھا ہے
شبِ سیاہ میں اک وہم کا کنایہ ہے

شاھد عزیز

سفر

ہزاروں سال سے میں چل رہا ہوں
ہزاروں سال سے ان ظلمتوں میں
میں اپنے خون سے مشعل جلا کر
روشنی پھیلا رہا ہوں
میں چل رہا ہوں
ہزاروں سال سے میں چل رہا ہوں
ہزاروں راستوں کے پیچ و خم سے
لڑ جھگڑ کر
ہزاروں منزلیں پائی ہیں میں نے
مگر پھر بھی
کسی منزل پہ میں ٹھہرا نہیں ہوں
میں چل رہا ہوں
ہزاروں سال سے میں چل رہا ہوں

سبط حسن

اُردو ادب کا جدید دور

بہار کا موسم نئی زندگی کا پیغام لاتا ہے۔ چنانچہ سردی سے کانپتی اور ٹھٹھرتی زندگی کے جسم میں توانائی اور حرارت سی زمانے میں پیدا ہوتی ہے۔ اور تب زمین کی روح تخلیق انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے۔ باغ پیلے اودے اور سرخ پھولوں سے مہک جاتے ہیں۔ اناج کی بالیاں نئی رُت کی سرشاری سے جھومنے لگتی ہیں۔ نیلے شفاف آسمان پر سورج کی چمک بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور بقولِ غالبؔ ہواؤں میں شراب کی تاثیر آجاتی ہے۔ غرض کہ ہمارے گرد و پیش کی ساری فضا روشن اور تابناک ہو جاتی ہے۔ اس نئے موسم میں انسانوں کے مزاج بھی بدل جاتے ہیں اور ان کی حسی کیفیات ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پُرانی قومیں نئے سال کا آغاز ہمیشہ موسمِ بہار کی آمد سے کرتی تھیں، کیونکہ اسی بہار پر ان کی معیشت بلکہ بقا کا انحصار ہوتا تھا۔ وہ اس بہار کا خیر مقدم گیتوں، ناچوں اور تہواروں سے کرتی تھیں۔ اسی لئے موسم کی حد تک یہ بتانا کہ جدید دور کب شروع ہوا، اور قدیم دور کب ختم ہوا بہت آسان ہے، مگر ادب کی دنیا میں قدیم اور جدید کے درمیان خطِ امتیاز قائم کرنا اتنا آسان نہیں۔ کیونکہ ادب ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے۔ البتہ نقادوں نے ہماری سہولت کے لئے اردو ادب کے مختلف ادوار قائم کئے ہیں۔ ان ادوار کا تعین ادبی اقدار اور سوچ کے انداز میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اُن کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً نقادوں کا کہنا ہے کہ اردو ادب کا جدید دور غالبؔ اور سرسیدؔ کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ اس دور کے ادبی اقدار کی آبیاری مولوی محمد حسین آزادؔ اور مولانا حالیؔ نے کی۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ ہمارے ادب میں جو تصنع اور بناوٹ کی فراوانی ہے اس کو ترک کر کے تحریر کو زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہئے۔

چنانچہ انہوں نے نیچرل شاعری پر بہت زور دیا۔ نیچرل شاعری کا مطالبہ تھا کہ ہم اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا بغور مطالعہ کریں، اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات نظم کے سانچے میں ڈھال کر لوگوں تک پہنچائیں۔ نیچرل شاعری اس بات پر بھی زور دیتی تھی کہ شستہ اور بول چال کی زبان استعمال کریں۔ اور فرسودہ اور پامال تشبیہوں، استعاروں، اور علامتوں کو جن میں اب کوئی جان باقی نہیں، ترک کر دیں۔ آزادؔ اور حالیؔ کی اس آواز کی، روایتی ادب کے حامیوں نے

شدت سے مخالفت کی تھی، لیکن رفتہ رفتہ آزاد اور حالی کے قائم کئے ہوئے معیار لوگوں میں مقبول ہونے لگے۔ اور پھر ایک وقت وہ آیا جب ہم نے انہیں دلیر ادیبوں کو اپنا ادبی رہنما تسلیم کرلیا۔

اردو ادب میں جدیدیت کا دوسرا دور وہ تھا جو مغرب کے رومانوی ادب سے متاثر ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس کے مبلغین سجاد حیدر یلدرم، مولانا سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، قاضی عبدالغفار، مہدی الافادی، امتیاز علی تاج، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور نلک پیما کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

نثر میں انشائے لطیف کا رواج بھی اسی دور میں ہوا۔ اور ایک بار پھر روایت پرستوں نے اُن جدید فن کاروں کی تخلیقات پر برہمی کا اظہار کیا، لیکن رفتہ رفتہ یہی رومانیت اور لطیف انشائیت اردو ادب کا جز بن گئی۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال کی آواز بلند ہوئی۔ اُن کی آواز بجائے خود ایک ادبی دور کی موجد تھی۔ علامہ اقبال کا نظریۂ ادب حقیقت شناسی اور حقیقت بینی پر مبنی تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
بلبل کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

علامہ اقبال نے اپنی تخلیقات سے واضح کر دیا کہ وہ ادیب کو دراصل معاشرے کا ضمیر اور اس ضمیر کی آواز خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیب معاشرے کا سب سے حساس اور باشعور عنصر ہے۔ اور اس اعتبار سے اس پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

علامہ اقبال نے جو قدیم اور جدید ادب پر گہری نظر رکھتے تھے، اور مشرقی روایت سے بھی بخوبی آگاہ تھے، ہیئت کے نئے تجربے بھی کئے۔ انہوں نے پرانی علامتیں تو ضرور استعمال کیں، ان کو نئے معانی عطا کئے جن سے ان علامات کے تاثر میں جان اور تڑپ پیدا ہوگئی۔

اسی زمانے میں اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے ادیبوں نے ہیئت کے تجربوں کے علاوہ اپنے موضوعِ سخن کا رُخ بھی بدل دیا۔ اور معاشرتی مسائل کی تنقید ان کا جزو ایمان بن گئی۔ اس دور کے سربرآوردہ ادیبوں میں فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیارپوری، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، ن۔م راشد، اور احمد راہی کے نام سرفہرست ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر ادیب ابھی حیات ہیں اور ان کی تحریروں سے اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے۔

لیکن گذشتہ چند برسوں سے چند نئے رجحانات ابھر رہے ہیں۔ بعض نئے ادیب وجودیت کے فلسفے سے متاثر ہو کر زندگی ہی کو مہمل اور بے معنی سمجھنے لگے ہیں۔ اور ہماری تمام تہذیبی قدروں سے بیزار نظر آتے ہیں۔ بعض ادیب ہیئت کے تجریدی تجربوں میں مصروف ہیں اور اپنی فنی تخلیق کی ماہیت اور معنویت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بعض ادیب شدید داخلیت اور فراریت کے شکار ہیں۔ بعض ادیب ماضی کی تمام علامتوں کو مسترد کر دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں۔ اور بعض

ادیب تو اپنی ذات میں اس حد تک گم ہوگئے ہیں؛ اور اُن کے کلام میں رمزیت، سریت، ابہام اور افراط اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی ان کی تحریروں کا سمجھنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہوگیا ہے۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ: ہم تو اپنے لئے لکھتے ہیں۔ ہماری بات اگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے۔

یہ درست ہے کہ آج کل زندگی بہت پیچیدہ اور زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے، اور کسی ایک جگہ کھڑے ہو کر اس زندگی کا تجربہ یا مشاہدہ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایٹمی دور میں قدم رکھ چکے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، انسان خلا کی تسخیر کرنے کے بعد اب چاند پر کمندیں پھینکنے کی فکر میں ہے۔ یہ بھی درست ہے ہم دنیا سے الگ تھلگ کسی جزیرے میں نہیں رہتے، بلکہ دنیا میں مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات پیدا ہوتے ہیں اُن سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب کے جدید دور میں مقصدیت اور افادیت کا عنصر قریب قریب غائب ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور جدید کا ادیب اپنے آپ کو معاشرے سے الگ کوئی مجرد شے سمجھتا ہے۔ اور بحیثیت شہری کے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اُن سے قطعاً کوئی دلچسپی لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ مسائل حیات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اور نہ گرد و پیش کے حالات اسے متاثر کرتے ہیں۔

جدید دور کا ادیب اپنی جرأت اور بے باکی کا بہت ڈھنڈورہ پیٹتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے۔ اور اسے معاشرے کی کسی قوت سے ڈر نہیں لگتا۔ لیکن جدید ادیبوں کی تحریروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بلکہ اجازت ہو تو عرض کروں کہ ان نام نہاد ادیبوں میں اخلاقی جرأت بہت کم ہے۔ جرأت سے مراد اگر فحش نگاری اور گالی گلوچ ہے یا ہیئت کے تجربے ہیں تب تو یہ ادیب یقیناً بے حد جری اور دلیر ہیں۔ لیکن حقیقی جرأت اور بے باکی کا معیار یہ ہے کہ آیا ادیب اپنے معاشرے کی امنگوں اور آرزوؤں، حسرتوں اور کلفتوں کی ترجمانی کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے یا نہیں، مانا کہ ہر ادیب منصور اور سرمد بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن جرأت اور بے باکی کا جو معیار اقبال، جوش، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی، اور دوسرے ممتاز ادیبوں نے قائم کیا تھا اس معیار کو برقرار رکھنا چنداں دشوار نہیں ہے۔

جدید دور کے ادیبوں میں بڑا چڑچڑا پن آگیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تلخی بھی ہے اور برہمی بھی ہے۔ اور ایک خاص قسم کی Cynicism بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے ادیب کو جو ذاتی پریشانیاں لاحق ہیں یا اس کی اپنی ذات جن پابندیوں میں گرفتار ہے اس سے وہ بہت خفا ہے۔ نئے ادیبوں کی تخلیقات پر مایوسی اور افسردگی کی گھٹا بھی چھائی رہتی ہے۔ یہ مایوسی اور افسردگی بھی انفرادی کیفیات ہیں۔ ان کا تعلق غم زیست سے بالکل نہیں ہے۔ غم کا اظہار ادب کا نہایت اہم موضوع رہا ہے۔ اس سے دردمندی پیدا ہوتی ہے۔ انسان دوستی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ انسانیت کی صحت مند قدروں سے الفت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ہوتی ہے، روح کی طہارت ہوتی ہے۔ لیکن وہ غم جو خالص ذاتی ہو اور جس میں آفاقی غم بننے کی صلاحیت نہ ہو، ہم کو افسردہ کرتا ہے اور ہماری قوتِ تخلیق قوت عمل کو شل کرتا ہے۔

آخر میں میں چند باتیں نئے ادیبوں کی صفائی میں پیش کروں گا۔ اول یہ کہ نئے ادب اور نئے ادیبوں کا حبا

لیتے وقت ہمیں اپنی جوانی کے دن کبھی نہیں بھولنا چاہئیں - ۱۹۳۶ء کے نوجوان ادیبوں کو اپنے پیشروؤں سے یہی شکایت تھی کہ وہ ان کی زبان اور اُن کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اور اُن پر بے جا اعتراض کرتے رہتے ہیں، آہستہ آہستہ انہیں نئے ادیبوں کی زبان پورے ادب کی زبان بن گئی۔ عین ممکن ہے کہ جدید دور کے ادیبوں کی تحریریں بھی آگے چل کر ایک روایت کی حیثیت اختیار کر جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جدید اردو ادب میں جو ذہنی خلفشار اور حسّی الجھنیں پائی جاتی ہیں، وہ کوئی حادثہ نہیں ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اکثر ملکوں کے ادیب ان دنوں اسی قسم کی الجھنوں کا شکار ہیں، وہ زندگی کو نئے انداز سے دیکھنے سمجھنے اور برتنے کی کوشش کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی حسّی کیفیات جنگ عظیم سے پہلے پیدا ہونے والوں کی حسّی کیفیات سے بہت مختلف ہوں گی۔ لہٰذا ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ حالات اور سانحات کو اس انداز سے محسوس کریں، اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کا اظہار اسی زبان میں کریں جس زبان میں اُن کے پیشروؤں نے کیا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اردو زبان کی روایتی علامتیں اور استعارے اب خزاں گزیدہ پتّوں کی مانند بے کیف ہو چکے ہیں۔ ان میں اگر کوئی دلکشی باقی ہے تو وہ حسنِ بیمار کی سی دلکشی ہے۔ ان علامتوں اور استعاروں میں اب اتنی سکت نہیں کہ وہ دورِ جدید کے تجربات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔ اس لئے ان استعاروں اور علامتوں کے خلاف نئے ادیبوں کی بغاوت لائق ستائش ہے۔ وہ کام جو آزاد اور حالی سر انجام نہ دے سکے اگر نئے ادیب سر انجام دے سکیں تو اُن کا یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔

لہٰذا نئے ادیب ہیئتوں اور علامتوں کے جو تجربے کر رہے ہیں اُن سے گھبرانے یا خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کی تحریروں میں ابہام ہے یا ان کی علامتیں اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہیں تو بھی انہیں نئے تجربوں کا موقع ملنا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ ردّ و قبول کے اصول کے پیشِ نظر ان کی انفرادی علامتیں آگے چل کر اجتماعی علامتوں کی شکل اختیار کر لیں۔ اور ان کے ذریعے جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا جاتا ہے، اُن کی اجنبیت بھی کم ہو جائے۔

البتہ ہم نئے ادیبوں سے یہ توقع ضرور رکھتے ہیں کہ وہ ادب کی تخلیق کرتے وقت اپنی ذات ہی کو انجمن نہ تصور کریں۔ بلکہ اپنے گرد و پیش بسنے والے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی اور تنقید کو بھی اپنا فرض سمجھیں۔ زندہ اور پائیدار ادب اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ادب جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور فن کے معیار جمال پر پورا اُترے۔ ایسا ادب جو حسن و محبت کی نغمگی، عشق و یقین کے سوز اور حق و صداقت کے خلوص سے لبریز ہو۔ ایسا ادب جو پاکستان کی تہذیبی روایتوں کو روشن کرے۔ جو ہماری زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ اور نقاد ہو، اور جو لوگوں کو جگائے، آگے بڑھائے، نہ کہ مایوس اور مضمحل کرے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

انجم اعظمی

ڈپٹی نذیر احمد

ایک مطالعہ

مرزا محمد عسکری تاریخ ادب اردو کے ترجمہ میں لکھتے ہیں ؛

"مولانا اپنے معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لے گئے۔ قوانین کے
تراجم سے وہ گورنمنٹ اور پبلک میں روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے
ترجمے سے مسلمانوں میں اُن کی شہرت ہوئی، اور ناولوں کی وجہ سے ہر گھر میں
اُن کا نام پہونچ گیا"

یہ مولانا جن کا ذکر تاریخ ادب اردو کے صفحات پر اس شان اور طمطراق کے ساتھ ہوا ہے کوئی اور نہیں ہیں، بلکہ سرسید کے رفیق ڈپٹی نذیر احمد ہیں جنہیں مہدی افادی نے اردو کے عناصر خمسہ میں شمار کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد بجنور میں پیدا ہوئے۔ عمر میں سرسید سے چودہ سال چھوٹے تھے۔ شادی دہلی کے ایک خاندان میں کی۔ اُن کی بیوی اُن کے استاد مولوی عبدالخالق کی بیٹی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب مولوی عبدالحق کا "مرحوم دہلی کالج" نہ صرف زندہ تھا بلکہ اپنے شباب پر تھا۔ یہاں وہ ہستیاں جمع ہوگئی تھیں جن کی ادبی و علمی خدمات سے برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل سنورنے والا تھا۔ اس کالج میں ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب جیسے لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہاں مغرب و مشرق کی لطافتوں، دریافتوں اور علمی نکتہ سنجیوں کو آمیز کیا گیا تھا، تاکہ طلبا، دونوں کا مجموعی شعور لے کر فارغ التحصیل ہوں۔

اس کالج کے قیام کا یہ نتیجہ تھا کہ طالب علموں میں وسیع معلومات ضبط و توازن اور آزادی رائے کے ساتھ ساتھ پختگی اور علم سے گہرا لگاؤ موجود ہوتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے حصے میں بھی یہ ساری خوبیاں آئیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے خود ڈپٹی نذیر احمد کی زبانی اپنے مضمون میں کہلوایا ہے :

"اگر میں اس کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں میں کیا ہوتا۔ مولوی

ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، بر خود غلط تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔

اس کالج نے قدیم وجدید اور مغرب و مشرق کی آمیزش سے نذیر احمد کو اعتدال پسند اور روایت پرستی سے بچاکر کام کا آدمی بنایا۔ اور زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیا۔

مولوی شبلی کے حق میں علی گڑھ کالج اور سرسید کی ذات نے جو کردار ادا کیا تھا، کم و بیش وہی کردار ڈپٹی نذیر احمد کے سلسلے میں دہلی کالج کا ہے۔ روزگار کے بہانے انہیں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑا۔ اس سیاحی میں زندگی کا تجربہ اور وسعتِ نظر کا ایک نیا خزانہ ان کے ہاتھ آیا۔ اس زمانے میں انہوں نے انگریزی زبان سیکھی، جس کے مواقع دہلی کالج میں موجود تھے لیکن اس وقت باپ کے منع کر دینے کے سبب محروم رہ گئے تھے۔ وہ گجرات واقع پنجاب، کانپور، الہ آباد، گورکھ پور، اعظم گڑھ وغیرہ میں رہے۔ پہلے محکمۂ تعلیم میں اور بعد کو تحصیلداری اور کلکٹری کے منصبوں پر فائز ہوئے۔ اور جب ریاست حیدرآباد کو اس جوہر اعلیٰ کی خبر ملی تو اس نے حکومتِ انگلشیہ سے ان کی خدمات حاصل کرکے جس کام پر انہیں مامور کرلیا اور جو مشاہرہ ان کا مقرر کیا اس سے سر سالار جنگ کی علم نوازی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یوپی کی ملازمت کے دوران اُن کا تعارف سرسید احمد خاں سے ہوا۔ وہ فوراً ہی اُن کے حلقۂ احباب میں شامل ہوگئے۔ اور اصلاحی تحریک کے سرگرم کارکن بن گئے۔ اصلاح کا جذبہ اُن میں پہلے ہی موجود تھا۔ دہلی کالج نے ان میں کام کرنے کا سلیقہ اور لگن پیدا کر دی تھی۔ سرسید سے مل کر اُن کی صلاحیتوں نے اور جِلا پائی۔ وہ آگ پوری طرح روشن ہوگئی جو سینے میں دبی ہوئی تھی۔ اور شخصیت کی تکمیل کا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا۔

اس عہد کے بڑے سے بڑے آدمی کے لئے سرسید سے ملنا اپنے زمانے کے شعور سے مکمل آگاہی کے مترادف تھا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اُن سے جتنے قریب ہیں ان کے یہاں روح عصر کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اتنی ہی زیادہ اجاگر ہوئی ہے۔ مولانا شبلی، حالی اور نذیر احمد وہ خوش قسمت لوگ تھے جنہیں سرسید سے استفادہ کا پورا پورا موقع ملا۔

ڈپٹی نذیر احمد کا ایک بڑا کارنامہ انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کے دوران قانون کی بے شمار اصطلاحات کے لئے اردو میں صحیح اور مناسب الفاظ تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ ابھی اردو زبان میں علمی کاموں کا آغاز ہوا تھا۔ کام کرنے والوں کو تلاش و جستجو کی ساری منزلیں خود ہی طے کرنی پڑتی تھیں، پہلے سے کوئی راہ یا سرمایہ موجود نہ تھا۔ جو تھوڑی بہت آسانی مہیا کر دیتا۔ بھلا یہ کون بتاتا کہ علمی اصطلاحات وضع کرنے کے اصول کیا ہوں گے۔ سب کچھ ڈپٹی نذیر احمد کو خود ہی کرنا تھا اور خود ہی کیا۔ انہوں نے اس کام میں اپنی عربی دانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کا ترجمہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کتنی حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ قانون کی اس کتاب کے مترجم کی حیثیت سے ایک

دیوبند نظر آتے ہیں جو راتوں رات ایک مضبوط اور پائیدار محل کھڑا کر دیتا ہے۔ آج بھی کسی میں اتنی ہمت اور سکت نہیں ہے کہ ایسی کتاب کا اتنا اچھا اور اتنی جلد ترجمہ کر سکے۔

انہوں نے بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھیں۔ اپنی لڑکیوں کے لئے ناول لکھے۔ یہی ناول اپنی خوبیوں کے سبب ان کا فن قرار پائے۔ قرآن کا ترجمہ کیا، اور ترجمہ کا ایسا انداز اختیار کیا گویا اسی بہانے تفسیر بھی کر ڈالی۔ مذہبی اور دینی کتابیں لکھیں جن میں "الحقوق والفرائض" نے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل کی۔ لیکن اردو ادب کے لوگوں نے خاص طور پر ان کے ناولوں کی طرف توجہ دی۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا ان کے خاص ناول ہیں۔ جن کو اُن کی مقصدیت کے سبب مولانا صلاح الدین نے ناول کے بجائے اہم مقالات سے تعبیر کیا۔ دراصل آج اردو ناول خاصی ترقی کر چکا ہے۔ اس کی فنی شکل ہر اعتبار سے اتنی مکمل اور جامع ہے کہ نذیر احمد کے ناول کسی طرح نظر میں نہیں ٹھہرتے۔ مولانا صلاح الدین بھی یہی کہنا چاہتے تھے کہ مقالات کی طرح نذیر احمد کے ناولوں میں بھی موضوع کو گہری سنجیدگی سے پیش کیا گیا۔ لیکن فنی شعور کی بے حدکمی کے ساتھ۔ اسی بات کو انہوں نے ایک اور انداز سے لکھا ہے:

"فن مقصد کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ اور مقصد کا سہارا لینے کی وجہ سے نذیر احمد ناکامیاب ہو گئے۔"

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مولانا صلاح الدین نے مقصد کو فن سے بالکل علیحدہ کر دیا جو فن کی کم تر سطح پر یا جب فن اور مقصد تحریر میں الگ الگ نظر آئیں فن کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے لیکن فن اپنی اعلیٰ ترین سطح پر زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے فن کے سلسلے میں اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا صلاح الدین سے ضمنی اختلاف کے ساتھ بیگم افضل کاظمی نے لکھا ہے:

"اُن کے یہاں مقصد فن سے تطبیق نہیں پا سکا۔ فن کار نذیر احمد مصلح نذیر احمد سے متصادم رہتا ہے۔"

فن اور مقصد کے تصادم کی وضاحت کے سلسلے میں انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کے ایک اہم گوشے سے نقاب سرکاتے ہوئے یہ بات بھی بتائی ہے:

"وہ فطری طور پر ظریف واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تعلیم اور تربیت ان کو ثقاہت اور دینداری کے ایسے راستے پر لے جاتی ہے جہاں زندہ دلی اور شگفتگی کو تقویٰ کے خلاف سمجھا جاتا ہے جس سے ان کا وار اوچھا پڑتا ہے۔"

مولانا صلاح الدین نے ڈپٹی نذیر احمد کی فنی کمزوری کو مقصد کا سہارا لینے سے تعبیر کیا۔ بیگم افضل کاظمی نے اسے فن اور مقصد کا تصادم قرار دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک اور جانب ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کو اُن کے تمام ہم عصروں سے زیادہ عوامی ادیب سمجھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ نذیر احمد کی

زبان اور لہجے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی ایک دینی کتاب "امہات الامۃ" میں اسی لہجے کی موجودگی نے لوگوں کو
برافروختہ کر دیا تھا۔ لیکن ان کے ناولوں میں یقیناً وہ کارآمد ثابت ہوا۔ دراصل اپنے ہم عصروں
میں وہ تنہا ناول نگار تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے جن عناصر کو عوامی کا نام دیا ہے وہ اُن کی ظرافت، کردار نگاری
کی صلاحیت اور ناولوں میں زبان و بیان کی روانی اور لطافت ہیں۔ لیکن انہیں عوامی کہنے سے بات نہیں بنتی۔ اس
سے نہ ان کا اسلوب سمجھ میں آتا ہے اور نہ ناولوں کے کرداروں کی ساخت اور انفرادیت۔ اور نہ اس لفظ سے ڈپٹی
نذیر احمد کی زبان دانی ہی کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ البتہ عوامی کا لفظ اس کی ضرور غمازی کرتا ہے کہ اپنے ہم عصروں
میں نذیر احمد کا خصوصی رجحان قصہ گوئی اور ناول نویسی کی جانب تھا۔ جس کی زبان، طرز نگارش اور لہجہ کو مضمون نگاری
اور خالص انشا پردازی کے مقابلے میں زیادہ عوامی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن "امہات الامۃ" میں یہی عوامی زبان
ڈپٹی نذیر احمد کے انداز نگارش کی بہت بڑی خامی بن گئی ہے۔ البتہ زبان کی یہ خامی اس بات کی بھی دلیل ہے کہ
ڈپٹی نذیر احمد ناول اور قصے کی زبان سے آشنا تھے، اور زبان سے آشنائی بہرحال فن سے نصف آشنائی کے
برابر ہے۔ بقیہ نصف کا حساب انہوں نے کلیم، ابن الوقت، مرزا ظاہر دار بیگ اور ہریالی جیسے کرداروں کی
تخلیق کر کے چکایا۔ پلاٹ سے ان کی ناواقفیت درست سہی لیکن یہ کردار ڈپٹی نذیر احمد کی زبردست تخلیقی
قوت کے گواہ ہیں اور گواہ رہیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کی زبان جس خوبی سے لکھتے ہیں اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کے ناولوں کی
کامیابی اور شہرت کا ایک راز یہ زبان بھی ہے۔ مراۃ العروس ان کا پہلا ناول ہے جو دو بہنوں اصغری اور اکبری کی
کہانی ہے۔ وہ اس ناول کو لکھتے جاتے تھے اور اپنی لڑکی کو پڑھاتے جاتے تھے۔ ناول لکھتے وقت ان کا مقصد فن کی
تخلیق نہیں تھا بلکہ وہ ایک تعلیمی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ اس کتاب کی بے پناہ شہرت نے ڈپٹی نذیر احمد کو ناول
کے فن پر زیادہ سوچنے سمجھنے کے مواقع نہیں دیئے۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کو مدنظر رکھیں
تو کہنا پڑے گا کہ انہیں اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ وہ عورتوں کی زبان سے گہری واقفیت رکھتے تھے، اور اپنی بات
ذہن نشیں کرانے کے لئے اسی حربے سے کام لیا کرتے تھے۔

دراصل ڈپٹی نذیر احمد ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جو فن کی کمزوریوں کے باوجود کامیاب اور بڑے ادیب
بن گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور ان کے دل میں کام کرنے کی سچی لگن تھی۔ جدید عہد کے
ادیب فن سے آشنا ہیں۔ لیکن انہیں ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے ساتھیوں سے یہ دونوں باتیں سیکھنی ہوں گی۔ اعلیٰ
مقصد بھی اور کام کی سچی لگن بھی — ساتھ ہی ساتھ وہ بردباری، حلم اور سلیقہ بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا جس
نے ڈپٹی نذیر احمد کو اہم علمی کتابوں اور توبۃ النصوح، ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا جیسے ناولوں کا مصنف
بنا دیا۔ جس کے سبب ہم یہ بات زندگی کے کسی موڑ پر فراموش نہیں کر سکتے کہ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے قوم کے بڑے
محسنوں میں سے ایک ہیں۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

آغا افتخار حسین

بادشاہ اور پاپائے روم

مانتسکیو کے فارسی خطوط

فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات

رضا اپنے ایک خط مورخہ "۴ ربیع الثانی" میں فرانس کے بادشاہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ فرضی خط ۱۷۱۲ء میں لکھا گیا جب شہنشاہ لوئی چہاردہم فرانس کا بادشاہ تھا۔ لوئی چہاردہم اپنی مطلق العنانی کی وجہ سے فرانس کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا یہ قول مشہور ہے :

"میں ریاست ہوں"

لوئی چہاردہم نے ۱۶۴۳ء سے ۱۷۱۵ء تک حکومت کی۔ مانتسکیو (پیدائش ۱۶۸۹ء - وفات ۱۷۵۵ء) نے خود لوئی چہاردہم کا عہد دیکھا۔ اس لئے اس نے جو کچھ "رضا" کے فرضی قلم سے لکھوایا ہے وہ خود اس کے مشاہدات پر مبنی ہے۔[1] رضا لکھتا ہے :

بادشاہ

"فرانس کا بادشاہ یورپ کا سب سے طاقتور فرمانروا ہے۔ اس کے پاس سونے کی کانیں تو نہیں جیسی کہ اس کے ہمسائے اسپین کے بادشاہ کے پاس ہیں۔ لیکن اس کے پاس اسپین کے بادشاہ سے زیادہ دولت ہے۔ اور یہ دولت اس کی رعایا کی خود پسندی ہے جس کا وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ "دولت" ایسی ہے جو کم ہونے میں نہیں آتی۔ اور اس لئے سونے کی کانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس نے بہت سی

---

[1] یہ خطوط لوئی چہاردہم کی وفات کے بعد ۱۷۲۱ء میں شائع ہوئے۔

جنگیں لڑیں یا اُن کا منصوبہ بنایا، لیکن ان کے اخراجات کے لئے اس نے صرف وہ "دولت" استعمال کی جو لوگوں کو خطابات "فروخت" کرنے سے حاصل ہوئی تھی، انسانی نخوت کے اس غیر معمولی[1] خزانے سے اس کے سپاہیوں کو تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے شہروں میں قلعے تعمیر ہوتے ہیں، اور اس کے بحری بیڑے کو سامانِ حرب سے لیس کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بادشاہ ایک بہت بڑا جادوگر ہے۔ اس کی حکومت رعایا کے ذہنوں پر بھی مسلط ہے۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق سوچتے ہیں۔ اگر اُس کے خزانے میں دس لاکھ ایسو[2] ہیں، اور اسے بیس لاکھ کی ضرورت ہے تو وہ اپنی رعایا کو سمجھا دیتا ہے کہ ایک ایسو کی قیمت دو ایسو کے برابر ہے اور لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ اگر اس نے کسی بڑی جنگ کا منصوبہ بنایا ہے اور اس کے پاس اس کے اخراجات کے لئے رقم نہیں تو وہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا سکۂ رائج الوقت ہے۔

لوگوں کے ذہنوں پر بادشاہ کا جادو یہاں تک موثر ہے کہ اس نے باور کرا دیا ہے کہ اگر وہ کسی مریض کو چھو دے تو اسے صحت ہو جاتی ہے۔"

اسی خط میں رضا نے پاپائے روم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ قرونِ وسطیٰ اور اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی سیاست میں پاپائے روم کا اثر بہت زیادہ تھا۔ یورپ کے فرمانروا اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اور اگر کوئی بادشاہ اس قسم کی جسارت کرتا تھا تو اسے اپنے ملک میں شدید اختلاف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ پاپائے روم کے بارے میں رضا اپنے خط میں لکھتا ہے:

پاپائے روم

"میں نے اس بادشاہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ایک جادوگر اور بھی ہے جو بادشاہ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جو بادشاہ کے ذہن پر اسی طرح حکومت کرتا ہے جس طرح بادشاہ رعایا کے ذہنوں پر حکومت کرتا ہے .... اس بادشاہ کو "پوپ" کہتے ہیں .... بعض وقت وہ بادشاہ کو یہ سبق دیتا ہے کہ تین ایک کے

---

[1] متن "Prodige de l'orgueil humain"
[2] فرانسیسی سکۂ رائج الوقت écu

برابر ہوتے ہیں[1] جو روٹی بادشاہ کھاتا ہے، وہ دراصل روٹی نہیں ہے۔ جو شراب وہ پیتا ہے وہ شراب نہیں ہے۔ وغیرہ۔ اور اس اندیشے سے کہ کہیں بادشاہ کے عقائد متزلزل نہ ہو جائیں، اور کہیں بادشاہ کو خود غور فکر کرنے کی عادت نہ ہو جائے پوپ کبھی کبھی بادشاہ کو عقائد سے متعلق سوالات اور مشقیں حل کرنے کے لئے دیتا ہے۔ دو سال ہوئے اس نے بادشاہ کو ایک عظیم الشان تحریر ارسال کی تھی جس کا نام "دستور" تھا۔ پوپ نے کوشش کی تھی کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا ہے اسے بادشاہ اور اس کی رعایا بلا اختلاف فوراً قبول کرے، ورنہ اس کے نتائج برے ہوں گے۔ بادشاہ کی حد تک تو اسے کامیابی ہوگئی، کیونکہ بادشاہ نے اس کی فوراً تعمیل کرکے رعایا کے لئے مثال قائم کی۔ لیکن رعایا میں سے بعض لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور انہوں نے کہا کہ وہ اس دستاویز کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ مخالفت کرنے والی عورتیں تھیں، کیونکہ اس دستاویز میں عورتوں کو اس کتاب کے پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جس کی عیسائیوں کے لئے وہی حیثیت ہے جو ہمارے لئے قرآن کریم کی۔"

ایک اور خط مورخہ ۲۰ محرم میں ازبک بادشاہ (لوئی چہاردہم) کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فرانس کا بادشاہ اجتماع ضدین ہے۔ مثلاً

"ایک اٹھارہ سال کا لڑکا اس کا وزیر ہے[2] اور ایک اسی سال کی بڑھیا اس کی منظور نظر[3] ... وہ شہروں کے شور و غل سے دور بھاگتا ہے۔ لیکن صبح سے شام تک اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کریں، بعض اوقات وہ اپنے ذاتی ملازم کو جو اس کی میز پہ دسترخوان بچھاتا ہے، اس سپہ سالار کے مقابلے میں زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو لڑائیاں جیتتا ہے اور شہر فتح کرتا ہے۔"

○

---

[1] یہ مسیحی تثلیث کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے۔ "فارسی خطوط" کے دوسرے ایڈیشن میں مانتیسکیو نے یہ جملہ حذف کر دیا ہے۔

[2] شہنشاہ لوئی چہاردہم کے ایک وزیر مارکوئس دوبار بیزو (Barbieux) کی عمر اٹھارہ سال کی نہیں بلکہ ۲۳ سال کی تھی۔

[3] لوئی کی محبوبہ مادام دومینتوں (Madam de Maintenon) اڑتالیس سال کی تھی۔

فضا ابن فیضی

خاک بر سر رہے یا جہر کلاہوں میں رہے
ہم ترے ہو کے زمانے کی نگاہوں میں رہے

قید ہو جیسے کوئی پھول کی زنجیروں میں
ہم کچھ اس طرح ترے پیار کی باہوں میں رہے

اے نسیم غم جاناں کے مہکتے جھونکو!
نفسِ گل کی طرح تم مری آہوں میں رہے

ہے ہر اک رنگ میں قائل یہ جنوں کا خم و پیچ
تیری زلفوں میں رہے یا مری راہوں میں رہے

تلخیٔ رحمت کو نہیں گوارا کر لیں
اتنی لذت تو بہرحال گناہوں میں رہے

اس طرح جینا تو پندار کی رسوائی ہے
کون شیشے کی طرح سنگ پناہوں میں رہے

عشق وہ آگ بھڑک اٹھے تو دنیا جل جائے
حسن وہ شعلہ جو دامن کی پناہوں میں رہے

درد والوں کا اثاثہ ہے بس اک خرقۂ فقر
ہم اسی شانِ فقیرانہ سے شاہوں میں رہے

ساتھ چھوڑا نہ کہیں عشق کی رسوائی نے
ہم جہاں بھی رہے دنیا کی نگاہوں میں رہے

مرتضیٰ برلاس

جنوں کا ذکر سرِ عام ہو گیا تو کیا
میں تیرے شہر میں بدنام ہو گیا تو کیا

ہماری تشنہ لبی آج تک نہ بجھ پائی
کوئی چھلکتا ہوا جام ہو گیا تو کیا

جہاں نے کس کو سزا وارِ آگہی جانا
جو میں بھی موردِ الزام ہو گیا تو کیا

کوئی صلیب پہ لٹکا، کسی نے زہر پیا
مرا بھی گر وہی انجام ہو گیا تو کیا

کوئی اصول مرا مطمحِ نظر تو رہا
شہیدِ حسرتِ ناکام ہو گیا تو کیا

ہزار شمعیں جلا کر ضیا بکھیر گیا
خموش میں جو سرِ شام ہو گیا تو کیا

حریفِ گردشِ ایام تو رہا برسوں
میں آج کشتۂ آلام ہو گیا تو کیا

نریش کمار شاد

آنکھوں کی روشنی ہوں دلوں کا غبار ہوں
آئینۂ نشاط و غمِ روزگار ہوں

گرنے لگوں اگر تو ہوں اک اشکِ بے کسی
اڑنے لگوں تو نکہتِ گیسوئے یار ہوں

دنیائے ہست و بود کی یخ بستہ رات میں
اک لازوال سلسلۂ نور و نار ہوں

میرے ہی دم قدم سے ہیں صحرا چمن چمن
میں موسمِ خزاں میں بھی فصلِ بہار ہوں

مجھ کو غمِ حیات سے اپنی خبر ملی
میں کیوں غمِ حیات کا شکوہ گزار ہوں

خود داریٔ نظر بھی ہے ذوقِ نظر کے ساتھ
اے کاش تجھ سے چھپ کے تجھے دیکھتا رہوں

پالا ہے جس کو دردِ دلِ کائنات نے
میں وہ تبسمِ رخِ لیل و نہار ہوں

شاعر ہوں اپنی ذات کے چھوٹے سے قصر میں
غمہائے کائنات کا آئینہ دار ہوں

مظفر حنفی

ہم کسی گنتی، کسی فہرست میں شامل نہیں
صاف گوئی آج کے آئین میں داخل نہیں

کیا کریں دھبے انہیں کی آستیں پر مل گئے
جن کی پیشانی پہ لکھا تھا کہ "ہم قاتل نہیں"

ہر سفینے پر کسی کا نام ہے۔ کیا کیجئے
شومئ قسمت سے ہم پروردۂ ساحل نہیں

رہنمائی وصفِ کامل ہے مگر سب ہم سفر
محترم کے باب میں کہتے ہیں اس قابل نہیں

لوگ تو منہ سے نکلتے ہی اُچک لیتے ہیں بات
آپ کی محفل بھی اب تو آپ کی محفل نہیں

راز کھل جائے گا زخموں پہ نمک پاشی کے بعد
اس کے ہنسنے سے تو لگتا ہے کہ یہ بسمل نہیں

تلخ باتوں سے مری نیت پہ شک مت کیجئے
آپ کو مسند مبارک، یہ مری منزل نہیں

اے مظفر، ناقدینِ عہد ناخوش ہیں تو کیا
آزما لیں گے، مرے اشعار بھی بزدل نہیں

جوہر میر

کاسۂ درد نہ جیب کوئی کسی غم سے بھرے
کیوں مرا دوست مرے زخم کو مرہم سے بھرے

تیرے ہوتے ہوئے خالی رہی دنیا تجھ سے
اب خلا تیرا، زمانہ ترے ماتم سے بھرے

کوئی کس کس کو سناتا رہے رودادِ فرات
دل کسی کا نہ اگر قصۂ زم زم سے بھرے

ہم نے خود ہی تو بنایا تھا صبا کو منصف
کون اب دل کا زیاں روٹھتے موسم سے بھرے

آج بھی زندہ ہے سقراط کی پیاسی جرأت
کوئی ساقی تو ہے جام کوئی سم سے بھرے

جل گئی دیدۂ بے خواب میں تصویرِ بہار
سنگ میں ترشے ہوئے پھول نہ شبنم سے بھرے

ایک انساں پہ ہوئی تنگ خدا کی جنت
دل کے فردوس رہے عظمتِ آدم سے بھرے

بے مداوا ہے پشیمانیٔ دردِ امید
زخم ایسا نہ ملا جو کسی مرہم سے بھرے

یہی بہتر ہے کہ محرومِ مسرت رہ جائے
میرؔ وہ دل جو کسی دوست کے ماتم سے بھرے

عبداللہ خاور

کس کو پروا ہے مری، آہ کسے پروا ہے؟!
التفاتِ گذراں خواب ہے یا دھوکا ہے

دھندلی ہوتی نظر آتی ہیں حسیں تصویریں
میری آنکھوں نے کہیں خوابِ وفا دیکھا ہے

تجھ کو بھولے ہیں تو ہر داغِ تمنا تیرا
کیوں شبِ تاب کی مانند اُبھر آیا ہے

کاش یاد آئے تبسم کی کوئی شوخ کرن
اس قدر سخت اندھیرا ہے کہ دم گھٹتا ہے

نم ہوائیں مری آنکھوں میں سمٹ آئی ہیں
ابر جو آج اٹھا تھا وہ کہیں برسا ہے

رفتہ رفتہ ہوئے جاتے ہیں ستارے بے نور
دھیرے دھیرے کوئی احساس کہیں جلتا ہے

ڈھونڈتے ہے کوئی اخلاص کے روشن پہلو
اور بھرے شہر میں ہر موڑ پہ سناٹا ہے

حادثے اور بھی گذرے ہیں جہاں میں خاور
اس طرح خود کو مٹاتے ہو کہ دل دکھتا ہے

مسرور زبیری

خون سے رنگیں کانٹا کانٹا، کھل اٹھے ویرانے بھی
پھول کھلا سکتے ہیں دیکھو ہم جیسے دیوانے بھی

کیسا ہے دستور بھلا ساقی تیرے میخانے کا
بادہ کشی بھی عام نہیں ہے رقص میں ہیں پیمانے بھی

اپنی وحشت کو دیوانے اپنے تک محدود نہ کر
درسِ جنوں لینے کو تجھ سے آئیں گے فرزانے بھی

کیا غمِ جاناں کیا غمِ دوراں دونوں سے بے بہرہ ہیں
اپنے کہہ کر دہراتے ہیں غیروں کے افسانے بھی

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی چہروں پہ آثارِ جنوں
دیکھ کے اس حالت میں کہئے آپ ہمیں پہچانے بھی

آؤ چلیں مسرورؔ کہ شاید وقتِ وداعِ بہاراں ہے
جمع ہوئے ہیں صحنِ چمن میں اپنے بھی بیگانے بھی

شمس الرحمٰن فاروقی

اُن کا خیال ہر طرف، اُن کا جمال ہر طرف
حیرتِ جلوہ رو بہ رو، دستِ سوال ہر طرف

مجھ سے شکستہ پا سے ہے شہر کی تیرے آبرو
چھوڑ گئے مرے قدم نقشِ کمال ہر طرف

ہم ہیں جواں بھی پیر بھی، ہم ہیں عدم بھی زیست بھی
ہم ہیں اسیرِ حلقۂ قولِ محال ہر طرف

نغمہ گرا ہے بوند بوند، پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج!
اڑتی پھرے ہے ذہن میں گردِ خیال ہر طرف

قلبِ حیات و موت سے مل نہ سکا کوئی جواب
پھینکا کئے ہیں گرچہ ہم سنگِ سوال ہر طرف

محمد نسیم قریشی

چاند نکلا تو ترے غم کا مقدر جاگا
دل ترے درد کے صحرا میں ہے شب بھر جاگا

تو کہ ہوگا بھی مرے غم کا مداوا کہ نہیں
میں اسی غم میں سلگتا ہوا اکثر جاگا

کتنے موتی ہیں جو پلکوں پہ ڈھلک آئے ہیں
آج پھر آنکھ کا خوابیدہ سمندر جاگا

عقل جب پختہ ہوئی سوچ نے پہلو بدلا
راہ جب جاگ اٹھی راہ کا پتھر جاگا

ایک آہٹ سے مری آنکھ نہ لگنے پائی
رات بھر کون مرے سینے کے اندر جاگا

دونوں ہی جلتے رہے شب کی جہنم میں نسیم
شمع کے ساتھ پتنگا بھی برابر جاگا

رشیدہ رضویہ

فاختہ

"یہ سب کچھ کس قدر اجنبی اجنبی سا لگتا تھا۔ گو جولائی کا مہینہ تھا۔ لیکن بڑی اجنبیت اور بیگانگی لیے تھا۔ اس ماحول، اس فضا کی کوئی بھی شے زندگی کے تجربے میں شامل نہ تھی۔ نگاہوں کے عین سامنے پیپل کا گھنا درخت تھا۔ جس کے سائے میں چڑیاں اور کوے دوپہر کے گرم و خوابیدہ لمحات میں آرام کرتے اور برآمدوں میں بیٹھے لوگوں کی پلیٹوں سے پکوڑے اور سموسے چرا کر چونچوں میں دبائے یہاں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ بلیاں بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھی چڑیوں اور گلہریوں کو دبوچنے کی فکر کرتی تھیں۔ پیپل پہ چھوٹے چھوٹے، گول گول پھل لگے تھے، جن کا نام نہ معلوم کیا تھا۔ جب ہوا چلتی، تو یہ پھل ٹپ ٹپ گھاس پہ گرتے تھے۔

چمپا کی خوشبو ہر طرف اُڑتی تھی اور جوہی کی بیل دیوار پہ دور دور تک پھیلی تھی۔ دیوار کے اندر سوئمنگ پول تھا۔ جس کے کنارے درختوں پہ رنگ برنگے قمقمے جلتے تھے، اور عشق و حسن کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ اور گرم و خلص سی فضا میں خالص ایشیائی چاند چمکتا تھا۔ یہ ایشیائی اور مغربی چاندنی بھی ایک ہی تھی! مغرب تو چاند میں ایٹم کے دھماکے کرنے کی فکر میں تھا۔ اور ایشیا چاند پہ غزلیں اور نظمیں کہتا تھا۔ الپ ارسلان بھی چاند پہ طبع آزمائی کرتا تھا اور چاند کی دنیا میں رہتا تھا۔ وہ یقیناً چاند میں افیم کی گولی ڈال کر کھاتا تھا۔ عائلہ کا یہی خیال تھا۔

نگاہیں اُٹھا کر عائلہ نے چاند کی طرف دیکھا۔ چاند ابھی آسمان کے نچلے کناروں پہ تھا، اور سڑک کے دوسری جانب ناریل کے جو اونچے اونچے پیڑ تھے، اُن کے درمیان شرارت سے جھانکتا نظر آرہا تھا۔

"ہائے اللہ چاند اس قدر جلد نکل آیا" ایک خاتون نے عائلہ کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ خاتون کا دراصل خیال تھا کہ عائلہ کسی لڑکے کو دیکھ رہی ہے۔ یا اشاروں اشاروں میں باتیں کر رہی ہے۔ حالانکہ عائلہ کبھی کسی لڑکے سے بات نہ کرتی تھی۔ سیاہ دوپٹہ اوڑھے کتابیں پڑھتی چلی جاتی تھی۔ اور لوگ اسے مقدس مریم کے نام سے پکارتے تھے ـــ

"چاند نکل آیا" کچھ اور آوازیں اُبھریں، اور نگاہیں چاند کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن چاند کہاں نکلا تھا۔ وہ تو ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے سامنے جو بجلی کا طویل القامت کھمبا تھا۔ اُس پہ ایک موٹا سا بلب جل رہا تھا اور ناریل کے

لمبے لمبے پتّوں میں چھپا چاند کا تاثر دیتا تھا۔

"بھلا یہ اس قدر رومانی بننے کا کون موقع ہے۔ بھری محفل میں چاند کا ذکر یوں ندیدے پن سے ہو رہا ہے گویا چاند نہ ہوا گائے کے قیمہ کا ہمبرگر ہو گیا۔ چاند تو تنہائی کا ساتھی ہے۔ غم کا مداوا ہے۔" بڑی کوفت سے عائلہ نے اپنے ارد گرد کی مخلوق کو دیکھا۔ یہ مخلوق کئی حصوں میں تقسیم تھی۔ اس میں ایک گروہ خالص بیگماتی تھا، جو اسکینڈل سازی کا کارخانہ ہر لمحہ کھولے بیٹھا تھا۔ لڑکیوں پہ نکتہ چینی کرتا تھا۔ یہ تمام بیگمات ایک سی تھیں۔ بغیر آستینوں کے اونچے بلاؤز پہنتی تھیں۔ میٹروپول کے ہیئر ڈریسر سے بال بنواتی تھیں۔ زیادہ تر انگریزی میں گفتگو کرتی تھیں۔ اور رمبولا کھیلتی تھیں۔ اور اپنے برج کھیلنے یا بار میں مدہوش ہونے والے شوہروں کا انتظار کرتی تھیں۔ دوسرا گروہ لڑکیوں کا تھا، جو سب سے الگ بیٹھ کر ہلکے پھلکے رومانی وجنسی فرانسیسی ناولوں کے انگریزی ترجمے پڑھتی تھیں۔ اپنے دوستوں کے قصے بیان کرتی تھیں۔ اور ذہن میں کسی نئے مغربی رقص کی مشق کرتی تھیں۔ تیسرا گروہ معزز مَردوں کا تھا جو عموماً برج کھیلتا اور الکحل کا استعمال کرتا نظر آجاتا تھا۔ بعض اوقات یہ لوگ اس قدر چڑھا جاتے کہ باہر نکلنا محال ہو جاتا۔ لڑکھڑاتے، گالیاں بکتے اور بیگمات کو گھورتے، یہ خوش پوش معزز حضرات باہر نکلتے، تو ان میں اور سڑک کے جانوروں میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ چوتھا گروہ بیروں اور خانساموں کا تھا، جو کلب میں آنے والے ہر شخص کی ہر حرکت وجنبش پہ نگاہ رکھتے تھے۔ صاحب بہادران کی بچی ہوئی شراب پی کر بلیوں سے لڑتے تھے۔ ہاں ایک گروہ بلیوں کا بھی تھا۔ بارہ یا پندرہ کی تعداد پہ مشتمل یہ بلیاں ہر کس وناکس کے قدموں میں لوٹتی تھیں' اور عائلہ کے لئے یہ سب کچھ نا قابلِ برداشت تھا۔ عائلہ نے بلیوں، بیگمات، صاحبوں اور بیروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا، اور خود ان سب سے الگ گویا کسی درخت کی اونچی سی چوٹی پہ بیٹھی ان کا جائزہ لیتی تھی، جیسے بیت اللحم کے بڑے کنیسہ میں مقدس مریم ستاروں کا تاج پہنے اونچائی پہ کھڑی اپنے قدموں میں آنے والی مخلوق کو دیکھتی ہو۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ عائلہ میں اور ان لوگوں میں کسی قسم کی کوئی مطابقت نہ تھی۔ یہ ایک الگ محاذ کے تھے اور عائلہ الگ محاذ سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن عائلہ اپنے محاذ پہ تنہا تھی، اور یہ لوگ لاتعداد تھے۔ جن کے درمیان وہ بہت سنجیدہ، بردبار اور مغرور سمجھی جاتی تھی۔ جو فاختہ کی مانند گردن اٹھائے چلتی تھی۔ اور کسی کی جانب متوجہ نہ ہوتی تھی۔ اور جب کبھی سیاہ آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ انجیل کے پرانے اوراق سے مقدس مریم نکل آئی ہے۔ وہ عموماً سیاہ دوپٹہ بی بی مریم کی چادر کی مانند اوڑھے رہتی تھی — سیاہ دوپٹے میں اس کے بالوں کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس وضع کے بنائے ہیں۔ ہاں ایک آوارہ سی لٹ اکثر پیشانی پہ جھولتی رہتی۔ جسے ہٹانے کی کبھی اُس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ کبھی دوپٹہ سر سے ڈھلتا تو سیاہ بالوں کے درمیان بغداد کی شارع الرشید کی مانند سیدھی اور طویل مانگ نظر آتی۔ جس پہ چلنے کے لئے بہت سے دل مچل اُٹھتے۔

کچھ خواتین جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران لندن میں تھیں، اسے "پولش بیوہ" کے نام سے بھی پکارتی تھیں۔ جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ سے جو خواتین پناہ کی خاطر لندن میں وارد ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح سیاہ دوپٹہ اوڑھے رہتی تھیں۔ اور اسی طرح اُن کے صاف ستھرے چہرے مغموم وخاموش لیکن پُرسکون نظر آتے تھے۔

"یہاں کس قدر سکون اور اطمینان ہے۔" دفعتاً عائلہ نے ماحول کو محسوس کیا۔ اور چاروں طرف دیکھا جب پاکستان و ہندوستان کی جنگ جاری تھی، تب بھی یہاں سکون و اطمینان کی ایسی ہی فراوانی تھی، تب بھی زندگی یہاں اسی قدر مسرور و بشاش تھی۔ تب بھی بالوں میں جوہی کی کلیاں سنواری جاتی تھیں۔ اور شمپین و وسکی کے گلاسوں میں صنم نظر آتے تھے۔

اب بھی وہی عالم تھا۔ اب بھی! عائلہ کا جی چاہتا تھا کہ میز پہ سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے لیکن اُس کے رونے سے لوگ یہی سمجھتے کہ کسی نے اُسے دھوکا دیا ہے اور وہ عشق میں ناکام ہوگئی ہے۔

"دھوکا اور ناکامیٔ عشق تو قدم قدم پہ ساتھ ہیں۔" عائلہ کو جانے کیوں الپ ارسلان کا خیال آگیا۔

"الپ ارسلان یقیناً محمود غزنوی کا وہ گھوڑا تھا، جس پہ بیٹھ کر وہ ہندوستان کا رُخ کرتا تھا۔ عائلہ اکثر یہی سوچتی تھی۔ وہ تاریخ ہند کے معاملے میں بالکل کوری تھی۔ لیکن کراچی کا یہ الپ ارسلان درحقیقت ایک شاعر تھا، جو خوابوں کی دنیا میں رہتا تھا۔ اور خود کو ہالی ووڈ کی فلموں کا ہیرو تصور کرتا تھا۔ حالانکہ اُس کی صورت ہیروؤں کی مانند قطعی نہ تھی۔ اور وہ شاعر کے بجائے قصائی معلوم دیتا تھا۔ عائلہ کے لئے یہ شخص بھی مخالف محاذ سے تعلق رکھتا تھا۔ الپ ارسلان کے محاذ پہ بھی بے شمار لوگ تھے۔ مثلاً وہ سنہری بیلکوں والا شاعر، جو اسی کلب کے بار میں اکثر نظر آتا تھا اور جس کے ہاتھ یوں لٹکے رہتے گویا پولیو کا مریض ہو۔ اس شاعر کا نام جلال الدین اکبر تھا۔

"جلال الدین اکبر خاندانِ غلاماں کا پہلا بادشاہ تھا، اور شالامار باغ لاہور میں مدفون تھا۔" عائلہ کہا کرتی، اور جلال الدین اکبر اور الپ ارسلان دونوں کا ہی غصہ ایک سو اسی ڈگری پہ پہونچ جاتا۔ خون کا دباؤ اس قدر بڑھ جاتا، کہ دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگتیں۔ لیکن عائلہ اُن پہ طنز نہ کرتی تھی۔ وہ تاریخ ہند کے معاملے میں واقعی بالکل کوری تھی۔

جلال الدین اکبر کی ایک بدصورت، بد وضع بیوی بھی تھی، جو کراچی کے کسی کابک نما گھر میں بچے پال رہی تھی۔ الپ ارسلان کی بھی ایک انتہائی بے ہنگم بیوی تھی جو لاہور کے کسی باورچی خانے میں چھ سات بچے پال رہی تھی اور الپ ارسلان کراچی میں دوسری شادی کی فکر میں تھا۔ ساتھ ساتھ ایک سفید پوش شادی شدہ عورت کے عشق میں بھی مبتلا تھا۔ یہ عورت گھنٹوں الپ ارسلان کے دفتر میں بیٹھی اُس کے ہونٹوں کو گھورتی رہتی۔ الپ ارسلان کے ہونٹ موٹے موٹے اور لٹکے ہوئے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر جانے کیوں نیلے رنگ کے پیلے پیلائے گرگٹ کا خیال آجاتا۔ گرگٹوں سے عائلہ کو سخت گھن آتی تھی۔

الپ ارسلان اور جلال الدین اکبر کے گروہ میں ایک عورت اور بھی تھی۔ زبردست نشیلی۔ لیکن عائلہ سے اسے خواہ مخواہ کی دشمنی تھی۔ وہ عائلہ کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی، اور کہتی تھی، "اے لوگو۔ یہ عائلہ نگوڑی کیا کوئی فلم ایکٹریس تھی کہ ہر شخص بوکھلا بوکھلا کر اس کا ذکر کرتا تھا۔" عائلہ کو یہ عورت جس کا نام رومانہ، شبانہ یا خم خانہ تھا، بالکل جادو کی کہانیوں کی کٹنی محسوس ہوتی تھی، جو جس طور چاہتی کہانیوں کی خوب صورت اور نیک ہیروئن کو شہر بھر میں بدنام کر دیتی۔ رومانہ، شبانہ، خم خانہ بھی عائلہ کو بدنام کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ جب بہت

کوشش کے باوجود عائلہ کے خلاف کوئی اسکنڈل نہ ملا، تو اُس نے جلال الدین اکبر کی چڑیلوں جیسی بیوی کے ساتھ خود ہی اسکنڈل سازی کا بیڑہ اٹھایا، اور ہر ایک سے کہنے لگی:

"اے بیوی، وہ عائلہ معتصم ہے نا۔ وہ تو بغداد کی جادوگرنی الف لیلیٰ کی کٹنی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اُس کی تمام شادی شدہ مردوں سے دوستی ہے۔ جلال الدین اکبر فون پہ اُس سے وقت لے کر الپ ارسلان کے دفتر میں ملاقاتیں کرتا ہے۔ الپ ارسلان کے گھر وہ راتیں گزارتی ہے۔ سارا دن الپ ارسلان کے دفتر میں بیٹھی رہتی ہے۔ الپ ارسلان کا دفتر تو اچھا خاصا قحبہ خانہ ہے۔

"ہاں بہن، وہ تو میرے میاں کو چھیننا چاہتی ہے۔ تم اپنے میاں کا ذرا خیال رکھنا۔ کہیں وہ بھی عائلہ کے عشق میں مبتلا نہ ہو جائے" جلال الدین اکبر کی بیوی کہتی۔

ایک روز یہ تمام باتیں رومانہ شبانہ خم خانہ نے عائلہ سے بھی کہہ دیں۔ عائلہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بڑی دیر بعد عائلہ کو پتہ چلا، وہ کہہ رہی تھی:

"خبردار جو میرے میاں سے کبھی بات کی۔ خبردار جو کبھی کسی شاعر یا ادیب یا اخبار نویس سے بات کی، اور خود کو یہاں کے انٹلیکچوئلز کے گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی"۔

"یا تو میں پاگل ہو گئی ہوں۔ یا پھر ٹھگوں کی یہ امان رومانہ شبانہ خم خانہ پاگل ہو گئی ہے۔ غضب اللہ کا! اسرائیل فقیر ہونے والا ان تو عربوں تک کو ایک آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ لیکن یہ عورت مجھے ایک آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتی"۔ —— عائلہ کو اس قدر غصہ آیا کہ اُس نے مرچوں کی چٹنی کھالی۔ اور پھر شکر پھانک پھانک کر سُوں سُوں کرتی رونے لگی۔

"اس شہر نے مجھے محض رونا دیا ہے"۔

عائلہ نے شہر کے اُس کلب میں شب کے پھیلتے سائے دیکھے۔ اب کھیل شروع ہو چکا تھا، اور مخالف محاذ کی تمام مخلوق اپنے اپنے کارڈ پہ جھکی کیتولا کھیل رہی تھی۔

"یہ کھیل رہے ہیں، یا زندگی کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں" عائلہ نے بڑے شک سے تمام ہجوم کی جانب دیکھا۔ اور پھر میز پہ دھری کتاب پہ پنسل سے لکھنے لگی۔

"الپ ارسلان —— محمود غزنوی کا وہ خچر —— جس پہ اُس نے گھڑ سواری سیکھی اور ہندوستان کا رُخ کیا۔ عمر ۴۴ سال۔ لیکن بتاتا ہے ۳۸ سال! آئینہ نہیں دیکھتا۔ کیونکہ آئینہ صورت کا مذاق اڑاتا ہے۔ ہر وقت پان چباتا ہے۔ سامنے کے چار دانتوں کو کیڑا لگا ہے۔ شاعری کرتا ہے اور ہر تیسرے ماہ ایک نئے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ انتہائی گھٹیا گفتگو کرتا ہے۔ گالیاں بکتا ہے۔ ہر عورت کو محبوبہ تصور کرتا ہے۔ اس کے تمام ردِ عمل تیسرے درجے کے ہیں۔ اس کے باوجود اپنا نفسیاتی تجزیہ نہیں کراتا"۔

"ارے۔ تم یہ لائبریری کی کتاب پہ کیا لکھ رہی ہو۔ الپ ارسلان —— محمود غزنوی کا خچر!" ایک خاتون نے کتاب اُٹھالی۔

"الپ ارسلان تو محمود غزنوی کا باپ تھا۔ پھر کہاں تھا؟"

"محمود غزنوی کا باپ سبکتگین اور اُس کا باپ الپتگین تھا" دوسری خاتون نے تصحیح کی۔

"پھر الپ ارسلان کون تھا؟" خواتین میں بحث شروع ہوگئی۔

اور عائلہ اس تمام گفتگو سے لاتعلق ہوگئی۔ اُسے الپ ارسلان سے مطلب؟ الپ ارسلان کون تھا؟ اُسے تو فرقان کی فکر کرنا چاہیے تھی۔ وہ کچھ اُداس سی ہوگئی۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ گھروں کی راہ لے رہے تھے۔ اور کچھ وہیں بیٹھے موسیقی سُن رہے تھے۔ مغربی موسیقی عائلہ کے کبھی پلّے نہ پڑی تھی۔ اُس کے کان تو کُردی، آشوری اور عربی موسیقی سے آشنا تھے۔ اور یہاں یہ سب کچھ کس قدر اجنبی اور تکلیف دہ تھا۔ آنکھیں بند کر کے اُس نے درد کی شدّت کو محسوس کرنا چاہا۔ شب دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے لان کے تمام رنگین قمقمے بجھ چکے تھے۔ اور بہت کم لوگ تاریکی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

دو لڑکے ٹرانسسٹر بجا رہے تھے۔ وہ فخر بجا ریڈیو کویت سُن رہے تھے۔ ریڈیو کویت کیا کہتا تھا، اُن کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ محض نقلیں اتار کر خوش ہو رہے تھے۔ لیکن ریڈیو کویت خبریں سُنا رہا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ ختم ہو چکی تھی، اور دوسری جنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔ وہاں گھر تباہ ہو چکے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ دمشق اور بیت المقدس کے گلی کوچوں میں خون پھیلا تھا۔

اور یہاں —— یہاں کراچی میں زندگی کس قدر مطمئن اور پُرسکون تھی۔ عائلہ کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ اور اُس نے مُرغ کی پلیٹ اپنے آگے سے ہٹا دی۔

جو لوگ اس کے اردگرد بیٹھے تھے ہنس ہنس کر اُونچی آواز میں اپنے اُن پسندیدہ فلمی اداکاروں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ جنہوں نے اسرائیل کی امداد کے لئے برطانوی اخبارات میں اعلانات کئے تھے۔

"لوگ وہاں بھوک مر رہے ہیں۔ صحرائے سینا میں اُن کے حلق میں کانٹے پڑتے ہوں گے۔ حاروں میں بچے تپتی ریت پہ روٹی اور پانی کے لئے چِلّاتے ہوں گے۔ اور یہاں میرے آگے مُرغ کی پلیٹ ہے۔ اور میں یہ ٹھنڈا مشروب کوکا کولا پی رہی ہوں —— میں قاتل ہوں —— خونی ہوں —— گو میں شریکِ جنگ نہ تھی۔ میں نے کسی کو نیپام بم کا نشانہ نہیں بنایا۔ کسی کا خون نہیں بہایا۔ انسانیت کو آگ کی نذر نہیں کیا۔ اس کے باوجود میں خونی ہوں۔ قاتل ہوں۔ میں اپنا بھی خون پی رہی ہوں۔ جب میں نے عرب پہ اسرائیلی حملہ کی خبر سُنی تھی، تو یوں محسوس ہوا تھا۔ کسی نے چاقو کی نوک سے کلیجہ باہر نکال دیا ہے۔ اس کلیجہ سے ٹپکتا خون میں خود پی رہی ہوں۔ یہ کوکا کولا کسی یہودی کا ہی تو مشروب ہے۔"

عائلہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اُس کے ذہن میں یتیم بچوں، بیوہ عورتوں اور مفلوج بوڑھوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس گونج میں فرقان کی چیخ نمایاں تھی۔ فرقان نہ تو یتیم تھا، نہ مفلوج بوڑھا۔ وہ تو عائلہ کا قلب تھا۔

"فرقان —— اوہ فرقان —— تم اس وقت کہاں ہو ——؟ بغداد، دمشق، قاہرہ یا عمان میں ۔
تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو؟

وہ جو ایک طویل اور سانپ کی طرح لہراتا خوب صورت دریا ہے نا۔ جسے دجلہ کہتے ہیں، جو شہر کو عین درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، اور اپنے خوب صورت پلوں سے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ تو دجلہ کے ایک پل جسر الجنیہ سے شہر کی طویل ترین شاہراہ الرشید کا آغاز ہوتا ہے۔ اور جسر الحریۃ پہ اس شاہراہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اور پھر باب شرقی یا باب شرجی شروع ہوتا ہے —— باب شرجی سے آگے جندی المجہول ہیں نامعلوم سپاہی کی یادگار ہے۔ اور یہیں سے کرادۃ الشرقیہ شروع ہوتا ہے۔ یہیں آگے کو جاکر دجلہ کا پاٹ بہت تنگ ہو کر ایک ندی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دجلہ کے اس تنگ پاٹ پہ ایک مشہور سوئمینگ پول ہے۔ سوئمنگ پول کے لئے اردو میں یقیناً کوئی مترادف لفظ ہوگا۔ بہر حال عربی میں اسے مسبح کہتے ہیں۔ یہاں ایک نائٹ کلب بھی ہے جس کا نام مسبح کی مناسبت سے المسبح رکھا گیا ہے۔ تو ایک دوپہر اسی المسبح میں عائلہ اور اس کا منگیتر فرقان کوکا کولا کی بوتلیں اور دولما کی پلیٹیں سامنے رکھے باتیں کر رہے تھے۔ اگر کوئی رومان پسند چڑیا ان کی باتیں سنتا تو یقیناً دونوں کی صحیح الدماغی پہ شک کرتا۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ جب کہ نہ صرف در و دیوار، زمین و آسمان سے آگ نکلتی ہے۔ بلکہ انسانی ہاتھ پیر بھی اچھے خاصے پرنیشر ککر معلوم دیتے ہیں۔ دیہاتی خواتین ایسے میں مہندی سے ہاتھ پاؤں سرخ انگارہ کیے گاؤں کی ندیوں میں کود کر مہندی کے قدیم گیت گاتی ہیں۔ عائلہ نے بھی دیہاتنوں کی مانند اپنے ہاتھ مہندی سے سرخ کر رکھے تھے۔ شہر میں مہندی کا رواج نہ تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھ اتنے سرخ سرخ اور پیارے پیارے نکل آئے تھے کہ فرقان نے بھی اعتراض کی ضرورت نہ محسوس کی۔ وہ اپنے ہاتھ میز پہ دھرے بیٹھی تھی۔ یوکلپٹس کے لمبے لمبے درختوں سے دھوپ چھن چھن کر اندر برآمدے میں آرہی تھی۔ درختوں کی طویل قطار دجلہ کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ درختوں کے سائے میں گلاب کے بے شمار پودے تھے۔ جن کی خوشبو ہر طرف اُڑی اڑی تھی —— کائنات کا ذرہ ذرہ مدہوشی کے عالم میں ازلی و ابدی سناٹے کا احساس دیتا تھا۔ گلیوں کوچوں میں آئس کریم والا گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ لیکن بچے گھروں کے تہہ خانوں میں ماؤں کے ساتھ بند سو رہے تھے۔ اور فاختائیں سایہ دار جگہوں پہ آرام سے بیٹھی بڑی فراغت و احساس سے اپنے اردگرد دیکھتی تھیں۔ پتھر مارنے والا کوئی شریر بچہ اور کوئی شکاری قریب نہ تھا۔ ہر طرف سکون و امن کا احساس تھا۔ اور المسبح کے مطبخ سے دولما کی خوشبو آرہی تھی ——

"مہندی اور دولما ہماری روایات میں شامل ہیں" عائلہ نے بے اعتنائی سے سوچا۔ دنیا بھی تو بے نیازی اور بے اعتنائی سے اُس کے اردگرد پھیلی تھی۔

"ہاں مہندی اور دولما کے بغیر زندگی نامکمل ہے" اب اُس نے کچھ دھیان سے سوچا۔ یہ بات طے شدہ تھی

کہ وہ اسی دجلہ کنارے کھجوروں کے سائے میں اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے فرقان کے لئے دولما بنایا کرے گی ۔ اور زندگی کو آگے بڑھتا دیکھا کرے گی ۔

وہ یک لخت خوش ہوگئی ۔ اور چہک کر بولی :

"فرقان ۔ آج میری طوطی نے پانچ انڈے دیئے ہیں "

فرقان کو بھی پرندوں، چڑیوں اور طوطوں سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی ۔ اُس نے فوراً طوطیوں کے حفظانِ صحت پہ ایک تقریر شروع کر دی ۔ جسے عائلہ بالکل بچاروں کے سے انداز سے سنتی رہی، پھر بولی :

"فرقان ۔ یہ جو طوطیوں کے چھوٹے چھوٹے گول انڈے ہوتے ہیں نا ۔ ان میں اور معروف کرخی کے نظریۂ موت میں کافی مماثلت ہے ۔" دفعتاً عائلہ پہ کشف ہوا ۔ اور اپنے نظریئے کی وضاحت کرنے لگی ۔

فرقان نے بڑی بے صبری سے اُس کے دلائل سنے ۔ فرقان کا خیال تھا کہ طوطیوں کے انڈوں اور بُدھا کے نروان میں کافی مماثلت ہے ۔

"بُدھا ۔۔۔ کون وہ ۔۔۔ گاندھی کا چیلا ۔۔۔ فاقے کر کر کے جس کی بارہ پسلیاں صاف نظر آنے لگی ہیں ۔ اور جو صرف ایک لنگوٹی باندھتا ہے، بیچارا "

"عائلہ ۔ تم جو بعلبک اور بطرہ کے کھنڈرات کے چکر کاٹتی رہتی ہو ۔ کبھی کراچی، ٹیکسلا اور پشاور کے عجائب گھر دیکھو ۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بدھا کون تھا ؟"

"یہ بات تو تم مجھے یہاں بھی بتا سکتے ہو ۔ اس کے لئے کراچی اور لاہور جانے کی کیا ضرورت ہے ؟"

"اوہ ۔ عائلہ ۔ تمہیں تو میرے شہروں سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ۔ کس خطے کی مخلوق ہو آخر تم ۔" فرقان کچھ جھنجھلا گیا ۔

"میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں فرقان ۔ بھلا مجھے کراچی اور پشاور سے مطلب ؟ میری زندگی تو دجلہ ہے، اور پھر میرے سامی نقوش اور تمہارے دراوڑی نقوش میں بھی کوئی مطابقت نہیں ۔" عائلہ شرارت سے اسے دیکھا کی ۔

"یہ بات ہے تو ابھی سے فیصلہ کر لو کہ کس راستہ پہ جانا ہے ۔ کراچی یا پشاور ۔ یا بعلبک اور بطرہ !"

"ہونہہ !" عائلہ نے بڑی جھنجھلاہٹ سے اپنے خوب صورت اور متمرد منگیتر کو دیکھا ۔ جلال کی تمام تر گرمی اسے اپنی رگوں میں دوڑتی نظر آئی ۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص کے ساتھ کبھی نبھا نہیں سکتی ۔ انگوٹھی انگلی سے اُتار کر فرقان کے قدموں پہ پھینک دی ۔ فرقان انگوٹھی اُٹھانے کے لئے جھکا، اور رُک گیا ۔ نظر بھر کر عائلہ کی جانب دیکھا ۔

اور عائلہ نے سوچا کہ اب یہ یقیناً ایک طویل تقریر اخلاقیات اور فرائض نسواں پہ کرے گا ۔ اور پھر الف لیلیٰ کے شہزادوں کے وقار اور وجاہت کے ساتھ انگوٹھی دوبارہ اسے پہنا دے گا ۔ لیکن فرقان تو چہرہ سُرخ کئے خرگوش کی مانند نتھنے پھڑکاتا اسے دیکھا کیا، اور پھر سے [illegible] انگوٹھی وہیں گلابی پاؤں

۔ ھالے فرش پہ پڑی رہی۔

الف لیلہ کی بے نیاز و بے پرواشہزادی نے الف لیلوی محرابوں سے نکل کر ستونوں کے قریب پڑی انگوٹھی اٹھائی، اور غیر ارادی طور پر زمین پہ رگڑ ڈالی۔ لیکن فرقان نہ آیا۔ انگوٹھی دوبارہ پہن کر وہ سیج سے باہر نکلی۔ لیکن فرقان کی موٹر دھول اڑاتی جا چکی تھی۔ باہر ریت کے بگولوں، گرم ہوا، تیز دھوپ اور مکھیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ دوبارہ اندر آئی۔ کوکا کولا پی کر فاختہ کے انڈوں اور نظریۂ اضافت کی مماثلت کے امکانات پہ غور کرنے لگی۔ فرقان بھی غالباً ایک اضافی کیفیت تھی۔

بہت دنوں بعد جب فرقان کا خط آیا، تو عائلہ کو معلوم ہوا کہ وہ شکاگو جا چکا تھا۔ اکیلا! حالانکہ پروگرام یہ تھا کہ دونوں شادی کے بعد شکاگو جا کر وہاں کے مشہور و معروف مجرموں اور قاتلوں کے انٹرویو لیں گے۔ کاؤ بوائز کے ساتھ گائیں اور بھینسیں چرائیں گے۔ اور پھر برازیل جا کر وہاں کے جنگلات میں شکار کھیلیں گے۔ ڈھیروں رنگ برنگے پرندے جمع کریں گے۔ اور جیتے جاگتے شیر اور چیتے پکڑ کر پالیں گے۔ دونوں کو جنگلی جانوروں سے بھی بے پناہ عشق تھا۔ خیریت ہوئی اُن دنوں بغداد میں کوئی چڑیا گھر نہ تھا۔ ورنہ المسیح کے بجائے دونوں چڑیا گھر میں نظریۂ ڈارون اور صحرائی اونٹ کے ارتقاء پہ غور کرتے نظر آتے۔

فرقان گیا، تو عائلہ نے بھی اپنا بستر بوریہ سمیٹا۔ اور بعلبک و بطرہ کے کھنڈرات کی طرف نکل گئی۔ یہ کھنڈرات بہر صورت برازیل سے زیادہ پرکشش تھے۔ تقریباً سال بھر بیروت اور عمان میں رہنے کے بعد وہ بغداد لوٹی۔ تو بغداد میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر تعمیر ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی بغداد کے حالات بھی خراب ہو چکے تھے لہٰذا کچھ عرصہ بعد وہ کراچی آ گئی۔

وہ کراچی آئی تو فرقان شکاگو سے بیروت اور پھر قاہرہ جا چکا تھا۔ وہاں اُس نے ایک فلسطینی لڑکی سے شادی کی۔ اور پھر پورے مشرق اوسط میں بکھر گیا۔

عائلہ اس کی وجہ سے کراچی آئی، اور وہ عائلہ کی وجہ سے مشرق اوسط میں آباد ہو گیا!

اور کراچی میں الپ ارسلان تھا۔ ایک قطعی اجنبی اور بالکل ہی مختلف دنیا کا انسان — جو یہ ماننے کو ہرگز آمادہ نہ تھا کہ عائلہ کسی کی منگیتر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ عائلہ کو جبراً اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اسے الف لیلہ سے دلچسپی تھی۔ اس کا انداز تحریر بھی کچھ الف لیلوی تھا۔ اس لئے عائلہ کا فرض تھا کہ الپ ارسلان کے عشق میں فی الفور مبتلا ہو جاتی۔

الپ ارسلان نے اپنے جسم کو عشق کے معاملات میں بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ اور ہر لمحہ گوری نار اور سانولے سلونے بلم کا ذکر کرتا تھا۔ گوری نار اور سانولے سلونے بلم کا مطلب عائلہ ہر بار بھول جاتی تھی، اور حیران ہوتی تھی کہ آگ کو درحقیقت نار کہا جاتا ہے۔ اور نار سُرخ ہوتی ہے۔ سفید کیونکر ہو گئی۔ اور بلم کبھی دجلہ میں

ئے والی بے ڈول اور نوکیلی کشتی کو کہتے ہیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ نار دوشیزہ کو کہتے ہیں۔ اور ظلم محبوب
د --!

الپ ارسلان کی ہندی اور عائلہ کی عربی میں کسی قسم کی کوئی مماثلت نہ تھی۔ اس میں اور الپ ارسلان
ا کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ پھر بھلا وہ الپ ارسلان کی طرف متوجہ کیوں ہوتی؟ جب کہ اس کی جاہل بیوی
ہو سکے باورچی خانے میں بچے پالتی تھی۔ جنہیں چھوڑ کر الپ ارسلان کراچی میں یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ بالکل
ذارا اور حد سے زیادہ شریف یعنی بالکل فرشتہ ہے۔ لیکن عائلہ کو وہ پہلی مرتبہ ہی شیطان نظر آیا تھا۔
کراچی کے اسی کلب میں عائلہ برآمدے میں ایک کرسی پہ بیٹھی بڑی محویت سے عربی کی ایک کتاب پڑھ
ہی تھی۔ جس کے سرورق پر الجزائری مجاہدوں کی تصویر بنی تھی۔ اور بڑے بڑے سرخ الفاظ میں کتاب کا نام
"الجزائر" لکھا تھا۔

الپ ارسلان اپنے سنہری پلکوں والے دوست جلال الدین اکبر کی دعوت پہ کلب آیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ
ہ کلب میں قدم دھر رہا تھا۔ اس لئے قدم بغیر پئے ہی لڑکھڑا رہے تھے۔ اور جب اُس نے شلوار قمیص میں ملبوس
س لڑکی کو سچ مچ کی عربی میں کتاب پڑھتے دیکھا تو بالکل ہی لڑکھڑا گیا۔ اور کرسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ جلال الدین
رنے اسے سنبھالنا چاہا، تو وسکی زیادہ چڑھا جانے کی وجہ سے خود کو نہ سنبھال سکا۔ اور عائلہ کی میز پہ جا گرا۔ میز
وسے اور پودینے کی چٹنی پڑی تھی، وہ تمام جلال الدین اکبر کے چہرے پہ لگ گئی۔ عائلہ نے انتہائی سنجیدگی
ہ دونوں کو دیکھا، اور پھر رومال جلال الدین اکبر کی طرف بڑھا دیا۔ اور خود سموسے سمیٹ کر کتاب پڑھنے میں
روف ہو گئی۔

"یار! یہ لڑکی عربی پڑھ رہی ہے۔" الپ ارسلان گھگھیا کر بولا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سموسوں کی مانند عائلہ
بیا ڈالے۔

"خود بھی عربی جان پڑتی ہے۔ میری عربی کھجور۔ تو ہے جنت کی حُور۔ آ۔ آ۔ آ۔" جلال الدین اکبر کان
تھ رکھ کر گانے لگا۔

اور عائلہ بے اختیار ہنس پڑی۔

اس ہنسی سے الپ ارسلان نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ عائلہ اُن کی دوستی چاہتی ہے۔ اسے تو وہی بے چینی ہو
ہی تھی جو ہر نئی لڑکی کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ گو وہ ایک برقعہ پوش شادی شدہ خاتون کے عشق میں بھی بری طرح مبتلا
تھا۔ اپنی ماہیات توند الا تا وہ عائلہ کے قریب آیا، اور کتاب کے متعلق دریافت کیا۔ عائلہ نے بھنویں چڑھا کر
کتاب اُس کے حوالے کر دی۔

وہ وہیں بیٹھ کر اوراق پلٹنے لگا۔ اور پھر کتاب واپس کر کے اپنا تعارف کرایا، اور عائلہ کا تعارف
مانگا ---

--- عائلہ معتصم۔ پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ۔ اونچی ایڑیوں کے ساتھ پانچ فٹ سات انچ --- پیمائش

۳ — ۲۳ — ۲۹ "

عائلہ کہتے کہتے اٹھی۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی:

"یہ چھوٹی انگوٹھی آپ میری درمیانی انگلی میں دیکھتے ہیں، میرے منگیتر فرقان نے پہنائی ہے۔ وہ اِن دِنوں قاہرہ میں ہے۔"

"آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔ میں تو شادی شدہ اور بچوں کا باپ ہوں، میرا وہ دوست بھی کئی بچوں کا باپ ہے۔ اور میں ایسا بُرا آدمی نہیں، جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"ہونہہ!" کندھے اُچکاتی وہ بے نیازی سے دوپٹہ لہراتی باہر نکل گئی۔

الپ ارسلان کرسی پر گر پڑا۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ لڑکی کا اتہ پتہ لینے کے بجائے اپنے بیوی بچوں کا ذکر لے بیٹھا۔

لیکن جلال الدین اکبر نے تسلی دی کہ وہ تو اکثر اس کلب میں کتابیں پڑھتی نظر آتی ہے۔ دوبارہ، سہ بارہ ملاقات کی صورت بھی نکل سکتی ہے۔

لیکن دوبارہ ملاقات کلب کے بجائے کسی مشہور فنکار کی تصاویر کی نمائش میں ہوئی۔ عائلہ دجلہ کی پروردہ تھی۔ اپنی گفتگو سے دجلہ کی مخصوص شیرینی کسی طور حذف نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو اگر کسی دشمن سے بھی بات کرتی، تو یہ شیرینی ساتھ ساتھ رہتی۔ وہ ان دونوں سے بھی اسی طرح بات کرتی جس طرح اپنے منگیتر یا بغداد کے کسی لڑکے سے کرتی تھی۔

اِدھر یہ دونوں دوست اس کے اندازِ گفتگو سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے، اُدھر رومانہ، شبانہ نعمانہ کو بہت بڑی تہلکہ مچانے والی خبر مل گئی۔

لڑکی اگر خوش شکل اور خوش پوش ہو۔ گفتگو کا ایک انداز رکھتی ہو۔ لوگوں میں اس کے مقبول ہونے کا خدشہ بھی ہو۔ تو بعض خواتین کا دل خواہ مخواہ اس پہ باتیں بنانے کو چاہتا ہے۔

عائلہ کو رومانہ، شبانہ نعمانہ اور بیگم جلال الدین بالکل برداشت نہ کر سکیں۔ عائلہ سے تو دونوں نے کہا، کہ وہ دونوں دوست انتہائی بے ہودہ انسان ہیں۔ اور خود اس جستجو میں لگ گئیں کہ الپ ارسلان اور جلال الدین اکبر کس حد تک عائلہ کو جانتے ہیں۔

لیکن عائلہ کو کراچی میں کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ بغداد کی مخلوق تھی۔

"ہائے ہائے —— اب ہم لوگوں کو کیا بتائیں گے کہ یہ لڑکی بغداد میں کیا خاک دھول اُڑاتی رہی ہے۔" وہ سوچتی رہیں۔

ادھر الپ ارسلان نے عشق میں ایک قدم آگے بڑھایا، اور عائلہ کو اپنے دفتر آنے کی دعوت دینے لگا۔

اگر ایک شادی شدہ، تجربہ کار شخص، ایک ناتجربہ کار لڑکی کو تنہا لمحات میں تنہا اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہ عائلہ بخوبی جانتی تھی۔ لہٰذا الپ ارسلان کو ترغیب کی ہر دعوت بے مایوس

رہی ۔

اور وہ شادی کی درخواست پہ اُتر آیا۔

عائلہ اس درخواست کا مطلب بھی بخوبی جانتی تھی ۔ جب تک الپ ارسلان مٹی کے گھروندے میں رہا، اپنی کا ساتھ دیتا رہا۔ اب ایک پختہ گھر میں آگیا تھا۔ تو اسے شیشے کے گھر میں رہنے والی بغدادی وہ لڑکی بڑی پرکشش تی تھی ۔ جو لمبی سی موٹر میں گھومتی پھرتی تھی ۔ اور یہ لمبی موٹر یقیناً الپ ارسلان کا معیار زندگی بلند کرسکتی تھی ۔ زندگی کے ۴۴ سال گذارنے کے بعد اب وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ان ۴۴ سالوں میں بالکل تہی دست ہے ۔ زندگی سے کچھ حاصل نہ کرسکا ہے ۔ اب وہ نفرت کی بنیادوں پہ محبت کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا تھا ۔ اور جانتا تھا کہ عائلہ اُسے کس قدر ناپسند کرتی ہے ۔ اس کے لئے تو یہی تصور قابلِ فخر تھا کہ عائلہ اس کے عشق میں ہے ۔

اُس نے جلال الدین اکبر سے عائلہ کے قصے شروع کردیئے ۔ عائلہ راتوں کو بے چین ہوکر اُسے فون کرتی تھی ، پہروں باتیں اُس کے گھر گذارتی تھی ۔ عائلہ اس کے لئے زہر کھانے کو تیار تھی ۔ وغیرہ وغیرہ !

جلال الدین اکبر نے یہ تمام باتیں بیوی سے کہیں ۔ اور بیوی نے یہ تمام باتیں رومانہ شبانہ خم خانہ کے ہیں انڈیلنے کے بعد یہ مژدہ بھی دیا کہ :

"عنقریب الپ ارسلان اور عائلہ کی شادی بھی ہو رہی ہے"

"ہاں ۔ لڑکی تو کافی اچھی ہے" رومانہ شبانہ خم خانہ جانے کس ترنگ میں کہہ اٹھی ۔

اور بیگم جلال الدین نے اسی بات کا بتنگڑ بنا لیا کہ رومانہ شبانہ خم خانہ تو عائلہ کو الپ ارسلان کے لئے ملتی ہے ۔

یہ "تجویز" الپ ارسلان کے کانوں تک پہونچی تو گمان ہوا کہ عائلہ نے اس کی درخواستِ شادی کا تذکرہ شبانہ خم خانہ سے کیا ہے ۔ اور یہی کھول کر دونوں نے اس کا مذاق اُڑایا ہے ۔ اب اس عائلہ نالائق کی نیندیں کیں تو میرا نام بھی الپ ارسلان نہیں "

اس ارادے کے ساتھ ایک روز الپ ارسلان نے بڑے پراسرار اور رازدارانہ انداز میں عائلہ سے کہا ، کہ ہر طرف بڑے زوروں کی بدنامی ہو رہی ہے ۔ رومانہ شبانہ خم خانہ ہر جگہ کہتی پھر رہی ہے کہ عائلہ کی جلد الپ ارسلان سے شادی ہوگی ۔

"اللہ تم سب کو غارت کرے ! "

یہ کیسے لوگ تھے جن کے درمیان نہ تو فلسفہ و ادب کے تذکرے تھے ۔ نہ مشرق اوسط کے سیاسی جھگڑے نہ حزب البعث اور حزب الشیوعی کے ہنگامے تھے ۔ نہ دجلہ و فرات کے گیت تھے ۔ کچھ بھی نہ تھا ۔ تو نہ تھا ۔

عائلہ کو ان لوگوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی ۔ جن کے پاس محض اسکنڈلز اور کھوکھلے جسم تھے ۔ اور یہ تمام

باتیں اُن لمحات میں اُس کے گوش گذار کی گئی تھیں، جب کہ دنیائے عرب پہ نیپام بم برسائے جارہے تھے، جب کہ عائلہ کا گھر مشرق وسطیٰ میں تباہ ہو رہا تھا۔ جب کہ ریڈیو بغداد اور ریڈیو قاہرہ سن سن کر عائلہ کی آنکھوں سے لہو ٹپکتا تھا۔

شب کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ چمپا کی خوشبو ہر سو اڑی تھی۔ سبز گھاس پہ شبنم کی نمی تھی۔ نیم اور پیپل کے سائے زمین کے ساتھ مل چکے تھے۔ چمپا کی خوشبو اور پیپل کے سائے عائلہ کی زندگی کے تجربوں میں شامل نہ تھے۔ اور اُسے شب کے سکون سے خوف آتا تھا۔

اس رات میں نہ دجلہ کے پُل تھے۔ نہ لہروں میں ڈولتے بلَم، نہ کوئی جادو، اسرار اور تحیر تھا۔ نہ کوئی غیر معمولی ہنگامہ ہی تھا۔ وہ وقت سے کتنی دور چلی آئی تھی۔ کائنات کے کس گوشہ میں چلی آئی تھی۔ جہاں اس کا وقت ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

"فرقان ——"

اُس کا جی چاہا۔ چلا چلا کر پکارے۔

فرقان کہاں تھا؟

مشرق وسطیٰ کے کس محاذ پہ تھا؟

اُس کے بیوی بچے کہاں تھے؟

محفوظ تھے یا نہیں؟

فرقان کا دُکھ عائلہ کا دُکھ تھا۔ مشرق وسطیٰ اُس کا ماضی تھا۔ اور مستقبل بھی تھا۔ مشرق وسطیٰ میں اس کا گھر تھا۔ شرق اوسط کی تمام زمین اُس کا گھر تھی۔

جب لوگ کہتے کہ وہ مشرق وسطیٰ سے آئی ہے، یا وہ مشرق اوسط میں رہ چکی ہے۔ تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ لوگ دجلہ، نہر دمشق اور نیل اور دریائے اردن کے کنارے تعمیر شدہ اُس کا گھر توڑ پھوڑ رہے ہیں۔ بابل، بعلبک بجلہ اور ابوالہول میں نقب لگا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کا اپنا تھا۔ مشرق اوسط کے سُکھ دُکھ بھی اُسی کے اپنے تھے۔ بالکل ذاتی اور داخلی نوعیت کے تھے۔ اور اس سُکھ یا دکھ میں رومانہ شبانہ نعمانہ، جلال الدین اکبر اور الپ ارسلان کوئی بھی شامل نہ ہو سکتا تھا۔

عائلہ بچوں کی طرح ہتھیلیوں سے آنکھیں مَسلنے لگی۔ وہ جو اتنی دلیر تھی کہ بغداد کے ہر ہنگامے میں سب سے پہلے پہونچتی تھی۔ گولیوں کی بوچھار کی بھی پروا نہ کرتی تھی —— وہ، جس نے آگ اور خون کے سمندر اپنے اردگرد دیکھے تھے۔ وہ — جس کے پس منظر میں مشرق اوسط کا تمام تر خون خرابہ تھا۔ یتیم بچوں کی مانند بے بس اور ناکارہ سی بیٹھی کراچی کے ایک کلب میں اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مقدس مریم، کچھ ضرورت سے زیادہ اُداس ہو گئی ہے۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ بیشتر تو بڑے زور و شور سے

اسرائیل وعرب پہ بحث کررہی تھی "۔ دالان میں ایک خاتون نے تاریکی اور عائلہ کو ساتھ ساتھ دیکھ کر کہا۔
"ہاں، بیت المقدس جو چلا گیا ہے "۔ دوسری خاتون زور سے ہنسی ۔ وہ شمپین کچھ زیادہ چڑھا گئی تھی۔
"مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے ـــ میں یہاں کیوں ہوں ۔ مجھے تو اپنے گھر جانا چاہئے ۔ فرقان کے ساتھ بغداد، دمشق یا عمان یا قاہرہ کے کسی محاذ پہ ہونا چاہئے تھا ـــ آخر میں مقدر کے ہاتھوں اس قدر بے بس کیوں ہوں ـــ "
وہ اُٹھ کر تاریک رات پہ چلنے لگی ۔
اگر اس کے ساتھ فرقان ہوتا، تو ان کے سائے ایک ہو کر تاریکی میں گھل جاتے ۔ اور اگر اب ارسلان ہوتا تو دونوں کے سائے واضح طور پہ الگ الگ نظر آتے ۔ بجنوری ایک لڑکی کا سایہ یہاں کسی کے ساتھ نہ مل سکتا تھا ۔
پس اپنا سایہ لئے وہ فاختہ کی طرح تاریک راستوں پہ تنہا چلتی رہی ۔

انیسہ جلال

آگ اور پھول

برآمدے میں جاڑوں کی دوپہر سے قبل کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

فوزیہ کی پُشت جلی سنہری کرنوں میں نہائے ہوئے سورج کی طرف تھی۔ اور اس کے سنہری بالوں کی جلا رسنہری کرنیں خوب غضب کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے گرد چمکیلا ہالہ اسے کسی اور دنیا کی مخلوق بنا رہا تھا۔

عامر بھابی کے گول مٹول بچے سے کھیل رہا تھا۔

"ہائے بھابی کیا پہلوان بن رہا ہے یہ آپ کا راجہ بیٹا"

عامر نے اس کے گال نوچے اور وہ پھول کی طرح کھل کھلا پڑا۔

"عامی تیری نظر لگ جائے گی میرے بیٹے کو" بھابی باورچی خانے میں مصروف تھیں، وہیں سے اُن کی نازک سی سُریلی آواز گونجی۔

اور جب وہ فوزیہ اور عامر کے لئے ٹرے میں چائے ناشتہ سجائے برآمدے میں آئیں تو عامر گڈو کو زور زور سے اچھال رہا تھا۔ اس کے قلقل مینا جیسے قہقہے سارے برآمدے میں پھیل رہے تھے۔ عامر نے گڈو کو اُچھال کر چھت تک پہنچا دیا گڈو نے سہمی سی چیخ ماری۔

"ارے بھیا مر جائے گا میرا بچہ" بھابی نے ٹرے پٹک دی ہوتی اگر فوزیہ آگے بڑھ کر سنبھال نہ لیتی۔

"کوئی مرے ورے گا نہیں بھی۔ ارے یہ پہلوان اتنی سی بات میں ڈھیر ہو جائے گا" عامر نے گڈو کو سینے سے بھینچ اُس کی سانس سینے میں سمائی اور پھر بے غیرتی کی ہنسی پھوٹ پڑی۔

"بھابی آپ اتنی دبلی پتلی اور نازک سی ہیں اور یہ اتنا تگڑا پہلوان۔ پہاڑ کا پہاڑ ہے پورا۔ میں کہتا ہوں بھیا کو ہے کم بخت" عامر مسلسل گڈو کو نظر لگائے جا رہا تھا۔

"بھابی نے گڈو کو چھین لیا۔

"ہمارا بیٹا اگر صحت مند ہے تو پھر۔۔۔۔" اُن کا منہ پھولنے لگا۔

اور عامر کو ہنسی آگئی۔

"ایسا ویسا صحت مند، پورم پور پہلوان ہے یہ تو۔ میری بات مانئے، اسے تو کسی محاذ پر روانہ کیجئے آپ"
بھابی گڈو کو سینے سے لگائے یوں بیٹھی تھیں جیسے عامر کی کوئی بات اُن کے کانوں میں نہ پڑ رہی ہو۔ اور فوزیہ نے عامر کو چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے سوچا:
"تم راجہ بیٹا کو کس کس محاذ پر بھیجو گے عامر؟
کشمیر؟ ویت نام؟ فلسطین! یا وہ محاذ جو آج دنیا کے ہر ملک میں کھلے ہیں۔ بھوک کے محاذ، بے کاری کے محاذ، نسلی فسادات اور مذہبی جھگڑوں کے محاذ ـــــ اس دنیا میں سینکڑوں محاذ ہیں اور راجہ بیٹا یا تم یا میں کس کس محاذ پر کب تک لڑ سکیں گے؟
"کیا سوچنے لگیں فوزی؟" عامر نے میز کے بجائے پیالی فوزی کے سر پہ چمکتے ہوئے سنہری بالوں کے تاج پہ رکھ دی
"کچھ بھی تو نہیں" فوزیہ مسکرا دی۔
"میں کیا سوچ سکتی ہوں بھلا۔ میرے خیالات اتنے محدود ہیں اور تمہارے سامنے تو میں یوں بھی کھسیا ئی سی رہتی ہوں" اور یہ تو تمہارا کرم ہے کہ تم میرا اس قدر خیال رکھتے ہو۔ ورنہ کہیں جو تم نہ ملے ہوتے تو میں زندگی کے ایک معمولی محاذ پر ہی شکست کھا چکی ہوتی۔
"محترمہ کہاں ہیں آپ؟"
اور فوزی نے ہنستے ہوئے اپنے سر پر سے چائے کی پیالی اُتاری جسے عامر اب تک تھامے کھڑا تھا۔ اُس سے اس قدر قریب اس قدر طویل و بالا، اور فوزی اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو اور بھی کمتر محسوس کرنے لگی۔
بھابی اپنے بیٹے کو گود سے اُتار کر چائے کے برتن سمیٹنے لگیں۔
موزیک کے چکنے فرش پر تیزی سے رینگتا ہوا گڈو فوزی کے پاؤں سے لپٹا تو فوزیہ نے اُسے اٹھا کر اُس کے پھول ایسے گالوں کو چوم لیا۔
گڈو کے اتنے لاڈ دیکھ کر عامر نے برآمدے میں پڑی ہوئی رنگین کرسیاں ہٹا کر اپنے لئے گھٹنیوں چلنے کی جگہ بنائی اور پتلون کے پائنچے چڑھا لئے۔
فوزیہ کے چہرے پر چمکتی ہوئی کرنوں میں شرم کی سُرخی شفق کی طرح پھول اٹھی اور وہ گڈو کو لے کر باورچی خانے کی طرف بھاگی جہاں بھابی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں جٹی ہوئی تھیں۔
"یہاں کتنا سکون ہے میرے اللہ"
فوزیہ نے گہری سانس لے کر سوچا:
گڈو، بھیا، بھابی اور سلیقے سے سجا ہوا ننھا سا خوشرنگ گھر، مجھے کوئی ایسا گھر مل جائے تو بس......"
فوزیہ برابر سوچے جا رہی تھی۔
یہ عامر جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ اس پرسکون گھر میں بیٹھ کر بھی ایسی خوفناک باتیں کرتا اور سوچتا رہتا ہے۔ اپنی ذات سے فوزیہ لاکھ کوشش کرتی پر عامر کی بڑی بڑی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتیں۔ اُسے دنیا کے اتنے بڑے بڑے دکھوں سے

کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو اس دکھی اور کمینی دنیا میں بھی صرف ایک ایسا گھر چاہتی تھی جہاں وہ اپنی اماں کے ساتھ سکون سے رہ سکے۔ جہاں اماں اپنے مرحوم شوہر کے لئے روتی نہ رہیں۔ وہ فوزی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے دکھ نہ مٹا سکی تھی اور نہ اپنی بیماریوں کو طول نہ دیں۔ فوزی کی کتنی چھوٹی چھوٹی خواہشات تھیں، لیکن ان کے لئے بھی اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتیں۔ اماں کے لئے سکون مہیا کرنا اور دونوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنا اس کے لئے کس قدر مشکل کام تھا۔

آفس جاتے ہوئے، بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے، سڑکوں پہ چلتے ہوئے جب مردوں کی وحشی، ناچتی ہوئی آنکھیں اُسے اپنے جسم کے اندر اُترتی، اپنے جسم پر سرسراتی محسوس ہوتیں تو اس کا دل چاہتا کہ ایسی دنیا اگر بھک سے اڑ جائے تو زیادہ اچھا ہو۔

لیکن عامر اس کمینی دنیا کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ گڈو کی مسکراہٹ جیسی حسین اور معصوم لگتی تھی اسے یہ دنیا!

فوزی چکرا جاتی۔ اس کے مقاصد، اس کے ارادے اُسے نہ پوری ہونے والی باتیں لگتیں۔ عامر اگر اس کے پاس نہ ہوتا تو وہ ان ارادوں پر عامر ہی کے سامنے کھل کھلا پڑی ہوتی۔

آتش فشاں کا مقابلہ برف کے ایک ٹکڑے سے کیا جا رہا تھا۔

اور عامر اس برف کے ٹکڑے کو لئے گھر گھر پھرتا ــــ ما نو امید کا یہی تو سورج تھا جو اُس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ بڑے سفید کاغذ پہ امن کی اپیل کے نیچے لوگوں کے دستخطوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اور عامر کے لئے یہی کاغذ امید کا جگمگاتا سورج بن گیا تھا۔ عامر اور اس کے چند سر پھرے ساتھی اسی مشن کو گلے سے لگائے گلی گلی گھوم رہے تھے اور فوزی بھی جیسے کسی کشش سے کھنچی کھنچی اُس کے ساتھ پھرا کرتی۔

"اماں اکیلی پڑی نجانے کیا کیا سوچتی ہوں گی"

اس خیال کو وہ ذہن سے بار بار جھٹک دیتی۔

عامر کا ساتھ تو وہ اس لالچ میں دیتی کہ وہ اُسے اکثر اپنے گھر لے جاتا۔ اُس گھر میں جو فوزی کے لئے تصوراتی تھا اور عامر اُس کا مالک تھا۔ بھابی، گڈو اور بھیا اس جنت کو مکمل کرتے تھے۔ فوزیہ یہاں چلی آتی تو بھابی اتنی اپنائیت سے ملتیں کہ اس کا دل بھر بھر آتا۔

"کاش اماں کی بیماری جلدی ختم ہو جائے"۔ وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگتی۔

بھابی اماں کی خیریت دریافت کرتیں تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اُن کی کیا حالت بیان کرے۔ وہ تو حالات سے ہاری ہوئی تھیں اور فوزی کے بس میں نہ تھا کہ وہ انہیں ان کے پچھلے دن لوٹا دے۔ پچھلی زندگی کی یادیں اُن کے لئے رِستا ہوا پرانا ناسور تھی اور یہ یادیں یہ ناسور ہر وقت یوں تڑپاتے تھے انہیں کہ فوزی اپنی زندگی سے شرمندہ ہو ہو جاتی اور اگر اس مایوسی کے عالم میں عامر نے اس کے دروازے پر دستک نہ دی ہوتی تو شاید اماں کے برابر ہی اُس کا بھی پلنگ لگ چکا ہوتا۔

عامر کے سفید کاغذ پہ بہت سے دستخط پھیلے ہوئے تھے، خوشخط، ٹیڑھے میڑھے گہرے ہلکے اور کالے سیاہ!

میں، بھیکی بدرنگ سیاہی میں، پنسلوں کی سرمئی رنگت میں، اور بعض جوشیلے لوگوں نے تو اپنے خون سے بھی اس کاغذ کا رنگا تھا۔ خون کی سُرخی کا رنگ اگرچہ بدل گیا تھا۔ پھر بھی حروف میں عجیب چمک تھی۔ جیسے سفید کاغذ پر لعل جڑ دیئے گئے ہوں۔

اور پھر فوزی بہت دیر تک کاغذ ہاتھ میں لئے سوچتی رہی ——— آج ہی شام وہ کس قدر روئی تھی، اور اب اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھل چکی تھیں، اور پامال رخسار اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ابھی یہاں سے آنسوؤں کا عظیم الشان قافلہ گذر چکا ہے۔ قلم ہاتھ میں پکڑے جب فوزی سوچتی رہ گئی کہ ان دستخطوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو بھی شامل کردے یا نہیں؟ تو عامر نے کاغذ اس کے سامنے سے اُٹھا لیا۔

"آپ اگر دستخط کرنے سے پہلے سوچنا چاہیں تو ٹھیک ہے میں پھر آجاؤں گا۔ آپ اچھی طرح سوچ بچار کریں آیا آپ اس خوبصورت دنیا سے محبت ہے بھی یا نہیں؟

اور وہ چلا گیا —— وہ جو دُنیا کی محبت سے سرشار تھا۔

آج فوزی کی نفرت بھی عروج پر تھی۔ پھر بھی اس کے جانے کے بعد دروازے بند کرکے وہ سوچتی ہی رہ گئی۔ اس کاغذ کے متعلق جس پر لکھی ہوئی چند سطریں شاید اتنی قیمتی تھیں کہ لوگوں نے اُن پر اپنے خون سے صاد کیا تھا۔ خون کے بدرنگ دستخط اُسے پریشان کرتے رہے اور وہ پڑی پڑی جھنجلاتی رہی۔

اور واقعی عامر دوبارہ آگیا ——— اس دفعہ اُس نے کاغذ نہیں نکالا۔ فوزیہ سے کہنے لگا: "چلئے، میرے ساتھ چل کر آپ ان سطروں کی سچائی کو پرکھ لیں، پھر دستخط بھی ہو جائیں گے"

فوزیہ نے اماں کی طرف دیکھا جو برآمدے میں منہ لپیٹے پڑی تھیں، اور اُسے یہی غنیمت لگا کہ کچھ دیر کے لئے ہی وہ اس ماحول سے دور بھاگ جائے بہت دور —— !

اس طرح فوزیہ اور عامر ملنے لگے۔

عامر اُسے اپنے گھر بھی لے گیا، اور یوں اس گھر سے فوزی کی غرض وابستہ ہوگئی۔ بھابی کی محبت، بھیا کی شفقت اور گڈو کی مسکراہٹوں میں فوزی کے لئے بڑی گنجائش تھی۔ اور پھر عامر کی نظر میں جو کچھ بھی کہتی ہوں فوزی اسے ماننے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ تو اس جنت میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔

عامر کی مصروفیات جو بھی تھیں اُن سے فوزیہ کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، لیکن پھر بھی وہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی اور یوں شام کے کئی گھنٹے وہ اپنے بے رونق گھر سے دور گزار دیتی۔

"اس دنیا کا بھی عجیب حال ہے" عامر جب اپنے چہرے سے مسکراہٹ کی نقاب ہٹا کر کہتا تو فوزیہ کو بہت خوف آتا۔ حالانکہ اسے تو ہمیشہ سے یہی علم تھا کہ دنیا کا ایسا ہی حال ہے۔ لیکن عامر کے ان الفاظ کا مطلب تھا کہ دنیا اس کے لئے بھی ویسی ہی بُری ہو گئی ہے جیسی فوزیہ کے لئے تھی۔ بڑے بڑے جہنموں کا تو اُسے علم نہ تھا لیکن اس کی اپنی دنیا اُس کے لئے جہنم تھی۔ اماں کے ساتھ وہ پریشانی، غم اور فکر کے محاذ پر ایک عرصے سے لڑ رہی تھی اور اس کی جنگ ختم ہی نہ ہو چکی تھی، اور عامر کو دنیا بھر کے محاذوں کی فکر تھی۔

فوزیہ کے نزدیک ایسی باتیں بیوقوفی کی تھیں۔ انسان فانی ہے۔ اب چاہے اُسے بھوک مٹائے یا جنگ کے شعلے جلا
ں۔ جنگ بھی تو بھوک ہے طاقت کی اور ہوس کی بھوک، احساس برتری کی بھوک، نسلی امتیاز کی بھوک، رنگ کی بھوک
ب کی بھوک! اور یہ جہنم کے کھلے ہوئے دہانے ساری دنیا میں آگ پھیلا رہے ہیں۔ انسان کو جلا رہے ہیں۔ انسان ہی
پیدا کی ہوئی بھوک کی آگ اسے بھون رہی ہے۔
اور عامر جیسے چند انسان اس بھوک کو مٹانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ فوزیہ کے لئے یہ باتیں ناممکن تھیں ـــ
ر اور اس کے ساتھی خواب دیکھ رہے تھے۔ پُرامن زندگی کے حسین سپنے میں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن فوزی تکلیف دہ
ک حقیقت پسند ہو گئی تھی۔ اسے خود اپنی حالت پر افسوس ہوتا کہ وہ کیوں عامر کی طرح آنکھیں موند کر سپنوں کے طلسم
ں مقید نہیں ہو سکتی۔ پر فوزی جو بھی سوچتی اسے اپنی زبان تک لانا ضروری نہ سمجھتی تھی۔ وہ خاموش رہ کر لوگوں کے
ں رکھنا جانتی تھی۔ اس لئے فوزیہ عامر اور اس کی پارٹی کا ساتھ دیتی رہی۔
لوگوں نے جب کئی کاغذ اپنے دستخطوں سے بھر دیئے تو اُن کے جوش و خروش نے عامر کی پارٹی کی ہمت بندھائی
ش بڑھتا گیا۔ مستقبل کے متعلق بہت سی حسین امیدیں بندھ گئیں اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ایک قدم آگے بڑھنا چاہئے
امن! شانتی! صلح و آشتی!
وہ اس دنیا سے اور چاہتے ہی کیا تھے؟
مظاہرے! ـــ جلسے! ـــ جلوس! ـــ یہ ساری ہنگامہ آرائی فوزیہ کو پسند نہ تھی۔ لیکن
و تو عامر کا ایسا سایہ تھی جو اندھیرے میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا، بلکہ اس میں سما کر خود اُس کے وجود کا ایک حصہ بن جاتا
ہے!
مظاہرہ بڑے ہی پُرامن طریقے سے شروع ہوا ـــ سب کے چہرے جوشِ جذبات سے سُرخ ہو رہے تھے
یکن وہ سب چپ تھے ـــ بڑے بڑے بینرز جلی حروف میں اُن کے دل کا حال بیان کر رہے تھے ـــ خاموشی
سے جلوس آگے بڑھتا گیا، ـــ اور جیسے جیسے تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جوش بھی بڑھتا گیا ـــ عامر اور اُس کے
ساتھیوں پر مشتمل مٹھی بھر آدمیوں کا جلوس اب بڑھ کر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن گیا تھا۔
یہ کیسی بے چینی تھی؟ ـــ یہ کون سی خلش تھی کہ جس نے سب کو ایک ہی ناتے میں باندھ دیا تھا ـــ؟
فوزیہ کی سوچ نے بھی آج اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ سُرخ تمتمایا چہرہ نیلے کنارے والے سفید پلو میں لپیٹے وہ مسحور سی عامر
کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔
یہ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ پہلا نعرہ کس نے لگایا، لیکن اس کے بعد جلوس کے نعروں نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔
فوزیہ کو ہوش اُس وقت آیا جب ٹھائیں ٹھائیں شروع ہو گئی۔ ورنہ وہ تو اس قدر گم ہو چکی تھی کہ اپنا ہاتھ ہوا میں
لہرا لہرا کر پوری شدت سے نعرے لگا رہی تھی۔ اب اس ہجوم میں عامر اسے کہیں بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔
مگر نہیں ـــ
اُس کے اطراف ہر چہرہ عامر کا چہرہ تھا، جذبات سے سُرخ اور تمتمایا ہوا ـــ پرجوش اور جھلایا ہوا ـــ

ہر چہرہ عامر کا چہرہ تھا، جو انسانوں سے انسانوں کے لئے جینے کا حق مانگ رہا تھا۔ یہ کیسا سوال تھا جسے پورا کرنے والے دروازے کھڑکیاں بند کئے خوف زدہ بیٹھے تھے اور سائل اُن کے گھر کے در و دیوار ہلائے دے رہے تھے۔

اور پھر کھائیں تھائیں ـــــ فوزیہ جیسے خواب سے جاگی۔

"عامر ـــــ عامر ـــــ عا ـــــ مر....."

اُس کی ایک ایک سانس عامر کو پکار رہی تھی۔ نہ جانے اُس کے دل کو کیا ہو رہا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ دور ـــــ بہت دور اُسے عامر نظر آیا ـــــ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکی ـــــ فوزی نے اس کے سینے سے سر لگا دیا، اور عامر کے سینے سے اُبلتے ہوئے خون نے اُس کی مانگ بھر دی۔ خون بہہ کر اس کے ماتھے تک آگیا۔ اور ایک کندن سا ٹیکا اس کی پیشانی پر چمک اٹھا۔

عامر ـــــ ؟

اُس نے وحشت بھری نگاہیں اُٹھائیں۔ عامر نے سر ڈال دیا۔ اور فوزی چیخ بھی نہ سکی۔ اُس کا تصوراتی گھر لٹ چکا تھا۔ عامر اور فوزیہ کی کہانی ختم ہوگئی۔

فوزیہ کے سامنے عامر کی لاش پڑی تھی۔ وہ بے حس تھی۔ وہ یہ سوچنا بھی نہ چاہتی تھی کہ عامر جیسے بلند حوصلہ انسان کو جو دنیا سے ہر محاذ کو ختم کرنا چاہتا تھا یوں ایک معمولی کانسٹبل کی گولی ختم کر دے گی، اور اس طرح خوبصورت دنیا کے سارے تصورات ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

عامر کی لاش پر فوزی آنسو بہا کر اس کی بے حرمتی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تو وہ سپاہی تھا جس نے ساری دنیا کی حفاظت کا عزم کیا تھا ـــــ وہ خواب تھا جسے دنیا کا ہر فرد آنکھوں میں بسا لینا چاہتا ہے۔ وہ تصور تھا جس سے ہر انسان اپنے خوابوں کے دریچے سجائے رکھنے کا آرزومند ہے۔

یوں تو فوزیہ اور عامر کی کہانی ختم ہوگئی۔ لیکن فوزیہ اس کہانی کو باقی رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس کہانی سے عامر کا نام نکال ہی نہیں سکتی۔ عامر نے اپنے خون سے اُس کی مانگ بھری تھی۔ اپنے سُرخ لہو سے اُس کے ماتھے پر کندن سا ٹیکہ سجایا تھا۔ اور اب وہی فوزیہ عامر بن گئی ہے۔ اس کاغذ کو ہاتھ میں تھامے جس پر ہزاروں دستخطوں کے علاوہ عامر کے خون کے دھبے بھی ہیں۔ اور گویا ان ہی سرخ دھبوں اور کالے نیلے حرفوں میں فوزی کا مستقبل بھی بند ہے۔ اب وہ ساری عمر ان دستخطوں اور ان سُرخ دھبوں کی حفاظت کا عزم رکھتی ہے۔

کون جانے وہ کس فوزی کا گھر بچانا چاہتی ہے!

کیا آپ نے کبھی سوچا کہ فوزی کا گھر اور آپ کا گھر دو جدا جدا حقیقتیں نہیں۔ یہ دنیا ہی اس کا گھر ہے۔ کیوں نہ فوزی کا ہاتھ بٹایا جائے۔ اس کے گھر کو جہنم سے بچانے کی کوشش کی جائے یا اپنے ہی گھر کو ان شعلوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے لئے سب ہی کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ تیار ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے یہ جھوٹ کہا تھا کہ فوزیہ اور عامر کی کہانی ختم ہوگئی۔ وہ تو جاری ہے اور رہے گی۔ فوزی کی کوششوں سے اور آپ کی ہماری کاوشوں سے۔

سید جاوید اختر

زہر، خوشی کا!

نام تو اس کا مظفر تھا، لیکن فتح اور زندگی کی سچی شادمانی کی ہوا کبھی اُسے چھو کر بھی نہ گذری تھی۔ عمر بھر وہ پاگل پن اور مرگی کی دوزخ میں جلتا رہا اور آخر ایک دن چپکے سے، بالکل غیر متوقع طور پر، موت کی آغوش میں سو گیا۔

اُس کی موت یُوں واقع ہوئی کہ حکیم جی نے اپنی باورچن کریماں سے اس کو دو دوروں کی خوراک پلا دینے کے لئے کہا، اور خود کسی اہم مریض کے ساتھ مطب چلے گئے۔ میز پہ دوائی کی تین چار شیشیاں پڑی تھیں۔ کریماں نے غلطی سے اسے مالش کی دوائی پلا دی۔

حکیم جی کے مطب سے واپس آنے تک مظفر کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کی سانس نرخرے میں اُلجھ رہی تھی۔ اور زبان مارے پیاس کے دیوانے کتے کی طرح منہ سے باہر لٹک لٹک جاتی تھی۔ جانے وہ پانی کے کتنے گلاس پی گیا۔ مگر پیاس کی آگ نہ بجھی۔ اب حکیم جی کو تشویش ہوئی اور انہوں نے باورچن سے پوچھ گچھ کی۔ آخر بھید کھُلا کہ اس کمینی نے جلدی میں آنکھوں پہ پٹی باندھ کر غلط دوا پلا دی۔ وقت زیادہ گذر چکا تھا، اور زہر اپنا اثر کر گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بے چارا ماہیٔ بے آب کی مانند تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

جب اس کی موت کی خبر اسکول میں پہونچی تو کلاس کو پڑھاتے پڑھاتے آپا حُسنہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُن کی پلکوں کے جھالروں پہ آنسوؤں کے موتی لرزنے لگے، اور انہوں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا: "ہائے اللہ! میرا بھائی مظفر مر گیا.... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط چنانچہ اسی وقت اسکول میں چھٹی کر دی گئی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا سگا بھائی فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا چھٹی تو لازماً ہونی ہی تھی۔

کاتبِ تقدیر نے یقیناً آج کے دن اُس کی موت لکھ رکھی تھی، ورنہ — ورنہ اگر وہ آج حسبِ معمول آپا حُسنہ کے ساتھ اسکول چلا آیا ہوتا، تو اس کے ساتھ یہ حادثہ تو پیش نہ آتا۔ صبح اسکول آتے سمے حکیم جی نے آپا سے کیسا پکا وعدہ کیا تھا، نگرانی رکھنے کا، کہتے تھے:

"حُسنہ بیٹی! مظفر کو ہر روز اسکول لے جانا اچھا نہیں۔ وہاں چھوٹی بڑی سبھی لڑکیاں تو پڑھنے آتی ہیں، اور تم جانو یہ رہا بے چارا جھوٹا الو، اس کیا خبر کس وقت کیا کر گذرے۔"

اور حکیم جی کا یہ اندازہ تھا بھی حقیقت پر مبنی : مظفر جب اسکول میں آتا تو عجیب و غریب حرکتیں کرتا۔ آپا حسنہ اسے اسکول کے لان میں نیم کی چھاؤں میں بٹھا کر مائی رحمت، چپراسن کو اس کا دھیان رکھنے کی ہدایت کر دیتیں۔ اس کے باوجود وہ شرارتوں اور حماقتوں سے باز نہ آتا۔ اگر کوئی بچی قریب ہی لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر پانی پینے یا ہاتھ دھونے آتی تو وہ بندر کی طرح اچھل کر اس کے پاس پہونچ جاتا اور کبھی اُسے گدگدی کرتا اور کبھی چٹکیاں لیتا۔ اسی واسطے اسکول کی اکثر کم سن لڑکیاں اس کو دیکھتے ہی خوف سے رو دیتی تھیں، اور حتی الامکان نلکے پر جانے سے احتراز کرتی تھیں۔

وہ پیدائشی طور پر مخبوط الحواس تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو اسے مرگی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ اس کے باپ حکیم جی خود طبیب حاذق تھے اور اسی محلے میں مطلب کرتے تھے۔ دو چار سال تک خود ہی اس کا علاج معالجہ کرتے رہے۔ مگر جب کامیابی حاصل نہ ہوئی تو انگریزی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ لیکن خدا کی قدرت کئی ڈاکٹروں کا علاج کرانے کے باوجود مظفر ٹھیک نہ ہو سکا۔ حکیم جی باپ تھے، مایوس ہونے کے بعد بھی مایوس نہ ہوئے اور بدستور ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔

موت کے وقت اس کی عمر اُنیس برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ گورا تھا، لیکن چہرے کے نقوش مسلسل دورے پڑنے کی وجہ سے کسی قدر ٹیڑھے ہو چکے تھے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بیماری کے باوجود بظاہر اس کی صحت اچھی خاصی تھی۔ کسرتی جسم، پانچ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا قد، اور موٹی کھُردری ڈرا دینے والی آواز، جیسے پہاڑی کوؤں کی کائیں کائیں۔

اصولاً تو آپا حُسنہ کو اُسے اسکول میں لانے کا کوئی حق نہ تھا، لیکن آخر اس کی سگی بہن تھیں، دل میں چھوٹے بھائی کا درد تھا، اور پھر وہ اس پرائیوٹ اسکول کی ہیڈ مسٹرس بلکہ مالکہ بھی تھیں۔ البتہ انہوں نے آٹھویں جماعت کی لڑکیوں کو خصوصیت کے ساتھ سمجھا رکھا تھا کہ وہ ادھر نہ جائیں، جہاں مظفر ہوتا ہے ـــــ مگر اتفاق کی بات ہے کہ آٹھویں جماعت ہی کی بعض شوخ لڑکیوں اور پگلے مظفر میں عموماً نوک جھونک رہتی تھی۔

مثال کے طور پر اگر سعیدہ اس کے پاس سے گذری ہے تو یا تو جاتے جاتے اسے سر یا کمر میں دھپ رسید کر جائے گی یا دور ہی سے دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر "ٹھلّا" دکھا دے گی۔

یا مثلاً اگر شگفتہ کو آپا حُسنہ نے مائی رحمت کو بُلانے کے لئے بھیجا ہے تو وہ جان بوجھ کر اُسے ایک آدھ ٹھوکر لگا دے گی، خواہ اس کے نتیجہ میں اسے مظفر کی واہی تباہی ہی سننی پڑے۔

اکثر یوں ہوا کہ مائی رحمت یا خود مظفر ہی نے آپا جی سے شکایت کی، فلاں لڑکی نے اس کے بال نوچے ہیں، اور آپا نے اس لڑکی کو بلا کر سخت سُست بھی کہا ـــــ مگر یہ ساری باتیں محض وقتی تھیں۔ لڑکیاں بھلا کہاں چوکنے والی تھیں۔ فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتیں :

"آپا جی! خدا کی قسم اس نے مجھے بڑی گندی گالیاں نکالی تھیں"

یا ـــــ

"آپا جی! اس نے میری چوٹی اتنے زور سے کھینچی تھی کہ ـــــ"

یا عموماً وہ مائی رحمت کو پہلے ہی سے بہلا پھسلا کر اور منت سماجت کر کے اپنے ساتھ گانٹھ لیتیں اور آپا حسنہ کے سامنے بالکل مکر جاتیں :

"ہائے آپا جی! میں مظفر کو کیوں مارتی ۔۔۔ نہ ۔۔۔ نہ (کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے) بھلا اس بے چارے نے میرا کیا بگاڑا ہے ۔ نہیں آپا جی اس کو دھوکا ہوا ہے کسی اور نے چھیڑا ہوگا ۔"

کئی دن تو مظفر لڑکیوں کے ہاتھوں پٹتا رہا اور "آں ۔۔۔ آوں" کر کے بڑی آپا سے شکایتیں کرتا رہا، مگر جب اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو اس نے بھی از خود لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ۔۔۔

کبھی کسی کو مغلظات سُنا رہا ہے تو کبھی لنگور کی طرح اچھل کر کسی لڑکی کے گال نوچ لئے ۔ اور اگر تین چار لڑکیوں نے ایک ساتھ حملہ بول دیا تو وہ کپڑے اُتارنے شروع کر دیتا ۔ بس یہ اس کا آخری حربہ تھا، جس کے نتیجے میں لڑکیوں کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا، اور وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ جاتیں ۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ آٹھویں جماعت کا معاشرتی علوم کا پیریڈ تھا ۔ مگر مس نسرین کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے کلاس نہ لگی ۔ کچھ لڑکیاں ریکریشن روم میں جا کر کیرم بورڈ وغیرہ کھیلنے لگیں ۔ اور کچھ اپنے کمرے میں بیٹھی اسکول کا کام کرتی رہیں ۔ شگفتہ، سعیدہ اور شبنم لان میں آ نکلیں اور پمپ پر منہ ہاتھ دھونے لگیں ۔ ان سے چند قدموں کے فاصلہ پر مظفر نیم کی گھنی چھاؤں میں ایک چٹائی پر لیٹا ہوا تھا ۔ اس وقت مائی رحمت وہاں موجود نہ تھی ۔

"شگفتہ ۔۔۔ دیکھو، وہ سُور کیسے مزے سے سو رہا ہے ۔" شبنم نے مظفر کی طرف اشارہ کر کے کہا: "جیسے یہ مدرسہ نہیں اس کے باپ کا گھر ہے ۔"

شگفتہ آسمان کی طرف منہ کئے غرارے کی "گڑ گڑ ۔۔۔ گڑ گڑ" سی آواز نکال رہی تھی، کلی کرتے ہوئے بولی: "ہاں کمینے نے پرسوں کس بری طرح میری ٹانگ کھینچ لی تھی ۔ میں منہ کے بل گرتے گرتے بچی ۔ خبیث نہ ہو تو!"

"چلو اس کم بخت پر پانی پھینکیں ۔"

سعیدہ نے تجویز کیا، اور منہ میں بہت سارا پانی بھر لیا ۔

شگفتہ اور شبنم بھی کلے پھلا کر مظفر کی سمت لپکیں ۔

سب سے پہلے شگفتہ نے اس کے قریب جا کر "پچ" سے اس پر کلی کر دی ۔

وہ سچ مچ سو رہا تھا ۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ۔ جیسے کوئی بچہ خواب میں ایک دم سے ڈر جاتا ہے ۔ اس سمے اس نے نیلی دھاریوں کے پاجامے پر ہلکے فاختئی رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی ۔ جو پانی سے بھیگ گئی ۔ اس کا چہرہ بھی پانی کے چھینٹوں کی زد میں آ گیا ۔

اور جونہی وہ چونک کر اُٹھا، شبنم اپنا منہ خالی کر رہی تھی ۔ کچھ پانی چٹائی پر نیچے گر گیا، اور کچھ مظفر کے سر اور گردن کی پشت پر ۔

مظفر نے تیزی سے گھوم کر شبنم کو کمر سے دبوچ لیا ۔ اور پھر "آں ۔۔۔ آں ۔۔۔ کنجری!" کہتے ہوئے اس نے اُسے دو تین چکر دیئے اور ایک جھٹکے کے ساتھ پرے دھکیل دیا ۔

اسی اثنا میں سعیدہ نے جلدی میں کلی کرنے کے بجائے پانی نگلتے ہوئے مظفر کی کمر پر ایک دوہتڑ دیا: "بہت کمینے کہیں کے!" وہ بولی، اور اس سے پیشتر کہ دوسرا وار کرتی اُس کی چٹیا مظفر کے ہاتھ میں تھی ۔

"چھوڑ مجھ کو — چھوڑ" اس نے دھمکی دی "نہیں تو میں آپا جی کو بتا دوں گی"

"بتا دینا — بے شک اپنی ماں کو — میں' میں" مظفر نے درد سے دوہرا ہوتے ہوئے کہا: "میں نہیں چھوڑوں گا سُؤر کی بچی!" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی بے باکی کے ساتھ ایک ہاتھ سے سعیدہ کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو نوچنے لگا — اس پر شبنم اور شگفتہ دونوں اس پر بیک وقت پل پڑیں۔ ایک کے ہاتھ میں اس کے بال آگئے، اور دوسری سعیدہ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

اس ہاتھا پائی میں ان تینوں نے مل کر اس بے چارے کا بُرا حال کر دیا۔ بدن پر لمبے لمبے ناخنوں سے چٹکیاں لیں۔ کان اینٹھے اور مکوں کی بارش کر دی۔ وہ مدافعت میں ہاتھ پاؤں مارنے کے علاوہ انہیں گندی گندی صلواتیں بھی سُنا رہا تھا۔

اسی وقت مائی رحمت آ گئی۔ اور اس نے آتے ہی دھمکی دی، "ٹھیرو میں تمہیں اُستانی جی کے پاس لے کر چلتی ہوں۔ تم نے کیا دوچ رصح کا مجاق بنا رکھا ہے"

"ہم آرام سے نل پر کھڑی پانی پی رہی تھیں، اس نے ہمیں پتھر کیوں مارا ہے؟" سعیدہ نے فوراً ایک بہانہ تراش لیا۔ "ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ بے شرم کہیں کا!"

"مگر بی بی یہ تو ابھی سو رہا تھا۔ میں اسے سوتا چھوڑ کر گئی تھی" مائی رحمت بولی۔

"مکر مار کے سو یا ہوگا" شبنم نے جواز پیش کیا۔

"تم نے مجھ پر پانی کیوں گرایا ہے؟" مظفر نے غصہ کی جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم جو ہمیں پتھر مار رہے تھے" شگفتہ نے تنک کر جواب دیا۔

"اچھا — اچھا — چلو" مائی نے جھگڑا چکانے کے سے انداز میں کہا۔ "اب تو میں اُستانی جی سے نہیں کہتی اگر پھر شرارت کی تو ضرور شکایت لگا دوں گی"

اور پھر وہ مظفر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئی، "چل بیٹا کوئی بات نہیں۔ تمہاری بہنیں ہی تو ہیں۔ تم بھی تو جا رہیں لڑنے لگے ہو"

مگر یہ واقعہ کل کا تھا، آج کا نہیں۔ آج تو وہ اسکول بھی نہ آیا تھا۔ اور — اور ایک دم سے بن بتائے اُس نے کبھی اسکول نہ آنے کی قسم کھا کر ایک لمبی چُپ سادھ لی تھی۔ وہ مر گیا تھا۔

جب یہ خبر مائی رحمت نے آپا حُسنہ کو سُنائی، وہ اس وقت آٹھویں جماعت کو انگریزی پڑھا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے کتاب پھڑپھڑاتی ہوئی نیچے گر پڑی، اور انہوں نے ایک چیخ مار کر بڑے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا:

"ہائے اللہ! میرا بھائی مظفر مر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا ......" اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک ریلا آیا اور پلکوں کی فصیل پھاند کر رخسار پر بہہ نکلا۔

اسی وقت ایک لمبی گھنٹی بجا کر اسکول میں چھٹی کر دی گئی۔ اور آپا حُسنہ اسٹاف روم میں چلی گئیں۔ جہاں دوسری

ستانیاں بھی جمع ہو رہی تھیں۔

آپا حسنہ کے کلاس روم سے نکلتے ہی شگفتہ نے سعیدہ کی آستین کھینچتے ہوئے بڑے مسرور انداز میں کہا:

"اری سعیدہ! مظفر مر گیا"

سعیدہ کی آنکھوں میں خوشی — ایک ان جانی سی خوشی — کا کوندا لپکا اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے:

"خس کم جہاں پاک!"

اتنے میں کلاس منتشر ہونے لگی، اور لڑکیاں اپنے اپنے بستے اٹھائے کمرے سے باہر جانے لگیں۔ سعیدہ اور شبنم اور ناہید پچھلے بینچوں سے اٹھ کر شگفتہ اور سعیدہ کی جانب بڑھیں۔ کمرے کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور نیم تاریک، نیم روشن فضا میں شبنم کا قہقہہ چھن سے بکھر گیا:

"ہاہا — وہ مر گیا — سنتی ہو سعیدہ — شگفتہ!"

"ہاں — چلو جان چھوٹی اس بدمعاش سے" شگفتہ نے جواب دیا: "ہمیں کتنا تنگ کرتا تھا۔ ایسوں کو تو موت ہی آجانی چاہئے۔"

"میرا جسم اب تک دکھ رہا ہے" سعیدہ نے کہا: "اُلو کے پٹھے نے مسل ہی تو ڈالا تھا کل۔ وحشی کہیں کا۔ میں تو کہتی ہوں اُس نے بیماری کا صرف ڈھونگ رچایا ہوا تھا۔"

"نہیں —" ناہید نے اُسے ٹوکا: "یہ تو نہ کہو سعیدہ! کئی بار تو اُسے ہمارے سامنے اسکول ہی میں مرگی کے دورے پڑے ہیں۔ اُف توبہ! کتنی بری حالت ہوتی تھی۔ سارا جسم برسات میں بھیگی ہوئی چارپائی کی طرح اکڑ جاتا تھا، اور منہ سے جھاگ آنے لگتا تھا۔" یہ کہتے کہتے وہ کانپ اٹھی، اور اُس نے کانوں کی لوئیں چھوتے ہوئے بات جاری رکھی: "اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا، ورنہ میری امی تو مجھے اسکول ہی بدلوا رہی تھیں۔"

اس پر شبنم اور سعیدہ نے بیک وقت ایک قہقہہ مارا۔ سعیدہ بولی: "اگر تم یہ اسکول چھوڑ دیتیں تو اس کم بخت کا کیا بگڑ جاتا؟ کسی نہ کسی کو تو اُسے تنگ کرنا ہی تھا۔ تمہیں نہ سہی۔ تمہاری کسی اور بہن کو۔" ایک اور چھناکے دار قہقہہ کمرے میں گونج پیدا کرتا ہوا باہر کی فضاؤں میں روپوش ہو گیا۔

شبنم اپنی ران مسلتے ہوئے بولی: "سوؤر کے بچے نے ایسی زور کی چٹکی لی تھی کہ اب تک ٹیس نہیں گئی۔ میں نے گھر جا کر دیکھا، اچھا خاصا نشان پڑ گیا ہے۔ میرا تو انا اللہ بھی پڑھنے کو جی نہیں چاہتا اُس شہدے کی موت پر۔"

"اور ہمارا کون سا جی چاہتا ہے" شگفتہ نے گرہ لگائی، اور پھر ایک دم اس نے سنجیدگی سے پوچھا، "کیا خیال ہے آپا جی کے گھر افسوس کرنے چلیں کہ نہیں؟"

"میں تو تھوکتی بھی نہیں" سعیدہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں — وہاں جانے میں کیا ہرج ہے؟" ناہید نے رائے دی: "ہمیں کون سا اُس مردے کی خاطر جانا ہے۔ ہو سکتا ہے اور لڑکیاں بھی وہاں جائیں۔ اگر ہم نہ گئے تو آپا جی دل میں کیا کہیں گی — چلو کچھ دیر کے لئے ہو آئیں — پھر وہیں سے اپنے

اپنے گھر چلے جائیں گی "

"اچھا تو چلو — آپا جی کا گھر یہاں سے کون سا دور ہے بمشکل سے دس پندرہ منٹ کا راستہ تو ہے" سعیدہ نے آمادگی ظاہر کی اور نقاب کھول کے پہننے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کلاس روم کے باہر تھیں۔

آپا حسنہ کے گھر کے باہر دیوار کے سائے میں چند کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ غمزدہ لہجے میں اظہار افسوس کر رہے تھے۔

جونہی وہ اس چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئیں جو آپا حسنہ کے گھر کے باہر کے دروازے اور دالان کو باہم ملاتی تھی انہیں حکیم جی اندر سے آتے ہوئے ملے۔ اس وقت انہوں نے سفید شلوار قمیص اور کالی اچکن پہنی ہوئی تھی۔ اور وہ معمول سے زیادہ کمزور اور بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی خشخشی داڑھی اور سر کے بالوں کا رنگ کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔

"حکیم جی۔ السلام علیکم!"

"حکیم جی۔ آداب عرض!"

وہ انہیں دیکھ کر ادب سے جھک گئیں۔

"جیتی رہو بیٹی — جیتی رہو!" حکیم جی نے درد بھری آواز میں دھیرے سے جواب دیا اور باہر نکل گئے۔

صحن میں عورتوں اور بچوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں بہت سی عورتیں ایک دائرے کی شکل بنائے کھڑی تھیں۔ اور آپا حسنہ کے رونے کی آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے، ٹوٹے ٹوٹے اور ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھیں:

"ہائے رے میرے بے وفا بھائی۔ تم ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔ چپ کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں — کیا ہو گیا ہے تمہیں — ہائے میرے خداوندا — میرا مظفر!"

"چپ بھی کرا بیب حسنہ بیٹی —" مجمع میں سے کسی بڑی بوڑھی خاتون نے اسے دلاسا دیا۔ صبر کرو — صبر، خدا صبر کرنے والوں کا بہتر ساتھی ہے"

برآمدے سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں محلے کی چند معزز عورتیں بیٹھی تھیں۔ یہ چاروں سہیلیاں سیدھی اندر چلی گئیں، کمرے کے بیچوں بیچ یا در چن کرمیاں فرشی دری پر سہمی ہوئی سی اکڑوں بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو چکا تھا۔

"ہائے میں پاپی — بدنصیبوں جلی — مجھے پتہ ہوتا بی بی جی، تو میں کلیجے کو اس معصوم کو مالش کی دعا پلا دیتی۔ ہائے وہ میرے بیٹوں جیسا بیٹا، بے چارہ پہلے ہی کتنا مظلوم تھا۔ اس پر ایک اور ظلم ہو گیا"

کمرے میں بیٹھی دو تین عورتوں کی سسکیاں نکل گئیں۔

ایک عورت نے دوپٹے سے اپنی آنکھوں کے کونوں میں اترتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بڑی دردمندی سے کہا "نہیں ماسی! اس میں تیرا کیا قصور ہے۔ خدا تعالیٰ کو ہی ایسا منظور تھا"

"شبنم — تجھے رونا نہیں آتا؟ بڑی بے جگر دل ہو۔" شگفتہ نے اُسے کہنی مار کر آہستہ سے کہا، اور اپنے دوپٹے کو ٹھونک ٹھونک کر گالوں پر ملنے لگی۔

"میرے حصے کا تم جو رو رہی ہو۔" شبنم نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"میں کیوں روؤں، اس مسٹنڈے کی خاطر —" شگفتہ کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے جلدی سے منہ میں نقاب ٹھونس لیا، اور اس سے پہلے کہ کمرے میں عورتیں اس کی طرف دیکھتیں، وہ کمرے سے باہر نکل گئی —

سعیدہ نے ناہید کی پسلی میں ایک چٹکی لی اور اُسے باہر گھسیٹتے ہوئے بولی:

"آؤ — آؤ — باہر صحن میں چلیں۔"

شبنم اور ناہید بھی اس کے پیچھے لپکیں۔

جب وہ برآمدے سے گذر کر دالان میں لگے ہوئے جامن کے پیڑ کی چھاؤں تک پہنچیں تو ان چاروں کی ہنسی پیٹ میں بل پیدا کر رہی تھی۔

سعیدہ نے منہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے ہنس ہنس کر اور رک رک کر کہا:

"میں تو شکر کرتی ہوں، اس موئے سے نجات ملی۔"

اتنے میں اُن کے قریب سے مائی رحمت گذری۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک خالی جگ تھا، اور نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔

"مائی کدھر جا رہی ہو؟" ناہید نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے۔ تم کب آئی ہو؟" مائی انہیں دیکھ کر رک گئی۔ "بی بی جی سے ملی ہو؟"

"نہیں —" شگفتہ نے جواب دیا۔

"وہ سامنے تو کھڑی ہیں برآمدے میں — آؤ میرے ساتھ۔" رحمت نے قدم اُٹھایا

"نہیں مائی — رہنے دو — ہم پھر مل لیں گے۔" سعیدہ نے بھی منہ سے نقاب نکال لیا۔

"اب ملنے میں کیا ہرج ہے؟ اُن سے افسوس کرنا تو ضروری ہے — چلو آؤ شاباش!" — اور پھر وہ چاروں یکلخت سنجیدہ ہو کر مائی کے ساتھ چلنے لگیں۔

برآمدے میں ستون کے پاس، جہاں مظفر کی لاش دھری تھی، اور اس کے اردگرد عورتیں جمع تھیں، ایک عورت آپا حسنہ کے شانوں پر ہاتھ رکھے انہیں تسلی دے رہی تھی:

"ہوش کرو، حسنہ — ہوش کرو — اتنا مت روؤ! ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، آگے یا پیچھے۔"

اور آپا حسنہ رو رو کر شکستہ حال ہو چکی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں غم کی لال لال ڈوریاں تن گئی تھیں، اور رخسار سُوج کر دہکتے انگارے ہو رہے تھے۔

"آپا جی — ہمیں بڑا افسوس ہے!" ناہید نے قریب ہو کر مردہ سی آواز میں اظہارِ افسوس کیا۔ "اللہ مظفر کو جنت نصیب کرے!"

شگفتہ، شبنم اور سعیدہ چپ چاپ، اُداسی کی تصویریں بنی کھڑی تھیں۔

آپا حُسنہ نے ایک نگاہ اُن کی جانب دیکھا اور پھر آنکھیں پونچھتے ہوئے ایسے بولیں جیسے اُن کے گلے میں خار دار جھاڑی پھنسی ہو۔ اور اُن کی آواز اس میں اُلجھ اُلجھ کر باہر نکل رہی ہو۔

"ٹھیک ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا — لیکن آہ! مظفر میرا اکلوتا بھائی تھا"

اور اُن کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسوؤں کا جھونکا آیا جسے انہوں نے پلکوں کی بارہ دری تک پہنچنے سے پہلے ہی دوپٹہ میں جذب کر لیا۔ اُن کے خشک ہونٹوں میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی۔ مگر وہ جی کڑا کرکے بولیں: "دیکھو گی مظفر کو۔ روز دیکھا کرتی ہو۔ آج پھر دیکھ لو۔ آج تو اُس کی اور ہی شان ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے شبنم کا ہاتھ پکڑ لیا، اور آنکھ کے اشارے سے باقی تینوں کو ساتھ لے، وہ عورتوں کے مجمع میں گھس گئیں

دائرے کے بیچوں بیچ ایک چارپائی بچھی تھی، اور اس پر مظفر بے حس و حرکت چت لیٹا تھا۔ اُس کا پورا بدن سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا — صرف چہرہ تکیہ پر ایک طرف کو لڑھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا گورا رنگ زردی مائل ہو چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، جیسے بغیر ٹوٹے بادام! ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، جیسے سوکھے ہوئے چھوہارے! — آہ۔ اب وہ کتنے اطمینان سے سو رہا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کی گہری اور پرسکون نیند — اب اُسے دنیا کے تمام آلام اور مصائب سے چھٹکارا حاصل ہو چکا تھا۔ مرگی کے دورے اب اس کے لئے بالکل بے ضرر تھے۔ اور اسکول کی جوان جوان لڑکیوں سے ہنسی ٹھٹھول اور عشق و عاشقی اب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی — موت کا بھاری بھرکم ہاتھ اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ اور وہ خاموش، مطمئن اور گہری نیند سو رہا تھا!

"اچھا آپا جی، اب ہمیں اجازت دیجئے"

شبنم نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مہرِ سکوت توڑی۔

"ٹھہرو گی نہیں — ؟" آپا حُسنہ نے کھوئی کھوئی نظروں سے پوچھا: "کیا موت کی پرچھائیاں دیکھ کر ڈر گئی ہو — ؟"

"نہیں — نہیں — آپا جی! ڈری تو نہیں..... مگر..... مگر گھر سے دیر ہو رہی ہے۔ کیوں شگفتہ؟" شبنم نے ٹھہر ٹھہر کر، اٹک اٹک کر جواب دیا، اور شگفتہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں — اب ہمیں اجازت ہی دیجئے، آپا جی!" شگفتہ اور سعیدہ بیک زبان بولیں۔

"گھر سے دیر تو نہیں ہو رہی، کیونکہ آج چھٹی جلدی ہو گئی ہے — بہرحال تم — تم جا سکتی ہو" آپا حُسنہ نے اُنہیں اجازت دے دی: "اور ہاں کل اسکول بند رہے گا — پرسوں آنا"

پھر وہ چاروں آپا جی کو بڑے ادب سے اور غم آلود انداز میں سلام کرکے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی میں پہونچ گئیں۔ گلی اس وقت بالکل خالی تھی، اور گھر سے باہر بیٹھے ماتم کروں کی آوازیں، سرگوشیاں سی محسوس ہو رہی تھیں — ناہید گلی کے وسط میں پہونچ کر ایک دم رک گئی، اور پھر اس نے سعیدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"سعیدہ! موت کتنی ہیبت ناک ہے اور پرسکون بھی — ....."

"ہاں اتنی ہیبت ناک اور پُرسکون جیسے — جیسے....."

سعیدہ سلطانہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر موت کی وضاحت کرنا چاہی۔ مگر وہ ایسا نہ کرسکی۔ اور موت کی وضاحت ادھوری ہی رہ گئی۔ البتہ اُسی لمحے اُس کی زبان سے یہ چند الفاظ بے اختیاری طور پر یوں گر پڑے جس طرح پکا ہوا پھل درخت کی شاخ سے خود بخود ٹوٹ کر نیچے گر پڑتا ہے ....

"اب ہمیں مظفر بڑا یاد آیا کرے گا"

"یا اللہ! اُس کی روح پر رحم کرنا!"

اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو پلکوں کا بند توڑ کر باہر امڈ پڑے۔

اور جونہی اُس نے نقاب کے پلو سے اُنہیں صاف کیا، اُس نے دیکھا کہ شگفتہ، ناہید اور شبنم کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اور اُن کی بغلوں میں دبے ہوئے بستے جسم کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی سسکیوں کے ہلکوروں پر کشتیوں کی طرح کانپ رہے تھے۔

نعیم آروی

گرتی دیواریں

شام ہوئی، دھند ہوئی، رات ہوئی تاریکی ہوئی!

دیئے کی روشنی میں جب رام نرائن نے بھات کھانا بلکہ نگلنا شروع کیا تو رکمنی کے چہرے پر جیسے دیوالی کی روشنی پھوٹ پڑی۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے رام نرائن کو بھات کھاتے دیکھتی رہی۔ کمرے کے طاق پر جلتا ہوا دیا ہلکی ہلکی روشنی دیتا رہا۔

اُوسارے کی چارپائی پر لکھن اور بیراج سو رہے تھے۔ بیراج کی عمر یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی، اور لکھن آٹھ برس کا تھا۔ دونوں صبح ہی صبح رام نرائن کا ہاتھ بٹانے مولا باغ چلے جاتے اور رنگ برنگے اُودے، نیلے، ہرے، کاسنی اور سُرخ پھولوں کو پتیوں سمیت توڑ توڑ کر بابا کے سچھے میں پھینکتے جاتے۔ اور ہولے ہولے لتا منگیشکر کے گیت گُن گُناتے جاتے تھے۔

"کاہے کو منوا میں آگ لگائے رے سنوریا"

رام نرائن ان کے گیت کے بول سن سُن کر بڑا حیران ہوتا تھا۔ کبھی وہ بھی لکھن اور بیراج ہی کی طرح نو عمر اور ناتجربہ کار تھا۔

پربھات پھیری کے سمے وہ اپنے بابا بدری ناتھ کے ساتھ چارپائی چھوڑ دیتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ اُٹھتے۔ محلے کے نل کے نیچے وہ ایک چادر لپیٹ کر بیٹھ جاتا۔ بدری نرائن خوب رگڑ رگڑ کر اس کے بدن کی صفائی کرتا، اور پیتل کے برتن کی طرح اس کے جسم کو چمکا دیتا تھا۔ پھر وہ دونوں منہ میں گنگا جل ڈال کر پربھات پھیری کے دوسرے چکر میں شریک ہو جاتے تھے۔ پھٹتے پھٹتے وہ مولا باغ پہونچتے، اور سُورج کی پہلی روپہلی کرن کے ساتھ ہی وہ گھر کے دوارے پر قدم رکھتے۔ پیر دھو کر باپ بیٹا رسوئی گھر میں گھس کر ناشتہ کرنے لگتے۔

اتنے میں بدری نرائن کی بیوی موتیا، جوہی اور چمیلی کے ہار گوندھ لیتی۔ باسی گجرے رات بھر پانی کے چھینٹا دے اگر تازہ نہ رہتے تو مرتے بھی نہ تھے۔ اُدھر بدری نرائن موتی، چمپا اور جوہیا کے ہار سمیٹ کر اپنی دوکان پر پہونچتا تو کیلی چک کی تانگی اور پیاری پیاری دھوپ میں پیتل کی تھالی کی طرح جگ مگ کرتی رہتی۔

اس تمام عرصے میں رام نرائن رمائن کی چوپائیاں گنگناتا رہتا یا پھر ــ "بھجو رام، سیتا رام، راجا رام" ــ کے ورد میں مصروف رہتا ــ اُس کے منہ سے کبھی کسی بازاری گیت کے بول نہ نکلتے۔ کیونکہ ریڈیو اور بائیسکوپ تو بہت بعد کی ایجادیں تھیں۔ البتہ اس کی جوانی تک نوٹنکی اور بنارس کے بھانڈوں کا بڑا شور تھا۔ مگر ان دونوں کا تجربہ کرنا تو الگ رہا، ان کے متعلق سوچنا بھی وہ مہا پاپ سمجھتا تھا۔ کیونکہ بدری نرائن کی بے پناہ محبت اور کڑی نگرانی نے اسے اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی اور آزادی سے غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور اگر کبھی اُس نے جان بوجھ کر سوچنے کی کوشش بھی کی تو ذہن آپ ہی آپ ان سے ہٹ کر مولا باغ کے پھولوں کی جھاڑیوں میں اُلجھ کر ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ وہ جب کچھ سیانا ہوا اور مسیں کچھ کچھ بھیگیں تو ایک روز بدری نرائن نے اُسے اُوسارے میں بٹھا کر کہا:

" ببوا ناچ، نوٹنکی، تاڑی اور دارو سب اُن کے چونچلے ہیں جن کے پاس دھن ہے۔ اور جن کی ساری زندگی استیہ اور انیائے میں گزرتی ہے۔ ہمارے پاس نہ تو دھن ہے اور نہ ہماری زندگی استیہ اور انیائے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ہم سیدھے سادے منش ہیں۔ اور ہمیں سیدھی سادی زندگی بسر کرنی چاہیئے ــ پھول ہمیشہ شاخوں پر اچھے لگتے ہیں یا پھر شیو کے چرنوں میں۔ رنڈی کے کوٹھے پر پہونچنے کے بعد ان کی شوبھا ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تمہیں اس عمر میں دارو اور نوٹنکی کے چسکے لگ گئے تو جوانی رنڈی کے کوٹھے پر ہی ختم ہوگی۔"

بدری نرائن نے زندگی میں پہلی مرتبہ رام نرائن سے اتنے کھُل کر گفتگو کی تھی۔ خود رام نرائن حیران تھا کہ بابا کو کیا ہوا جو آج ایسی کھُلی کھُلی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ اُن کے منہ سے تو وہ آج تک گنوتی ستیا کی ستیہ اور پاک دامنی کے چرچے سُنتا آیا تھا ــ سو لیلائیں رچانے والے، گوکل کے نٹ کھٹ گوالے کنہیا کی شرارتیں، کانوں کے رستے جسم کے انگ انگ میں امرت گھولتی رہی تھیں۔ سورداس، بھگت کبیر، میرا بائی کی بھگتی اور قربانیوں کی رچنائیں پڑھ پڑھ کر اُس نے صرف ایک ہی بات سیکھی تھی ــ

"ستیہ صرف نرائن ہی کے ساتھ ہے۔"

مگر بدری نرائن آج ان تمام باتوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ عجیب عجیب چھکا دینے والی باتیں کر رہا تھا۔

بدری نرائن جب تمام باتیں کہہ چکا تو اپنے لاڈلے کے چہرے کی جانب دیکھ کر دو چار لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے بولا ــ

"ببوا کبھی ہم بھی تمہاری عمر کے تھے۔ اس عمر میں خواہ مخواہ کے اَن جانے، اَن دیکھے روگ لگ جاتے ہیں۔ بڑی ظالم عمر ہوتی ہے۔ اسی لیے آج ایسی باتیں جو میں نے برسوں سے چھُپا کر رکھی تھیں، کہہ سُنائیں۔ کہیں ایسا نہیں کہ تم بھٹک کر اندھے راستے پر لگ جاؤ ــ جس کی منزل بجلی چوک کی اندھی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔"

بدری ناتھ تھا تو مالی۔ گوپالی کنوئیں کے قریب ہی بجلی چوک پر پھولوں کی ایک دُکان تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ برسوں کی دکانداری نے اُسے بڑا تجربہ کار اور سیانا بنا دیا تھا ــ رات گذرتی اور جب کوٹھوں پر طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار کی ملی جلی آوازوں میں شہر کی مایۂ ناز طوائف سبز رنگ کی سُریلی آواز میں گیت کے بول گونجتے تو بڑی دیر تک واہ ــ واہ کا شور بپا رہتا۔

"لپٹ رہتی راجا تورے بنگلے سے"

وہ سالہا سال سے اس گیت کے بول سنتا چلا آرہا تھا، اور سالہا سال سے وہ ایک ہی تماشہ بھی دیکھتا چلا آرہا تھا۔ واہ واہ کے شور میں نوٹوں کی بارش ہوتی۔ پھر اس شور میں کسی کی جیب خالی ہو جاتی۔ اور جب اس کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تو بلاوجہ شور مچا کر اپنی پشیمانی چھپانے کی کوشش کرتا ۔۔ سنجوگ، حسین اور کافرادا سنجوگ جو ہر سال پھاگن اور بسنت میں راجواڑوں سے لاکھ دولا کو سمیٹ لاتی تھی، زیادہ دیر تک خالی خولی شور برداشت نہ کرتی، اور اس کے ایک ہلکے سے اشارے پر لوگ اسے اٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیتے ۔۔ سیڑھیوں کی تاریکی میں الجھتا ہوا نشے میں دھت وہ قلابازیاں کھا کر سیدھے بدری نرائن کی دکان کے سامنے دھڑام سے گرتا ۔۔ اور گھنٹے دو گھنٹے نالی کے قریب پڑا قے کرتا رہتا اور اٹھ کر جھومتا جھامتا کسی طرف نکل جاتا۔

یہ روز کا تماشہ تھا جسے بدری نرائن بڑی بیگانگی اور اجنبیت سے دیکھتا اور ٹھہر ٹھہر کر پھولوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگتا تھا ۔۔ وہ اکثر نالی کے قریب پڑی ہوئی اجنبی صورت میں اپنے جوان بیٹے رام نرائن کی شبیہہ تلاش کرنے لگتا اور پریشان بیاکل من سے ہرے رام ہرے رام کی جاپ شروع کر دیتا تھا۔

ایک روز کھری چارپائی پر پڑے ہوئے بیٹے کی جوانی کو دیکھا تو گھبرا گیا ۔۔ اس سے رہا نہ گیا۔ رام نرائن جاگا تو اس کے سامنے نصیحتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے سمجھایا بھی کہ "جوان بیٹے کے سامنے ایسی ویسی باتیں کر کے کھلا ہمیں لجا نہیں آتی" مگر اس نے اپنی بیوی کو بھی ایک ہلکی سی بحث کر کے چپ کرا دیا۔

رام نرائن نے عمر کی پندرہویں منزل میں قدم رکھا تو بدری نرائن نے ایک مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کی شادی کر دی۔

گونا کے دن جب وہ اپنی دلہن کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو کچھ دوستوں نے شادی کی خوشی میں نوٹنکی دیکھنے کی دعوت دی، بلکہ اصرار کر کے اسے ساتھ لے گئے۔

نوٹنکی اس کی زندگی کا پہلا اور ناقابل بیان تجربہ تھا۔ اسٹیج کی بھرپور روشنی میں جب ایک کامنی سی چھوکری بار بار اپنی کمر کو دائرے میں گردش دیتی ہوئی جھٹکے پر جھٹکا دیتی تو رام نرائن کے جسم کا جوڑ جوڑ انگڑائی لینے لگتا، اور بدن کا سارا خون کنپٹیوں میں سمٹ کر شوں ۔۔ شوں بولنے لگتا تھا ۔۔

نوٹنکی کا شو ختم ہوا تو اس نے دل ہی دل میں سوچا:

"اچھا ہی ہوا جو میں نوٹنکی نہیں دیکھ سکا تھا"

اس دن کے بعد سے اس نے کبھی نوٹنکی کی طرف رخ نہ کیا۔ اکثر اس کے دوست کھینچتے۔ مگر وہ ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا ۔۔

"کھیل تماشے جی کو ہلکا کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ من اور تن کو روگ لگانے کے لئے نہیں۔ میں نے تم لوگوں کے ساتھ زندگی میں ایک بار پاپ کیا تھا۔ اب دوبارہ وہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا ۔۔"

رام نرائن برج اور رکمنی کو پھول توڑتے ہوئے گنگناتے سنتا تو اس کا ماتھا ٹھنکنے لگتا۔

"کاہے کو منوا میں آگ لگائے رے سنوریا"۔۔۔ گیت کا بول رام نرائن کے لئے خطرے کی گھنٹی تھا۔ ٹھیک ایسی ہی گھنٹی اس وقت بھی بجی تھی جب بدری نرائن نے رام نرائن کے ننگے اور جوان جسم کو کھری چارپائی پر اوندھے سیدھے پڑا پایا تھا۔۔۔ رام نرائن کو اپنے بابا کی ساری نصیحتیں ایک دم سے یاد آگئیں۔ اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے سوچا: یہی وقت ہے جب اندھی اور منہ زور جوانی کو تجربے اور نصیحتوں کی لگام سے روکا جا سکتا ہے۔ اس نے جب اس سلسلے میں رکمنی سے مشورہ کیا تو وہ گھبرا کر بولی:

"ہے رام، ایسی باتیں تم اپنے بچوں سے کروگے۔ تمہیں شرم نہ آئے گی ایسی باتیں کرتے؟"

مگر رام نرائن نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"پگلی تو نہیں جانتی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ میری باتوں سے ان پر اچھا ہی اثر پڑے گا۔۔۔ اور پھر وہ یہ بھی جان لیں گے کہ میں ایسی ویسی باتیں پسند نہیں کرتا۔۔۔ بابا نے بھی اسی عمر میں مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں جنہیں سن کر میں بوکھلا گیا تھا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ان کی باتیں کتنی سچی تھیں۔۔۔"

مگر رکمنی نے رام نرائن کی باتوں سے اتفاق نہ کیا اور بولی: "سال دو سال ٹھہر جاؤ، جب وہ تمہاری باتیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے، پھر کر لینا۔۔۔"

رام نرائن رکمنی کی بات ٹالنا پسند نہ کرتا تھا، کیونکہ رکمنی اس کی دنیا کی واحد محبت، دلچسپی اور رنگینی تھی۔۔۔ اٹھارہ انیس سال کی رفاقت نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ وہ دونوں اپنا الگ الگ وجود بھول کر ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔

رکمنی کے انکار کے سبب بات رام نرائن کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی اور نصیحتوں کا پٹارہ کھلنے سے رہ گیا۔

رام نرائن نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔۔۔ "اچھا اگر تم کہتی ہو تو میں بات نہیں کرتا، مگر بنارس کے میلے سے لوٹنے کے بعد ان سے ضرور بات کروں گا۔۔۔"

"کر لینا"۔۔۔ رکمنی اندھیرے میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے نندیا سی آواز میں بولی، اور خاموش ہو گئی۔

بنارس کے میلے میں روانگی سے ایک روز قبل رام نرائن نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا۔۔۔ "تم دونوں اس گھر کے مان ہو۔ میرے یہاں نہ ہونے پر کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا کہ پرکھوں کی آتما بیاکل ہو جائے۔۔۔ اور ہاں رات دیر تک دکان کھلی نہ رکھنا۔۔۔ جلدی گھر چلے آیا کرنا۔۔۔ سمجھ گئے نا۔۔۔" رام نرائن تاکیداً یہ بات برج سے کہہ کر رکمنی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

رکمنی جلدی سے بولی۔۔۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم کاہے کو فکر کرتے ہو۔۔۔ دونوں سمجھدار ہیں، تم خیر سے جاؤ اور خیر سے گھر آؤ۔"

میلے میں رام نرائن کو توقع سے زیادہ دیر لگ گئی۔۔۔ بنارس کا میلہ ختم ہوا تو چند دنوں کے بعد سورج گرہن لگ گیا

گنگا اشنان کے لئے بنارس میں ہندوؤں کے ٹھٹ لگ گئے ۔۔۔ دوکان خوب چل رہی تھی - اس لئے رام نرائن کچھ عرصہ ٹھہر کر کے ٹھہر گیا ۔۔۔ میلے کا زور ٹوٹا اور ہجوم دھیرے دھیرے چھٹنے لگا تو اُس نے گنگا اشنان کیا اور چلنے کی تیاری کی'
اسی دن اُس کا ایک پُرانا دوست مل گیا - جو لنگوٹ کسے ، جسم پر بھبھوت ملے بیراگی بن گیا تھا -

اُس نے رام نرائن سے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا : " دنیا سوائے چھل کپٹ کے اور کچھ نہیں بھائی ۔۔۔ یہ آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہے سب دھوکا اور فریب ہے - کوئی باپ نہیں ، کوئی بھائی نہیں - کوئی رشتہ نہیں ۔۔ بھگوان کا رشتہ اٹوٹ ہے - بھگوان کی شکتی مہان ہے - گیان اور بھگوان ایک سچ ، ایک حقیقت کا نام ہے - جس کے پیچھے کوئی لالچ کوئی مکر ، کوئی استیہ نہیں ۔۔ میں نے دنیا تیاگ کر ایک سچ کو اپنا لیا ہے "

رام نرائن کو اُس کی باتوں سے بڑی روحانی اور سچی خوشی حاصل ہوئی - اسی کے کہنے پر وہ پریاگ کو ہو لیا اور وہاں سادھوؤں کی بھیڑ میں پندرہ بیس روز گذارنے کے بعد گھر واپس ہوا -

دوسرے دن صبح وہ مولا باغ جانے کے لئے اٹھا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ لکھن اور بیراج دونوں ٹانگ پر ٹانگ رکھے خراٹے لے رہے ہیں - گیانی کی باتیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں -

" یہاں کوئی باپ نہیں ۔۔۔ یہاں کوئی بیٹا نہیں ۔۔۔ کوئی بھائی نہیں ۔۔۔ سارے رشتے جھوٹے ہیں ۔۔۔ بھگوان کا رشتہ اٹوٹ ہے "

" ہاں دیکھو تو جوانی کے نشے میں اپنے باپ تک کو بھلا دیا دونوں نے " ۔۔۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اکیلے ہی مولا باغ کو روانہ ہو گیا ۔۔۔ مولا باغ سے لوٹ کر آیا جب بھی بیراج کو لیٹے ہوئے دیکھا ۔۔۔ اُسے اپنے بڑے لڑکے بیراج پر سخت غصہ آیا ۔۔۔ مگر غصے کو پی کر وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے بیراج کو جگانے لگا ۔۔۔ " اُٹھ نا بیراج ، دیکھ تو پیروں میں دھوپ آ گئی ہے - یہ وقت سونے کا نہیں کام کرنے کا ہوتا ہے - جاگ بھئی ۔ "

مگر بیراج نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدل لی ۔۔ " ہٹو بھی ۔۔ انگ انگ ٹوٹ رہا ہے - میں اتنی جلدی نہیں اٹھوں گا "
بیراج کی منہ زوری اور لہجے کی تلخی رام نرائن کے لئے ناقابل برداشت تھی - مگر وہ ضبط کئے رہا - اس نے پوری چارپائی پر بیراج کے جسم کو پھیلے ہوئے دیکھ کر سوچا ۔۔۔

" وہ اس سے کم تو نہ تھا - بلکہ آدھ ایک انچ پاؤں باہر ہی نکلتا تھا ۔۔۔ شریر میں بھی اس سے زیادہ جان تھی - مگر اس زبان میں کبھی اس نے اپنے باپ سے گفتگو نہ کی تھی ۔۔ وہ تو بدری نرائن کی آواز پر یوں جاگ اُٹھتا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو " وہ کچھ دیر گم سم بیراج کی چارپائی کی ادوائن پر بیٹھا حیرت اور خوف سے بیراج کو تکتا رہا ۔۔۔ " میرا لڑکا مجھ سے کتنا مختلف نکلا ۔۔۔ "

ناشتہ سے فارغ ہو کر جب وہ پھولوں کے ہار سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ رہا تھا تو بیراج کمرے کے سامنے سے گنگناتا ہوا گذرا ۔۔۔

" بھور بھئی لے وے پیا پردیسوا جیئے نا "
گیت کے بول سُن کر رام نرائن کا خون کھول اُٹھا ۔۔ وہ ٹوکری وہیں رکھ کر بڑے زور سے گرجا -

"ہیراج اس گھر رنڈی کا ناچ نہیں ہے ۔ رام نرائن کا ہے ۔ بدری نرائن کا ہے ، سمجھے نا ـــ آئندہ سے ایسے گیت گھر میں نہ [ہو ں گے] ـــ ہاں ـــ" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا ـــ اُس کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک گھر کے سناٹے میں [اُس] کی چیخ گونجتی رہی ۔ اس گھر میں پہلی بار ایک آدمی چیخا تھا ۔ اس کی آواز بڑی دلخراش اور ہیبت ناک تھی ۔ ہیراج لکھن [اور] رکمنی کو تو سانپ سونگھ گیا تھا ۔

اُس نے بڑی بے دلی سے دکان کھولی ۔ موتیا ، چمیلی کو گلاب اور ہار سنگھار سے الگ کر کے ایک طرف رکھ دیا ـــ دو چار [ہا]روں کو دوکان کے چھجے کی کھونٹیوں پر لٹکانے کے بعد خاموشی سے گدی پر بیٹھ گیا ، اور الکساہٹ میں گجرے کے [پھو]لوں پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگا ـــ

رہ رہ کر اس کی نظریں مغربی سمت اٹھتی تھیں ۔ شاید ہیراج بھاگتا ہوا آرہا ہو ـــ شاید وہ آ کر پیروں کو پکڑ لے اور [ک]ہہ دے ، بابا اب کی معاف کر دو ـــ آئندہ سے تمہارے مزاج کے خلاف ایک بات بھی نہ کروں گا ـــ انتظار ہی انتظار میں [دو]پہر ہوئی ، اور پھر شام کی خنک اور ٹھنڈی تاریکی بجلی چوک کی پتلی سی پکی سڑک پر اُتر آئی ۔ مگر ہیراج نہ آیا ـــ غصے اور [فکر] میں اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا ـــ کھانے کی پوٹلی پیتل کے چمچماتے برتن میں پڑی پڑی سوکھ گئی ـــ بجلی کی روشنی [جل]ی تو پورا بازار جگمگا اٹھا ـــ کوٹھوں پر سازندے سازوں کو درست کرنے لگے ـــ کبھی کبھی کسی ستار کے تاروں کی جھنجھناہٹ سے اس کا سر چکرا کر رہ جاتا ـــ اور اس کے تمام جسم میں چنگاریاں سی سلگ اٹھتی تھیں ـــ اس نے ایسا کبھی محسوس نہ کیا [تھ]ا ـــ رات کے پہلے پہر کا آغاز سنجوگ کے گیت سے ہوا ۔

"ابھی ابھی تو آئے ہو بہار بن کے چھائے ہو ۔
ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر ـــ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر

اس کی دوکان پر روز کی طرح کئی لوگ ہار خریدنے آئے مگر وہ مطلوبہ ہار کے بجائے الٹے سیدھے پھولوں کے ہار دیتا [ر]ہا ۔ اُس کی غائب الدماغی پر کئی لوگوں نے آوازیں بھی کسیں ۔ مگر وہ خاموشی سے پھبتیاں سہہ کر معذرت کر لیتا :

"بھیا معاف کر دیو ، طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے"

وہ جلد ہی دکان بند کر کے گھر روانہ ہو گیا ۔

گھر پر تو جیسے اماوس کی رات کی نحوست پھیلی تھی ۔ ہر طرف اُداسی ، ہر گوشے میں تاریکی ـــ سیڑھیوں پر اُس کے قدموں کی چاپ سن کر رکمنی دیا جلا کر خاموشی سے اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی ـــ رام نرائن نے پھولوں کی ٹوکری ایک طرف رکھ دی انگوچھا اتار کر الگنی پر ٹانگ دیا اور بنا ایک لفظ نکالے چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا ۔

رکمنی کو بیٹے کی بغاوت اور شوہر کے دکھ کا بڑا گہرا احساس تھا ۔ وہ برسوں سے اس گھر میں ایک شخص کی حکومت ، ایک روایت پسند انسان کی عملداری دیکھتی چلی آرہی تھی ۔ جس کے فیصلے کے سامنے گھر کا ایک ایک فرد بلا چون وچرا سر تسلیم خم کرتا آیا تھا ـــ رام نرائن سے پہلے اس گھر پر بدری ناتھ کی حکومت تھی ـــ بدری ناتھ سے پہلے اس گھر میں بدری نرائن کے پرکھوں کا راج تھا ـــ مگر اب ..... ہیراج کی ایک ذرا سی بغاوت ، معمولی سی حرکت سے روایت کا مضبوط قلعہ ڈانوا ڈول تھا ـــ قلعہ کی ایک ایک فصیل لرز رہی تھی ۔

رام نرائن نے سر اٹھا کر پوچھا : " لکھن کہاں ہے ؟ "

" سو رہا ہے " رکمنی کی آواز کالے کوسوں سے آئی تھی ۔

" اور بیراج ---؟ " رام نرائن کی آواز میں صدیوں کا دکھ اور بے چارگی تھی ۔

" ابھی تک نہیں آیا --- "

رام نرائن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا --- کروٹ بدل کر سو گیا --- سونے کا تو اس نے بہانہ کیا تھا ۔ بھلا آنکھوں میں نیند کہاں تھی --- نیند تو اسی دن آنکھوں سے اڑ گئی تھی جس دن اس نے بیراج کو ملایا راگ میں " کاہے کو منوا میں آگ لگائے رہے سنوریا " گنگناتے سنا تھا ۔ اب تو بیراج کی سنوریا کی لگائی ہوئی آگ میں اس کا تن بدن ہی نہیں کل اثاثہ بھی جل رہا تھا --- وہ بیراج کی موت ہنستے ہنستے برداشت کر لیتا مگر پورکھوں کے مان کی موت برداشت کرنے کا حوصلہ وہ اپنے میں نہیں پا رہا تھا ---

وہ رات بھر ننگی چارپائی پر پڑے پڑے ذہنی الاؤ کی تیز آنچ پر تڑپتا رہا --- یہاں تک کہ بھور ہو گئی ، اور منڈیر پر کوے کائیں کائیں کرنے لگے ۔ آنگن کے طاق پر رکھی ہوئی گنیش جی کی مورتی سورج اشنان کے لئے آنکھیں کھولے رام نرائن کی منتظر رہی ۔ مگر رام نرائن کو تن من کا ہوش ہی نہ تھا --- وہ چارپائی پر سیدھے سدھے پڑا کھپریل کی چھت کے بانسوں کو گنتا رہا --- پانی کے چھڑکاؤ کے بغیر رکمنی کے کمرے میں گجرے مرجھا گئے --- اور ران پر مکھیاں بھنبھنے لگی تھیں ۔

دن نکلا اور دھوپ آنگن میں گرنے لگی تو رکمنی رام نرائن کے قریب آکر بڑی ملائمت سے بولی :

" دوکان نہ جاؤگے ؟ "

" آں --- ہاں " --- کہہ کر وہ خاموشی سے اٹھا اور منہ دھونے چلا گیا ۔ منہ دھو کر ابھی وہ اپنے گمچھے سے ہاتھوں کو پونچھ ہی رہا تھا کہ لکھی نے کہا --- " بابا بیراج آیا ہے "

رام نرائن نے نگاہیں اٹھائیں تو سامنے سے بیراج چلا آتا تھا ۔ اس کے پیچھے پیچھے سادہ سے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک عورت بھی تھی --- رام نرائن کو محسوس ہوا جیسے آسمان اور زمین گردش میں آگئی ہے ۔ اس کا سر تیزی سے چکرایا --- اگر دیوار پکڑ نہ لیتا تو دھڑام سے فرش پر گرتا ۔

بیراج رام نرائن کے قریب آکر بولا --- " بابا --- یہ ساوتری ہے رام داس کی لڑکی --- رات میں اس کے گھر تھا --- میں اسے دھرم پتنی بنانا چاہتا ہوں --- تم سے اشیرباد لینے آیا ہوں "

رام نرائن سے کچھ کہتے بن نہ پڑا --- اس کی نظروں کے سامنے بس ایک ہی منظر تھا --- کیلاش کی سفید پوش چوٹیوں پر شبھو مرتیو (موت اور تباہی) رقص میں مست تھے ۔ ہر چیز الٹ رہی تھی ۔ ہر شے تلے اوپر گر رہی تھی ۔ ٹوٹ رہی تھی ۔ غرق ہو رہی تھی ۔ ختم ہو رہی تھی ۔

" بابا --- بابا --- میں جا رہا ہوں " بیراج کی آواز بہت دور سے سنائی دی --- وہ چونک پڑا --- بیراج اور ساوتری اشیرباد کا انتظار کئے بغیر باہر نکل رہے تھے --- !!

الیگزینڈر گرین
ترجمہ
سید رضا کاظمی

تصویر

(روسی کہانی)

الیگزینڈر گرین سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کی پہلی افسانوی تخلیق نے ہی جس کا عنوان "سرخ بادبان" تھا، ناقدوں کو چونکا دیا۔ اس کہانی کو فلمایا جا چکا ہے۔ اس کی دوسری مشہور کہانیوں کے عنوان "خوشنما دنیا" اور "لہروں پہ چلنے والے" ہیں۔ اس کی کہانیوں کے تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ عالمی جنگ کے دوران اُس نے متعدد کہانیاں جنگ کے پس منظر میں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ اس کے انداز تحریر کے متعلق روسی ادب کے ایک مشہور ناقد نے لکھا تھا کہ گرین عام اور معمولی واقعات میں سے غیر معمولی باتیں اخذ کرنے، زندگی کو رومان سے رنگین بنانے، اور روزمرہ کی زندگی کی خشک نثر سے وجدان و شاعری پیدا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی نظروں میں مرد وہ ہے جو طاقتور ہے۔ جس کا دل صاف ہے اور جو محبت کرنے والا ہے۔ اس کی کہانیوں میں اسی قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔ گرین کا انتقال سنہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ (مترجم)

جب کلیسن صبح سو کر اُٹھا تو وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ گذشتہ شام بیٹسی نے اُسے جو تلخ باتیں سُنائی تھیں، وہ ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بیٹسی نے اسے طعنہ دیا تھا کہ وہ نکما اور کاہل ہے اور بیوی کی آمدنی پر گذارہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے بہتر تو اس کا چھوٹا بھائی تھا جو اسٹیمر کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا!

سچ تو یہ ہے کہ خود کلیسن نے بھی کوئلہ جھونکنے والے کی حیثیت سے اسی اسٹیمر پر ملازمت حاصل کر لی تھی، لیکن اس نے جان بوجھ کر اسٹیشن پہونچنے میں دیر کر دی تھی تاکہ ٹرین چھوٹ جائے اور اسٹیمر اُسے لئے بغیر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو جائے۔

بیٹسی دھوبن تھی اور اس کی آمدنی کافی تھی۔ لیکن وہ شراب کی رسیا تھی، اور خود کلیسن اس کی ہمت افزائی کرتا رہتا تھا، کیونکہ نشہ کی حالت میں بیٹسی سے رقم حاصل کر لینا بڑا آسان ہوتا تھا!

کلیسن بستر پر لیٹا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج کیونکر پانچ شلنگ حاصل کر سکے گا۔ آج تعطیل تھی اور اس نے کل ہی ایک دوست سے فوکس بار میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

صبح کی خنک ہوا سے مکان کی کھڑکی پہ چڑھی ہوئی پھولوں کی لتا ہل رہی تھی۔ اس کے مکان کے سامنے لگی ہوئی جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اُن کے سفید و زرد پھولوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کلیسن نے تصور کیا کہ یہ پھول نہیں بلکہ چاندی اور سونے کے سکے ہیں۔ اُس نے انہیں گننا شروع کیا، اور چالیس تک گننے کے بعد اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی!

بیٹسی چائے دانی لئے ہوئے آئی اور میز پر ناشتہ لگانے لگی۔ کمرے میں صرف دو اسٹول، دو چارپائیاں اور ایک بیدکی کرسی تھی۔

ایک ہفتہ کا کوڑا کرکٹ دروازے کے پیچھے جمع ہو گیا تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹوں کے پاس روٹی کے سوکھے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ اور کمرے کے فرش پر کھیرے اور ناشپاتی کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی ٹوکری تھی جس میں میلے کپڑے جو دھلائی کے لئے آئے تھے رکھے تھے اور ان سے گندگی اور پسینہ کی ملی جلی بدبو اُٹھ رہی تھی۔

بیٹسی نے فرش پر پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتل کو زوردار ٹھوکر لگائی اور بوتل فرش پر لڑھکتی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر رُک گئی۔

کلیسن نے اندازہ لگا لیا کہ بیٹسی اس وقت بھی غصہ میں ہے۔ کلیسن کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے رات ہی کوشش کر کے بیٹسی سے رقم کیوں نہ حاصل کر لی۔

اُس نے اُٹھ کر منہ دھویا اور خاموشی سے کپڑے پہننے لگا۔

وہ سلسلۂ کلام شروع کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

دونوں خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے۔

جس وحشیانہ انداز میں بیٹسی نے اس کے ہاتھ سے چھری چھین کر ڈبل روٹی کاٹنا شروع کیا، اُس سے

کلیسن کو اندازہ ہوگیا کہ وہ ابھی تک اسٹیمر والی بات نہیں بھولی ہے۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ میں نے عمداً ٹرین چھوڑ دی؟" کلیسن نے دھیمے لہجے میں کہا: "سچ کہتا ہوں یہ محض اتفاق تھا۔ خیر۔ آج مجھے صرف ایک شلنگ دے دو۔"

"مجھ پر سارے جہان کی لعنت، اگر میں تمہیں ایک پنس بھی دوں۔" بٹسی نے انتہائی ترش لہجے میں کہا۔ "اس ہفتہ مجھے پانچ گھروں سے دھلائی کی رقم ملی ہے اور میں سب کی شراب پی جاتی گی بالکل تمہاری طرح گھر کے اخراجات سے بے نیاز ہوکر۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو غضبناک نظروں سے دیکھا اور پھر خاموش ہوگئے۔

چائے بھرا مگ ایک ہی گھونٹ میں خالی کرنے کے بعد کلیسن نے کہا: "آج کل تم بہت زیادہ پینے لگی ہو۔ کل تم نشہ میں دُھت ہوکر دوسرے کا قیمتی پیٹی کوٹ پہن کر اترا رہی تھیں۔"

"تو تمہیں کیا؟ میں اپنے پیسے کی شراب پیتی ہوں۔ خوب پیوں گی۔ لیکن تمہیں ایک پنس بھی نہ دوں گی' سمجھے ___؟"

ممکن تھا کہ دونوں ہاتھا پائی پر اُتر آتے کہ دفعتاً ایک پڑوسی نے کھڑکی کے قریب آکر بٹسی کو آواز دی، اور وہ کونے میں رکھی ہوئی میلے کپڑوں کی ٹوکری کو کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی کلیسن جھپٹ کر اپنی کرسی سے اُٹھا اور میلے کپڑوں کی ٹوکری کے قریب پہونچ گیا۔ اُس نے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈالا اور اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ چند لمحے بعد اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا ایک ڈبہ نکل آیا جس کے اندر بٹسی نے رقم چھپا رکھی تھی۔ کلیسن نے اس کے اندر سے چند سکے نکال لیے، اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپا لیے۔ اور کپڑوں کے ڈھیر کو برابر کرکے اپنی کرسی پر واپس آگیا۔

جب بٹسی کمرے میں واپس آئی تو اُس نے کلیسن کو گھور کر دیکھا، لیکن اسے کلیسن کی چوری کا کوئی شبہ نہ ہوا۔ وہ باہری کھڑکی کے پاس جاکر کمبل کو دھوپ دکھانے لگی۔

کلیسن دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا، اور مکان کی نیچی چہار دیواری پھلانگ کر باہر سڑک پر پہونچ گیا کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ بٹسی اس کا تعاقب نہیں کر رہی ہے وہ بس اسٹاپ کی جانب مڑگیا۔

بھری ہوئی بس میں بیٹھ کر کلیسن نے اطمینان کا سانس لیا!

شہر کے مرکزی علاقے میں بس سے اُتر کر اُس نے اپنی جیب سے پانچ شلنگ نکال کر انہیں پیار بھری نظروں سے دیکھا، اور فوکس بار کی سمت چل پڑا۔

سڑک پار کرتے ہوئے جب اُس نے دائیں جانب دیکھا تو چونک پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ بٹسی تیزی سے اُس کی جانب بڑھ رہی ہے۔

کلیسن گھبرا گیا۔ اُس میں ہمت نہ تھی کہ بٹسی کے سامنے اقبالِ جرم کرسکے۔ اُس نے دیکھا بٹسی راہ گیروں

کو دھکے دیتی، گاڑیوں سے بچتی کتراتی اس کی جانب بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اس نے بھاگنے میں عافیت جانی، اور تیزی سے قریبی گلی میں گھس گیا۔ اُسے اُمید تھی کہ گلی میں اسے چھپ جانے کے لئے کوئی موزوں جگہ ضرور مل جائے گی۔

جب اُسے اپنے قریب " ذلیل ناکارہ کُتے۔ تو مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا " کا جُملہ سُنائی دیا تو وہ دوڑنے لگا۔ اور تیزی سے گلی کے باہر نکل گیا۔ اگلی سڑک پر پہونچتے ہی اس کی نظریں ایک بلند عمارت کے بیچ سجائے پھاٹک پر پڑیں، جس پر رنگ برنگی جھنڈیوں کے درمیان ایک بورڈ لٹک رہا تھا۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں " تصویروں کی نمائش " لکھا ہوا تھا۔

کلیسن پھاٹک میں داخل ہوکر تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک موٹی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ جس نے کلیسن کو نمائش میں داخلے کا ٹکٹ لینے پر مجبور کیا۔ ٹکٹ کی رقم ادا کرتے ہوئے اُسے یک گونہ خوشی ہوئی کہ وہ بالآخر بیٹی کی رقم کا ایک حصہ خرچ کر دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے اس احساس سے بھی خوشی ہوئی کہ بیٹی اُسے بھیڑ میں گم کر چکی ہوگی، اور اس عمارت میں نہ پہونچ سکے گی۔

کلیسن ایک ہال میں داخل ہوا جس کی دیواروں پر متعدد تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ان تصویروں کو سرسری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے ان تصویروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو چند منٹ یہاں گذار کر اور یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ بیٹی اس کے تعاقب میں آگے نکل گئی ہوگی باہر نکل کر فوکس بار پہونچ جانا چاہتا تھا جہاں اس کا دوست یقیناً اس کا منتظر ہوگا!

اس نے ان لوگوں پر نظریں دوڑائیں جو ادھر اُدھر ٹولی کی شکل میں کھڑے ہوئے تصویروں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان پر تبصرے کر رہے تھے۔ دفعتاً اُسے ایک ٹولی میں بیٹی کا غصہ سے تمتایا ہوا چہرہ نظر آیا۔

بیٹی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ کلیسن کی جانب بڑھ رہی تھی۔ غالباً بیٹی کو ہال میں کلیسن کے علاوہ جس نے اُس کے پانچ شلنگ چرائے تھے اور کوئی نظر نہ آرہا تھا

" تو تم یہاں چھپے ہوئے ہو " بیٹی نے اُس کے قریب پہونچ کر کہا : باہر چلو تاکہ میں تم سے بات کرسکوں:

" خدا کے لئے یہاں شور نہ مچاؤ۔ یہ نمائش گاہ ہے۔ میں تو تصویریں دیکھنے آیا تھا۔ تم کب آئیں ؟ میں نے تمہیں بس میں نہیں دیکھا ؟ "

" مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہاری یہ کمینی حرکتیں کب تک . . . . . .

" میں تمہارا غلام نہیں ہوں " کلیسن نے اُس کی بات کاٹ کر کہا، اور تیزی سے قریب کھڑی ہوئی عورتوں مردوں کی ٹولی کی طرف بڑھ گیا۔

بیٹی بھی اُس کے پیچھے بڑھی۔ اور اُس کے قریب پہونچ کر دبی آواز میں اُسے گالیاں دینے لگی۔ کلیسن نے بھی اُسے گالیاں دیں

لیکن جب اُسے یہ احساس ہوا کہ لوگ اُن کی جانب دیکھ رہے ہیں، اور اُن کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ گھبرا گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ اور وہ ایک ٹولی سے دوسری ٹولی کی طرف بڑھنے لگا اور تصویروں کو دیکھنے لگا۔

بیٹسی بھی اُس کا پیچھا کرتی رہی!

کلیسن کوشش کرتا رہا کہ اُن تصویروں کے پاس جا کر کھڑا ہو جہاں زیادہ لوگ جمع تھے، تاکہ بیٹسی اسے گالیاں نہ دے سکے۔

لیکن بیٹسی اُس کا پیچھا کرتی رہی۔ اور دبی آواز میں "کمینے، نیچے، بدمعاش" کہتی رہی۔ اور ایک بار تو اُس نے ذرا اُونچے لہجے میں کہا:

"لاؤ میری رقم واپس کرو، ورنہ ......"

"چپ رہو، ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا" کلیسن نے چیخ کر کہا۔ اور بیٹسی اس خوف سے خاموش ہوگئی کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔

کلیسن آگے بڑھ کر ایک تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ بیٹسی بھی اُس کے قریب پہونچ کر کھڑی ہوگئی۔ تقریباً پندرہ آدمی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

تصویر میں سُرخ اینٹوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس کے سامنے پھولوں کی کیاریاں تھیں، اور جس کی کھڑکی پر سفید پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ مکان کے باہر ایک برآمدہ تھا، جس میں ایک خالی پنجرہ لٹک رہا تھا۔

یہ تمام چیزیں کلیسن کو مانوس اور جانی پہچانی نظر آئیں!

"یہ تو ہمارا ہی گھر معلوم ہوتا ہے" اُس نے آہستہ سے کہا۔ اُس کا لہجہ انتہائی مصالحانہ تھا۔

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئے" بیٹسی نے جواب دیا۔

لیکن بیٹسی نے جب تصویر کو کافی غور سے دیکھا تو اُسے بھی یہی گمان ہوا کہ یہ تصویر اُن کے اپنے مکان کی ہے اُسی منحوس مکان کی جس کے اندر سے اُس کی محنت مشقت کی کمائی کے پانچ شلنگ چرائے گئے ہیں۔

اُس نے کھڑکی، برآمدے میں پڑی ہوئی لکڑی کی ٹوٹی بنچ کو پہچان لیا۔ اُس نے برآمدے کے باہر اُس شاہ بلوط کے درخت کو بھی پہچان لیا جس کی شاخوں میں ڈوری باندھ کر وہ دُھلے ہوئے کپڑے خشک ہونے کے لئے پھیلایا کرتی تھی۔

جھاڑیوں کے درمیان کھلی ہوئی جگہ، مکان کی چھت کا اُکھڑا ہوا پلستر اور برآمدے میں لٹکا ہوا خالی پنجرہ یہ سب اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے تھے کہ یہ تصویر درحقیقت اس کے اپنے مکان کی ہے۔

حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دونوں اس تصویر پر تبصرہ کرنے لگے:

"وہ دیکھو، ہمارے کمرے کے کونے میں کوڑے کا ڈبہ بھی پڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

بیٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش تم نے ڈبے سے کوڑا نکال کر پھینک دیا ہوتا؟"

گلیسن نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

دونوں وہاں سے ہٹ کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اور دھیمے لہجے میں یہ طے کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ آخر اُن کے مکان کی تصویر کیونکر بنائی گئی۔ اور نمائش میں کیونکر پہونچی؟

گلیسن نے کہا:

"میرے خیال میں یہ پینٹنگ ہے۔"

"نہیں، اب مجھے یاد آیا۔ تقریباً دو ماہ قبل ایک آدمی ایک ڈبہ لئے ہوئے ہمارے مکان پر آیا تھا۔ اُس وقت میں نے اُس کی جانب کوئی دھیان نہ دیا تھا۔ کیونکہ اُن دنوں تم گھر سے غائب تھے۔ اور میں تمہاری تلاش میں پریشان تھی۔"

چند لمحے بعد دونوں دوبارہ اُس تصویر کے قریب پہونچے، جس نے اپنے سحر سے دونوں کے اختلافات کو وقتی طور پر ختم کر دیا تھا۔

تصویر کو دیکھتے ہوئے ایک خاتون نے کہا، "کتنا خوبصورت مکان ہے۔ کھڑکیوں پہ پھیلی ہوئی پھولوں کی بیل کتنی دلکش ہے!"

یہ سنتے ہی گلیسن اور بیٹی کے دل فخر و مسرت سے بھر گئے۔

لیکن فوراً ہی بیٹی کو اس خوف کا احساس ہوا کہ اگر یہ لوگ اس تصویر کو دیر تک غور سے دیکھتے رہے تو انہیں کمرے میں پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتلیں اور میلے کپڑوں کی ٹوکری بھی نظر آجائے گی۔

لیکن جلد ہی اُس کا خوف دور ہو گیا، اور وہ تصویر کی خوبصورتی اور اپنے مکان کی کھڑکیوں پر پھیلی ہوئی بیل کی دلکشی میں کھو گئی۔

دونوں کے سینے فخر سے پھول گئے!

بیٹی کے ذہن میں ایک تکلیف دہ خیال اُبھرا —— دو سال سے ہم اس خوبصورت مکان میں بطور کرایہ دار رہ رہے ہیں۔ کاش ہم اسے خرید سکتے۔ اور تصویر دیکھنے والوں کے سامنے فخر سے اعلان کر سکتے کہ اس خوبصورت مکان کے مالک ہم ہیں!

"میری تنخواہ اُس بدذات ریان سے زیادہ ہے" —— بیٹی نے کہا —— "اس لئے کہ میں اپنے کام میں دلچسپی لیتی ہوں، اور میرے تمام گاہک مجھ سے خوش ہیں۔ اس کے علاوہ میں کپڑوں میں سوڈا بھی نہیں ملاتی اور ان پر بڑی احتیاط سے استری کرتی ہوں —— خیر، اب تو تم نے پانچ شلنگ کما ہی لئے ہیں تو جاؤ، جاکر شراب پی لو۔ لیکن سب رقم خرچ نہ کر دینا۔"

"اور میں کل ہی جاکر ہابسن سے ملوں گا۔ اُس نے اپنی فیکٹری میں مجھے ملازمت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اُس نے مجھے ملازم نہ رکھا تو میں اسنیک کے کارخانے میں جاؤں گا"
کلیسن نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
"ہابسن صرف تمہیں ٹال رہا ہے۔ وہ کبھی ملازمت نہ دے گا" بیٹی نے کہا۔
"میں ابھی جاکر اس سے ملتا ہوں۔ میں اُسے بھی شراب نوشی کی دعوت دوں گا"
دونوں ہال سے باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر اُس تصویر کے قریب سے گذرے اور دونوں نے کنکھیوں سے اُس کی جانب دیکھا۔
سڑک پر پہونچ کر دونوں کو عجیب حیرت کا احساس ہوا کہ وہ دونوں اُسی مکان کو واپس جا رہے ہیں، جس کے بارے میں تصویر دیکھنے والے اجنبی لوگ اتنی اچھی باتیں کر رہے تھے !!

ابوالعلاء المعری
ترجمہ
ڈاکٹر سید محمد یوسف

عربی

ہار جیت

إن جارتِ الأمراءُ جاءَ مؤمّرٌ
أعتىٰ وأجورُ يستضيمُ ويكلمُ

اگر امرا ظلم کرتے ہیں تو ایک ایسا امیر مسلط ہو جاتا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر سرکش اور ظالم ہوتا ہے۔ وہ کچل ڈالتا ہے اور لہولہان کردیتا ہے

يتشبّهُ الطاغي بطاغٍ مثله
وأخو السعادة بينهم من يسلمُ

ایک متکبر اپنے جیسے دوسرے متکبر کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اور ایسوں کے درمیان جو سلامت رہ جائے وہ بڑا نیک بخت ہے۔

في الناسِ ذو حِلمٍ يُسفّهُ نفسه
كيما يُهاب وجاهلٌ يتحلّمُ

کچھ لوگ تو عقل کے قابو میں ہوتے ہیں لیکن وہ طیش کا مظاہرہ کرتے ہیں تاکہ ان کی ہیبت دلوں میں بیٹھ جائے اور کچھ لوگ بے لگام ہوتے ہوئے عقل و ضبط کا ادعا کرتے ہیں

وكلاهما تعِبٌ يُحاربُ شيمةً
غلبت فآضَ بحرّ بها يتألّمُ

دونوں ہی ہار جاتے ہیں وہ جبلی خصلتوں سے لڑتے ہیں جو غالب آجاتی ہیں اور ان کے خلاف لڑنے سے بجز تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

شوکت

ناظم حکمت
ترجمہ
محمد قاسم

ڈاکٹر تم نہیں جانتے

ڈاکٹر تم نہیں جانتے

کہ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے ؟

میں یہاں ہوں، لیکن میرے دل کا نصف حصہ چین میں ہے

اور اس کی دھڑکنیں

زرد دریا کے کنارے کنارے بڑھتی ہوئی افواج کے

قدموں کی چاپ سے ہم آہنگ ہیں

اور ڈاکٹر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں

کہ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی

میرا دل یونان میں پہونچ جاتا ہے

جہاں میرے عوام سینہ پر گولیاں کھا رہے ہیں

میلینے سارلیسکو
ترجمہ
خیرالنساء انصاری

رومانیہ

قطب نما

سمندر میں ایک دیو پیکر قطب نما ہے
جس کی مضطرب مچھلیوں کا رُخ
ہمیشہ شمال کی سمت رہتا ہے

ہر مچھلی کے مقدر میں ایک شمال ہے
وہ دوسروں پر اس کو تھوپنے کی کوشش کرتی ہے
اور ان کے شمال نگل لیتی ہے

کہا جاتا ہے کہ ایک دن ایک ایسا شمال مقرر ہوگا
جب تمام مچھلیاں ایک ہی سمت میں تیریں گی
ایک کے بعد ایک
اور سب کا رُخ اس شمال کی سمت ہوگا

پھر نہ کوئی جہاز راستہ بھٹکے گا
اور نہ گرداب کا دہن کبھی جہاز کو نگلے گا
تب اس قطب نما سے
زمین اپنی زندگی کا صحیح راستہ تلاش کرے گی

لوک گیت
ترجمہ
یونس احمر

بنگلہ

جھنڈا اُڑ رہا ہے

بھائی جائے جُودھے[1]	بھائی جنگ کرنے جا رہا ہے
اورے[2] تورا[3] پوتھے[4] دے	ارے راستہ چھوڑ دو
تلوار ہاتے دے	ہاتھ میں تلوار دے دو
تارموتو جو روڈور[5]	اس جیسا زور آور
نائی کیو[6]، نائی آر	اور کوئی نہیں، نہ ہے
ائی[7] اوڑے[8] جھانڈا[9]	یہ دیکھو جھنڈا اُڑ رہا ہے
دشمن کھٹانڈا	دشمن ٹھنڈا ہو گیا

---

[1] جودھیہ، یُدّھ: لڑائی
[2] پتھ، راستہ
[7] یہ
[4] ارے
[5] زور آور
[8] اُڑے
[3] تم
[6] کوئی
[9] جھنڈا

رُوداد نگار

غالبؔ اور آزادی

اردو مجلس کی ماہانہ نشست

۷ رجولائی سنہ ۱۹۶۷ء کو آغا افتخار حسین صاحب کی قیام گاہ پر اردو مجلس کی ماہانہ نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر ریاض الاسلام نے کی۔ افتخار احمد عدنی صاحب نے "غالب اور آزادی" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ نشست میں ان حضرات نے شرکت کی: ممتاز حسین، افتخار احمد عدنی، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر ریاض الاسلام، وقار احمد، صہبا لکھنوی، اشفاق نقوی، سحر انصاری، مسعود احمد برکاتی، آغا افتخار حسین، انجم اعظمی، عتیق احمد، قمر ہاشمی، میجر آفتاب حسن۔

مقالے پر بحث کی دعوت دیتے ہوئے ڈاکٹر ریاض الاسلام نے کہا کہ:

غالب کی شاعری میں آزادی کے تصور کو تلاش کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ فرد اور معاشرے کے تعلق کو سمجھنے کے لئے یہ ایک مناسب طریقہ ہے کہ شاعر کے کلام کی روشنی میں اسے دیکھا جائے۔

وقار احمد: دراصل اس مضمون میں آزادی سے زیادہ غالب کی آزادہ روی کا تذکرہ ہے، لیکن اس میں ان کی آزادہ روی کے محرکات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ نہیں بتایا گیا کہ اُن کے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں، انگریز کے تسلط اور غدر وغیرہ کا ان پر کیا ردِعمل ہوا۔ پھر اس میں اس پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے تھی کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ غالب کے یہاں کسی خیال کا کوئی باقاعدہ ارتقا ہوا

ہے، نہیں۔

نثار احمد فاروقی: مجھے غالب کے دیوان میں ایسے اشعار نظر نہیں آئے جن سے یہ پتہ چل سکتا کہ غالب کے یہاں آزادی کا کوئی باقاعدہ تصور تھا۔ بعض نقادوں نے کوشش کی ہے کہ غالب کی زندگی اور ان کے کلام سے تعلق کو ظاہر کریں۔ میں نے اکرام صاحب کی وہ کتاب نہیں دیکھی جس میں انہوں نے غالب کی زندگی کے ادوار کے متعلق ان کی غزلوں کا تعین کیا ہے۔

ممتاز حسین: غالب کے یہاں مروجہ اقدار اور مذہب کے خلاف ایک رجحان پایا جاتا ہے جو اس زمانے کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا ہے۔ اُن کی زندگی کے بعض ابتدائی واقعات اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ مذہب اور معاشرے کے بارے میں اُن کے خیالات کیا تھے۔ کلکتے کے قیام کے دوران انہوں نے انگریزوں کی تہذیب و ترقی کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ان کی تہذیب سے متاثر تھے، اور آئین اکبری کی تقریظ میں اس کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں راجا رام موہن رائے کی تحریک بھی زوروں پر تھی اور یہ ناممکن ہے کہ غالب اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ راجا رام فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے اور اُن کے خیالات غالب تک یقیناً پہونچے ہوں گے۔ غالب کے شاگردوں میں بہت سے انگریز مثلاً ایگزینڈر ہیڈرلی وغیرہ شامل تھے۔ غالب دہلی سوسائٹی کے ممبر تھے اور انہوں نے اس میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔ آخر میں وہ فری میسن سوسائٹی میں شامل ہوگئے تھے۔ ان واقعات کے پس منظر میں ان محرکات کا علم ہو سکتا ہے جو غالب کی فکر پر اثر انداز ہوئے۔

کرار حسین: غالب پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ رسمی مذہب یا معاشرے کی پابندیوں سے آزادی کی کوشش ہماری شاعری کی قدیم روایت ہے۔ مثلاً بیاباں میں جانا اور گریباں چاک کرنا ہماری شاعری میں آزادی کا سمبل بن چکا ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس کی کیا بنیاد ہے۔ معاشرے میں بہرحال پابندیاں ہوتی ہیں۔ ان کو توڑنے کی کوشش کیا صرف شاعرانہ مزاج کی خصوصیت ہے یا کچھ اور، غالب نے پرانے زمانے کی باتوں میں شدت پیدا کر دی ہے، اور طنز و مزاح نے اُسے شدید بنا دیا ہے۔ یہ سمجھنا کہ وہ ساری روایت سے ہٹا ہوا تھا اور وہ مغربی خیالات سے واقف تھا، کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جنت اور دوزخ کے سلسلے میں رابعہ بصری سے لے کر غالب تک ایک ردِ عمل ملتا ہے۔

ممتاز حسین: دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا — غالب نے یہ کہہ کر ثابت کر دیا کہ مذہب کا شعور ان میں موجود تھا، مگر وہ فقہ سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ وہ لا موجود الا اللہ کے قائل تھے۔ اور جنت اور دوزخ کے

بارے میں ان کا تاشاسی شعور کی بنیاد پر ہے۔ غالب کے سلسلے میں یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ ان سے پہلے فکر یا فلسفے یا آزادی کی روایت نہیں تھی۔ روایت کے بغیر تو شاعری بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن غالب نے اپنے وقت اور اپنے زمانے کے پس منظر میں روایتی خیالات کو ٹھوس شکل میں یعنی معاشرے سے ہم آہنگ بنا کر پیش کیا ہے۔

اشفاق نقوی: کرار صاحب کا زور روایت پر ہے، اور ممتاز صاحب کا غالب کے زمانے پر، میرا خیال یہ ہے کہ غالب نے جس قسم کی آزادی کا اظہار کیا وہ یقیناً انگریزوں کی آمد اور نئے معاشرے کے قیام کا نتیجہ تھی۔ قیامت، دوزخ اور خدا کے سلسلے میں ان کی SENSIBILITY پر ان کے حالات کا بڑا اثر پڑا۔

انجم اعظمی: غالب کے یہاں فرد کی آزادی کا تصور نہیں ہے بلکہ ایک شاعرانہ آزاد خیالی ہے جسے غالب کی آزادہ روی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مضمون میں غالب کا تصور آزادی نہیں بلکہ اُن کی آزادہ روی اور آزاد خیالی کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سحر انصاری: جنت اور دوزخ کے تصور پر غالب نے جو تنقید کی ہے یا اپنا فکری مسلک پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مذہب کے ادارے پر تنقید کی ہے۔ اس لحاظ سے جنت اور دوزخ کے بارے میں ان کا تصور اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ مجموعی طور پر اُن تمام افراد کے لئے ہے جو ان مسائل پر غور و خوض کرتے ہیں۔

وقار احمد: مجھے غالب کے یہاں ایک ایسی چیز نظر آتی ہے جو یورپ وغیرہ میں صدیوں کے عمل کے بعد آئی ہے یعنی SCEPTICISM — خواہ اس کا کوئی تعلق یورپ سے ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا شعور پہلی بار ہمیں غالب کے یہاں ملتا ہے۔ جس طرح والٹیر نے پرانی قدروں کو توڑ کر نئی قدروں کا تصور دیا، اسی طرح غالب کا عمومی رویہ یہ ہے کہ انہوں نے نئی قدروں کو قبول کیا حالانکہ اس زمانے میں مسلمان عام طور پر ہچکچاتے رہے۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام: جہاں تک میں سمجھتا ہوں چاہے جنت اور دوزخ کا تصور ہو خواہ خدا اور فرد کی آزادی کا تصور۔ غالب نے ہر معاملے میں روایتی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی شاعری اور نثر پر اس دور کا کوئی اثر نہیں ملتا ہے۔

ممتاز حسین: کم از کم غالب کے کلام سے تو یہ بات ظاہر نہیں ہوتی جو آپ نے کہی ہے غالب نے اس دور کی سائنسی ایجادات اور آئینی حکومت کا خیر مقدم کیا ہے۔ گویا نئی تہذیب کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور اس کا اثر اُن کی شاعری اور فکر پر یقیناً پڑا ہے۔

انجم اعظمی: نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے ،
یہ تصور اور یہ استعارہ گہرے شعور کے بغیر
ممکن نہیں ہے ۔

میجر آفتاب حسن : یہ تصور کہ سیاروں کی گردش
میں موسیقی پائی جاتی ہے ، بہت پرانا ہے
اور فیثا غورث نے اس پر خاصا اظہار
خیال کیا ہے ۔

عتیق احمد : جناب صدر ہم دیکھتے ہیں موجودہ دور
میں غالب ہر لمحہ جدید تر معلوم ہوتے ہیں
جب کہ اُن کے ہم عصر اپنی اہمیت کھوتے
جا رہے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ
انہوں نے بعض خیالات ایسے پیش کئے
کہ وہ اب تک تازہ ہیں ۔

آغا افتخار حسین : صاحب میرا اس سلسلے میں ذرا
مختلف نقطۂ نظر ہے ۔ میرے خیال میں
غالب کی عظمت کا راز غالباً یہ ہے کہ اُن
کا مبلغ علم نہایت محدود تھا ۔ میں سمجھتا
ہوں کہ انہوں نے انیسویں صدی کی
سائنس، فلسفہ یا سیاست کا باقاعدہ
مطالعہ نہیں کیا تھا ۔ اقبال کو دیکھئے ، کہ
ان کے پیش نظر بیسویں صدی کا تمام فلسفہ
اور ادب ہے ۔ اس لئے جب اقبال کوئی
بات فلسفے سے متعلق کہتے ہیں تو ہمیں حیرت
نہیں ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف غالب
جب کوئی فلسفیانہ بات کہتے ہیں تو ہمیں
حیرت ہوتی ہے اور ان کی عظمت محسوس
ہوتی ہے ۔ غالب کے یہاں علم کا
DISCIPLINE نہیں ملتا ، لیکن
ان میں INVENTIVENESS
کی صلاحیت بے پناہ تھی ۔ اس سے غالب
کی عظمت میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا ہے
انہوں نے اکتساب کے بجائے القا و وجدان
یا الہام وغیرہ سے کام لیا ہے منطق یا فلسفے
یا اور کسی علمی کتاب کا ذکر اُن کے خطوط میں
نہیں ملتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ
منطق اور فلسفے کی بعض اصطلاحی باتوں کو
نظم کر دیتے ہیں ، یہ ان کے ذہن رسا کی
دلیل ہے ۔

آغا افتخار حسین صاحب کی اس رائے سے بیشتر
شرکائے نشست کو اختلاف تھا ۔ چنانچہ اپنے اپنے انداز
میں سب اس رائے کے خلاف دلائل دیتے رہے ۔ لیکن
آغا صاحب کا مُوقف آخر تک یہی رہا ۔

اس بحث کے بعد نشست ختم ہوگئی ، اور طے
پایا کہ آئندہ نشست میں پروفیسر کرار حسین صاحب
آزادی کے تصور پر ایک مقالہ پڑھیں گے ۔

سحر انصاری
مسعود احمد برکاتی

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

جدید غزل

مصنف : رشید احمد صدیقی
ناشر : سرسید بک ڈپو۔ علی گڑھ-۲ (انڈیا)
صفحات : ۱۲۸ قیمت : ۲ روپیہ ۷۵ پیسے

رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے ہمیشہ یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ انہوں نے ادب اور زندگی کے معاملے میں بعض فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کئے ہیں۔ اور کسی دور میں بھی وہ ان فیصلوں کی حمایت اور پشت پناہی سے محترز نہیں ہوتے۔ علی گڑھ سے اُن کی محبت اب ایک روایت بن چکی ہے۔ اسی طرح غزل سے انہیں ایک خاص لگاؤ رہا ہے۔ یہ لگاؤ علمی اور جذباتی، دونوں پہلو رکھتا ہے۔ شاید اسی بنا پر رشید صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ غزل ہماری تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔ ہماری تہذیب کی آبرو ہے۔

رشید احمد صدیقی کی کتاب "جدید غزل" اُن کی ناقدانہ بصیرت اور غزل سے اُن کی بے پایاں دلچسپی کی ایک متوازن مثال ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسری کے منصب پر فائز ہونے کے بعد علی گڑھ کے ایک ادبی اجتماع میں ۲۶ راگست سنہ ۱۹۵۴ء کو پڑھا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس کی ابتدائی سطریں غزل کے سلسلے میں اُن کے موقف کے تعین میں بہت مدد دیتی ہیں:

"غزل جتنی بدنام ہے اُتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار

ایک دوسرے سے ملا ہے ۔"

ممکن ہے کسی کو رشید احمد صدیقی کے اس موقف سے اختلاف ہو، اور اختلاف کا حق بہرحال ہر شخص کو حاصل ہے ۔ تاہم اس حقیقت کی ہر شخص قدر کرے گا کہ رشید صاحب نے پورے 'CONVICTION' کے ساتھ اس صنفِ سخن کی حمایت کی ہے ۔

مقالے کے شروع میں غزل کی ہیئت اور لوازم سے مختصراً بحث کی گئی ہے ، اور ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو غزل پر عائد کئے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد جدید غزل کا تذکرہ ہے جس کا آغاز حالیؔ سے ہوتا ہے ۔ جدید غزل کے اہم شاعروں حالیؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، اقبالؔ اور فراقؔ کی غزل کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل نے جو رُخ اور رنگ و آہنگ اختیار کیا اس پر ایک خاص انداز سے بحث کی گئی ہے ۔ غزل سے محبت کے باوجود رشید صاحب غزل گو شعراء کی کوتاہیاں بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں ۔ فراقؔ اور فانیؔ کے سلسلے میں اُن کے اعتراضات بہت وقیع ہیں ۔ غزل کی تنقید کے ضمن میں انہوں نے تنقید نگاری کے اصولوں اور نقاد کے منصب پر بھی بہت مفید خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ جن کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ہمارے ناقدین کو اپنے ادب کی پرکھ کے لئے مستعار اصطلاحوں اور اجنبی لہجے سے کام لینے کے بجائے اپنے اصول خود مرتب کرنے چاہئیں ۔

رشید احمد صدیقی کی تحریر میں غزل کا سا تنوع اور ایجاز و اختصار ملتا ہے ۔ پھر سنجیدہ مزاح اور متانت آمیز طنز اُن کے اسلوب کو اور بھی دلکش اور دلپذیر بنا دیتا ہے ۔ وہ اس اسلوب کے ساتھ تنقید کو نکھارنا خوب جانتے ہیں ۔ انہوں نے تنقید کے جو اصول وضع کئے ہیں اُن میں سے ایک نمایاں یہ بھی ہے کہ تنقید کا مقصد تنقید برائے تنقید نہ ہو ۔ اسی لئے ہم ان کی تحریر میں فیشن ایبل نقادوں کا سا انداز نہیں پاتے بلکہ اُن کا ہر فقرہ ایک تہذیبی رچاؤ اور ہر لفظ گہری معنویت کا حامل ہوتا ہے ۔

اس مختصر سی کتاب میں بعض مباحث نہیں آ سکے ہیں ۔ جس کا اعتراف خود رشید صاحب نے ابتدائیہ میں کیا ہے ۔ لیکن جن مباحث کو شامل کیا گیا ہے ان کی روشنی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نے غزل کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس کی مثال اردو تنقید میں مشکل ہی سے ملتی ہے ۔
(سحر انصاری)

آدابِ اردو

مولف : حکیم گل چین کرنالی ۔
ناشر : اردو مشن، گلی پتراں والی، ملتان
صفحات : ۲۰۸　قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

اردو زبان، قواعد، املا، الفاظ، تراکیب، محاورات، مرادفات، تلمیحات، اور

اصطلاحات سے متعلق بہت سے مسائل پر اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:-

آداب کی بات، تلفظ کی غلطیاں، زبان کا تنقیدی جائزہ، غلط اور صحیح استعمال، واؤ عطف اور کسرۂ اضافت، روزمرہ اور محاورہ، زبر کی تنوین، بعض لفظوں کی نئی تحقیق، نئی اصطلاحیں۔

ہر باب میں متعدد ذیلی سرخیاں بھی ہیں، جن کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ ان سرخیوں کے تحت جناب گل جیبی نے اردو زبان کے صحیح استعمال، حفظِ معیار اور اس کی ترقی و اصلاح کے لئے جگہ جگہ سے پھول چن کر جمع کئے ہیں۔ آدابِ اردو میں تنقیدیں بھی ہیں اور تجویزیں بھی۔ فاضل مولف کی بعض تنقیدوں اور تجویزوں سے بہت سوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً 'تجویز کرنا' کے لئے 'تجویزنا'، 'پاک ہندی' کے لئے 'پاکندی'، 'عربی آمیز' کے لئے 'عربیلا' وغیرہ شاید ہی مقبول ہو سکیں۔ فاضل مولف نے بہت سے الفاظ کے غلط مفہوم یا غلط استعمال پر بڑی اچھی گرفت کی ہے۔ اور بعض مشہور شخصیتوں کی غلطی ہائے مضامین کی نشاندہی بھی کی ہے۔ بعض مروّج الفاظ کی جگہ نئے الفاظ بھی بتائے ہیں۔ مثلاً 'نام نہاد' کا استعمال بعض جگہ سخت معلوم ہوتا ہے، اس لئے جناب گل جیبی نے 'اصطلاحی' کا لفظ استعمال کیا ہے 'ادا' سے 'ادائی' بالکل اسی طرح صحیح ہے جس طرح 'رہا' سے 'رہائی' اور 'صفا' سے 'صفائی'۔ لیکن فاضل مولف نے ادائی کے بجائے 'ادائیگی' کی حمایت کی ہے۔ تاہم 'گی' کے اضافے کا جواز ثابت نہیں ہو سکا۔

اس مختصر کتاب میں جناب گل جیبی نے اردو کے اتنے مسائل کو سمیٹا اور اتنے الفاظ و محاورات پر بحث کی ہے کہ اس سے ان کی وسعتِ نظر اور تحقیق، تلاش اور جستجو کے ساتھ ساتھ اردو سے ان کی محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آدابِ اردو کا مطالعہ اردو کے طالب علموں، استادوں اور لکھنے والوں کے لئے خصوصاً بہت مفید ہوگا۔ کیونکہ آج کل صحتِ زبان سے بے اعتنائی کے نتیجے میں غلط زبان کا استعمال اور عجزِ بیان عام ہو گیا ہے۔

(مسعود احمد برکاتی)

"درد آشوب" پر تبصرہ

"افکار" کے شمارہ جون ۶۷ء میں احمد فراز کے مجموعۂ کلام "درد آشوب" پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ شمارہ جولائی ۶۷ء میں اس تبصرہ پر دو خطوط شائع کئے گئے اسی سلسلہ میں ابھی کچھ اور خطوط موصول ہوئے ہیں جو آئندہ شمارے میں پیش کئے جائیں گے

ادارۂ افکار

ص - ل

رفتارِ عالم

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

گذشتہ بیس سال میں اردو کی ترویج و ترقی پر دو کروڑ روپے خرچ کئے گئے ہیں

مغربی پاکستان میں متعدد ادارے مختلف موضوعات پر کام کر رہے ہیں

مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اردو کی ترقی پر جو رقم خرچ کی ہے وہ صوبائی حکومت کے سالانہ بجٹ کا ایک فی صد ہے

لاہور - مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی امداد سے جو ادارے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں اُن میں سرکاری زبان کی کمیٹی، اردو اکیڈیمی لاہور - اردو اکیڈیمی بہاولپور، مجلس ترقیٔ اردو لاہور - بزمِ اقبال لاہور، پاکستان رائٹرز گلڈ لاہور، پشاور یونیورسٹی - مرکزی ترقی اردو بورڈ لاہور - انجمن ترقی اردو کراچی، سندھ یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، زرعی یونیورسٹی لائل پور اور ترقیٔ اردو بورڈ کراچی قابلِ ذکر ہیں -

یہ ادارے مختلف موضوعات پر کتابوں کی ترتیب و تدوین، اصطلاحات کی تیاری، لغات کی تکمیل، سائنسی اور فنی موضوعات پر کتابوں کی تیاری اور نایاب کتب کی از سرِ نو ترتیب و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں - آزادی کے بعد سے اب تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اردو کی ترقی پر دو کروڑ روپے خرچ کئے ہیں جو صوبائی حکومت کے سالانہ بجٹ کا ایک فی صد ہوتا ہے۔ ان تمام اداروں میں کس حد تک باہمی ربط و تعلق ہے اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ بیس سال گذر جانے کے باوجود اردو کو تمام سرکاری اور تعلیمی اداروں میں وہ منصب نہیں مل سکا جس کی وہ مستحق تھی ـــ توقع ہے کہ موجودہ حکومت کی قومی زبان اردو سے خصوصی دلچسپی اور مندرجۂ بالا اداروں کی تشکیل کی

کارکردگی کے پیشِ نظر اردو مقررہ مدت سے پہلے ہی انگریزی کی جگہ لے سکے گی۔ اور اس طرح پاکستان کے عوام بھی اپنی قومی زبان پر فخر کر سکیں گے۔ انگریزی بلاشبہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس لیے علم و مطالعہ کے لئے اسے ضرور برقرار رکھنا چاہیئے، لیکن اُسے کسی طور بھی قومی زبان پر فوقیت نہیں دینا چاہیئے۔

اردو ناول اور افسانہ کے روسی ترجموں کے ساتھ ان ترجموں پر سویت تنقید کاروں کے اہم مضامین کی کتابیات بھی شامل ہے۔

ان مصنفین کے خیال میں ولی اورنگ آبادی، نظیر اکبر آبادی اور دوسرے ممتاز شعراء اور ادباء نے اپنے عہد کے عوام کی زندگی کا قریبی مطالعہ کیا ہے۔ اور

روس میں اردو ادب پر تحقیقی کام

ماسکو۔ گذشتہ چند برسوں میں روسی مترجمین نے اردو کی بعض بہت اہم تخلیقات کو سوویت یونین کے قارئین سے متعارف کرایا ہے اس وقت تک روسی زبان میں میرامن، میرزا غالب، پریم چند، علامہ اقبال، کرشن چندر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس اور اردو کے دوسرے ممتاز اہلِ قلم کی تصانیف کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

اہلِ قلم کی تخلیقات پر روسی مصنفین نے تحقیق اور تجزیے کے بعد متعدد اہم اور دلچسپ مقالات لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں نکولائی گلیبوف اور الکسی سخوچیف کا اردو پر تحقیقی کام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ سویت یونین کی تاریخ میں پہلی بار اردو کے عظیم ادب پر ابتداء سے عہدِ حاضر تک کی تاریخ کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ [illegible] از یں اس میں

حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے معاشرے کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ نکولائی گلیبوف اور الکسی سخوچیف نے دورِ حاضر کے جن ممتاز اردو شعراء اور ادباء کی تخلیقات پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا ہے ان میں کرشن چندر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، شوکت صدیقی، علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، ممتاز

بنگلہ اکیڈیمی نے ۱۶۵ مطبوعات شائع کیں

بنگلہ زبان و ادب کی ترقی کیلئے مزید ۲۵ لاکھ روپے کی امداد

ڈھاکہ۔ پتہ چلا ہے کہ بنگلہ اکیڈیمی مذہب، تاریخ، ادب، ثقافت اور فنون کے موضوعات پر اب تک ۱۶۵ کتابیں شائع کر چکی ہے۔ اور ۱۵۹ مسودات مختلف موضوعات پر اشاعت کے لئے تیار رہیں جن میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور دو ہزار صفحات پر مشتمل اردو بنگلہ لغت بھی شامل ہے۔

بنگلہ اکیڈیمی اب تک مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں سے ۵ ہزار سے زائد لوک کہانیاں اور لوک گیت جمع کر چکی ہے۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ بنگلہ زبان و ادب کی مزید ترویج و ترقی کے لئے حکومت نے ۲۵ لاکھ روپے منظور کئے ہیں۔

اور اونچا تھا شک قابل ذکر ہیں۔ کتاب کے مصنفین نے ان اہل قلم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان مصنفین نے اردو ادب میں نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے معاشرے کی خرابیوں پر صرف نشتر زنی نہیں کی بلکہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے لئے نئی زندگی کی تعمیر کا تصور بھی پیش کیا ہے۔

امریکی کالج میں لازمی اردو

نیویارک۔ امریکہ کی فورڈہم یونیورسٹی نے جولائی سے شروع ہونے والے تین سالہ تجرباتی کالج کے نصاب میں داخلہ لینے والے طلباء کے لئے اردو کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ نئے قائم شدہ کالج کے سربراہ ڈاکٹر الز بتھ سویل نے کہا ہے کہ مذکرہ کالج کے پانچ شعبوں کے ممبران کے ایک حالیہ اجلاس میں اس کا فیصلہ کیا گیا۔ داخلہ لینے والے طلباء سے انٹرویو کے دوران جب یہ شرط پیش کی گئی تو اس کا ردِ عمل بہت عمدہ ہوا۔

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

راولپنڈی۔ صدر ایوب کی خود نوشت سوانح عمری "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کا اردو ایڈیشن "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ اردو ایڈیشن کا نام علامہ اقبال کے شہرۂ آفاق شعر کے ایک مصرعہ پر رکھا گیا ہے۔ پورا شعر یوں ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس شائع کر رہا ہے، اور ۱۰ اگست سے پہلے یہ کتاب فروخت کے لئے مارکیٹ میں پیش کر دی جائے گی۔

مشہور بنگلہ ناول "لال شالو" انگریزی میں

لندن۔ سید ولی اللہ کے بنگلہ ناول "لال شالو" کا یونیسف کی نگرانی میں انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے جس کا انگریزی نام "Tree with out roots" رکھا گیا ہے۔ اس کا بنگالی زبان سے انگریزی ترجمہ جن حضرات نے کیا ہے اُن کے نام یہ ہیں: قیصر سعید، انامری تھائی بند، جیفری بائی جین اور ملک خیام ــ اسے برطانوی پبلشرز چٹو اینڈ ونڈس نے شائع کیا ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ مشہور ادیب یونس احمر "لال چادر" کے عنوان سے کر چکے ہیں۔

دو نئے شعری مجموعے
شہرِ درد اور سحر نغمہ

کراچی۔ اطلاع ملی ہے کہ اردو کی مشہور شاعرہ ادا جعفری کا دوسرا مجموعۂ کلام "شہر درد" کے عنوان سے مکتبۂ اشاعت گھر کراچی شائع کر رہا ہے۔ [illegible] کی ایک اطلاع سے پتہ چلا ہے کہ "زاویئے" مطبوعات اردو کے کہنہ مشق شاعر صمد رضوی ساز کا پہلا مجموعۂ کلام "سحر نغمہ" کے عنوان سے شائع کر رہا ہے۔

ڈراموں کی پانچ جلدیں زیر طبع ہیں

لاہور۔ بورڈ فار دی ایڈوانس منٹ آف لٹریچر کے زیر اہتمام مرتب ہونے والے اردو کلاسیکل ڈرامہ کی پانچ جلدیں زیر طبع ہیں، اور بہت جلد منظر عام پر آجائیں گی۔ اس کا انکشاف بورڈ کے ڈائرکٹر جناب سید امتیاز علی تاج نے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بورڈ کے ترتیب دیئے ہوئے اس پروگرام کی [illegible] کڑی ہے جس کے تحت تین جلدوں

پر مشتمل اردو کلاسیکل ڈرامہ کی انسائیکلو پیڈیا شائع کرنا ہے۔ جس میں سنہ ۱۸۵۰ء سے کر سنہ ۱۹۳۶ء تک کا ڈرامائی عہد اور اس کا ارتقا شامل ہوگا۔ اس انسائیکلو پیڈیا کا آغاز رہس، دریائے عشق اور اندر سبھا جیسے ڈراموں سے ہوا اختتام آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں پر ہوگا۔ سید امتیاز علی تاج نے توقع ظاہر کی کہ اس پروگرام کی تکمیل کے بعد نہ صرف یہ کہ محققین کو اس سے بہت مدد ملے گی بلکہ اردو ادب کے طلبا بھی اس سے استفادہ کرسکیں گے

نقش ہائے رنگ رنگ

لاڑکانہ۔ حلقۂ ادب لاڑکانہ نے لاڑکانہ کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ شہر کی ادبی تاریخ میں حلقۂ ادب نے یہ نئی روایت قائم کی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب کے لئے اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ مدیر ماہنامہ افکار صہبا لکھنوی نے اپنے خصوصی پیغام میں اس کوشش کو بہت سراہا ہے۔ وادیٔ مہران کے شاعر حسن حمیدی، محسن بھوپالی اور کراچی کے شاعر بہار کوٹی کا کلام بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

مصنفین کے لئے یونیسکو انعامات

کراچی ۱۶ رجون۔ سنہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کے دوران چھپی ہوئی اردو کی تین کتابوں پر یونیسکو انعامات دیئے گئے ہیں۔ یہ انعام چار سو ڈالر کی مالیت کا ہے۔ یہ انعامات دو سال میں ایک مرتبہ یونیسکو کی طرف سے مصنفین کو دیئے جاتے ہیں۔ انعامات حسب ذیل کتب پر دیئے گئے ہیں: (۱) الف لیلہ (آسان زبان میں تالیف شدہ) [illegible] پاکستان [illegible] کے

رسوم و رواج (مختلف فرقوں اور علاقوں کے رسوم و رواج پر ایک تحقیقی کتاب)، از شاہد حسین رزاقی۔ (۳) میلا نام منگو ہے (ناول بیگار کیمپ کے پس منظر میں)، از جبار توقیر۔ ججوں کی کمیٹی نے جس کے صدر جناب ممتاز حسن تھے اور جس میں جناب عبدالعزیز خالد، جناب ابراہیم جلیس، جناب سبط حسن اور جناب صہبا لکھنوی بحیثیت جج شامل تھے، مصنفوں کی خصوصی طور پر تعریف کی۔ نیشنل بک آف پاکستان نے حوصلہ افزائی کے طور پر ان دو کتابوں کے مصنفین کے لئے پانچ پانچ سو روپے کے انعامات کا اعلان کیا ہے۔ کتابیں حسب ذیل ہیں: (۱) ہماری پہیلیاں، از سید یوسف بخاری۔ (۲) بروہی کی لوک کہانیاں، از انور رومان۔ ان انعامات کا انتظام حکومت پاکستان کی طرف سے قومی کتاب مرکز کرتا ہے۔

نیپال کی لوک کہانیاں

کھٹمنڈو۔ محکمۂ ثقافت کے ایک ادبی تحقیقاتی ادارہ نے دو سو سے زیادہ نیپالی ضرب الامثال، لوک کہانیاں اور اصنامیاتی قصے جمع کئے ہیں جنہیں عنقریب کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

شیکسپیئر کو ۸۰ ممالک کا خراج عقیدت

لندن۔ گذشتہ دنوں مشہور ڈرامہ نویس شیکسپیئر کی ۴۰۳ ویں سالگرہ کی تقریب میں ان کے آبائی گاؤں میں ۸۰ ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی اور شیکسپیئر کے مجسمے پر پھول چڑھائے۔

مدیر و ناشر صہبا لکھنوی — طابع مشہور آفسٹ پریس کراچی — دفتر رابسن روڈ کراچی

مشروبِ مشرق کے رنگا رنگ استعمال

روح افزا عموماً شربت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن آپ اسے اور بھی کئی دلپسند چیزوں میں شامل کر کے ایک نیا لطف اور ایک نیا ذائقہ حاصل کر سکتے ہیں۔

روح افزا مشروبِ مشرق

روح افزا آئس کریم، ملک شیک، سوڈا، لسّی اور قلفی وغیرہ

آج کل ہر جگہ مقبولیت حاصل کر رہے ہیں

ہمدرد فروٹ پروڈکٹس لاہور۔کراچی

united

افکار

فیض نمبر

قیمت
۱۳ روپے
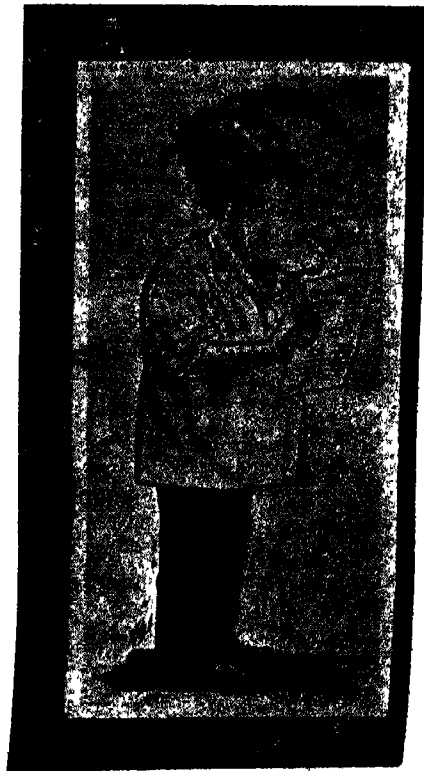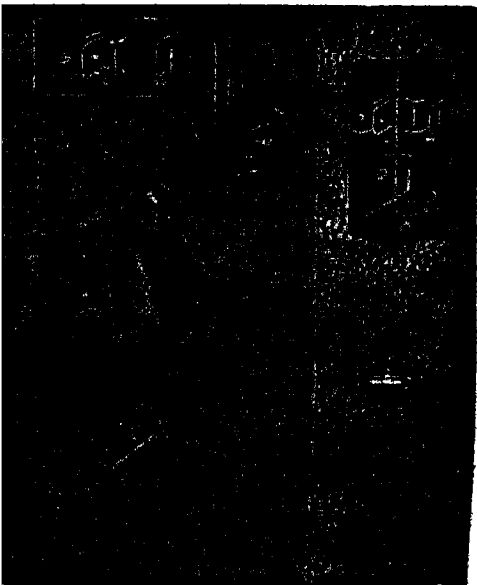
پی آئی اے

کی پروازیں

بنکاک
پیرس
استنبول
فرینکفرٹ
نیروبی
بغداد
روم

جاتی ہیں

ان کے علاوہ پی آئی اے کی پروازیں ، لندن - جنیوا - قاہرہ - بیروت - ماسکو - تہران - کویت - جدہ - دھران - دوحہ - دبئی - بحرین - کابل - کراچی - ڈھاکہ - کٹھمنڈو - رنگون - کینٹن - شنگھائی - کو بھی جاتی ہے۔

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی آئی اے آفس سے رجوع فرمائیں۔

PIA پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

جان بچی سو لاکھوں پائے!

قسمت نے آپ کا ساتھ دیا' ورنہ آپ تو جان پر کھیل ہی گئی تھیں۔ بغیر دیکھے بھالے سڑک کو دوڑ کر پار کرنے سے آپ نے نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔

احتیاط کیجئے۔ زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ اس کو لاپرواہی یا جلد بازی کی نذر نہ کیجئے۔

- جہاں کہیں ممکن ہو' فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے۔
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں' وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں۔
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھ لیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے۔
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے۔
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں' انتہائی محتاط رہئے۔

United

گلگت سے کاکس بازار تک...

... پاکستان کے گوشے گوشے میں
جہاں بھی آپ جائیں
پوسٹ آفس سیونگ بینک موجود ہے

پوسٹ آفس سیونگ بینک کی ۹۰۰ سے زیادہ شاخیں مشرقی اور مغربی پاکستان کے گوشے گوشے میں آپ کی خدمت کیلئے پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ دو روپے کی معمولی رقم سے اپنا حساب کھول سکتے ہیں یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے جمع شدہ رقوم پر شرح منافع بڑھانے کے علاوہ ڈیپازٹس کی حد بھی دگنی کر دی گئی ہے آج ہی اپنے قریبی ڈاک خانے میں حساب کھولئے۔

یہ پاکستان کا واحد بینک ہے جس کی ملک بھر میں ۹۰۰ سے زیادہ شاخیں ہیں۔

پوسٹ آفس سیونگ بینک

DFP 145

اور جنرل سیکنڈری ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون ۲۳۹۹۳۰

افکار

سال: ۲۳ ○ شمارہ: ۱۹۳

مدیر

صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ	بیرونی ممالک سے		قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ	۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

لندن آفس

۱۴ - پرنسیز ایونیو - لندن - این - ڈبلیو نمبر ۹

ستمبر ۱۹۶۷ء
تخلیقات

شمارے کی
تخلیقات
راست حاصل
گئی ہیں۔
بن نظم و نثر
اشاعت
ہے۔ کوئی
تحریری
کے بغیر
نہیں کی
سکتی

۱۵ ص.ل

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب
سید سبط حسن کی نئی کتاب

شہرِ نگاراں

حیدرآباد دکن کے حالیہ ماضی کی قدرہ تاریخ
بھی ہے اور سید سبط حسن کی سوانح کا ایک حصہ بھی

انہوں نے بے شمار واقعات اور یادیں
اس کتاب میں محفوظ کر دی ہیں جو ہماری
تاریخ اور تہذیب کی بعض اہم کڑیوں کو
ملا کر ہمارے شعور و علم میں اضافہ کرتی ہیں

سید سبط حسن کی لطیف، کیف پرور اور سحر آگیں
تحریر نے اس کتاب کو ایک جیتا جاگتا مرقع بنا دیا ہے

بہترین گیٹ اپ — متعدد تصاویر — سرورق: شاکر علی
صفحات: ۲۲۴ — قیمت — ۵ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ، کراچی

اردو - آزادی کے بیس سال بعد

بیس سال تک پاکستانی قوم کے باشعور افراد اس آسرے پر زندہ رہے، کہ آئینی طور پر اردو کو مغربی پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اور عنقریب اردو کو سرکاری دفاتر، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کی قومی زبان بنا دیا جائیگا لیکن اب آزادی کے بیس سال بعد اچانک یہ عقدہ کھلا کہ اردو کو نہ صرف یہ کہ اس کا جائز مقام نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس کا چہرہ مسخ کرنے اور اس کی بنیادی ساخت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو زبان کو جب ایک ملک گیر زبان کی حیثیت حاصل ہے تو اس کو تسلیم نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آفتاب نیمروز کی روشنی سے انکار کرنا۔

جب کسی زبان میں ضرورۃً کوئی تبدیلی کی جاتی ہے، تو اس کا ذمہ دار ماہر لسانیات کو بنایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ ریڈیو پاکستان نے مطلق العنان ادارے کی حیثیت سے اردو میں جن تبدیلیوں کا آغاز کیا ہے اُسے ملک کے کسی باشعور طبقے کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یک جہتی یا کسی اور نعرے کو سامنے رکھ کر کسی ایسی زبان کی روایت کو بدلنا جس نے مصنوعی نہیں بلکہ فطری انداز میں خود کو مستحکم کیا ہو۔ دانش مندی سے بعید ہے پھر خبروں میں "ریزولیوشن" اور "پریذیڈنٹ" جیسے انگریزی الفاظ کی شمولیت کا کیا جواز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہم دراصل کسی سائنسی بنیاد پر شروع نہیں کی گئی ہے بلکہ شروع کرنے والوں کے ذہن میں خود اس کا کوئی واضح تصور بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اردو ایسی ہمہ گیر زبان کے سلسلے میں کوئی "اجتہادی" قدم اٹھانے سے پہلے لسانیات کے ماہرین سے مشورہ لے لینا بہت ضروری ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ حکومت کے ارباب حل و عقد زبان کے سلسلے میں عوام کے جذبات کا احترام کریں گے اور ماہرین لسانیات کی کمیٹی بنا کر اس مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کر کے کوئی مناسب قدم اٹھائیں گے۔

انجم اعظمی

ایک زبان ۔ ایک تہذیب

علمِ لسانیات کی رُو سے زبان کے وجود میں آنے کے دو ہی اسباب ہیں۔
اوّل، آدمی میں اظہار کی صلاحیت۔
دوم، اظہار کی ضرورت۔

پہلا سبب اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان انسانی فطرت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ دوسرے سبب میں انسان اور انسان، انسان اور ماحول، انسان اور کائنات کے خارجی رشتے ملتے ہیں۔ انہیں رشتوں سے اظہار کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔

اگر ان دونوں اسباب کو ملا کر سوچا جائے تو بعض اہم حقائق سامنے آتے ہیں۔ اظہار کی ضرورت اور صلاحیت میں گہرے داخلی رشتہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کو داخلی رشتہ اس لئے کہا جائے گا کہ ضرورت کے احساس کے بعد ہی انسان کا ذہن اپنی اس فطرت سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ وہ اظہار کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ گویا ایک سبب دوسرے سبب کو روشنی میں لاتا ہے، اور آدمی کے لئے ادراک و انکشاف کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ اس بہانے ضرورت اور فطرت کے تعلق کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اپنی ضرورتوں کے مطابق وہ ساری صلاحیتیں میسّر ہیں جن سے کام لے کر آدمی اپنے ماحول میں ہم آہنگی کی منزل تک پہونچ سکتا ہے یا پہونچ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ضرورت کے لفظ ہی میں یہ اشارہ پنہاں ہے کہ کوئی مادی یا روحانی طلب آدمی کو اسی وقت درپیش ہو سکتی ہے جب کہ اس کی فطرت اور جسم و جان کے آہنگ ہی میں اس کا تقاضا موجود ہو اور اس تقاضے سے ایک سیدھی سڑک خارج کی طرف جاتی ہے جو آدمی کو اس کے ماحول سے ملاتی ہے۔ یہی ماحول اس کی ضرورتوں کی کفالت کرتا ہے۔ اور زبان جو ہماری ضرورت بھی ہے اور فطرت بھی۔ ابلاغ کی اس سیدھی سڑک کا نام ہے جو آدمی اور اس کے ماحول یعنی معاشرہ کو باطنی اتحاد بخشتی ہے۔

ماہرینِ لسانیات کی رائے میں زبان کی پیدائش انسانوں کی بے شمار نسلوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ارتقا کی بے شمار کڑیوں کے ملنے کے بعد آدمی اس قابل ہوا کہ اظہار کے لئے اشاروں کنایوں کے بجائے زبان جیسی بڑی

اور عاشی تلاشت اختیار کر سکے۔ زبان کی تخلیق سے وہ سماجی زندگی پیدا ہوئی جو نوعیت کے اعتبار سے تمام حیوانات پر انسان کی برتری کا ایک کھلا اعلان تھی ـــــــ زبان کا سہارا پا کر جب انسانی ذہن خیال اور جذبے کو لفظ و بیان کے نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے کے قابل ہو گیا، تو اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ابلاغ کی اس صلاحیت سے کام لے کر وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک لڑی میں پرو سکے گا۔ گویا زبان نے اسے زمانے کا تصور دے کر زمان و مکان کے ان رشتوں کو ڈھونڈھ نکالا جن سے اس کی ابدیت آشکار تھی۔

یہاں سے انسانی زندگی میں زبان کی عظیم الشان خدمات کا آغاز ہوا۔ بیسویں صدی کے اس موڑ تک آتے آتے جہاں ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ زبان کی ان خدمات کا ایک مختصر جائزہ بھی انسانی عظمت کا ایک بے حد وقیع مرقع نظر آتا ہے:

۱۔ آج زبان انسانی ذہن کی زبردست قوت اظہار کی گواہ بن چکی ہے۔

۲۔ زبان کے بغیر دو چار اشخاص گونگوں کی طرح یکجا رہ سکتے تھے لیکن ایک بڑے معاشرے کا قیام ناممکن تھا۔

۳۔ زبان کے ذریعے تفصیلی تاریخ مرتب ہوئی جس کے آئینے میں آدمی اپنے ماضی یعنی اپنی جدوجہد کے پچھلے نقوش کو سمیٹ سکے۔

۴۔ زبان نے تاریخ کی صورت میں جب انسانی جدوجہد کی مسلسل داستان سنائی تو روایت نے جنم پایا۔ یعنی انسانی ذہن کو ایک طویل تجربے کے پس منظر میں یہ سیکھنے کا موقع فراہم کر دیا گیا کہ زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے زندہ رہنے کے بنیادی اصول کیا ہیں۔

۵۔ روایت کی مدد سے زبان نے انسانی تہذیب کو فروغ دیا، اور اس کے امکانات کو روشنی میں لا کر مستقبل کا اشاریہ بن گئی۔

۶۔ زبان کی مدد سے ساری انسانیت زمانہ و جگہ کے امتیازات سے بلند ہو کر ایک وحدت میں ڈھل گئی۔ اور تاریخ کے متضاد اور متنوع واقعات اس وحدت کی جدلیاتی حقیقت کی نمائندگی کرنے لگے۔

۷۔ زبان نے انسان کے مطالعے کو انسانیت کا مطالعہ قرار دیا۔ اس نے فرد کو معاشرے سے، معاشرہ کو تاریخ سے پیوست کیا، اور ان سب کے تانے بانے کو انسان کی جدلیاتی فطرت قرار دیا۔

۸۔ زبان کو انسان کا دوسرا وجود کہا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت یقیناً دوسرے وجود سے بہت بڑی ہے عمل فرد یا افراد کے درمیان محدود ہوتا ہے زبان اس عمل کو دوسرے افراد کے عمل سے ملا دیتی ہے۔ ان اعمال کے درمیان تسلسل پیدا کرتی ہے۔ اور زندگی کا منطقی میزان مہیا کر کے گہری اور بڑی حقیقتوں کے چہرے سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔ اس طرح زبان انسان کے اس منطقی اور بامعنی وجود کو پیش کرتی ہے جو ساری تاریخ اور نوع انسانی کے ارتقا کی ساری امکانی کڑیوں کو احاطہ کرتا ہے۔

زبان کی ان خصوصیات کا مطالعہ ذرا قریب سے ہم اپنے ماحول میں بھی کر سکتے ہیں یا یوں کہئے کہ اپنی زبان

اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کے مطالعہ سے ہم زبان کے منصب کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں اپنے خیالات کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اظہار کی ضرورت اور صلاحیت کے ملنے سے انسانی تہذیب کا کتنا بڑا کارخانہ مستقبل میں ترقی کے بے پناہ امکانات کے ساتھ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔

چونکہ ابلاغ ماحول اور انسانی ذہن کے درمیان ایک رابطہ ہے اس لئے مختلف ماحول میں مختلف زبانیں وجود میں آئیں۔ ان سب میں انسانی ذہن کی اظہار کی صلاحیت اور اظہار کی ضرورت کو مشترک قدروں کی حیثیت حاصل ہے لیکن زمانہ اور جگہ کے فرق سے حروف میں تنوع پیدا ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مختلف زبانوں میں بنیادی آوازوں (حروف)، اور معنی میں تنوع کے ساتھ ساتھ گہری مماثلت باقی رہی۔ اس مماثلت سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کتنے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ ماحول کے بدلنے سے اس میں تبدیلی ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن ہر تبدیلی ذات کے بدل جانے کے بجائے وسعتِ ذات کی خبر دیتی ہے۔ اگر انسانی فطرت سچ مچ جلد جلد بدل جایا کرتی جیسا کہ بعض اہل فکر کا اس کے متعلق خیال ہے تو نوعِ انسانی کا مفہوم ہی سرے سے خبط ہو جاتا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں کا وجود، ایک ہی حصے میں مختلف زبانوں کے یکے بعد دیگرے مٹنے اور جنم لینے اور کہیں کہیں ایک ہی خطہ میں بیک وقت ایک سے زیادہ زبانوں کا بولا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ زمانہ اور ماحول کی تبدیلی سے انسان گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے۔ رد و قبول کی اس زبردست صلاحیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسانی فطرت ایک نامیاتی صداقت ہے۔ جس طرح دریا بہتا رہتا ہے اس کے باوجود وہ ایک دریا ہے اسی طرح انسان اپنی فطرت کے سیل میں بہتا رہتا ہے لیکن وقت کے ہر موڑ اور مقام کی ہر تبدیلی کے باوجود وہ انسان ہی رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے زبانیں بے شمار ہوتی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اپنے اپنے ماحول میں یکساں طور پر انسانی اظہار کی صلاحیت اور اظہار کی ضرورت کے عین مطابق اپنے فرائض انجام دیتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی پیدائش کے بنیادی اصولوں کے ماتحت تشکیل پاتی رہتی ہیں۔ اور جس طرح آدمی کھلی ہوا میں سانس لے کر فرحت و انبساط ہی نہیں بلکہ توانائی بھی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک ماحول کی زبان یا زبانیں لوگوں کو زندگی کی بشارت دیتی رہتی ہیں۔ اور جس طرح باغوں میں پھول کھلتے اور مرجھاتے ہیں اسی طرح الفاظ مرتے اور زندگی پاتے ہیں۔ نئے الفاظ سے زبان کی رگوں میں تازہ ہو دوڑنے لگتا ہے لیکن نئے الفاظ اس وقت تک میسر نہیں آتے جب تک زندگی نے کوئی کروٹ نہ لی ہو۔ نئے الفاظ کی اوٹ سے ہمیشہ ہی زندگی کا نیا چہرہ جھانکتا ہے۔

بعض زبانیں دوسری زبانوں کے مقابلے میں جدید تر ہوتی ہیں۔ وہ ہماری زندگی کے معیار کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر برقرار رکھ سکتی اور ترقی دے سکتی ہیں۔ لیکن اس قسم کا مقابلہ ایک ماحول کی زبانوں ہی کے درمیان ممکن ہے۔ ورنہ اس کی حیثیت غیر منطقی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے لئے انگریزی اور اردو کا مقابلہ ایک غیر منطقی بحث کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ زبان انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک مضبوط رابطہ ہے اس لئے ماحول سے الگ ایک زبان کی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی جو اپنے ماحول کے اندر اسے حاصل ہوتی ہے۔ بین الاقوامی زبانیں بعض سیاسی اور ملکی رشتوں کو استوار رکھنے کے لئے سیکھی جاتی ہیں لیکن ان کا اکتساب

ہمارے ماحول کی زبانوں کے فطری نشوونما سے بالکل مختلف چیز ہے۔ ایک زبان ہمارے لئے سانس لینے کی طرح ناگزیر ہوتی ہے دوسری صرف مخصوص ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود کا حصہ نہیں بن پاتی۔

ایک ایسی زبان جو ہمارے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی مسلسل استعمال ہوتی رہے تو لوگوں میں اس زبان کی خاص استعداد پیدا ہو جائے گی۔ لیکن ان کی اظہار کی صلاحیت اور اس صلاحیت کا فطری بہاؤ کم ہوتا چلا جائے گا جس کی وجہ سے زبان کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کی ترقی بھی بے طرح مجروح ہوگی۔ اسی لئے زندہ قومیں اپنی مادری زبانوں ہی کو وسیلۂ اظہار بناتی ہیں۔ البتہ جب ایک ماحول میں کئی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور ان کی حیثیت اکتسابی نہیں ہوتی جیسا کہ ہمارے ملک میں ہے تو وہاں عموماً بڑے پیمانے پر وسیلۂ اظہار وہ زبان بنا کرتی ہے جو اپنے اندر زندگی کے متنوع مسائل اور موضوعات کو سمیٹنے کی دوسروں سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے اور دو مختلف سطحوں پر ہمارے کام آ سکتی ہے۔ پہلی سطح جذبہ اور خیال کی ہے جن کی ترجمانی کی صلاحیت تقریباً ہر زبان میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی زبان اس سطح سے آگے نہیں بڑھتی تو اس کا واحد سرمایہ تصور خیال بھی ناقص رہ جاتا ہے۔ اور اسے صرف ایک بولی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ زبان کی دوسری سطح وہ ہے جہاں وہ فکر اور منطق کو اپنا کر علمی زبان بن جاتی ہے۔ دراصل اس کے بعد ہی وہ زبان کہلانے کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ ہمارے ملک کی زبانوں میں اردو کو اسی لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ایک علمی زبان ہے۔ اور اس کے شعر و ادب میں اسی رعایت سے تصور خیال نکھرا ہوا ملتا ہے۔ اس کا شعری و ادبی سرمایہ بھی دوسری زبانوں سے زیادہ ہے۔

یہاں پہنچ کر دو باتوں کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم اردو کو چھوڑ کر انگریزی کو اپنا لیں تو ہماری اظہار کی فطری صلاحیت کم ہوتی چلی جائے گی۔ نتیجے کے طور پر اظہار کی ضرورت جن اشیائے متعلق ہوگی اُن کا پورا پورا شعور ہمیں نہیں ہو سکے گا۔ اور ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے ہوتے چلے جائیں گے۔ دوسری طرف اگر ہم ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو کی اہمیت اور افادیت کو نظرانداز کرتے رہے تو ہمارے یہاں علمی کاموں کی رفتار بے حد سست پڑ جائے گی۔ کیونکہ اردو کے مقابلے میں ہماری دوسری زبانوں میں علمی سرمایہ تقریباً صفر کے برابر ہے اس کے بعد ہمارا ذہن نہ تو سائنس کے شعبوں میں جدید تحقیق کے قابل بن پائے گا اور نہ شعر و ادب کا معیار ہی قائم رہے گا جس کے لئے زندگی کے ہر موڑ پر اپنی تہذیب کا ادراک ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنسی اور عمرانی تحقیقات سے واقف ذہن ہی تہذیب کا پورا ادراک کر سکتا ہے۔

برصغیر ہند و پاک کی تقسیم کے بعد بھارت والوں نے اردو کے بجائے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنا کر اس قسم کی غلطی کی ایک مثال چھوڑی ہے جس سے کسی قوم کو علمی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور خاص طور پر اپنے قومی شعور کو سمیٹنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر کی زبانوں میں اردو ہی تنہا ملک گیر پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے لٹریچر اور علمی سرمائے میں اضافہ کرنے والوں میں ملک کے ہر حصے کے لوگ شامل تھے جن کی تعداد اور علمی صلاحیتوں کے بل بوتے پر دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو نے بہت زیادہ ترقی کی ہے یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ورنہ ان حالات اور تاریخی اسباب پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے

ں نے اردو کو ملک بھر کی زبان بنا دیا تھا۔ البتہ اس فرق کو بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ اردو برصغیر کی بولی جانے والی زبان تھی اور انگریزی کی حیثیت ایک اجنبی زبان کی تھی جسے ہم نے گرامر کی مدد سے سیکھا تھا، تاکہ اپنے حاکم کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کریں۔

آج بھی برصغیر ہند و پاک کے تقریباً تمام علاقوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور دوسری زبانیں علاقائی ہیں۔ برصغیر کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک ملک گیر زبان اور بے شمار علاقائی زبانیں رائج رہی ہیں اور دونوں یعنی علاقائی زبانیں اور ملک گیر زبان کا ارتقا، فطری ہوا کرتا تھا۔ ملک گیر زبان ملک کی ساری زبانوں کی دلکشی اور حسن سے ناتہ جوڑے رکھتی تھی جیسا کہ اردو نے کیا۔ علاقائی زبانیں ہمارے جذبے اور احساس کی ترجمان ہونے کے باوجود ہم سے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی تھیں۔ خصوصاً اس سائنسی عہد میں یہ بڑا مشکل ہو گیا ہے ان کے نرم و نازک چہرے زندگی کی کڑی دھوپ میں آتے ہی کمہلا جاتے ہیں۔ ان میں اظہار کی وہ گوناگوں اور پیچیدہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی جس کی نئی زمانہ ضرورت ہے۔ اسی لئے انہوں نے ہمارے ذہن اور قوت عمل کی نمائندگی اردو کے سپرد کر دی ہے۔ جس کا ادبی و شعری سرمایہ صرف معصوم جذبات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ فکر و خیال کے نئے افق مسلسل وا ہونے کے سبب اردو زبان میں جذبے اور احساس کی بدلی ہوئی شکلیں ملتی ہیں جو ہمارے ملک کی دوسری تمام زبانوں کے ادب و شعر سے زیادہ جدید ہیں۔ دوسری زبانیں تو ابھی اقبال کی شاعری اور پریم چند کی افسانہ نگاری کی روایت تک بھی پوری طرح نہیں پہونچی ہیں۔ جدید شعر و ادب کی کوئی مربوط روایت ان کے یہاں کہاں سے ملے گی۔ ہندی کے شاعروں نے ادھر چند سالوں میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن شعری اور ادبی سرمائے میں ہمیشہ ٹھوس اور مستحکم بنیادوں ہی پر اضافہ ہوا کرتا ہے۔ سر سید نے اردو کو ایک علمی زبان بنانے کا آغاز کیا تھا۔ انہیں کے زمانے میں شبلی، حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد جیسے لوگوں نے اس کی علمی حیثیت کو اتنا فروغ دیا کہ ملک کی دوسری زبانیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اس کے بعد علی گڑھ، بھوپال، لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد دکن، لاہور، شبلی منزل، اعظم گڑھ، پٹنہ اور کلکتہ میں برابر علمی کام ہوتا رہا۔ حیدرآباد دکن کی یونیورسٹی کا سارا نصاب اردو میں موجود تھا۔ فلسفہ و حکمت، عمرانیات اور سائنس کی مشکل کتابیں اردو میں ترجمہ کی جا چکی تھیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے علمی اور تحقیقی کاموں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ہند و پاک میں علیحدہ علیحدہ اب بھی جاری ہے۔ کورٹ کی زبان سو فی صد اردو تھی۔ یہ زبان ڈپٹی نذیر احمد کے انڈین پینل کوڈ کے ترجمے سے وجود میں آئی تھی اور اس کی تہہ میں ہمارا تخلیقی مزاج کارفرما تھا۔ دراصل یہ سارا کام کسی ایک علاقے کے لوگوں نے نہیں کیا بلکہ ہر علاقے کے ادیب بساط بھر اپنی ملکی زبان "اردو" کی ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ اردو کی اس حیثیت کو سمجھ لینے کے بعد ہی ہم انگریزی کی غلامی سے نجات پا سکتے ہیں، اور اسی صورت میں علاقائی زبانوں کی ترقی اور نشو و نما کے امکانات بھی پیدا ہو سکیں گے۔ کیونکہ انگریزی کو دیس نکالا دینے کے بعد ہی ہمیں اپنے ملک اور قوم کی زبانوں اور اس پہلے اپنے جذبے اور احساس کی صداقت اور سائنسی ترقی کے لئے اپنی لگن و دوسرے بھی دلچسپی پیدا ہو سکے گی۔ اگر کسی کو اس معاملے میں کوئی شک بھی ہو تو کم از کم وہ ان سارے پڑھے لکھے لوگوں کو بیوقوف نہیں سمجھتا ہوگا جنہوں نے بذریعہ انگریزی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ایک عمر زندگی کی رفتار و ترقی کے بارے میں اس اجنبی زبان کا

اکتساب کرکے بہت کچھ معلومات بہم پہونچائیں۔ لیکن انگریزی کی جگہ اردو کو اس لئے دینا چاہتے ہیں کہ انہیں اپنی علمی تگ و دو ہی کے دوران اجنبی زبان کے ذریعے علم حاصل کرنے کی بنیادی خامیوں کا بھی پتہ چلا۔ جو اجتماعی طور پر ایک قوم کو احساسِ کمتری کے عذاب میں مبتلا کرکے اس کے احساسِ آزادی ہی کے درپے ہو جاتی ہیں، اور ایسے خیالات اور رجحانات کو زہر کی طرح رگ رگ و پے میں اتار دیتی ہیں جن سے اعتماد کی جگہ بے اعتمادی' اور حوصلے کی جگہ بزدلی کو مل جاتی ہے۔

میں تھوڑی دیر کے لئے برصغیر میں اردو کی سیاسی، تہذیبی اور علمی حیثیت سے بے نیاز ہو کر امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا کی انگریزی کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انگلستان کی زبان اب دنیا کے کئی ملکوں کی زبان ہے جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع ہیں۔ وہ ان ملکوں میں رہنے والوں میں سے بیشتر کی مادری زبان ہے علاوہ باقیوں کے لئے ایک قابلِ قبول ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ زبانوں کا ان کے ماحول سے کیا تعلق ہے۔ اور انگریزی زبان کے امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا پہونچنے تک اس میں کس حد تک تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس باب میں ایک غلطی کا ہمہ وقت امکان موجود ہے کہ ماحول سے جغرافیائی ماحول مراد لے لیا جائے علاوہ زبانوں کے سلسلے میں ماحول سے مراد تہذیبی ماحول اور اس کا تاریخی پس منظر ہے۔ جغرافیائی ماحول سے جس حد تک لوگ متاثر ہوں گے اس کے اعتبار سے بھی انگلستان کی انگریزی اور امریکہ یا آسٹریلیا کی انگریزی میں فرق ملے گا۔ لیکن تہذیبی ماحول کی تبدیلی سے بڑے پیمانے پر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد اردو کو انگریزی کی طرح اتنے بڑے سفر نہیں کرنے پڑے کہ اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی اور نہ کسی تہذیبی ماحول ہی سے سابقہ پڑا۔ وہی لوگ ہیں' وہی تہذیب ہے' اس کے اردگرد وہی علاقائی زبانیں ہیں جن سے اس کی پرانی شناسائی ہے۔ اسی لئے سیاسی غلط فہمیوں سے بلند ہو کر اردو کے بارے میں جب بھی ہم سوچیں گے اس کی ترقی میں ہمیں اپنی ہی ترقی کے نقش قدم ملیں گے۔

بھارت والوں نے اگر ہندی کے بجائے اردو کو اپنایا ہوتا تو وہاں کی ترقی پسند اور تاریخی قوتیں اپنا تحفظ کو قائم رکھ کر جن سنگھیوں اور متعصب حضرات کو آسانی سے ہر محاذ پر شکست دے سکتی تھیں۔ لیکن ہندی کی وجہ سے بھارت کا معاشرہ تہذیبی اعتبار سے بیس سال پیچھے چلا گیا ہے اور زبان کے بارے میں غلط فیصلے نے اُن کی قومی زندگی میں ایسے تضاد پیدا کر دیئے ہیں جن سے نجات پانے کا واحد ذریعہ صحیح پالیسی کو دوبارہ اپنانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، پاکستان میں بھی بعض کم آگاہ حضرات کے تعصب ہی نے اردو کی صحیح پوزیشن کو واضح نہیں ہونے دیا، حالانکہ وہ پہلے بھی اتحاد، سلامتی اور ترقی کی نقیب تھی اور آج بھی ہے۔ اور ملک کے ہر علاقے کا آدمی اپنی علاقائی زبان کے علاوہ برصغیر کی اس ملکی زبان سے بخوبی واقف ہے اور لین دین کے معاملات اور عام بول چال میں اس سے کام لیتا ہے اس کی واقفیت ہی سے پہلا کبھی عیاں ہے کہ مختلف زبانوں کے علاقوں کی موجودگی میں بھی ہم ایک قوم ہیں۔ اور ہمارا تہذیبی ماحول ایک ہی ہے جس کا نام "اردو" ہے۔ یہ زبان اور یہ تہذیب اپنے ملک میں تعصب اور تنگ نظری کے بڑھتا ہوا تنزل ہوئی ایک مضبوط قومی معاشرے کے قیام کو عمل میں لا رہی ہے اور ایک انسان دوست والی معاشرے کی طرف قدم اٹھا رہی ہے ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ اس زبان میں دنیا کی بعض بڑی زبانوں سے کہیں زیادہ انسانی آدرشوں اور تہذیبی اقدار کو جذب کرنے کی صلاحیت

آغا افتخار حسین

صادق (Zadig)

والتیر کا ایک ناول

فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات

والیٹر نے مشرقی تاریخ و ادب سے متاثر ہو کر جو کہانیاں لکھی ہیں اُن میں "صادق" (Zadig) بہت مشہور ہے۔ اس مختصر ناول کا پہلا ایڈیشن ۱۷۴۷ء میں امسٹرڈم سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ "صادق" ایک نوجوان کی کہانی ہے جو بابل کا رہنے والا تھا۔ صادق خوشحال ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم بھی اچھی ہوئی۔ اس کی ذہانت بھی خدا داد تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود قسمت نہایت ستم ظریف پائی تھی۔ وہ اپنی طرف سے سب کی بھلائی چاہتا تھا اور سب کے کام آتا تھا لیکن شومئی قسمت سے اس کو اپنے ہر اچھے فعل کے نتیجے میں برائی ملی۔ اس ناول میں اسی قسم کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

مثلاً ناول کے تیسرے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ صادق ایک جنگل میں جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بادشاہ کے سپاہی ہر طرف بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے صادق سے پوچھا:

"تم نے ملکہ کا کتا دیکھا ہے؟"

"وہ کتا نہیں کتیا ہے" صادق نے ذرا انکساری سے جواب دیا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" سپاہی نے کہا "وہ کتیا ہی ہے"

"اس نے چند روز ہوئے بچے دیئے ہیں" صادق نے وضاحت کی "وہ پچھلے بائیں پاؤں سے لنگڑاتی بھی ہے۔ اور اس کے کان بہت لمبے ہیں"

"بالکل ٹھیک" سپاہی نے کہا۔ "تو پھر تم نے کتیا کو ضرور دیکھا ہے"

"نہیں۔ نہیں۔ میں نے کتیا کو بالکل نہیں دیکھا" صادق نے کہا۔ "بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ملکہ کے

پاس کوئی کتیا ہے بھی یا نہیں "

سپاہیوں نے صادق کو ملکہ کی کتیا چرانے کے الزام میں پکڑ لیا۔ اُس نے لاکھ کوشش کی کہ صحیح صورتحال بیان کرے لیکن سپاہیوں نے اس کی ایک نہیں سُنی اور اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ ججوں نے صادق کو کوڑے لگائے جانے اور جلاوطن کیے جانے کی سزا سنادی۔

اتفاق سے اس کے فوراً بعد بادشاہ کی کتیا بھی مل گئی۔ ججوں نے یہ صورت حال دیکھ کر صادق کو کتیا چرانے کے الزام سے تو بری کر دیا۔ لیکن اس پر غلط بیانی کا جرم عائد کیا ـــــــــــــــــــ چنانچہ اس پر چار سو اشرفی جرمانہ کر دیا گیا۔ البتہ یہ رعایت ضرور کی گئی کہ جرمانہ ادا کرنے کے بعد اگر صادق چاہے تو اپنی صفائی میں بیان دے سکتا ہے۔

جرمانہ ادا کرنے کے بعد صادق نے جج صاحبان کی عدالت میں حسب ذیل بیان دیا:

"ستارگانِ عدل و انصاف! بحورِ علم و فضل! آئینہ ہائے صداقت! مظاہرِ قوتِ آہن و فولاد! آب و تابِ زمرّد و الماس! رشکِ قدر و قیمتِ سیم و زر![1] مجھے از راہِ کرم اجازت دی گئی ہے کہ اس معزز محفل کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں۔ چنانچہ میں آہورمزد[2] کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ملکہ کی معزز کتیا کو کبھی نہیں دیکھا۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ میں جنگل میں پھر رہا تھا کہ مجھے یہ معزز سپاہی ملے۔ میں نے ریت پر ایک جانور کے پاؤں کے نشان دیکھے تھے جن سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ایک چھوٹے کتے کے نشان ہوں گے۔ کہیں کہیں ریت ذرا اُبھری ہوئی تھی وہاں پاؤں کے نشانوں کے درمیان کچھ ہلکے ہلکے نشان تھے۔ ان سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کتیا کے لٹکے ہوئے تھنوں سے پڑ گئے ہوں گے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ کتیا نے چند روز ہوئے بچے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ اور نشانات، کتیا کے پاؤں کے نشانات کے دائیں اور بائیں دیکھے جن سے معلوم ہوا کہ کتیا کے کان بہت لمبے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ کتیا کے ایک پاؤں کے نشان باقی تین نشانوں کے مقابلے میں زیادہ گہرے تھے۔ اس بنا پر میں نے یہ نتیجہ نکالنے کی جرأت کی کہ ہماری ملکہ معظمہ کی معزز کتیا کے ایک

---

[1] یہاں والتیر نے فرانسیسی لفظ " Affinité " کے ذو معنی ہونے کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لفظ کے معنی "مماثل" کے بھی ہیں۔ اور "شوق و طلب" کے بھی۔ یعنی دوسرے معنوں میں صادق نے ججان عدالت کو "شائقینِ سیم و زر" کہہ کر طنز کیا۔

[2] زرتشتی مذہب میں خدا کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

پاؤں میں ذرا لنگ ہے :

اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے صادق آخر کار بادشاہ کی نظروں میں آگیا ۔ اور ترقی کرکے وزیر بن گیا ۔ لیکن اس کے یہ اچھے دن زیادہ عرصہ نہ رہے ۔ محل میں سازشیں ہوئیں اور سب سے زیادہ بدنصیبی یہ ہوئی کہ ملکہ صادق پر کچھ ضرورت سے زیادہ مہربان ہوگئی ۔ راز فاش ہوگیا ۔ بادشاہ کو پتہ چلا تو اس نے صادق کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن صادق کو اس کی اطلاع بروقت مل گئی ، اور وہ راتوں رات فرار ہوگیا ۔ اور مصر چلا گیا ۔ یہاں پہونچ کر بھی ستم ظریفیوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا ۔ مثلاً مصر کی سرزمین میں قدم رکھتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک نہایت خوب صورت عورت کو بری طرح مار رہا ہے ۔ عورت نے فریاد کی ۔ صادق کو رحم آیا ۔ اور اس نے ظالم مرد کو پہلے تو مارنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانا تو صادق نے اسے مار دیا ۔ اس کے بعد صادق نے عورت سے اجازت چاہی لیکن وہ عورت اس کے پیچھے پڑ گئی کہ تونے میرے شوہر کو کیوں مارا ۔ مجھے تو اس سے پٹنے میں مزا آرہا تھا ۔ صادق ہکا بکا رہ گیا ۔ عورت نے ہنگامہ مچایا ۔ صادق گرفتار ہوا ۔ سزا کے طور پر غلام بنا دیا گیا ۔ بازار مصر میں ایک عرب تاجر کے ہاتھ بیچا گیا ۔ عرب تاجر کچھ عرصے بعد اس کی ذہانت سے متاثر ہوا اور اسے تجارتی مشن کے سلسلے میں سراندیپ کے بادشاہ کے پاس بھیجا ۔ لیکن صادق کی بدقسمتی نے اس کا ساتھ یہاں بھی نہ چھوڑا ۔ راستے میں اسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر بھاگا ، اور واپس بابل آیا ۔ بابل کا بادشاہ مرچکا تھا ۔ یہاں خوش قسمتی اور بدقسمتی کے مختلف ادوار سے گذر کر آخر صادق بابل کا بادشاہ بن گیا ۔ بابل کے سابق بادشاہ کی ملکہ جس کی محبت کی وجہ سے صادق بابل سے بھاگا تھا ، صادق کی محبت میں اب تک سرشار تھی ۔ چنانچہ صادق نے اس سے شادی کرلی ۔ اور بادشاہ اور ملکہ ہنسی خوشی رہنے لگے ۔

اس کہانی میں متعدد عجیب وغریب واقعات اور اتفاقات اس قسم کے بیان کئے گئے ہیں جن میں قسمت کی ستم ظریفی کے سامنے انسان کی مجبوری ظاہر ہوتی ہے ۔ اس طرح کے اتفاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر صادق کہتا ہے :-

> " ذرا غور تو کیجئے ۔ ایک کتیا کو نہ دیکھنے کے جرم میں چار سو اشرفی جرمانہ ادا کرنا پڑا ۔ بادشاہ کی شان میں قصیدہ لکھنے کی پاداش میں موت کی سزا ہوئی ۔ اتفاق سے ملکہ کے جوتے میری ٹوپی کے رنگ کے تھے ۔ اس لئے عمر قید کی سزا کے خوف سے بھاگنا پڑا ۔ ایک عورت کو پٹنے سے بچانے کے صلے میں غلام بنا کر بازار میں بیچا گیا ۔ عرب کی بیواؤں کی جان بچانے کا انعام یہ ملا کہ خود مجھے زندہ جلائے جانے کا حکم صادر کیا گیا "[1]

---

[1] ایک مقام پر صادق نے کوشش کی کہ عربوں میں قدیم ہندوستانیوں سے ملتی جلتی ستی کی رسم کے خلاف مہم چلائے ۔ چنانچہ اس " بغاوت " میں دھر لیا گیا ، اور اسے زندہ جلائے جانے کا فیصلہ کیا گیا ۔

موسیٰ و خضر

"صادق" کے اٹھارھویں باب میں والتیر نے ایک راہب کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ قصہ کسی حد تک قرآن کریم کی ایک حکایت سے مماثلت رکھتا ہے جو سورۂ کہف (۶۴ - ۸۲) میں بیان کی گئی ہے۔ قرآن کی حکایت اور "صادق" کا قصہ اس طرح ہے:

از روئے قرآن حضرت موسیٰ کی ملاقات ایک پراسرار شخصیت سے ہوتی ہے، جسے قرآن کریم میں:

عبدًا من عبادنا اٰتینٰه	ہمارے بندوں میں سے ایک
رحمة من عندنا وعلمنٰه	بندہ جس پر ہم نے اپنی رحمت نازل
من لدنا علما ۔	کی اور خود اپنے علم کی تعلیم دی

کہا گیا ہے۔ اس پراسرار شخصیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا علم عام عالم محسوسات سے ماورا اور قید زمان و مکان سے آزاد ہے۔ اس کے لئے حال اور مستقبل برابر ہیں۔ حضرت موسیٰ اس شخصیت سے (جسے بعض مفسرین نے خضر کہا ہے) ملے اور ان کے ہم سفر ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ خضر نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ حضرت موسیٰ خضر سے کوئی بات دریافت نہیں کریں گے۔ حضرت موسیٰ خضر کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں حضرت موسیٰ اور خضر ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ خضر نے کشتی کو دو ایک مقامات سے توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ نے اس عجیب و غریب فعل کی وجہ پوچھی۔ خضر نے انہیں وعدہ یاد دلایا کہ وہ کسی فعل کی وجہ نہیں پوچھیں گے۔ حضرت موسیٰ خاموش ہو گئے۔ آگے چل کر انہیں ایک نوجوان ملا جسے خضر نے قتل کر دیا۔ اس پر بھی حضرت موسیٰ نے استفسار کرنا چاہا، لیکن خضر نے صبر کی تلقین کی۔ کچھ دور آگے چل کر انہیں ایک شہر ملا۔ انہوں نے شہر کے لوگوں سے کھانا مانگا لیکن شہریوں نے کسی قسم کی مسافر نوازی سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود خضر نے اس شہر کی ایک دیوار گرتی ہوئی دیکھی تو اسے پھر سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ خضر کے اس التفات بے جا پر خاموش نہ رہ سکے۔ اور انہوں نے خضر سے اس کی وجہ پوچھی۔ اس پر خضر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے وہ فقرہ کہا جو اب ضرب المثل بن گیا ہے۔ یعنی:

هٰذا فراقُ بینی	یہاں سے ہم اور تم جُدا
وبینکَ ۔	ہوتے ہیں ۔

لیکن جُدا ہونے سے پہلے خضر نے اپنے بظاہر عجیب و غریب افعال کی حسب ذیل وجوہ بیان کیں:

کشتی کو دو ایک مقامات سے اس لئے توڑا کہ اس ملک کا بادشاہ نئی کشتیوں کی تلاش میں تھا۔ اگر اُسے یہ کشتی صحیح حالت میں ملتی تو وہ اسے بھی ہتھیا لیتا، اور کشتی کا مالک جو مسکین و مفلوک الحال تھا، اپنے اثاثے سے محروم ہو جاتا۔ اب چونکہ کشتی ذرا سی ٹوٹی ہوئی تھی اس لئے ظالم بادشاہ کی نظر اس پر نہیں پڑے گی۔

جس نوجوان کو قتل کیا گیا تھا، اس کے بارے میں خضر نے پیشین گوئی کی کہ وہ بڑا ہو کر ظالم اور جابر ہوتا اور اپنے والدین پر ظلم کرتا۔ چنانچہ خضر نے اسے قتل کر دیا اور دعا کی کہ قدرت ان ماں باپ کو کوئی اچھا بیٹا دے۔

دیوار سیدھی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دیوار دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ دیوار کے نیچے خزانہ تھا۔ خضر نے مصلحتاً گرتی وقت دیوار کو پھر سیدھا کر دیا تاکہ یہ خزانہ کسی دوسرے کے ہاتھ نہ آئے اور اس عرصے میں یہ دو یتیم بچے باشعور ہو ئیں اور دیوار کھود کر خزانہ نکال لیں [۵]

والتیر کے ہاں صادق نے حضرت موسیٰ اور راہب نے خضر کا رول ادا کیا ہے۔ والتیر کی کہانی حسب ذیل ہے سفید ریش راہب صادق سے وہی وعدہ لیتا ہے جو خضر نے حضرت موسیٰ سے لیا تھا۔ یعنی یہ کہ راہب کچھ کرے صادق اس کی وجہ دریافت نہیں کرے گا۔ دونوں راستے میں ایک متمول آدمی کے مہمان ہوتے ہیں جو ذرا نک مزاج ہے۔ لیکن انتہا درجے کا مہمان نواز۔ وہ رات کو صادق اور راہب کی خوب خاطر و مدارات کرتا ہے۔ سرے دن صبح دونوں مہمان رخصت ہوتے ہیں، اور راہب رخصت ہوتے وقت اپنے میزبان کے مکان سے ایک ق سونے کا برتن اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ صادق کو یہ برا معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ نہیں بولتا۔ آگے چل کر یہ دونوں ایک ایت کنجوس آدمی کے مہمان ہوتے ہیں جو ان کو نہایت بدمزہ کھانا کھلاتا ہے۔ اور ان کے آرام کا بھی کوئی خاطر خواہ نظام نہیں کرتا۔ رخصت ہوتے وقت راہب وہ سونے کا برتن جو اپنے گذشتہ متواضع میزبان کے ہاں سے لایا تھا، ں خسیس آدمی کو تحفہ کے طور پر دے دیتا ہے۔ صادق اس کی وجہ دریافت کرتا ہے، راہب بادل ناخواستہ اس کی جیہہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ متواضع شخص دراصل صرف خوش حال لوگوں کی تواضع کرتا ہے تاکہ اپنی امارت کا ظاہرہ کر سکے۔ میری اس حرکت سے وہ ذرا محتاط ہو جائے گا، اور یہ خسیس آدمی آئندہ شرمسار ہو کر اتنی کنجوسی ہیں کرے گا۔

آگے چل کر صادق اور راہب ایک اور شخص کے مہمان ہوئے جس نے ان کی خوب خاطر و مدارات کی۔ لیکن راہب ات کو اٹھا اور جانے سے پہلے اپنے میزبان کے گھر کو آگ لگا دی۔ صادق کھینا یا۔ لیکن خاموش رہا۔

آگے چل کر صادق اور راہب ایک بیوہ کے مہمان ہوئے جس نے ان کی بہت خاطر تواضع کی۔ دوسرے دن صبح وجب یہ دونوں رخصت ہونے لگے تو راہب نے خواہش ظاہر کی کہ بیوہ اپنے لڑکے کو تھوڑی دور ان کے ساتھ کر دے یوہ راضی ہو گئی۔ لڑکا کچھ دور آیا۔ یہ لوگ ایک دریا کے پاس پہنچے۔ راہب نے اچانک بیوہ کے لڑکے کے بال پکڑ کے وراسے دریا میں ڈبو دیا۔

یہ دیکھ کر صادق آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے راہب کو خوب صلواتیں سُنائیں۔

راہب نے توجیہہ کی کہ جو مکان اُس نے جلایا تھا اس کے نیچے خزانہ تھا جو مکان جلنے کے بعد مالک مکان و مل جائے گا۔ اور اس طرح اس نے اپنے میزبان کی خدمت کی۔ جس لڑکے کو اُس نے ڈبو دیا تھا وہ اگر زندہ رہتا تو قاتل

---

۵ اقبال نے خضر و موسیٰ کے واقعہ کے بارے میں کہا ہے ؎

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اور ظالم ہوتا۔

صادق کو سخت غصہ آرہا تھا۔ اس نے کہا :

" لیکن، اے ظالم، تجھ سے کس نے کہا کہ یہ واقعات اس طرح ظہور پذیر ہوں گے "

صادق نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ سفید ریش بزرگ کی ریش دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی، اور وہ ایک نوجوان بن گیا۔ اور اس کے پر نکل آئے۔ اور وہ ایک فرشتہ بن گیا۔

صادق اس سے بہت متاثر ہوا، اور اس نے معذرت کرتے ہوئے اپنی حیرت کی وجہ بیان کی اور کہا کہ میرا فہم ناقص سہی لیکن کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جس لڑکے کو آپ نے ڈبویا ہے اس کی اصلاح کرلی جاتی ؟

فرشتہ نے جواب دیا : " اگر اس کی اصلاح ہوجاتی تو اسے خود قتل کر دیا جاتا۔ اور اس کے ہونے والے بیوی بچوں کو بھی "

" لیکن" صادق نے کہا " کیا یہ ضروری ہے کہ جرم اور بدقسمتی ہمیشہ قائم رہیں۔ کیا اچھے کام کرنے والوں کا مقسوم یہی ہے کہ ان کے ساتھ ظلم ہو؟ "

فرشتہ نے کہا : " بدکار ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ وہ اس لئے ہیں کہ اچھے انسانوں کا امتحان لیا جاسکے۔ اور ہر شر ایک خیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے "

" لیکن" صادق نے کہا " فرض کیجئے کہ دنیا میں شر نہ ہوتا صرف خیر ہوتا "

فرشتے نے جواب دیا : " تو یہ دنیا دوسرے قسم کی ہوتی۔ واقعات کا تسلسل دوسرا ہوتا۔ جو کسی دوسری عقل کل کی کارفرمائی کا مظہر ہوتا۔ اور وہ نظام کامل جہاں شر کا گذر نہ ہو صرف ذاتِ باری ہی میں قائم ہوسکتا ہے۔ اس نے کروڑوں مخلوقات پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے جدا ہے۔ یہ ایک لامحدود قوت ہی کا ظہور ہوسکتا ہے۔ دنیا کے لاتعداد درختوں پر دو پتے ایسے نہیں جو ایک جیسے ہوں۔ دو ستارے ایسے نہیں جو مماثل ہوں، اور یہ کرۂ ارض جس پر تم پیدا ہوئے ہو، زمان و مکان کے اس مقام پر معین کر دیا گیا جس کا تعین اس عقل کل نے کیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بچے کا پانی میں ڈوبنا اور مکان کا جل جانا اتفاقی حادثہ تھا۔ لیکن اتفاقی حادثہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہر واقعہ یا امتحان ہے یا سزا۔ انعام ہے یا مصلحت ...... اے انسانِ فانی ! تجھے ہر حال میں شکر کرنا چاہئے، اس کے خلاف حجت نہیں کرنی چاہئے "

" لیکن ...... " صادق نے کہنا شروع کیا۔

جونہی صادق نے " لیکن " کہا فرشتہ فلکِ دہم کی طرف پرواز کرگیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ " لیکن " ہے جس کا کوئی جواب عقل و فہمِ انسانی آج تک نہیں دے سکی۔ اور وہ " آخری لیکن " یہ ہے کہ جو ذات ہر شئے پر قادر ہے وہ ایسی دنیا تخلیق نہیں کرسکتی تھی جس میں یہ شر اور مصائب و آلام نہ ہوں۔ کہا جائے گا کہ ان کے بغیر جزا اور سزا ممکن نہ ہوتی یا شر کے بغیر خیر کا اور مصائب کے بغیر آرام کا تصور ممکن نہ ہوتا۔ لیکن " ممکن نہ ہوتا " کا جملہ اس ہستی کے لئے استعمال نہ ہونا چاہئے جس کے لئے سب کچھ ممکن ہے۔ کوئی چیز ناممکن نہیں ــــ

والتیر ایک عظیم فن کار کی طرح اس نازک مقام سے نہایت خوب صورتی کے ساتھ گذر گیا ہے۔ اور یہ احساس دلا گیا ہے کہ اس "لیکن" کا جواب ان سماوی ہستیوں کے پاس بھی نہیں جن کی نظر ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں محیط ہے۔

ملکۂ نشر

والتیر نے "صادق" کا انتساب دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے۔ یہ انتساب حضرت شیخ سعدیؒ کی طرف سے ہے۔ کتاب 'ملکۂ نشر' کے نام معنون کی گئی ہے۔ والتیر کے ہم عصروں کا خیال ہے کہ "ملکۂ نشر" سے مراد شاہ فرانس لوئی پانزدہم کی مشہور منظور نظر مادام پامپادور (Piompadour) تھی[1] جو والتیر کی مخالف ہو گئی تھی۔ انتساب ایک خط کے ذریعہ کیا گیا ہے جو طنز ملیح کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ خط کا انداز حتیٰ کہ تاریخ تحریر بھی مشرقی ہے۔ خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

معروضۂ انتساب "صادق"
بخدمت ملکہ سلطانۂ نشر
منجانب سعدیؔ۔
مورخہ ۱۰ ماہ شوال ۸۳۷ ہجری
سحر نگاہ۔

میں آپ کی خاک پا کو بھی نہیں چوم سکتا۔ کیونکہ آپ بہت کم محو خرام ہوتی ہیں۔ اور جب ہوتی بھی ہیں، تو آپ یا تو ایرانی قالین یا پھولوں کو یہ اعزاز بخشتی ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں ایک حکیم قدیم کی ایک کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ خوش قسمتی سے اس حکیم کے پاس "صادق" کی کہانی لکھنے کے علاوہ کوئی

---

[1] دیکھئے Henri Benac: Voltaire. Romans et Contes Classiques Garnier صفحہ ۶۱۶

مارکس پمپادور (۱۷۲۱-۱۷۶۴) شاہ فرانس، حکومت اور سیاست پر بہت زیادہ اثر انداز تھی۔ حتیٰ کہ ہفت سالہ جنگ کی زیادہ تر ذمہ داری اسی خاتون پر ہے۔ وہ موسیقی، ڈرامہ اور ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتی تھی۔ اس نے شاہ کی دل بستگی کے لئے قصر و رسائی میں ایسی محفلیں منعقد کیں جو فرانس کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ وہ ادیبوں اور فن کاروں کو بھی نوازتی تھی۔ خود والتیر عرصے تک اس کا درباری رہا۔ لیکن بعد میں اپنی تلون پسندی اور بدمزاجی کی وجہ سے وہ والتیر سے ناراض ہو گئی اور والتیر کو جلاوطن ہونا پڑا — مادام پامپادور کے دلچسپ حالات زندگی پر فرانسیسی ادب میں بہت مواد موجود ہے۔ یہ داستان پھر کبھی لکھوں گا۔

دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ اس کتاب میں حسن کے علاوہ "ماورائے حسن" بھی کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔

میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسے ملاحظہ فرمائیں اور اس پر غور فرمائیں کیونکہ گو آپ اپنی زندگی کی بہاریں ہیں۔ گو زندگی کی تمام مسرتیں آپ کو ڈھونڈتی ہیں۔ گو آپ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں۔ اور آپ کی ذہانت آپ کے حسن کی ہم پلہ ہے۔ اور گو صبح سے شام تک آپ کی تعریف ہی ہوتی ہے۔ اس لئے ان تمام وجوہ کی بنا پر آپ میں عقل سلیم تقریباً مفقود ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا ذہن نہایت رسا اور آپ کا مذاق نہایت سلیم ہے اور میں نے آپ کو اس موثر طریقے پر بحث کرتے سنا ہے کہ جبہ و دستار پہننے والے سفید ریش درویش بھی ایسی بحث نہیں کر سکتے۔ آپ مصلحت اندیش ہیں لیکن شکی مزاج نہیں۔ آپ شیریں سخن ہیں لیکن کمزور نہیں۔ آپ داد و دہش میں محتاط ہیں۔ آپ اپنے دوستوں کو چاہتی ہیں اور اپنے دشمن نہیں بناتیں۔ آپ کی بذلہ سنجی کبھی عیب جوئی اور بہتان طرازی کا سہارا نہیں لیتی۔ آپ نہ کسی کو برا کہتی ہیں نہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے لئے آپ کے پاس ہر طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ مجھے آپ کی روح بھی اتنی ہی پاکیزہ معلوم ہوتی ہے جتنا کہ آپ کا حسن۔ اس کے علاوہ آپ فلسفہ سے بھی کسی قدر شغف رکھتی ہیں۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ حکیم کی یہ کتاب کسی دوسری خاتون کے مقابلے میں آپ زیادہ شوق سے پڑھیں گی۔

یہ کتاب سب سے پہلے بابل کی زبان میں لکھی گئی۔ جو نہ آپ جانتی ہیں نہ میں۔ اس کے بعد مشہور سلطان علوغ بیگ[1] کی ضیافت طبع کے لئے اس کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں اور ایرانیوں نے "الف لیلہ"[2] اور "الف یوم" کی تصنیف کا کام شروع کیا تھا۔ علوغ "صادق" پڑھنا پسند کرتا تھا۔ لیکن بیگمات الف لیلہ پڑھنا پسند کرتی تھیں۔

علوغ نے ان سے پوچھا: "تم ایسی کہانیاں پڑھنا کیوں پسند کرتی ہو جن میں کوئی عقل کی بات نہیں ہوتی اور جو بے معنی ہوتی ہیں؟"

بیگمات نے جواب دیا: "بالکل ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ہم یہ کہانیاں پڑھنا پسند کرتی ہیں۔"

---

[1] والتیر نے اس کتاب میں سلطان کا نام " Ouloug - beb " لکھا ہے، لیکن بعد اپنی مشہور کتاب تاریخ تمدن Essai sur les moeurs میں صحیح نام یعنی علوغ بیگ (Ouloug beg.) لکھا ہے۔ سلطان علوغ بیگ (۱۳۹۰-۱۴۴۹) تیمور کی نسل سے تھا۔ تاریخ تمدن میں والتیر نے اس کے علم و فضل کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے سمرقند میں سب سے پہلی سائنس کی اکادمی قائم کی۔ (دیکھئے کتاب مذکورہ باب ۸۸)

[2] الف لیلہ کا پہلا فرانسیسی ترجمہ گالاں (Galland) نے ۱۷۰۴-۱۷۰۸ میں کیا۔ الف یوم ۱۷۰۱ — ۱۷۱۲ میں شائع ہوئی۔

مجھے امید واثق ہے کہ آپ ان بیگمات کی ہم خیال نہ ہوں گی۔ اور صحیح معنوں میں علوغ کی تقلید کریں گی۔ میں تو یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ جب آپ اس روزمرہ کی عنب شب (جو الف لیلہ سے ملتی جلتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ عنب شب الف لیلہ کی طرح مزیدار نہیں ہوتی ہے) سے اکتا جائیں گی تو میں ایک لمحہ کے لئے آپ کی خدمت میں باریاب ہو کر کچھ عقل کی باتیں کرنے کی جسارت کروں گا۔ اگر آپ سکندر کے زمانے میں طالستریس[1] ہوتیں یا حضرت سلیمان کے زمانے میں ملکہ صبا ہوتیں تو یہ دونوں بادشاہ دور دراز کا سفر کر کے آپ تک پہونچتے۔

میں ارباب ارض و سماوی سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کے عیش و نشاط میں کبھی کمی نہ ہو۔ آپ کے حسن کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اور آپ کی خوش نصیبی تا ابد قائم رہے۔

سعدی

"صادق" والتیر کی ہلکی پھلکی تحریروں کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس کے افکار عالیہ تو اس کے تاریخی کارناموں میں ملتے ہیں، لیکن کہانیوں اور ناولوں وغیرہ کے ذریعے والتیر نے اپنے افکار کو عوام کی سطح پر پیش کیا۔ اس نے ہر فرسودہ نظام سے بغاوت کی۔ چاہے وہ مذہب کا ہو، ادب کا ہو، یا سیاست کا۔ وہ دو بار باستیل (Bastille) کے زندان میں اسیر ہوا۔ اور آخر کار اس کے افکار کے نتیجے میں جب فرانس میں انقلاب آیا تو ۱۴ر جولائی ۱۷۸۹ء کو اہل پیرس نے سب سے پہلے جو کارنامہ انجام دیا وہ شکست و ریخت زندان باستیل تھا۔

---

[1] Thalestris جو چاہتی تھی کہ سکندر سے اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو جائے۔

منصور قیصر

زبان، تہذیب اور موت

لندن میں جب ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی نوجوان کے کمرے میں اس کی انگریزی محبوبہ نے انگریزی میں
ہوا ایک ایسا خط پڑھا جو پاکستان سے بھیجا گیا تھا تو وہ حیرت سے پوچھنے لگی:

"کیا تمہارے ملک کی کوئی اپنی زبان نہیں ہے؟"

اپنی زبان کے بارے میں وہ پاکستانی نوجوان کیا جواب دیتا، صرف جھینپ کر رہ گیا۔

اصل میں اسے جھینپنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اسے صاف صاف بتا دینا چاہئے تھا کہ اپنی قومی زبان کے بار
س کا کوئی قصور نہیں، کیونکہ اس نے تو آنکھ ہی اس وقت کھولی تھی جب پاکستان بنا تھا، اور پاکستان بننے کے
بعد افراتفری کا ایسا دور تھا کہ قومی کردار یا تو مہاجرین کے کیمپوں میں پڑا تھا یا پھر ناجائز الاٹمنٹوں، جبری
ں اور سیاسی سودے بازی میں مصروف تھا۔ قوم کے لیڈروں نے رات بھر میں امیر ہونے کا منصوبہ بنا لیا تھا، قومی
کر سازشوں میں گھر کر رہ گئی تھی، اور قومی ثقافت مہاجرین کی امداد کے لئے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں فیشن شو اور فیشن
لا رہی تھی۔ قوم کا قائد قوم کو نیا وطن سپرد کر کے خود خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ ایسے حالات میں قومی زبان سے کون
ا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو؟

چند سر پھروں نے قائداعظم کے ارشاد کے مطابق اردو کو قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا، تو اس برسرِ اقتدار
نے انہیں چپ کرا دیا جس نے ساری عمر انگریز کی غلامی کر کے اعلیٰ نوکریاں حاصل کی تھیں۔ یہ طبقہ ہمیشہ اس بات کے
وشاں رہا کہ کسی طور بھی ان کے اقتدار پر ضرب نہ آنے پائے۔ انگریز کے تربیت یافتہ اس طبقہ اور نو دولتیوں نے اپنے
و عوام سے الگ تھلگ رکھنے کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے کہ معاشرتی اقدار کا شیرازہ سارے کا سارا
یا۔ دولت اور ظاہری وجاہت سب سے بڑی قدریں کر رہ گئیں۔ سوسائٹی دو واضح طبقوں میں بٹ گئی:

ایک وہ طبقہ جو بے بس، غریب، ناخواندہ اور وسائل سے عاری تھا۔

دوسرا وہ جو بارسوخ اور برسرِ اقتدار تھا۔

دوسرے طبقے نے اپنی برتری کے لئے لباس، زبان، مادی آسائش اور طرزِ معاشرت تک مغرب سے درآمد

لی۔ لیکن یہ محاورہ بھول گیا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔

پہلے طبقے نے بھی دوسرے طبقے سے رنگ پکڑا۔ اپنی زبان بگاڑی، اپنا لباس بدلا، درآمدی معاشرت کی بھونڈی نقل کی، اور دولت کمانے کے ناجائز ذرائع استعمال کئے۔

مذکورہ طبقوں کے جذبۂ مسابقت نے سوسائٹی میں وہ گل کھلائے کہ قومی مزاج کے بھی ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ اب ایسے حالات میں پرورش پانے والے پاکستانی نوجوان کو جو لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے وسائل بھی رکھتا ہو کیا پتہ چل سکتا ہے کہ ملک کی کوئی اپنی زبان بھی ہے کہ نہیں۔

مجھے اس پاکستانی نوجوان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ کیونکہ اس کی تربیت ہی اس طرح کی گئی ہے کہ اُسے قومی کردار اور تہذیبی روایات کا پتہ نہ چلے۔ پاکستان میں اسے ایسے اسکول میں تعلیم دی گئی جہاں اردو کا داخلہ اسی طرح منع ہے جیسے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں شلوار قمیص کا داخلہ بند ہے۔ اس کے والدین نے بڑی بڑی فیسیں صرف اس لئے دیں کہ اسے انگریزی بولنا سکھایا جائے، اور اس کے اساتذہ اُسے یہ تک نہ بتائیں کہ ڈیڑھ صدی قبل انگریز حکمرانوں نے بھی تسلیم کیا تھا کہ اردو قومی زندگی کی ہر خدمت کی اہلیت رکھتی ہے۔ اردو میں جدید علوم کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ اردو دفتری زبان بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ انہیں انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ انہیں انگریزوں نے اپنے علوم کو اردو میں منتقل کرایا۔ انہیں انگریزوں کے عہد میں سرسید نے قومی انفرادیت کی تحریک چلائی۔ اور انہیں انگریزوں سے تعلیم حاصل کر کے علامہ اقبال اور قائد اعظم نے دو قومی نظریے کی بنیاد رکھی۔ ان اساتذہ نے اسے یہ بھی نہ بتایا کہ انگریزوں نے اردو کو ترک کر کے انگریزی کو رائج کیا تھا تو اس کی وجہ صرف مسلمانوں کے خلاف سیاسی حکمتِ عملی تھی۔

اس میں اس نوجوان کا کیا قصور ہے کہ ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر تعلیم کے دو نظام ہیں۔ عرفِ عام میں جسے پبلک کہتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو پبلک اسکولوں میں بھیجنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ پبلک کے بچوں کے لئے ایسے اسکول ہیں جہاں جذبۂ قومی موجود ہے لیکن احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبا ہوا۔ جہاں مذہب ہے لیکن اس میں ترقی پذیر معاشرہ کی ہم آہنگی نہیں۔ دو مختلف قسم کے اسکولوں سے نکلی ہوئی، دو مختلف قسم کی پاکستانی نسلیں آج بھی ذہنی طور پر گتھم گتھا ہیں، اور وہ کل بھی باہم متحارب ہوں گی۔

دونوں کو ایک جان کرنے کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے قومی زبان، جو آسانی سے ذریعۂ تعلیم بھی بن سکتی ہے دفتری زبان بھی بن سکتی ہے۔ اور قومی تہذیب کی علامت بھی بن سکتی ہے۔

اگر گذشتہ بیس سال کی طرح ہماری دونوں قومی زبانیں اپنا مقام ہی متعین کراتی رہیں تو پھر وہ دن دور نہیں جب نئی نسل کا کوئی نوجوان تورخم کے بارڈر پر کھڑا ایسی بے نیازی سے اس انداز میں سوچے گا کہ سرحد سے بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا شخص پاکستانی نہیں ہے۔ نہ ہندوستان کا علاقہ عبور کر کے سُندربن میں رہنے والا پاکستانی ہے۔ آخر یہ کیوں ہے؟ یہ ذہنی بُعد ایک ایسے المیئے کا آغاز کرے گا جو تحریک پاکستان کی روایت کو زبردست نقصان پہونچائے گا۔

میں اپنی یہ گذارشات قلم بند کر ہی رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی طرف سے جاری کردہ ایک مطبوعہ اپیل موصول ہوئی جس پر جلی حروف سے درج تھا کہ:

"اردو کے لئے جمہور کی اپیل"
اس میں لکھا ہے کہ:

"یہ صحیح ہے کہ دستور اساسی میں اردو اور بنگالی دونوں کی قومی حیثیت تسلیم کی گئی ہے، لیکن قومی زندگی میں ان کو جگہ دینے کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا ہے، اور اس کے سلسلے میں سنہ ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن کی تجویز کی گئی ہے جو یہ فیصلہ کرنے کے لئے مقرر ہوگا کہ اردو اور بنگالی زبانیں کب اور کس طرح سرکاری اور دفتری زبانیں بنائی جائیں۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس کمیشن میں کون لوگ ہوں گے۔ تحقیقات کا طریقۂ کار کیا ہوگا۔ اور آخر میں فیصلہ کیا ہوگا؟"

مجھے یہ اپیل بالکل ایک یتیم خانے کی اپیل نظر آئی۔ اگر سارے جہاں میں دھوم مچانے والی زبان ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو جائے، تو یہ ہماری تہذیب کی موت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس اپیل کی جو پذیرائی ہوگی وہ بھی سن لیجئے:—

ایک بار ایک یتیم خانے کے منتظمین نے اخبار میں اپیل شائع کرائی کہ ایک نیا یتیم خانہ قائم کیا گیا ہے اس کے لئے امداد کی جائے۔ اس اپیل پر کسی نے نقدی بھیج دی کسی نے کپڑے بھیج دیئے۔ کسی نے کتابیں بھیج دیں، اور کسی نے اناج بھیج دیا۔ لیکن ایک بارسوخ شخص نے منتظمین کو خط کے ذریعے مطلع کیا کہ: "جناب میں یتیم خانے کی امداد کے لئے چھ یتیم بھیج رہا ہوں!"

یہ تسلیم کہ سرسید سے لے کر قائد اعظم تک مسلمانوں کی فکری تحریک کے ساتھ ساتھ گیسوئے اردو منت پذیر شانہ ہے۔ لیکن جب زبان مشاطگی کے بعد دلہن بن کر بیٹھ گئی تو اب صرف اس لئے اس کا نقاب نہیں اٹھایا جاتا کہ شاید یہ بدصورت نہ ہو، اور اس طرح کہیں انگریزی کا حسن بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ حالانکہ ڈرنے والوں کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس دلہن کے آریائی جسم میں ایرانی خون ہے، اس کے چہرے پر وسطی ایشیا کا شکوہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں مشرقِ اوسط کی چمک ہے اور یہ مغربی میک اپ کو سلیقے سے استعمال کرنا بھی خوب جانتی ہے! اس دلہن سے بات کر کے تو دیکھئے، زندگی کا کون سا پہلو ہے جس پر دسترس نہیں رکھتی۔ سائنس سے لے کر نفسیات تک کے موضوع اس سلیقے سے بیان کرتی ہے کہ اس نے اِدھر بات کی اُدھر دل میں اتر گئی۔ اگر آپ کا حافظہ کمزور نہیں تو حیدرآباد دکن میں اس کی جادو بیانی کے قصے آپ کو یاد ہوں گے۔ تمام علوم جدیدہ کی تعلیم اور دفتری امور اسی زبان میں ہوتے تھے۔ اس ضمن میں بابائے اردو کی خدمات تو کوئی پرانی بات نہیں۔ اردو کالج تو اب بھی کراچی میں تمام علوم کی تعلیم اپنی زبان میں دے رہا ہے!

کوئی زبان صرف زبان کی حد تک انفرادی نہیں ہوتی، بلکہ اپنے ساتھ اپنا تہذیبی ورثہ اور انداز فکر بھی لاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ انگریزی نے ہمیں نئے علوم سے روشناس کرایا۔ لیکن یہ زبان اپنی تہذیب کی تمام قباحتیں بھی اپنے ساتھ لائی۔ اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہماری سوسائٹی کے بارسوخ طبقے نے ان قباحتوں کو سوشل ایٹی کیٹ سمجھ کر

کرلیا۔ مغربی سامراج تو اس بات پر خوش ہے کہ اُس نے ایشیا کی ایک ترقی پذیر قوم میں دیرا اثر زہر گھول دیا ہے
اس پر بھروسے نہیں سما رہے کہ ہم مغرب کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی مغربی سامراج ہے
نے اس ملک پر ڈیڑھ صدی حکومت کی۔ یہ وہی مغربی سامراج ہے جو افریقہ ایشیا کو کھوکھلا کرنے اور امن ختم
کرنے کے لئے اسلحے سے لے کر تہذیب تک رشوت دیتا ہے۔ یہی وہ مغربی سامراج ہے جو گندم کے ایک دانے کے
ساتھ بیٹلز اور راک اینڈ رول کا گراموفون ریکارڈ اور جیمز بانڈ کا ناول بھی بھیجتا ہے۔ مغرب کا یہی عطیہ ہے کہ لندن
میں پاکستانی نوجوان اپنی محبوبہ کو یہ بتلانے سے جھینپ جاتا ہے کہ اس کی قومی زبان کون سی ہے؟ آج تو وہ صرف
زبان کے بارے میں صرف جھینپتا ہے اور کل وہ یہ بھی نہیں بتا سکے گا کہ اس کا مذہب اور اس کی تہذیب کیا ہے؟

مجھے انگریزی زبان سے کوئی دشمنی نہیں۔ یہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک اہم وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے
جس سے ہم دنیا کے قریب ترین ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے اپنی قومی زندگی پر ہی پیرِ تسمہ کی طرح
سوار کرلیں۔ ہمارے طرزِ احساس کی چھوٹی سی مثال تو یہ ہے کہ ہم کسی کیمسٹ سے سوڈا بائی کارب اور سوڈیم کلورائڈ
مانگیں تو وہ مسکرا کر شیشیاں اٹھا دیتا ہے۔ اور جب یہی چیزیں میٹھا سوڈا اور کھانے کا نمک کہہ کر مانگی جائیں تو وہ ماتھے پر
بل چڑھا کر پرچون والے کی دوکان کا رستہ بتاتا ہے۔ کیا میٹھا سوڈا اور کھانے کا نمک، سوڈا بائی کارب اور
سوڈیم کلورائڈ سے بڑے لفظ ہیں یا اُن کی ظاہری حیثیت بدل جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنی ہی خواہشات کے غلام
بننے میں لطف محسوس کرتے ہیں، ورنہ اردو کو قومی زبان بننے کے لئے کسی لمبی چوڑی جانچ کی ضرورت نہیں، اور پھر یہ
ضرب المثل تو تقریباً سب زبانوں میں موجود ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت پھر اس بات کی ہوگی
کہ ماں کو ماں سمجھا جائے، طوائف نہیں!

منور ہاشمی

رقصِ شرر

سرمئی شام، دل آویز فضا، ابر کی چھاؤں
کتنے گل چہرہ و سیمیں بدناں یاد آئے
نقش بنتے رہے، مٹتے رہے خوابوں کی طرح
بادل اڑتے رہے، یخ بستہ ہوا چلتی رہی
دامنِ ابر سے تھم تھم کے جو موتی برسے
گنگنانے لگی رات

چاند نکلا تو چمکنے لگے دشت و در و بام
ملکۂ شب کی مہک دستِ صبا سے ٹکرائی
چاندنی تھی کہ برستی ہوئی مے
دل کی تنہائی نے بھی کوئی سہارا نہ دیا
لاکھ چاہا کہ سمٹ جائے سکوتِ شبِ غم
ساغرِ زہر اگر ہو تو اسے پی جاؤں
پر گراں باریٔ شب کم نہ ہوئی

مشعلیں کتنی ہی یادوں کی جلیں اور بجھیں
دیر تک جلتے رہے ذہن میں ناموں کے دیئے
تھرتھراتے ہوئے تارے تھے کہ تھا رقصِ شرر
صبح نے رات کے ہاتھوں میں دیا زہر کا جام
رات کس طرح کٹی یہ مجھے معلوم نہیں
بجھتے بجھتے نہ ہوا شعلۂ دل خاک کا ڈھیر

مقصود زاہدی

سالگرہ

اِک چراغ اور جلا
اِک چراغ اور بُجھا

اِک قدم اور بڑھا
کچھ سفر اور گھٹا

بوجھ کچھ اور گرا
بوجھ کچھ اور بڑھا

ایک سال اور کٹا
ایک سال اور گھٹا

رُباعیاں

ہر نوکِ قلم پر ہیں کچھ الفاظ جُدا
ہر جنبشِ لب سے ہیں عیاں راز جُدا
سودا ہے ہر اک سر میں زمانے سے الگ
ہر دل کے محبت کے ہیں انداز جُدا

دعوائے خرد اور یہ چھینے کا جنوں
یہ لاف و گزاف اور یہ اعمالِ زبوں
ہم اہلِ قلم تھوڑی سی شہرت کے لئے
کس شوق سے پی لیتے ہیں احباب کا خوں

ہر رنگ کے حالات بنا کر دیکھے
سب دیر و خرابات مٹا کر دیکھے
انسان کی افتاد وہی ہے کہ جو تھی
صدیوں کے حجابات اٹھا کر دیکھے

مظفر علی سیّد

قلم، میرا نیزہ

قلم میرا نیزہ رہا ہے
کہ بچپن میں اس کا یہی نام تھا
اگرچہ کسی سے قلم کی لڑائی نہ تھی

قلم میرا نیزہ ہے اب بھی
کہ دشمن کے سینے میں
نیزے کی مانند پیوست ہے

مگر اب، ثقہ لوگ
کروٹ کے بل، اُجلی مسند پہ تکیہ جمائے
(وہ مسند کہ اُن کے لئے مستند ہے
وہ تکیہ سخن کے لئے آخری آسرا ہے)
یہ ارشاد کرتے ہیں: "غیظ و غضب بے محل ہے
(محل میں جو رہتا ہے شاید وہی بر محل ہے)
میاں، چھوڑو بچپن کی باتیں، لڑکپن کے قصے
یہ تحریر ہے، نیزہ بازی نہیں ہے
کہ اب تو مصنف، ادیب اور شاعر
وہی آدمی ہے جو غازی نہیں ہے!

نریش کمار شاد

ترائیلے

فرانسیسی شاعری کی ایک مقبول صنف

۱ - اپنی بیوی سے

کس درجہ دل نشیں تھے مری زندگی کے خواب
دیکھا نہیں تھا جب تجھے بیوی کے روپ میں
تعبیر میں جو ڈھل کے بنے مستقل عذاب
کس درجہ دل نشیں تھے مری زندگی کے خواب
میرے تصورات کے ہنستے ہوئے گلاب
مرجھا کے رہ گئے ہیں حقائق کی دھوپ میں
کس درجہ دل نشیں تھے مری زندگی کے خواب
دیکھا نہیں تھا جب تجھے بیوی کے روپ میں

۲ - اپنے بچے سے

بارہا یہ سوچتا ہوں اے مرے لختِ جگر!
میرے[ل] بس میں ہو تو میں تجھ کو جواں ہونے نہ دوں
میرے بس میں ہو اگر یہ گردشِ شام و سحر
بارہا یہ سوچتا ہوں اے مرے لختِ جگر!
کھیلتا رہتا ہے جو تیرے رُخِ معصوم پر
وہ تبسم نذرِ اندوہِ جہاں ہونے نہ دوں
بارہا یہ سوچتا ہوں اے مرے لختِ جگر!
میرے بس میں ہو تو میں تجھ کو جواں ہونے نہ دوں

۳ - اپنے آپ سے

وہ بھی تو خوش نہیں ہیں جہانِ خراب میں
اے شادؔ، زندگی میں جنہیں کوئی غم نہیں
وہ بھی تو مبتلا ہیں خیالی عذاب میں
وہ بھی تو خوش نہیں ہیں جہانِ خراب میں
تو غم نصیب تو ہے بھلا کس حساب میں
تیری طرح جو کشتۂ تیغِ ستم نہیں
وہ بھی تو خوش نہیں ہیں جہانِ خراب میں
اے شادؔ، زندگی میں جنہیں کوئی غم نہیں

[ل] یہ مصرعہ معمولی سی ترمیم کے ساتھ فاخر ہریانوی کا ہے۔ (شادؔ)

سحر انصاری

آبِ جُو

تجھے میرے قرب سے کیا ملا
کہ مرا وجود تو ایک دشتِ خراب ہے
جسے ایک لمحۂ آرزو بھی عذاب ہے

ترا جسم موجۂ آبِ جو
جسے میرے قرب کی تپتی ریت نے پی لیا
زہے جستجو، زہے آرزو!

تری اس میں کوئی خطا نہیں
کسی تشنہ رُوح کو آبِ تازہ کی پیش کش
تو سدا سے کارِ عظیم ہے
تجھے کیا خبر تھی کہ تازہ موجۂ آب جو
کسی تشنہ دشت میں آکے اپنے وجود کو
نہ بچا سکے گی غمِ وفا کے سراب سے
نہ بچا سکے گی فشارِ جاں کے عذاب سے

رب نواز مائل

تذبذب

راستوں پر دُھند، گلیوں میں دُھواں
اور سر پر سایۂ ابرِ رواں
اب مرا سورج نہیں ہے رازداں

شام کا منظر بھی گہرا سُرمئی
اب کہاں دن کا اُجالا نقرئی
دو گھڑی میں رنگ دیکھے ہیں کئی

رات کا بھی کیا بھروسہ کیجئے
تیرگی کے زخم دل پر لیجئے
بے بسی میں ساتھ غم کا دیجئے

سوچتا ہوں دل سی شے کا کیا کروں
مختصر جینا ہے کیا کیا غم سہوں
زندگی یا موت کس کا ساتھ دوں

لطف الرحمٰن

خوں بہا

یہ لمحہ جو صدیوں میں تبدیل ہوتا چلا جا رہا ہے
یہ لمحہ وہی ہے کہ جس کو
گذشتہ کئی سو برس سے میں پہچانتا ہوں
جسے اُس کے قدموں کی آواز سے جانتا ہوں

یہ لمحہ وہی ہے
جو صدیوں سے خنجر کی صورت مری روح میں زخمہ زن ہے
یہ لمحہ وہ ناگن ہے جس نے
مجھے ڈس لیا ہے
مری زندگی میں ازل سے ابد تک کا بس بھر دیا ہے
یہی ایک لمحہ جو صدیوں پہ پھیلا ہوا ہے
مسلسل تعاقب مرا کر رہا ہے
یہ لمحہ وہی ہے جو پچھلے کئی سو برس سے
مرے آفتابِ درخشاں کو گہنا رہا ہے

یہ لمحہ وہی ہے
جو مجھ سے مرے عہدِ رفتہ کی سب لغزشوں
اور ناکردہ ساری خطاؤں کا پھر خوں بہا مانگتا ہے

اس نے کئی سو برس پیشتر وادیِ کربلا میں
سلگتے ہوئے ریگزاروں پہ مجھ سے
مرے جرمِ حق اور صداقت پرستی کی قیمت طلب کی
فرات آج تک جس کا افسانہ خواں ہے
فرات آج تک جس پہ نوحہ کناں ہے

یہ لمحہ وہی ہے
جو مجھ سے مری شان و شوکت کی قیمت
لہو کی اک ایک بوند گن کر
کبھی قصرِ حمرا کی اک اک روش پر طلب کر چکا ہے
اور اب مسجدِ قرطبہ سے چمٹ کر
مرے نقشِ خونِ جگر کا لہو چاٹتا ہے

کبھی میں نے گوبی کے صحرا سے اُٹھ کر
مصائب کے طوفاں
غم و درد و رنج و الم کے بگولوں کو پہلو میں لے کر
خراساں کی سرزمینِ حسیں پر
کبھی شہرِ بغداد میں میرے گھر پر
بشکلِ خزاں آ کے دستک لگائی
تباہی کے خونیں ڈرامے
مرے علم و فن کے حسیں شیش محلوں پہ قہرِ الٰہی کی صورت میں ٹوٹا
مری رنگ و نکہت کی بستی میں سیلِ بلا بن کے آیا
یہ لمحہ وہی ہے

یہی ایک لمحہ
سنائی کے شعلہ صفت ریگزاروں
لبِ نیل — غازہ کے تپتے ہوئے زخمزاروں
سے اپنے گناہوں کے سب داغ دھبے مٹانے کی خاطر
مرے جسم کے ایک اک قطرۂ خوں کا طالب ہے اب بھی
خلیجِ عرب، شام اور بیتِ مقدس میں میری زمیں پر۔
یہی ایک لمحہ
یہی میرا قاتل
مرے عہدِ رفتہ کی سب لغزشوں
اور ناکردہ ساری خطاؤں کا پھر خوں بہا مانگتا ہے
یہی ایک لمحہ جو صدیوں میں تبدیل ہوتا چلا جا رہا ہے

شعور ہستی

مری ہستی ہے کیا؟
کوزے میں دریا
مجھے جس کی تمنا تھی وہ میں ہوں
بجز ہستی نہیں کچھ بھی جہاں میں
مجھے جس نے بنایا ہے وہ میں ہوں
ہزاروں رنگ میں جو بٹ گیا ہو
وہ میں ہوں
اور یا میرا خدا ہے
تصور نے بنا ڈالیں پناہیں
خدا دیر و حرم میں کب رہا ہے؟
تراشے گو کمالِ فن نے پیکر
تخیل کے مقید زاویوں سے
خدا ان زاویوں میں کب ڈھلا ہے؟
کبھی حاضر بھی غائب ہو سکا ہے؟
نہیں جو زاویوں میں ڈھلنے والا
وہ میں ہوں
یا خدا ہے نام اُس کا
مری ہستی ہے کیا؟
کوزے میں دریا
مجھے جس کی تمنا تھی وہ میں ہوں!

مہر اظہر

خودکشی

راستے سو بھی گئے رات کا آنچل پھیلا
برگِ آوارہ کی مانند سرِ راہِ خیال
سوچتا ہوں کہ کہیں زہر پیوں مرجاؤں
خودکشی جرم سہی، جرم کی تکمیل کروں

گوشۂ دل میں ہے اک کرب کا عالم کب سے
کس قدر تیز ہوئی جاتی ہے احساس کی لَو
اب بھی ہر زخم مہکتا ہے گلوں کے مانند
اب بھی ہے تلخیٔ حالات کا رگ رگ میں اثر

نور میں ڈوبے ہوئے شہر کا ریزہ ریزہ
آگ بن کر جو اُبھر آئے تو بہتر ہوگا
دوشِ امید پہ رکھی ہوئی امکان کی لاش
برف کی طرح پگھل جائے تو بہتر ہوگا

ابراہیم یوسف

بنتِ عم

منظر: شبو کا کمرہ۔ ہر چیز بڑے قرینے سے سجی ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمرے کو خاص طور پر سجایا گیا ہے۔ ہر چیز صاف ستھری ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو شبو آئینے کے سامنے کھڑی بال برابر کرتی نظر آتی ہے۔ اسی وقت لطفی کمرے میں داخل ہو کر شبو کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے۔

لطفی: زلفیں سنوارنے سے بنے گی نہ کوئی بات
اُٹھئے کسی غریب کی قسمت سنواریئے

شبو: (پلٹ کر لطفی کو دیکھ کر) آپ بھی کس قدر واہیات شعر یاد رکھتے ہیں۔

لطفی: واہیات! کمال ہے یہ واہیات شعر ہے۔ (شبو کے پاس آتے ہوئے) اور آپ کے پسندیدہ شعر کون سے ہیں؟

شبو: میرے؟ (مسکرا کر) سے

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

لطفی: (قہقہہ مار کر) بہت خوب۔ پھر تو آپ کو یہ شعر بھی پسند ہوگا۔
"ایک لڑکی بگھارتی ہے دال"

شبو: کیوں نہیں۔ بے حد پسند ہے۔ یہ آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟

لطفی: بس کالج سے چلا آ رہا ہوں۔

شبو: کالج سے!! اب تو سات بجنے والے ہیں۔

لطفی: جی ہاں کیا بتلائیں ہمارے اردو کے پروفیسر کی رگِ خوشنویسی پھڑک اٹھی تھی۔

شبو: رگِ خوشنویسی! (مسکرا کر) یہ جسم کے کس حصہ میں پائی جاتی ہے؟

لطفی: (بے حد سنجیدہ شکل بنا کر) خالص دماغ سے اس کا تعلق ہے جہاں سے خبطی پن پیدا ہوتا ہے فرمانے لگے تم سب کے ہینڈ رائٹنگز انتہائی گندے واہیات بلکہ جاتی ہیں۔ بس سب سے

افرادِ تمثیل

افسر بیگ	:	ایک معقول اور زندہ دل بزرگ
حمیدہ	:	افسر بیگ کی بیوی
شبو	:	افسر بیگ کی لڑکی
لطفی	:	شبو کا چچا زاد بھائی

دو دو صفحے اس وقت تک نقل کراتے رہے، جب تک ان کو یقین نہیں ہو گیا کہ ہم سب اعلیٰ درجے کے خوشنویس بن چکے ہیں۔

شبو: (قہقہہ مار کر) پھر تو کافی سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں۔

لطفی: جی ہاں — میں تو خدا سے دعائیں مانگتا رہا کہ کہیں میری صحت کی طرف ان کا دھیان نہ چلا جائے اور اس کو واہیات کہہ کر ڈنڈ پیلنے اور مگدر ہلانے کا حکم صادر نہ فرما دیں۔ (چند سیکنڈ رک کر) یہ آپ اس وقت کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟

شبو: کہیں کی بھی نہیں۔ آج ہماری خالہ جان آ رہی ہیں۔

لطفی: کونسی خالہ جان؟

شبو: وہی جن کے یہاں گئے سال ہم چھٹیوں میں مہمان گئے تھے۔

لطفی: ارے وہی، جن کے ایک صاحبزادے کچھ کریک سے ہیں؟

شبو: یہ آپ سے کس نے کہہ دیا (مسکرا کر) کہ کریک سے ہیں۔

لطفی: آپ ہی اکثر کہا کرتی ہیں کہ وہ کچھ ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

شبو: میں نے کریک تو کبھی نہیں کہا۔ ہاں کچھ کھوئے کھوئے سے ضرور رہتے ہیں۔ (مسکرا کر) یا پھر ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔

لطفی: تو پھر آپ نے خبطی کہا ہوگا۔

شبو: (میں نے خبطی کہا، آپ تو اپنی طرف سے ہر کچھ فرض کر لیتے ہیں۔

لطفی: خیر خبطی بھی نہ کہا ہوگا۔ کیا وہ بھی تشریف لا رہے ہیں؟

شبو: آنے کو تو لکھا ہے۔ اب دیکھئے۔

لطفی: تو پھر یہ نہیں کے خیر مقدم کی تیاریاں ہیں۔ آپ اُن سے میری ملاقات کرائیں گی؟

شبو: کیوں نہیں۔ (مسکرا کر) آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔

لطفی: (مسکرا کر) اور وہ مجھ سے مل کر؟

شبو: (ہنس کر) یہ وہ جانیں۔ آپ کی بات تو اس لئے کہہ دی کہ آپ کو سب سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ (مسکراتے ہوئے) اس روز آپ نجمی صاحب کے صاحبزادے سے ہی کہہ رہے تھے کہ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، حالانکہ وہ صاحبزادے انتہائی بور واقع ہوئے تھے۔

لطفی: (ہنس کر) بور لوگوں سے مل کر مجھے واقعی خوشی ہوتی ہے۔ آخر ان سے مل کر بھی تو کوئی خوش ہونے والا ہو — آپ کی خالہ جان کب آ رہی ہیں؟

شبو: آتی ہی ہوں گی۔ پاپا اسٹیشن گئے ہیں۔

لطفی: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اب میں بھی ذرا جا کر انسان بن جاؤں۔ آپ کے ان کھوئے کھوئے سے رہنے والے بھائی صاحب سے ملاقات کرنا پڑے گی۔

(اسی وقت حمیدہ کمرے میں داخل ہو کر)

حمیدہ: اری شبو، ان لوگوں کے کمرے تیار ہیں؟

شبو: جی ہاں، وہ تو صبح تیار کرا دیئے تھے۔

حمیدہ: (لطفی کو دیکھ کر) لطفی میاں! تم نے اپنے کمرے کی کیا گت بنا رکھی تھی۔ شبو کو صبح سمیٹنا پڑا۔

اس کی صفائی میں (لطفی مسکراتا ہے) اب تم
کہاں جا رہے ہو؟

لطفی: چچی جان۔ میں ذرا انسان بننے جا رہا ہوں۔

حمیدہ: اس وقت تم کہاں کے حیوان ہو؟

لطفی: دیکھئے نا۔ حلیہ سے تو میں بھلا آدمی نظر نہیں آتا
اور پھر آپ کی آپا جان آ رہی ہیں۔ ان سے ملنے
کے لئے کم ازکم حلیہ تو معقول ہونا چاہئے (ہنستے
ہوئے) ورنہ کہیں گی: آپ نے بھی کہاں کہاں کے
نمونے پال رکھے ہیں!
(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ حمیدہ کچھ دیر خاموش
رہ کر)

حمیدہ: شبو! یہ لطفی کل رات تیرے کمرے میں کیوں آیا
تھا؟

شبو: (حیرت سے) میرے کمرے میں! نہیں تو۔

حمیدہ: تیرے پاپا نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ رات
کوئی بارہ کا عمل ہوگا۔

شبو: کل تو میرے سر میں درد تھا، دس بجے ہی سو گئی
تھی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں آئے تھے۔

حمیدہ: تیرے کمرے میں ایک بام کی شیشی رکھی ہوئی تھی
تو نے بازار سے منگوائی تھی؟

شبو: جی نہیں۔ وہ تو میں نے بھی دیکھی تھی۔ میں سمجھی
شاید آپ یا پاپا رکھ گئے ہیں۔

حمیدہ: تو پھر وہی رکھنے گیا ہوگا، اور تجھے سوتی دیکھ کر
واپس آ گیا ہوگا۔
(حمیدہ کچھ دیر خاموش رہ کر)
تو اپنے پاپا کے ساتھ اسٹیشن نہیں گئی؟

شبو: جی ہاں مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔

حمیدہ: اچھا اچھا [illegible]

گے اور ذرا خیال رکھنا، آپا جان ذرا تیکھے مزاج
کی ہیں ان کی باتوں کا برا نہ ماننا۔

شبو: (مسکرا کر) میں نے کب اُن کی باتوں کا بُرا
مانا ہے۔

حمیدہ: عمر کے ساتھ ساتھ آدمی بلا وجہ چڑچڑا ہو جاتا
ہے اور پھر وہ تو اگلے وقتوں کی ہیں۔ یہ آج کل
کی اچھل کود انہیں پسند نہیں۔

شبو: میں ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔
(افسر بیگ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ حمیدہ
انہیں دیکھ کر)

حمیدہ: آپ تو تنہا آ گئے! — کیا آپا جان نہیں آئیں؟

افسر بیگ: (ایک کرسی پر بیٹھ کر) ارے صاحب کوئی
ٹھکانہ ہے۔ گاڑی پورے سات گھنٹے لیٹ ہے

حمیدہ: سات گھنٹے؟

افسر بیگ: جی ہاں۔ گویا اب دو بجے کے قریب آئے
گی۔ اور اس کا بھی کیا ٹھکانہ۔ ریل گاڑی کیا ہے
چھکڑا ہو گیا۔ جب جی چاہا چلا دیا، جب جی چاہا
بیلوں کو گھاس چرانے لگے۔

حمیدہ: غضب خدا کا۔ اب سارا پکا پکایا کھانا سڑتا
رہے گا۔ کم بخت ریل بابو ہر اسٹیشن پر تو اتر کر
چائے پیتے ہیں۔ بس اسی میں گاڑی لیٹ ہو جاتی
ہے۔

افسر بیگ: بس آپ اپنی قابلیت رہنے دیجئے۔

حمیدہ: تم تو مجھے بولنے ہی نہیں دیتے۔ آخر اس مرتبہ
ہم علی گنج گئے تھے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے
کنڈکٹر چائے پینے جاتا تھا پھر تھانیدار، اور سب
کے بعد میں گلیزر اسی میں گھنٹہ گھنٹہ لگ جاتا
تھا کم بخت کبھی ایک ساتھ نہیں جاتے تھے۔

افسر بیگم : وہ ریل تھی ؟ تم کو ریل اور بس میں بھی تمیز نہیں۔

حمیدہ : جب ریلیں بھی بسوں کی طرح لیٹ ہونے لگیں تو دونوں میں کون تمیز کرے گا ؟

(شبو مسکراتی ہے۔ افسر بیگ ہنس کر)

افسر بیگ : تمہاری اس منطق سے کوئی نہیں جیت سکتا اب جاکر کچھ انتظام کرو کہ کھانا گرم رہے اور خراب نہ ہو۔

حمیدہ : اب دو بجے رات کو میز سجائی جائے گی۔ ارے راستے میں کچھ کھا پی کر آئیں گی۔ تمہارے کھانے کے لئے بھوکی نہیں رہیں گی۔

افسر بیگ : (مسکرا کر، بھئی ہماری تو سالی ہیں۔ تم انتظار کرو یا نہ کرو۔ ہم تو ضرور انتظار کریں گے۔

حمیدہ : آپ کو تو بات بات میں مذاق سوجھتا ہے۔ لڑکی کا بھی خیال نہیں کہ سامنے کھڑی ہے۔

(تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہیں — افسر بیگ کچھ دیر خاموش رہ کر شبو سے)

افسر بیگ : تمہاری ماں اپنی بہن کے آنے پر بہت خوش ہیں۔

شبو : جی ہاں دو تین راتوں سے تو خوشی کے مارے سوئی تک نہیں ہیں۔

افسر بیگ : ارے بھئی خوش ہونا ہی چاہئے۔ ایک ہی بہن ہیں اور کئی سال کے بعد آ رہی ہیں — لطفی کہاں ہے ؟

شبو : اپنے کمرے میں ہوں گے۔ ابھی ابھی کالج سے آئے ہیں۔

افسر بیگ : اتنی دیر میں !

شبو : جی ہاں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) پاپا ! امی امی

کہہ رہی تھیں کہ آپ نے رات بارہ بجے انہیں میرے کمرے میں جاتا دیکھا تھا۔

افسر بیگ : ہاں بیٹی۔ میں بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھے خود حیرت ہے کہ وہ اس قدر رات گئے تمہارے کمرے میں کیوں گیا تھا۔ کیا تم نے اس سے بام کی شیشی مانگی تھی ؟

شبو : نہیں پاپا — میں نے تو آپ سب کے سامنے ہی سر میں درد کی بات کہی تھی، اور پھر جاکر کمرے میں سو گئی تھی — کچھ دن پہلے ایک مرتبہ مجھے اور شک ہوا تھا کہ وہ رات کو میرے کمرے میں آئے تھے۔

افسر بیگ : پھر ؟

شبو : میں خود نیند میں تھی۔ شاید وہ میری میز سے میرا رومال اٹھا کر لے گئے تھے۔

(افسر بیگ خاموش رہتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں)

اسی طرح ایک مرتبہ مجھے ایک کتاب کی ضرورت تھی، یا تو ل باتوں میں تذکرہ کیا تھا اور صبح وہ کتاب مجھے اپنی میز پر رکھی ہوئی ملی تھی۔

افسر بیگ : مگر وہ یہ سب کچھ چوری چھپے کیوں کرتا ہے !

(لطفی کمرے میں آتا ہے۔ افسر بیگ اسے دیکھ کر)

آؤ لطفی میاں، آج کالج سے بہت دیر میں آئے ؟

لطفی : جی ہاں دیر ہو گئی۔ (شبو کی طرف دیکھ کر) کیوں شبی اب میں بھلا آدمی معلوم ہوتا ہوں !

(مسکرا کر) اب تو میں تمہارے ان [illegible] سے بھلے بھائی صاحب سے [illegible]

(شبو خاموش رہتی ہے) ابھی تمہارے وہ بھائی صاحب نہیں آئے ؟

افسر بیگ : گاڑی سات گھنٹے لیٹ ہے ۔

لطفی : سات گھنٹے ! کمال ہے ۔ (پھر شبو کی طرف دیکھ کر) اسے ہاں بھئی ۔ تمہیں چچی جان بلا رہی ہیں باورچی خانے میں ہیں ۔ (مسکرا کر) جلدی چلی جاؤ ورنہ ابھی کی پٹائی ہوجائے گی ، اُس نے کچھ گڑبڑ کردی ہے ۔

(شبو خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے — افسر بیگ لطفی سے)

افسر بیگ : ارے بھئی بیٹھو کھڑے کیوں ہو ۔

لطفی : (بیٹھتے ہوئے) تو گویا اب وہ لوگ رات کے دو بجے تک آئیں گے ۔

افسر بیگ : اس کا بھی کیا ٹھکانہ ۔ گاڑی اور لیٹ ہو گئی تو رات کے چار پانچ بھی بج سکتے ہیں —

(افسر بیگ کچھ دیر خاموش رہ کر)

لطفی میاں تمہارے امتحان کی تیاری کیسی ہورہی ہے ؟

لطفی : چچا جان تیاری تو اچھی کرلی ہے ۔ امید ہے کہ اچھا ڈویژن بھی مل جائے گا ۔ آگے خدا کی مرضی اور آپ لوگوں کی دعائیں ہیں ۔

افسر بیگ : سعادت مندوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں — ہاں ہماری جو سالی آرہی ہیں ان کے صاحبزادے سے ملنا ۔ وہ حضرت شاعر ہیں

لطفی : مجھے ان سے مل کر خوشی ہوگی ۔

(حمیدہ کمرے میں آکر)

حمیدہ : غضب خدا کا ۔ اس اچھن پر ذرا سا کام چھوڑ کر گئی تھی ۔

افسر بیگ : (مسکرا کر) اب کون سی مصیبت نازل ہوگئی ۔

حمیدہ : آپ تو بس مسکرا دیتے ہیں ، اور میں اس اچھو کی حرکتوں پر جل بھن کر کوئلہ ہوجاتی ہوں — سارا کیا دھرا خاک میں ملا دیا ۔

افسر بیگ : (اُسی طرح مسکراتے ہوئے) آخر ہم سے بھی تو کہو کہ اچھن نے کس کا خون کردیا ۔

حمیدہ : میرا خون کردیتا تو اچھا تھا مگر آپا جان یہ آکر تو نہ دیکھتیں کہ بھنڈی تیل میں پکی ہے ۔

افسر بیگ : (ہنس کر) بس اتنی سی بات ہے گھی میں اور بھنڈی پکوا لو ۔

حمیدہ : آپ تو بڑی آسانی سے زبان ہلا دیتے ہیں اور سچ تو ہے زبان ہلانے میں کہاں کے ٹکے خرچ ہوتے ہیں ۔

(کچھ دیر خاموش رہ کر افسر بیگ کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے)

اب جاکر اس تام جھام کو اتارو ، اور کچھ دیر لیٹ لو ، میں ایک بجے تمہیں جگا دوں گی ۔

لطفی : چچا جان ، آپ آرام کیجئے میں اسٹیشن چلا جاؤں گا ۔

افسر بیگ : نہیں لطفی میاں ۔ (حمیدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ہماری بیوی کی بہن یعنی ہماری سالی کا معاملہ ہے ۔ اسٹیشن پر ہم خود ہی جائیں گے ۔ (پھر حمیدہ کی طرف دیکھ کر) تو آج خوشی میں کھانے کا پروگرام گول رہے گا ۔

حمیدہ : غضب خدا کا ۔ ابھی خود ہی کہا تھا کہ ان لوگوں کے آنے پر کھاؤں گا ۔ اب میں اچھن سے کہہ آئی کہ گرم گرم چپاتیاں اسی وقت ڈالے ، تو کھانے

کا پروگرام بننے لگا۔

مر بیگ: پھر میں تو اپنی سالی کے ساتھ ہی کھاؤں گا مگر ان بچوں نے کون سا قصور کیا ہے کہ انہیں بھوکے رہنے کی سزا دی جا رہی ہے۔

حمیدہ: اب بچے ایسے ندیدے نہیں ہیں ایک دن گھنٹے دو گھنٹے صبر کریں گے۔

مر بیگ: (مسکرا کر) اچھا صاحب آج آپ کی ہی مرضی چلنے دیجئے ہماری سالی جو آئی ہیں۔

(مسکراتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے چلے جاتے ہیں)

لطفی: چچی جان کوئی کام میرے لائق ہو تو بتلائیے میں حاضر ہوں۔

حمیدہ: اپنے چچا کے ساتھ اسٹیشن چلے جانا، رات کا وقت ہوگا۔

لطفی: ضرور چلا جاؤں گا۔

حمیدہ: ان کی عمر جیسے جیسے زیادہ ہوتی جا رہی ہے یہ جانے کیسے ہوتے جا رہے ہیں۔

(لطفی کے پاس بیٹھ کر رازدارانہ لہجے میں) تم سے ایک بات کہوں؟

لطفی: ضرور فرمائیے

حمیدہ: آپا جان کا لڑکا دلگیر ہے نا

لطفی: وہی جن کے متعلق شبی کہتی ہے کہ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں

حمیدہ: ارے ہاں وہی۔ شاعر ہے بس خیالات میں ڈوبا رہتا ہے۔

لطفی: اگر وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہوئے تو ضرور ان کو کھوئے کھوئے سے بھائی جان کہا کروں گا۔

حمیدہ: (مسکرا کر) تم تو بات میں بات نکال لیتے ہو۔ آپا جان کا خیال شبو کے لئے ہے!

لطفی: اچھا۔

(پھر ایک دم اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر)

نہیں چچی جان میں ایسی خبر سننا نہیں چاہتا۔

حمیدہ: (گھبرا کر) کیا مطلب؟

لطفی: آپ ایسی خبر بلا مٹھائی کھلائے سنا رہی ہیں پہلے مٹھائی کھلوائیے پھر میں اپنے کان کھولوں گا

حمیدہ: (قہقہہ مار کر) بھئی غضب خدا کا۔ مجھے تو ڈرا دیا۔ ارے مٹھائی بھی مل جائے گی (مسکرا کر) اب تو کان کھول لو۔

لطفی: وعدہ رہا؟

حمیدہ: رہا بھئی رہا۔

لطفی: (کانوں پر سے ہاتھ ہٹا کر) دیکھئے مکر نہ جایئے گا۔ ورنہ میں ان کھوئے ہوئے بھائی جان کو قطعی اپنی ناپسندیدگی کی سند دے دوں گا۔

حمیدہ: کیسی باتیں کرتے ہو تم دیکھنا تو اپنی شبی کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔

لطفی: آپ نے شبی کی بھی رائے لے لی ہے؟

حمیدہ: اپنے خاندان میں کون لڑکیوں کی رائے لیتا ہے؟

لطفی: وہ تو ٹھیک ہے چچی جان مگر پھر بھی۔ اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔

حمیدہ: زمانہ کتنا ہی بدل جائے پھر بھی لڑکیاں اپنے منہ سے تھوڑی ہی کہتی ہیں۔

(لطفی خاموش ہو جاتا ہے ---- کچھ دیر بعد شبو کمرے میں آ کر)

شبو: توبہ ہے امی۔ دن بھر تو سارے گھر بھر کو ہدایتیں جاری کی جا رہی تھیں کہ اچھے صاف

ستھرے کپڑے پہنو۔ یہاں صفائی کرو،
وہاں صفائی کرو۔ یہ کمرہ گندہ ہے، وہ چیز
ٹھیک نہیں ہے۔ اور آپ نے خود کیا حلیہ بنا
رکھا ہے؟

حمیدہ: (مسکرا کر) ارے میرا کیا، کون مجھے کسی کی
نمائش کرنا ہے۔

لطفی: (کھڑا ہو کر) چچی جان، میں کمرے میں ہوں جس
وقت ضرورت ہو آواز دے لیجئے گا۔

حمیدہ: دیکھو میاں سو نہ جائیو۔ تمہیں اسٹیشن تک
جانا ہے۔

لطفی: بہت اچھا میں جاگتا رہوں گا۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔
شبو کچھ دیر بعد)

شبو: ان سے کیا رازدارانہ باتیں ہو رہی تھیں؟

حمیدہ: بڑا ہی مزے دار لڑکا ہے۔ (ہنستی ہیں) کہہ
رہا تھا کہ، میں دلگیر کو "کھوئے کھوئے سے
بھائی جان" کہا کروں گا ـــ ارے ہاں، تیرے
پاپا نے دلگیر کی جو کتاب لا کر دی تھی تو نے
دیکھی؟

شبو: ہاں دیکھی ـــ مگر امی مجھے ان کی شاعری
بالکل پسند نہیں آئی۔

حمیدہ: (کسی قدر گھبرا کر) مگر یہ بات تو اُس کے
سامنے نہ کہہ دینا، بُرا مان جائے گا۔

شبو: لیکن اگر انہوں نے خود اس کے متعلق بات چیت
کی تو ضرور اپنی رائے دوں گی۔ اس کے مقابلے
میں تو لطفی بھائی کی کہانیاں کہیں جاندار ہوتی
ہیں۔

حمیدہ: تم لوگ تو جانے کیسی باتیں کرتے ہو۔ ارے
جان دار اور بے جان کیا، شاعری شاعری
ہے کہانی کہانی۔ خیر اس کا ذرا خیال رکھنا

شبو: خیال کیوں نہ رکھوں گی۔ گئے سال انہوں
نے بھی تو ہماری بڑی آؤ بھگت کی تھی اب
بدلہ تو چکانا ہی پڑے گا۔

حمیدہ: صرف بدلہ چکانے کی بات نہیں ہے ـــ
(مسکرا کر) کچھ اور بھی ہے۔

(شبو غور سے حمیدہ کو دیکھتی ہے مگر خاموش
رہتی ہے ـــ حمیدہ کچھ دیر خاموش رہ کر)
ارے تم دونوں کچھ کھا پی لو، کہاں تک
بھوکے رہوگے؟

شبو: ابھی ایسی کوئی بھوک نہیں ہے۔

حمیدہ: لطفی ابھی کالج سے آیا ہے، ضرور بھوکا ہوگا،
کہتا دے پاپا تو غضب کرتے ہیں۔ بھلا تم لوگ
کہیں دو بجے تک بھوکے رہوگے۔

شبو: ایک دن کا کیا ہے امی رہ لیں گے۔

حمیدہ: کچھ تھوڑا بہت تو پیٹ میں ہونا ہی چاہئے
جا لطفی کو بلا لے ایک کپ چائے ہی پی لے۔

شبو: مگر امی ـــ

حمیدہ: چلی جا بھی اور دیکھ اپنے پاپا کو بھی بلا لانا،
اور چھمن سے چائے کے لئے کہہ دینا۔

(شبو کچھ سوچتی ہوئی کمرے
سے چلی جاتی ہے۔
حمیدہ کمرے کا بڑی تنقیدی
نظر سے جائزہ لیتی ہے۔ میز پر رکھی
ہوئی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی
ہے اور دلگیر کی کتاب نکال کر
میز پر نمایاں جگہ پر رکھ دیتی ہے کہ

(افسر بیگ داخل ہو کر)

بیگ : اب کیا حکم ہے؟

میدہ : میں نے سوچا، ایک ایک کپ چائے پی لی جائے۔ نہیں تو رات دو بجے تک پیٹ میں چوہے دوڑنے لگیں گے۔

بیگ : (مسکرا کر) شکریہ۔ بہن کے آنے کی خوشی میں تو آج ہماری بھی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

میدہ : بھئی غضب خدا کا۔ میں جیسے پہلے تو خیال رکھتی ہی نہ تھی۔

بیگ : رکھتی تو تھیں مگر

میدہ : (بات کاٹ کر) میں نے شبو کو اشارے اشارے میں ان کے آنے کا مقصد بتا دیا ہے۔

بیگ : اچھا۔ پھر کیا بولی؟

میدہ : غضب خدا کا۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں کہیں ہمارے خاندان کی لڑکیاں کچھ کہتی ہیں — اور لطفی تو مارے خوشی کے اچھل پڑا۔

بیگ : ہوں۔ (سوچتے ہوئے) میں تو سوچتا تھا کہ کہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر)۔ اس کے چہرے پر تو کسی ناگواری کا احساس نہیں تھا۔

میدہ : اب مردوں کے چہرے تو میں تاکتی نہیں، کہنے لگا: چچی جان یہ خبر تو میں بلا منہ میٹھا کئے نہیں سنوں گا۔

(شبو کمرے میں آکر)

بو : امی! کمال ہو گیا۔

(افسر بیگ اور حمیدہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں)

وہ تو بستر پہ لیٹے ایسے سو رہے ہیں جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں۔ کپڑے تک نہیں بدلے۔

حمیدہ : ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے کہ وہ یہاں سے گیا ہے۔

شبو : جی ہاں۔ میں نے تو آواز بھی دی مگر وہ تو خراٹے لے رہے ہیں۔

افسر بیگ : کالج میں تھک گیا ہوگا، لیٹا تو نیند لگ گئی۔

شبو : مگر پاپا، وہ کتنے ہی تھک جائیں، رات ۹–۱۰ سے پہلے کبھی نہیں سوتے۔ یہ تو بڑی غیر معمولی حرکت ہے — (پریشانی کے انداز میں) کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حمیدہ : بھئی غضب خدا کا، میں نے کہا بھی تھا کہ سونا نہیں، ذرا اپنے چچا کے ساتھ اسٹیشن چلے جانا، رات کا وقت ہوگا، مگر صاحبزادے ابھی سے جا کر سو گئے۔

(اسی وقت لطفی کمرے میں آتا ہے، مگر اس کے آنے کا انداز غیر معمولی ہے۔ سیدھا میز کے پاس جاتا ہے کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر جیب سے ایک لیڈیز رومال اور ہیئر پن نکال کر میز پر رکھتا ہے اور واپس جانے کے لئے مڑتا ہے۔ حمیدہ کچھ کہنا چاہتی ہے، افسر بیگ اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ لطفی اسی طرح خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے حمیدہ حیرت سے افسر بیگ کو دیکھتی ہے)

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

فیض انصاری

سچّا پیار جھوٹے آنسو

جھلیا چونک کے اُٹھ بیٹھا۔

خمار بھری آنکھوں سے اُس نے چاروں طرف گھوم کے دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ سارے گاؤں پر موت کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا، بوڑھا برگد بھی یوں ساکت ہوگیا تھا جیسے اُس کی پتّیاں اب کبھی تالیاں نہیں بجائیں گی۔

جھلیا نے دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں اور پھر ایک بار اطمینان سے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ اس کا خارش زدہ کتا جگرے کی دوسری طرف پڑا نیند میں گردن کھجا رہا تھا۔

اب جھلیا کو یوں لگا کہ جیسے وہ سپنا دیکھ رہا تھا۔ "مگر منگلی تو مجھ پر تیر نہیں چلا سکتی۔ پھر یہ سپنا کیسا۔۔؟"

وہ تھوڑا کھسک کر جگرے کے قریب آگیا۔ جگرے کی آگ ٹھنڈی پڑگئی تھی۔ اس نے ایک باریک لکڑی سے اس کھوڑکی راکھ جھاڑ ڈالی جس میں ابھی آگ باقی تھی۔ اور پھر آس پاس کی اَدھ جلی لکڑیاں سمیٹ کر کھوڑ پر ڈال دیا اور پھونک مارنے لگا۔ دو چار پھونکوں میں آگ بھڑک اٹھی اور اس کے اطراف کا اندھیرا پیچھے چلا گیا۔ خارش زدہ کتا بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُسے یاد آیا کہ آج دوپہر میں ہی تو منگلی نے مہوے بین کر لوٹتے وقت اس جگہ کھڑی ہوکر کہا تھا کہ "دیکھ جھلیا اب تو مجھ سے بیاہ کرنے کے سپنے دیکھنا چھوڑ دے، باپو نے صاف کہہ دیا ہے کہ منگلی تیرا بیاہ جھلیا سے نہیں ہوسکتا۔"

جھلیا نے ایک باریک لکڑی اٹھا کر زور سے کھوڑ پر مارا۔ موٹے کھوڑ سے بے شمار چنگاریاں نکل کر فضا میں بکھر گئیں۔ خارش زدہ کتا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور چنگاریوں کو آسمان کی طرف اٹھتی دیکھنے لگا۔

"باپو۔۔! میں بھی دیکھوں گا کہ وہ منگلی کا بیاہ مجھ سے کیسے نہیں ہونے دے گا۔"

جگرے کی روشنی میں نفرت اور غصہ کی شدّت اس کے چہرے پہ صاف جھلک رہی تھی۔ تب ہی اس کی جھونپڑی میں دبکا بیٹھا مُرغا بانگ دینے لگا۔ اُس نے پیچھے مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا لیکن وہاں اب بھی وہی تارے جگمگا رہے تھے جو آدھی رات کے بعد جگمگایا کرتے ہیں۔ بوڑھا برگد بدستور اُونگھ رہا تھا اور اس میں بیداری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ پہرے دار تو تیسرے پہر رات ہی جاگ اٹھتا ہے ابھی تو دو پہر رات باقی ہے۔

جھلیا نے جب گردن سیدھی کی، اور جگرے کے اُس پار اس کی نگاہ گئی تو وہاں اس کو خارش زدہ کتا نظر نہیں آیا۔ اس نے گردن اٹھا کر غور سے دور تک دیکھا مگر وہاں بھی کتا موجود نہیں تھا۔

"سالا گیا منگی کے گھر ــــ!" جھلیا کے منہ سے نکلا اور پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ اُس کی کتیا بھی تو اُس کے بغیر نہیں رہتی ـ اندھیرے میں بلا گئی ہوگی آ کر ــــ"

اور پھر جھلیا کو یوں لگا کہ منگی سے اُس کی کتیا ہی اچھی ہے۔ اپنے بیار کتے کی کیسی فکر ہے اس کو ــــ اور منگی ــــ وہ تو مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ دیکھ لیا نا سپنے میں تیرے کر آئی تھی مارنے کو ــــ!

تب ہی جھلیا کے کانوں میں آواز آئی۔ دور بہت دور بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں جیسے ایک ساتھ کئی بیل گاڑیاں مینڈولا پہاڑی کی اونچائی پر چڑھ رہی ہوں۔ اور پھر اُس نے سُنا:

ہاتھوں سے بھیا اپنے ہیں فولادی
چیر کے رکھ دیں گے چٹانوں کی وادی

مینڈولا پہاڑی کی دوسری طرف اس کی چٹانیں کاٹ کر وہاں ایک بند باندھا جا رہا تھا۔ جھلیا کو یاد آیا کہ یہ گاڑی والے اس کام پر وہاں جا رہے ہیں اور قریب کے ہی گاؤں کے تو ہیں سب۔ جھُونا۔ سمارُو۔ جھولا بھی تو ہوں گے ان کے ساتھ۔ میرے پاس بھی تو آئے تھے یہ مجھے کام پر لے جانے ــــ

جھلیا بیلوں کی گھنٹیوں کی سریلی آواز سے بھی تیز پروا ز کرکے مینڈولا بند کی چٹانوں پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اس کے سامنے اندراوتی بہہ رہی تھی۔ وہی اندراوتی جو اس کے گاؤں کے بالکل قریب سے گذرتی ہے۔ وہی اس کا صاف شفاف بہتا پانی جس میں ہر روز صبح تڑکے اس کی منگی ڈبکی لگانے آتی ہے۔ اور پھر گگری بھر کر ٹھیک اسی وقت اُس کے آنگن میں سے گذرتی ہے۔ جب سورج کی پہلی کرن بوڑھے برگد کی ہری پتیوں پر سنہرا رنگ بکھیرتی ہے۔ اور جھلیا کی خمار آلود آنکھیں منگی کے گورے بدن کے اُن حصوں پر ہوا کرتی ہیں جس پر منگی کے ساون کی گھٹاؤں جیسے کالے بالوں سے اندراوتی کے پانی کی بوندیں موتیوں کا روپ دھارا کرتی ہیں اور دوسرے لمحے پھسل کر زمین پر آ رہتی ہیں۔ پورے سات برس سے وہ منگی کو اپنے آنگن سے یونہی گذرتا دیکھتا آ رہا ہے۔ کبھی سردی کے موسم میں جگرے کے پاس بیٹھے ہوئے کبھی برسات کی بوندا باندی اور موسلادھار بارش میں پھوس کی جھونپڑی کے چھپّر سے اور گرمیوں کے موسم میں تو منگی ٹھیک اسی کی کھاٹ کے قریب سے اور اتنی قریب سے گذرتی کہ نہایا ہوا بدن پر گر کر پھیلنے والی بوندیں اچھل کر جھلیا کے ننگے سینے پر آ رہتیں۔ اور اکثر اوقات تو انہیں کی نمی سے جھلیا نیند سے جاگ اٹھتا اور جب ہاتھ بڑھا کر وہ منگی کا بازو پکڑنے کے لئے لپکتا تو وہ ہرنی کی طرح پھرتی سے اس کی زد سے باہر ہو جاتی اور پھر دور کھڑی ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی کالی گھنی پلکوں کو یوں دباتی کہ جھلیا دل مسوس کر رہ جاتا۔

اور پھر چٹانوں کے تراشے ہوئے سیتوں پر قدم بڑھاتے ہوئے جھلیا کو یاد آیا کہ آج سے صرف ایک برس پہلے، جب یہ چٹانیں مینڈولا پہاڑ کی سرسبز وادی تھی جہاں گرمیوں میں ٹیسو کے پھول انگاروں کی طرح پھیل جاتے تھے، اور سردیوں میں مہوہ ٹپک ٹپک کر ساری وادی کو مست بنا دیا کرتا تھا تو وہ اکثر منگی کو لے کر یہاں آ جاتا تھا۔

جیسے کل ہی کی تو بات ہے۔ اس جگہ جہاں ٹیسو کا ایک گھنا پیڑ تھا جس پر سُرخ پھول یوں کھلے ہوئے تھے جیسے اس کی ہر شاخ سے انگارے نکل رہے ہوں۔ ایسی انگارے جو آنکھوں میں تو سرور بھر دیتی ہے مگر دل میں ناقابلِ برداشت حدّت پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر جھلیا نے محسوس کیا کہ وہ اس ٹیسو کے جھاڑ کے نیچے کھڑا ہے اور منگلی اپنا سر اس کے ننگے سینے پر رکھے اپنی رانوں کو قابو میں کرتی ہوئی کہہ رہی ہے :

"جھلیا .... تو کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دیدے گا۔ کسی اور کا تو نہیں ہو جائے گا؟"

اور جھلیا ٹیسو کے تنے سے پیٹھ ہٹا کر منگلی کو پوری قوت سے بھینچتے ہوئے کہہ رہا ہے :

"تو کتنی پگلی ہے منگلی۔ بڑے دیوی کی قسم کھانے کے بعد کوئی گونڈ دھوکا دینے کی ہمت کر سکتا ہے؟ ۔ اری جس دن میں ایسا ارادہ بھی کروں گا اسی دن بڑا دیو مجھے ختم کر دے گا :"

"ہاں جھلیا مجھے بھی اسی بات کا ڈر ہے۔ دیکھ تو ایسا ہرگز نہ کرنا ـــ آخر لہکا کو آدم خور شیر کھا گیا تھا۔ سلیا وہ سے بے وفائی کر کے نیرجا کو بیاہ لیا تھا نا اس نے۔"

بھوں ـــ بھوں ـــ یہ خارش زدہ کتے کی آواز تھی جو جگرے کی طرف پچھلے قدموں سے لوٹتے ہوئے بھونک رہا تھا۔ جیسے کوئی اسے مارنے کے لئے آ رہا ہو۔ جھلیا کے سارے تصوّرات بکھر گئے اور وہ چونک کر سرد ہوتے ہوئے جگرے کے اوپر سے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنے لگے۔

"کون ـــ ؟" جھلیا نے پکارا۔

"سنبھال اپنے مریل کتے کو۔ دوبارہ میرے گھر پر آیا تو جان سے مار ڈالوں گی :"

جھلیا نے منگلی کو دیکھا تو نہیں لیکن اس کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں بھری آئی تھی۔

"منگلی ـــ !" جھلیا کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔

اور منگلی اپنی کنیا کو لے کر دور جا چکی تھی۔

"ارے وہ تیرے کتے کو نہیں تجھے کہہ گئی ہے جھلیا ـــ !"

جھلیا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ برگد کا بوڑھا درخت تالیاں بجا رہا تھا۔ جیسے سچی بات کہہ کر خوشی سے ناچ رہا ہو۔ اور زندگی میں پہلی بار جھلیا کو اپنے دادا کی عمر سے بھی پرانے بوڑھے برگد پر غصہ آیا۔ اور پہلی بار دل میں کرود پیدا ہوئی کہ پھر سالے کی اس بوڑھے کی ساری جڑیں کاٹ کر رکھ دے۔ لیکن تبھی برگد کی پشت پر پھیلے ہوئے گھنے ساگوانی جنگل کے دوسرے کنارے سے موروں کی سُریلی تانیں سُنائی دینے لگیں۔ اور اس کے فوراً ہی بعد گاؤں کے سارے مرغوں نے یکے بعد دیگرے بانگیں دینی شروع کر دیں۔ برگد کی دسیوں کو میں رین بسیرا کرنے والے پرندے جاگ اُٹھے۔ قریب سے ہی کسی اور درخت سے کوئل کوکنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اَن گنت چڑیاں اپنے پیدا کرنے والے کے گُن گاتی ہوئی دودھیا فضاؤں میں بکھر گئیں۔

اس اندھیرے اُجالے کے سنگم پر جھلیا کی جلتی ہوئی آنکھوں نے دیکھا ـــ منگلی بلی میں گگری ڈالے اس انداز دلربائی سے اُس کے آنگن سے گذر رہی ہے جس پر جھلیا ہزار جان سے بھی صدقے ہونے کو تیار رہتا تھا لیکن اس وقت

جھلیا کے من کی بپتا کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔

"یہ عورت نہیں چنڈالنی ہے۔ کالی ناگن ہے۔ آدم خور شیرنی ہے"

اور جھلیا تیزی سے اپنی جھونپڑی کی طرف پلٹ گیا۔ شاید وہ منگلی کا چہرہ دیکھنا بھی اس وقت پاپ سمجھ رہا تھا سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جب منگلی اندرادتی میں ڈبکی لگا کر ہر روز کی طرح واپس لوٹی، اور جھلیا کے آنگن سے گذرنے لگی تو اس کے قدم جیسے زمین میں اپنے آپ گڑ گئے۔ اور اس کے بغل کی گگری جیسے خود بخود چھلکنے لگی۔

جھلیا کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا، اور مٹی کے وہ چند برتن باہر لوٹے پڑے تھے جو جھلیا کی کل کائنات تھے منگلی نے سنبھل کر چاروں طرف ایک بار گھوم کر دیکھا، شاید وہ جھلیا کے خارش زدہ کتے کو دیکھنا چاہتی تھی، مگر وہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اور پھر جب منگلی نے بوڑھے برگد کے نیچے سے گاؤں کے باہر جانے والی پگڈنڈی پر نظر ڈالی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس راہ سے جھلیا گاؤں چھوڑ کر نہیں گیا ہے بلکہ اس کی روح چلی گئی ہے وہ جیون چلا گیا ہے جس کے لئے وہ آج تک زندہ تھی۔

اور پھر دوسرے لمحے منگلی کو نظر آیا۔

اس کی کتیا اسی پگڈنڈی پر تیز رفتاری سے دوڑی چلی جا رہی ہے۔ کون جانے منگلی کو اس وقت یہ محسوس ہوا کہ نہیں کہ سچا پیار اس کو جھلیا سے تھا یا اس کے خارش زدہ کتے سے اس کی کتیا کو۔۔۔!

بنتِ عم

(صفحہ ۵۲ سے آگے)

اصغر بیگ : وہ سو رہا تھا۔

حمیدہ : وہ سو رہا تھا!

اصغر بیگ : ہاں۔ وہ شاید سوتے میں کام کرتا ہے اور ـــ اور (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے شبو کے متعلق اس سے جو بات کہی تھی، اس سے نا امید ہو گیا ہے۔ جب ہی تو شبو کا سامان لوٹا گیا ـــ وہ شبو سے ...... (خاموش ہو جاتے ہیں)

(شبو اصغر بیگ کو دیکھتی ہے اور نظریں جھکا لیتی ہے، اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔

اصغر بیگ شبو کو دیکھ کر، اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر)

سب ٹھیک ہو جائے گا شبو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

حمیدہ : مگر کبھی بھی تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

اصغر بیگ : جانے کر وہ اپنی محبت بھول جاتا ہے اور شبو کو صرف بنتِ عم ہی سمجھتا ہے۔

(پردہ گرتا)

میرے
خوابوں
کی
سرزمین مشرقی پاکستان
صبا لکھنوی

فیض نمبر

قیمت
۱۲ روپے

ایک آہنگ
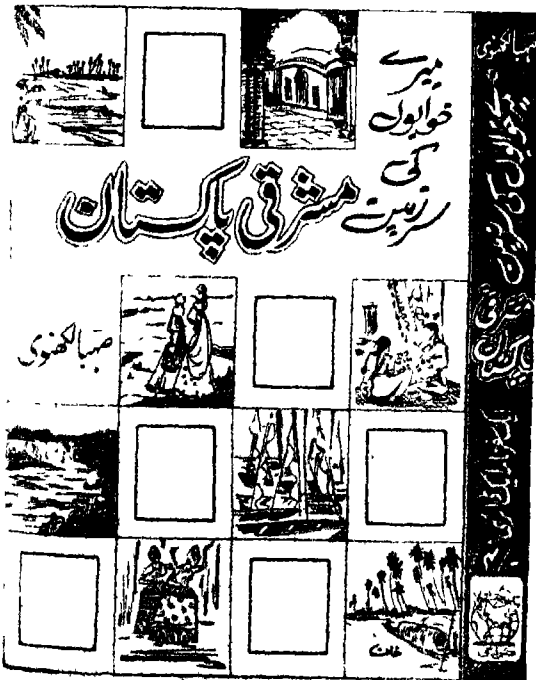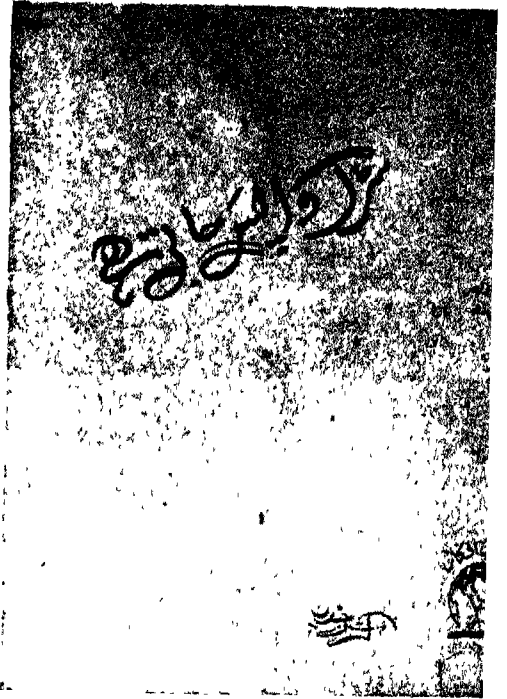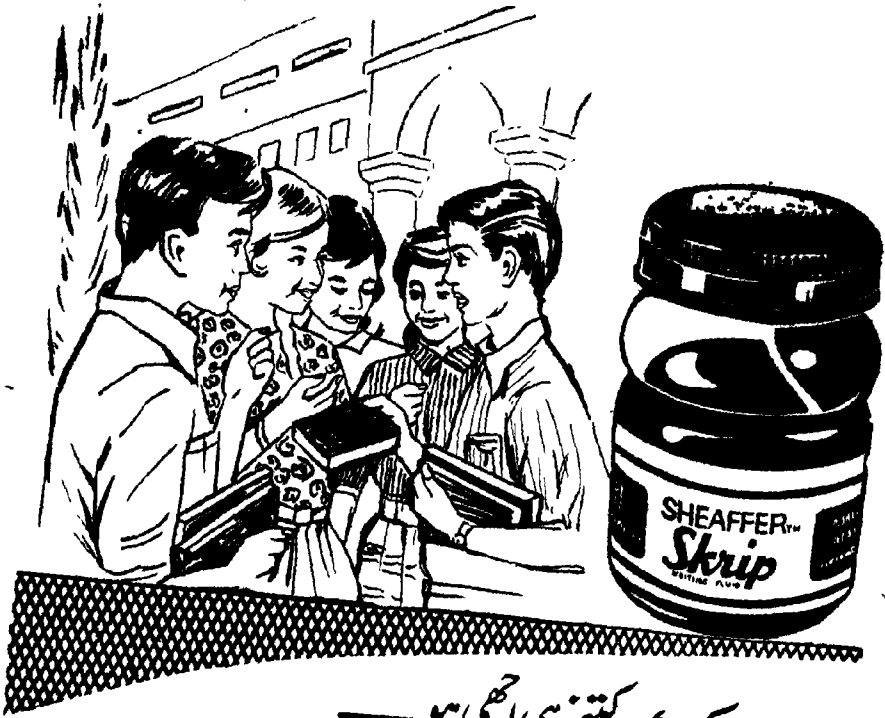
SHEAFFER™
Skrip
نوٹ بک کتنی ہی اچھی ہو —
عمدہ تحریر کے لئے
اِسکرپ اِنک
ضروری ہے!
ہر اسٹیشنر سے دستیاب ہے
پاکستان میں واحد تقسیم کنندگان:
زیڈ، اِیچ، الضاری، اینڈ کمپنی، میریٹ روڈ، کراچی

سیّدہ حِنا

درد کا رشتہ

میں بس کے انتظار میں ہوسٹل کے گیٹ پر تنہا کھڑی ہوں۔ گیٹ کی سیاہ وارنش چمک رہی ہے۔ میرے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے، ایک خیال آتا ہے ایک خیال جاتا ہے۔ جیسے شہر کی سب سے زیادہ چلنے والی سڑک جس پر ہر قسم کا ٹریفک آجا رہا ہو۔ اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ پل بھر کے لئے بھی نہ رک رہا ہو ــــــــــــــــ میں یکسوئی کے ساتھ کسی ایک موضوع پر سوچنا چاہتی ہوں اس بچے کی طرح جو سڑک کے کنارے کھڑا دیر سے اس انتظار میں ہو کہ پل بھر کے لئے ٹریفک رُکے تو وہ سڑک کو پار کرکے اپنے گھر پہونچ جائے۔

میں بہت کوشش کرکے اپنے خیالات کو ایک مرکز پہ لانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر جس طرح تیز ہَوا کے جھونکے سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اڑ کر کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں میرا ذہن بھی منتشر ہو جاتا ہے۔ میں کس خیال کے پیچھے بھاگوں کس یاد کو پکڑوں ــــ تھوڑی تھوڑی دیر ہر خیال، ہر یاد، ہر دکھ، ہر محرومی کے پیچھے دوڑتی ہوں، ان میں سے کوئی ایک بھی ہاتھ آجائے تو اسی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرلوں۔ بلا سے وہ مجھے آنسوؤں میں ڈبو دے۔ پر اس لامرکزیت سے تو نجات پاؤں۔ اور کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں خود بھی کاغذ کے ایک پرزے، درخت کے ایک پتے کی طرح فضا میں سرگرداں ہوں۔ وقت کی تیز آندھیاں مجھے کسی ایک مرکز پہ رُکنے نہیں دیتیں، کہیں ٹھہر کر دم نہیں لینے دیتیں۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے سے پیار بھرے بوسوں کی آواز آرہی ہے۔ شمی اپنے ننھے سے گول مٹول بھتیجے کو پیار کر رہی ہے۔ میرے دل میں کوئی چیز چبھ رہی ہے، میری بانہوں میں لرزش سی ہو رہی ہے۔ ہونٹ آپ سے آپ کانپنے لگے ہیں ـــ میرا بھی ایک بھتیجا ہے اسی عمر کا۔ یقیناً وہ بھی ایسا ہی گول مٹول اور پیارا پیارا سا ہوگا۔ میں اسے اپنی بانہوں میں اٹھانا چاہتی ہوں۔ میرے ہونٹ اس پر پیار بھرے بوسوں کی بارش کرنا چاہتے ہیں ـــ مگر میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرے بھائی نے مجھے لکھ بھیجا ہے اسے میری ضرورت نہیں ہے' میرے پیار کی' میرے خلوص کی ضرورت نہیں ہے اور مجھے بیس بائیس سال پہلے کی بات یاد آرہی ہے۔

وہ گرمی کا ایک روشن دن تھا۔ میں فراک پہنے بالوں میں ربن لگائے اپنی ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ میری بہت

چھوٹی سی گود میں میرا ننھا نومولود بھائی پڑا اپنی حیران آنکھیں بار بار جھپکا رہا تھا۔ میری ماں نے اسے پکڑ رکھا تھا کہیں وہ میری گود سے نہ گر جائے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ اسے سنبھال نہیں سکتی تھی ـــ مجھے خواب و خیال کی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنی ماں سے اس کے لئے پوچھا تھا، اور میری ماں نے کہا تھا:

"یہ تمہارا بھائی ہے ـــ یہ بڑا ہو کر تم سے بہت پیار کرے گا ـــ پھر تم اس کی دلہن بیاہ کر لانا ـــ پھر اس کے منے منے بچے ہوں گے وہ تمہیں 'پھوپھو' کہہ کر بلائیں گے۔ اور اس سے بھی زیادہ تم سے پیار کریں گے۔"

اس وقت میری ساری کائنات پیار ہی تھی ـــ ماں کا پیار، باپ کا پیار، عزیزوں رشتے داروں کا پیار ـــ ان میں کچھ پیار سچے تھے، کچھ جھوٹے تھے۔ پر میں تو اس سے خود بھی پیار کی ایک چھوٹی سی علامت تھی۔ میرے لئے کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا کہاں ممکن تھا۔ وقت گذرتا گیا۔ پہلے ماں کا پیار خاموش ہوا، پھر باپ کا ـــ عزیزوں رشتے داروں کے پیار کی پالش اتر گئی، اور میرے چاروں طرف نفرت، سرد مہری اور دل آزاری کے ناگ پھنکارنے لگے۔ اور میرا دم گھٹنے لگا ـــ مجھے پیار کی تلاش تھی، پیار کی طلب تھی۔ میں ابھی تک پیار ہی کے سہارے تو زندہ رہی تھی۔ پیار ہی میری روح کی بالیدگی اور میرے جسم کی نشوونما کا ذریعہ تھا۔ میں جیسے اپنے آپ میں سکڑنے لگی۔ روح کی، دل کی، ذہن کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں بجھ گئیں، تب اس مکمل اندھیرے میں، زندگی کے قیدخانے کی گیلی، نم آلود زمین پر سنگین حالات کی چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے اچانک مجھے گیان ہوا ـــ

"میں تو خود پیار ہوں ـــ میں تو خود چشمہ ہوں ـــ میں تو خود سایہ دار درخت ہوں۔ میں کیوں پیار کی تلاش میں بھٹکوں ـــ میں کیوں پانی کی بوند بوند کو ترسوں۔ میں کیوں ماتا کی چھاؤں کی طلب میں سرگرداں پھروں ـــ میں تو خود ماتا کی ٹھنڈی چھاؤں ہوں۔"

پھر سال پر سال گذرتے گئے، بے خوابی، رنج اور محنت کے کٹھن سال ـــ میرا بھائی بڑا ہوتا گیا، پر جتنا جتنا وہ بڑا ہوتا گیا اتنا ہی مجھ سے بے پروا، مجھ سے بیزار ہوتا گیا۔

(ماں: تم نے تو کہا تھا: یہ بڑا ہو کر تم سے بہت پیار کرے گا۔ پر شاید یہ ابھی بڑا نہیں ہوا ہے ـــ یہ کب بڑا ہوگا ماں ـــ؟)

میں بائیس سال تک اس کے بڑا ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی دلہن لانے اور بچے کھلانے کی خوبصورت امیدوں سے دل بہلاتی رہی۔

یہ مشرقی مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بیٹے کو جنم دیتے ہی خوابوں کے جال بننے لگتی ہیں ـــ ماضی کی ستائی ہوئی حال سے بیزار ـــ دکھیاری مائیں۔ اپنے بچوں کے مستقبل کی امید پر ہی تو جیتی ہیں ـــ کیا ہوا، اگر دنیا نے کچھ نہیں دیا۔ اپنی اولاد تو ایسا نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنا ہی گوشت اپنا ہی خون ہوتی ہے۔

(میری ماں! تم نے اپنے خواب مجھے سونپ کر کچھ اچھا نہیں کیا ـــ اب جو یہ خواب ٹوٹے ہیں تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ان کے ساتھ میں بھی کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی ہوں۔ ماں! میں ان کرچیوں کو کیسے چنوں ـــ؟ چن بھی لوں تو جوڑوں گی کیسے؟)

لوگ کہتے : اب اس کی شادی کر دونا — وہ بڑا ہو گیا ہے۔

اور میں بہتی آنکھوں کے ساتھ سوچتی : ابھی وہ کہاں بڑا ہوا ہے۔ ابھی ابھی تو مجھے دکھ دے کے — بے مجھے رلا کے گیا ہے — ابھی تو اُس نے مجھ سے پیار کرنا نہیں سیکھا، ابھی تو وہ بڑا نہیں ہوا ہے۔ ماں نے کہا تھا، وہ بڑا ہو کے تم سے بہت پیار کرے گا۔

لوگ کہتے : اونہہ۔ تمہیں تو جانے کیا ہو گیا ہے۔ سارے لڑکے اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں — بیاہ کر دو گی خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر تم خود کو بھی تو دیکھو، کب تک یونہی اکیلی اکیلی پھرتی رہو گی۔ دلہن آجائے گی تو تمہاری تنہائی بھی آباد ہو جائے گی۔

پھر میں نے بھائی کے سہرا باندھا، اور بڑے ارمانوں سے دلہن بیاہ کر لے آئی — پر بیاہ کے ایک ہفتے بعد ہی میرے بھائی نے دور ایک دوسرے شہر میں اپنا ٹرانسفر کرا لیا۔ (تنہائیاں کبھی یوں بھی آباد ہوا کرتی ہیں) — وہ اپنی دلہن کو لے کر پھر کبھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔

اُس کی دلہن پریوں کے دیس سے آئی ہوئی کوئی شہزادی ہے۔ وہ سدا پیار کے آغوش میں پلی ہے — ماں باپ کا پیار — عزیزوں رشتے داروں کا پیار، بھائی بہنوں کا پیار، اور پھر اب جیون ساتھی کا پیار — وہ بہت نازک مزاج ہے۔ کہیں میری کسی بات سے اس کا دل نہ دکھ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی ہنستی آنکھیں نم ہو جائیں — اس ڈر سے وہ اسے مجھ سے دور لے گیا ہے۔

میں نے منہ پھیر کر جلدی سے آنسو خشک کر لئے ہیں۔ نوکر اور چوکیدار ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے روتے دیکھ لیا، تو وہ کیا کہیں گے —!

بس آج خدا جانے کیوں اتنی لیٹ ہو گئی ہے۔ ممکن ہے میری گھڑی ہی غلط ہو —

دور سے مالی تیز تیز قدم اُٹھاتی آ رہی ہے — ایک دفعہ رک کر اُس نے مجھے دیکھا، پھر دوبارہ دیکھا — اب اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ اِک دم رُک گئی ہے۔ جیسے مجھ سے کترا کر کسی دوسرے راستے پر نکل جانا چاہتی ہو۔ پر اس ہوسٹل کا تو ایک ہی راستہ ہے۔

مالی —! تمہیں میرے سامنے سے ہی گذرنا ہوگا —! میں نے اُسے پکارا۔

مالی —!

اُس نے رک کر ایک نفرت آمیز نگاہ مجھ پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں جانتی ہوں اُس نے ایسا کیوں کیا؟ — پر میں مجبور ہوں میں اسے محبت کرنے سے نہیں روک سکی تو نفرت کرنے سے کیسے روک دوں۔ گیٹ سے باہر نکل کر اُس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا ہے، شاید اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو چھپانے کے لئے۔

رات اُس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ بڑی منتوں سے ذرا دیر کے لئے اُس نے کمرہ لاک کر کے مجھے کرسی پر بٹھا دیا، اور خود ہندو داسیوں کی طرح فرش پر میرے پیروں میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں

میں سر جھکا کر اپنے پیر دیکھنے لگی ۔
وہ جھنجھلا گئی ———
میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں ؟
میں ذرا اپنے پیر دیکھ رہی ہوں ۔
کیا خاص بات ہے ان میں ؟
بجلی کی روشنی میں یہ خلافِ معمول بہت اچھے لگ رہے ہیں ۔ ذرا ناخن تو دیکھو کیسے چمک رہے ہیں !
میں نے یہ سب کچھ مذاق میں کہا تھا ' پر خدا جانے اُسے کیا ہوا ——— میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر اُس نے میرے پیروں کو دیکھا ۔ ناخن چھو کر دیکھے ، اور پھر ——— میرے پیروں پر جھک کر زار و قطار رونے لگی ——— اُس کے آنسوؤں نے میرے پیر بھگو دیئے ۔
اُف ——— رابی ، اب میں کیا کروں ؟
میں نے نرمی سے اُس کا جھکا ہوا چہرا اُوپر اُٹھایا ، آنسوؤں سے بھیگا ہوا تمتمایا ہوا چہرا ۔
رابی ! تم دے سکتی ہو تو مجھے بہن کا پیار دے دو ———
نہیں ——— اُس نے سر ہلایا ——— میری کئی بہنیں ہیں میں اُن کے پیار سے تھک چکی ہوں ۔
تم غلط کہہ رہی ہو رابی ——— بھلا ایسے مقدس پیار سے بھی کوئی تھکتا ہے ——— ؟
میرے لئے اِن رشتوں میں اب کوئی تقدس نہیں رہا ۔ سب بے درد ہیں ' میرا درد کوئی نہیں جانتا ۔
(رابی کا منگیتر جب سے اس کی بہن کو بیاہ کے لے گیا ہے وہ ایسی ہی باتیں کرنے لگی ہے ۔ یہ ماں باپ کیسے تھے جنہوں نے ایک بیٹی کے ارمانوں کی چتا پر دوسری بیٹی کی خوشیوں کا رنگ محل تعمیر کیا ——— ؟ اور وہ بہن کیسی تھی جس نے بہن کی آرزوؤں کے خون کی مہندی اپنے ہاتھوں میں سجائی ہے ——— آنسوؤں کی دھند میں بھٹک بھٹک کر آخر اُس نے ایک راہ پا ہی لی)
میرے لئے اب یہ پیار بے معنی ہو چکے ہیں ، مجھے ——— مجھے اب صرف تم سے پیار ہے ۔ تم اپنا آپ مجھے دے دو ——— !
رابی ——— !
کتنی کٹھور ہو تم ——— !
نہیں رابی ۔ میں تو ذرا بھی کٹھور نہیں ۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں تم بہت اچھی لڑکی ہو !
میں نے پیار سے اُس کے پھولے پھولے گال تھپتھپائے ———
اب میں اپنی رابی کا بیاہ کروں گی ——— میں تمہارے ان ہاتھوں میں مہندی رچاؤں گی ——— تمہارے ماتھے پر جھومر سجاؤں گی ۔
اونہہ ——— ! اُس نے جھنجلا کر میرے ہاتھ جھٹک دیئے ——— نہ بیاہ نہیں کروں گی ۔ مجھے اس لفظ سے نفرت

ہوگئی ہے۔ میں ساری عمر تمہارے ساتھ رہوں گی —— تم اپنا پیار مجھے دے دو —— نہیں تو آج میں رو رو کر مر جاؤں گی —— !

رونے سے کوئی نہیں مرا کرتا مالی —— ورنہ میں ابھی تک کبھی کی مر گئی ہوتی !

تم —— تم بھی روتی ہو —— تمہیں کیا دکھ ہے ؟

اور یونہی کسی شاعر کا ایک مصرع میرے ذہن کی سطح پر تیر گیا۔ ؎

کسے دکھائیں کہ سینے میں زخم کیا کیا ہیں

پر مالی سے میں نے کہا : مجھے کوئی دکھ نہیں —— دکھ تو پیار کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور میں نے کسی سے پیار ہی نہیں کیا ——

میری آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں، مگر میں نے خود کو سنبھال لیا ——

ہاں میں کسی سے پیار نہیں کرتی ۔

مجھ سے بھی نہیں —— ؟

دماغ خراب ہے تمہارا تو ——

اُس کی آنکھیں پھر بہنے لگیں ۔

میں کھڑی ہو گئی ——

مجھے چابی دے دو —— میں جاؤں گی ۔

تم نے پیار کی باتیں کر کے میرے دل سے چین اور میری آنکھوں سے نیند چھین لی ہے ۔ میرا ضبط یوں نہ آزماؤ مجھے جانے دو ۔

اُس نے چابی میرے ہاتھوں میں تھما کر اپنی باہوں میں میری پنڈلیاں مضبوطی سے جکڑ لیں اور لرزتے ہوئے ہونٹ میرے پیروں پر رکھ دیئے ۔

پتھر کی دیوی —— ....

مالی کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں ۔ وہ سچ مچ ساری رات روتی رہی ہے ۔ پر میں اُسے کیسے سمجھاؤں ۔ میرے پاس الفاظ ہیں، اُس کے پاس حقائق —— میرے پاس فلسفہ ہے، اُس کے پاس چوٹ کھایا ہوا دل اور اُمڈتے ہوئے جذبات ۔ میں کس کس حقیقت کو جھٹلاؤں گی ۔

بس آگئی ہے ۔ ستھرے ستھرے کپڑوں اور نکھرے نکھرے چہروں والے لڑکے کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہیں لڑکیوں کے دوپٹے سروں سے ڈھلکے ہوئے ہیں ۔ گاؤن سامنے سے کھلے ہیں اور خوب صورت جسموں کے پیچ و خم صاف نظر آرہے ہیں ۔ لڑکوں کی آنکھوں میں شرارت اور چہروں پر کھلی کھلی تشنگی کا سا احساس ہے ۔ وہ لڑکیوں پر فقرے چست کر کے لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔

زینو میرے نزدیک بیٹھی ہے۔ ہوا سے اُس کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال لہرا رہے ہیں۔ لہراتے ہوئے بالوں
اُس کا چہرہ کسی چھوٹی سی معصوم بچی کا سا لگ رہا ہے۔ سُرخ سُرخ گال ۔۔۔ سُرخ سُرخ ہونٹ۔ اس کا دوپٹہ اب
سنے سے بھی ڈھلکنے لگا ہے۔ تون کی چُست قمیص میں سے اس کا صندلی رنگ جھلک رہا ہے۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے
ہوئے لڑکے للچائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ سب لڑکیوں کے دوپٹے شانوں سے ڈھلکے ہوئے ہیں۔ اور کالی
الی ناگنوں جیسی لٹیں لہرا رہی ہیں۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر زینو کے سر اور سینے پر دوپٹہ برابر کر دیا ہے۔

دسر ڈھانپ لو لڑکیو! اور سینوں پر دوپٹے دوہرے کر کے ڈال لو ۔۔۔ تم زندہ قوم کی لڑکیاں ہو، اپنی قوم کے
جوانوں کو گھٹیا جذبات کی انیون دے کر نہ سُلاؤ۔ اگر یہ سو گئے تو کل تمہاری عزت کی حفاظت کون کرے گا؟>

لڑکیوں نے جیسے میری بات سن لی ہے، سمجھ لی ہے۔ انہوں نے جلدی جلدی دوپٹے برابر کر لئے ہیں۔ ایک خوبصورت
لڑکی کا گلابی آنچل اچھل کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کی گود میں جا پڑا ہے۔ لڑکے ہنس رہے ہیں ۔۔۔ ایک
انجانی آواز میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے:

یہ دقیانوسیت چھوڑ دو محترمہ ۔۔۔ یہ آویزش تو ازل سے ہوتی آئی ہے ابد تک ہوتی رہے گی۔ ایسے چھوٹے
چھوٹے خوبصورت حادثے تو روز ہی ہوا کرتے ہیں بسوں میں چڑھتے اُترتے ہوئے، اٹھ اٹھ کر جھکتی پلکوں کے
سائے میں مسکراہٹوں کی پھوار اور قہقہوں کے جلترنگوں میں۔ روز خدا جانے کتنے رومانس جنم لیتے ہیں، پیار کی
کتنی کلیاں چٹکتی ہیں۔ یوں نہ ہو تو زندگی میں یہ رنگ، یہ روشنی، یہ بہار کہاں سے آئے ۔۔۔ زندگی زعفران کا پھول
ہے، سنگلاخ چٹانوں کے سینے سے پھوٹ کر بہتا ہوا ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہے ۔۔۔ زندگی کسی لڑکے کی گود میں
پڑا ہوا کسی الہڑ لڑکی کا گلابی آنچل ہے۔

میں زعفران کے پھولوں ۔۔۔ پہاڑی چشموں اور گلابی آنچلوں کے لئے سوچنا چاہتی ہوں ۔۔۔ مگر یہ کیا ۔۔۔؟
سڑک کے کنارے گدھے کی لاش ابھی تک اسی طرح پڑی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ جہدِ حیات سے تھک
کر سستانے کے لئے ذرا کی ذرا سڑک کے کنارے لیٹ گیا ہے۔ اس کا سر سڑک سے اُبھرے ہوئے کنارے پر دھرا
ہے اور جسم کچے راستے پر پڑا ہے جیسے کوئی مایوس انسان پیار کا گہرا زخم کھا کر یا آلامِ روزگار سے تنگ آ کر اپنا سر
ریل کی پٹڑی پر رکھ کر سکون کے دائمی احساس کے ساتھ آنکھیں بند کر لے ۔۔۔ کتنے دن سے یہ لاش یونہی پڑی
ہے۔ کوئی اسے اُٹھاتا نہیں ہے ۔۔۔ روزانہ بس میں آتے جاتے یہ منظر میرے محسوسات میں آگ لگا دیتا ہے۔
زندگی کی ارزانی، زندگی کی ناقدری اور بے بسی کا احساس مجھے بے چین کر دیتا ہے۔ لوگ اُسے اُٹھا کر کسی گڑھے میں
کیوں نہیں ڈال دیتے ۔۔۔؟ زندگی پر موت کی جیت ہی کیا کم ہے جو یوں اُسے اس جیت کا جشن منانے دیا
جائے ۔۔۔؟!

اور وہ اَن جانی لیکن مانوس آواز پھر سرگوشی کرنے لگی ہے۔

موت کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس حقیر سی جیت کا جشن منائے۔ یہ جشن اگر دیکھنا ہے تو ویت نام چلو۔

کشمیر چلو — اور قوی ہیکل جوانوں، گل اندام عورتوں اور پھول سے بچوں کی لاشوں پر موت کا بھیانک رقص دیکھو — اس کے لرزا دینے والے قہقہے سنو — سڑکوں پر، کھیتوں اور باغوں میں سڑتی ہوئی — گلتی ہوئی لاشیں — اپنی بے بسی کا آپ ماتم کرتے ہوئے بے رُوح جسم۔ اپنے اُٹھانے والوں کے انتظار میں کھلی ہوئی بے نور آنکھیں — زندگی زعفران کا پھول سہی، پر آگ کے شعلوں میں پھول کہاں باقی رہ سکتے ہیں — ؟؟

زندگی کی مدافعت میں موت کا کرب جھیلنے والو — تمہارے دکھ ہمارے — ہم زندہ انسانوں کے دکھ سے مختلف نہیں ہیں — فرق بس اتنا ہے کہ تمہاری بے نور آنکھیں، اپنے لاشیں اٹھانے والوں کا انتظار کر رہی ہیں، اور ہم اپنی لاشیں آپ اُٹھائے پھر رہے ہیں۔ تم نے موت کا کرب جھیلا ہے۔ ہم زندگی کا کرب جھیل رہے ہیں — تمہیں دشمنوں نے زخمی کیا ہے ہم دوستوں کے ہاتھوں زخم کھا رہے ہیں — بات بہرحال ایک ہی ہے۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ کالج کے سامنے رُک گئی ہے۔ میں چونک اٹھی ہوں۔ اور بھیگی ہوئی آنکھوں پر جلدی سے سیاہ چشمہ لگا کر بس سے اُترنے لگی ہوں — مگر مجھے رکنا پڑا ہے۔ فرسٹ ڈور لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے مگر اس میں سے لڑکے اُتر رہے ہیں۔

لڑکیاں بُل کھا رہی ہیں:

آخر یہ پچھلے دروازے سے کیوں نہیں اُترتے — ؟

اس غصے میں بھی ایک لگاوٹ ہے — پیار کی ایک ادا ہے —

میں خواہ مخواہ مسکرانے لگی ہوں۔

بس سے اُترتے ہوئے ایک لڑکی ایک لڑکے سے ٹکرا گئی ہے۔

جھینپ نے اس کا چہرا اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔

لڑکے مسکرا رہے ہیں — اور گنگنا رہے ہیں:

come live with me and
be my love.

دیپ تم! انہیں کرسٹو مارلو کے معصوم چرواہے کی طرح سادہ زندگی کی وہ راحتیں کہاں سے مہیا کروگے ان کے لئے وہ پھول — وہ چشمے، اور وہ گھنے درختوں کے سائے کہاں سے لاؤگے۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی وہ خوب صورت وادی — جہاں سچی اور پرخلوص محبت پروان چڑھتی ہے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے — جہاں محبت خدا بن کر کائنات کو اپنے نور سے جگمگا دیتی ہے — یہاں تو بڑھتی ہوئی آبادی کے بڑھتے ہوئے مسائل ہیں — سینما گھروں کی اُونچی اونچی بلڈنگیں ہیں۔ نیم عریاں جسم، اور پالش کئے ہوئے چہرے ہیں — محبت کے نام پر بکتی ہوئی ہوس ہے — دھوکا ہے — فریب ہے، اور تپتی ہوئی تارکول کی کالی کالی سڑکیں ہیں جن کے کنارے گدھوں اور کتوں کی لاشیں صدیوں سے پڑی سڑ رہی ہیں۔ فضا میں تعفن ہے — ہوائیں دھوئیں اور پٹرول کی بو سے بھاری ہیں — یہاں پیار کے نغمے کہاں — یہاں تو چاروں طرف بم اور مشین گنوں کے دھماکے ہیں آنسوؤں کی دھند ہے — یہاں

پیار کی باتیں نہ کرو۔ یہاں پیار بیوپار ہے — اور محبت فارنسا اور پاؤڈر اور اطلس و کمخواب سے سجی ہوئی بڑھی بیسوا) —

مسٹر روز حسبِ معمول اپنی اسٹوڈنٹس کو وقت کی اہمیت سمجھا رہی ہیں :

Gather ye rose-buds while ye may,
Old time is still a flying
And this same flower, that smiles today,
To-morrow will be dying.

(ٹریجڈی یہ نہیں مسٹر! کہ آج کا کھلا ہوا پھول کل مرجھا جاتا ہے۔ ٹریجڈی تو یہ ہے مسٹر کہ وہ کانٹا بن کر ساری عمر دل میں چبھتا رہتا ہے — میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا مسٹر! تم نے بھی تو ایک زمانے میں پھول چُنے تھے — پر آج تمہاری رُوح چھلنی ہو چکی ہے۔ اور دل ریزہ ریزہ — دن کو اپنی نوعمر اسٹوڈنٹس کو گلاب کی کلیاں چننے کا مشورہ دینے والی مسٹر! سچ بتاؤ، یہ ہر صبح تمہارا تکیہ بھیگا بھیگا کیوں ہوتا ہے؟ — اور یہ سارا دن تمہاری آنکھیں سُرخ سُرخ بوجھل بوجھل کیوں رہتی ہیں۔ کیوں باتیں کرتے کرتے ہنستے ہنستے تمہاری آنکھوں میں نمی سی تیر جاتی ہے۔ تم چاہے نہ بتاؤ مگر تمہاری بوڑھی ملازمہ ہمیں سب کچھ بتلا دیتی ہے — وقت بوڑھا نہیں ہوا ہے مسٹر! ہم خود ہی بوڑھے ہو گئے ہیں، جبھی تو ہر دم جوانی کی برباد امنگوں کا ماتم کرتے رہتے ہیں)

شام ہو رہی ہے۔ افق کے کنارے سُرخ ہونے لگے ہیں۔ میں ساحل پر کھڑی ہوں۔ سمندر کا شفاف پانی ملگجا ہو گیا ہے۔ دن دم توڑ رہا ہے۔ بہت سے بے چین اور کربناک دنوں کی طرح یہ دن بھی — بہت سے دکھ اپنے دامن میں سمیٹے سمندر کے گہرے پانیوں میں ڈوب رہا ہے — میرا دل چاہ رہا ہے میں یہیں اس گرم ریت پر چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ موجیں بڑھ کر مجھے اپنے شفاف دامن میں ڈھانپ لیں — میری رُوح سے دکھوں کی ساری سیاہی دھو دیں۔ میں ہلکی پھلکی ہو کر سمندر کی ایک موج بن جاؤں۔ اور دوسری موجوں کے ساتھ مل کر ساحل سے اٹکھیلیاں کروں — میں حیات کے غیر مختتم ابدی سمندر کی ایک موج ہی تو تھی — جو ایک بار اٹکھیلیاں کرتی ہوئی دوسری موجوں کے ساتھ ساحل پر دور تک نکل آئی تھی — پھر یوں ہوا کہ دوسری موجیں لوٹ گئیں، اور میں تنہا رہ گئی — میری ٹریجڈی یہ ہے کہ میں ریت میں خود کو جذب نہ کر سکی — بس اپنے منبع کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ بھٹکے جا رہی ہوں۔ کبھی — دور اس سمندر جیسے سات سمندر پار ایک بے چین روح نے بالکل میری ہی طرح سوچا تھا —

I could lie down like a tired child
And weep away the life of care,
Which I have born and must bear

Till death like sleep might steal on me
For I am one whom men love not.

کسی نے سچ ہی کہا تھا ــــ ہم ایک ہی سمندر کی بھٹکی ہوئی موجیں ہیں ہم سب اپنے منبع کی تلاش میں سرگرداں ہیں ــــ ہمارے دکھ ــــ ہماری سوچ ــــ ہمارے مسائل سب ایک ہیں۔ مشرق سے لے کر مغرب تک، ویت نام سے لے کر کشمیر تک، رابی سے لے کر سسٹر روز تک۔ ہم مختلف سمندروں سے نکالے ہوئے مختلف رنگوں اور مختلف سائز کے وہ موتی ہیں جنہیں قسمت کے مشاق ہاتھوں نے ایک ہی دھاگے میں پرو دیا ہے۔

ہاسٹل کی وسیع و عریض بلڈنگ پر رات گہری ہو چلی ہے۔ دن کی فکروں سے نڈھال ہو کر میں سونا چاہ رہی ہوں ــــ گالوں پر بکھرے ہوئے آنسوؤں کے آخری قطرے شبنم بن کر جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچا رہے ہیں۔ میرے محسوسات پر غنودگی کی پھوار سی پڑ رہی ہے جب ہی ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ میں چونک پڑتی ہوں۔

دروازے کا تھوڑا سا پٹ کھولے رابی کھڑی ہے۔ آدھی اندر آدھی باہر۔ اس کے لب لرز رہے ہیں اور آنسو رخساروں پر بہہ رہے ہیں ــــ مجھے نیند نہیں آ رہی ــــ مجھے سکون نہیں مل رہا ــــ میں بہت دکھی ہوں ــــ میں بہت دکھی ہوں ــــ!

"اکیلی تم ہی دکھی نہیں ہو رابی! ہم سب دکھی ہیں۔ ہم سب اپنی صلیبیں اٹھائے صدیوں سے مقتل کی طرف رینگ رہے ہیں۔ اپنے دکھوں کو اپنے سینے سے لگا کر سو جاؤ رابی! رات بہت جا چکی ہے!

فریدہ رضوی

ستارۂ سحر

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ آسمان پہ کہیں کہیں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے زمین پہ سایہ فگن تھے کائنات پر چاندنی یروشلمی دوشیزہ کے زرد چہرے کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ جب کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا چاندنی پہ چھا جاتا تو رات زیادہ تاریک اور گمبھیر ہوجاتی۔ ایسے ہی لمحات میں "عالیہ" گھر کی چھت پہ کبوتری کی مانند کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

وہ بہت تھک چکی تھی، اور اُسے آرام کی ضرورت تھی۔ تمام دن وہ اپنے خالو کے ساتھ کھجور کی گٹھلیاں اٹھاتی اور تمر بمر مثل خمر (شراب جیسی کھجور) کی گردان کرتی رہی تھی۔

جون جولائی کی حدت اور تندی کھجوروں میں رس بھر دیتی ہے۔ یہ رس درختوں سے مٹی کی ہانڈیوں میں ٹپکتا رہتا ہے۔ جس میں سونف کا پانی ملا کر "عرق" تیار کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ عالیہ نے بھی یہ عرق کسی گھریلو تقریب میں نوش جان کیا تھا، تو یہی محسوس ہوا تھا کہ "فبرجی" (نان بائی) کا دہکتا ہوا تنور حلق میں اُنڈیل دیا ہے۔ اُف کس قدر تلخ تھا۔ تمام سینہ انگارہ بن گیا تھا۔

آج کی شب بھی اس کی ویسی ہی کیفیت تھی۔ چند لمحے پیشتر اس کا منگیتر اُس کے پاس آیا تھا، اور تلخ، دل خراش باتیں کرکے چلا گیا تھا۔ اُسے اپنے منگیتر پہ کس قدر ناز تھا۔ جس کی رگوں میں خالص فلسطینی خون تھا۔ خود عالیہ میں بھی تو دو خون شامل تھے۔ عراقی ماں کی گرم جوشی اور تُندی اور فلسطینی باپ کی سرد مزاجی اور امن پسندی!

فواد — اپنے منگیتر سے باتیں کرتے کرتے اس کا عراقی خون کھول اٹھا تھا — فواد خود غرضی اور مفاد پرستی کی بات کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ فلسطین اپنے گھر لوٹنے کے بجائے بغداد کے اسی قصبہ میں کیوں نہ رہا جائے۔ کیونکہ فلسطین میں کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔

"تم کو دجلہ میں جاکر ڈوب مرنا چاہئے۔ فواد بن قاسم۔ ساری عرب دنیا ہمارا گھر ہے۔ گھر کے ایک حصے میں جنگ ہو، دشمن کے ناپاک قدم اٹھیں اور دوسرے حصے میں امن وسلامتی کی باتیں کرکے ہم پناہ گاہیں ڈھونڈتے پھریں۔ کمینے اسرائیلی برطانیہ اور امریکہ کے اشاروں پہ اپنی للچائی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہمیں اُن سے خوفزدہ ہونا زیبا دیتا

ہے ؟! تمہاری رگوں میں کسی یہودی چوہے کا خون ہے یا مسلمان مجاہد کا! میں تمہاری طرح تعلیم یافتہ نہیں، ایک دیہاتی لڑکی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ہمیں وہ دیوار توڑنی ہے جو ہمارے اور دشمنوں کے درمیان ہے۔" عالیہ کی زبان گویا عرق کی تلخی بن کر فواد کے حلق میں کانٹے بچھاتے لگی۔

"دیوار توڑ کر تم اسرائیل فتح کروگی یا دشمنوں کو اپنی حدود میں آنے کی دعوت دوگی؟" فواد تمسخر سے ہنسا۔

"ہم ناصر کے ساتھ فتح و نصر کے نعرے لگاتے تل ابیب جا پہونچیں گے، اور اپنا وطن دوبارہ حاصل کرلیں گے۔" وہ بڑے جوش سے بولی۔

"خواب دیکھو خواب، عالیہ خاتون!" وہ ہنسا۔ اور پھر بغور عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "سنو عالیہ!" وہ کچھ جذباتی سا ہوگیا اور آنکھوں میں خمار اُتر آیا۔ "عالیہ میں بھی بچپن سے یہ خواب دیکھتا چلا آیا ہوں کہ شادی کے بعد ہم ایک چھوٹے سے خوب صورت گھر میں رہیں گے۔ گھر کے چمن میں گلاب کے پودے ہوں گے۔ چمن کے چاروں طرف پھول دار درخت ہوں گے۔ کیاریوں میں بلیوں کے بچے اور چوزے کھیلتے ہوں گے۔ ہمارے اپنے بچے بھی ہوں گے۔ کیا تم نے یہ خواب کبھی نہیں دیکھا عالیہ خاتون!"

یہ خواب عالیہ بھی دیکھتی تھی۔ لیکن اس وقت تو اس کے سینے میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی، جسے کوئی نہیں بجھا سکتا تھا۔ اس کے سامنے اس وقت ایک ذاتی گھر نہیں، بلکہ تمام وطن تھا۔ اپنے ہونے والے بچے نہیں، بلکہ وہ تمام عرب بچے تھے، جن کے سروں پر جنگ کا بھیانک بھوت منڈلا رہا تھا۔ وہ قدس واپس جانا چاہتی تھی، تاکہ مقدس مقامات کی حفاظت میں حصہ لے سکے۔ اس حفاظت میں چاہے اُس کی اور فواد کی جان کیوں نہ چلی جائے۔

"تم میری موت کی خواہاں ہو۔" فواد اب سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"مجھے معلوم نہ تھا فواد بن قاسم، تم اس قدر بزدل ہو۔ آخر تم آزادیٔ وطن کی فوج میں بھرتی ہونے کے بجائے مجھے لے کر بغداد کیوں چلے آئے؟"

"میں امن و سلامتی کا خواہاں ہوں۔ میں خون خرابہ نہیں دیکھ سکتا۔ پھر زعما کی غلط باتوں کا نشانہ ہم کیوں بنیں ــــ؟"

"فواد بن قاسم تم جا سکتے ہو۔ آئندہ میں تمہاری صورت دیکھنا پسند نہ کروں گی۔"

فواد نے اُسے دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر چپ چاپ چلا گیا۔

اب وہ بھی خاموش زخمی کبوتری کی مانند چھت پر کھڑی تھی۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی کھڑی قصبے پہ جو چاندنی میں کسی لاش کی طرح زرد نظر آرہا تھا، نگاہیں دوڑاتی رہی۔ پھر اُسے یاد آیا کہ اس قصبے سے شب کے نو بجے ایک بس عمّان کی طرف روانہ ہوتی ہے۔

اس یاد کے ساتھ ہی وہ چھت سے اُتری اور گھر سے باہر نکل گئی۔ قصبے کی مسجد میں عشا کی اذان ہو رہی تھی ــــ اللہ اکبر کی آوازیں اُسے بڑا ٹھہراؤ اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ یہ آوازیں گویا مسجدِ اقصیٰ کے میناروں سے بلند ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحات کے لئے مسجد کے دروازے پہ رکی، اور پھر بس کے اڈہ کی طرف بڑھ گئی۔

عالیہ قدس پہونچی تو دوسرے ہی روز فواد بھی اس کی تلاش میں وہاں آ پہونچا۔ لیکن عالیہ کی ایک ہی شرط تھی کہ وہ اسی صورت میں فواد سے شادی کر سکتی ہے جب کہ فواد آزادیٔ وطن کی فوج میں شامل ہو جائے۔ فواد کو آخر اُس کی بات ماننی پڑی۔ اور عالیہ فخر و غرور سے سر اٹھائے اپنی سہیلیوں اور خواتین کے ہجوم میں گھومنے پھرنے لگی۔ جب وہ اپنے منگیتر کو دیوارِ یروشلم کے نیچے دیکھتی تو اُس کا سر تن جاتا۔ اُسے قطعی یقین تھا کہ اس دیوار کو توڑنے والوں میں اُس کا منگیتر بھی شامل ہوگا۔ فواد کا نام ستارۂ سحری کی طرح ہر طرف چمکے گا۔ آنے والی نسلیں اس کی چمک سے منور ہوں گی ستارۂ سحر کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہر بھٹکے مسافر کو اپنی منزل کا پتہ ملے گا۔

وہ جب آسمان پہ ستارۂ سحر دمکتے دیکھتی تو یوں محسوس ہوتا کہ فواد کی صورت اس میں مسکرا رہی ہے۔ اس کا معمول ہو گیا تھا کہ اِدھر مسجدِ اقصیٰ سے اذان بلند ہوئی، اُدھر عالیہ چھت پہ کھڑی ہو کر ستارۂ سحر کی چھاؤں میں سوتے اور جاگتے یروشلم کو دیکھتی، اور تصور کرتی کہ دیوار درمیان سے اُٹھ گئی ہے۔

لیکن وہ یہ نہ جانتی تھی کہ جب ابابیلیں آسمان سے آتشیں کنکر برسائیں گی، اور ہاتھی کی سونڈ جیسے جانور زمین کو روندتے ہوئے آگے بڑھیں گے، تو گو دیوار ٹوٹے گی۔ لیکن دیوار کی بنیادوں میں اُس کے منگیتر کا خون رائیگاں جائے گا وہ یہ کچھ نہ جانتی تھی۔ محض آزادیٔ وطن کے خواب دیکھتی تھی۔

اُس کا یہ خواب پانچ جُون کی صبح منتشر ہو گیا۔

اسرائیلیوں نے اُس کا گھر تباہ کر دیا۔

فواد کا خون ہر طرف پھیل گیا۔

اور ایک امریکی سپاہی نے اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیا۔

یہ امریکی بھی اسرائیلی فوج میں شامل تھا —— وہ یقیناً یہودی تھا۔ لیکن وہ عرب نہ تھا —— وہ محض امریکی تھا اُسے عرب کی سرزمین، پیغمبروں اور نبیوں کی آرام گاہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ مذہبی اور اقتصادی جنگ لڑنے آیا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر مسلمانوں کا قتلِ عام اور مشرقِ اوسط کا تیل تھا —— وہ سامراجی تھا، اور تمام عرب پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ وہ گدھوں کی طرح عرب کو کیوں نہ نوچتا۔ عرب محض عرب تھا۔ مسلمان محض مسلمان تھا۔ نہ وہ کسی کا باپ تھا نہ بھائی، نہ انسان تھا نہ کسی کا محبوب نہ کسی کا منگیتر!

دیوارِ یروشلم کے نیچے پتھروں کے نیچے ستارۂ سحر کا لاشہ پڑا تھا

آسمان سے سُورج رنج و غم سے شعلے برسا رہا تھا،

اور تیز دھوپ میں فواد سے کچھ فاصلے پر عالیہ کا نیلا اور سرد جسم پڑا تھا!

یہ موت اُسے امریکی بھیڑیئے نے عنایت کی تھی، جو دوسری عالیوں کی تلاش میں ارضِ مقدس کے سینے کو اپنے ناپاک قدموں سے روندتا پھر رہا تھا۔

بن پھول

ترجمہ

سید رضا کاظمی

نام میں کیا رکھا ہے؟

(بنگلہ کہانی)

ہمارے محلے کے پتن بابو کو غیر معمولی آدمی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ سماج میں رہ کر بھی سماج کے باہر رہنا چاہتے ہیں۔ نہ آدابِ محفل کا خیال کرتے ہیں نہ ہمسائیگی کا لحاظ۔ کسی کی دعوت کبھی قبول نہیں کرتے اور پڑوسیوں کی خیر خبر لینا فضول سی بات سمجھتے ہیں۔ کبھی ان کے گھر ملنے کے لئے جاؤ تو یوں منہ بنائیں گے جیسے کونین کھالی ہو! پھر بھی ہم لوگ تقریباً ہر شام اُن کے گھر پہونچ جاتے ہیں۔ پتن بابو کے برتاؤ اور اخلاق میں خواہ کیسی ہی کھوٹ کیوں نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کے گھر کی چائے بڑی اچھی ہوتی ہے۔

اُس شام جب ہم تینوں دوست ان کے گھر پہونچے تو وہ کسی سے مصروفِ گفتگو تھے۔ اُن کا مخاطب ہمارے لئے اجنبی تھا۔ پتن بابو نے ہمیں دیکھا لیکن حسبِ عادت یہ بھی نہ کہا کہ بیٹھئے۔ بس اس اجنبی سے باتیں کرتے رہے۔ ہم تینوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اُن دونوں کی باتیں سننے لگے۔

پتن بابو کہہ رہے تھے۔ "وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ غنڈہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ اور شراب بھی پینے لگا تھا۔"

"آپ گھوش بابو کے لڑکے کا ذکر کر رہے ہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

لیکن پتن بابو نے کوئی جواب نہ دیا۔ زیر لب مسکرائے اور اس اجنبی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہتے رہے، "اُس کے باپ نے اُسے اسکول سے اٹھالیا اور اپنے ایک رشتے دار کے پاس بہار بھیج دیا۔ ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا اسی دوران وہ لڑکا شاعری بھی کرنے لگا تھا۔"

"میرے دوست بھنڈاری بابو نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا: "پتن بابو جگّا کا ذکر کر رہے ہیں۔ نہیں سمجھے کیا؟" مجھے یاد آیا کہ دو بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد پتن بابو کے بڑے لڑکے جگدیش نے جسے وہ پیار سے جگّا کہہ کر پکارا

کرتے تھے شراب پیتا اور فلمی پرچوں کے لئے گیت لکھنا شروع کر دیا تھا، اور ان دنوں چھپرا ضلع کے ایک گاؤں میں اپنے ننہال میں رہتا ہے۔ اس لئے میں نے بھی سوچا کہ بھنڈاری بابو کا گمان درست ہے۔

لیکن پتن بابو نے نہ تو تصدیق کی نہ تردید، وہ کہتے رہے:

"بہار رہا کر اس کا شاعری کا مرض زور پکڑ گیا۔ باپ نے اُسے کاروبار سیکھنے کے لئے بھیجا تھا، لیکن لڑکے نے وہاں جاکر اُس طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ہفتہ وار و ماہوار رسالوں کو نظمیں بھیجتا رہا اور بقیہ وقت کمرے میں بیٹھ کر فضول سی کتابیں پڑھتا رہا۔"

اجنبی نے پوچھا: "فضول سی کتابیں؟ یعنی کس قسم کی کتابیں؟"

"یہی فلسفہ، منطق اور ادب کے متعلق۔ مطلب یہ کہ نیل کے کاروبار کے متعلق کوئی کتاب نہیں پڑھی۔"

"نیل کے کاروبار سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"ارے بھئی ان رشتہ داروں کا نیل کا ہی کاروبار تھا اور جس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرکے اس لڑکے کو کچھ معاشی فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا؟ وہ رشتے دار بھی اس سے تنگ آگئے۔"

نوکر اندر سے چائے لایا، اور ایک ایک پیالی سب کے ہاتھ میں تھما دی۔

بھنڈاری بابو نے اپنی افیون کی ڈبیہ نکالی اور اُسے چائے میں ڈال کر ملاتے ہوئے بولے: "نیل کا نام سن کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بات جگا کی نہیں کسی دوسرے لڑکے کی ہے ——— آخر کون ہو سکتا ہے؟"

پتن بابو نے کہا، "تو بھائی اس کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ کلکتہ کے ایک ادبی ماہنامے کے ایڈیٹر نے اُس لڑکے کو بُلا لیا۔ انہوں نے لڑکے کو لکھا: "مجھے تمہاری نظمیں بہت پسند ہیں تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اور معاون ایڈیٹر کی کرسی سنبھال لو۔ چند ماہ بعد میں تمہاری نظموں کا مجموعہ شائع کرا دوں گا" ——— لڑکا کلکتہ پہونچ گیا اور وہاں کے ادیبوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے ہمارے تیسرے ساتھی مدھو بابو بول پڑے: "اوہو میں سمجھ گیا، یہ اپنے بنکم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے!"

میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ اس لڑکے کے حالات بنکم سے واقعی ملتے جلتے تھے۔ بنکم بھی کچھ عرصہ تک کلکتہ کے ایک ماہوار رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکا تھا:

"ہاں تو لڑکا کلکتہ میں خوشی خوشی رہنے لگا۔" پتن بابو کہنے لگے۔

گو کہ پتن بابو نے ایک بار بھی بھنڈاری بابو کی جانب نہیں دیکھا تھا، پھر بھی بھنڈاری بابو نے کہا:

"اچھا ———؟"

"وہ کلکتہ کے ادبی حلقوں میں خوب گھل مل گیا۔ تمام شاعر اور ادیب اس کا ذکر کرنے لگے تھے۔ جو لوگ شاعری یا

ادیب نہیں تھے وہ بھی اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ بات یہاں تک پہونچی کہ اُسے ایک ملازمت مل گئی۔"

اجنبی نے پوچھا: "کون سی ملازمت؟"

"اسکول ماسٹری کی۔"

"اچھا، پھر کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا، چند دنوں تک اُس کی کافی تعریفیں کی گئیں ـــ بڑا اچھا ماسٹر ہے۔ بڑا نیک ماسٹر ہے ـــ لیکن اس کے بعد وہ ذرا بہادری دکھانے پر اُتر آیا۔۔۔۔۔۔۔"

"وہ کیسے؟"

"طالب علموں کے ساتھ گھل مل گیا۔ تمام طالب علم اس کے دوست بن گئے۔"

بھنڈاری بابو فوراً بول پڑے: "آج کل کے نوجوانوں کا یہی حال ہے۔ میں سمجھ گیا آپ اشوک ماسٹر کا ذکر کر رہے ہیں۔ کیا آپ اس کا کچا چٹھا جانتے ہیں؟"

پتن بابو ہولے سے ہنسے لیکن کوئی جواب نہ دیا ـــ "ہاں تو اسکول کے اس نئے ماسٹر کی بہت بدنامی ہوئی کہ وہ اسکول کے طالب علموں کے ساتھ ہر وقت اٹھتا بیٹھتا ہے۔"

"اس کے بعد؟" اجنبی نے پوچھا۔

"اس کے بعد اور کیا ہوتا۔ ملازمت گئی۔ بدنامی الگ ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر کو خوف ہونے لگا کہ کہیں تمام لڑکوں کے خیالات میں انقلاب نہ آجائے، اس لئے انہوں نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا۔"

"لیکن لڑکوں کے خیالات میں انقلاب آجانے کا اندیشہ کیونکر ہوا؟" اجنبی نے پوچھا۔

"بھئی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا تھا اور کہا کرتا تھا ـــ یہ مذہب اور اخلاق یہ سب دقیانوسی بن مانسوں کی سوجھ بوجھ ہے۔ اس دور میں یہ تمام باتیں بے معنی اور فضول ہیں ـ اصل چیز عمل ہے ـــ وہ فرانس کے انقلابیوں کی باتیں کرتا، ابفر تے اور مل کی باتیں دُہراتا۔"

"پھر؟"

"اونھ۔ ہمارے ملک میں اس "پھر" کا کب تک دور دورہ رہے گا؟ وہ تھوڑے دنوں یونہی ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ بزرگوں کی نصیحتیں اور گالیاں سنیں اور ایک دن مر گیا۔"

"مر گیا؟ کیا ہوا تھا اُسے؟" اجنبی نے پوچھا۔

"ہیضہ!"

بھنڈاری بابو فوراً بول پڑے: "اب میں سمجھ گیا۔ آپ راین گھوش کے بھتیجے نیپو کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی کلکتہ میں اسکول ماسٹری کرتا تھا۔ شکستہ قسم کا آزاد منش آدمی تھا۔ ایک سال ہوا مر گیا۔ آپ اُسی کا ذکر کر رہے ہیں نا؟"

میرے تیسرے ساتھی نے کہا: "راین گھوش کا بھتیجا شراب نہیں پیتا تھا، البتہ اُس نے اسکول ماسٹری ضرور کی تھی۔ شراب تو اتول بوس کا بھانجا گنگو پیتا تھا، لیکن وہ تو ٹائیفائڈ میں مرا تھا۔ آپ کو غالباً غلط اطلاع ملی ہے

پتن بابو ـــــــ ؟"

پتن بابو پھر زیر لب مسکرائے، لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ ایسا بے حس آدمی شاید ہی کوئی دوسرا ہو!!
اجنبی کی جانب دیکھ کر پتن بابو نے کہا: "ایسے آدمی سے عقیدت یقیناً فطری بات ہوگی۔ میں تو اس کا بڑا احترام کرتا ہوں۔"

"تو یہ ہے آپ کے عظیم و قابل احترام آدمی کی کہانی؟" اجنبی نے کہا۔
بھنڈاری بابو بولے: "آپ نے اس کا نام چھپا رکھا ہے اس لئے یقیناً وہ عظیم انسان نہیں ہو سکتا۔ پہلے ہی نام بتا دیتے تو یقیناً وہ صحیح روشنی میں عظیم انسان نظر آتا۔"
"نام کیا ہے؟ بتائیے نا؟" اجنبی نے پوچھا۔
"نام ڈِک ہیری!"
پتن بابو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

قتیل شفائی

شام سے آ رہی ہے یاد تری
جام چھلکا رہی ہے یاد تری
جھنجھنا سا رہا ہے سازِ خیال
گیت سے گا رہی ہے یاد تری
کھلتے جاتے ہیں پھول زخموں کے
غم کو مہکا رہی ہے یاد تری
میں تڑپتا ہوں یاد کر کے تجھے
مجھ کو سمجھا رہی ہے یاد تری
جل رہا تھا بدن خیالوں کا
سائے برسا رہی ہے یاد تری
بے سبب تو نہیں یہ سناٹا
کچھ تو فرما رہی ہے یاد تری
دیکھ کر مجھ کو محوِ کارِ حیات
روٹھ کر جا رہی ہے یاد تری
اب مرا دل وہ دشت ہے جس میں
ٹھوکریں کھا رہی ہے یاد تری
صرف تو ہی نہیں اداس قتیلؔ
اُن کو بھی آ رہی ہے یاد تری

فارغ بخاری

جو اپنے جسموں کے مقتل میں بن گئے سائے
انہیں صداؤں کا ملبوس کون پہنائے
کھلی فضاؤں کا رہوار بن گیا ہے بشر
ہے کس کے بس میں جو اس برق پا کو ٹھہرائے
کہاں ہے نکتہ طرازو وہ منزلِ احساس
کہ ذہن لمحۂ آسودگی جہاں پائے
غموں کے دجلے ہم آنکھوں میں لے کے نکلے ہیں
برس پڑے تو یہ دھرتی کہیں نہ بہہ جائے
وہ لہر بھی کبھی اس بحرِ منجمد سے اٹھے
دلوں کی بجھتی ہوئی آنچ کو جو بھڑکائے
مسافرانِ وفا کو نیا افق نہ ملا
وہی فسانے ہر اک رہ گذر نے دہرائے
شبِ فراق میں کافی نہیں ہو رونا
کہ اور بھی تو ہیں اظہارِ غم کے پیرائے
جو چرکے دل پہ لگائے ہیں آشناؤں نے
وہ زخم بن کے میری روح میں اتر آئے
ہوں خامشی کے بیاباں میں منتظر فارغ
خدا کرے کوئی چہکی ہوئی صدا آئے

حزیںؔ لدھیانوی

دوست بنائیں گے اب کیونکر، دے گی ساتھ خدائی کیسے
ماں تک منہ کو موڑ چکی جب، بہنیں کیسی، بھائی کیسے

ظلمت کے دریا میں ڈوبے، درد کے صحراؤں سے گزرے
پوچھ نہ دیوانوں نے دل میں پیار کی جوت جگائی کیسے

وہ شب رنگ حسیں زلفوں کے پیچ و خم کو دیکھ رہے ہیں
میں دل میں یہ سوچ رہا ہوں آکے سحر کجلائی کیسے

صبر کی سل سینے پر رکھ لو یا کوئی اور مداوا سوچو
پاٹ سکو گے رو کر یارو غم کی گہری کھائی کیسے

دن بھر دھوپ حوادث کی اور شب بھر اشکوں کی برساتی
حیرانی ہے، ایسے میں یاد کسی کی آئی کیسے

کاش مجھے سمجھائے کوئی زیست کے تپتے ویرانے میں
ہو جاتی ہے رم جھم کیونکر، چلتی ہے پُروائی کیسے

مجھ کو دیکھو، مجھ سے پوچھو، تم کیا جانو، تم کیا سمجھو
زلفوں والو، ناگن بن کر ڈستی ہے تنہائی کیسے

بوالہوسوں کے رنگ محل میں رات حزیںؔ یہ منظر دیکھا
اوّل شب کے چاند کی صورت جھکتی ہے برنائی کیسے

احمد فراز

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

کرے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لئے
یہ شہر کب سے ہے ویراں، وہ لوگ کب کے گئے

تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

(بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

زہرہ نگاہ

(۱)

ہر خار عنایت تھا، ہر اک سنگ صلہ تھا
اُس راہ میں ہر زخم ہمیں راہ نما تھا
اُن آنکھوں سے کیوں صبح کا سورج ہے گریزاں
جن آنکھوں نے راتوں میں ستاروں کو چُنا تھا
اے شیشہ گرو، کچھ تو کرو آئینہ خانہ
رنگوں سے خفا، رُخ سے جُدا ہی نہ ہوا تھا
کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا

(۲)

جو دل نے کہی لب پہ کہاں آئی ہے دیکھو
اب محفلِ یاراں میں بھی تنہائی ہے دیکھو
پھولوں سے ہوا بھی کبھی گھبرائی ہے دیکھو
غنچوں سے بھی شبنم کہیں ٹکرائی ہے دیکھو
اب ذوقِ طلب وجہِ سکوں ٹھیر گیا ہے
اور عرضِ وفا باعثِ رُسوائی ہے دیکھو
غم اپنے ہی اشکوں کا خریدار ہوا ہے
دل اپنی ہی حالت کا تماشائی ہے دیکھو

(بشکریہ: ریڈیو پاکستان کراچی)

منظوم مثنوی

گلہائے شمشاد قداں ہیں
دل کے زخم ہی میری جاں ہیں
دیکھو تو، ظلمت کے پیچھے
روشنیاں ہی روشنیاں ہیں
آئینہ بن کر بیٹھا ہوں
سب ہی محفل میں حیراں ہیں
تم اپنی فرماؤ ۔ ہم تو
اچھے ہیں، جیسے ہیں، جہاں ہیں
نعرے سن کر سوچ رہا ہوں
شاعر ہیں کہ سیاست داں ہیں
پھولوں کے پہلو میں کانٹے
اپنی قسمت پر نازاں ہیں
ہر چہرے پر تابانی ہے
اے حیرت! ہم آج کہاں ہیں
یہ مصرعے منسوب ہیں اُن سے
میرے حال پہ جو خنداں ہیں
اُستادانِ شعر مظفرؔ
تیری غزلوں سے نالاں ہیں

حامد سروش

کیوں چور ہیں کہ جامِ مئے ناب ہم نہ تھے
آئے ہیں کیوں گہن میں کہ مہتاب ہم نہ تھے

قسمت نے ہم کو تاجِ وفا میں سجا دیا
ایسے بھی ورنہ گوہرِ نایاب ہم نہ تھے

کمہلا دیا ہے وقت کے صحرا کی دھوپ نے
کیا اب سے پہلے اک گلِ شاداب ہم نہ تھے

ہم تیرے دل پہ نقش تھے پھر محو کیوں ہوئے
آغازِ شب میں دیکھا ہوا خواب ہم نہ تھے

مل جاتے زندگی کے کسی موڑ پہ تمہیں
تم ڈھونڈتے تو اتنے بھی کمیاب ہم نہ تھے

اس کے وجود سے کوئی نسبت نہ تھی سروش
سجتے تو کیسے اطلس و کمخواب ہم نہ تھے

وقار عزیز

شور تھا ہر سمت اور دل میں تھی گہری خامشی
اُس سے آواز تیری ایک پتھر سی لگی

سوچ تیرا روپ تھی اور لفظ تھے تیری تراش
آخری تصویر تھی وہ درد کے انداز کی

زخم کچھ بھرنے لگے تھے ہاتھ جب خاموش تھے
زخم تازے کر گئی ہے ٹوٹ کے زنجیر بھی

لمس تھا تیرا تصور رنگ تھا تیرا بدن
شہر میں ہر چیز تیرے سانس کی آواز تھی

خشک سینوں پہ کبھی سجتی نہیں شبنم تری
اب تری یادیں بھی ہیں آواز جیسے دور کی

اس ہجوم بے کراں میں کس کی لغزش تھی وقارؔ
ایک چنگاری اُڑی اور ساری بستی جل گئی

رشید نثار

کس تمنا پہ کریں بات کسی شوخ سے ہم
نگہِ لطف کہاں، جنبشِ مژگاں بھی نہیں
وقت گذرا ہے مگر تیری ادا کے مانند
حاصلِ درد نہیں، درد کا درماں بھی نہیں
وحشت اس مرتبہ کیا رنگ دکھائے گی نثار
جیب و دامن تو کہاں تارِ گریباں بھی نہیں

انجم سلطانپوری

تذکرہ جب مرا آیا ہوگا
بزم میں دل کوئی دھڑکا ہوگا
زندگی لاکھ بھیانک ہی سہی
ہم کو ہر حال میں جینا ہوگا
لکھ کے اک نام مٹا دیتا ہوں
سوچتا ہوں کوئی رسوا ہوگا

مقبول قریشی

رکے تو ہم نے سنواری ہے زلفِ دشت ودمن
چلے تو بخت جگائے ہیں رہگذاروں کے
فضائے دشتِ تمنا دھواں دھواں ہے تو کیا
قدم رکیں گے نہ اب تیرے جاں نثاروں کے

اصغر یگانہ

وہ جذبِ محبت ہو کہ اظہارِ عقیدت
ہر بات یہاں تیرے اشاروں میں ڈھلی ہے
ہر عشرتِ ہستی ہے ترے نام سے منسوب
ہر دولتِ غم درد کے ماروں میں ڈھلی ہے

ناصر صدیقی

غم ترا دل میں بسا ہو جیسے
کوئی ویرانہ سجا ہو جیسے
چیختی پھرتی ہے صحرا میں ہوا
راہ میں کوئی ملا ہو جیسے
دل دھڑکتا ہے تو ہم سوچتے ہیں
یہ بھی تیری ہی صدا ہو جیسے

احمد تنویر

لاشوں کے یہ انبار، یہ خوں ریزئ لمحات
آسیب زدہ دل سا کوئی گھر نہیں دیکھا
خوشبو کو خداوندِ چمن ماننے والو
کیا تم نے کسی گل کا مقدر نہیں دیکھا

فہیم احمد فہمی

فریبِ زندگی میں آ گئے ہیں
بڑا رنگین دھوکا کھا گئے ہیں
اُجالوں کی تلاش و جستجو میں
بھیانک تیرگی میں آ گئے ہیں
ہمیں دنیا سے اب لینا ہی کیا ہے
تجھے پایا تو سب کچھ پا گئے ہیں

ندیم نیازی

دل ڈھونڈتا ہے جس کو بہر سُو بہر مقام
اے کاش وہ حسین سا چہرا دکھائی دے
وہ رو دیئے تو ڈوب گئے دو جہاں ندیمؔ
اُن کے ہر ایک اشک میں دریا دکھائی دے

عبدالرحمٰن چغتائی   قیصر تمکین   اشرف حسین

احمد سلیم   رضیہ فصیح احمد   حکیم گلچیں کرنالی

محفل

عبدالرحمٰن چغتائی ۔ لاہور

صہبا صاحب، سلام مسنون ۔

میں دو ماہ برابر بیمار رہا، اب کچھ اچھا ہوں ۔ کچھ دن ہوئے آپ کا بیش قیمت عطیہ "مجاز ایک آہنگ" وصول ہوا ۔ اور اس نے اس پریشانی میں بڑا سہارا دیا ۔ مطالعے سے جی بھر کر لطف اندوز ہوا ۔

مجاز کا رنگ قوس قزح کا سا آہنگ ہے ۔ جن ادیبوں اور اہل قلم نے اس کی تکمیل میں آپ کا ہاتھ بٹایا ہے ان کی بصیرت نے مجاز کو زندۂ جاوید شاعر اور اسرار الحق دکھانے کی پوری کوشش کی ہے ۔

آپ کی محنت اور کوششوں کی داد دینا اپنا فرض تو ہے ۔ مگر آپ کے ارادوں میں ابھی تشنگی ہے ۔ چغتائی نمبر کے متعلق ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے ۔ علامہ اقبال کا مصور ایڈیشن شائع ہوئے ۔

معلوم ہوتا ہے ، اس دفعہ آپ یوم اقبال کے موقع پر' جو کراچی میں ہوا ہے' نہیں سکے ۔ ممتاز حسن صاحب نے اس موقع پر تصویروں کی نمائش کا بھی بڑا اہتمام کیا تھا ۔ اور سنتا ہوں اسے ممتاز حسن صاحب کی امیدوں سے بھی کہیں زیادہ کامیابی ہوئی ۔ کچھ تصویریں مجھ سے بھی لی گئی تھیں جو ڈان اور جنگ میں شائع ہوتی رہیں ۔

آپ کی یاد آوری کا شکریہ   میں کوشش کروں گا آپ کے سالنامے کے لئے آپ کو کوئی اپنا لکھا ہوا افسانہ دوں اور سرورق بھی بنا دوں ۔

والسلام ۔   چغتائی

قیصر تمکین ۔ ٹما لسنگٹن

محبی صہبا ، تسلیم ۔

آپ کا محبت نامہ خاصی مدت کے بعد ملا ۔ مگر خوشی یہ ہوئی کہ میرا نام آپ کی یادداشت میں کس طرح محفوظ

ہے بہت بہت شکریہ۔

میرا اکتوبر کے وسط سے یہیں ادھر ہی ادھر رہا۔ جس کی بنا پر کسی طرح کی ڈاک کہیں سے بھی نہ مل سکی۔ میں عام طور پر چھٹیوں میں یورپ کے شہروں میں سرگشت کرتا رہتا ہوں۔ ایک آدھ بار اٹلانٹک پار بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر یہ وہی سفری ایجنسیوں کے ذریعے کہ آدھا کرایہ پہلے اور باقی اقساط میں۔ یہ سفر بس دو تین دن اور زیادہ سے زیادہ سات دن کے ہوتے ہیں۔ لکھنوی کہاوت میں ان کی توصیف بس " دھنیا "چکر آ جانے کی سی ہوتی ہے۔ کسی جگہ کے مزاج اور وہاں کے لوگوں سے مخصوص انداز نیز یا رائے سے واقفیت کا موقع کمتر ہی ملتا ہے۔ بنیادی وجہ یہ کہ ہوٹلوں میں ٹھیرنا پڑتا ہے۔

یہاں اردو میں لکھنے کی کوشش کے باوجود وقت تو کم ہی مل رہا ہے۔ پچھلے دو سال کی مدت میں جو کچھ بھی لکھا وہ آپ کو یا سلیم الرحمان صاحب کو لاہور بھیجا۔ اصل کام ایک ناول پر کر رہا ہوں اور یہ پہلی چیز ہے جو میں شروع ہی سے انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ یوں تو اپنی کئی کہانیاں انگریزی میں خود ہی ترجمہ کر کے شائع کرائیں۔ مگر انگریزی میں باقاعدہ لکھنے کا وقت یہاں اس وجہ سے زیادہ مل رہا ہے کہ خود محنت نہیں کرنا پڑتی ہے۔ مجھے سیاسی مضامین لکھنے کے سلسلے میں ایک سکریٹری مل ہوئی ہے وہی بے چاری ناول بھی ٹائپ کرتی رہتی ہے۔ اگر کسی پبلشر نے اس میں دلچسپی ظاہر کی تو شائع ہونے کے بعد اس کا ترجمہ ان شاء اللہ خود ہی کروں گا۔ ممکن ہے کہ آپ اس میں کچھ دلچسپی محسوس کریں۔ مگر یہ سب ابھی مشروط ہی ہے کیونکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس کے اختتام کی منزل سوجھ ہی نہیں رہی ہے۔

ادبی حلقوں کی یہاں بات یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ایک آدھ کتاب کا مصنف ہے خاصی رقم حاصل کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ساحلی مقامات پر کہیں ایک آدھ شاٹو حاصل کر کے اطمینان اور فرصت سے بلا کسی خلل اندازی کے اپنا وقت گذارے۔ جو لوگ جدوجہد کی ابتدائی منزلوں میں ہیں وہ "شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باش" کے مصداق کو کبھی کھاتے۔ گندے رہتے۔ یا علت میں مبتلا اور خودکشی کی کوششوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ ہماہمی اور لاگ ڈانٹ جو اپنے یہاں قہوہ خانوں، چائے کی دوکانوں اور پارکوں میں نظر آتی ہے یہاں بالکل مفقود ہے۔ یونیورسٹیوں میں کچھ رونق رہتی ہے۔ مگر ہر ادبی نشست کے لئے جگہیں مخصوص اور ٹکٹ پہلے ہی سے بک چکے ہوتے ہیں۔

پچھلے سال میں ڈرامہ زیادہ مستعد تھا، اس لئے بین الاقوامی ڈرامہ فیسٹول کے لئے ۲۱ پونڈ دے کر جگہیں ایک ماہ پہلے سے مخصوص کرائی تھیں اور رو چسٹر سے لندن آنے جانے کا خرچ الگ رہتا تھا۔ اس سلسلے میں دلچسپ امر یہ ہے کہ باوجود انتہائی اشتیاق اور دلچسپی کے آج تک رائل البرٹ ہال کے کسی کنسرٹ میں کوئی بھی نشست حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ مشہور آفاق فن کاروں مثلاً یہودی مینوہن یا شتاستا کووچ کو لندن میں نہیں بلکہ نئی دہلی اور ایمسٹرڈم میں سننے کا موقع ملا۔ آج کل کا زبردست اور جدید ترین کا فن کار آئیگو اسٹراونسکی (Igor Stravinsky) ہے۔ نیوکاسل میں آنے والا تھا جس کے لئے میں نے جنوری سے انتظام کر رکھا تھا۔ اس کا کنسرٹ ۳ مارچ کو ہونا تھا مگر عین موقع پر معلوم ہوا کہ یہ پروگرام ملتوی ہو گیا۔ بقول کسے وا حسرتا!

لندن کے مقابلے میں پیرس زیادہ کھلا، زیادہ آزاد، زیادہ گرم جوشی سے ملو اور ادب و فن کے ہنگاموں سے

بھرپور ہے۔ دن کو آرٹ گیلریوں میں گھومئے۔ شام کو لفٹنٹ بنک کے کھلے قہوہ خانوں میں دنیا کے ہر فن پر بولئے۔ ہر زبان میں بولئے۔ ہر عیاشی سے بہرہ ور ہوئیے۔ کسی خوانچہ فروش سے کچھ لے کر کھا ئیے۔ شراب خانوں میں گھس جائیے پھر رقص گاہوں میں چلے جائیے اور صبح ہونے تک ناچتے رہیئے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وقت کہاں گذر گیا۔ لندن میں دن کا ابتدائی حصہ (خاص طور پر دوپہر کو دو تین بجے تک) تو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتا ہے۔ پھر یہاں عجائب خانوں، نگار خانوں اور قہوہ خانوں میں بھی بڑی بھیانک "Touch me not" قسم کی مردم بیزاری ٹپکتی ہے۔ پیرس میں لوگ ہنستے بولتے، باتیں کرتے، مذاق اڑاتے اور ہر خوبصورت لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ یہاں کسی لڑکی سے بولئے تو وہ بڑی مشفقانہ مسکراہٹ سے سر ہلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ گویا آپ نے ان کو ہیلو کہنے کے بجائے "آپا سلام" کہا ہو۔ وہاں کی لڑکیاں ادب و فن کی دلدادہ ہیں۔ نقاشوں کے پیچھے تو دیوانی رہتی ہیں — یہاں لڑکیوں کو بے تکی Pop موسیقی کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ سب سے زیادہ ناقابلِ توجہ اور التفات "اپنی طرف کی بے چاری بہنیں" ہوتی ہیں جن کو سوائے پیسہ بٹورنے کے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان میں پاکستانی ہندوستانی کی تخصیص نہیں ہے۔

خیر جانے دیجئے۔ میں بھی کیا ذکر لے کر بیٹھ گیا۔ اب اس کاغذ میں جگہ نہیں ہے اس لئے محض آپ کی خیریت اور مکمل صحت و تندرستی کی تمنا کے اظہار کے ساتھ رخصت۔

اشراف حسین۔ پشاور

محبی صہبا صاحب۔ سلام مسنون۔

آپ کے موقر جریدے کے حالیہ شمارے میں احمد فراز کا ایک شہ پارہ چھپا ہوا دیکھا۔ یہ خط واقعی عجائبات میں سے ہے۔ اور اگر افکار جیسا ادبی جریدے کی زینت نہ بنتا تو یقیناً اس کی ادبی تاریخ میں ایسی کمی رہ جاتی جس کا پُر کرنا محال تھا۔ اس میں جو اردوئے معلیٰ استعمال کی گئی ہے وہ تو اس قابل ہے کہ انہیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی جائے۔

اس تحریر سے فراز کی ذہنی سطح اور ادبی معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے زبان و بیان اور لب و لہجہ میں بازاری پن کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہے کوئی شریف آدمی چاہے بھی تو اس سطح پر ہرگز نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کا جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آپ نے یہ خط کس خوشی میں شائع کیا[1] اس سے پر تو آپ ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے فارغ بخاری صاحب یا رضا ہمدانی صاحب کی طرف سے کوئی ایسا اقدام نہیں ہوا جس کے اس قدر عامیانہ جواب کی انہیں ضرورت پیش آئی ہو۔ یہ لامحالہ اس تبصرے کا جواب ہے جو آپ نے "درد آشوب" پر کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔ وہ تبصرہ بھی میری نظر سے گذرا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ اتنے سیخ پا ہوتے کہ اخلاق و شرافت کی تمام قدریں پامال

---

[1] جمہوری اقدار کے احترام میں۔ ہر شخص کو اظہار رائے کا حق ہے۔ (صہبا)

دیکھ کر غزل کہہ دی پھانستر آئے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محض آدم جی پرائز حاصل کر لینے سے نہ کوئی انسان بن سکتا ہے نہ ادیب۔

لطف یہ ہے کہ تبصرہ آپ نے کیا، اور فراز صاحب کے قہر و غضب کا نشانہ فارغ رضا صاحبان بنے۔ اور آپ نے بھی یہ خط شائع کرتے ہوئے اتنا نہ سوچا کہ آخران حضرات کا کیا قصور ہے۔ کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ آپ نے یہ محاذ کھلوانے کے لئے ایسا تبصرہ شائع کیا۔ اگر یہ بات نہیں، اور ایک سچے ادیب کی طرح جو کچھ آپ نے محسوس کیا، اس رائے کا جرأت مندانہ اظہار کر دیا تو آپ کا فرض تھا کہ اس ردّعمل کا مقابلہ بھی خود ہی کرتے، اور فراز کا خط چھاپنے کے بجائے اُسے لکھتے کہ یہ میری ذاتی رائے تھی اور جو زہر اُگلنا چاہو میرے خلاف اگلو۔ آپ تو ان گنتی کے ایڈیٹروں میں سے ہیں جن کا کردار بے داغ رہا ہے جو حکومت کی تلوار کے سامنے نہیں جھکے پھر ایک فرعون طبع شاعر کے دھمکیوں میں کیسے آگئے۔
مجھے امید ہے آپ اخلاقی جرأت سے کام لے کر یہ خط ضرور شائع کریں گے۔

احمد سلیم - راولپنڈی

جناب صہبا صاحب۔

سود و آشوب" کے تبصرہ کے سلسلے میں احمد فراز صاحب کا خط دیکھ کر حیرت ہوئی۔ لطف یہ ہے کہ تبصرہ آپ نے کیا اور نزلہ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی پر گرا۔ آپ نے جو تبصرے میں فراز صاحب کے فیض صاحب سے متاثر ہونے کے متعلق لکھا ہے ان کا غیظ و غضب کہیں اس کا نتیجہ تو نہیں ہے؟

کسی صاحب نے "شاہر فراز" میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے بہت سے اشعار سے احمد فراز کے شعروں کی سندیں مہیا کی گئی ہیں۔ فراز صاحب نے نہ تو ان کا جواب دیا ہے، اور نہ ہی ان صاحب کو کسی قسم کی ڈانٹ پلائی ہے۔ لیکن یہاں وہ کپڑوں سے باہر ہوتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے لہجے کی یہ درشتی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ سوائے اس کے جیسا کہ عام طور پر کہا جا رہا ہے۔ فراز بچارے بُری طرح احساسِ کمتری کا شکار ہو رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خاصی دوڑ دھوپ کے بعد "گلڈ ادبی انعام" حاصل کر لینے سے کوئی بڑا شاعر یا ادیب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی یہ چیز کوئی معیار ہو سکتی ہے۔

میں فارغ رضا کو بھی جانتا ہوں، اور فراز صاحب سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے فارغ رضا نے کبھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ جس سے کسی "برخوردار" کی "نسلی حُرمت" کو خطرہ لاحق ہوا ہو۔ فراز صاحب کے لئے یہ ثابت کرنا بھی ممکن نہ ہوگا کہ فارغ رضا نے کسی نئے لکھنے والے کی مخالفت کی ہو۔ یا اس پر اپنی چھاپ لگانے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ جس پر نہ انہیں فخر ہے اور نہ وہ اس کی داد کے طالب ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فخر و مباہات کے لئے ان کی اپنی تخلیقات کا اتنا عظیم ذخیرہ موجود ہے، جس سے

لہ افکار نے گذشتہ ۲۳ سال میں کبھی ادبی محاذ نہیں کھولا جس کا ثبوت اُس کی فائلوں سے مل سکتا ہے۔ (صہبا)

کون کورچشم ہی انکار کرسکتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد۔ سیالکوٹ

صہبا بھائی۔ آداب۔

تازہ 'افکار' میں انجم اعظمی صاحب کا مضمون "پاکستان میں اردو ناول" پڑھا۔ اس میں "آبلہ پا" کا ذکر سب سے سرسری اور ناروا انداز میں کیا گیا ہے۔ انجم اعظمی صاحب لکھتے ہیں کہ 'آبلہ پا' ایک کچے ذہن کی پیداوار ہے۔ وہ کسی تخلیق کو خام تو کہہ سکتے ہیں کہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ مگر کسی لکھنے والے کو اس سے ملے بغیر ایسے الفاظ سے نوازنے کے مجاز نہیں ہوسکتے۔ میں نہیں جانتی کہ انجم اعظمی صاحب کا ذہن کچا ہے یا دم پخت، مگر اُن کی تحریر کے اس حصّے میں غیر ذمّہ داری کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے:

"رضیہ فصیح احمد زندگی کے دکھوں سے نا آشنا ہیں۔"

ایک صورت نا آشنا شخص دُوسرے کے بارے میں یہ بات وثوق سے کیسے کہہ سکتا ہے۔ جواب صرف ایک ہے: سُنی سنائی باتوں پر! اور مجھے یقین ہے کہ ناول پر تبصرہ بھی صرف سنی سُنائی پر کیا گیا ہے۔ اگر ان کے پاس اسے پڑھنے کا وقت نہیں تھا تو اس پر لکھنا کیا ضرور تھا۔ اسے بھی غیر اہم اور نا قابلِ ذکر ناولوں کی فہرست میں ڈال دیتے جیسا کہ ان کی تحریر سے ثابت بھی ہوتا ہے۔

تبصرے میں جن باتوں کو ناول کی جان مان لیا گیا ہے گہری نظر سے پڑھنے والا جانتا ہے کہ ان پر ناول کی اساس نہیں ہے۔ "آبلہ پا" کے پڑھنے والے کا کیا یہ جملہ صحیح ہے: "ایک بے شعور طبقہ اپنی ذہنی کم مائگی کو خود سے چھپا کر ہنسنے بولنے کے ہزار پہلو نکال لیتا ہے اور مجموعی طور پر اس بے شعوری کو شریفانہ زندگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔" ناول میں دراصل اسی دکھ کا احساس ہے کہ بہت سے لوگ اپنی ذہنی کم مائگی کو چھپانے کے لئے ہنسنے بولنے کا ایسا پہلو نکال لیتے ہیں جو کسی طرح تعمیری نہیں ہوتا۔ رہا اس بے شعور زندگی کو شریفانہ زندگی کے نام سے پُکارنے کا ذکر تو ناول میں یہ اشارتاً دُور دور نہیں ہے۔ تبصرے کی ان چند سطروں میں بعض جملوں کا مطلب ہی خبط ہے۔ مثلاً یہ جملہ — "یہ سارے کردار آپس میں خالہ زاد، پھوپی زاد، ماموں زاد، چچا زاد بھائی ہیں اور خود پھوپی، پھوپا، خالہ خالو، ممانی، ماموں، چچا اور چچی وغیرہ ہوتے ہیں۔"

کلیے بنا کر ناول نہیں لکھے جاتے۔ اعظمی صاحب تو اپنے مضمون میں ایک ہی نسخہ سب کو بتلائے دے رہے ہیں کہ بھئی "آگ کا دریا" جیسا آفاقی ناول لکھتے جاؤ اور بقائے دوام کے دربار میں سجتے جاؤ۔ بڑے اور تاریخی المیئے آسمان سے نہیں ٹپکتے۔ وہ بھی شخصی اور انفرادی دکھوں سے عبارت ہوتے ہیں، اور انسانی رشتوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ شیکسپیئر کے سارے ڈرامے ایسے ہی دکھوں سے پُر ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہیں۔ اردی کی "ٹیس" مرد کے ہاتھوں ایک عورت کے زخم کھائے ہوئے دل کی داستان ہے۔ مادام بواری میں کونسا ایسا غم ہے جو عورت مرد نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کسی آفاقی سچائی کے لئے سہے ہیں۔ ناول انسانی زندگی سے بنتے ہیں، خواہوں سے نہیں۔ خواب بھی انسانی زندگی کا حصّہ ہیں مگر

محض خواب ہی زندگی نہیں ہوتے۔ انجم اعظمی مانیں نہ مانیں مگر عورتوں پہ مردوں کا ظلم اپنی جگہ صدیوں پرانی اور اٹل حقیقت ہے اور اس سے اُبھرنے والے المیئے زندگی سے دور نہیں ہو سکتے۔ بشرطیکہ وہ سلیقے سے بیان کئے گئے ہوں۔ دنیا میں مردوں کے ظلم سہنے والیوں کی تعداد ان عورتوں سے کہیں زیادہ ہے جنہوں نے "تاریخ کے صفحات پر" مردوں کا انتقام کر ظلم سہے ہیں۔ کیا ناول صرف یک رُخی حقیقت لکھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کیا محبت کی خود سپردگی ہی اصل ہوتی ہے۔ زخم کی چوٹیں اصل نہیں ہو سکتیں، جو دو اجنبی دلوں کی ازدواجی زندگی میں جکڑے ہوئے بجائیں بجھائیں کرتے اندھیرے میں چلتے ہوئے محسوس ہوتی ہیں۔ اگر ناول کی کیمیاگری میں ایک ہی نسخہ کامیاب ہوتا تو آج بہت سے ناولوں کا شمار عظیم ناولوں میں نہ ہوتا۔

اعظمی صاحب نے تبصرے میں رشتوں کی جو کھر ماسکی ہے وہ نہ ناول تک ہے نہ اس طرح سے جیسی عام معاشرتی ناولوں میں ہوتی ہے۔ ویسے پاکستان میں کتنے انسان ہیں جو اپنی زندگی کی کہانی یوں لکھ سکتے ہیں کہ اس میں دور و نزدیک کے کسی عزیز کا ذکر بھی نہ آئے۔ مغرب سے متاثر ہونے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کے ناولوں میں رشتوں کا فکر اس لئے نہیں ہے کہ ان کے ہاں زندگی سے رشتے کٹ گئے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں جہاں بہت سے عظیم المیئے ان رشتے ناتوں، ان وہموں اور ان رسموں سے جنم لیتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہیں وہاں لکھنے والا ان سب کو نظر انداز کرکے محض آفاقی اور خیالی غموں کے بارے میں سوچتا یا لکھتا ہے تو کیا اسے حقیقت نگار کہا جائے گا۔ "آبلہ پا" میں گھٹی ہوئی زندگی کا عکس بھی ملتا ہے اور یہ سچائی بھی کہ ہمیں اپنی زندگی کی اُن بنادٹی قدروں کو فوراً بدل ڈالنا چاہیئے جنہیں ہم غلطی سے بنیادی سمجھ بیٹھے ہیں۔

حکیم گلچیں کرنالی - ملتان

مکرمی، تسلیم۔

"آئینہ اردو" کے تبصرے (بحوالہ الکار اگست ۷۶ء) میں جناب مسعود احمد برکاتی نے فرمایا ہے کہ:

> "ادا سے ادائی بالکل اسی طرح ہے جس طرح رہا سے رہائی، اور صفا سے صفائی۔ لیکن فاضل مؤلف نے ادائی کے بجائے "ادائیگی" کی حمایت کی ہے تاہم "گی" کے اضافے کا جواز ثابت نہیں ہو سکا۔

حالانکہ صفحہ ۱۳۴ پر جناب اثر لکھنوی کا قول درج ہے کہ:

> "ادائیگی ادا کرنا۔ اس کی جگہ ادائی موجود تھا جیسے صفا سے صفائی لیکن ادائی کچھ ایسا ہلکا پھلکا اور غیر اہم معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے نکتہ شناسوں نے ایک گاف کا اضافہ کرکے ادائیگی بنا لیا۔ فارسی سے مشابہت بھی قائم رہی اور لفظ کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ مگر صفائی میں "گی" کا پیوند نہیں لگایا گیا۔ کس قدر ذکی اور حساس تھے یہ لوگ جنہوں نے اردو زبان بنائی"

ہم نے اس قول کی تائید اس لئے کی کہ لسانیات کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ:

جو لفظ جس طرح بن کر رائج یا مروّج ہو گیا اسی طرح صحیح ہے۔

جس طرح "بنتا ہے (یعنی اصول وقواعد کی روشنی میں) غلط ہے۔

لہٰذا "پے منٹ" کے معنی میں "ادائیگی" "بن گیا" اور رائج ہو گیا ہے اس لئے درست ہے۔ اس کی جگہ "ادائی" (جیسے قرض کی ادائی کرنی ہے) غلط ہے "ادائیگی" (جیسے قرض کی ادائیگی کرنی ہے) صحیح!

البتہ دوسرے معنی میں "ادائی" ہی آئے گا۔ جیسے خوش ادائی، کج ادائی وغیرہ میں۔

اگر یہ سطور شائع کر دی جائیں تو قارئین افکار کو ادائیگی کی حمایت کرنے کا جواز اور میرا موقف معلوم ہو جائے۔

احفاظ الرحمٰن

نئی کتابیں

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

چوری سے یاری تک ○ کلکتہ اک رباب ○ جگر اور اس کی شاعری ○ بولان نامہ

چوری سے یاری تک

مصنف : ڈاکٹر وزیر آغا
ناشر : جدید ناشرین، چوک اردو بازار، لاہور۔
صفحات : ۱۳۶ قیمت ۴ روپے (اشاعت خاص)
" ۲ روپے (اشاعت عام)

"چوری سے یاری تک" ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ وزیر آغا نثر میں سادگی اور خوبصورتی کے قائل ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عام پہلوؤں کو ایسے شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھرنے لگتی ہے۔ ان کے اس مدھم لیکن پُراثر لہجے کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

"ہنسی کی طرح مجھے گریہ سے بھی نفرت ہے۔ عورتوں کی طرح آنسو بہانا کس قدر ذلت کی بات ہے۔ اور پھر اس میں ایک اعلانِ شکست بھی تو ہے۔ رونے کا مطلب تو یہ ہے کہ اب کوئی امید، کوئی آرزو، روشنی کی کوئی کرن تک باقی نہیں، بس چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے...... ہنسی اور گریہ ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ ایک خودغرضی کی علامت ہے اور دوسرا شکست کا اعلان!" (چیخ)

زمین سے آدم کی محبت اور پھر زمین کا ٹکڑوں میں بٹ جانے کا سانحہ!

"پھر ایک صبح جب مسلسل سفر اور لامتناہی فاصلوں کے درمیان لمحے بھر کے لئے رکا۔ اور پہلی بار زمین کی سوندھی سوندھی باس سے آشنا ہوا تو یوں

یہیں کا ہو کر رہ گیا ..... اس نے ایک بچے کی طرح زمین کو بڑے زور سے اپنے سینے سے چمٹا لیا ساتھ ہی اس کا دل کانپ اٹھا کہ کہیں یہ زمین اس سے چھن نہ جائے۔ چنانچہ اس نے جلد جلد زمین کو لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا۔" (دیوار)

انشائیہ کا طنزیہ لہجہ بڑا لطیف ہوتا ہے لیکن اس کا تاثر عام نثر پاروں سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انشائیے کے اس لوازمے کو پوری طرح نبھایا ہے۔ وہ معاشرے کی خرابیوں کو دھیرے دھیرے بہت آہستگی سے کرید کر سامنے لاتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک تہہ کے بعد دوسری تہہ خود بخود نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ زیر نظر انشائیوں میں بھی انہوں نے اپنی یہ روایات برقرار رکھی ہیں۔

کلکتہ اک رباب

مصنف : سید حرمت الاکرام
ناشر : حلقۂ ترویج ادب، مرزاپور، یوپی (بھارت)
صفحات : ۹۲　　قیمت : ۱۵ روپے۔

'کلکتہ اک رباب'، حرمت الاکرام کی ایک طویل نظم ہے جس میں ان لمحوں کا عکس پیش کیا گیا ہے جو انہوں نے کلکتہ میں گذارے تھے۔ اس نظم میں ہمیں کلکتہ کی مشینی زندگی کے تمام مثبت اور منفی رخ نظر آجاتے ہیں۔ اردو میں شہروں سے متعلق کئی نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ کلکتہ سے متعلق .... حرمت الاکرام کی یہ طویل نظم ان نظموں میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

'کلکتہ اک رباب' میں حرمت الاکرام نے اپنے خلوص کی پوری قوتوں سے کام لیا ہے اور شہروں سے متعلق انسان کے جذباتی رشتوں کی عکاسی کی ہے۔

جگر اور اس کی شاعری

مرتبہ : انور عارف
ناشر : مکتبۂ ماحول، کراچی
صفحات : ۴۰۰　　قیمت : ۱۵ روپے۔

جب غزل کا نام آتا ہے تو جگر صاحب کا نام بھی ضرور آتا ہے۔ وہ اردو کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو غزل کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔

انور عارف نے جگر کی شخصیت اور شاعری کے پہلوؤں پر مختلف اچھے اور بکھرے ہوئے مضامین اس کتاب میں جمع کر دیئے۔ مضمون نگاروں میں اردو کے اکثر بڑے نقاد، ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں جگر صاحب کی چند یادگار تصاویر بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ کوشش کی جاتی تو جگر کی کئی یادگار و نایاب تصاویر دستیاب ہو جاتیں۔ اسی طرح جگر کے مشہور خطوط کی تعداد میں بھی اضافہ ممکن تھا

کاش کتاب کے مرتب جگر کے مستند حالاتِ زندگی بھی شاملِ کتاب کر دیتے، تو ایک بڑی کمی پوری ہو جاتی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کو خود ہی طور پر جو چیزیں آسانی سے مل گئیں۔ انہیں کسی التزام و ترتیب کے بغیر شائع کر دیا گیا۔ پھر بھی جن مشہور و مستند اہلِ قلم کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ان سے اردو کا طالب علم یقیناً مستفید ہوگا۔

بولان نامہ

مرتبہ : ورنا واننده گل
ناشر : ورنا واننده گل، گورنمنٹ کالج، کوئٹہ
صفحات : ۲۳۴ قیمت : درج نہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بلوچی کا ادب بھی بڑی وسعت لئے ہوئے ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کی حدود تحقیق و تجسس کی طالب ہیں۔

"ورنا واننده گل" اردو گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی ایک ادبی سوسائٹی ہے جو ۱۹۶۳ء سے بلوچی ادب کی مختلف اصناف کی ترتیب و اشاعت کا کام انجام دے رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب "بولان نامہ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"بولان نامہ" میں بلوچی نثر کی مختلف اصناف کی ارتقائی شکلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلوچی لوک گیت، بلوچی نثر کا تدریجی ارتقاء، بلوچی فارسی گو شعراء، بلوچی افسانہ، بلوچی خواتین کی شاعری اور بلوچی لوک کہانیاں چند قابلِ ذکر مضامین ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ بلوچستان کے جیالے طالب علم اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے رہیں گے۔ اور اپنے تمام وسائل سے مزید تحقیقی کام جاری رکھیں گے۔

یہ نہایت ضروری ہے!

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کے ساتھ جوابی لفافہ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر ادارہ جواب اور مضامین کی واپسی کا ذمہ دار نہیں۔
- منتخب مضامین سلسلے وار شائع کئے جاتے ہیں کسی بھی تخلیق کی فوری اشاعت پر اصرار نہ کیجئے۔
- نمونے کی کاپی کے لئے ایک روپے کے ٹکٹ بھیجئے۔

——— مینیجر افکار، کراچی

رحمان بابا
ترجمہ
سید اشرف بخاری

پشتو

آجا...

آبھی جا اے دلِ پر درد کے آرام آجا
لالہ رُخ سرو قد اے میرے گل اندام آجا

تُو کہ ٹھہرا ہے امام آئینہ سیماؤں کا
ہر پری چہرہ کے لب پر ہے ترا نام آجا

قدرِ اربابِ وفا اے کہ تری ذات سے ہے
اے کہ ہے تجھ سے ہی عشاق کا اکرام آجا

کیا خبر پھر یہ گھڑی لوٹ کے آئے کہ نہیں
سخت ہے دغدغۂ گردشِ ایّام آجا

کون ہوتا ہے بھلا گردشِ دَوراں کا حریف
ہے ترے جور و وفا کا یہی ہنگام آجا

یہ جہاں راہ نوردانِ عدم کی ہے سرا
موت ہے عالمِ ہستی کا سرانجام آجا

روشنی دن کی بھی اے ماہِ تمام رحمٰن
تیری فرقت میں ہوئی تیرگیٔ شام آجا

خواجہ فریدؒ

ترجمہ

اقبال ارشد

سرائیکی

کافی

کرنیں سمٹ گئی ہیں تری پائے زیب میں — ٹیکے کا عکس، عکسِ جمالِ حبیب ہے
جھومر سے ہو رہے ہیں منور خطوطِ رُخ — شاید کہ اب قریب وصالِ حبیب ہے

کاجل بھری نگاہ سے لطف و کرم ملے — لب کی کرن نے فکر فراموش کردیا
بینے[1] نے تیری صاف جبیں کو اُجال کر — قوسِ قزح کا ذکر فراموش کردیا

بادِ شمال شہرِ طرب زا پہ چھا گئی — ساون میں پھر ملار کی دنیا نکھر گئی
آنکھوں میں موجزن ہے محبت کی آبجو — سارے بدن میں شوق کی مستی بکھر گئی

اے خوش کہ زندگی میں دیارِ عرب ملا — اچھا ہوا جو موت نہ آئی غیاب میں
حاصل ہوا حضورِ نگار شعورِ دل — میرا خیال نور بنا ہے شباب میں

وہ سرزمین قوسِ قزح ارضِ رنگ و بو — وہ سامنے ہے میری نگاہوں کے سامنے

آلام سب فریدؔ مرے کوچ کر گئے
خوشیاں بکھیر دی ہیں محبت کی شام نے

---

[1] بینا (Beena) ایک ملتانی زیور

چلین

ماؤزے تنگ
ترجمہ
عنبر چغتائی

جذبۂ ناتسخیر

(کوموچو کے جواب میں)

اس ننھے منّے سے کرۂ ارض پر
کچھ مکھیاں، باریک تیز آواز میں
اور کبھی کراہنے کے انداز میں
مسلسل بھنبھناتی ہوئی
دیوار سے اپنا سر پھوڑ رہی ہیں
لوکسٹ کے پیڑ پر چیونٹیاں ایک بڑی قوم ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں
مغرب کی ہوا اس درخت کی پتّیاں شینگان[1] پر بکھیر رہی ہے
اور تیر سنسناتے ہوئے اُوپر سے گذر رہے ہیں

اسی طرح بہت سے عظیم کام وجود میں آنے کا تقاضا کرتے ہیں
اور ان کا یہ تقاضا ہمیشہ شدید تر ہوتا ہے۔
زمین گردش میں ہے
وقت گذر رہا ہے
گو کہ دس ہزار سال خاصے طویل ہوتے ہیں
تاہم دنوں کو ٹھہرا لو! وقت کی رفتار کو روک دو!!
اگرچہ بجلیاں کڑک رہی ہیں
چاروں سمندروں میں طوفان آیا ہوا ہے
بادل اور سمندر غضب ناک ہیں
پانچوں براعظم لرز رہے ہیں
مگر ہم ہر بلا سے محفوظ ہیں
کیوں کہ ہمارا جذبہ ناقابلِ تسخیر ہے!

---

[1] مقام

روسی

دیمیان بیدنی
ترجمہ
عبدالجلیل قریشی

سگِ نگراں

(براہِ راست روسی سے)

سنہ ۱۸۸۳ء میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا۔ پیٹرسبرگ یونیورسٹی میں تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور پھر سنہ ۱۹۱۲ء سے بالشیوک اخباروں کیلئے کام شروع کیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ سول وار کے دوران نظمیں گیت سیاسی کہانیاں اور لوک گیت کہے۔ وہ سادہ زبان میں ایسی سیدھی سادی بات کہتا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ آسانی سے سمجھ لیتے۔ سیاست اور عوامی زندگی کے درمیان جو کچھ دیکھتا وہی کہتا۔ دیمیان بیدنی اس کا اصل نام نہیں ہے بلکہ یہ ایفم پریدوور کا قلمی نام ہے اور اس نام سے دنیا اس کو جانتی ہے۔

گا رہا ہوں ——— لیکن کیا حقیقی طور پر میں "گا رہا ہوں؟"
میری آواز لڑائی میں کرخت ہو چکی ہے
اور میری نظم بغیر مشاطگی کے آسان ہے
روشنی اسٹیج پر نہیں ہے
سادہ لوح عوام کے سامنے جو شوق میں ساکت ہیں
میں ساحرانہ ترنم میں وائلن کی دھن نہیں گا رہا ہوں
میں تو اپنی آواز بلند کر رہا ہوں
جو غصہ سے بھرپور ہے۔ وہ مضحکہ اڑائے گی اور بہرہ کردے گی
غم کا بوجھ مجھے ورثہ میں ملا ہے
میں خوشیوں کا غلام نہیں ہوں
میری سخت لیکن سادہ نظم ـــ میرا ہر روز کا کارنامہ ہے
میرے ہم وطن محنت کشو
میرے لئے صرف تمہارا انصاف بہت اہم ہے
تم ——— میرے لئے خود ہی ایک مخلص منصف ہو
تم ـ میں تمہاری امیدوں اور تصورات کا مخلص نمائندہ ہوں
تم ——— میں تو تمہارے تاریک گھروں کا سگِ نگراں ہوں

مشرف احمد

رفتارِ عالم

ادبی تہذیبی خبریں اور تبصرے

اردو زبان میں تبدیلی تحریک پاکستان کے منافی ہے

یہ کوشش ثقافتی تاریخ کو ختم کرنے کے مترادف ہے

زبان میں تبدیلی قدرتی عمل کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے

ریڈیو پاکستان کی نئی نشریاتی پالیسی پر ڈاکٹر سید عبد اللہ کا اظہار افسوس

لاہور۔ ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ریڈیو پاکستان نے اپنی نشریات میں بعض عام فہم اردو الفاظ کے بجائے ہندی اور انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کر دیا ہے انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ریڈیو حکام زبان میں اصلاح کے متعلق کوئی معقول بات پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے صرف یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ اردو کو فارسی اور عربی الفاظ سے محروم کر دینے کے لئے کوئی سازش کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر عبد اللہ نے یہ بھی کہا کہ چند سال ہوئے اردو کے ہندسے انگریزی ہندسوں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے اور اب پھر اردو میں عجیب و غریب اصلاح کی جا رہی ہے۔ شاید ریڈیو پاکستان والے ہماری ثقافتی تاریخ کے ایک اہم حصے کو ہم سے جدا کر دینا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد اللہ نے مزید کہا کہ یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ قوم نے اپنے ماضی کے تجربوں سے غافل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ان تجربوں سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے اس منظم احتجاج کا حوالہ دیا جو مسلمانوں نے آزادی سے قبل وار دھا اسکیم کے خلاف کیا تھا۔ اس اسکیم کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے آسان بنایا جائے لیکن آسان بنا دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس سے فارسی اور عربی الفاظ کو ہٹا کر ہندی کے لفظ اردو میں ٹھونس دیئے جائیں۔ اس مسئلہ پر مذہبی اختلافات کی روشنی میں غور کیا گیا اور اسکیم پیش کرنے والوں کو اسلام اور مسلمان

تصدیق کیا گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے کہا کہ جو لوگ ریڈیو پاکستان میں اس تبدیلی کے ذمہ دار ہیں انھوں نے احتجاج کی وہ شدت فراموش کر دی ہے جو مسلمانوں نے ہندوؤں کے اسی قسم کے رویہ کے خلاف ظاہر کی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں کسی زبان کے آسان بنانے کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس عمل کا یہ مطلب نہ ہونا چاہئے کہ عام فہم الفاظ کو زبان سے خارج کر دیا جائے۔ کسی زبان میں تبدیلی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے یہ تبدیلی اس وقت بے ضرر ہوتی جب یہ قدرتی عمل کے ذریعہ پیدا ہوتی لیکن اگر زبردستی اسے ہندی کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تو یہ کوشش اس تحریک کے خلاف ہوگی جس کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے قوم کے ثقافتی اور تاریخی اقدار کے نام پر حکام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس تبدیلی کو روک دیں یا کم سے کم کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے پہلے عوام کو اپنے اعتماد میں لے لیں۔

کراچی اور لاہور میں ۲۰ سالہ ادب کے جائزے

کراچی۔ پاکستان کے بیسویں یوم آزادی پر گلڈ کے ذیلی ادارہ رائٹرز کلب نے مرکزی گلڈ کے اشتراک سے "بیس سالہ ادب کا جائزہ" کے عنوان سے ایک پروگرام پیش کیا۔ جائزہ پیش کرنیوالوں میں سحر انصاری، آنسہ زاہدہ تقی، آفاق ہاشمی، شبیہ فاروقی وغیرہ شامل تھے۔ اکثر جائزے نہایت تشنہ، ناقص اور مایوس کن تھے جبکہ ہر جائزہ نگار نے کہا کہ یہ جائزے سکریٹری رائٹرز کلب کی فرمائش پر نہایت عجلت میں لکھے گئے ہیں۔

سحر انصاری، آنسہ زاہدہ تقی، شبیہ فاروقی کے جائزے اگرچہ مختصر تھے لیکن محنت سے لکھے گئے تھے جبکہ دیگر جائزوں سے جانبداری، غیر ذمہ داری، احباب نوازی اور تعصب کی بو آتی تھی۔

رائٹرز گلڈ کے معتبر اور ذمہ دارانہ پلیٹ فارم سے اس نوع کے غیر ذمہ دارانہ پروگراموں کی پیشکش گلڈ کے ارباب حل و عقد کو دعوت فکر دیتی ہے۔

توقع ہے کہ آئندہ اس نوع کے پروگرام پوری تیاری کے بعد پیش کئے جائیں گے۔ تاکہ گلڈ کی نیک نامی اور شہرت کو نقصان نہ پہنچے۔ بیس سالہ ادب کا جائزہ نہایت سنجیدگی، واضح شعور اور علم و آگہی کا تقاضہ کرتا ہے اور ایسے جائزوں کے لئے صرف مستند نقادوں ہی کو دعوت دینی چاہئے۔

لاہور میں بھی بیسویں سالگرہ پر بیس سالہ ادب کا جائزہ پیش کیا گیا۔ جو اطلاعات کے بموجب گروہ بندی، احباب نوازی، جانبداری سے مملو تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ لاہور کے جائزے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور فیض تک کے نام نہیں لئے گئے اور ایک صاحب نے تو پریم چند کو بھی ہندوانہ ذہنیت کا حامل قرار دیکر ادبی شعور کا مذاق اڑایا اور انسانی قدروں کی بے حرمتی کی۔ جو بے حد افسوسناک ہے۔

بیسویں یوم آزادی پر صدارتی انعامات و اعزازات

راولپنڈی۔ پاکستان کی بیسویں یوم آزادی پر صدر ایوب نے جن لوگوں کو فنون لطیفہ کے مختلف میدانوں میں ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں صدارتی انعامات و اعزازات سے نوازا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں :-

۱۔ جناب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (ستارۂ امتیاز)
۲۔ جناب ڈاکٹر عاشق حسین۔ بٹالوی (اردو ادب) صدارتی تمغہ اور دس ہزار روپیہ
۳۔ جناب قاضی بندے علی میاں (بنگالی ادب) "
۴۔ جناب رفیع پیرزادہ (ڈرامہ) "
۵۔ استاد انیس الدین (موسیقی) "

ادارہ افکار انعام یافتہ حضرات کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

صدر ایوب کی پہلی تصنیف "فرینڈز ناٹ ماسٹرس" کی بین الاقوامی مقبولیت

گلڈ اور نیشنل بک سینٹر کی جانب سے مبارکباد

صدر ایوب کے جوابی تار

صدر ایوب کی پہلی تصنیف "فرینڈز ناٹ ماسٹرس" نے شائع ہوتے ہی بین الاقوامی شہرت و
ولیت کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر جمیل الدین عالی سیکرٹری جنرل پاکستان رائٹرز
اور ابن انشا ڈائرکٹر نیشنل بک سینٹر نے صدر ایوب کو ادیبوں کی برادری میں شمولیت اور کتاب کے
ساز موضوع و مواد کو نہایت بے باکی اور ادبی دیانت کے ساتھ پیش کرنے پر مبارکباد کے تار بھیجے تھے جن کے
ب میں صدر ایوب نے ان دونوں حضرات کا دلی تشکریہ ادا کیا ہے۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات پر مسرت کا
ار کیا ہے کہ ملکی محنت کا دش کو ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ واضح رہے کہ اس کتاب کے دنیا کی کئی زبانوں
ں ترجمے کئے جا رہے ہیں۔

شام ہمدرد

کراچی۔ گذشتہ ماہ "شام ہمدرد" کی تقریب میں
کے بدھی نے "پاکستان کا تاریخی کردار" کے موضوع
ر کرتے ہوئے کہا کہ۔ پاکستان پورے خلوص اور تندہی
اتھ اخلاقی، فکری، اور روحانی بنیادوں پہ اپنی
ت اور ثقافتی چارہ کے مسلم نظریہ کو فروغ دینے
وشاں رہا ہے۔

شام ہمدرد کی یہ تقاریب بلا شبہ کراچی میں ایک
ایت کی بانی ہیں۔ جو ہر ماہ پابندی سے منعقد
یں اور علم و فن، تاریخ و ادب اور تہذیب
ن کی گراں قدر خدمات سر انجام دے رہی ہیں۔
کے لئے حکیم محمد سعید دہلوی متولی ہمدرد وقف
بارکباد ہیں۔

ہمدرد کی شام میں کراچی کے علاوہ لاہور
ولپنڈی میں بھی روایتی اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی
یں۔

فیض کی دست صبا سندھی میں

حیدرآباد۔ سندھی کے مشہور شاعر سید
محمد عاقل حسن، لینن انعام یافتہ پاکستان کے
مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض کے شعری مجموعہ
"دست صبا" کا سندھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں
مقامی مزدور رہنما جناب رسول بخش تالپور نے
کہا ہے کہ یہ ترجمہ سندھی ادب میں گراں قدر
اضافے کا باعث ہوگا۔

لاہور۔ گورنر موسیٰ نے مشہور شاعر مشیر کاظمی
کو ان کی نظم "قائد ثانی" کی مقبولیت کے پیش نظر
ایک ہزار روپے کا انعام دیا ہے۔
یہ نظم انھوں نے ایک استقبالیہ میں سنائی
تھی جو لاہور مسلم لیگ نے صدر محمد ایوب خان
کے اعزاز میں دیا تھا۔

قومی سالمیت، استحکام اور اتحاد کیلئے اردو کو رائج کیا جائے

دنیا کے ہر بڑے آدمی کی طرح بابائے اردو کا بھی ایک خاص مشن تھا

لاہور میں اس سال بھی بابائے اردو کی یاد نہیں منائی گئی

کراچی۔ اردو کالج میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی چھٹی برسی کے سلسلہ میں ایک جلسہ عام انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین کی صدارت میں ہوا جس میں بابائے اردو کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ مقررین نے تحریک پاکستان اور اردو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی تحریک میں اردو زبان نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہمدرد دوا خانہ کے چیرمین حکیم محمد سعید نے کہا کہ بابائے اردو کہا کرتے تھے کہ میں اردو کو قومی و سرکاری زبان بنائے بغیر نہیں مرنا چاہتا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بابائے اردو کو ایک عظیم شخصیت قرار دیا

ان کے علاوہ مقررین میں جناب سید ہاشم رضا اور اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بابائے اردو کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر زور دیا۔

آخر میں انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین نے کہا کہ بابائے اردو کے خواب اقامتی کالج کی تعمیر ابھی باقی ہے جس کی امداد ہر محب وطن کا قومی فریضہ ہے۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ لاہور میں اس سال بھی بابائے اردو کا دن خاموشی سے گزر گیا اور کسی سرکاری نیم سرکاری یا عوامی ادبی تنظیم نے مولوی عبدالحق کا دن منانا ضروری نہیں سمجھا

سنسکرت کی ترقی کیلئے سہولتیں

ڈھاکہ۔ ڈھاکہ میں عشرہ پاکستان سنسکرت اور پالی تعلیم بورڈ کی پہلی سالانہ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے عبدالمنعم خان گورنر مشرقی پاکستان نے

نے کہا کہ پاکستان مذہبی رواداری اور عالمی بھائی چارے پر یقین رکھتا ہے اور سنسکرت اور پالی زبان کو ترقی کرنے کے ہر ممکن مواقع فراہم کئے جائیں گے

دانشور اپنی تخلیقات میں اسلامی

اقتدار کو فروغ دیں۔ (قدرت اللہ شہاب)

لاہور۔ مرکزی وزارت تعلیم کے سکریٹری مسٹر قدرت اللہ شہاب نے پاکستان کے مصنفوں، شاعروں اور دانشوروں پر زور دیا ہے کہ وہ مذہب کو اپنی تخلیقات میں نمایاں مقام دیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ اپنی تخلیقات میں ایسی کوئی بات نہ لکھیں جو اسلام کی روح کے منافی ہو۔ وہ آج نئی تشکیل شدہ تنظیم "ایوان افکار" کے افتتاحی اجلاس سے "دانشوروں کے خدوخال" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے انہوں نے مزید کہا کہ ڈرامے شعری تخلیق، افسانے اور ناول یا کسی تحقیقی مقالے میں صرف اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے باقاعدہ اور شعوری کوششوں کو دخل ہونا چاہیئے۔

نایاب کتابیں

کراچی۔ نیشنل آرکائیوز لائبریری نے کئی نادر و نایاب کتابیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق حاصل کر لی ہیں۔

دانشور قومی زبان اور ثقافت کے خلاف ہر تحریک کا مقابلہ کریں

اہل قلم منفی رجحانات کے خلاف کوششوں کو بروئے کار لائیں

بنگلہ اکیڈمی کے جلسہ اسناد سے گورنر منعم خاں کا خطاب

ڈھاکہ۔ بنگلہ اکیڈیمی کے سالانہ جلسہ اسناد سے خطاب کرتے ہوئے گورنر مشرقی پاکستان عبدالمنعم خاں نے فرمایا کہ مفکر اور ادیب آنے والی نسلوں کے قومی شعور کا سامان فراہم کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ان مقاصد کے لئے جامع اور واضح اسکیم تیار کرنی چاہیئے تاکہ قومی امنگیں روایات اور ثقافتی ورثے کو نوجوان نسل کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ گورنر نے دانشوروں پر زور دیا کہ وہ قومی تاریخ پر مفید کتابیں لکھیں۔ اور قومی زبانوں کے احیا اور ترقی کے لئے کام کریں تحریک پاکستان کے لئے بنگلہ کے آتش بیاں شعرا کے کارناموں کو سراہا گورنر نے اکیڈمی کو تین ہزار روپے کا عطیہ دیا اور ۱۷ طالب علموں کو ڈپلوما کورس مکمل کرنے پر اسناد عطا کیں۔ اور انجنئرنگ یونیورسٹی ڈھاکہ میں زیر تعلیم مغربی پاکستان کے طالب علم مسٹر خورشید احمد کو بنگال کورس کامیابی سے مکمل کرنے پر خصوصی طلائی تمغہ عطا کیا۔ تجرید البخاری، قرآن شریف (پارہ عم) کے بنگلہ ترجمہ، ندائے اسلام کا انگریزی ترجمہ اور کلام اقبال بنگلہ ترجمہ کرنے والے بنگالی ادیبوں کو بھی ان کی خدمات کے عوض طلائی تمغے دینے کا اعلان کیا۔ اس کنونشن میں صوبے کے ممتاز اہل قلم، پروفیسروں، دانشوروں شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔

کشن چند اخلاص پر پی۔ ایچ۔ ڈی

پٹنہ۔ پٹنہ یونیورسٹی نے زبیر احمد قمر لکچرار شعبہ اردو۔ فارسی، بہار یونیورسٹی کو ان کے تحقیقی مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ جناب زبیر احمد قمر کی تحقیقی مقالے کا موضوع تھا۔ "کشن چند اخلاص اور اس کا تذکرۂ بہار" یہ تذکرہ اپنی خصوصیات کی بنا پر انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اب تک اس کے کئی نسخے لندن جرمنی اور ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں منتشر حالت میں تھے جو اب بڑی کد و کاوش سے یکجا کئے گئے ہیں۔

آرٹ گیلری کیلئے اقبال کی قدآدم تصویر

کراچی۔ پروفیسر حسن عسکری کی تیار کردہ علامہ اقبال کی قدآدم تصویر میونسپل کارپوریشن نے ۵ ہزار روپے میں آرٹ گیلری کے لئے خرید کی ہے۔ عسکری صاحب نے اس تصویر کو بنانے سے پہلے تین سو مختلف تصویروں کا مطالعہ کیا تھا۔

نخشب جارچوی کی رحلت

کراچی۔ برصغیر کے ادبی اور فلمی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مشہور فلمساز و شاعر نخشب جارچوی کا ۲۴ ... کو لندن میں انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف سینتالیس سال تھی۔ ادارہ افکار متعلقین کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

مغربی قوموں نے مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں پر جب یلغار کی تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ اس قوم سے تیر و تفنگ کا چھین لینا، یا اسے معاشی طور پر برباد کر دینا اتنا مفید نہیں جتنا کہ اسے متاعِ ایمان سے محروم کر دینا ضروری ہے چنانچہ اس محاذ پر پیش قدمی کرنے کے لئے مستشرقین کی ایک فوج آگے بڑھی اور انہوں نے حضور سرورِ کائنات اور قرآن مجید پر مسلسل اور پیہم حملے شروع کئے بہت سے نامور اہلِ علم اسلام کے دفاع کے لئے آگے بڑھے ان میں سر سید، امیر علی، مولوی چراغ علی مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ شبلی اور پروفیسر سید نواب علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف پروفیسر نواب علی وہ صاحب علم ہستی ہیں جو علی گڑھ کی فضا میں پلنے کی وجہ سے سیرت نگاری میں نئے دور کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ انہیں مستشرقین کی ریشہ دوانیوں کا اچھی طرح علم تھا۔ علم تقابلِ ادیان ان کا خاص موضوع تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی علوم میں بھی کسی حد تک دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے مستشرقین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر سیرت کے اصل ماخذ کی بنیاد پر یہ کتاب تحریر فرمائی علامہ شبلی کی سیرت النبی اور پروفیسر نواب علی کی سیرت رسول اللہ دونوں ایک ہی جذبہ کے تحت اور ایک ہی محرک کے مطابق مرتب کی گئی ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے سیرت رسول کو اس انداز سے لکھا ہے کہ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہوتا ہے۔ پروفیسر نواب علی نے ان غلط فہمیوں کے براہ راست جوابات دیئے ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہر طبقے میں مقبول ہوئی۔ مگر کچھ عرصے سے یہ مفید تصنیف نایاب تھی۔ مکتبہ افکار نے اسے دوبارہ طبع کیا ہے۔

(ترجمان القرآن)

مدیر و ناشر:- صہبا لکھنوی　طابع:- مشہور آفسٹ پریس کراچی　دفتر: رابسن روڈ کراچی

خوش قسمتی سے بریک بروقت لگے،
ورنہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے !
تیز رفتار بس اور اسے اوورٹیک کرتی ہوئی ٹرک
کی زد سے ذرا کم ہی بچا کرتے ہیں۔ چند لمحوں کی
دیر اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دس بیس سال
پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں۔ سڑک پر چوکنا نہ
رہنا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے!

- جہاں کہیں ممکن ہو، فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے۔
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں۔
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھ لیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے۔
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے۔
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے۔
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں، انتہائی محتاط رہئے۔

united

اس بار

- اردو ادب کا جدید دور ——— سبط حسن
- ڈپٹی نذیر احمد ——— ایک مطالعہ ——— انجم اعظمی
- بادشاہ اور پاپائے روم ——— آغا افتخار حسین
- امریکہ سے ایک خط، ایک نظم ——— سید ابوالخیر کشفی
- غالب اور آزادی ——— ایک مذاکرہ
- (۵) کہانیاں ——— (۱۴) منظومات
- (۴) دیس دیس کی نظمیں ——— (۲) نئی کتابیں

اور مستقل عنوانات

آپ زندگی کا بیمہ اور کمپنیوں سے کرا سکتے ہیں

یا الاکو سے،

اس میں ذرا فرق ہے!

ذرا غور فرمائیے، الاکو کی پالیسیاں پچہتر سالہ تجربات کی حامل ہیں
ذرا دوبارہ غور فرمائیے، الاکو نے مستعدی سے اور بروقت کلیموں
میں ۳,۴۰,۰۰,۰۰۰ روپیہ سے زائد رقم ادا کر کے مثال قائم کی ہے۔
اور ذرا مزید غور فرمائیے، الاکو کے پریمیم کم، بونس زیادہ،
۲/-د روپیہ فی ہزار تک، پیڈ اپ پالیسیوں پر بھی بونس۔
(الاکو پاکستان کی واحد کمپنی ہے جو پیڈ اپ پالیسیوں پر بھی بونس ادا کرتی ہے،
اور ایسی خدمت جو پالیسی خریدنے کے بعد ختم نہیں ہوتی
بلکہ مستقل جاری رہتی ہے

آپ یقیناً الاکو ہی سے بیمہ کرانا پسند کریں گے

ا	ل	ا	ک	و

آئیڈیل لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

آپ کے مستقبل کے ساتھی

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء

ٹیلی فون : ۲۳۹۹۳

سال: ۲۳ ○ شمارہ: ۱۹۶

مدیر
صہبا لکھنوی

زرسالانہ	بیرونی ملکوں سے	قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۱۲ - پرنسیز ایونیو - لندن - این ڈبلیو نمبر ۹

۰ افکار غالب نمبر ۰ افکار جوش نمبر (دو ایڈیشن) ۰ افکار فیض نمبر ۰

افکار حفیظ نمبر ۰ افکار منٹو نمبر ۰ افکار دس سالہ نمبر ۰ افکار ریڈیو تخلیق نمبر ۰ افکار رائٹرس کنونشن نمبر

۲۳ ویں سالگرہ پر

سالنامہ افکار

روایتی حسن و معیار کے ساتھ

جنوری ۱۹۶۸ء میں

شائع ہو رہا ہے

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیے

نئے سالانہ ممبر

۱۲ روپے منی آرڈر سے بھیج کر یہ عظیم

پیش کش مفت حاصل کر سکتے ہیں

صفحات تقریباً ۴۰۰ ۰ متعدد تصاویر ۰ قیمت: چار روپے

مکتبہ افکار

رابسن روڈ۔ کراچی

افکار سالگرہ نمبر ۰ افکار خاص نمبر ۰ افکار افسانہ نمبر ۰ افکار مجاز نمبر (دوسرا ایڈیشن)

۰ افکار لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر ۰ افکار بھوپال اردو کانفرنس نمبر ۰

ترتیب

دسمبر ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

شذرات

دارالمطالعوں کی ضرورت

گذشتہ دنوں راولپنڈی اور ڈھاکہ میں دارالمطالعوں اور لائبریریوں کے قیام اور تعمیر و ترقی کے سلسلے میں مذاکرے منعقد ہوئے تھے جن میں تمام شرکاء نے متفقہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ابھی پاکستان ایسے ترقی پذیر ملک میں لائبریریوں اور دارالمطالعوں کی بہت کمی ہے۔ بڑے اور چھوٹے شہروں کے علاوہ دیہی علاقوں میں بھی ان کی شدید ضرورت ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور عوامی لائبریریوں کو بھی وسعت دے کر منظم کرنا ہے تاکہ علم و تعلیم کی فضا پیدا کی جاسکے، اور عام آدمی بھی ان سے مستفید ہو سکے۔

لائبریریوں اور دارالمطالعوں کی ترویج و ترقی کے جذبے سے کئی سال ہوئے، ایک انجمن بنی تھی، جس کے صدر ملک کے مشہور دانشور حکیم محمد سعید دہلوی ہیں۔ اس انجمن نے کئی دُور رَس فیصلے کئے ہیں۔ لائبریری کورس کی تربیت کا انتظام کیا ہے، باہمی ربط و تعلق کی فضا تیار کی ہے اور کوشش کی ہے کہ پاکستان اس ضمن میں جلد سے جلد خود کفیل ہو سکے اور شہروں دیہاتوں میں لائبریریوں اور دارالمطالعوں کا جال بچھا دیا جائے تاکہ صاحبانِ ذوق، نئی نسل اور اہلِ علم اُن سے بیش از بیش استفادہ کر سکیں۔ اس انجمن کی ہر جہتی مساعی قابلِ تحسین ہیں۔ ہر کام حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوا کرتا — ترقی پذیر معاشرہ میں اہلِ ثروت اور صاحبانِ اقتدار پر بھی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر یہ حضرات عملاً دلچسپی لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک بھر میں لائبریریوں اور دارالمطالعوں کی وسعت اور ترقی ممکن نہ ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت کے تعاون اور اہلِ ثروت کی امداد سے پاکستان میں ہر جگہ اچھی لائبریریاں اور دارالمطالعے جلد قائم ہو جائیں گے اور ملک میں اچھے ادب اور تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا، جو ایک زندہ قوم اور مثالی معاشرہ کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور جس کے بغیر قومی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سالنامۂ افکار

افکار کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہے جو نئے سال کا ایک یادگار تحفہ ہوگا — اور توقعات کے مطابق جنوری ۶۸ء میں شائع ہوگا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ سالنامہ بھی افکار کی دیرینہ خصوصیات کا حامل ہو۔ سالنامہ دیکھ کر آپ خوش ہوں گے۔ انشاءاللہ!

م۔ احمد

رفتارِ عمل

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

غیر ملکی زبان کے بجائے قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے

درسی کتب کی تصنیف و تالیف پر معقول معاوضے دیئے جائیں

ملک بھر کی یونیورسٹیوں کے دو سو اساتذہ کا اظہارِ خیال

لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات کے استاد محمد نواز چودھری نے مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں کے تقریباً دو سو منتخب اساتذہ کو جن میں سے نصف کے لگ بھگ غیر ملکی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہیں قومی زبانوں کے سلسلے میں ایک سوالنامہ مرتب کر کے روانہ کیا تھا جس کے جواب میں متفقہ طور پر اساتذہ نے اظہارِ خیال کیا کہ انگریزی کی جگہ بنگلہ اور اردو زبان میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

ان میں سے اکثر نے اس امر کی نشان دہی کی کہ غیر ملکی علوم اور تازہ ترین تحقیقات سے باخبر رہنے کے لئے ایک یا دو غیر ملکی زبانوں کا باقی رکھنا ضروری ہے۔

ان اساتذہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریزی میں سائنس کے موجودہ مواد کو قومی زبانوں میں منتقل کیا جائے اور اس کے لئے تجربہ کار اساتذہ کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

بہت سے اساتذہ نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک اردو اکیڈمی اور بیورو قائم کیا جائے، اور اساتذہ کے لئے ریفریشر کورس شروع کئے جائیں، اور اعلیٰ درسی کتب کی تصنیف و تالیف پر معقول معاوضے دیئے جائیں۔

کچھ اساتذہ نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ ایسے سکول کھولے جائیں جن میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو نیز کاروباری مراسلت بھی اردو میں ہونی چاہیئے۔ انہوں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ اس تبدیلی سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کو کسی صورت میں بھی نقصان نہیں پہنچے گا

اساتذہ کے ان خیالات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہوگا۔ لیکن ہماری دانست میں اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے نہ صرف ادب اور عمرانی علوم میں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں بھی ہم انتہائی تیزی سے ترقی کر سکتے ہیں ۔۔ چین اور جاپان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

زندہ قوموں کے افراد احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کے بجائے قومی اہمیت کے حامل امور کو جلد سے جلد پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی ہر ممکن سعی و جہد کرتے ہیں

مغربی پاکستان میں اردو اور مشرقی پاکستان میں بنگالی کو عدالتی زبان بنایا جائے

— چیف جسٹس کی تقریر

آدم جی، داؤد اور نیشنل بنک کے انعامات کی تقسیم

ڈھاکہ۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اے آر کارنیلیس نے زور دیا ہے کہ ملک کی ترقی اور عدلیہ کے ارتقاء کے لئے اجتماعی جد و جہد کی جائے۔ یہ بات آپ نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے تحت ادبی انعامات کی تقسیم کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی۔ اس تقریب میں آدم جی، داؤد اور نیشنل بینک کے ادبی انعامات تقسیم کئے گئے۔ مسٹر جسٹس کارنیلیس نے عدلیہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی فضا میں ہماری ہر سانس ایسے معاشرے میں ہونی چاہئے جس کی بنیاد حق و انصاف پر ہو، جو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ ہو۔ آپ نے قومی زبانوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی اور مغربی پاکستان میں اردو کو عدالتی زبان قرار دیا جائے۔ آخر میں آپ نے ۱۹۶۴، ۶۵ اور ۶۶ء کے آدم جی، داؤد اور نیشنل بینک کے اردو اور بنگلہ کے انعامات تقسیم فرمائے۔

"۶ ستمبر کا ادبی انعام" کا اعلان

کراچی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک اور ادبی انعام کا اعلان کیا ہے۔ یہ انعام "۶ ستمبر کا ادبی انعام" کہلائے گا اس کے لئے دس ہزار روپے مقرر کئے گئے ہیں، جو اردو اور بنگلہ تصنیفات پر مساوی طور سے تقسیم کئے جائیں گے۔ گلڈ کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ ۳۱ جنوری کو گلڈ کی سالگرہ کے موقع پر مقابلے کے انعقاد کا اعلان کیا جائے گا۔ اس مقابلے میں وہ کتابیں شامل کی جائیں گی جو پاکستانی جوانوں کے کارناموں اور ان کے حالات اور جنگ کے دیگر واقعات کے بارے میں تحقیق کے بعد لکھی گئی ہوں۔ اس مقابلے میں وہ کتابیں جو دسمبر ۶۵ء سے اس سال دسمبر تک کے درمیان شائع ہوئی ہیں شامل ہوں گی۔ اردو کے ججوں کی کمیٹی کے چیرمین احمد ندیم قاسمی اور بنگلہ کے ججوں کی کمیٹی کے چیرمین ٹی کے شماش ملحق ہوں گے۔

عبدالعزیز فطرت کی بیوہ کے لئے تین سو روپے وظیفہ

راولپنڈی۔ اردو کے مشہور شاعر عبدالعزیز فطرت کی بیوہ کے لئے صدر ایوب نے تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا ہے۔ بزمِ یادگارِ فطرت نے صدر ایوب کے اس ہمدردانہ اقدام کو سراہا ہے۔

انقرہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو

پشاور۔ اطلاع ملی ہے کہ انقرہ یونیورسٹی عنقریب شعبۂ اردو قائم کر رہی ہے۔ اس شعبہ کے صدر پروفیسر طاہر فاروقی ہوں گے۔ جو آج کل پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔

محققین کے لئے قومی اعزازات

راولپنڈی۔ گورنر کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ قومی اعزازات دیتے وقت تعلیمی اور سائنسی تحقیق کے شعبوں میں مصروف اسکالروں کو ترجیح دی جائے۔ صدر ایوب نے کانفرنس کو مطلع کیا کہ وہ حال ہی میں جب کراچی یونیورسٹی گئے تھے تو وہاں ان ماہرین تعلیم اور سائنس دانوں سے بہت متاثر ہوئے جو اہم قومی شعبوں میں تحقیق کا کام انجام دے رہے ہیں۔ صدر نے وہاں یہ محسوس کیا کہ ایسے محققین کو اعزازات دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

صدر کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوگیا

کراچی۔ صدر ایوب کی خود نوشت سوانح عمری "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کا اردو ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" شائع ہوگیا۔ اور اطلاعات کے بموجب پاکستان میں ہر جگہ مقبول ہو رہا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کو اس سلسلے میں آرڈر موصول ہو رہے ہیں۔

چغتائی کا ایک اور شاہکار

علامہ اقبال کا مصور ایڈیشن

اپریل ۶۸ء تک شائع ہو جائے گا

لاہور۔ علمی و ادبی دنیا میں یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنی جائے گی کہ ایشیا کے عظیم مصور عبدالرحمن چغتائی کا تازہ ترین شاہکار "علامہ اقبال کا مصور ایڈیشن" تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے اور اطلاعات کے بموجب اپریل ۶۸ء تک شائع ہو جائے گا۔ چغتائی کئی سال سے علامہ اقبال کے مصور ایڈیشن پر شبانہ روز کام کر رہے تھے۔ توقع ہے کہ نقشِ چغتائی کی طرح یہ ایڈیشن بھی دنیائے ادب میں قبولِ عام حاصل کرے گا۔

غالب کی صد سالہ برسی

۲۵ لاکھ روپے کے خرچ کا تخمینہ

نئی دہلی۔ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان سے متعلق کتابوں اور تنقیدی تخلیقات وغیرہ کو شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ مرزا غالب کی صد سالہ برسی منانے والی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ مرزا کے نام پر ایک عمارت تعمیر کی جائے گی۔ ان منصوبوں پر ۲۵ لاکھ روپے خرچ ہوں۔ اس کمیٹی کی صدر مسز اندرا گاندھی اور سرپرست ڈاکٹر ذاکر حسین ہوں گے۔

اُمّ کلثوم کے لئے ستارۂ امتیاز کا اعزاز

راولپنڈی - صدر ایوب نے مشہورِ عالم مصری ممتاز گلوکارہ مادام اُمّ کلثوم کو "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز عطا کیا ہے۔ مادام اُمّ کلثوم نے اسی سال علامہ اقبال کی برسی کے موقع پر علامہ کی مشہور نظم "شکوہ اور جوابِ شکوہ" کا عربی ترجمہ اپنی آواز میں پیش کیا تھا۔

جمیل جالبی کی کتاب "تنقید اور تجربہ" شائع ہو گئی

کراچی - پاکستان کے ممتاز ادیب جمیل جالبی کے تنقیدی و ادبی مضامین کا مجموعہ "تنقید اور تجربہ" شائع ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف ادبی موضوعات پر ۲۴ مضامین شامل ہیں، اور اسے مشتاق بک ڈپو کراچی نے شائع کیا ہے۔

فراق گورکھپوری کو سوویت دیس نہرو انعام

نئی دہلی - سوویت دیس نہرو ایوارڈ کمیٹی نے امن اور ہند-سوویت دوستی کے سلسلے میں نمایاں ادبی خدمات سرانجام دینے پر مختلف زبانوں کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو انعام دیا ہے جن میں اردو کے ممتاز و مشہور شاعر فراق گورکھپوری بھی شامل ہیں۔

عربی میں ڈاکٹریٹ کی پہلی ڈگری

کراچی - جامعہ کراچی سے عربی میں پی ایچ ڈی کی پہلی ڈگری ایک ترک طالب علم زکریا کتابچی نے حاصل کی ہے۔ زکریا کتابچی نے تین سال یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف کی نگرانی میں کام کیا اور "عباسی معاشرہ اور حکومت میں ترکوں کا کردار" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ عربی میں لکھا گیا ہے۔ اور عربی ادب اور اسلامی تاریخ کے ماہرین نے اسے سراہا ہے۔

اردو میں ماؤزے تنگ کے افکار و خیالات

کراچی - گذشتہ دنوں ایک مقامی ہوٹل میں عوامی اشاعت گھر کراچی نے پاک چین دوستی کی انجمن کے تعاون سے ایک نمائندہ تقریب منعقد کی جس کی صدارت حکیم محمد سعید دہلوی نے فرمائی۔ اس تقریب میں ماؤزے تنگ کے افکار و خیالات پر مشتمل کتابچے عوامی اشاعت گھر کراچی کی جانب سے صدر جلسہ کو پیش کئے گئے۔ تقریب کے دوران ان کتابچوں کے ناشر اور مترجم زین الدین خاں، عوامی جمہوریہ چین کے قونصلر اور حکیم محمد سعید دہلوی نے تقریریں فرمائیں اور پاک چین دوستی پر اظہار خیال فرمایا۔ یہ کتابچے چین کے عوامی رہنما ماؤ کے اعلیٰ ادبی اور فکری نظریات کے حامل ہیں۔ جنہیں زین الدین خاں نے کمال احتیاط، خوبصورت گیٹ اپ اور دلکش اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مختصر مختصر

○ حیدرآباد - ڈاکٹر عتیق الرحمان صدر شعبۂ صحافت ڈھاکہ یونیورسٹی سندھ کے مشہور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی پر تحقیق کر رہے ہیں۔

○ پاکستان کے شاعر اور ناول نویس ذوالفقار غوث کو برطانیہ کی آرٹس کونسل نے بارہ سو اسٹرلنگ کا وظیفہ دیا ہے۔ آرٹس کونسل کے ایک نمائندے نے کہا کہ شاعری کے وظائف کا مقصد فن کار کو فرصت و آسودگی کے لمحات مہیا کرنا ہے۔ بہت سے مصنفین جا اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں غیر ادبی ملازمتیں کرکے اپنی روزی کماتے ہیں، اس لئے ہم مقدور بھر بہترین مصنفوں اور شاعروں کو سکون سے تخلیقی کام کرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔

○ دہلی - جمہوریہ بھارت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے 'آزادئ ہند' کی بیسویں سالگرہ پر بہار یونیورسٹی کے صدر شعبۂ فارسی عطا کاکوی کو سرٹیفکیٹ 'آف آنر' دیا ہے۔

○ پشاور - وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی چودھری محمد علی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ کیونکہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا زیادہ آسان ہے اور اس سلسلے میں جتنے تجربات کئے گئے ہیں ان میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

○ معلوم - پتہ چلا ہے کہ یہاں پاکستانی لوک گیتوں پر ایک کتاب انگریزی اور پشتو میں شائع کی جا رہی ہے۔

○ مشہور شاعر اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر مصطفیٰ زیدی کے مجموعۂ کلام "قبائے ساز" کا لاہور کے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ فیض احمد فیض نے جلسے کی صدارت کی۔ شاعر کی شخصیت و فن پر مقالے پڑھے گئے اور مہدی حسن، فریدہ خانم اور نسیم بیگم نے غزلیں گا کر سنائیں۔

○ راولپنڈی - اطلاعات و نشریات کے سکریٹری جناب الطاف گوہر نے آج یہاں سوشل سائنس ریسرچ پر لیکچروں کے سلسلے کا افتتاح کیا۔ بیورو آف نیشنل ریسرچ اینڈ ریفرنس نے ان لیکچروں کا انتظام کیا ہے۔

○ کراچی - اسلامیہ کالج کے بانی اے ایم قریشی نے ہر سال زرعی اصلاحات، خاندانی منصوبہ بندی اور خارجہ پالیسی پر بہترین کتاب لکھنے والوں کو پانچ پانچ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ بہترین کتب کا انتخاب مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری قدرت اللہ شہاب اور مشہور نقاد پروفیسر حسن عسکری صدر شعبۂ انگریزی، اسلامیہ کالج پر مشتمل منصفوں کا ایک بورڈ کیا کرے گا۔

○ نئی دہلی - بھارت کے ہندی و اردو ادیبوں نے ایک مشترکہ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک کے تمام تعلیمی اداروں میں اردو اور ہندی میں ساتھ ساتھ تعلیم دی جانی چاہئے۔ اس مشترکہ بیان پر بہت سے ادیبوں کے دستخط ہیں۔

گذشتہ دنوں کراچی میں روس کے عظیم اشتراکی انقلاب اکتوبر کی تقریبات کا ہفتہ منایا گیا۔ اس پروگرام میں خالق دینا ہال میں روسی کتابوں کی نمائش بھی کی گئی، اس نمائش کا افتتاح پاکستان میں سوویت یونین کے قونصل جنرل و۔ف۔ استوفالین نے کیا۔ نمائش میں اردو، انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں ترجمہ شدہ سوویت سائنس دانوں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی کتب رکھی گئی تھیں۔

کولمبو۔ مدراس کی حکومت سیاری ڈراویڈ بینے کا ز کام دوسری بین الاقوامی تامل کانفرنس منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد تامل کو عالمی زبانوں میں نمایاں مقام دلانا ہے: جسے چار کروڑ سے زیادہ عوام بولتے ہیں۔ آئندہ جنوری میں ۲۰ ممالک کے دو سو سے زیادہ تامل عالم اس کانفرنس میں شرکت کریں گے۔

راولپنڈی۔ صادقین نے منگلا بجلی گھر پہ دنیا کی سب سے بڑی دیواری تصویر تیار کی ہے۔ لیکن وہ اپنی اس تخلیق سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ تصویر ۱۷۰ فٹ لمبی اور ۲۳ فٹ چوڑی ہے جس کا افتتاح صدر ایوب نے فرمایا۔ اس تصویر میں صادقین نے شیریں کے لئے نہر کھودنے کے سلسلے میں فرہاد کی کوشش اور علامہ اقبال کے خیال "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

لاہور۔ پتہ چلا ہے کہ ناگرک پرچارنی سبھا کے زیر اہتمام مرزا غالب، نظیر اکبرآبادی، داردو، سورداس، عبدالرحیم خانِ خاناں، ڈاکٹر رنگھے راگھوا وریالو گلابے رائے دھندی، للولال جی، اور پنڈت ستیہ نارائن دسکھری بولی، کی یاد میں سہ روزہ جشن منایا جائے گا۔

مجلس محبانِ اقبال کا افتتاح

کراچی۔ پچھلے دنوں جمہوریہ شام کے سفیر جناب فوزی صعوت نے مجلسِ محبانِ اقبال کا افتتاح فرماتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبالؒ نے عالمِ اسلام کو جگایا، حریت او آزادی کا سبق دیا۔ ان کی یہ عظیم خدمت تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

جلسہ کی صدارت علامہ اقبال کے بڑے صاحبزادے بیرسٹر آفتاب اقبال نے فرمائی۔ جناب اے ڈی اظہر نے علامہ اقبال پر ایک مقالہ پڑھا اور ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی۔ مجلسِ محبانِ اقبال کے جنرل سکریٹری سید مسعود احمد جمالی نے اپنے سپاسنامہ میں آفتاب اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

بیگم نذر سجاد حیدر یلدرم کی رحلت

کراچی۔ اطلاع ملی ہے کہ اردو کی مشہور ادیبہ بیگم نذر سجاد حیدر یلدرم کا یہاں ۷۳ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آپ عرصے سے بیمار تھیں، اور اپنی صاحبزادی قرۃ العین حیدر کے ساتھ بمبئی میں مقیم تھیں۔

ادارہ افکار پسماندگان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے، اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

انجم اعظمی

نوابِ محسن الملک

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بڑی مسجد سرسید ہال کی مغربی دیوار کے وسط میں واقع ہے اس کے بائیں جانب ہال کا مغربی پھاٹک ہے جس کے سامنے کرکٹ کا میدان اور اولڈ بوائز کی عمارت ہے مسجد کے دروازے مشرقی سرسید ہال اور مغربی سرسید ہال میں کھلتے ہیں۔ ان کے درمیان کی دیوار سے ایک عمارت سرسید ہال کو دو حصّوں میں منقطع کرتی دوسرے سرے تک چلی گئی ہے یونیورسٹی کا شعبۂ قانون، شعبۂ تاریخ وسیاسیات مشہور اسٹریچی ہال اور لٹن لائبریری اسی عمارت میں قائم ہیں مسجد کے اندر مشرقی سرسید ہال کے دروازے سے اگر کوئی شخص داخل ہو تو اسے اپنے سامنے اسلاف میں سے چند بزرگوں کی قبریں نظر آئیں گی جن کا ایک ساتھ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں زندگی میں بھی گہری رفاقت اور مشترک نصب العین حاصل تھا۔ یہیں سرسید کے پہلو میں نواب محسن الملک محوِ خواب ہیں جو سرسید کے داہنے بازو کی حیثیت رکھتے تھے اور جن کا نام سرسید کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ان کا نام مہدی حسن تھا۔ ۱۸۳۷ء کا مبارک سال سرسید کے دو ساتھیوں مولانا الطاف حسین حالی اور نواب محسن الملک کا سال پیدائش ہے۔ مہدی حسن اٹاوہ کے ایک سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی میں اپنے عہد کے دوسرے اکابرین کی طرح انھیں بھی نوکری میں ادھر اُدھر بھٹکنا پڑا۔ پہلے دس روپیہ ماہوار پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک بھرتی ہوئے تھے ۱۸۵۷ء میں اہلمدپھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں ترقی کرکے تحصیلداری کے منصب پر فائز ہوگئے تھے ۱۸۶۳ء میں مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوگئے اس دوران انھوں نے اردو میں دو کتابیں لکھیں ایک کا تعلق قانون مال سے تھا اور دوسری کا قانون فوجداری سے ان دونوں کتابوں کی خاصی شہرت ہوئی۔ اس بہانے مہدی حسن کی ذہانت محنت اور سلیقے کی خبر بھی دور دور تک لوگوں کے پاس پہونچ گئی۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ تھا جب ریاست حیدرآباد دکن میں سر سالار جنگ بہترین ذہنوں کی گھات میں رہتے تھے انھوں نے مہدی حسن کو بھی حیدرآباد بلاکر مالیات کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔

حیدرآباد آکر اپنی کارگزاریوں کی بدولت وہ مہدی حسن سے نواب محسن الملک ہوگئے۔ حیدرآباد کی سرکار نے بہتوں کو خطاب سے نوازا لیکن آج ہم جب لوگوں کی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو قابلیت، سروس، علم پروری، سچی لگن اور عوام سے محبت کی بناء پر ان سب میں ریاست کے عطا کردہ خطاب کا محسن الملک سے بڑا حقدار نظر نہیں آتا۔

وہ ایک جوہر قابل تھے جسے پہچان کر سر سالار جنگ حیدر آباد لائے تھے۔ اور سر سید علی گڑھ کھنچ گئے تاکہ قومی کاموں کا کچھ بوجھ اپنے کاندھوں سے اتار کر اس شخص کے سپرد کر دیں جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے۔

ریاست حیدر آباد میں محسن الملک ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکریٹری اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل اور پولیٹیکل سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان عہدوں پر رہ کر انھوں نے ریاست کے لئے ایسے زبردست کام کئے کہ سرکار حیدر آباد سے محسن الدولہ نواب محسن الملک منیر جنگ کا خطاب پایا۔ خواص سے اپنی قابلیت اور محنت کی داد پائی اور عوام میں اپنی فیاضی اور رحمدلی کے سبب بے انتہا مقبول ہوئے۔ انھوں نے حکومت کے کاموں کی بجا آوری اور حیدر آباد کے لوگوں کی دادرسی کو ہمیشہ اپنی نجی ضروریات کے مقابلے میں اہمیت دی۔

ریاست حیدر آباد میں انھیں موقع ملا کہ وہ کھل کر اپنی اس محبت اور شعور کا اظہار کریں جو انھیں اردو زبان سے تھی۔ محسن الملک ہی کی مساعی سے اردو کو ریاست کی زبان قرار دیا گیا۔ اس معاملے میں بھی انھوں نے اردو زبان سے اپنی گہری محبت کے بجائے شعور کو رہنما بنایا تھا ظاہر ہے کہ قومی زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کے لئے اردو زبان کو بنیاد بنانا ضروری تھا اس مسئلے کی حیثیت کسی طرح بھی اور ذاتی نہیں تھی۔ فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک کے لوگ اپنی تہذیب سے سچا ربط رکھتے ہوئے مختلف علوم پر تیزی سے دسترس حاصل کریں۔ حیدر آباد کی اردو یونیورسٹی کا قیام بعد کو اسی مقصد کی ایک عملی شکل تھا۔

سر سید کی طرح وہ بھی انگریزی سے ناواقف تھے۔ لیکن انگریزی کتابوں کے تراجم پڑھ کر انگریز قوم کے خیالات اور کلچر کی ایسی معلومات رکھتے تھے جو (آجکل کے انگریزی دانوں کے بجائے) سر سید اور ان کے باشعور رفقا ہی کا حصہ تھیں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو ایک تہذیب کا نمائندہ سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے اور دوسروں سے اثر پذیر ہونے کے صحیح مفہوم سے آشنا تھے۔ آج انگلستان اور یورپ کا سفر عام بات ہے لیکن سفر کرنے والوں میں کم ہی ایسے ہوتے ہیں جو خالص طالب علم یا تہذیب کے مطالعہ کے لئے جاتے ہوں اس کے برخلاف سر سید کے زمانے میں انگلستان کا سفر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی لیکن جب سر سید کو سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا مقصود ہوا اور یہاں مواد کی فراہمی مشکل ہو گئی تو انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ اور اپنی دولت کا بڑا حصہ سفر اور کتابوں کی تلاش پر خرچ کر کے "خطبات احمدیہ" تصنیف کی جس میں ولیم میور کو مدلل اور منہ توڑ جوابات دیئے گئے۔ محسن الملک نے بھی سر سید کی طرح ایک مقصد کے تحت انگلستان جا کر گلیڈ اسٹون سے ملاقات کی۔ انگریزوں کی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کا مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں جو کچھ حاصل کیا اس کا اندازہ مولوی عبد الحق کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے۔

"وہ اگر ڈپلومیسی یا کسی اور سلطنت کے فارن منسٹر ہوتے تو یقیناً دنیا میں بڑا نام پیدا کرتے"

اس عبارت سے نواب محسن الملک کی اصل عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جتنے مشہور تھے اس سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ ریذیڈنٹ اور نواب اور راجہ کے درمیان جھگڑوں میں تدبر کے فقدان کے سبب اکثر ریاستوں نے بڑا نقصان اٹھایا لیکن محسن الملک کے زمانے میں ان کے تدبر کے سبب ریاست حیدر آباد ایسے جھگڑوں کے خراب اثرات سے محفوظ رہی۔

نواب محسن الملک سر سید کے بڑے عاشقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سر سید نے انگریزی طرز معاشرت کو اپنانے پر زور دیا تھا۔ محسن الملک نے اس معاملے میں خاصا غلو سے کام لیا۔ انگلستان سے فرنیچر منگایا تو اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک انگریز بھی انگلستان سے پکڑ لائے سوائے مشرقی کھانوں کے ان کی کوٹھی کا سارا رنگ ڈھنگ انگریزی تھا اس مبالغے کے باوجود اور ان کے تدبر اور فیاضی کی ذاتی خصوصیات سے ہٹ کر تہذیب الاخلاق کی فائلوں میں جب ان کے لکھے ہوئے مضامین کا مطالعہ کیجئے تو ہماری ملاقات اپنے

قوم کے ایک جلیل محسن سے ہوتی ہے جس نے اردو کے جدید دور کے آغاز میں سرسید کے ساتھ مل کر کام کیا علمی نثر کو فروغ دینے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ تحریک کے ذریعے اور اپنے اور سرسید کے تعلیمی نصب العین کو ابھرنے کا سالا کر اردو کی تعلیم اور اردو کلچر کو پروان چڑھایا تہذیب الاخلاق کے مضامین مذہبی موضوع پر ان کی مشہور کتاب "آیات بینات" کے علاوہ ہیں۔ جن میں محسن الملک نے سادہ اسلوب اور علمی انداز کو برتا ہے۔ سرسید تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں

"میرامن نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ ...... چند روز میں ہماری تحریریں میکالے اور ایڈیسن کی سی ہو جائیں گی" "مضمون نگاری دوسری چیز ہے" کہہ کر سرسید نے اپنے اور اپنے عہد کے اکابرین علم و ادب کے غالب رجحان۔ نئے علوم سے ان کی وابستگی اور قوم کی تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مجموعی سعی و عمل کا اظہار کیا تھا جو علمی مضامین کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔

تہذیب الاخلاق کی فائلوں میں بے شمار مضامین جو محسن الملک کے لکھے ہوئے موجود ہیں موضوعات کے اعتبار سے متنوع ہیں' سرسید کی طرح تحریر میں سادگی پائی جاتی ہے۔ اور منطقی استدلال کی اہمیت ہے۔ جا بجا وہ آتش بیانی بھی ہے جو ایک جادوگر مقرر کے قلم سے نکلی ہے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کی طرح وہ قوم کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور دوسروں پر شدت سے اثر انداز ہونا جانتے تھے۔ اسی لئے سرسید کے بعد انھیں سرسید کا قائم مقام بنایا گیا۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کو موثر بنانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں بے شمار تقریریں کی تھیں جن کے ذریعے مخالفین کے دل جیتے گئے تھے۔ ان تقریروں میں لہجے کے اتار چڑھاؤ کے حسن کے ساتھ ساتھ اپنے ملک سے خلوص اور زبان کی لطافت کی خوبی بھی ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک زمانے میں اکبرالہ آبادی کی طرح سرسید کے زبردست مخالفین میں تھے لیکن ایک بار ملنے کے بعد ان پر سرسید کا کچھ ایسا جادو چلا کہ پھر علی گڑھ تحریک میں مرتے دم تک سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ سرسید کے بعد اس تحریک میں دوسرا کوئی ایسا سرگرم کارکن نہ تھا انھیں سرسید کا خلوص بھا گیا تھا وہ اپنی تقریروں کے ذریعہ پوری قوت سے دوسروں پر اثر انداز ہوتے تھے ایسا معلوم ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ سرسید کے سچے پیروکار ہیں۔ لیکن پیروی کرنے والا اپنے خلوص کو جگا کر اس منزل میں پہونچ گیا ہے جہاں پیروی تمام تر روشنی بن جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سرسید کسی سے مل کر چند جملوں میں اپنی شخصیت کا مقناطیسی اثر ڈالتے تھے۔ اور یہی کام محسن الملک اپنی تقریروں سے لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا مقرر روز روز پیدا نہیں ہوا کرتا۔

ان کی تقریروں میں جو آگ تھی۔ وہی ذرا نرم اور قابل برداشت ہو کر ان کی تحریروں میں روشن ہے۔ مضامین میں ان کا ایک اپنا اسلوب ہے محمد حسین آزاد کی خیال آرائی اور سرسید کے استدلال کو ملا کر انھوں نے اپنا اسلوب دریافت کر لیا تھا جو مختلف النوع مضامین پر قلم اٹھاتے وقت ان کی شخصیت کا ترجمان بن جاتا تھا۔

آخر میں ان کی ذہانت، بصیرت، محنت اور عظمت کو دیکھتے ہوئے بہر حال یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کی جانب توجہ کرتے تو حالی اور شبلی کی طرح آج ان کا نام بھی بڑے ادیبوں میں ہوتا۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

بیگم فضل کاظمی

ادبی ابتدا کا گواہ۔ زمانہ

بہترین ادب کی گرفت زمان و مکاں دونوں پر ہوتی ہے جسے ادب العالیہ کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد ایسے جذبات واحساسات استوار کی جاتی ہے جو ہر ملک اور ہر زمانے کے انسان کے دل میں موجزن رہتے ہیں۔ جکی بناء پر وہ ادب بنی نوع انسان کا مشترک تہذیبی رمایہ بن جاتا ہے خواہ وہ کسی زمانے یا کسی زبان میں لکھا گیا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ادب اپنی منفرد خصوصیات کی بناء پر زندگی کے کس معیار اور رخ کا نام ہے۔ زندگی ایک مکمل اکائی ہے بن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان بنا ہے دل۔ دماغ اور جسم سے۔ اور جسم بنا ہے ہاتھ۔ پاؤں۔ ناک۔ کان لکھ اور دوسرے اعضائے جسمانی سے۔ جسم کے ہر عضو کا اپنا الگ فعل ہے۔ ناک کا کام کان سے اور آنکھ کا کام ہاتھ سے یا دل کا م دماغ سے نہیں لیا جا سکتا۔ اسی طرح علوم وفنون میں ادب۔ تاریخ۔ اور اقتصادیات سب زندگی کے مختلف شعبے ہیں معاشیات تعلق مالی حالت اور انسانی ضرورت سے ہے۔ تاریخ کا کام گزشتہ واقعات کو چھان بین کے بعد بلا کم وکاست بیان کرنا ہے۔ ں طرح ادب اور شاعری کا تعلق جذبات نگاری اور خیال آرائی سے ہے۔ ادب اسی وقت ادب کہلانے کا مستحق ہوگا جبکہ اس ہری حسن کے ساتھ ساتھ لطافت خیال اور پاکیزگی جذبات بھی پائی جائے۔ خیال آرائی اور سخن گستری اس کا خاصہ ہو۔ جسطرح تاریخ ۔ اگر تاریخی واقعات بیان کرنے کے بجائے خیال آرائی اور سخن گستری سے کام لیا جائے تو وہ تاریخ نہیں رہے گی۔ اسی طرح ادب ۔ اگر حسن۔ لطافت۔ پاکیزگی اور خیال آرائی نہیں ہے تو وہ ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر یا ادیب ۔ قلم میں وہ تاثیر بھی ہونا چاہیئے جو قاری پر اپنے ادب کا جادو جگا سکے۔ اگر وہ کوئی خوبصورت منظر پیش کر رہا ہے تو ہم اس ۔ لطف اندوز ہوں۔ اگر وہ انسانی دکھ سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اس غم میں برابر سے اس کے شریک ہو جائیں۔ اگر وہ حب الوطنی ا تعلیم دے رہا ہے تو ہمارے دل وطن کی محبت سے سرشار ہو جائیں۔ اگر شاعر یا ادیب کا قلم یہ تاثیر رکھتا ہے تو یہ اس کا کمال ہے۔ ر جو ادب یہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے وہ یقیناً اعلیٰ پایہ کا ہے۔

گویا خیال آرائی جذبات نگاری اور سخن گستری کا نام ادب ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ادب معیاری یر معیاری بھی ہو سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کونسی خوبیاں ہیں جن کی موجودگی ادب کو معیاری اور غیر موجودگی غیر معیاری بنادیتی ہ۔ سب سے پہلے ہمیں ادب کے محرکات کا جائزہ لینا ہے۔

انسان کی سرشت میں مختلف قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں جن سے وہ حسب ضرورت کام لیتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی خارجی شے کو دیکھتے ہیں تو تخیل بہ تقاضائے انبساط ایک خیالی ہیولیٰ تیار کر لیتا ہے۔ جسکی بنیاد اس خارجی شے پر ہوتی ہے۔ یہ ہیولیٰ اپنی بنیاد سے علیحدہ بھی ہوتا ہے اور ملا ہوا بھی۔ علیحدہ اس صورت میں کہ وہ خارجی شے نہیں ہے اور ملا ہوا اس صورت میں کہ خارجی شے کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ہیولیٰ گویا روح کا عکس ہے جو خارجی شے پر پڑتا ہے۔ اس لئے روح کی تمنائیں اور آرزوئیں اسی ہیولے میں نظر آتی ہیں۔ اور چونکہ اس ہیولے میں روح کی آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہوتی ہیں اس لئے اس کا تصور روح کو مسرور کرتا ہے۔ اسی ہیولے کا نام "حسن" ہے جب اس تخیلی ہیولے پر تخیل اور تفکر کا عمل ہوتا ہے تو اس میں معنویت اور قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ قدر کی حیثیت کل کی ہوتی ہے۔ جس سے روح اور خارجی اشیاء میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ روح کو بلندی کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک ایسے عالم کی خواہش ہوتی ہے جہاں پہونچکر انسان زندگی کے آلام و مصائب کو بھول جائے۔ جہاں زندگی کا راز منکشف ہو جائے۔ یہ خواہش شاعری۔ موسیقی یا مصوری سے پوری ہوتی ہے۔ روح خارجی مناظر کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اور ہم کبھی پھول کو ہنستے اور کبھی شبنم کو آنسو بہاتے محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً باغ کا پر فضا منظر نگاہوں کے سامنے ہے۔ رنگین اور خوبصورت پھول پر شبنم کے قطرے جھلملا رہے ہیں۔ تخیل ایک خیالی ہیولیٰ تیار کر لیتا ہے۔ اور ایک حسین چہرے پر پسینے کے قطرے جگمگاتے دیکھتا ہے۔ اور جب اس خیالی ہیولے پر تخیل اور تفکر کا عمل ہوتا ہے تو شاعر الفاظ کا سہارا لیکر کہہ اٹھتا ہے

چمن والوں نے شبنم کہہ کے پردہ رکھ لیا ورنہ
پسینہ آ گیا پھولوں کو فریاد عنادل سے

اور اس طرح روح نے ایک خارجی منظر کو اپنے رنگ میں رنگ کر بات کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ تخلیق اسوقت عمل میں آتی ہے جب صاحب فن جذبات کی گہرائی میں اتر جائے۔ گویا کسی تخلیق کو وجود میں لانے کے لئے جذبات کی شدت ضروری ہے۔ یہاں آ کر ایک شاعر اور غیر شاعر کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر کے جذبات و احساسات میں شدت ہوتی ہے۔ وہ حسن سے متاثر ہونا جانتا ہے۔ وہ حسن میں کشش محسوس کرتا ہے۔ اور پھر اپنے احساس اور خارجی مناظر میں یگانگت پیدا کر لیتا ہے۔ یہ یگانگت تخیل سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تخیل جتنا بلند ہوگا احساس میں اتنی ہی شدت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً جب کوئی خوبصورت منظر نگاہ کے سامنے آتا ہے تو ہر کوئی بقدر استطاعت اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ اور اسے حسین کہنے لگتا ہے۔ لیکن ایک شاعر اپنے تیز احساسات کی بنا پر تخیل اور تفکر سے کام لے کر مختلف معانی اور مطالب پیدا کرے گا۔ مثلاً ہم میں سے ہر ایک نے شبنم کے قطروں کو پھولوں کی پنکھڑیوں پر گرتے اور پھر سورج کی حدت سے اسے فنا ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن غالب اس منظر کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے منفرد احساس میں بسا لیتا ہے۔ جو اپنے اچھوتے پن کی وجہ سے عالمگیر حیثیت کا مالک بن جاتا ہے۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ؎

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یا میر جب ایک ناشگفتہ کلی کو پھول بنتے دیکھتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

گویا تخیل کی بلندی اور احساس کی شدت فن کا لازمی جزو ہے جس کے بغیر کوئی بھی فن بلندی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن تخیل کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر کے لئے فن شاعری سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ ایک اچھا شاعر حسن خیال کے لئے عمدہ الفاظ تلاش کرتا ہے اور دونوں کی باہمی ترکیب سے ایک پیکر حسن تیار کرتا ہے۔ لیکن ایک معمولی شاعر صرف محاورہ اور الفاظ کی بندش کو ہی منتہائے کمال سمجھتا ہے۔ بہترین صاحب فن وہ ہے جو معنی اور فن میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا حصہ صورت کا ہے اور کونسا معنی کا۔ معنی اور صورت کے امتزاج سے جو چیز تخلیق پاتی ہے وہ حسین کہلاتی ہے اور جو صاحب فن اپنے فن میں یہ کمال پیدا کر لیتا ہے وہ صاحب کمال ہوتا ہے۔ اگر کسی بڑے خیال کو خوبی کے ساتھ فن میں منتقل کیا گیا ہے تو وہ فن نہ صرف کامل ہوگا بلکہ عظیم بھی ہوگا۔ مثلاً مجاز کا یہ شعر دیکھئے ؎

زندگی کیا ہے — گناہ آدم
زندگی ہے — تو گنہگار ہوں میں

یہاں معنی اور صورت میں کمال ہم آہنگی ہے۔ معنی میں جتنی بلندی ہے اسی اعتبار سے فن میں بھی بلندی ہے جس نے اس شعر کو حسین بنا دیا ہے۔ ایک بڑا شاعر عوام الناس سے قریب ہوتے ہوئے بھی عوام الناس سے آگے ہوتا ہے اس لئے اکثر جب وہ اپنے تخیل اور فکر کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے اسوقت عوام الناس اس کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ اس بلندی پر وہ جو کچھ کہتا ہے اس سے اس کا مقصد اپنی روح کی ترجمانی کرنا ہوتا ہے۔ اور جبتک عوام الناس خود کو اس بلندی تک نہیں پہونچا دیتے اسکا کلام ان کے لئے ناقابل فہم رہتا ہے۔ یہی بات غالب جیسے عظیم شاعر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ انکو اپنے زمانہ میں مہمل گو تک سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہر اعتبار سے اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے۔ ان کے ہم عصر ان کی فکر کی بلندی کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے تو ان کی عظمت سے انکار کرتے تھے لیکن جب ماحول بدلا اور نئے علم کی روشنی نمودار ہوئی تو مرزا کی شخصیت اس روشنی میں نمایاں ہوگئی۔ اور آج مرزا کو سمجھنے کے بعد کون ہے جو ان کی عظمت سے انکار کر سکے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ مصرعہ دیکھئے۔

؎ نالہ میرا گردش سیارہ کی آواز ہے۔

آج جب کہ سائنس نے ترقی کی انتہائی منزلیں طے کر لی ہیں۔ انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے اور چاند پر پہونچنے کے لئے کوشاں ہے ستاروں کی گردش سے پیدا ہونے والی آواز بھی سنی جا چکی ہے۔ جس حقیقت کا انکشاف سائنس کی دنیا میں آج ہوا ہے غالب کے شاعرانہ وجدان نے اب سے مدتوں پہلے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ لیکن اسی شعر سے صحیح طور سے ہم آج زیادہ محظوظ ہوتے ہیں جبکہ اس کے مفہوم سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ یا پھر یہ شعر دیکھئے ؎

سوزش باطنی کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بظاہر اس کا مطلب مشکل ہے۔ لیکن جب عبدالرحمٰن بجنوری نے فرانسیسی فلسفی برگساں کی سند پیش کی تو معلوم ہوا کہ مرزا کا قول درست ہے۔ اور اس توضیح کے بعد شعر کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ گویا کسی بھی صاحب فن کے یہاں معنی اور صورت کے مناسب اتصال سے اس کا فن کمال کو پہونچتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شاعر الفاظ کی موزونیت اور شاعری کا کمال رکھتے ہوئے بھی بڑا شاعر نہیں کہلاتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ الفاظ اور بندش کی خامیوں کے باوجود شاعر عظمت کا مالک ہو۔ مثلاً مرزا غالب

کے یہاں علامات وغیرہ کا پورا اہتمام نہیں ہوتا اور اکثر نامانوس الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے مصحفی۔ جرأت اور ناسخ وغیرہ کا کلام خوبصورت الفاظ اور محاورات سے مرصع ہوتا ہے۔ اور ترکیب و بندش کی غلطیوں سے پاک ہوتا ہے اس کے باوجود وہ بڑے شاعر نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں معنی کی بلندی نہیں پائی جاتی۔ شاعرانہ عظمت کے لئے خیال و معنی کی بلندی ضروری ہے جو میر و غالب کے یہاں پوری طرح موجود ہے۔ معنی اور خیال کی اسی بلندی نے میر و غالب کو بڑا شاعر بنایا۔

خیال اور معنی کی بلندی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو صورت بنائی گئی ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہو جس میں انسان اپنی مکمل ہستی دیکھ لے۔ جب کوئی شاعر اپنے خاص ذاتی اثر کو ایک عالمگیر اثر کے تحت لاتا ہے تو وہ ایک بڑا فنکار کہلاتا ہے۔ مثلاً اقبال نے مندرجہ ذیل شعر میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی ایک ولادت مہر
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اس شعر میں جو بلندی پیدا ہوگئی ہے وہ قدر کی بلندی ہے۔ اور یہی حسن کی جان ہے۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر فرد اپنی ذات میں ایک معاشرہ ہوتا ہے جس طرح افراد سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے اسی طرح پورا معاشرہ فرد کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ ایک شاعر کے لئے معاشرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے غم میں شریک ہونا ناگزیر ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے انفرادی غم میں بھی سبکو شریک کر لیتا ہے۔ اور یہاں ایک شاعر انفرادی شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کا مالک بن جاتا ہے۔ ادب کا رشتہ جماعت، ماحول، کائنات۔ ماورائیت۔ غرض مختلف بہانوں سے انسان اور صرف انسان کے ساتھ ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات انسان کی نفسیات۔ انسان کے دکھ، انسان کی خوشی ان سب سے ادب کا رابطہ قائم رہتا ہے۔ اور ادب میں پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ ان سب کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ایک سچا فنکار سچائی کو جھوٹ کے خوبصورت اور رنگین غلاف میں لپیٹ کر نہیں پیش کرتا۔ بلکہ سچ کو اپنے احساس اور جذبے میں سمو کر پورے خلوص کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ اور یہی اخلاقیات کا سب سے بلند درجہ ہے۔ جہاں پہونچکر ادب فن کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی میں مختلف تجربات سے گزرتا ہے اور انھیں کی بنیاد پر مختلف رویہ اختیار کرتا ہے۔ جن کا اظہار ادب میں ہوتا ہے اور جتنی قوت کے ساتھ ادب میں اس کا اظہار ہوتا ہے ادب اتنا ہی بلند پایہ بن جاتا ہے۔ ایک حقیقی فنکار کو اپنی ذات میں پائے جانے والے تضاد کے اظہار سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ اسی بہانے اس کے معاشرے کا تضاد سامنے آجاتا ہے۔ اگر اظہار سے وہ خوف کھاتا ہے تو فن کی سطح پر قائم نہیں رہ سکتا شاعری پیغمبری کا ایک جزو ہے۔ شاعر اپنے خیالات کے اظہار میں بے باک اور پر خلوص ہوتا ہے۔ شاعر کی زندگی فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے فن میں تخیل کے ساتھ ساتھ ہمدردی۔ رواداری، محبت، وسیع النظری اور لوگوں کو سمجھنے اور ان کے غم میں شریک ہونے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ ایک شاعر نے بہت خوبصورت اور موزوں الفاظ میں شاعر کا سراپا کھینچا ہے جسکو پڑھکر شاعر کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے؎

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر

اک جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریئل کی پرواز پیمبر کی رسائی
قرآں کی عظمت دل فرعون کا انکار

جس طرح آرٹ میں عمدہ اخلاقی اقدار کا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح ناپسندیدہ اور مخرب اخلاق اقدار کا بھی اثر پڑتا ہے فن کی دنیا میں جب ہم کسی کو جرم کرتے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس جرم کے ہونے کا احساس ہوتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا اس طرح فن میں مثبت قدروں کے ساتھ منفی قدروں کا ذکر کرکے مثبت قدروں کو زیادہ نمایاں کر دیا جاتا ہے۔ انسانی صفات کی ترقی کے لئے جس طرح نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا لازمی ہے اسی طرح فن کی دنیا میں بھی ناپسندیدہ قدروں کا اظہار ضروری ہے۔ کیونکہ

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

چنانچہ . . . . میر انیس نے جہاں اپنے مرثیوں میں امام حسین علیہ السلام اور دوسرے شہدائے کربلا کی خوبیوں اور صفات پاک کا ذکر کیا ہے وہاں یزید اور اس کے ساتھیوں کا ذکر بھی پوری تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور یہاں ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ یزید کے ساتھیوں کی ناپسندیدہ حرکات کے اظہار کے ذریعہ شہدائے کربلا کی خوبیوں کو زیادہ نمایاں کیا جاسکے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ فن میں خیر اور حسن کے علاوہ کچھ ہوتا ہی نہیں۔ بلند اخلاقی قدروں کا اظہار کرنا فن کا شعار رہا ہے۔ فن نہ صرف اخلاقی قدروں کا اظہار کرتا ہے بلکہ زندگی کی اخلاقی سطح کو بلند بھی کر دیتا ہے۔ مثنوی زہر عشق کو یہاں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ جو اکثر حضرات کے نزدیک ایک خلاف تہذیب مثنوی ہے۔ دراصل شعر نام ہے کسی جذبہ کے اظہار کا۔ اور جذبے کا اظہار جتنے خلوص اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے گا فن اتنا ہی بلند پایہ اور اعلیٰ قدروں کا حامل ہوگا۔ شاعر صرف اتنا جانتا ہے کہ دنیائے بشریت میں بالعموم کس قسم کے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ شاعر ان ہی کا اظہار بلا کم و کاست کر دیتا ہے اس اعتبار سے مثنوی زہر عشق کی شاعری کے ممتاز نمونوں میں شمار کرنا پڑتا ہے۔ زہر عشق کی ہیروئن ماہ جبیں کا کردار جتنا حقیقی۔ معصوم۔ دلگداز اور باوقار ہے۔ ایسا کردار دنیائے ادب میں مشکل سے ہی ملیگا وہ ایک نوخیز حسین لڑکی ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ مگر محبت اس کی زندگی ہے۔ محبت کی شدت نے اس میں سپردگی کا انداز پیدا کر دیا ہے۔ محبت کی ناکامی زندگی کو اس کی نظر میں بے حقیقت بنا دیتی ہے۔ اور وہ تقاضائے بشریت سے مجبور ہو کر زہر کھا لیتی ہے۔ موت سر پر کھیل رہی ہے مگر ایسے لمحات میں بھی وہ اپنے محبوب کے لئے فکر مند ہے اور اسے ہر طرح اطمینان اور تسلی دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس منزل پر محبت کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ جذبہ محبت کا ہے اور جس تحریر میں جذبۂ محبت کا اظہار اور ذکر کیا جائے وہ تحریر بھی مقدس بن جاتی ہے۔ اسی تاثر سے مغلوب ہو کر مجنوں گورکھپوری یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔

"افسانے کی دنیا میں اب تک مجھے تین ممتاز ہستیاں نظر آئی ہیں جنکو اپنی افتادگی پر ناز رہا ہے۔
. . . . . اور جنکی پستی میں میں نے ایک جلال محسوس کیا ہے۔ ایک تو ٹالسٹائی کی

ہیروئن ایناکیریننیا۔ دوسری عورت شاہنامہ فردوسی کی تہمینہ اور تیسری عورت یہی ماہ جبین ہے جس کے حوصلہ عشق کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا "

ماہ جبین کا یہی حوصلہ عشق ہے جس نے زہر عشق کو عظمت اور پائداری کا مالک بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی کوئی دوسری مثنوی زہر عشق کے معیار کو نہیں پہونچی۔

یہ ساری بحث اچھی طرح اس بات کی وضاحت کر دیتی ہے کہ کسی بھی فن کو معیاری اور بلند پایہ بنانے کے لئے کن خوبیوں کی موجودگی لازمی ہے۔ جس ادب میں یہ ساری خوبیاں ہونگی ہر زمانہ اور ہر زبان میں اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا جائیگا چنانچہ وہی ادب صحیح معنوں میں ارفع اور اعلیٰ سمجھا جا سکتا ہے جس سے تمام لوگ محظوظ ہوں اور ہوتے رہیں۔ کیونکہ اگر کوئی ادب ایک ہی قسم کے تاثرات ان تمام لوگوں پر چھوڑتا ہے جن کے پیشے مقاصد، عمریں اور زبانیں مختلف ہیں۔ اور ان اختلافات کے باوجود اگر تضاد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو وہ معیاری بن جاتا ہے۔ ایک جرمن شاعر کا قول ہے۔۔۔

" شاعر کسی شہر کا شہری نہیں ہوتا بلکہ اپنے زمانہ کا شہری ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنے زمانہ سے حاصل کرتا ہے اور زمانہ کو بخشتا ہے"۔

یہی بات جو شاعر کے لئے کہی گئی ہر فنکار کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ فنکار زمانہ سے لیتا ہے اور زمانہ کو بخش دیتا ہے اور اس کے صلہ میں قبول عام اور بقائے دوام کا مالک بنتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ فنکار کے فن میں اگر ایک طرف ایسے عناصر موجود ہیں جو وقتی اور مقامی ہیں۔ تو دوسری طرف ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو چند مخصوص دلچسپی کی باتوں کے ختم ہو جانے کے باوجود ہر زمانہ کے انسانوں کو محظوظ اور متاثر کر سکتے ہیں۔ وہ فن جو رواج۔ مذاق۔ اور تمدن کے تغیرات کے باوجود قائم رہتا ہے۔ وہ صرف اس لئے پائدار نہیں ہوتا کہ فی الواقع زندگی کے نئے طور طریقوں۔ افکار۔ اور زبان کے ساتھ تطبیق پیدا کر لیتا ہے بلکہ اس لئے پائیدار ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اس کی تصنیف و تالیف کی بنیادیں کچھ ایسے عناصر پر رکھی گئی تھیں جو فطرت انسانی کے بنیادی۔ اہم ترین اور ان پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں جو زمانہ کی تبدیلیوں کے باوجود قائم رہے ہیں۔ وہ تصنیفات انسانی تجربات کے ان گوشوں سے متعلق ہیں جس میں بہت کم تبدیلی ہوتی ہے۔ اور جس ادب نے اس گوشے کی ترجمانی کی اور انسان کے دکھ سمیٹنے کی کوشش کی وہ ادب بھی ہر عہد کا ادب بن جاتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے کہا ہے۔۔۔۔

"ادب خواب اور حقیقت کے امتزاج کا نام ہے"

انسانی روح کو ایک ایسی دنیا کی تلاش ہوتی ہے جہاں سکون اور اطمینان میسر آ سکے۔ اس دنیا کی تلاش فن کی تخلیق کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ جستجو اس فنی تخلیق کو عظیم اور پائدار بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ہر زمانہ اور ہر عہد کے انسان کی یہی جستجو رہی ہے۔ یہ امر حقیقی ہے کہ وہ ادیب جسے ابدیت اور پائداری حاصل ہوئی ان کے مصنفین اپنے زمانۂ حال کے مسائل پر اپنی تمام تر توجہات مرکوز کئے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ان کی نگاہوں میں غیر شعوری طور پر آنے والی نسلوں کے مسائل بھی تھے۔ ان کی نگاہیں اپنے زمانہ کے حقائق اور مسائل پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ امروز کے آئینہ میں فردا کو دیکھنے والے ادیب نہ تھے۔ بلکہ ان کی نگاہیں امروز پر لگی ہوتی ہیں۔ جس پر فردا خود بخود جھلک پڑتا ہے۔ ادیب یا شاعر ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتا

ہے۔ اس لئے اپنے زمانہ کے مسائل اور حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس قوت سے کام لیکر جسے شعور کے نام سے پکارا جاتا ہے مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور مستقبل کے لئے راہیں استوار کرتا ہے۔ اور اس طرح ماضی۔ حال اور مستقبل کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے اور اس کا ادب نہ صرف یہ کہ حال کا ترجمان بنتا ہے بلکہ مستقبل کا پیغامبر بھی بن جاتا ہے۔

چنانچہ اب یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس ادب نے زندگیٔ جاوید کا راز پالیا اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مقامی اور عارضی مسائل سے بھی اسی طرح بحث کی جاتی ہے اور ایسی بصیرت بینائی اور قوت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ان وقتی اور مقامی چیزوں میں عالمگیر اور مستقل اشیاء کی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کتابوں میں انسانی جذبات۔ تجربات، کشمکش اور رنج و مسرت کا ذکر ہوتا ہے۔ جو انسانی زندگی کی مشترک بنیادیں ہیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں یہی خصوصیت ادب کی عظمت اور زندگی کا باعث بن جاتی ہے۔ اسی کو ادیب کا ردیہ کہتے ہیں۔ چنانچہ دانتے کی — BOOK OF DIVINE COMEDY ہومر کی نظمیں۔ شیکسپئر کے ڈرامے ان سب میں وقتی اور ابدی عناصر ملتے ہیں۔ یہی حال فردوسی کے شاہنامے کا تھا۔ جو اپنے زمانہ کے عرب اور عجم کی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ ایرانیوں کے ان عزائم کا ترجمان ہے جنھوں نے خلافت امویہ کے کھنڈر پر خلافت عباسیہ کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اسی طرح اقبال کی شاعری میں تشبیہات، استعارات۔ تلمیحات اور روایات بیشتر کلاسیکی ہیں۔ لیکن ان میں ابدیت کا عنصر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ان مخصوص مشرقی اور کلاسیکی اصطلاحات کے ذریعہ اپنے زمانہ کے وقتی اور ہنگامی مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگرچہ بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی زندگی ہی میں قبول عام حاصل ہوا اور زمانہ نے ان کو بقائے دوام سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن ساتھ ہی ایسے ادیب اور شاعر بھی ہیں جن کی عظمت کی شہادت صرف زمانہ دیتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے متعلق زمانہ کے تاریخی پس منظر کی بناء پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تخلیقات ادب العالیہ کا درجہ رکھتی تھیں۔ لیکن خود ان کے زمانہ میں ان کو شاعروں کے نہیں بلکہ اوباش لوگوں کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ اور قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کا قتل عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ نہ مر سکا۔ اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی بقا کے اسباب زیادہ ہی اکٹھے ہوتے گئے۔ اس مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کی عظمت کا اندازہ ابدیت اور پائداری سے لگایا جاتا ہے۔ اور ادب کی ابدیت اور پائداری کی شہادت صرف زمانہ دے سکتا ہے۔

سید ضمیر جعفری

بجنگ آمد ایک تاثر

"بجنگ آمد" کی آمد اُردو کے فکاہی ادب میں ایک شاہکار اضافے اور مزاح کے مزاج و معیار میں ایک یادگار موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب، مزاح نگاری میں تازگی و کشادگی کا ایک نیا اُفق، اور لطافت و مسرّت کی ایک نئی لذّت لے کر آئی ہے۔ اس کی اشاعت، ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ اُن من موہنی تخلیقات میں سے ہے جن سے ادب کی ساکھ، اور تہذیب کی آبرو قائم ہوتی ہے۔ اس کے مصنّف، کرنل محمد خان کے بارے میں، اگر مجھے صرف ایک ہی جملہ کہنا ہوتا تو میں وہی مشہور و معروف جملہ دہراتا کہ —— " وہ آیا، اُس نے دیکھا، اُس نے فتح کرلیا"۔ . . مگر یہاں میں، سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا کرتب دکھانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔

ادب و فن کی دنیا، وجدان و احساس کی دُنیا ہے۔ رنگارنگ، لامتناہی۔ دیکھنے میں کائناتی، برتنے میں ذاتی، قریب اتنی کہ بقول شخصے —— جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی! —— اور اسقدر کہ غالب کا دیوان ہزار مرتبہ پڑھنے کے باوجود —— پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ —— ! ادب کا اگر کوئی دروازہ ہے تو وہ باہر نہیں اندر کھلتا ہے!

مزاح کی صورت و سیرت اور وظیفے کے بارے میں کتنی ہی تعریفیں لکھی جا چکی ہیں۔ جب تک زندگی باقی ہے، یہ سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا۔ میں ذاتی طور پر، مزاح کی جس شریعت کا قائل ہوں، اس کی غایتِ اولیٰ افزائشِ مسرت اور تقسیمِ مسرّت ہے۔ مسرت، مزاح کا انعام بھی ہے اور پیغام بھی!

"بجنگ آمد" اسی قبیل کے "بجیب الطرفین" مزاح کا گلستانِ ہمیشہ بہار ہے۔ کرنل محمد خان، ظرافت اور ذہانت کو دودھ میں شکر کی طرح گھول کر، اس میں لطافت کی ایسی لہر، لذت کا ایسا ذائقہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہ ہو۔ وہ مسکراہٹوں کے سوداگر ہیں۔ اُجلی اُجلی میٹھی میٹھی، پیاری پیاری مسکراہٹیں۔ زندگی کو خوش تر و محبوب تر بنانے والی مسکراہٹیں —— یہ سارا مال اِن کے اپنے کارخانے کا ہے۔ مسکراہٹیں، اُن کو کہیں باہر سے درآمد نہیں کرنی پڑتیں۔ مسکراہٹیں اُن کے ہاں، چوکوں، چبوتروں، مناروں کی طرح، یہاں وہاں ایستادہ بھی نہیں ہیں، سنہری مچھلیوں کی طرح ایک قدرتی بہاؤ میں، بہتی، تیرتی، چلی آتی ہیں۔ تاروں کی طرح اُفق سے ٹوٹتی اور پھولوں کی طرح زمین سے اُگتی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ بس چوندائی ہی چوندائی ہو، گہرائی نہ ہو۔ ان کا مزاح بصیرت مند ہے اور صحت مند بھی —— یہ دُور تک دیکھتا اور دیر تک مسکراتا ہے۔ گہرائی ہے مگر اس کا دہانہ تنگ نہیں تنا۔

پیغام ہے، مگر اُس کا انگ چھلکا کوئی نہیں۔ کرنل محمد خان کو مزاح کی وہ صورت پسند نہیں ہے کہ اگر مزاح، انسانی پیکر میں زندہ ہو کر خوشحال خٹک اماں سامنے آجائے تو عصا ان بزرگوار کے ہاتھ میں ہو، چوغہ جسم پر، اور منبر و وعظ کے سوا کوئی مقام ان کے واسطے موزوں نظر نہ آئے۔ ہم ان کو اٹھ کر تعظیم دیں گے۔ جھک کر سلام کریں گے۔ کچھ دیر، ان کے ہمراہ، گہرے سمندروں کا سفر بھی کر لیں گے، مگر ہاتھ پہ ہاتھ مار کر، ان سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ کرنل محمد خان کے مزاح میں نکھار اور شگفتگی، ایک ہی دھاگے میں ڈھل کر آتے ہیں، حکمت، مسرت بن کر برستی ہے یہ مزاح خوش دلی اور عالی حوصلگی کے ساتھ، زندگی کی زیبائیوں کا خالق ہے، باورچی خانے کا ملازم نہیں۔ اس کے پڑھنے سے آگہی آتی ہے مگر اُس کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ نہ کتاب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑتا ہے۔

اب چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے، پہلا اقتباس کتاب کے مقدمے ہی سے ماخوذ ہے!

(۱) "۔۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی ایسی معرکہ آرا یا انقلاب آور قسم کی کتاب نہیں کہ اس پر مقدمہ دائر کیا جائے اور دراصل مقدمے کے بغیر ہی چھپنے جا رہی تھی کہ ہمارے ایک ٹیڑھی مزاج دوست ریحان مرزا تشریف لے آئے اور مسودہ دیکھ کر کسی قدر طنزاً فرمانے لگے:

"تو یہ کتاب آخر چھپ کر رہے گی؟"

عرض کیا — "کوئی اعتراض"؟

بولے — "دو ہیں — ایک تو آپ فوجی ہیں۔ دوسرے آپ کا نام بھی کاشتکارانہ سا ہے۔ جب کام اور نام کا یہ عالم ہو تو لوگ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب نویسی کا اشتعال کیسے آ گیا؟ یعنی کیوں نہ اس کی بجائے ایک مورچہ کھود ڈالا — یا، دو چار بیگھے زمین جوت لی؟"

(۲) "۔۔۔۔۔ یہ ابتدائے جنوری ۱۹۴۰ کا واقعہ ہے۔ اُس وقت، دوسری جنگ عظیم کی عمر یہی کوئی چار ماہ کی تھی اور ابھی ہٹلر کی اُنگلی پکڑ کر برلن سے بمشکل وارسا پہنچی تھی۔ باقی دُنیا بفضل خدا خیریت سے تھی، اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے امن برپا تھا، کہ شیر بکری معہ جملہ ہندوستانیوں کے، ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے۔"

(۳) "۔۔۔۔۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے، جو انگریزی اور پنجابی بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نو آموز کی زبان سے، انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں۔ اُسی طرح ہمارا "انگریزی آلو گوشت" بھی ہمارے اناڑی چھُری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا"

(۴) "۔۔۔۔۔۔۔ تمام اُستاد ادب سے پیش آئے۔ لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابلِ ادب قسم کے آدمی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری تعلیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی"

(۵) "۔۔۔ اُن دنوں قبائلی علاقے میں سفر کرنے سے پہلے قبائلیوں کے چند اعتراضات رفع کرنے پڑتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ اپنے اعتراضات کے اظہار میں زبانی فصاحت و بلاغت کے قائل نہ تھے بلکہ سرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے"

(۶) "۔۔۔۔۔ پنڈی میں چند دوست ملے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ہم سمندر پار جا رہے ہیں تو انہوں

ہیں اُس حسرت سے دیکھا، جس سے بن کھلے مرجھانے والے غنچوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک رقیق القلب دوست کی ہمدردی تو کچھ تعزیت کی سی شکل اختیار کر گئی، جسے ہم نے ایک مظلومی بلکہ شہادت کے عالم میں قبول کیا"

(۷) " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جو لڑ کر جنگ جیتتے ہیں۔ اور وہ، جو کھا کر جیتتے ہیں"

(۸) " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں۔ بلکہ اگر آتش جوان ہو، جیسا کہ وہ تھا، تو نالتو آرام ایک عجیب بدنی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے"

(۹) "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جدھر دیکھو جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لئے کہ زمین پر کھڑے ہیں، سینۂ خاک کو پاؤں سے دبانا پڑتا تھا، ورنہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تیر رہے ہیں"

(۱۰) ہندو پاکستان کے مسلمانوں کے دماغ میں قاہرہ کا تصور سراسر جامعہ ازہر کا تصور ہے۔ یعنی اہلِ قاہرہ یا رکوع میں ہیں یا سجود میں۔ ہاتھ میں یا کوزہ ہے یا تسبیح اور سر پہ رومی ٹوپی"

(۱۱) " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لمبی لمبی مونچھوں والے اُدھیڑ عمر کے کرنیل اور جرنیل جا بجا بکھرے ہوئے تھے — یہ محاذِ جنگ پر جانے کے قابل تو نہ تھے، البتہ "محاذِ کلب" کے نشیب موزوں تھے۔ بلکہ کلب کا ایک خود رو سا عضو لگتے تھے"

(۱۲) " ۔ ۔ ۔ ۔ بوجھ گونگا نہ تھا، فقط ضبطِ نفس کا قائل تھا"

"بجنگ آمد" — شروع سے آخر تک — ایسے ہی تابدار بلکہ ان سے بھی زیادہ شوخ و شنگ موتیوں سے لبریز ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اقتباسات ہی پیش کرتا چلا جاؤں۔ یہ کام سہل بھی تھا زیادہ دلچسپ بھی، اور میرے مقصود کے واسطے سودمند بھی کہ اس خرمن میں جہاں بھی ہاتھ ڈالئے، مٹھی میں روشنی ضرور آجاتی ہے۔ لیکن، جس طرح خود کرنل صاحب نے ایک کردار کے بارے میں لکھا ہے کہ "انہوں نے ایران کے قیام میں تھوڑی سی فارسی چُن لی تھی" اسی طرح، میں بھی، روا داری میں، چند اقتباسات ہی چُن سکا ہوں کہ ؎

شبِ وصال کوتاہ و سخن دراز باشد

تاہم، اربابِ ذوق، ان سے، کتاب کی عام چاشنی اور ادبی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مزاح، ادب کی لطیف ترین اصناف میں سے غالباً سب سے پتلی اور شاید سب سے مشکل صنف ہے۔ اس کی روح تک پہنچنے کے لئے، تہذیبی شعور کی سطحِ مرتفع پر لٹکی ہوئی ایک طویل "پل صراط" سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ "پل صراط" بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اس کے ایک طرف، سنجیدگی کا گہرا غار ہے اور دوسری طرف عامیانہ پن کی مسلسل دلدل۔ آدمی پھسلا اور گرا — اور جب گرا تو ؎

سر و دستار نداند کہ کدام اندازد!

پاؤں کے نیچے ہی تلوار نہیں، ایک تلوار ہاتھ میں بھی ہے ـــــ طنز کی تلوار! حکم یہ ہے کہ خود بھی چلتے رہو اور تلوار بھی چلتی رہے۔ تاکید یہ ہے کہ ہدف بسمل ہو جائے مگر زخمی نہ ہونے پائے۔ تلخی یا دل آزاری، شگفتگی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ کرنل محمد خاں، اپنے تیز سے تیز طنز میں بھی، دلفریبی و دلنوازی کے عناصر کو جس سلیقے سے بالا و بالغ رکھتے ہیں، وہ ان کا حصۂ خاص ہے۔ نہایت ارفع تہذیبی و سماجی شعور اور بہت ہی صقیل حس ظرافت کے بغیر اس منزل سخت سے گزر نا ممکن نہیں ہے۔ گزشتہ ادیبوں کے پشتے اٹھا کر دیکھیئے تو ان میں سے اکثر اپنی ہی تلوار کے گھائل ملیں گے ـــــ طنز کا وار خطا جائے تو، لوٹ کر لینے ہی اوپر آ پڑتا ہے!

"بجنگ آمد" دوسری جنگ عظیم کے ایک لفٹین کی جگ بیتی ہے۔ اسکو عسکری زندگی کا ایک رپورتاژ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے، جنگ کے پس منظر میں، اس زاویۂ نظر سے کوئی فکاہیہ کتاب، اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ یہ تجربہ نیا بھی ہے اور خوشگوار بھی۔ عسکری زندگی، امن اور جنگ، دونوں حالتوں میں اپنی ایک خاص فضا اور کیفیت رکھتی ہے اسکو مختصراً شجاعت، شفقت، رفاقت اور مسرت کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ یہ زندگی، عام زندگی سے بہت مختلف ہے۔ اس لئے یہ کتاب بھی دوسری کتابوں سے بہت مختلف ہے اس سے اردو مزاح نگاری کو تازہ ہوا ملی ہے۔ ہم اس راستے سے آشنا نہ ہوتے تو کچھ عجب نہیں کہ شیر باز برے، کیڈٹ ارجن سنگھ، لوجم، کیپٹن راجندر سنگھ بتالیہ، میجر مڈ وے اور قاہرہ میں شاہ فاروق کے جلسے میں نعرۂ تکبیر بلند کرنے والے صوبیدار صاحب اور ان کی طرح کے کتنے ہی دوسرے دلچسپ و شاداب کرداروں کی ملاقات سے محروم رہ جاتے؟

مشاہدات کی داخلی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے، اس پایہ کا رپورتاژ لکھنا ہے کہ جس کا انگ انگ زندگی سے شاداب ہو، جو سپاٹ ہواؤں میں پندرہ پندرہ سو میل کا سفر طے کر جائے اور تھکن کی کوئی شکن ماتھے پر ابھرنے نہ پائے، بڑا مشکل کام ہے۔ کاغذ کے پیٹ میں واقعات کا انبار تو لگایا جا سکتا ہے لیکن اگر ہاضمہ بگڑ جائے تو واقعات، واقعات کو کھانے لگتے ہیں۔ پھر مزاح نگار کو ہر واقعے کے گلے میں گھنٹی باندھنی پڑتی ہے۔ یہ گھنٹی نہ ہو تو داستان اور سامعین دونوں راستے ہی میں سو جائیں۔ رپورتاژ کی اصل مشکل ہی یہ ہے کہ یہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے! "بجنگ آمد" کو جس چیز نے واقعی قاتل، کافر بنا دیا ہے، وہ کرنل محمد خاں کے اندازِ بیان کی شیرینی ہے۔ ان کا اسلوب ملائم اور میٹھا ہے۔ بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔ اس میں ایک قسم کی دوشیزگی کا ایک ایسا الھڑ پن سا موجود ہے کہ اگر توفیق ہو تو آدمی اس کے لمس کو چھو بھی سکتا ہے۔ وہ، حکمت کی اونچی گہری بات بھی اس انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ چہرے کا بھولپن آلودہ نہیں ہوتا۔ لمحات پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ واقعہ خواہ کتنا ہی معمولی ہو، ان کی طبع رسا، اس میں سے حیرت و مسرت کا ایک آدھ گیلن مزید کشید کر لائے گی۔ قدرت کی طرف سے انکسار کی جو وافر نعمت ان کو ملی ہے،

میں سمجھتا ہوں کہ اس خوبی کے پرتو نے بھی ان کے اسلوبِ نگارش کو ایک خاص آب و رنگ بخش دیا ہے۔ ان کی نظر ہمیشہ دوسروں کے نقطۂ نظر پر رہتی ہے۔ وہ پڑھنے والے کو مخالف ہونے دیتے ہیں نہ مشتعل ؎

ان کا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

واقعات کو وہ جس لطف و لذت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اسکی دو ایک جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

.... ایک گورا سپاہی ہمیں اردلی ملا۔ اُس نے آتے ہی ہمیں سیلوٹ کیا۔ اور بغیر بات کئے ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھا۔ جوتے پالش کئے۔ اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں دن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر ہمارا مورال کچھ ضرورت سے زیادہ بلند ہو گیا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ سب انگریزوں کو بد دماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا۔"

(۲) "........ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سو چا کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں۔ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہار مدعا کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی گوئی کی داد دی، ایک مخلصانہ مسکراہٹ فرد پیش کی لیکن جہاں تک ہماری انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا، ظاہر تھا کہ وہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی انگریزی میں کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشقِ سخن جاری رکھی تو ہماری انگریزیاں، بالکل متوازی پگ ڈنڈیوں پر، ایک دوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ، زبان کی بجائے، ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقول داغ

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے!

(۳) "...... اصغر بولے ...... اِدھر دیکھنا ...... اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھی سی خاتون جو التجیات میں ہیں، دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں، ایک سُلگتا ہوا سگریٹ تھامے ہوئے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً ایک نہایت تسلی بخش سا کش بھی لگا لیتی ہیں اور خانۂ خدا میں، نیلے دھوئیں کے مرغولے اور محرابیں تعمیر کر رہی ہیں۔ حیران تھے، لیکن کیا کہہ سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ

یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہے تو کر

(۴) "...... ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات دوشیزائیں۔ پیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!"

دیکھا آپ نے کہ ان کی نظر واقعات کے بطن میں لرزاں دلچسپ سایوں کو کس طرح ڈھونڈ کر سطح پر لے آتی ہے اور پھر کس طرح وہ اپنے بے تکلف اور جاذب اسلوبِ نگارش سے اُن میں مسکراہٹوں کے چراغ روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک ایک جملے کو، دل ہی دل میں وجد کر کے، بلکہ شاید رقص کر کے، لکھتے ہیں۔ چنانچہ، ان کا ہر جملہ گلاب کی پنکھڑی کی طرح ڈھلا ہوا آتا ہے ـــ اور پنکھڑی بھی ایسی ـــ کہ جب دیکھئے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی!

مزاح میں اعلیٰ کارکردگی کا "تمغہ" عموماً اس فن پارے کو ملتا ہے جس کو آدمی اگر پڑھنا شروع کر دے تو ختم کئے بغیر چھوڑ نہ سکے۔ "جنگ آمد" کا مطالعہ کرتے وقت جی یہ چاہتا ہے کہ اے کاش یہ کتاب کبھی ختم نہ ہو!!

(راولپنڈی کی ایک ادبی تقریب میں پڑھا گیا)

شے ضیمی

ٹی۔بی

مہرباں ہو کے مرے گھر جو براجے ہو تم
یہ تو بتلاؤ، یہ گھر تم کو پسند آیا کبھی ؟
یا کہ تم بھی کسی سلسلۂ محبت کی طرح
چار دن رہ کے مرے پاس، چلے جاؤ گے ؟

چار دن ! ہائے مَیں کس دل سے کروں اُن کو شمار !
بے طلب جبکہ تھی رقصاں مرے اس گھر میں بہار
بے سبب مجھ سے کیا تھا کسی مہ وش نے پیار
مہوشِ زیست، کہ میں اب جسے کچھ یاد نہیں !

کتنی صدیوں سے یہ گھر ہے کہ جو آباد نہیں !
اب خدارا تمہیں اس گھر کے مکیں بن کے رہو
میرے اس جسم میں پھیلو مری رگ رگ میں بسو
میری ہر سانس کی بڑھتی ہوئی سوزش میں ڈھلو !

غم نہیں گر مرے سینے کی کسی خلوت سے
کچھ شفق رنگ پیامات چلے آتے ہیں
غم نہیں، میری مسیحائی کی گر زحمت سے
چارہ گر بھی مجھے اب دیکھ کے گھبراتے ہیں

تم کو سینے سے لگائے ہوئے لاکھوں انساں
جادۂ وقت سے ہر روز گذر جاتے ہیں
اے ہجومِ گذراں ! میں ہوں ترے ساتھ رواں

میرے مونس ! مرے ہمدم ! مرے پیارے مہماں !
ہے بہت عام زمانے پہ تمہارا احساں
اَن گنت لوگوں کی اس دیس میں تقدیر ہو تم !
مہ وشِ زیست کے جلووں ہی کی تنویر ہو تم !
ایک جرثومہ سہی، دق کے سہی، سل کے سہی
مہرباں ہو کے مرے گھر جو براجے ہو تم
یہ تو بتلاؤ، یہ گھر تم کو پسند آیا کبھی ؟

ساقی جاوید

پتھر کے انسان

تم ہو برگِ سمن تم ہو بادِ صبا
تم کو معلوم کیا
ہم نے تم سے یہ رنگِ حنا مانگ کر
دل کے بدلے یہ چاکِ قبا مانگ کر
شب کی تنہائی میں
گنگناتے ہوئے
گیت گاتے ہوئے
اپنے جلتے لہو میں نہاتے ہوئے
اپنے غم کا فسانہ کیا ہے رقم
اور ہم ہو گئے اس میں صرفِ قلم

تم کو معلوم کیا
تم تو ہو لذتِ غم سے نا آشنا
آہ کس سے کہیں
ہم نے کس شوق میں
اپنے زخموں کو رشکِ بہاراں کیا
اپنے اشکوں میں بھر بھر کے تابِ سحر
شہرِ خوباں میں ہم نے چراغاں کیا

تم تو رنگِ شفق بن کے ڈھلتے رہے
اپنی زلفوں کی عنبر فشاں چھاؤں میں
تم تو بادِ صبا بن کے چلتے رہے
تم سے ہم کیا کہیں
تم کو معلوم کیا
ہم نے کاٹی ہے کیسے شبِ زندگی
ہم نے کیسے اٹھایا ہے بارِ وفا
چاند نکلا نہ تاروں نے آواز دی
سر پہ کالے اندھیرے برستے رہے
اور جنت نشینوں کے اس شہر میں
روشنی کے لئے ہم ترستے رہے

تم سے اُمید تھی وہ بھی جاتی رہی
رات غم کی غزل گنگناتی رہی
ہر قدم پر ہمیں
وادیٔ شوق میں
اک شکستِ وفا یاد آتی رہی
بے وفا لوگ کیا حالِ دل پوچھتے
ہم کو دیکھا تو ہم سے نظر پھیر لی
ہائے دل کی یہاں کوئی قیمت نہیں
ہائے عنبر مزاجوں کے اس شہر میں
بوئے گل کی طرح ہم پریشان ہیں
واقعی ہم تو پتھر کے انسان ہیں

حامد سروش

نغمۂ برشگال

کاغاں کی حسیں پہاڑیوں سے — اٹھتی ہیں وہ جھوم کر گھٹائیں
آتی ہیں سمن کی وادیوں سے — خوشبو میں بسی ہوئی ہوائیں
آ، نغمۂ برشگال گائیں

ہو کیٹس کا نغمۂ محبت — خیام کی یا کوئی رُباعی
اُمڈی ہوئی میگسار بدلی — ساغر پہ جھکی ہوئی صراحی
آ، نغمۂ برشگال گائیں

ہے وجد میں ابر کوہساراں — ڈوبے ہوئے رنگ و بو میں منظر
کچھ دُور پہ رقصِ آبشاراں — نظروں کے لئے نگاہ پرور
آ، نغمۂ برشگال گائیں

بادل سے برس رہے ہیں نغمے — برفانی ہوا بھی جھومتی ہے
کہسار پہ بے نیازیوں سے — دوشیزۂ ابر گھومتی ہے
آ، نغمۂ برشگال گائیں

شاداب چمن ہے زندگی کا — اٹھلاتی ہیں لالہ گوں بہاریں
عالم ہے عجیب سرخوشی کا — ہم عیش دوام کو پکاریں
آ، نغمۂ برشگال گائیں

طلعت اشارت

سایہ

کیا تم میرے اپنے ہو!
— یا اک سایہ ہو —
جو میری پیاسی آنکھوں کے
— آگے لہرایا ہو!
میرے ساتھی!
میرے سپنوں کے ہمراہی!
کاش کبھی
— ان اونچے نیچے
— پتھریلے
— لمبے رستوں پر
ہم تم چلتے!
تم میرے خوابوں میں نہیں —
میری آنکھوں میں رہتے!!!

فروغ تمکنت

کاغذ کا ٹکڑا

سجا کر میں نے اپنے دل کی دوشیزہ اُمنگوں کو
حسیں قرطاس پر بکھرا دیا نغموں کی صورت میں
کہ ان کو آبشاروں کے ترنم میں کوئی گائے
سمو دے رَس بھرے ہونٹوں کی شادابی ساعت میں

اسی کاغذ کے پیراہن سے یہ خوشبو بکھرتی ہے
کہ جس سے حُسن کی شہزادیاں مخمور ہوتی ہیں
جلاتے ہیں یہی الفاظ خلوت گاہ میں شمعیں
لکیریں گیت بننے کے لئے مجبور ہوتی ہیں

مری محبوب تک کاغذ سفیرِ رنگ بنتا ہے
محبت ہے مجھے فن کی طرح کاغذ کے ٹکڑے سے
یہ میری بے زباں نغمات کا آہنگ بنتا ہے

احمد سلیم

لہو کا خراج

صنم پرانے ہوں یا نئے ہوں
مرا مقدر تو بندگی ہے

گلوں کی خوشبو، اُفق کی لالی
خدا، صحیفے، شکم، صلیبیں
یہ میرے دستِ ہنر کے پیکر
مرے ہی معبود بن گئے ہیں
یہ سحر ان کا
فریب ہے اور کچھ نہیں ہے

تمام پرچم
مرے لہو کا خراج لے کر جواں ہوئے ہیں
مگر ستم ہے
خود اپنی صنعت گری کے ہاتھوں
میں لاکھ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہوں

خدا، صحیفے، شکم، صلیبیں
صنم پرانے ہوں یا نئے ہوں
مرا مقدر تو بندگی ہے

قمر اقبال

ایک پراچین کتھا

یہ جہاں، بے اَماں
وقت کی دَوڑتی بھاگتی رہ گزر
مدّتوں سے ہے چھتا ہوا
جس کے سینے سے انبوہِ بے پایاں
شام و سحر
ہر کوئی سوچ کی تہہ میں ڈوبا ہوا
دُھن میں اپنی رواں
ساتھ سب کے بظاہر مگر ہر کسی سے ہے دَامن کشاں
اس خرابے میں
ہمراہ اک دوسرے کے سہی، ہر کوئی
جانتے ہیں سبھی
یہ رفاقت فقط چند لمحوں کی ہے
یہ جو پہچان ہے چند قدموں کی ہے
یہ کہانی نہیں چند برسوں کی ــــ
ــــ صدیوں، زمانوں کی ہے

خورشید راٹھور

لمحوں کے سائے

آ کبھی بیٹھ کوئی بات سُنا
دل ہے ویران خرابے کی طرح
لوگ کہتے ہیں : بہار آئی ہے
آرزو ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں
کوئی آئے تو سنور جائے جہاں
کس کے آنے سے مسرّت ہوگی ؟
ہاں وہ آئے تو اُجالا ہو جائے
آ کبھی بیٹھ کوئی بات کریں
اجنبی دیس کے راہی کو بھلائیں کیسے ؟
کتنا سندر ہے ـــ دل آرام کوئی
میری چاہت کے خیابانوں کا مہمان کوئی
روز اک روپ نیا دھارے چلا آتا ہے
پھر بھی مدت ہوئی جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں
اور کچھ بیٹھ ! کہاں دل کی کوئی بات ہوئی
بیٹھ بھی جا کہ کہاں دل کی ابھی بات کہی
آج بے ساختہ یاد آیا کوئی
ذہن پر دھند مسلط ہے خیالوں کی ابھی
لیکن اک چھوٹی سی تابندہ کرن لاتی ہے جینے کا پیام
سکھی وہ بات سنا دل کی کدورت مٹ جائے
ایسی اک بات کہ جو دل میں اُتر کر کوئی نغمہ بن جائے

صنوبر مصوّر

زندگی

فاصلے، وقت، مقامات، یہ خوابوں کے طلسم
آخر اس کشمکشِ زیست کا حاصل کیا ہے
ہر نئی سوچ میں پارے کی تڑپ ملتی ہے
ایسے احساسِ بلاخیز کی منزل کیا ہے
زندگی امن و سکوں ہی کی علامت ہے اگر
پھر یہ شوریدہ تلاطم لبِ ساحل کیا ہے
ایک ہنگامۂ رنگیں ہے اگر اصلِ حیات
تب یہ آزردہ کلامی سرِ محفل کیا ہے

یہ نئی رنگ خلائیں، یہ غبارِ منزل
دل ہے آئینہ تو پھر اس کے مقابل کیا ہے؟

زندگی ایک حقیقت بھی ہے افسانہ بھی
زندگی خواب بھی ہے، خواب کی تعبیر بھی ہے
بیکراں وقت کی مانند ہے خود بھی آزاد
خود گذرتے ہوئے لمحات کی زنجیر بھی ہے
سرگراں ہو کے بھٹکتی ہے یہ ویرانوں میں
آئینہ خانے میں اک چاند سی تصویر بھی ہے
نغمۂ شام کبھی بن کے جگائے جادو
ڈھلتی راتوں میں کبھی نالۂ شبگیر بھی ہے

خاک کی گود میں سمٹا ہوا ذرّہ ہی نہیں
اوجِ انجم پہ یہ اک قوتِ تسخیر بھی ہے!

زیست ہر نقش کو یوں حسن عطا کرتی ہے
روشنی جیسے اندھیروں سے گذرتی جائے
امن کے دور میں مہتابِ جواں کی صورت
اپنے رنگوں کی صباحت میں نکھرتی جائے
عرصۂ جنگ میں سورج کی شعاعوں کی طرح
زندگی سرخ نگینوں میں بکھرتی جائے
اک ہمہ گیر تغیر کی فسوں کاری سے
زلفِ ہستی ہے کہ ہر لحظہ سنورتی جائے

ایسے ماحول طربناک و ضیا ریز میں بھی
دل کی قسمت ہے کہ بن بن کے بگڑتی جائے

مختار زمن

محبت کی غذا موسیقی

(مختار زمن)

شیکسپیئر نے لکھا ہے کہ موسیقی محبت کی غذا ہے ۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے ملک میں اس غذا کی کمی نہیں، شعراء کے دیوان اور سینما کے فلم اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ بنیادی طور پر ہم زراعتی ملک نہیں بلکہ "محبتی" ملک ہیں۔ میں نے سرکاری بیانات اور منصوبہ بندی کمیشن کی رپورٹوں میں اکثر یہ لکھا دیکھا ہے کہ ہمارے ملک کی ۸۵ فی صدی آبادی دیہات میں رہتی ہے اور زراعت پر گذر بسر کرتی ہے ۔ میرے خیال میں اس بیان کا پہلا حصہ صحیح ہے لیکن دوسرے حصے میں بجائے زراعت کے عشق کا لفظ بڑھا دینا چاہئے ۔ ہمارے ملک میں خوراک کی کمی کی شکایتیں اکثر سننے میں آتی ہیں ۔ گو اب یہ کہا جا رہا ہے کہ سنہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک پاکستان غذا کے سلسلے میں خود کفیل ہو جائے گا ۔ لیکن جہاں تک عشق و محبت کی غذا کا تعلق ہے ہم لوگ نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ یہ غذا ــ یعنی موسیقی ــ ہمارے یہاں اتنی پیدا ہوتی ہے کہ ہم اسے برآمد کر کے زرمبادلہ کما سکتے ہیں ۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس کی صداقت پر شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھئے، یا میرے تجربات سے فائدہ اٹھایئے ۔

صرف ایک دن کا پروگرام پیش کرتا ہوں :

صبح سو کر اُٹھا تو دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی یہ تان سُنائی دی ـــ

"پہلی مُلاکات ہے ۔ پہلی ملاکات ہے..... "

نوکر نے دروازہ کھولا ۔ دودھ والا کھڑا تھا ، اُس نے دودھ دیا ۔ "مُلاکات" ختم ہونے پائی تھی کہ پڑوس میں چائے والے نے ریڈیو کھول دیا ۔

ہمارے ملک میں چائے والے اور ہوٹل والے پیسے کے لالچی نہیں کہ جو اُن کے یہاں چائے پئے وہی گانا سُن سکتا ہے ۔ یہ حضرات عوام کے فائدے کے لئے فی سبیل اللہ ریڈیو لگاتے ہیں، چنانچہ ریڈیو کی تانیں چائے والے کے ریڈیو سے نکل کر میرے کمرے کی دیواروں اور چھتوں کو توڑتی ، دوسرے پڑوسیوں کی سامعہ نوازی کرتی ہوئی تمام

محلے میں پھیل گئیں۔

میرے پاس نوکر کو بلانے کے لئے بیرا یا گھنٹی نہیں، چنانچہ جب میں نے باورچی خانے میں جاکر بنگالی نوکر کو آواز دی تو وہ مشہور بنگلہ گیت "اِکلا چولو اکلا چولو" گا رہا تھا۔

میں جب ناشتے سے فارغ ہو کر ٹیکسی میں بیٹھا تو ٹیکسی والے نے ریڈیو پوری آواز سے کھول دیا، اور راستے بھر میں فلمی گانوں سے محظوظ ہوتا ہوا دفتر پہونچا۔

میں دفتر ذرا جلد پہونچ جاتا ہوں، اسی لئے ہمیشہ فراش یا پیگی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ جیسے ہی میں نے دفتر میں قدم رکھا تو پیگی کا ۱۱ برس کا لڑکا، فرش پر "ٹاکی" لگا رہا تھا اور پورے سوز و گداز کے ساتھ "دو نیناں متوالے" گا رہا تھا۔

دفتر کا کام شروع ہوا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سڑک کے اُس پار ایرانی کی دکان اور ریڈیو ایک ساتھ کھولے جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ میں نے دونوں میں سے کسی کو کبھی بند نہیں دیکھا۔ پاکستان، ہندوستان، سیلون، بی بی سی، فوجی بھائیوں کا پروگرام، مشرقی بھائیوں کا پروگرام، افریقی بھائیوں کا پروگرام، ایشیائی بھائیوں کا پروگرام مختلف ممالک میں اس طرح ترتیب دیئے جاتے ہیں کہ فلمی موسیقی چوبیس گھنٹے سنی جا سکتی ہے۔

غرض کہ دن بھر ایرانی کی دکان کا گانا، "باہر والے" کی کٹنگ ہٹ اور ٹیکسیوں اور رکشا والوں کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شام کو گھر واپس آیا تو پھر چائے کی دکان پر ریڈیو موجود تھا۔ میں ریڈیو سنتے سنتے سو گیا۔ یہ ریڈیو اور میرے کان رات بھر بجتے رہے۔

...... اب آپ بتایئے کہ فنونِ لطیفہ میں کوئی اور فن ایسا ہے جو موسیقی کا مقابلہ کر سکے۔ بیرونی ممالک کے سیاح ہمارے شہروں اور دیہاتوں کو دیکھ کر خواب میں بھی اس کا یقین نہ کرتے ہوں گے کہ جو قوم ٹیڑھے مکان، گندے تالاب، بدبودار بدرو، گوبر کے اُپلے، بغیر فٹ پاتھ کی سڑک، بیچ شہر میں بھینس کالونی اور مذبح بنا سکتی ہے وہ موسیقی جیسے اعلیٰ فنِ لطیفہ کی اس قدر شائق اور ماہر ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ہماری قومی روایت ہے۔ ہمارا بلند کردار ہے۔ صدیوں کی پُرانی ثقافت ہے ——

ہمارے بچے قوالی گاتے ہیں۔

عورتیں میلاد شریف گاتی ہیں۔

ہماری فلموں میں جب ولن ہیرو کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیتا ہے اور اس کی انتڑیاں باہر نکل آتی ہیں تو ہیرو پیٹ پکڑ کر نہایت سُریلا گیت گاتا ہے۔

ہیروئن کی شادی طے ہوتی ہے تو گاتی ہے —— شادی ٹوٹتی ہے تب بھی گاتی ہے —— ہیرو کی موت پر بھی گاتی ہے اور وصل پر بھی۔

ہیرو اور ہیروئن ایک ہزار میل دور بیٹھ کر بھی سوال جواب کی طرح گاتے ہیں۔ اور سامنے بیٹھ کر بھی۔

ہم محفل موسیقی میں بھی گاتے ہیں، غسل خانے میں بھی، اور مشاعرے میں بھی۔

مغرب کے بعض ماہرین موسیقی یہ سمجھتے ہیں کہ گانے کے لئے شعر یا گیت میں وزن کی ضرورت ہے ہم اسے نہیں مانتے۔ ہمارے فلمی گیت اور بعض اشعار میں وزن نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بھی گائے جاتے ہیں۔ صرف لے اور تان کی مدد سے نثر کو نظم کی شکل دے دی جاتی ہے۔ آپ نثر کا ایک فقرہ کسی فلمی ہیروئن یا پلے بیک سنگر کو دے دیجئے اور پھر دیکھئے کیسا راگ نکلتا ہے۔

ہمارے قومی کردار کی نمائندگی ابّو بھائی کرتے ہیں ـــــ ابّو بھائی کا اصل نام ابوالحسن تھا۔ کالج میں وہ پہلے میرے چھوٹے چچا کے کلاس فیلو تھے اور پھر امتدادِ زمانہ سے میرے کلاس فیلو ہوگئے۔ کالج میں اتنے دن قیام رہا کہ ان کے بعض ساتھی پروفیسر بن کر اسی کالج میں آگئے، مگر ابّو بھائی اپنی جگہ پر جمے رہے۔ انہیں صرف دو باتوں کا شوق تھا ـــ ورزش اور فلمی گانے۔ وہ باقاعدہ جمنیزیم جاتے، کسرت کرتے اور بادام گھونٹ کر پیتے تھے۔ چھ فٹ کا قد، شیر کا سا کلّہ جبڑا۔ ہر وقت فلمی گیت گنگناتے اور اپنے بازوؤں کے عضلات کی نمائش کرتے رہتے تھے، جو ڈوئی کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ صورت سے بھی فلمی ہیرو معلوم ہوتے۔

ایک دفعہ ابّو بھائی کی لڑائی ایک معمولی جسامت کے لڑکے سے ہوگئی۔ لڑکا تھا تو ذرا سا لیکن نہایت پھرتیلا اور مرچ کی طرح تیز۔ اُس نے ابّو بھائی کی ٹھکائی کر دی ـــ ہم لوگوں کو معلوم ہوا تو سخت حیرت ہوئی کہ ۱۲ سال کی ورزش بے کار گئی۔

پوچھا: "ابّو بھائی، یہ اَن ہونی بات کیونکر ہوگئی؟"۔

ابّو بھائی مسکرائے، لوہے کی لاٹ کا سا بازو دکھلایا اور بولے "اجی وہ مردود مجھے کیا مار سکتا تھا۔ میں چٹنی بنا دیتا۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ جس وقت وہ میری طرف بڑھا، اور میں نے دھوبی پاٹ دینے کا ارادہ کیا، اسی وقت ایک گیت یاد آگیا۔ میں نے کہا: تنا۔ تا۔ تنا۔ تنا۔ تاتنا۔ اور اس دوران میں اس نے مجھے مار لیا"۔ تو دیکھا آپ نے موسیقی کا ذوق سچ پوچھئے تو خدا کی دین ہے۔ ع

این سعادت بزورِ بازو نیست

فیض انصاری

روٹی موت اور بھگوان

(۱)

"دو مٹھی آٹے میں کتنی روٹیاں پکائے گی ماں ؟"

ببلو نے پوچھا —

"ایک روٹی میرے بچے — !

"لیکن کھانے والے تو چار ہیں ماں — ؟"

چُنی بولی —

"چار ٹکڑے کردوں گی نا بیٹی — !"

"مگر اماں — !"

ببلو کچھ بولتے بولتے رُک گیا۔

(۲)

بھوک لگ رہی ہے ناماں — !"

چُنی بلکنے لگی —

" مرا بھی تو پیٹ نہیں بھرا ماں "

ببلو بھی مچلا۔

" ہوں — ہوں — ہوں — !"

گود کی بچی بھی فریاد کرنے لگی۔

ماں نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو پی لئے اور بچوں کو ایک ایک گلاس پانی پلا دیا۔

پیٹ کی آگ سرد پڑ گئی ،

اور بچے سو گئے۔

(۳)

"اٹھ نا ماں —— دن چڑھ آیا ——!"

ببلو نے پکارا۔

"بڑی تیز بھوک لگ رہی ہے ماں ——"

چنی نے ماں کو جھنجھوڑا۔

"ہوں —— ہوں —— ہوں ——"

گود کی بچی کسمسائی اور رونے لگی۔

ماں اٹھی اور کنویں پر چلی گئی۔

ایک ایک گلاس تازہ پانی سے بچوں کا ناشتہ ہو گیا۔

(۴)

"بھیا شام ہو رہی ہے اور ماں اب تک نہیں آئی ——!"

"آٹا پسا رہی ہوگی ——!" ببلو چنی کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے بولا۔

"مگر اناج کہاں سے ملا ہوگا ماں کو بھیا ——؟" چنی نے سوال کیا۔

"کسی سے اُدھار مانگ لیا ہوگا ——!"

ببلو نے گھٹنوں سے پیٹ دباتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ روز روز کون اناج دیتا ہوگا بھیا؟" چنی نے دوسرا سوال کیا۔

"جو ماں سے محنت مزدوری کراتا ہوگا"

"اور کل کی طرح آج بھی مزدوری نہ ملی ہوگی ماں کو تو ——؟"

بھوکے پیٹ بجانے چنی کو یہ سوالات کیسے سوجھنے لگے۔

"تو پھر اناج بھی نہیں ملے گا ——!"

ببلو بات منہ سے نکال کر پچھتانے لگا۔

"تو پھر ماں آج بھی آٹا نہیں لائے گی بھیا ——!"

"ماں آٹا ضرور لائے گی چنی ——"

ببلو اب فریب دینے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیسے لائے گی بھیا۔ جب اناج نہیں ملا ہوگا"

"آٹا ضرور لائے گی ماں —— چنی"

اب ببلو جھلا گیا تھا۔

"جھوٹ مت بول بھیا۔ اس سے پیٹ نہیں بھرتا" چنی پوری قوت سے چیخ پڑی۔

"نہیں پیٹ بھر تا — تو مر جا —" بیلو کو بھی غصہ آگیا تھا۔
چنی اُس کے رعب میں آگئی اور خاموش ہوگئی۔

(۵)

"بھیا — اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے نا —!"
چنی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں — رات چودھویں ہے چنی"
بیلو مری ہوئی آواز میں بولا۔
"ماں کب آئے گی بھیا؟"
"اب آتی ہی ہوگی چنی —!"
"بھوک پھر تیز ہوگئی ہے بھیا —"
"اور تھوڑی دیر صبر کرلے —!"
"اچھا — ایک گلاس پانی اور پلادے بھیا"
"مگر پانی تو ختم ہوگیا چنی"
چنی آسمان پر جمع ہوتے بادلوں کو دیکھنے لگی۔

(۶)

"بھیا —!"
"ہوں —!"
"ماں نہیں آئی —؟"
"نہیں —!"
"کب آئے گی —؟"
"بھگوان جانے —!"
"بھگوان کہاں ہے بھیا —؟"
"اپنے مندر میں —!"
"چل اُس سے ماں کا پتہ پوچھیں —!"
"اری پگلی — بھگوان بھی کہیں بولتا ہے —"
اور چنی تائید میں سر ہلاتی رہ گئی۔

(۷)

"بھیا —!"

"ارے کیا ہے ۔"
"وہ کون آرہا ہے — ؟"
"کہاں — ؟"
"وہ سامنے — !"
"کوئی بھی تو نہیں ہے — !"
"نہیں — کوئی ہے بھیا — !"
"مجھے تو نہیں دکھائی دیتا کوئی ۔"
"وہ دیکھو، وہ سامنے — کوئی کالا کالا میری جانب چلا آرہا ہے — !"
"یہ کیا بک رہی ہے چنی —"
"نہیں بھیا سچ کہہ رہی ہوں —"
"اچھا اب آنکھیں بند کرلے — !"
"نہیں بھیا — تو ذرا چراغ جلا"
"چراغ میں تو ہفتے بھر سے تیل نہیں ہے ۔"

"نہیں — نہیں — میرا گلا مت دباؤ —"
"چنی — !"
"ہاں بھیا — یہ میرا گلا دبا رہا ہے ۔"
"چنی — !"
"بھیا — بچا ...... "
"چنی —"
اور چنی خاموش ہوگئی ۔
بُت بن گئی ۔
بُت — !
بھگوان کا بُت — !
جسے بھوک لگتی ہے نہ پیاس —
جو رو سکتا ہے نہ قہقہہ لگا سکتا ہے ۔
جو دیس کے بھوکوں کو اناج دے سکتا ہے نہ اُن کی بھوک ختم کرسکتا ہے ۔
البتہ جو بہرا اور گونگا ضرور بن سکتا ہے !

سیدہ حنا

بلی

صدف کا خط مٹھی میں مسل کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے!

شروع ہی سے انھوں نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ خود کو نمایاں کرنے کا جذبہ انھیں ہر دم بے چین رکھتا۔ بچپن میں یہ خواہش ان سے عجیب عجیب کام کراتی تھی۔ ہر کام جس سے ان کی شخصیت نمایاں ہو سکے کر گزرتے تھے۔ گھر میں ان کی بڑی بہن تھی۔ سخت بدمزاج اور لڑاکا۔ نہایت نکمّا باپ تھا جس کی راتیں رنڈیوں کے مجرے یا خاموش فلمیں دیکھنے میں گزرتی تھیں جسنے ان کی لڑاکا بہن کو ان پر اس طرح تعنیات کر رکھا تھا جیسے قیدیوں پر جیل کا داروغہ۔ وہ ان کی معمولی سی سرکشی پر بھی ان کو سزا دلوائے بغیر چین نہیں لیتی تھی۔ باپ ہمیشہ بہن کا بیان سنکر سزا کا فیصلہ سنا دیا کرتا تھا۔ اس نے ننھے بھیا کا بیان سننے کی کبھی زحمت نہیں کی تھی۔ ان کا پھکڑ چچا تھا جو ہمیشہ ان سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ ان کی کشتی کرا کے خوش ہوا کرتا تھا۔ اور چچی تھی جو ان کی کلائی مروڑ کر پیسہ چھین لیا کرتی تھی۔ اس طرح زندگی ان کے لئے ایک اذیت بن گئی تھی اور گھر اذیت گاہ ۔۔ مدتوں وہ گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے رہے۔ لڑائیاں لڑتے اور پٹتے رہے پھر ایک دن ان کے تحصیلدار ماموں ان کے یہاں آئے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے، ممانی نے ان کا بڑے خلوص سے خیر مقدم کیا ان کے سینے میں منہ چھپا کر ایک لمحہ کے لئے ننھے بھیا کو وہی سکون میسر ہوا جو چار سال کی عمر میں ان سے چھن گیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک ان کی گود میں منہ چھپائے اپنی فردوس گمشدہ کا تصور کرتے رہے۔ ماموں نے انھیں چوتھی کلاس میں داخل کرا دیا تھا مگر چین ان کی قسمت میں یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی کلاس میں سب سے بڑی عمر کے لڑکے تھے۔ دوسری کلاسوں کے لڑکے انھیں چڑاتے، ماسٹر بات بات پر انھیں شرمندہ کرتے۔ صدف اسوقت بہت چھوٹی تھی وہ ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ ماموں اسے روز ایک آنہ دیتے تھے۔ پہلے وہ یہ پیسے خرچ کر ڈالتی تھی مگر جب سے ننھے بھیا آئے تھے وہ پیسے جوڑنے لگی تھی۔ بھیا کو گلاب جامنیں بہت پسند تھیں اور اس سستے سمے دو آنے کی پاؤ ملتی تھیں۔ صدف بڑی پابندی سے دوسرے دن ان کے لئے پاؤ بھر شیرے میں ڈوبی ہوئی گلاب جامنیں لیکر آتی۔ ایسے میں اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھی روشن ہو جاتی تھیں (یہ کیسی روشنی تھی جو انھیں زندگی بھر نصیب نہیں ہو سکی)

ایک سال میں جیسے تیسے انھوں نے پرائمری پاس کر لیا تو ماموں نے انھیں مڈل اسکول میں داخل کرانے کی سوچی مگر ایکدن انھوں نے انھیں بڑی عمر کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ پکچر۔ ہاؤس میں بیٹھے اور بیڑی پیتے دیکھ لیا۔ انھوں نے وہیں سب کے سامنے ان کو

بھر کے پیٹا اور نوکر کے ساتھ گھر بھجوا دیا مگر گھر آنے کے بجائے وہ راستے ہی سے بھاگ گئے اور راتوں رات اپنے گھر پہنچ گئے۔ اس دفعہ باپ نے ان کا بہت اچھی طرح خیر مقدم کیا اور انھیں کچھ نہیں کہا اور دوسرے ہی دن انھیں ایک بیڑی بنانے کے کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔

تم پڑھ سکتے ہی نہیں ہو — اس نے کہا — تمھارے لئے یہی ٹھیک ہے۔

ان کا دن تمباکو، تیندو کے پتوں اور بدلنے لوگوں کے درمیان گزرتا۔ پکّی عمر کے مزدور ایکدوسرے سے، بہت فحش مذاق کرتے۔ عورت کی قسمیں گناتے، اور اس کے جسم کے ایک ایک حصّے کا مزے لے لے کر تذکرہ کرتے اور نہایت مکروہ قسم کے قہقہے لگاتے۔ وہیں ننّھے بھیا کو عورت مرد کے تعلقات کا علم ہوا۔ وہیں انھیں پتہ چلا کہ ماں، بہن، چچی اور ممانی کے علاوہ بھی ایک عورت ہوتی ہے جسے معشوقہ بھی کہتے ہیں اور بیوی بھی۔

اندنوں ان کے پڑوس میں ایک کوٹھی بن رہی تھی جب وہ بنکر تیار ہوئی تو اس میں ایک میجر صاحب اپنی بڑی سی فیملی کے ساتھ آکر رہنے لگے۔ ننّھے بھیا نے کوٹھی کے سرسبز لان میں لڑکیوں کو دوپٹے کمر سے باندھے لڑکوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے بھاگتے، دوڑتے اور قہقہے لگاتے دیکھا۔ زندگی کا یہ رخ کتنا غیر معمولی اور کسقدر دلچسپ تھا۔ ان لوگوں میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ انھیں صبح منھ اندھیرے بیڑی کے کارخانے میں جانا ہوتا تھا مگر اب وہ وہاں سے لیٹ ہونے لگے تھے کیونکہ صبح میجر صاحب کی کوٹھی سے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروپ سیر کے لئے نکلتا تھا۔ ننّھے بھیا بےتعلقی سے دور، دور چلتے ہوئے ان کے ساتھ جاتے اور اسی طرح واپس آتے۔ شام کو بھی وہ کارخانے سے جلدی بھاگ آتے اور کوٹھی کے گیٹ پر کھڑے ہو کر انھیں بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ پھر ایکدن ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی انھیں اندر بلا کر لے گئی۔ وہ میجر صاحب کی سب سے چھوٹی لڑکی سلطانہ تھی میجر صاحب اور ان کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ وہ ان کے پڑوس میں رہتے ہیں تو وہ بہت شفقت کے ساتھ پیش آئے اور انھیں کبھی کبھی اپنے یہاں آتے رہنے کے لئے کہا۔ کچھ ہی عرصے بعد ننّھے بھیا میجر صاحب کی فیملی کے ایک فرد بن گئے۔ ہر شام وہ جا کر ان کے بچوں میں کھیلتے۔ انھیں دنوں ان کی ممانی صدف اور صبوحی کو لیکر ان کے یہاں آئیں۔ وہ میجر صاحب کے یہاں بھی گئیں اور میجر صاحب کی بیگم بھی ان سے ملنے آئیں۔ صبوحی تو خیر بہت چھوٹی تھی مگر صدف اکثر سلطانہ آپا کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ایکدن وہ دونوں انھیں کے گھر میں "اندھا بھینسا" کھیل رہی تھیں۔ صدف نے اپنی چھوٹی سی اوڑھنی سلطانہ آپا کی آنکھوں پر پٹی کی طرح باندھی ہوئی تھی اور سلطانہ اندھوں کی طرح ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر صدف کو ٹٹول رہی تھی۔ ایسے میں اس کے تمتماتے ہوئے رخسارے اور ادھ کھلے ہونٹ بہت پیارے لگ رہے تھے، تب ہی صدف کے دھوکے میں اس نے ننّھے بھیا کو پکڑ لیا۔ اس لمس نے بھیا کے اندر اونگھتے ہوئے مرد کو پوری طرح بیدار کر دیا۔ ایک ثانیے کیلئے انھوں نے اس کے آدھ کھلے ہونٹوں، تمتماتے رخساروں اور فراک کی چولی میں ابھری ہوئی نوخیز چھاتیوں کو دیکھا، اس کی گوری گوری باہوں کو اپنے گرد حلقہ کئے ہوئے پایا۔ اور اچانک انھوں نے اسے پوری قوت سے سینے کے ساتھ بھینچ کر اپنے موٹے موٹے جامنی ہونٹ جن سے بیڑی کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اس کے آدھ کھلے ہونٹوں پر رکھ دیئے —— زلزلے کا جھٹکا تھا یا بجلی کا کوندا۔ بس پلک جھپکتے ان کا سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ — باپ نے مار مار کر ان کے بدن پر نیل ڈال دیئے اور بارش کی اس طوفانی رات میں جب اندر باہر ہر طرف زلزلے لہرا رہے تھے، اور کوندے لپک رہے تھے۔ ننّھے بھیا چپ چاپ گھر سے بھاگ لئے۔

وہ میلوں پیدل چلے، انھوں نے بےشمار راتیں بمبئی کے فٹ پاتھوں پر بسر کیں اور پولیس والوں کی ٹھوکریں کھائیں۔ انھوں نے

ملوں میں دن رات کام کیا۔ انھوں نے جانوروں کی طرح اپنیش اور گارا ڈھویا۔ بدبودار کھولیوں میں کھٹملوں جوؤں اور چوہوں کے درمیان زندگی بسر کی۔ مگر اس اچھوتے جسم کی مہک باسی نہ ہوئی۔ اس پہلے بوسے کا ذائقہ انھیں کبھی نہ بھولا۔ اسے حاصل کرنے کی آرزو ان کے دل سے کبھی نہ نکلی۔ وہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا نوخیز جسم۔ دو بڑی بڑی شربتی آنکھیں، وہ کٹے ہوئے بھورے بھورے بال، اور وہ دنیا کی ہر رسیلی ہر میٹھی چیز سے زیادہ میٹھے ہونٹ وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا چاہتے تھے۔
کراچی آکر ان کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ ان کا کاروبار چل نکلا۔ پھر جلد ہی ان کا شمار دولت مندوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں اس کے حصول کے امکانات روشن ہوتے گئے ان کی بیکلی بڑھتی گئی۔ پھر ایک دن انھوں نے اپنی ممانی کو خط لکھا۔ کہ وہ میجر صاحب سے سلطانہ کا ہاتھ ان کے لئے مانگیں۔ ممانی کے بجائے صدف کا خط آیا۔ اس میں ان کی اتنی طویل گمشدگی کا گلہ تھا۔ ان کے مل جانے کی خوشی تھی گھر اور کنبے کے حالات تھے۔ اپنی ماں اور ان کے چچا کی موت کی خبر تھی۔ آخر میں سلطانہ کے لئے لکھا تھا کہ اسنے سینئر کیمبرج کر لیا ہے۔ اور میجر صاحب، ایک کمیشنڈ آفسر کو اس کا رشتہ دینے کی سوچ رہے ہیں — اس نے بڑے افسوس سے لکھا تھا۔

کاش بھیا۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوتی آپ کو بھی آرمی میں کمیشن ملا ہوتا تو آج سلطانہ آپا میری بھابی ہوتیں۔"

انھوں نے سنا تھا عورت پہلا پیار کبھی نہیں بھولتی اور وہ سوچ رہے تھے سلطانہ یا تو اب تک ان کے فراق میں جان سے جا چکی ہوگی، یا پھر ہجر کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپ کر اسے ٹی بی ہوگئی ہوگی۔ ان کا پیغام اسے نئی زندگی دے گا۔ میجر صاحب انھیں فوراً بلا کر سلطانہ کو ان کے حوالے کر دیں گے۔ یہ تیسری بات بالکل خلاف توقع تھی۔ انھوں نے خط کے پرزے پرزے کر کے اس پر ایکبار نہیں کئی بار تھوکا — مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ ہفتوں وہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں سودائیوں کی طرح گھومتے پھرے۔ کوئی قیمتی چیز کھو گئی تھی اور اب وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھے پھر ان کے دوست نے جو ان کے کاروبار میں بھی شریک تھا انھیں سنبھالا۔ اس نے انھیں بتلایا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں ہرجائی ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کسی ایک کی ہو کر نہیں رہتیں۔ محبت اور وفا صرف نئی تعلیم اور تہذیب سے نا آشنا لڑکیوں میں مل سکتی ہے۔ اور ایسی ہی ایک لڑکی ان کے پلے باندھ دی۔ نفیسہ جسے صرف محسوس اور مادی چیزوں سے سروکار تھا۔ ان کا جسم ان کی دولت ان کا گھر اچھے کپڑے اچھا کھانا۔ بس اس کی پہنچ یہیں تک تھی۔ روح و دل کے معاملے اس کی سمجھ سے باہر تھے وہ ان جھگڑوں میں کبھی نہیں پڑی۔

گھر والوں کو ان کا پتہ معلوم ہوگیا تھا۔ باپ اور ماموں کے خطوط اکثر ان کے نام آتے یہ ۱۹۴۷ء کا آخر اور ۱۹۴۸ء کا شروع زمانہ تھا جب ان کے گھر والوں نے ہجرت کی ٹھانی باپ نے بڑی عاجزی سے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ کرایہ بھیج کر ان سب کو بلالیں۔ بہن اور چچی کے بھی خوشامد سے بھرے خط آئے۔ وہ مدت سے حالات کی تیز دھوپ میں جھلس رہے تھے اور اس تناور درخت کی گھنی چھاؤں میں ستانا چاہتے تھے۔ (انھوں نے اس کا سایہ ہی دیکھا تھا گھُن کی انھیں خبر نہ تھی) بنّے بھیّا کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو ان کا دل بہت بڑا ہوگیا۔ انھوں نے اپنے نکمے ظالم باپ، اپنی لڑاکا بہن جو بیوہ ہو کر مستقل باپ کے ساتھ رہنے لگی تھی اور ہاتھ مروڑ کر پیسہ چھین لینے والی چچی کو معاف کر دیا۔ اور انھیں ایک معقول رقم بھیجدی۔ ساتھ ہی ماموں کو بھی جواب دیتا اثر ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کی دعوت دی۔ ماموں نے انھیں لکھا۔ وہ صرف صدف کے لئے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس سال اس نے بی۔ اے کر لیا ہے اور یہاں ایک رشتہ ان کی نظر میں ہے۔ لڑکا ٹریننگ کے لئے گیا ہوا ہے واپس آئے تو صدف کا بیاہ کر کے وہ بھی ان کے پاس آجائیں گے مگر تحصیلدار صاحب کی قسمت میں بیٹی کو آباد دیکھنا نہ تھا۔ وہ اچانک بیمار پڑے اور چند دن کے اندر ختم ہوگئے۔

صدف اور صبوحی گھر والوں کے ساتھ ان کے پاس آگئیں۔ صدف ان کے سینے پر سر رکھے دیر تک آنسو بہاتی رہی وہ بیس اکیس سال کی ایک خوبرو دوشیزہ تھی۔ سرو قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور گلاب جیسے رخسار صبوحی بھی کچھ کم خوبصورت نہ تھی (نفیسہ ان کے سامنے بالکل تھوا لگتی تھی) سفر کی تکان اترتے ہی صدف نے ان سے مطالبہ کیا۔

بھیا۔ صبوحی نائنتھ پاس کر چکی ہے میں اس کا سرٹیفکیٹ لیتی آئی ہوں آپ اسے یہاں کسی ہائی اسکول میں داخل کر دیں۔

وہ اکدم سخت ہوگئے — سنو صدف! میں لڑکیوں کی اتنی تعلیم کا قائل نہیں ہوں جتنا تم دونوں نے پڑھ لیا ہے بس یہی کافی ہے میں تو اب اس فکر میں ہوں کہ موزوں رشتے مل جائیں تو تم دونوں کے ہاتھ پیلے کر دوں۔

مگر بھیا۔ صبوحی نے کہا — باجی کا رشتہ تو ابا میاں طے کر گئے ہیں۔ اتنے اچھے ہیں ہمارے اطہر بھائی بالکل جیسے کہیں کے شاہزادے ہوں۔

صدف کے چہرے پر رنگ آگیا۔ اس نے کہا — بھیا ابا میاں کی زندگی میں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں ایم اے کروں گی۔ اور صبوحی کو بھی اتنا ہی پڑھاؤں گی۔

وہ پر امید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

تم سمجھ لو کہ تمہاری وہ سوچ انہیں کے ساتھ خاک میں مل گئی۔ (بتنے بھیا تمہیں اس بے چاری لڑکی کا دل یوں نہیں توڑنا چاہیئے تھا)

روتے روتے صدف کی ہچکی بندھ گئی مگر وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے صبوحی کا پورا دسویں کا کورس بھی غائب کر دیا جو ہر رات صدف اسے پڑھایا کرتی تھی اور ایک ایک کر کے وہ ساری قیمتی کتابیں بھی جو وہ اپنی جان سے لگا کر لائی تھی ضائع کر دیں۔ اور وہ احتجاج تک نہ کر سکی۔

پھر ایک دن اس نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا —

دد جب تحصیلدار صاحب کا انتقال ہوا میں ٹریننگ پر گیا ہوا تھا۔ آیا تو امی سے سارے حالات معلوم ہوئے۔ اس نے اپنی ماں کا خط ان کے آگے رکھ دیا — جس سے انہیں پتہ چلا کہ ان کے مرحوم ماموں نے صدف کے لئے جسکا انتخاب کیا تھا یہ وہی تھا۔ انہوں نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ موزوں قد، متناسب جسم، آنکھوں میں گہرائی اور محبت کی چمک، چہرے پر سفر کی تکان کے باوجود بشاشت، اور ہونٹوں پر تبسم۔ کتنا مناسب جوڑ تھا صدف کا۔ اچانک ایک ناگ نے ان کے سینے میں پھن اٹھایا — سلطانہ کا شوہر بھی ایسا ہی رہا ہوگا — پھر ان کی رگ رگ میں ناگ پھنکارنے لگے۔

نہیں — نہیں — نہیں —

انہوں نے زندگی میں پہلی بار مکاری سے کام لیا۔

مجھے افسوس ہے نوجوان تم نے دیر کر دی۔

اس کے چہرے سے بشاشت کافور ہوگئی — آپ کا مطلب — مطلب ہے . . . . .

ہاں — انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا — میں نے صدف کا یہاں ایک اچھی جگہ رشتہ کر دیا ہے۔ اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر بادل نے سایہ کر لیا — سنبھل کر ایک نئی امید کے ساتھ اس نے پوچھا۔

کیا آپ نے اس دوسرے رشتے کے لئے صدف سے پوچھا تھا ـــ
بنے بھیا تھوڑا سا ہچکچائے تھے کہ ناگ نے پھر اپنا خوفناک پھن اٹھایا۔
ہاں ـــ جو کچھ ہوا ہے اس کی مرضی سے ہی ہوا ہے۔
اچھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا ـ اور گریزاں امید کے آنچل کو پکڑنے کی ایک آخری کوشش کی۔
کیا میں ان سے مل سکتا ہوں ـــ ؟
نہیں ـــ میں پردے کا قائل ہوں ـ اس پر سختی سے عمل بھی کرتا ہوں۔ پھر شاید صدف بھی ایک اجنبی سے ملنا پسند نہ کرے ـــ

اجنبی ـــ وہ اکدم اٹھ کھڑا ہوا ـ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈیوڑھی سے نہیں گلی سے بھی نکل گیا جیسے اگر وہ ذرا دیر وہاں اور رک گیا تو شاید حواس کھو بیٹھے۔ بنے بھیا کا دل چاہا کہ دل کھولکر ہنسیں ـــ میں نے بھگا دیا اسے ـــ آیا تھا بڑا کہیں سے لاٹ صاحب کا بچہ ـــ

چچی پرانے زمانے کی تھیں لرز کر رہ گئیں ـــ برا کیا بیٹا تم نے ـــ یہ تمھارے ماموں کی خواہش تھی۔
سنیئے چچی ـــ یہ میرا گھر ہے ـــ یہاں آپ کو میری مرضی کے مطابق چلنا ہوگا اور بس۔
چچی اپنا سا منھ لیکر رہ گئیں ـــ صدف نے سب کچھ سن کر ان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو ـــ
"کیا محبت اور اعتماد کا صلہ یہی ہوا کرتا ہے"

پھر مہینوں وہ بیماری جھیلتی رہی ـــ زیادہ وقت وہ بے سدھ پڑی رہتی ـ اور ہوش میں آکر چاروں طرف یوں دیکھتی تھی جیسے ہر طرف گھپ اندھیرا ہو ـ اور اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ ان دنوں بنے بھیا کی ایک کیمسٹ سے دوستی تھی جوان کی بچیوں کے لئے پیرا مین اور کیسٹر آئل مفت دیا کرتا تھا۔ انھوں نے صدف کا رشتہ اسے دینے کا طے کر لیا ـ تب ایک دن صدف ان کے گھر سے چلی گئی ـ اسے دوسرے شہر کے ایک ہائی اسکول میں جگہ مل گئی تھی اور جب وہ انتہائی برہمی کے عالم میں اسے طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے تھے اسنے کہا۔

بھیا! میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنی امنگوں، اپنی آرزوؤں، حتیٰ کہ اپنی زندگی تک کو خاک میں ملا دیا مگر صبوحی کی امنگوں، اسکی آرزوؤں اور اس کی زندگی کو خاک میں نہیں ملا سکتی ـ اس کے لئے تو مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا ـ برہمی کے عالم میں وہ جو کچھ کہہ سکتے تھے انھوں نے کہا وہ پھر کچھ نہیں بولی ـ چپ چاپ سر جھکائے لرزتے ہاتھوں سے سامان کی پیکنگ کرتی رہی ـ اسکا کمزور جسم لرز رہا تھا وہ بڑی مشکل سے سسکیوں کو روک رہی تھی مگر جب بھیانے اسے آخری دھمکی دی ـــ
یاد رکھو ـــ آج سے ہمارا ہر تعلق ختم ہے ـ اب ہم میں سے کوئی بھی تمھیں نہیں پوچھے گا ـ تو اس نے سر اٹھا کر آنسو خشک کئے اور کہا۔

"خدا تو ہے ـ"

لہجے کا یقین بنے بھیا کے دل میں اتر گیا ـ انھوں نے ایک جھرجھری سی لی اور کمرے سے نکل آئے۔
دل کا سکون کہاں ملے گا ـــ ؟ ایکدن انھوں نے خود سے سوال کیا ـ وہ بہت دنوں سے روحانی کرب کے ساتھ ساتھ

مادی کرب میں بھی مبتلا تھے ۔ ہر سال ان کی زندگی کے ویرانے میں ایک پھول مسکراتا اور فوراً ہی مرجھا جاتا ۔ نفیسہ کی صحت، تخلیق کا کرب اور بچوں کی موت کا غم جھیل جھیل کر خراب رہنے لگی تھی ۔ ان کی صحت بھی گر گئی تھی گھن اندر ہی اندر انھیں کھوکھلا کر رہا تھا ۔ ادھر کچھ کاروباری حریف بھی پیدا ہو گئے تھے ۔ ہر قدم پر ہر میدان میں انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا ۔ تب ایکدن انھوں نے خدا کو یاد کیا ۔ اس یاد میں انھیں ایک عجیب سی لذت محسوس ہوئی پہلے انھوں نے پانچ وقت کی نماز پابندی سے شروع کی پھر تہجد، اشراق اور درود وظائف کا دور آیا ۔ آخر میں چلہ کشی تک نوبت پہنچ گئی ۔ وہ شہر شہر گھوم کر پیروں فقیروں سے ملتے نئے نئے وظیفے اور عمل سیکھتے اس آوارہ گردی میں بھی ایک لذت تھی ۔ نفیسہ روتی رہی ان کے حریف میدان جیتتے رہے ۔ کاروبار چھٹ ہوتا رہا ۔ لڑکیاں باپ کے پیار کو ترستی رہیں اور وہ چلے کھینچتے رہے ۔ ایکدن وہ مسجد سے گھر لوٹ رہے تھے داڑھی بڑھی ہوئی، کپڑے میلے، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ سر پر ایک میلی سی ٹوپی ۔ جب وہ بازار سے گزر رہے تھے ایک نئے ماڈل کی کار ان کے قریب آ کر رک گئی ۔ ایک خوش پوش نوجوان نے اتر کر ایک خوبصورت لڑکی کو اترنے میں مدد دی ۔ ان کے حواس جواب دینے لگے ۔ وہ لڑکی بالکل سلطانہ جیسی تھی ۔ جس طرح ایک بے تکلف دوست اپنے بچھڑے ہوئے شناسا دوست کا چہرہ دیکھکر بیقراری سے بڑھتا ہے بنے بھیا بھی اس کی طرف لپکے تب ہی وہ نوجوان ان کے درمیان آ گیا ۔

اے ـــ کون ہو تم ـــ اسنے انھیں ڈانٹا ـــ

کوئی بھکاری معلوم ہوتا ہے ـــ سلطانہ جیسی لڑکی نے کہا ـــ اور ایک چونی کھٹاک سے ان کے پیروں میں آ گری ۔

وہ ان کی خدا پرستی کا آخری دن تھا ۔ اگر خدا اپنے پرستاروں کو ایسا ہی ذلیل کراتا ہے تو وہ باز آئے ایسی خدا پرستی سے (بنے بھیا تم عبادت میں بھی کاروبار کرنے چلے تھے) ـــ صدف ایکدفعہ چچی کے مرنے میں ان کے یہاں آئی تھی وہ ایم اے کر کے کسی کالج میں جونیئر لیکچرر کی پوسٹ پر کام کر رہی تھی ۔ صبوحی تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی ۔ وہ ان سب سے یوں ملی جیسے درمیان میں کوئی حادثہ ہوا ہی نہ ہو ۔ بنے بھیا دور کھڑے اسے دیکھتے رہے ۔ (تم جانتی ہو کہ میں نے اسے بھگا دیا تھا جس کے خواب تم نے ساری عمر دیکھے تھے ۔ جسکا انتظار تم نے ساری عمر کیا تھا پھر بھی تم مطمئن ہو ۔ کیا زندگی کی ویرانی اور راتوں کی تنہائیاں تمھیں ڈستی نہیں ہیں ـــ ؟) اس سوال کا جواب بہت دن بعد انھیں ملا جب ان کی لڑکیوں نے بتلایا ۔ کہ وہ انھیں کتنا پیار کرتی تھی اور پیار کرتے کرتے کس طرح رو پڑتی تھی ـــ ابا جان! وہ اتنی پیاری سی تو تھیں ۔ پر وہ روتی کیوں تھیں ـــ ؟

پھر ایکدفعہ انھوں نے اسے صبوحی کی شادی میں دیکھا ۔ کام کی تقریب میں وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی ۔ صبوحی کا دولھا عین میں اسی نوجوان کی طرح تھا جو صدف کا خواستگار بن کر آیا تھا ۔ یا جیسا انھوں نے سلطانہ جیسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا ـــ زندگی سے بھرپور شگفتہ اور شاداب ـــ ان کے سینے میں ایک شعلہ سا لپکا ۔ اور انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا ـــ

نہیں ـــ نہیں ـــ نہیں ـــ

اسی وقت دلہن بنی ہوئی صبوحی ان کے پاس رخصتی کے سلام کے لئے آئی ۔ صدف ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کو گود میں لئے اس کے ساتھ ساتھ تھی ان سے ملکر صبوحی نے کہا تھا ۔

بھیا! اگر آپ اطہر بھائی کے معاملے میں بے جا ضد سے کام نہ لیتے تو آج باجی یوں تنہا نہ ہوتیں ۔

اور بہن کے شانے پر جھک کر وہ بلک پڑی تھی ---- اور جب پھولوں سے لدی کار دولہا دلہن کو لیکر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو انھوں نے صدف کی طرف دیکھا۔ وہ ستون کا سہارا لئے کھڑی تھی اور اس کی دھندلائی ہوئی نگاہیں دور افق میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ آج بھی اس کے دیکھنے کا وہی انداز تھا جیسے اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا ہو اور اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔

ان کے گلے میں پھندا سا پڑا۔ اور وہ کھانستے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نفیسہ دوا کی پڑیا لئے ہوئے کھڑی تھی۔ انھوں نے اجنبی اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ---- یہ کون تھی ---- یہ موٹی سی تھل تھل کرتے جسم والی عورت اور یہ لڑکیاں جو اس کے پیچھے کھڑی خوفزدہ نگاہوں سے انھیں کھانستے ہوئے دیکھ رہی تھیں ---- ان کے لئے آج تک کسی نے ان کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا ---- کوئی خوابوں کا شہزادہ ان کا خواستگار بن کر نہیں آیا تھا۔ زندگی نے انھیں یہی کچھ دیا تھا۔ یہ چند اجنبی چہرے، افلاس، اور یہ جان لیوا کھانسی۔ کھانسی کی شدت سے ان کا چہرا پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ چہرا اور آنکھیں خشک کر کے انھوں نے صدف کا خط ایکدفعہ پھر پڑھا۔ یہ نفیسہ کے اس خط کا جواب تھا جو اس نے ان کی چوری سے اسے لکھا تھا جس میں ان کی بیماری، اور اپنی غربت کا حال لکھ کر اس نے مدد کی درخواست کی تھی۔ اسنے نفیسہ کو لکھا تھا۔

بھابی ---- آپ بھیا اور بچیوں کو لیکر یہاں آجائیں یہاں کئی اچھے ڈاکٹر ہیں مجھے امید ہے بھیا ضرور صحتیاب ہو جائیں گے
(یہ روگ بنے بھیا کسی بھی ڈاکٹر کے بس کا نہیں ہے)

لڑکیوں کے لئے اس نے لکھا تھا ---- ان کی آپ فکر نہ کریں میں انھیں تھوڑا بہت پڑھا لوں گی پھر ہم مل کر ان کے لئے اچھے رشتے تلاش کریں گے ---- آخر میں لکھا تھا۔ مجھ سے جتنی بھی ہو سکے آپ کی مدد کروں گی ----

اور پھر تم مس صدف عطا اللہ تم جو جونیئر لیکچرر سے ترقی کر کے اب ایک مقامی کالج کی پرنسپل ہو تم مجھے میری خامیاں گناؤ ---- تم بہت اونچی بہت بزرگ بنکر مجھے بتاؤ کہ کیوں میرا ہر تجربہ ناکام رہا اور کیوں ایسا ہوا کہ میری عبادت بھی رائیگاں گئی۔ اور تمہارا عشق بھی عبادت بن گیا ---- وہ کونسا راستہ تھا جسے ساری عمر بھٹک کر بھی میں نہ پا سکا۔ اور جس پر چلکر تم ایک ہی جست میں منزل پر پہنچ گئیں۔

اگر بھیا آپ نے اعلٰے تعلیم حاصل کی ہوتی۔ اگر بھیا آپ نے اطہر کو دھوکہ نہ دیا ہوتا۔ ....
اگر بھیا آپ نے لڑکیوں کو تعلیم دلائی ہوتی ....

تو مس صدف عطا اللہ میں تمھیں یہ سب کچھ کہنے کا موقع نہیں دوں گا۔ میں تمھیں یہ موقع نہیں دوں گا کہ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔

خط مٹھی میں مسل کر انھوں نے آتشدان میں ڈالدیا۔ ایک ننھا سا شعلہ سانپ کے پھن کی طرح لہرایا۔

نہیں - نہیں - نہیں ....

مشرف احمد

ماچس والا

وہ فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں بیچنے والے کے پاس کھڑا ہوا کتابیں اور رسالے دیکھ رہا تھا کہ بھاری تھل تھل کرتا جسم اس کی کمر سے لگا اور بائیں پاؤں سے اس کی موٹی بید کی لکڑی ٹکرائی۔ ہجوم میں لوگوں کا ٹکرا جانا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوتی۔ اس نے پلٹ کر جلدی سے دیکھا۔ اتنے میں وہ اپنی لاٹھی کو بائیں طرف سرکا کر ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتا چند قدم آگے جا چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر کٹ پیس بیچنے والے نے سامنے والے کو مخاطب کر کے کہا۔

"لو بھئی آ گئے بادشاہ!"

سامنے والا فٹ پاتھیا تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے لکڑی کے سہارے چلنے والے موٹے بھاری جسم کی دونوں ٹانگوں میں اپنا ہاتھ دے دیا اور بولا۔

"کیوں بے ماچس دیگا"؟

زمین کی رنگت کے کورے لٹھے کے کپڑے پہنے ہوئے اس نے اپنی محافظ لاٹھی کو مدافعت میں ہلکے سے گھمایا۔ اس کے چہرے پر ایسا رنگ آیا جو صرف مظلوم اور بیکس لوگوں ہی کا حصہ ہوتا ہے اور پھر دھیمے، بجھے ہوئے لہجے میں، ٹیکسیوں، بسوں، اور راہگیروں کے ہجوم میں اس کی آواز "ماچس لے لو، ایک لمحے کو گونجی اور ساری بے ہنگم آوازوں میں گڈ مڈ ہو گئی۔ وہ جو خود دکھی دل کا مالک تھا آگے بڑھا اور اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے چوڑے اور بڑے کالے چہرے کو گرد اور پسینے کے مرکب نے مل کر عجیب سا رنگ دے دیا تھا۔ حلقوں میں ابھرے ہلکے سبز رنگ کے کانچ کی گولیاں باقی رہ گئیں تھیں جیسے ان آنکھوں کی سیاہی کو کسی نے کمال احتیاط سے کھرچ ڈالا ہو۔ اس طرح کہ کھرچنے کے نشان بھی باقی نہ رہ گئے ہوں وہ اپنے گرد حلقوں میں یوں لگ رہی تھیں جیسے سبز رنگ کے کانچ کی گولیاں دو گدلے پانی کے گڑھوں میں پڑی ہوں۔ بائیں بازو میں اس نے تھیلا لٹکا رکھا تھا جس میں ماچسیں بھری تھیں اور بید کی لمبی لاٹھی اسکے بائیں ہاتھ میں تھی جس سے وہ راستہ تلاش کر رہا تھا اور دائیں ہاتھ میں اوپر نیچے پکڑی ہوئی ڈھیر سی ماچسیں۔ یہ ماچسیں، انکو سہارا نہ بنا کر وہ اس معاشرہ میں باعزت طور پر روزی کمانے نکلا ہے، اور یہ لوگ ــ تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ وہ ماچس خرید کر اس نے آپ کو یوں ہلکا ہلکا محسوس کیا گویا اسے تنگ کرنے والوں سے اس نے بدلہ لے لیا ہو۔

گدلے پانی کے گڑھوں میں پڑی ہوئی دو کانچ کی گولیاں اس کے ذہن پر چھائی رہیں۔ فائلوں کے سادہ کاغذوں، چائے کی پیالیوں، ملنے ملانے والوں کے چہرے پر اسے کانچ کی وہ گولیاں ٹکی ہوئی نظر آتی رہیں۔ سارا دن وہ بے چین رہا۔ شام ڈھلتے ہی وقت مقررہ پر

وہ پھر اسی فٹ پاتھ پر موجود تھا۔ کافی دیر تک وہ وہاں انڈر ویر اور بنیان بیچنے والوں، کتابوں والوں، نائیلون کے پیس بیچنے والوں کے اسٹالوں پر بے مقصد چیزیں دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں کانچ کی گولیوں کی متلاشی تھیں۔ یکایک انڈر گراؤنڈ کے کارنر سے مڑ کر پیرلیان کیفے کی طرف آتے ہوئے وہ اسے فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا نظر آگیا۔ یوں جیسے ایک دم کوئی واقعہ ظہور میں آجائے۔ وہ جلدی سے پیرلیان کیفے کی طرف چل پڑا۔ اور فٹ پاتھ کے اختتام پر جاکر پھر واپس پلٹا۔ اتنے میں ٹھک ٹھک کی آواز پیدا دیزاں وہ چہرہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"باباجی، چار ماچس دیدینا"

"اچھا جناب!" تھکی اور مغموم آواز سنائی دی۔ اور ساتھ ہی اس چہرے کا دہانہ پھیل گیا۔

ماچس جیب میں ڈال کر وہ تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

فٹ پاتھیوں، غریب ہاکروں اور معذور لوگوں سے چیزیں خریدنے کا اسے خبط تھا۔ لیکن اس سے پہلے کسی واقعے اور کسی شخصیت نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کا سکون جیسے ہر لمحے چھن سا گیا ہو، ہر جگہ، کتابوں کے صفحوں پر، بیوی کے چہرے اور رواں دواں ہجوم کے چہروں پر اسے وہ کانچ کی گولیاں نمایاں نظر آتیں۔ بچوں کی ہنسی کی کھنک میں اسے کانچ کی گولیوں کے آپس میں ٹکرا جانے کا شبہ ہوتا۔ بستر کی سفید چادر پر اسے ہر طرف کانچ کی گولیاں بکھری نظر آتیں۔ راتوں کو سوتے میں وہ چونک چونک اٹھتا جیسے اس کے جسم میں بستر پر بکھری ہوئی گولیاں چبھی جارہی ہوں۔

ماچس خریدتے ہوئے اسے کافی دن گذر گئے۔ روز روز ماچس پاکر اس کی بیوی گھبرا گئی۔ کہ نہ جانے یہ اتنے ماچس ہر روز کہاں سے مل جاتے ہیں جب کہ وہ کسی ایسے محکمے میں بھی نہیں جہاں رشوت چلتی ہو یا جہاں ماچس امپورٹ ایکسپورٹ کرنے کے لائسنس ملتے ہوں۔ آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"آخر تم یہ روزانہ اتنے ماچس کہاں سے لاتے ہو"؟

پالنے میں لیٹے گڈو کی کلکاری کمرے میں گونجی — جیسے بہت ساری کانچ کی گولیاں ٹکرا گئی ہوں۔ ایک لمحے میں وہ وہاں نہیں تھا۔

"سبز رنگ کی کانچ کی گولیاں میرے تعاقب میں ہیں" دھیرے سے اس نے کہا۔

"کیا کہا — کون؟"

"ارے بھئی کچھ نہیں — وہ باقر دے جاتا ہے اپنا دوست۔"

وہ بہت پریشان ہوگیا تھا۔ رات کو وہ یہ فیصلہ کرکے سویا کہ کل سے وہ ماچس نہیں خریدے گا۔ اس کے حالات اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ لیکن صبح سے شام تک دفتر کے اوقات کے درمیان کانچ کی گولیاں اسے بلاتی رہیں۔ وقت مقررہ پر پھر وہ وہاں موجود تھا۔

"چار ماچس بابا"

ماچس جیب میں ڈال کر وہ گھر جانے کے بجائے پارک میں چلا آیا اور روشن روشوں اور لوگوں کے ہجوم سے گذرتا ہوا ایک تاریک گوشے کی بینچ پر آکر بیٹھ گیا اگر ماچس لے کر گھر جاؤں گا تو بیوی کے طعن و تشنیع سننے پڑیں گے۔ لڑائی جھگڑا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک بچے کو روک لیا۔

ماچس لوگے بیٹے، یونہی مفت

"نہیں مجھے نہیں چاہئیں ـ" بچہ خوفزدہ ہوکر تیزی سے بھاگ گیا۔

ہنہ۔ وہ پریشان ہوکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ پھر چاروں ماچسوں کو جیب میں سے نکال کر اس نے آہستہ سے بنچ کے کونے پر رکھیں اور اور اٹھ کر چل دیا۔

ماچس خریدنے کا جنون حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اب خود خریدنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کسی نہ کسی دوست کو بھی اس راہ سے لیکر گذرتا۔ خود بھی خریدتا اور دوستوں کو بھی مجبور کرتا کہ وہ بھی خریدیں۔ اس کی اس عادت سے دوست جلد ہی گھبرا گئے دفتر میں اس کے دوست مذاق اڑاتے کہ آج کل وہ ایک ماچس والے کا کمیشن ایجنٹ بن گیا ہے۔ لیکن وہ حسب معمول پابندی سے ماچس خریدتا رہا۔

گھر میں ماچسوں کا ڈھیر لگتا گیا اور اسی اعتبار سے اس کی بیوی کا پارہ چڑھتا گیا۔ گھر کے سکون اور خوشی میں بھی فرق آنے لگا۔ کبھی کبھی تلخ کلامی کے بعد یہ بھی ہوتا کہ رات کو بغیر کھانا کھائے ہی سونا پڑتا پُرسکون ازدواجی زندگی کے لمحے کہیں کھو گئے تھے اور عورت جو سب کچھ برداشت کر سکتی ہے ــــــــــــــــــــ لیکن اپنی دنیا، اپنا گھر، اپنے محبوب کی چاہت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتی اور تنگ آکر زبان کا سہارا لیتی ہے۔

"میں کہتی ہوں اس اندھے فقیر کو کسی کی آئی لے جائے جس نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے" وہ لرز لرز جاتا ــ نہ جانے عورتوں کی زبان میں کیا طاقت ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاید ہم سبھی عورتوں سے مرعوب ہے۔

"بس چپ کرو جی" ــ وہ حکم اور التجا کے ملے جلے لہجے میں کہتا اور ایک موہوم سا اندیشہ اس کے ذہن پر چھا جاتا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بہت دیر انتظار کرنے کے باوجود بھی کسی دن وہ نہ آتا۔ اور اسے اپنی بیوی کی بددعاؤں کے پورا ہو جانے کا یقین سا ہونے لگتا۔ اندھے خیالات چاروں طرف اس کا دل دہلانے کے لئے مکڑی کے جالے کی طرح پھیل پھیل جاتے۔ وہ تنہا، تھکا ماندہ، افسردہ دل گھر واپس لوٹتا۔ اور اگلی شام تک کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ ماچس وہ برابر خریدتا رہا۔ کبھی گھر لیجاتا۔ کبھی لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ کبھی میزوں کی درازمیں ڈال دیتا یا پھر کبھی کسی نالے کے قریب سے گذرتا ہوا ماچسوں کو گندے نالے میں پھینک دیتا۔

اس دن اس نے انتہائی بے چینی سے اس کا انتظار کیا۔ شام ہو چکی تھی۔ نیون سائن روشن ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ نہیں آیا تھا۔ تھک ہار کر وہ جانے ہی والا تھا کہ وہ اسے انڈر گراؤنڈ کے کارنر سے مڑ کر پیرلیسان کیفے کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس کا دل خوشی کے مارے دھڑکا ــ گویا ماچس والا نہیں اس کی محبوبہ آگئی ہو جس کا وہ بہت بے چینی سے انتظار کرتا رہا ہو۔ ٹھک ٹھک کی آواز اور دو اندھی کانچ کی گولیاں لئے اداس چہرہ جس پر جھریاں اتنی بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں جیسے کسی کھلنڈرے بچے نے شوق فضول میں دیوار پر آڑی ترچھی بے ترتیب لکیریں ڈال دی ہوں وہ چہرہ اس کے قریب آتا گیا۔

"بابا چار ماچس"

ماچس خرید کر پیسے دینے کے بعد وہ وہیں کھڑا رہا۔

وہ مانوس چہرہ، لاٹھی لئے ٹھک ٹھک کرتا آگے چلتا گیا۔

"روزنامہ آغاز" ایک ہاکر تیزی سے آواز لگاتے ہوئے اس کے قریب سے گذر گیا۔

تھل تھل کرتا جسم پریسانالٹہ کیفے کارنر سے آگے نکل چکا تھا۔ اور اب فٹ پاتھ کے کراسنگ پر تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر ۔۔۔ کے ڈھیر پر جھک گیا۔

زیں ۔۔۔۔ زیں ۔۔۔۔ زیں ۔ کی آواز ساری آوازوں پر سبقت لے گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس آواز ۔۔۔ ڈرا۔ ایک لمحے کو گلزار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ پر چمکنے والی نیون سائن بھی اور پھر جل گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں ۔۔۔ ن سڑک پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ لاٹھی دور جا پڑی تھی۔ اور جمع ہونے والے ہجوم کے پیروں کے ۔۔۔ ماچس کی سوکھی لکڑی تڑ تڑ چیخ رہی تھی

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے،" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

بیوی، جس سے اس کی اسی وجہ سے بول چال بند تھی۔ دروازے پر عورتوں والی مخصوص مسکراہٹ لئے ـــــ ایسی ۔۔۔ جس کے آگے مرد موم کی طرح پگھل پگھل جاتا ہے۔ صلح کن انداز میں بولی،

"لاؤ آج کی ماچیس"

"خاموش رہو۔ کانچ کی گولیاں ٹوٹ گئی ہیں۔"

اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

ثریا جبین

ہم طنز و مزاح نگار بنے

اللہ جانے کہاں پڑھا تھا مگر پڑھا ضرور تھا کہ شاعر اور ادیب پیدا نہیں ہوتے بنائے جاتے ہیں سو ہم نے اپنے آپکو شاعر بنانے کا فیصلہ کرلیا — اس بات کی بھی بھنک کان میں پڑی تھی کہ ہر شاعر شاعری کرنے سے پہلے استادوں کے کلام سے فیض اٹھاتا ہے ہم نے اس روایت سے بھی پورا پورا فائدہ حاصل کیا اور اتنا کیا کہ ہر شاعر کا دیوان ہمیں ازبر ہوگیا۔ شاعری آئی یا نہ آئی مگر ایک فائدہ ضرور ہوا کہ بیت بازی کے ہر مقابلہ میں اول ہم ہی آتے۔ کسی محفل یا تقریب میں اگر ہم سے پوچھا جاتا کہ بھئی تفریح کے لئے کونسا کھیل مناسب ہوگا تو ہمارا فوری جواب ہوتا بیت بازی۔ اور کسی کھیل میں ہم ماہر تو کیا اناڑی بھی نہ تھے یہی ایک ایسی چیز تھی جس میں جیت ہماری ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ لوگوں نے ہم سے پوچھنا ہی چھوڑ دیا اور تو اور بیت بازی کے مقابلوں میں بھی ہمیں دعوت نہ دی جاتی اس ڈر سے کہ ہم شریک ہوئے اور پہلا انعام گیا۔ خیر تو بات ہو رہی تھی ہمارے شاعر بننے کی۔ ہم نے کمال ہوشیاری سے استادانِ فن کے کلام کو توڑ مروڑ کر اپنا بنایا اور اس استادی سے بنایا کہ اوروں کی تو بات ہی چھوڑیئے اگر خود صاحبِ غزل کو ہماری غزل دکھائی جاتی تو انھیں شبہ نہ ہو پاتا۔ تو صاحب بہزار خرابی تین چار غزلیں تیار ہوگئیں۔ ایک غزل لکھتے ہی یوں نہ چھپوائی کہ ہم تصور میں غزل چھپنے کے بعد کے واقعات کی ایک تصویر بنا بیٹھے تھے۔ سوچا تھا کہ غزل چھپتے ہی ایڈیٹر صاحب کا لمبا چوڑا خط آئے گا کہ محترمہ آپ کا جیسا کلام نہ آج تک پڑھا اور نہ سنا کیا آپ برائے مہربانی اپنی کسی تازہ غزل سے نہ نوازیں گی ہمارے اخبار کو۔ اور یہ صرف ہمیں ہی خبر تھی کہ ایک ہی غزل کہنے میں ہمارا جگر کیونکر خون ہوا تھا۔ بھلا یوں کسی شاعر کی غزل کو اپنے انداز میں اس طرح ڈھالنا کہ کسی کو نقل کا شبہ تک نہ ہو کوئی آسان کام تو نہیں۔ اسی لئے ہم نے پہلے ہی انتظامات مکمل کر لیے تھے کہ ایڈیٹر کا فرمائشی خط آتے ہی دوسری غزل بھی روانہ کرسکیں اور انھیں یہ سوچنے کا موقع نہ ملے کہ کسی اور سے لکھوا کر بھجوائی تھی۔ احتیاطاً دو ایک اور بھی لکھ لی تھی کہ اگر کسی رسالے کے ایڈیٹر کی نظر پڑ گئی اور انھوں نے بھی فرمائشی خط روانہ کر دیا تو مایوس نہ ہونا پڑے۔ کم از کم ہمارے خیال میں تو سچے ادیب اور شاعر کی یہ شان نہیں ہوتی کہ ایک غریب آدمی تو خوشامد کر رہا ہے اور ہم اکڑ جائیں کہ صاحب ہمارا تو لکھنے کا موڈ قطعاً نہیں۔ تو صاحب یہ تمام حفاظتی اقدامات تو ہوگئے مگر اب سوال یہ پیدا ہوا کہ غزل کو کہاں بھیجا جائے۔ ایک دم رسائل میں بھیجنے کے ہم قائل نہ تھے انسان کو قدم بہ قدم راستہ طے کرنا چاہیئے یہ نہیں کہ چھلانگیں مارتا ہوا آگے بڑھے اس میں گرنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اسی خیال کے تحت ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اخبار سے شروع کریں گے مگر دقت یہ پیش آئی کہ کونسے اخبار میں بھیجا جائے۔

اخبار کے نام سے ہمارے یہاں کاغذ کا پرزہ تک نہ آتا تھا وہ یوں کہ ابا جان تو زیادہ تر دورے پر رہتے تھے آج یہاں تو کل وہاں اور جب گھر پر ہوتے تھے تو انگریزی کا اخبار منگا لیتے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ انگریزی کا تو اخبار دیکھ کر ہی ہمارا جی الٹنے لگتا۔ بچیا تھیں، سو انھیں انسان کے مطالعہ سے دلچسپی تھی اور ان کا مقولہ تھا کہ دوسروں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان خود اپنے آپکو پہچانے۔ اور اپنے آپ کو جاننے کا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دن رات آئینہ کے سامنے ہزاروں ڈبے ڈبیاں اور شیشیاں لئے بیٹھی رہتی تھیں اپنا مطالعہ کرتی تھیں اور اپنے میں جو خامی پاتیں اسے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی تھیں۔ جب اس شغل سے تنگ آجاتیں تو اپنی کسی سہیلی کے یہاں چلی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنی سہیلی کا مطالعہ کر سکیں اور سہیلی ان کا۔

اپیا تھیں تو وہ (بقول خود) بڑی گھریلو قسم کی مانی جاتی تھیں اور اسی وجہ سے انھیں کمرشیل سروس سے بڑی دلچسپی تھی۔ بڑے غور سے ایک ایک اشتہار سنتیں اور اس لئے محلہ پڑوس کے لوگ ان سے مشورہ لیتے رہتے تھے کہ کونسا گھی استعمال کرنا چاہیئے؟ گھریلو استعمال کی دیگر اشیاء کہاں سستی ملتی ہیں وغیرہ۔ کمرشیل سروس کی بدولت نیم حکیم (خطرۂ جان) بھی بن گئی تھیں۔ کسی کا کان گرم ہوا اور وہ دوڑا ہوا اپیا کے پاس آیا۔ انھوں نے الماری کی شیشوں پر نظر ڈالی اور اگر وہاں کچھ نہ ملا تو اپنی "کمرشیل سروس ڈائری" پر نظر ڈالی (جس پر اپنے خیال کے مطابق کمرشیل سروس میں بتائی جانے والی ہر ضروری اور اہم چیز نوٹ کر لیا کرتی تھیں) اور کوئی دوا بتادی۔ غرضکہ انھیں اپنے ان تجربات سے ہی فرصت نہ ملتی تھی جو وہ اخبار کی طرف توجہ دیتیں۔

امی کو باورچی خانے کے دھندوں سے کہاں نجات جو وہاں وقت گذاری کے جھمیلوں میں پڑتیں اور ویسے بھی بقول ان کے ان موٹے نگوڑے اخباروں میں ہوتا ہی کیا ہے سوائے مار پیٹ کی خبروں کے۔ رہ گئے ہم تو بھئی ہم فضول خرچی کے قائل نہ تھے ہمیں خبروں سے واقعی بڑی دلچسپی تھی مگر پیسے خرچ کر کے کیوں حاصل کی جائیں جبکہ ہمیں مفت میں ہر قسم کی خبریں سننے کو مل جائیں اخبار پیسوں سے آتا اور خالہ جنتو ہمیں مفت میں بڑی چٹپٹی خبریں سنا جاتیں حتیٰ کہ وہ بھی جو کسی اخبار میں آہی نہ سکتی تھیں۔ خبریں کی خبریں مل جاتیں اور خرچ کچھ بھی نہ کرنا پڑتا کیونکہ چائے سے خاطر تواضع صرف ان لوگوں کی ہوتی تھی جو بقول امی خاص الخاص ہوتے تھے (اور یہ خاص الخاص کون اور کیوں ہوتے تھے ہمیں کبھی نہ پتہ چل سکا!) یا پھر ابا جان کے دوستوں کے لئے تو خالہ جنتو نہ تو خاص الخاص تھیں اور نہ ابا جان کی دوست اس لئے چائے پانی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں پان وہ خوب کھاتی تھیں مگر ڈبیہ بٹوہ ساتھ رہتا تھا سو اس کی بھی ہمیں فکر نہ کرنی پڑتی۔ الٹا وہ ہمیں ہی ایک دو پان کھلا جاتیں (چاہے اسی رشوت میں ہی کیوں نہ کھلاتی ہوں کہ محلہ میں کوئی ان کو لفٹ نہ دیتا تھا سوائے ہمارے)۔ اللہ جانے کیوں امی کو ہماری اور خالہ جنتو کی دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور ان کے جانے کے بعد ہمیں فوراً یہ خبر سناتیں کہ ہم میں تو لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہ رہی" بلکل ہی ٹھرڈ کلی ہو کر رہ گئی لڑکی تو!!!" اور تب ہم بڑے غور سے آئینہ میں اپنے آپکو دیکھتے یا اللہ اچھی خاصی لڑکی تو ہیں۔ شلوار، قمیص، لمبی سی چوٹی کانوں میں بندے اور بھلا امی کیا چاہتی ہیں۔ اور کیسی ہوا کرتی ہیں لڑکیاں ــ؟

خیر تو ہماری اس مشکل کا کہ غزل کہاں چھپوائی جائے حل یوں ہوا کہ ابا دورے سے لوٹے تو پتہ نہیں کیا سوچ کر اردو کا ایک اخبار منگوانا شروع کر دیا۔ اس اخبار کے علاوہ بھی دو ایک اخبار اور منگا لیتے اور ہر ایک کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کرتے کہ کس میں کس قسم کی غزلیں آتی ہیں اور کس میں اپنی غزل چھپنے کے "چانسز" زیادہ ہیں۔ خیر جی ایک اخبار چنا اور اللہ کا نام لے کر

ایک غزل بھیج ایک زرہ دار خط کے روانہ کردی۔ دن پہ دن گذرتے گئے مگر غزل نہ آج آتی ہے نہ کل۔ جب کافی دن گذر چکے تو ہم نے ایڈیٹر صاحب کو سخت خفگی کا خط لکھا کہ صاحب آپ عجب کور ذوق انسان ہیں آپکی جگہ کوئی اور ہوتا تو سر آنکھوں پر جگہ دیتا ہماری غزل کو اور یہ کہ آپ کو کوئی حق نہیں کہ پبلک کو ایسی عظیم تخلیق سے محظوظ ہونے سے محروم رکھیں اور مزید یہ کہ آپ کو فوراً ہماری غزل چھاپنی چاہئیے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے خط پہ خط لکھے گئے مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان صاحب پہ تو کسی بات کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ خیر ہمنے ایک بار اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا اور اس بار یہ کیا اس اخبار میں دوسری غزل اور باقی تینوں غزلیں تین مختلف اخباروں میں روانہ کردیں اور اشاعت کا انتظار کرنے لگے مگر لگتا ہے جیسے تمام اخباروں کا ایڈیٹر ایک ہی آدمی تھا کسی بھی غزل کا اثر نہ ہوا اور تب ہمنے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم مختلف اخباروں میں مختلف ناموں سے مراسلے بھیجیں گے کہ صاحب یہ ایڈیٹر بڑی دھاندلی کرتے ہیں مگر افسوس کہ یہ اسکیم عمل میں لانے کی نوبت ہی نہ آئی۔

ان ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر ہمنے سوچا کہ بھئی شاعری تو بہت جان جوکھوں کا کام ہے خواہ مخواہ "غزلیں بنانے" میں اتنی "انرجی" بھی ضائع ہوتی ہے اور پیسہ بھی اور کیا ان چار پانچ غزلوں کے پیچھے نہ جانے کتنے روپے کے لفافے آگئے ــــ لاحول ولا۔ اس سے اچھا تھا کہ ہم افسانہ نگار بن جاتے مزے سے افسانے لکھا کرتے نہ کہیں دیوانوں میں سر کھپانا پڑتا نہ اتنا چلانا پڑتا۔ جو افسانہ بھیجتے جھٹ سے چھپ جایا کرتا اور کچھ ایسی محنت بھی نہ کرنی پڑتی جب دل چاہا بیٹھے اور گھنٹہ بھر میں اچھا سا افسانہ تیار۔ افسانہ لکھنے کا ارادہ تو کرلیا مگر اب مصیبت یہ آن پڑی کہ لکھے کیسے جائیں۔ ہمیں کبھی ان افسانوں کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ لو بھئی اچھی خاصی کوئی محترمہ چلی جارہی ہیں کہ ایک عدد سائیکل ان سے ٹکرا جاتی یا وہ سائیکل سے ٹکرا جاتی ہیں اور اس کے بعد جو قصہ چلتا ہے تو شادی پر ہی جا کر رکتا ہے یا کبھی کبھار کسی کی موت پر۔ یا پھر کوئی محترمہ مصیبتوں میں گھر جاتی ہیں اور کوئی محترم آن کر ان کو اس مصیبت سے نجات دلاتے ہیں اب ان کا احسان مند ہونا تو لازم ہی ہے۔ اور اس کے بعد ــــ تو یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ ان حادثات کی تلاش میں ہم بہت سرگرداں پھرے ہیں۔ ایک بار بھی ایسا "حادثہ" اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو کام آسان تھا۔

ایک بار کیا ہوا کہ ہم اپنی دھن میں مگن جارہے تھے کہ ایک سائیکل سوار ایک صاحبہ سے ٹکرا گئے۔ قدرت خدا کی وہ صاحبہ کوئی طالبہ تھیں۔ کتابیں وغیرہ ہاتھ میں لئے جارہی تھیں ٹکراتے ہی وہ سب کتابیں بکھر گئیں۔ سائیکل سوار نیچے اترے اور ہم یہ دیکھتے ہی ایک ماہر فوٹوگرافر کی طرح "جائے واردات" کی طرف لپکے کہ کچھ سن گن لے سکیں مگر ہوا یہ کہ ان صاحب نے کتابیں سمیٹ کر نہایت بے نیازی سے ان محترمہ کو دیں جنہوں نے نہایت سرد مہری سے شکریہ کہا اور دونوں چلدیئے۔ "شادی شدہ ہوگا بے چارہ" ہمنے ہمدردی سے سوچا اور ان کے مستقبل سے مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہوگئی کہ ہم افسانہ نگار ہرگز نہیں بن سکتے۔

اب صرف ایک ہی میدان رہ گیا تھا اور بقول کسے ہم اس میں تو پہلے ہی سے ماہر تھے چنانچہ ہمنے فیصلہ کیا کہ اب ہم طنز و مزاح ــــ کے میدان میں قدم رکھیں گے۔ اپنے اس ارادہ کو اپنے تک محدود رکھا اور ایک عدد مضمون لکھ لیا۔ لکھا کیسے یہ ایک راز ہے جو ہم کبھی کسی پر آشکارا نہ کریں گے۔ اس مضمون پر خوب ہی دعائیں پڑھ کر پھونکیں اور منت مانی کہ یہ شایع ہو جائے تو ہم دو پیسے کی شیرینی بانٹیں گے۔ مضمون بھیجا اور سراپا انتظار بن کر بیٹھ رہے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اب کی بار سلسلے میں قسمت آزمائی کی تھی کافی دن گذر گئے تو پریشانی لاحق ہوئی۔ یا اللہ کیا قوم کی بدقسمتی ہے کہ رسالوں، اخباروں کے ایڈیٹر اسے ہم جیسے ادیبوں کی تخلیقات

سے محروم رکھ رہے ہیں۔ ایک دو ہفتے خطوط کی دھاک بٹھائی ہے تو ایڈیٹر صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ خوشامدیں کیں، التجائیں کیں ۔ دھمکیاں دیں اور آخر کار ہمارے حربے کارگر ثابت ہوئے وہ یوں کہ مضمون شائع ہو گیا۔

مضمون دیکھتے ہی ہم نے گھر بھر کے تمام حضرات کو جمع کر کے اعلان کر دیا کہ بس ہم طنز و مزاح نگار بن رہے ہیں۔ ہمارے اعلان کا عجیب ردعمل ہوا۔ گھر بھر پہ سناٹا طاری ہو گیا۔ کہاں تو ایک شور ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی مار دھاڑ، امی کی ڈانٹ پھٹکار، بجیا کی جھنجھلاتی ہوئی آواز جس میں وہ ہر وقت اسی سے کسی نہ کسی بات کی شکایت کرتی رہتی تھیں۔

"پپو میری کریم کی شیشی لے گیا"

"گڈو نے سینٹ گرا دیا"۔

"گڑیا میری نیل پالش لگا رہی تھی"

"اور پھر اپیا کی آواز جو چھٹے پالس سے کسی صورت کم نہ تھی مگر پھر بھی انھیں اس کے بارے میں غلط فہمی تھی اور اس حسین آواز پر طرہ یہ کہ ہر اشتہار کو نہ صرف سنتی تھیں بلکہ ریڈیو کی آواز سے آواز ملا کر گانے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔ غرضیکہ ہر قسم کی آوازیں نہ جانے کہاں غائب ہو کر رہ گئیں۔ بجیا کی غصیلی آواز بہت کم سنائی دیتی۔ اپیا کے ریڈیو کی آواز بھی کم ہو گئی اور وہ اب بجائے گانے کے صرف گنگنانے پر اکتفا کرتی تھیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی شرارتیں، بدتمیزیاں، اور لڑائیاں ختم تو خیر کیونکر ہو سکتی تھیں مگر امی مستقل ان کا گلا گھونٹے رکھتیں اور روزانہ معمول کے مطابق تو نہ ڈانٹیں مگر آہستہ آہستہ انکو ہدایتیں دیتی رہتیں اور اگر ہم سامنے ہوتے تو کسی دوسرے کمرے میں جا کر علیحدگی میں ڈانٹتیں۔ چھوٹے بچے جو یا تو ہر وقت ہمارے سر پہ سوار رہتے تھے یا اب دور دور بھاگنے لگے تھے۔ پاس آتے تو ایسے ڈرے سہمے جیسے ہم ابھی خنجر نکال کر سر قلم کر دیں گے بجیا اور اپیا دونوں الگ الگ رہنے لگیں امی بھی یوں بات کرتیں جیسے کسی بات کا ڈر سوار ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ آخر ہم سے ایسا کیا جرم سرزد ہو گیا جس کی یہ پاداش بھگتنی پڑ رہی ہے۔ دریافت حال کیا تو نہایت گول مول جواب ملے۔

"لو بھئی ہم لوگ ویسے ہی تو ہیں جیسے تھے"۔ "تمہیں تو خواہ مخواہ غلط فہمی ہو گئی"

"لڑکی دماغ تو ٹھیک ہے بھلا۔ مجھے کیا ہونا تھا اچھی بھلی تو ہوں"۔

اُوسان جوابات پر ہم حیران ہو ہو کر رہ گئے۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو گھیرنے کی کوشش کی مگر وہ مختلف بہانے بنا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم نے بھی زیادہ کرید نہ کی ادیبوں کو بھلا ان بکھیڑوں میں پڑنے کی فرصت کہاں۔

اب مضمون کے لیے موضوع کی تلاش ہوئی تو بہت سے موضوعات ذہن میں آئے اور ہم نے سوچا کہ خالہ جنتو پر لکھیں وہ سب سے زیادہ موزوں ثابت ہونگیں۔ یہ فیصلہ کیا تو دل پر سے بوجھ اتر گیا۔ مضمون لکھنے بھی نہ پائے کہ اسی دن ابا دورے سے لوٹ آئے۔ رات میں کچھ تھک ہار کر لیٹے تھے اور کچھ مضمون کے تانے بانے بُن رہے تھے کہ امی کی آواز کان میں پڑی۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ ہم سو گئے۔

"میں نے کہا سنتے ہو؟"

کیا ہے بھئی" ابا کچھ غنودگی کے عالم میں بولے۔

"یہ صاحبزادی کو کیا سوجھی؟"

"کیا سوجھی؟" ابا گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ نہ جانے کیا سمجھ کر۔

"لو اور سنو جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔ صاحبزادی خیر سے مضمون نگار بن گئیں!" امّی طنز سے بولیں۔

"تو بھئی اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ ہماری بیٹی ادیبہ بنے۔" ابا کے لہجہ میں بلا کا لاڈ تھا۔

"بس تم اپنے چوچلے رہنے دو" امی غصہ سے بولیں۔

"ارے بھئی تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔" ابا کو ہمارے مضمون نگار بننے میں قطعاً کوئی برائی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ہاں ہاں بیٹی صاحبہ گھر کے قصہ سارے جہاں کو سناتی پھریں گی اور تمہارے لئے کوئی بات ہی نہیں۔" امی نے اپنی دانست میں زبردست انکشاف کیا۔

"گھر کے قصے! کیا مطلب!! ابھی مضمون لکھے گی وہ تو۔" ابا کی واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"خاک مضمون لکھے گی۔ کل ہی بچو (یعنی بجیا) بتا رہی تھی کہ اسکی کوئی دوست ہے اس کی بہن بھی لکھتی ہے ایسے مضمون۔

"کیسے مضمون؟" ابا نے بات کاٹی۔

"اے ہی! یہ جو صاحبزادی کہتی رہتی ہیں طنز و مزاح اور کیا۔ تو اس لڑکی نے اپنے کچھ رشتہ داروں کے متعلق لکھا تو آپس میں لڑائیاں ہو گئیں۔" امی کا لہجہ نہایت متفکرانہ تھا۔

"لاحول ولا۔ تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو بیگم،" ابا کچھ بور ہو گئے۔ آخر کو رہیں نا وہی جہالت کی باتیں۔

"آپکو تو میری ہر بات عجیب لگتی ہے!" بھلا امی کیوں نہ برا مانتیں فوراً خفا ہو کر بولیں۔ "صاحبزادی کے دماغ ویسے ہی کیا کم تھے۔ ہر وقت ہر ایک پر اعتراضات کرتی رہتی تھیں۔ بجیا اتنا فیشن کیوں کرتی ہیں، ابا کو کیا اور کوئی کام نہیں سوائے ریڈیو سننے کے۔ گھر کا یہ حلیہ بنا رہتا ہے ہر وقت اسی مصیبت میں گرفتار رہتی تھیں اب اور کیا لکھیں گی گھر پر ہی نشانہ لگے گا

"امی کے دل سے کسی صورت یہ پریشانی نہیں جا رہی تھی کہ ہم گھر کے افراد اور ان کی عادات پر مضمون نہ لکھ دیں۔

"اچھا بھئی جب وہ لکھے گی تب کی تب دیکھی جائے گی۔ ابھی تک تو نہیں لکھا نا؟" ابا کسی نہ کسی صورت اس موضوع سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے تھے۔ امی بھی مایوس ہو کر چپ ہو گئیں اور تب ہم پر یہ بھید کھلا کہ صاحب یہ ہر شخص ہم سے کھنچا کھنچا کیوں تھا۔ دل میں ہم بہت ہنسے امی نے خود ہی ہمیں وہ بات یاد دلادی جسکا ہمیں اب تک خیال بھی نہ آیا تھا۔

"اگلے دن ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ اتنا اچھا موضوع مل گیا تھا بغیر تلاش کئے۔ خوب نمک مرچ لگا کر مضمون لکھا اور فوراً بھیج دیا۔ حیرانی کی بات یہ ہوئی کہ وہ جلد ہی شایع بھی ہو گیا۔ ہمنے امی سے چھپانے کی بہت کوشش کی مگر بجیا نے ابا کے کان میں کیسے بھنک پڑ گئی اور وہ تو تھیں ہی امی کی پرائیوٹ سکریٹری۔ پھر بھلا امی کو پتہ کیوں نہ چلتا۔

"اور پھر کیا ہوا۔ خیر چھوڑیئے بھی یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں آپکو بھلا ان سے کیا۔؟ بس اتنا بتلائے دیتے ہیں کہ خوب مزاج پرسی ہوئی مگر ہمنے اس ہنگامہ کو موضوع بنا کر ایک اور مضمون داغ دیا۔ اس مضمون کی اشاعت نے ایک نئے ہنگامے کو جنم دیا اور ہمیں ایک اور نیا موضوع سجھا دیا۔ ہر مضمون شایع ہونے کے بعد کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی کہ ہمیں نئے مضمون کے لئے موضوع تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہ اٹھانی پڑتی۔ اب اگر خاندان والے ہم سے ناراض ہیں کہ ہم خواہ مخواہ ہر ایک کی پگڑی اچھالتے پھر رہے ہیں (حالانکہ آپ چاہے ہم سے کیسی ہی قسم لے لیں ہمنے آج تک تو اپنے یہاں کسی کو "پگڑی پوش" دیکھا نہیں اور ویسے بھی خواتین کے ساتھ تو پگڑی کا تصور عجیب سا لگتا ہے اور ہم تو لکھتے ہی صرف خواتین کے متعلق ہیں) تو آپ انصاف سے کہیں کہ اسمیں ہمارا کیا قصور ہے؟

بوٹا سنگھ
ترجمہ
عرفان حسین

سردارنی ہرکور

(پنجابی کہانی)

سردارنی ہرکور نے پانی کا آخری چمچہ اپنے خاوند کے منہ میں ڈالا ــــ سامنے کھڑے ہوئے اپنے اکلوتے لڑکے بچنت سنگھ کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اشارے سے اس کو سامنے کے کمرے میں لے گئی ــــ سردار کے پلنگ کے آس پاس رشتہ دار۔ حکیم۔ ڈاکٹر۔ اور گوردوارے کے بھائی جی سب ہی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ سردارنی نے بیٹے کے کاندھے سر لگا کے روتے ہوئے کہا۔ "پُت ۔ ۔ ۔ ۔ اب ۔ ۔ ۔ ۔ تیرا باپو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں چھوڑ ۔ ۔ ۔ ۔" سردارنی نے اپنی چیخ نکلتے نکلتے بڑی مشکل سے روکی ــــ اور آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پیتی ہوئی صندوق کھول کے سو سو کے نوٹوں کی گڈی۔ اور تھیلی روپیوں کی ایک تھیلی نکالی۔ اور اُسے پکڑا کر کہا۔ "لے بیٹے سنبھال لے۔ باپ کو اچھی طرح نکالنا۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ اتنے بڑے سردار کو گھر سے ننگا نکالا ہے۔ تیرے باپ کو لوٹ لوٹ کے اب اس حویلی میں نہیں آنا۔ تیرے دادا کے نام کو تیرے باپ نے قائم رکھا اور اب تو ہی اس گھر کا والی ۔ ۔ ۔ ۔ ــــ" سردارنی کمرے کے باہر نکل گئی۔ اس کے چند لمحوں بعد سردار نے دو لمبے سانس لئے۔ اور کھیل ختم ہو گیا۔

سردار کی "ارتھی" بڑی شان سے نکالی گئی۔ سردارنی ہرکور نے ایک آنسو نہ بہایا۔ بلکہ ارتھی پر روپیوں کی بوچھاڑ کی۔ اور بھری برادری میں کہا۔ "جیتا رہے میرا بچنت ۔ ۔ ۔ ۔ ان حویلیوں زمینوں والے کو لوٹ لوٹ کر نہیں آنا۔" سردارنی نے کسی کو رونے نہ دیا۔ کسی کو آنسو نہ بہانے دیا۔ کسی کو بین نہ کرنے دیئے۔ اور ارتھی کے پیچھے پیچھے پیشانی پر گھونگھٹ ذرا نیچا کر کے ننگے پیروں۔ ہاتھ جوڑ کر بیٹے کے ساتھ چلتی گئی جیسے بیٹے کی رکھوالی کرتی جا رہی ہو۔

سردار کی موت کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی۔ گاؤں کے گاؤں ماتم پرسی کو آنے لگے۔ سردارنیاں اپنی مراثنوں کے ساتھ روتی پیٹتی آتیں ــــ حویلی کے بڑے دروازے کے آگے روتی سردارنیوں اور دہائی دیتی مراثنوں کو دیکھ کر سردارنی ہرکور اُن کے بیچ جا کھڑی ہوتی۔ مراثنوں کے مونہہ پر ہاتھ رکھ کے انہیں چپ کر دیتی۔ اور سردارنیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کے کہتی

"نی میرے جیتے کی خیر مانگو رونے کے بجائے۔ اس حویلی میں اب دوسرا مرد نہیں رہا . . . . .، لوگ جانتے تھے جیتے کا دادا بھی۔ جیتے کے باپ کو اسی عمر میں چھوڑ گیا تھا۔ اور اب پھر جیتے اکیلا جیتا رہ گیا ہے۔ ان کا جیسی حویلی سنبھالنے والا —" جیتا ہے میراپت۔ یا قسمت یا نصیب!" سردارنی کی آوازیں طوفان ہوتا۔ جس کو سن کے سب کے آنسو سوکھ جاتے۔ اور ہرکور کی بکّی پر لوگوں کو بہت ترس آتا۔

سردارنی ہرکور اپنے خاوند کو بھول گئی تھی — اس نے کبھی اپنے خاوند کی یاد میں آہ نہ بھری۔ کبھی آنسو نہ بہایا۔ کبھی اس کی کوئی بات نہ چھیڑی۔ لیکن جس دن رنجیت سنگھ ہیضے کا شکار ہو کر نڈھال پڑا تھا۔ تو ہرکور کے پرانے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ جیسے اس کے دکھوں کا پیالا بھر گیا ہو۔ ادھر رنجیت سنگھ نے آخری ہچکی لی۔ ادھر ہرکور نے اپنا سر رنجیت سنگھ کے پلنگ کی پٹی پر دے مارا۔ اس کی پیشانی سے نکلے لہو کی دھار پلنگ پر پڑی چادر کے دوسری طرف جا پہنچی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ پڑوس کی عورتوں اور گھر میں کام کرتی نوکرانیوں نے رو رو کے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ بے سدھ پڑی سردارنی ہرکور کو ساتھ کمرے میں لے جا کر اس کی مرہم پٹی کی گئی رام جوائی نوکرانی سردارنی کو سنبھالتی بھی جاتی۔ اور ساتھ ہی روتی بھی جاتی۔ اس نے کئی بار سردارنی کے موہنہ میں پانی ڈالا — باہر سے رونے اور دھاڑیں مارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور اندر ابھی تک سردارنی بے ہوش پڑی تھی۔ رام جوائی آنسو بہاتی ہوئی سوچ رہی تھی۔" واہ . . . . . رے . . . . . ربّا . . . . . دونوں ماں بیٹے اکٹھے بلائے . . . . کون یہ حویلی سنبھالے گا . . . . . وے میرے ربّا . . . . . بی بی تری آئی مجھے لگ جائے . . . . . ان پھولوں سے دونوں بچوں کو . . . . . لوگ بے آسرا سمجھ کے مار ڈالیں گے . . . . . ہائے . . . . . . وے . . . . . میرے ربّا۔"

رام جوائی نے سردارنی کے موہنہ میں اور پانی ڈالا۔ سردارنی نے آنکھیں کھولیں۔ تو رام جوائی نے آنسو پونچھ کر ذرا غصّہ سے کہا۔" بی بی کچھ ہوش کر۔ کیا بیٹے کا مردہ سڑانے کا ارادہ ہے؟ . . . . . کون ہے تیرے بنا اس گرتے گھر کو سنبھالنے والا۔ اٹھ اور اپنے ہاتھوں سے نکال پُت کو جیسے بڑے سردار کو نکالا تھا . . . . . "

سردارنی نوکرانی کی بات سن کے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آ کے بیٹے کے پلنگ پر گر پڑی۔ سندر کور کے مائیکے والے آ گئے تھے۔ اور جب سندر کور کی ماں نے سدھن کے ماتھے سے لہو ٹپکتا دیکھا۔ تو اس نے کوٹ کوٹ کر اپنی چھاتی ایسی کر لی جیسے کسی نے طبلا توا لگا دیا ہو — یہ دیکھ کے سردارنی اور زور سے بین کرنے لگی۔ " . . . وے . . . میں . . . . . تمہیں کہاں چھپا لوں میرے چنبیلی کے پھول . . . . . ." سردارنی کے بین سن سن کے لوگوں کی چیخیں نکل نکل گئیں۔ اور جب ارتھی اٹھنے لگی۔ تو سردارنی نے ایک گہری آہ بھری۔" لوگو . . . . اے . . . . . آج ہماری حویلی اندھیری ہو گئی۔ ہم ساس . . . . بہو . . . . . . دونوں رانڈیں . . . . . ." سردارنی کے بین سنے نہیں جاتے تھے۔ بوڑھی نین اور رام جوائی نوکرانی سردارنی کو تھام تھام لیتیں۔ اس کے سر کی چادر کو گھڑی گھڑی ٹھیک کرتیں۔ جس پر ماتھے سے نکلے لہو کے دھبے پڑ گئے تھے۔

لوگوں کا خیال تھا بڑے سردار کے دکھ کو تو سردارنی ہرکور سہہ گئی تھی۔ لیکن بیٹے کی موت اس کو ساتھ لے کر جائے گی۔ — رب نے ساری مصیبتیں سندر کور بچاری پر ڈال دی ہیں۔ وہ بھی الھڑ لڑکی ہی تو ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ رنجیت سنگھ اسے بیاہ کر لایا تھا۔ رب کی مہربانی کہ چار برسوں میں بیٹوں کی جوڑی ملی۔ لیکن ابھی تو دل کے ارمان دل ہی میں تھے! — اب تو بس اسی کے لئے دکھ ہی دکھ رہ گئے ہیں۔ ہرکور تو مردوں کا مرد تھی۔ لیکن اسے ابھی دنیا کا کیا پتہ ہے!۔

ہرکور اپنی بہو کے مقابلے میں خواہ تگڑی لگتی تھی۔ لیکن بیٹے کی موت نے ایک بار تو اس کا جسم سوکھی لکڑی جیسا کر دیا —— چند ہی دنوں میں اس کی کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید دکھنے لگے تھے ۔ جب وہ اپنے دو برس کے پوتے جھوپی کو ۔ اور چھ مہینے کے نوپی کو دیکھتی تو اُسے گھیپے آنے لگتے ۔ اور وہ سوچتی کیسے پرورش ہوگی مجھ سے یہ جوڑی ۔ اور کب تک بڑے ہوں گے یہ دونوں ۔ بھائی —— بڑے سردار کے بعد لوگوں نے زمینوں کے حصے بخرے کی باتیں شروع کر دی تھیں ۔ . . . لیکن اب تو تنکے کا بھی آسرا نہیں رہا ! —— کون جائے گا بٹائی وصول کرنے ؟ کون جائے گا کرایہ اُگانے ؟ رب نے کوئی سہارا نہیں چھوڑا۔ باپ بھی اکیلا تھا اور بیٹا بھی اکیلا رہا ۔ دو پوتے ہوئے تو سمجھا رب کی نظر سیدھی ہوئی ہے۔ لیکن واہگورو ! پھر مجھے بالکل اکیلا کر دیا ۔"

ہرکور نے بیٹے کے غم میں کئی مہینے سر نہ دھویا ۔ کئی ہفتے دُھلا کپڑا نہ پہنا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ دنوں ہی کی مہمان ہے۔ لیکن ایک دن اپنے دونوں پوتوں کو اکٹھا ایک چھوٹی سی پلنگڑی پر باہنہ پر باہنہ رکھے سوتا دیکھ کر ہرکور کو اندھیرے میں ایک ہلکی سی روشنی کی کرن نظر آئی ۔ جس نے اس کی آنکھوں کو روشن کر دیا ۔

اگلے دن وہ نہائی ۔ کپڑے بدلے ۔ رام جوائی سے اپنے سر میں گھی ڈلوایا —— سندر کور سے کپڑے بدلنے کے لئے کہا ۔ صفائی کروائی سارے گھر کو دھلوایا ۔ اور دونوں ساس بہو ایسی سج کر بیٹھ گئیں جیسے آج بیٹے کا مونڈھن کرانا ہو ۔

سردارنی ہرکور کے اعضا پھر توی ہونے لگے ۔ اس کے چہرے پر پھر سرخی آنے لگی —— وہ گوپالا پلّہ دار سے مسکرا مسکرا کے باتیں کرتی ۔ جب وہ صبح کو دھاریں نکالنے آتا تو اس کے پاس جا کھڑی ہوتی ۔ تب حویلی کی اس سمت سردارنی اور گوپالے کے سوا اور کوئی نہ ہوتا ۔ اور سردارنی اکثر اس سے اپنا دکھ سکھ کھول بیٹھتی ۔ کرایہ داروں کی شکائتیں کرتی ۔ بھٹّے کے منشی کی بے ایمانیاں اس طرح بتاتی جیسے وہ یہ ساری باتیں مجبوراً برداشت کر رہی ہو ۔ —— "گوپال داسا . . . . تو بھی تو گھر کا آدمی ہے . . . . ہمیں تجھ پر کتنا مان ہے . . . . تو بھی دودھ کی گڑوی لے جایا کر ۔ ہم سے اتنا دودھ اب نہیں سنبھالا جاتا . . . ." ——

سردارنی گوپالے کے ساتھ چاہے کتنی دیر باتیں کرتی رہتی ۔ لیکن سندر کور کی ہمت نہیں تھی ۔ کہ وہ کلام بھی کرے ۔ اور جب گوپالا پلّہ دار دودھ کی بڑی کلسی اٹھا کے سردارنی کے ساتھ چلتا تو سردارنی آہ بھرتی ہوئی سوچتی ۔ "آدمی کی بھی کیسی حکومت ہوتی ہے !"

گوپالا پلّہ دار ساری منڈی میں ایک تھا ۔ تین من کی بوری پھول کی طرح اٹھا لیتا ۔ روز تیل ملتا ۔ ڈنڈ پیلتا ۔ بیٹھکیں لگاتا ۔ اور جب کسی سے اس کا جھگڑا ہو جاتا ۔ تو حریف کو منٹوں میں مٹی چٹا دیتا ۔

ادھر سردارنی ہرکور پر ایک نیا نکھار آ رہا تھا ۔ اُدھر گوپالے نے پلّہ داری چھوڑ دی تھی ۔ وہ سردارنی کے ساتھ کرایہ اُگانے جاتا ۔ زمینوں پر پھیرے مارتا ۔ بھٹّے کے منشی کو کبھی کبھی ڈانٹ دیتا ۔ سردارنی اس کو کچھ نہ کہتی ۔ الٹا گوپالے کا پارٹ لیتی اور راستے میں اس طرح ہنس ہنس کے باتیں کرتی جیسے اس پر اب نئی جوانی چڑھی ہو ۔ پر کیا مجال ہے گوپالے کی جو وہ سندر کور کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھ لے —— سندر کور تو اپنے بچوں کے ساتھ حویلی میں نظر بند تھی ۔ وہ کہیں آ جا نہیں سکتی تھی ۔ نہ کسی سے مل جل سکتی تھی ۔

سندر کور کئی سال سے مائیکے نہیں گئی تھی ۔ اُس کی ماں سردارنی ہرکور سے بہت ڈرتی تھی ۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ سندر کور کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ہرکور سے کہہ بھی سکتی ! —— ہرکور شیرنی تھی ۔ جو شکار مار کے کھا سکتی تھی ۔ لیکن کوئی اور اس کے شکار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔

سچیت سنگھ سردارنی ہرکور کا دور کے رشتہ کا دیور لگتا تھا۔ وہ غریب بیچارہ اپنی ضرورتوں کے لئے آتا تو سردارنی ہرکور اس کو واپس نہ جانے دیتی۔ رات کو خود اسے بیٹھک میں دودھ کا گلاس دینے آتی۔ اور کئی رات تک اس سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ سچیت سنگھ تو اس کے ساتھ زیادہ دیکھ کر کہیں گوپالا ناراض نہ ہو جائے! ــــ لیکن اس نے تو دونوں کو جگہ جگہ سے کس کے پکڑ رکھا تھا۔ اور دونوں سردارنی کے پیچھے وفادار کتوں کی طرح پھرتے رہتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور گھور کے دیکھتے لیکن سردارنی کو اپنی حسد کا پتہ نہ لگنے دیتے۔ دونوں کی جیبوں میں روپئے بھرے رہتے۔ دونوں روز خوب دودھ پیتے۔ اور سردارنی دونوں سے الگ الگ اسی طرح باتیں کرتی جیسے وہ اسی کے لئے ہے۔

سچیت سنگھ زمینوں کے کاغذ۔ دکانوں کی رجسٹریاں سردارنی کو لا کر دیتا۔ اور گوپالا بٹائی۔ اور کرایہ اس طرح اُگا کے لاتا۔ جیسے سب کچھ اسی کا اپنا ہی ہو۔ وہ ذرا سی بات پر مارنے مرنے کو تیار ہو جاتا ــــ سردارنی نے نہ کبھی کاغذ پتر سچیت سنگھ کے سامنے سنبھالے تھے اور نہ کبھی لائی ہوئی رقموں کا حساب گوپالے کے سامنے کیا تھا۔

سردارنی کے تیور پھر پہلے جیسے ہو گئے تھے۔ اس کے چہرہ پر پھر سرخیاں ناچنے لگیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کو خاوند اور بیٹا کبھی یاد ہی نہ آتے ہوں۔ اور بیٹے کی موت پر اس کی غشی محض مکاری تھی۔

سردارنی جب بھی بازار سے گذرتی۔ تو وہ چٹے لٹھے کی چادر اوڑھے ہوئی۔ گھونگھٹ پیشانی سے نیچا ہوتا۔ گوپالا پیچھے پیچھے ہوتا۔ اور سچیت سنگھ ساتھ ساتھ ــــ یہ دیکھ کر چودہری کہر سنگھ پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں سے بڑے کٹیلے لہجے میں بات کرتا۔ "ارے جوانی بھی کبھی کسی کی یار ہوئی ہے جیسے . . . کتی . . . نا . . . . چو . . . . کتیا ذات ہے ــــ ہرکور نے سردار سنت سنگھ کی عزت مٹی میں ملادی ہے۔ بیٹے کی موت پر کیسی کیسی مکاری دکھائی تھی۔ جیسے اس کی چتا کے ساتھ ہی جل جائے گی۔ اور اب آگے پیچھے دو خصم لئے پھرتی ہے۔ جیسے کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں۔ کتیا پر اب جوانی چڑھی ہے پیچھے پیچھے کتے لئے پھرتی ہے۔ ارے عورت کی مت کھوپڑی کے پیچھے ہوتی ہے۔ اس رنڈی سے سب کچھ سچیت سنگھ ہتھیا لے گا۔ اور وہ دونوں معصوم خالی ہاتھ رہ جائیں گے بھایا . . . ."

گوپالے سے لوگ مذاق کرتے تو وہ پھول جاتا۔ یوں لگتا جیسے اس نے اپنے بازوؤں کے بل پر کوئی بڑی جاگیر مارلی ہو۔ وہ سمجھتا تھا سردارنی میری ہے۔ اور وہ اُس سے جو کہدے وہی کرتی ہے۔ اور سچیت سنگھ سمجھتا تھا کہ ایک دن اسے بھابی پر چادر ڈال دینا ہے۔ پھر وہ گوپالے کا نام ونشان مٹادے گا ــــ بھابی سے اس نے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ لیکن اچھے دن کا ہی انتظار ہے!

کئی برس اسی طرح بیت گئے۔ لوگ سردارنی پر دبی زبان سے دشنام طرازی کرتے۔ لیکن کوئی کھل کے سامنے نہ آتا۔ اور جب کوئی چندہ مانگنے آتا تو سردارنی کھلے دل سے روپیہ دیتی۔ گھر آئے سرداروں کی خوب آؤبھگت کرتی۔ انہیں بڑی بیٹھک میں بٹھاتی۔ شربت اور دودھ بھر بھر گلاس پلاتی۔ اور خود چادر کا لمبا گھونگھٹ نکال کے سیڑھی پر بیٹھ جاتی۔ اور سب کی باتوں کا جواب دیتی جاتی ــــ جب علاقے کا پہلا کالج بنا تو سردارنی نے دس ہزار روپیہ دیا۔ گوردوارے کے باہری دیوار پر اس نے اپنے بیٹے کے نام کی اینٹ لگوائی ــــ لیکن جب اس کے کانوں تک چودہری کہر سنگھ کی باتیں پہونچتی تو وہ خون کا گھونٹ پی کے رہ جاتی۔ اور دل ہی دل میں کہا کرتی۔ "وہ کہر سنگھا اگر میں نے تجھے مٹی نہ چٹوا دی۔ تو جاٹ کی

بیٹی مت کہنا۔

انوپ اور بھوپندر سردارنی کے دونوں پوتے جوان ہو رہے تھے۔ اور سردارنی کے تیور اور تیکھے ہوتے جا رہے تھے۔ انوپ بارھویں میں پڑھتا تھا۔ اور بھوپندر دسویں میں! ــــ ایک دن اسکول کھانا دینے گئے گوپالے کو دونوں بھائیوں نے اتنا مارا کہ اس کو چارپائی پر ڈال کر اسپتال پہونچا گیا ــــ یہ سن کے بچیت سنگھ اپنے گاؤں چلا گیا۔ اور واپس نہ آیا ــــ چودھری کہر سنگھ بھاگم بھاگ سردارنی کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ "بہن میرے لائق کوئی سیوا بتا۔ سنا ہے گوپالے کا لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ . . . انوپ اپنا بیٹا ہے۔ میری بیٹی سے دو ہی برس بڑا ہے۔ لیکن کاٹھ میں اپنے دادا جیسا نکلا ہے . . . بہن میرے لائق جو خدمت سیوا ہو کہہ دینا . . . . میں تیرا خادم . . . . . ."

یہ سن کے سردارنی ہر کور کو ایسا لگا۔ جیسے وہ نئی حویلی میں آگئی ہو۔ اور اس کا سراپا نئی خوشبوؤں میں بس گیا ہو۔

فضا ابن فیضی

تصویرِ گل بنے نہ حنا کی طرح رہے
ہم سادہ سادہ اپنی وفا کی طرح رہے

باایں سکوتِ شوق تری انجمن میں ہم
پروردگارِ شعر و نوا کی طرح رہے

ہم اپنے دشتِ خوش نگہی کے غزال تھے
پھر بھی جہاں میں آبلہ پا کی طرح رہے

کیا چیز ہے یہ شوخیٔ ذوقِ نگاہ بھی
شعلہ رُخوں میں لوگ ہوا کی طرح رہے

چشمِ جہاں میں بن کے سراپا بہشت زار
ہم بھی تمہارے بندِ قبا کی طرح رہے

ہم خوش سلیقہ کب ہیں مگر گل رُخوں کے ساتھ
رہنا پڑا کبھی تو صبا کی طرح رہے

صاحب نظر تھا کون کہ پہچانتا ہمیں
ہم اجنبی سے نقشِ وفا کی طرح رہے

مسجودِ فکر و فن رہی تنہا ہماری ذات
ہم اپنے بُت کدے میں خدا کی طرح رہے

احمد ظفر

جسم ڈھلتا ہوا لکیروں میں
بٹ گیا حُسن کے اسیروں میں

چاند کا داغ ہے مری آواز
روشنی سے تہی ضمیروں میں

اُس کی باتیں خیال کی تصویر
چند لمحے حسیں جزیروں میں

جانے کیوں سوچتا رہا ہوں میں
شاہ بھی ہو تو راہ گیروں میں

دن جہاں نذرِ شہریار ہُوا
شب وہاں کٹ گئی فقیروں میں

دوستی ہو کہ دشمنی ہو ظفر
چل رہا ہوں برستے تیروں میں

مظفر علی سید

کام کوئی تو کبھی وقت سے آگے کر جا
اے دلِ زندہ، مرے مرنے سے پہلے مر جا

کیسی دھرتی تھی، کبھی کان میں کن مِن نہ ہوئی
کیسا امبر تھا، کبھی سر پہ نہ بادل گرجا

ساغرِ چشم کو زہراب سے خالی کر دے
اور جو بھرنا ہے تو پیمانۂ ہستی بھر جا

ذہن سے تا بہ فلک خون کا پھیلا دامن
کوئی کوشش نہ کہیں، اور تمنا ہر جا

تشنگی کم ہو مگر دور نہ ہونے پائے
اپنے پیاسے کو نہ سیرابِ محبت کر جا

تو مسافر، ترے کس کام کی شہرت! اے سید
یہ سخاوت، سرِ دہلیزِ رفیقاں مرحبا

مظفر حنفی

سجدے چکا رہے ہیں سبھی ۔ مدعا ہے کیا
میں پوچھتا ہوں آپ سے وہ بُت خدا ہے کیا

اے چارہ گر! نمک نہ چھڑک از رہِ مذاق
اب کیا پتہ مریض کو، اُس کی دَوا ہے کیا

اے برقِ بے اماں یہ اثاثہ قبول کر
گلشن میں خار و خس کے سوا بچ رہا ہے کیا

پہنچا کے اس مقام پہ مجھ کو ستم ظریف
بَن بَن کے پوچھتا ہے کہ ، آخر ہوا ہے کیا

ہر چند ٹوکتا ہوں غلط زاویوں پہ میں
لیکن وہ بدمزاج مری مانتا ہے کیا

طوفان مدتوں سے اُٹھایا نہیں کوئی
اے بیکراں سکوت! بتا ماجرا ہے کیا

کیوں دیکھتے ہیں لوگ اسے گھور گھور کر
قاتل کی آستیں پہ کوئی گُل کِھلا ہے کیا

یہ سنسنی سی پھیل گئی انجمن میں کیوں
حق بات کہہ رہا ہوں مگر "یہ خطا ہے کیا"

آواز مختلف ہے ، نئی ہے ، دلیر ہے
سُننا ذرا ، مظفرِ آتش نوا ہے کیا

محسن احسان

مرگِ احساس سے یوں دل کو قرار آیا ہے
جیسے منزل پہ کوئی بار اُتار آیا ہے

نوکِ مژگاں پہ سلامت رہیں خوں کی بوندیں
روئے ہستی پہ قیامت کا نکھار آیا ہے

اب فقط اشکوں کی برسات سے دُھل سکتا ہے
آئینہ خانۂ دل پر جو غبار آیا ہے

وہی اعجازِ تکلم، وہی اندازِ حیا
تو جب آیا ہے قیامت بکنار آیا ہے

شہرِ بلقیسِ خزاں میں یہ منادی کر دو
فوجِ گل لے کے سلیمانِ بہار آیا ہے

حسنِ مطلق تو کہاں ہے ذرا آواز تو دے
تجھ کو محسن سرِ افلاک پکار آیا ہے

تاج سعید

چلتی ہوئی ہوا سے جو دَر بند ہو گیا
پھر آج تک وہ در میرے یارو نہیں کھلا

زنداں کی تیرگی سے مِلا ہے کسے مفر؟
روشن سحر کا ہم کو چلے کِس طرح پتا

پتّوں کے پیٹنے کی صَدا رات بھر رہی
پیڑوں کے دل کی بات نہ کوئی سمجھ سکا

کتنی ہی بارشیں یہاں آ کر برس گئیں
لیکن غبار اُن کا ابھی تک نہیں دُھلا

مدّت سے دل کی آنکھ رہی جس کی منتظر
جب وہ ملا تو اپنا مقدّر سنور گیا

اپنے کئے کی اُن کو سزا خود ہی مل گئی
ہم کو بھی اپنے دکھ کی دوا اسے خدا بتا

اطہر نادر

میں ایک بات کہوں گر تمہیں بُرا نہ لگے
کہو جو کوئی حقیقت تو وہ فسانہ لگے

گلا تو گھونٹ دیا ہم نے آرزوؤں کا
یہ زندگی ہے اب ایسی کہ مجرمانہ لگے

کبھی گھمس، کبھی بارش عجیب موسم ہے
ہوا چلی بھی تو ایسی کہ کچھ ہوا نہ لگے

بجا کہ کیف نہیں ہے غمِ محبت میں
مگر میں کیا کروں جب وہ مجھے خفا نہ لگے

تری جُدائی گوارا بھی ہو تو کیوں کر ہو
بچھڑ کے تجھ سے جو ملنے میں اک زمانہ لگے

مجھے یقیں ہے کہ اک بار وہ ملے گا ضرور
مگر یہ شرط، کہ ہاتھ اُس کے کچھ بہانہ لگے

ہر ایک بات ہے نادر تری خدا لگتی
اب اس سے کیا کہ بظاہر وہ شاعرانہ لگے

کامل اختر

صدیوں کی تھکی ہاری ہوا کانپ رہی ہے
احساس کے ساحل پہ نئی دھوپ کھڑی ہے

ہر شہر میں جس نے کبھی ہنگامے اٹھائے
آواز کے جھولے میں اسے چپ سی لگی ہے

میں اور کہیں جا کے تو بس جاؤں گا لیکن
رہتا ہے یہاں کون، کہو کس کی گلی ہے

اب اپنی سبھی سکھیوں سے ملتی ہے سنا ہے
وہ مجھ سے بچھڑ کر ہی ملنسار ہوئی ہے

ہم لوگ تو سیلاب سے بچ آئے ہیں لیکن
آبادیٔ دل جانے کہاں ڈوب گئی ہے

برسوں سے مری آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا
یہ بات بھی اس کے لئے اک بھید بنی ہے

بدلے ہوئے حالات کا شکوا کریں کس سے
میری ہی صدا مجھ کو نہ پہچان سکی ہے

سحر انصاری

جدید افریقی نظمیں

دیس دیس کا ادب

سفید اور سیاہ انسان ہماری تہذیب کے روز و شب ـــــ سحر و شام ـــــ ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں نظامِ فطرت کا ایک حسین منظر سمجھنے کے بجائے باہمی تنازعے اور تصادم و تحارب کی علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ سفید فام اقوام نسلی برتری کے غرور میں مبتلا ہیں، اور سرمایہ داری کے انسانیت سوز نظام نے اس غرور کے ہاتھ طرح طرح سے مضبوط کئے ہیں۔ لیکن سفید فام زمین اپنی کاشت کا صلہ پا چکی اس کی فصلیں کٹ چکی ہیں۔ اب سیاہ فام زمین کی زرخیزی اپنا اثبات اور اعلان چاہتی ہے۔ سیاہ فام دوشیزہ زمین نے فکر و تخیل کی بارآور فصلوں اور ثمردار درختوں کے بے پایاں امکانات کا ابھی محض آغاز کیا ہے۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں، اور جو باقی ہیں وہ بھی ٹوٹ رہی ہیں۔ نئے زمانے میں نیگرو احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہیں۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑی توانائی سے بروئے کار لا رہے ہیں۔ وہ اپنے دُہرے منصب کو مستحکم کرتے جا رہے ہیں۔ اُن کا دُہرا منصب یہ ہے کہ وہ اقوامِ عالم میں سماجی، سیاسی، ثقافتی برتری حاصل کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی نیگرو انفرادیت کو بھی برقرار رکھیں۔ فن، موسیقی، شاعری اور ثقافت کے شعبوں میں افریقی اور امریکی نیگروؤں کا ایک خاص ذہنی و فکری رویہ ہے جسے انہوں نے نیگرویت (Negritude) کا نام دیا ہے۔ اب یہ رویہ صرف نیگروؤں ہی تک محدود نہیں ہے۔ اس کے اثرات سفید فام فن کار بھی قبول کر رہے ہیں۔ موسیقی، فنِ تعمیر اور مصوری میں تو نیگرویت کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نیگرویت کی تحریک سے فکر و اظہار کے نئے سانچے سامنے آئے ہیں۔ جو بہت دلکش، منفرد اور مسحور کن ہیں۔ نیگرو اقوام کی توانائی، جذبے کے براہِ راست اظہار اور اشیاء سے متعلق ان کے خاص ذہنی رویے نے فنونِ لطیفہ کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔

نیگرو آرٹ کی طرح نیگرو شاعری بھی امریکہ اور افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں الگ الگ پیرہن رکھتی

ہے۔ اس وقت جن نظموں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ افریقی ممالک کے چند نمائندہ نیگرو شاعروں نے لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں افریقہ کا مخصوص جغرافیائی ماحول، قبائلی مزاج اور بے ساختگی ملتی ہے۔ پام کے درخت صنوبر کی شاخیں، چاند اور کوہسار، جھونپڑیاں اور آبشار، قوس قزح، رقص، دف، شراب اور چہروں کے زنگار رنگ نقاب ان کی شاعری میں بار بار آتے ہیں، اور ان کے مسائل، جد وجہد اور ان گنت جذبوں کے اظہار کی نئی علامات بن کر ابھرتے ہیں۔ لیوپولڈ سینگھار ان میں سب سے زیادہ مشہور اور با صلاحیت شاعر ہیں۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شعر لکھتے ہیں۔ سینگھار سینگال کے صدر ہیں اور نیگرویت کی تحریک کے سرگرم قائدین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا سیاسی مسلک خواہ کچھ بھی ہو لیکن اُن کی فکر اور شاعری میں نیگرو اقوام سے بے پناہ محبت اور جدید تقاضوں کے مطابق سفید و سیاہ فام قوموں میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے کا جذبہ سب سے مقدم نظر آتا ہے۔ وہ خود کو نیگرو اقوام کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

اک سفیرِ سیہ فام ہوں میں

ذیل میں سینگال، انگولا، نائیجیریا، گھانا اور مڈغاسکر کے جدید افریقی شعرا کی نظموں کے وہ ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً میں کرتا رہا ہوں:

سیاہ فام چہرہ

لیوپولڈ سینگھار　　　سینگال

سپاہی کے سیاہ فام چہرے کو جب تم نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا
تو وہ خوش بختی کے نور سے فروزاں نظر آنے لگا
کوہسار سے گزرتے ہوئے میں نے سورج کو تمہاری آنکھوں کی جھیلوں
میں ڈوبتے دیکھا۔
جاتے ہوئے دل میں سوچتا ہوں
میں اپنی سرزمینِ حیات — تمہارے چہرے کا افق کب دیکھوں گا
میں کب تمہارے سیاہ سینے پر اپنا سر رکھوں گا۔
دل نشیں فیصلوں کا نشیمن تنہا رہ گیا ہے۔

میں دیس دیس کے آسمانوں اور دیس دیس کی آنکھوں سے شناسائی حاصل کروں گا
پھولوں سے زیادہ شاداب ہونٹوں سے بادۂ حیات نوش کروں گا
طوفانوں سے محفوظ اجنبی زلفوں کی چھاؤں میں مجھے نیند آ جائے گی
لیکن ہر سال جب موسمِ بہار رگ و پے میں تازہ خون کی شمعیں روشن کرے گا

تو میں اپنے گھر اور صحرا کی پیاسی ریت پر اُس شکیبا دمتہاری آنکھوں کا
سوگ مناؤں گا ۔

ماں سے رخصت کے وقت

ایگا ستنھو نیتو　　　انگولا

میری ماں !
(آہ سیاہ فام مائیں ، جن کے بچّے ان سے بچھڑ چکے ہیں)
تو نے مجھے انتظار کرنا اور پُر امید رہنا سکھایا ہے
کیونکہ آفت انگیز ساعتوں میں تیرا طور یہی رہا ہے

لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ میں
زندگی نے پُر اسرار امید کو ہلاک کر دیا ہے

اب میں کسی کا انتظار نہیں کرتا
اب مجھے خود اپنا انتظار رہا کرتا ہے

امید تو ہم خود ہیں
زندگی کا پیٹ بھرنے اور ایک عقیدے کی سمت سفر کرنے والے
تیرے بچّے ۔

ہم خار دار جھاڑیوں کے برہنہ بچّے
جاہل چھوکرے ، جو دوپہر کی دھوپ میں
چیتھڑوں کی گیندوں سے میدانوں میں کھیلتے ہیں

اُجرتوں کی خاطر قہوے کے کھیتوں میں اپنی زندگیوں کو جھلس دینے والے
جاہل سیاہ فام انسان تو ہم ہیں
جنہیں سفید لوگوں کا احترام کرنا

اور دولت مندوں سے ڈرنا چاہیے
ہم تیرے ان جھونپڑوں کے بچے ہیں
جہاں بجلی کے قمقمے کبھی نہیں پہنچے
موت کے نقارے کی بھینٹ چڑھنے والے
شراب پی پی کر مر جانے والے
تیرے بچے
جو بھوکے ہیں
جو پیاسے ہیں
جو تجھے ماں کہتے ہوئے شرماتے ہیں
جنہیں راستوں سے گذرتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جو انسانوں سے خوف کھاتے ہیں

وہ ہم ہی ہیں
زندگی کی بازیافت ِ امید

چاند اور چوہا

ژاں جوزف ریبیئرے ویلو　　مڈغاسکر

رات کی دیوار سے
ایک نادیدہ چوہا آتا اور
چاند کا دودھیا نان کتر لیتا ہے
کل صبح
جب وہ جا چکا ہوگا
تو صرف دانتوں کے خوں چکاں نشان رہ جائیں گے

وہ لوگ جنہوں نے تمام شب شراب پی ہے
تاش کے کھیل سے دست کش ہو کر
دُزدیدہ نگاہوں سے چاند کی طرف دیکھیں گے

اور رُک رُک کر کہیں گے :
" یہ چھ پنس کا سکّہ کس کا ہے
جو سبز میز پہ گھوم رہا ہے "

" اوہ " ان میں سے ایک کہے گا
" ہمارا دوست سب کچھ ہار گیا
اور اُس نے خودکشی کر لی ہے "

اور سب چپکے چپکے بے شرمی سے ہنسیں گے
اور لڑکھڑا کر گر پڑیں گے
کل صبح چاند وہاں نہیں ہوگا :
چوہا اُسے اپنے بل میں لے جا چکا ہوگا

رجز

جے - اوونر ولیمز　　گھانا

میں سوؤں گا سفید کفن میں لہولہان
انساں کے سر پہ جنگ کا آسیب آگیا
　　میں سوؤں گا سفید کفن میں لہو لہان
ہاں ہاں قدم بڑھاؤ جوانانِ صف شکن
کیلی اور اس کے لوگ مسلسل قدم بڑھائیں
ہم کو سفید فام تفنگوں کا ڈر نہیں
ہم بڑھ رہے ہیں سینہ سپر ہو کے چار سُو
　　ہم سوئیں گے سفید کفن میں لہولہان
آؤ قدم بڑھاؤ کہ دہلے زمیں کا دل
جنگ اب ہماری جھونپڑیوں میں در آئی ہے
بُزدل تمام اپنے گھروں میں چھپے رہیں
ہم محوِ کارزار رہیں ، اور بیویوں کے پاس

جو لوگ جائیں اُن کے ہمیں سَر قلم ملیں

ڈس جائے گا سنا گیا ہے کہ بچے کو سانپ نے
کاٹا ہوا اُس کی ماں کی نگاہوں کے سامنے
جنگ اب ہماری جھونپڑوں میں در آئی ہے
ہم ڈٹ کے اِس بَلا کا کریں گے مقابلہ
ہم کو سفید فام تفنگوں کا ڈر نہیں
ان کے دھوئیں نے گھیر لیا ہے ہمیں تو کیا
اب لڑ رہے ہیں جان کی بازی لگا کے ہم
ہم قتل ہوں گے عرصۂ جنگ و قتال میں
ہاں بزدلی کی موت ہمیں نا پسند ہے
مر جائیں گی ہماری تفنگیں ہمارے ساتھ
خنجر ہمارے ساتھ فنا ہوں گے دیکھنا
ہم قتل ہوں گے عرصۂ جنگ و قتال میں

ہجر

کوسٹی آکٹ یو — **نائیجیریا**

چاند ہم دونوں کے مابین اُبھر آیا تھا
دو ہم آغوش
درختانِ صنوبر کی حدوں کے مابین

چاند کے ساتھ جو درد اُبھرا تھا
دوری و ہجر کی شاخوں پہ ہوا ہے شاداب

اور اب ہم ہیں وہ سائے
جو ہم آغوش تو ہوتے ہیں مگر
جسم کے لمس سے محروم رہا کرتے ہیں۔

انجم اعظمی ○ احفاظ الرحمن
سحر انصاری

نئی کتابیں

(تعارف و تبصرہ)

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

مختصر کہانیاں

مصنف : سید حیدر بخش حیدری دہلوی
مرتبہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : اردو دنیا کراچی۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ افکار رابسن روڈ کراچی
صفحات : ۲۹۲ قیمت : چھ روپے

حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے چند اہم مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے طویل داستانیں، اپنی ملازمت کے دوران لکھی تھیں۔ لیکن کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ مختصر کہانیاں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لندن کے قیام کے دوران انڈیا آفس لائبریری میں اس نسخے کو دریافت کیا۔ اور اپنے دیباچے کے ساتھ ان کی مختصر کہانیوں کے مجموعے کو پاکستان سے طبع کرایا۔ اس مجموعے کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ کہانیاں اس وقت لکھی گئی تھیں جب اردو میں مختصر کہانیوں کا کوئی رواج نہ تھا۔ اس تحقیق سے اردو افسانے کی تاریخ، اور تنقید میں تبدیلی کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ خود حیدر بخش حیدری کی ادبی صلاحیتیں اور فنی محاسن کے پرکھنے کا انداز بڑی حد تک بدل جائے گا۔ کیونکہ داستانیں فارسی، اور دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کی جاتی تھیں، جبکہ یہ مختصر کہانیاں حیدر بخش حیدری کی تخلیقی صلاحیت کا، اور ان کی ذہنی اُپج کی

گواہ ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جن کی ساری عمر تحقیق و تنقید میں گذری ہے۔ سید رفیق حیدری کی مختصر کہانیوں کو ڈھونڈ نکالنے پر قابلِ مبارک باد ہیں۔　　　(انجم اعظمی)

چلتے ہو تو چین کو چلئے

مصنف : ابن انشا
ناشر : مکتبۂ دانیال - ۳۱۶ محبوب چیمبرز - صدر کراچی
صفحات : ۱۹۲　　　قیمت : چھ روپے

ابنِ انشا شاعر ہے اور طنز نگار بھی۔ اس کی نثر آہستہ سے کھلتے ہوئے پھول کی طرح شگفتہ اور نرم ہے۔ "چلتے ہو تو چین کو چلئے" ایک طویل سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں ابن انشا کی ظرافت کی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ظرافت کے ساتھ کہیں کہیں خوبصورت طنز بھی ملتا ہے۔ "چاند نگر" میں خواب دیکھنے والا اس کتاب میں جب دوسروں کو ہنساتا ہے تو اس وقت بھی بظاہر ادنگھتا رہتا ہے۔ لیکن ہنس لینے کے بعد اس کی باتوں پر غور کیجئے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ بیتے کی کہی کرتا ہے اور باشعور ہے۔ یہ شعور اس کی خواب آلود نظم "بغداد کی اک رات" میں بھی موجود ہے اور چین کے سفرنامے میں بھی۔ اسے جو باتیں اچھی نہیں لگتیں ان سے مزاج میں کدورت پیدا کرنے کے بجائے وہ ہنس لینا کافی سمجھتا ہے۔ اس کی ہنسی اس کے جملے سے لپٹی ہوئی وقت کا پوری طرح ساتھ دیتی نظر آتی ہے۔ وہ بھولا بھالا ہے انجان نہیں ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے لیکن بے ہوش نہیں رہتا۔ وہ ہنستا ہے دوسروں کو بھی ہنساتا ہے اور کسی کا مذاق نہیں اڑاتا۔ اس ہنسی میں قدروں کے شعور سے روشنی پیدا ہوئی ہے اور اسی روشنی سے اس کا منفرد اسلوب تابناک ہے۔

یہ سفرنامہ چین کی سرزمین اور اہلِ چین کے افسانوں کا امین ہے۔ ہم لوگ گاؤں اور شہر آباد نہیں کر پاتے اور اہلِ چین ایک پورا ملک آباد کر کے اب اس فکر میں ہیں کہ امریکیوں کے وجود سے ایشیا کی ستم رسیدہ آبادی کو پاک کر دیں۔ ابنِ انشا کی کتاب اسی یقین کو مستحکم کرتی ہے کہ اہلِ چین جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ عمل کے مردِ میدان ہیں۔ چینیوں سے ابن انشا کی عقیدت اس کی کتاب میں صاف جھلکتی ہے جو مشاہدے اور مطالعے سے پیدا ہوئی ہے۔ اور بعض چٹکلے اور فقرے تو اس کتاب میں ایسے ہیں۔ جو کبھی ذہن سے نہیں نکل سکتے۔

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ابنِ انشا کی نثر کا اسلوب بے حد منفرد ہے۔ اس نثر کی تازگی اور شگفتگی نے لوگوں کو اس کی تحریر کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

(انجم اعظمی)

اردو کا پہلا ناول

خطِ تقدیر

مصنف : مولوی کریم الدین
مرتبہ : ڈاکٹر محمود الٰہی
ناشر : دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
صفحات : ۱۹۰　　قیمت : تین روپے

ڈاکٹر محمود الٰہی نے مولوی کریم الدین کی تمثیلی کہانی "خطِ تقدیر" کو "اردو کا پہلا ناول" کے عنوان سے "حرفِ آغاز" اور "مقدمہ" کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مقدمہ میں مولوی کریم الدین کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ اور محقق کے فرائض سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمود الٰہی گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تحقیقی کاموں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مقدمہ سے یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ انہوں نے "خطِ تقدیر" کو کن مبنیادوں پر ناول قرار دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "توبۃ النصوح" تمثیل کے ساتھ ساتھ ناول کی خصوصیات اور ساخت کی حامل ہے۔ "خطِ تقدیر" کا انداز قطعی تمثیلی ہے لیکن ناول کی ساخت اور خصوصیات نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں کتاب کا نام "اردو کا پہلا ناول" محتاجِ توجہ ہے۔ آخر میں فرہنگ اور مولوی کریم الدین کی کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے۔ 'خطِ تقدیر' بلاشبہ افسانوی ادب کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے ڈاکٹر محمود الٰہی نے مستند متن سے مرتب کر کے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔　　(انجم اعظمی)

تنہا اُداس لڑکی

مصنفہ : سیدہ حنا
ناشر : مکتبۂ ارژنگ۔ سکندر ٹاؤن۔ پشاور
صفحات : ۹۴　　قیمت : دو روپے

"تنہا اُداس لڑکی" سیدہ حنا کا پہلا ناولٹ ہے۔ اس عنوان میں کوئی شے بے حد ذاتی ہے جس کا تجزیہ آسان نہ سہی لیکن اس میں ایک عجیب کشش ہے۔ یہ ایک نہایت ذاتی اور انوکھے احساس کو جنم دیتا ہے۔ قاری میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ سیدہ حنا کون ہے اور ایک لڑکی کے غم کو بصیرت سے کس طرح ہم آہنگ کیا جاتا ہے کیونکہ ادب بصیرت کا خریدار ہے۔ دراصل ادب میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ حیات و کائنات، ماحول اور معاشرہ کے بارے میں بہت کچھ ہونے کے باوجود لکھنے والے کے لئے ذاتی مسئلہ ہوتا ہے اور اس ذاتی مسئلہ کا اجاگر ہی ادب کے تاثر کی ضمانت ہوتا ہے۔ سیدہ حنا کے اس ناولٹ کا عنوان قائم کرنے

کے سلسلے میں یقیناً بے پناہ کامیابی ہوئی ہے۔ کیونکہ پڑھنے والا عنوان پڑھ کر بے شمار سوالوں کے جوابات کے لئے بے قرار ہو کر ناولٹ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس ناولٹ کو پڑھتے وقت قاری کی بے قراری کو آہستہ آہستہ جو آسودگی حاصل ہوتی ہے اس میں سیدہ حنا کے طرزِ تحریر کی سادگی کو بڑا دخل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کے معمولی واقعات میں انسانی فکر و عمل کی عظمت کو تلاش کر لینا ہی ادب ہے۔

"تنہا اداس لڑکی" لیلیٰ پر بے حد معمولی واقعات کا بیان ہے لیکن ان کے اِرد گرد رومانیت اور ایمائیت کا جادو بھی ہے۔ کرداروں سے ملتے اور بچھڑتے وقت اُن کی باتیں ذہن میں در آتی ہیں۔ سیدہ حنا کو جو کچھ کہنا ہے دَبی زبان سے، سیدھے سادے طور پر، متانت کے ساتھ کہتی چلی گئی ہے۔ ان کی باتوں کو کہی ہوئی باتوں سے مطابق چلی گئی ہے۔ "تنہا اداس لڑکی" ناول کے آخری جملوں میں تنہا نہیں رہتی۔ چھوٹے بھائی کی خواب کی بڑبڑاہٹ زندگی کی گہری معنویت حاصل کر لیتی ہے۔ اور خواب کی یہ بڑبڑاہٹ لڑکی کے لئے چہار سمت سے اُمنڈتی ہوئی تاریکی پر روشنی کا پل بن جاتی ہے۔

ناولٹ میں ہمارا ماحول ہے۔ اس ماحول کے دکھ ہیں۔ ناولٹ کے آخر میں مرکزی کردار کی کشمکش اور روشنی ہے۔

سیدہ حنا کی تحریر بڑی منفرد اور دل نشین ہے۔ ناولٹ کی کتابت اور چھپائی پر اور توجہ کی ضرورت تھی۔

(انجم اعظمی)

صنم اندر صنم

مترجم : ایس۔ اے۔ علوی
ناشر : اردو اکیڈمی سندھ۔ بندر روڈ۔ کراچی
صفحات : ۱۹۸ قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

"صنم اندر صنم" پرل ایس بک کی مشہور کتاب "OTHER GODS" کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم علوی صاحب نے ترجمے پر کافی محنت کی ہے۔ البتہ چند مقامات پر پڑھتے پڑھتے قاری کو جھٹکا سا لگتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً الفاظ کا بے محل انتخاب ہے۔ مثلاً :

"اگر کوئی صرف اس پھول کو دیکھنے کے لئے ہی یہ
تمام سفر برداشت کرے تو صحیح ہو گا"

کہنے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ وہ پھول اتنا خوبصورت ہے کہ محض اسے دیکھنے کے لئے ہی یہ اذیت ناک سفر طے کیا جائے تو بھی یہ سودا مہنگا نہ ہو گا۔ لیکن لفظ "صحیح" یہاں وہ معنی نہیں دیتا جو فاضل مترجم کا مقصد ہے۔ بہرحال ایسی خامیاں بہت کم ہیں۔

اردو اکیڈمی سندھ نے یہ کتاب بھی روایاتی حسن و معیار کے ساتھ شائع کی ہے۔
(احفاظ الرحمٰن)

سنگ و سمن

مصنف : خالد شفائی
ناشر : منزل اکیڈمی، حیدرآباد۔ اے پی ۲ (بھارت)
صفحات : ۱۹۲ قیمت : تین روپے

'سنگ و سمن' بھارت کے جواں سال شاعر خالد شفائی کے شعری مجموعے کا نام ہے، جس میں زیادہ تر نظمیں اور چند غزلیں شامل ہیں۔ نظموں میں اظہار کے خارجی عناصر نمایاں ہیں اس سے قبل ساحر، مجروح اور مخدوم اسی انداز میں بارہا خوبصورت نظمیں کہہ چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب خالد شفائی اس طرزِ فکر کو کس حد تک آگے بڑھاتے ہیں کہ یہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ (احفاظ الرحمٰن)

باقیاتِ اقبال

مصنف : علامہ اقبال
ترتیب اول : سید عبدالواحد معینی
ترمیم و اضافہ : محمد عبداللہ قریشی
ناشر : آئینۂ ادب چوک انارکلی لاہور
صفحات : ۵۰۴ قیمت : دس روپے پچاس پیسے

اقبال کے کلام سے برصغیر کے مسلمانوں کو جو لگاؤ ہے وہ کسی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے اردو اور فارسی کلام کے مجموعوں کے متعدد ایڈیشن آب و تاب کے ساتھ شائع ہو کر ہاتوں ہات فروخت ہو چکے ہیں۔ باقیاتِ اقبال۔ اُن کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اپنا تمام کلام بڑی تحقیق و جستجو کے بعد یکجا کر دیا گیا ہے جو کسی وجہ سے اقبال کی مطبوعہ تصانیف میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔

اسے سید عبدالواحد معینی ایم۔اے (آکسن) نے ترتیب دے کر سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع کیا تھا۔ اب محمد عبداللہ قریشی نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ (اس مجموعے کی ترتیب میں) "جو چیز جہاں سے لی گئی ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اور کلام کو تاریخ وار درج کیا گیا ہے تاکہ خیالات کا ارتقا سمجھنے میں مدد ملے۔" اقبالیات کے باب میں یہ مجموعہ ایک دلکش اضافہ ہے جس سے اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

(سحر انصاری)

ایک درخواست

پچھلے برس کی طرح اس برس بھی میں ۶۷ء کی بہترین مطبوعہ شاعری مرتب کر رہا ہوں جو ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شائع ہوگی — شاعر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ۶۷ء میں شائع شدہ اپنی بہترین تخلیق مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ جس رسالے یا اخبار میں وہ تخلیق شائع ہوئی ہو اس کا حوالہ بھی ضرور دیں۔

پتہ :- پرکاش پنڈت

1582/3A نوین شاہدرہ، دہلی -32

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی — طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی — دفتر: رابسن روڈ کراچی

خبردار!
بچے کھیل
کھیل رہے ہیں

بچے بچے ہیں۔ وہ سڑک پر کھیلیں گے اور اپنے کھیل میں اس طرح کھو جائیں گے کہ گاڑیوں کے نیچے کچلے جائیں۔ اس لئے احتیاط سے گاڑی چلایئے۔ شہری حدود میں رفتار تیز نہ کیجئے۔

بچے قیمتی سرمایہ ہیں انہیں محض اپنی بے پروائی سے نقصان پہنچانا یا ضائع کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔

- رفتار کی حدود سے تجاوز نہ کیجئے۔
- ہمیشہ ایسی رفتار سے گاڑی چلایئے جو کسی ہنگامی موقع پر مناسب فاصلے سے آسانی کے ساتھ روکی جاسکے۔
- ایسے تمام چوراہوں پر جہاں پولیس یا سگنل نہ ہوں پیدل چلنے والے گزرتے رہتے ہیں۔
- اپنی عادت بنالیجئے کہ رفتار کم رکھیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو گاڑی روک دیں۔
- جب آپ کسی چوراہے پر اپنی گاڑی موڑ رہے ہوں تو یہ دیکھ لیں کہ کوئی راہگیر سڑک عبور نہ کررہا ہو۔
- بچے اکثر کھڑی گاڑیوں کے پیچھے کھیلتے یا چھپ جاتے ہیں لہٰذا گاڑی کو بیک کرنے سے پہلے یقین کرلیجئے کہ راستہ صاف ہے۔
- کم کشادہ راستوں پر اوورٹیک نہ کریں خاص طور سے ان مقامات پر جہاں آپ بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہے ہوں

اس شمارے کی چند اہم تخلیقات

- اردو ــــ آزادی کے ۲۰ سال بعد
- ایک زبان ایک تہذیب
- زبان، تہذیب اور موت
- والیبر کا ایک ناول ــــ صادق
- لندن اور پیرس کی ادبی زندگی کا آنکھوں دیکھا حال
- ۵ افسانے، ڈرامے، ترجمے ۲۶ منظومات

دیس دیس کا ادب ○ محفل ○ نئی کتابیں ○ ادبی خبریں۔

چند لکھنے والے:- عبدالرحمٰن چغتائی، قیصر تمکین، رضیہ فصیح احمد۔ قتیل شفائی۔ انجم اعظمی۔ آغا افتخار حسین۔ ابراہیم یوسف۔ مظفر علی سید۔ فیض انصاری۔ نازش بخاری۔ قمر ہاشمی۔ زہرہ نگاہ۔ سحر انصاری۔ سیف الاظمی۔ زلیش کمار شاد۔ سیدہ حنا۔ احمد فراز اور دوسرے۔

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء
ٹیلی فون: ۴۳۹۹۲

افکار

سال: ۲۳ ۰ شمارہ: ۱۹۹

مدیر
صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے		قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ	۱۰ ڈالر	ایک روپیہ

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۱۲ - پرنسیز ایونیو - لندن - این - ڈبلیو نمبر ۹

ترتیب

۸- نظم، رباعی، گیت

۱۴- جشن سالگرہ

۸- غزل

۴- افسانہ، طنز، ترجمہ

۴- دیس دیس کا ادب

۳- نئی کتابیں

مارچ ۶۸ء کی تخلیقات

گفتنی نا گفتنی

ساغر صدیقی

'افکار' کا سالنامہ ۶۸ء شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اور اس خاص اشاعت کی بھی ویسی ہی پذیرائی ہوئی جیسی کہ اس سے قبل شائع ہونے والی دیگر خاص اشاعتوں کی ہوتی رہی ہے۔ اس حوصلہ افزائی، قدردانی اور افکار نوازوں کی بے پناہ محبت کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں، مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

سچ پوچھئے تو 'افکار' اسی لئے زندہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے، اس کو پسند کرنے والے، اس کی معاونت کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اسی احساس رفاقت نے مجھے اور 'افکار' کو جینے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور میں مشکلات کی پروا کئے بغیر 'افکار' کی زندگی کے لئے ساری توانائیاں ہی نہیں زندگی تک کی بازی لگا چکا ہوں اور خوش ہوں کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی مقصد اور کسی نصب العین کی نذر ہو رہا ہے۔ زندگی جو وقت گذاری کا نام نہیں، جو کسی دیوانے کا خواب نہیں، جو ہم سے کچھ مطالبے کرتی ہے، کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہم پر عائد کرتی ہے اور ان کی تکمیل چاہتی ہے —— اسی زندگی کو بامقصد اور بامعنی کہا جاتا ہے جو اصول و صداقت کی آئینہ دار ہو، جو دوسروں کے کام آ سکے۔ جو سچائی، محنت اور دیانت سے عبارت ہو۔ اگر میں نے گذشتہ ۲۳ سال کے عرصے میں ادب کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لئے کچھ کیا ہے تو صرف اتنا ہی کیا ہے کہ افکار کو ماہ بماہ شائع کر کے برصغیر کے سیکڑوں پرانے اور نئے اہل قلم کے افکار تازہ سے حیات تازہ کی تعمیر و نمود کے اسباب فراہم کئے ہیں اور بس۔

سالنامہ ۶۸ء کی اشاعت کے فوراً بعد اردو مجلس اور رفیقانِ افکار نے ۲۳ ویں سال گرہ منا کر ایک بار پھر مجھے حوصلہ اور توانائی عطا کر دی ہے کہ میں اس دَورِ پُرآشوب میں ادبی جنوں سے باز نہ آؤں بلکہ عمر و صحت کا باقی ماندہ حصّہ بھی افکار کی نذر کر دوں ، سو میں افکار دوستوں اور اہلِ قلم رفیقوں کو دل کی گہرائیوں سے یقین دلاتا ہوں کہ میں افکار کو آخری سانس تک زندہ رکھنے ، اس کے معیار کو اور آگے بڑھانے ، اور اُسے صوری و معنوی لحاظ سے مزید بہتر بنانے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھوں گا اور آئندہ بھی ایسا ادب پیش کرتا رہوں گا جس سے اردو ادب ، نئی نسل اور بہتر مستقبل کی تعمیر میں مدد ملے ۔

یہ شمارہ جو ۲۳ ویں سال کا آخری شمارہ ہے حسبِ روایت تازہ ترین تخلیقات پر مشتمل ہے ، اس شمارے میں تقریبِ سال گرہ کی مضامین نظم و نثر بھی شامل کئے جا رہے ہیں ۔ رفیقانِ افکار نے ان میں بہت سی مفید اور کام کی باتیں ادب و ادبی رسائل کے بارے میں ایسی کہی ہیں جن سے آئندہ کام کرنے والوں کو روشنی اور بصیرت مل سکتی ہے ۔ ادبی ماہنامے یقیناً ہماری تہذیب و معاشرت ، تاریخ و تمدّن اور علم و ادب کا لازمی حصّہ ہیں ۔ اُن پر آج اگر بُرا وقت ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آئندہ بھی وہ انہی حالات سے دوچار رہیں گے ، اس لئے مایوسی کا کوئی جواز نہیں ۔ کام کرنے والے ہمیشہ کٹھن صبر آزما اور مشکل حالات میں ہی اپنے لئے راہیں نکالتے آئے ہیں ۔ ہماری ادبی تاریخ اس کی شاہد ہے ۔ ان گذارشات کا مقصد صرف اِتنا ہے کہ آپ جو ادب کے سرپرست و محافظ ہیں اگر اپنے ادبی ماہناموں ، ادبی اداروں اور ادبی خدمت گذاروں کو اپنی پرخلوص محبت و شفقت سے نوازتے رہیں گے اور حلقۂ اثر میں بھی ادب دوست پیدا کرنے کی سعی و جہد جاری رکھیں گے تو انشاء اللہ افکار ایسے کئی اور ادبی ماہنامے شائع ہونے لگیں گے اور علم و ادب کے لئے سازگار فضا پیدا ہو جائے گی ۔ ادبی رسالوں نے ہر زمانے اور ہر دور میں علم و فکر کی مشعلیں فروزاں رکھی ہیں ، اور آئندہ بھی رکھیں گے ۔ یہی وہ رسالے ہیں جن کے دم قدم سے ادب ایک زندہ حقیقت بن کر زندگی اور مستقبل کی تعمیرِ نو کا فریضہ انجام دیتا اور لمحاتِ فرصت میں آپ کو ذہنی آسودگی اور طمانیت قلب عطا کرتا ہے ۔

صہبا

جوش ملیح آبادی

نئی رُباعیات

الوان میں دل کی ناؤ کھیتا ہوں میں
نظروں کو قبائے رنگ دیتا ہوں میں
جب صبح کے مکھڑے پہ جماتا ہوں نگاہ
اپنے چہرے کو دیکھ لیتا ہوں میں

جب دہر میں پہنائی نہیں پاتی ہیں
کیا کیا نہ ترنگیں مری گھبراتی ہیں
انگڑائی جو لیتے ہیں خیالات مرے
تو کہنیاں قطبین سے ٹکراتی ہیں

ہم بند کیے، دل کے تقاضوں کی دکاں
تم قلب پہ لادے ہوئے اربوں ارماں
تم کثرتِ دولت کی بناء پر ہو گدا
ہم قلتِ حاجات کے بل پر سلطاں

رقصاں ہیں تجلیات میرے دل میں
غلطاں ہیں صفات و ذات میرے دل میں
جیسے مٹھی میں صرف اک ذرۂ خاک
یوں بند ہے کائنات میرے دل میں

جس وقت بعقلِ تند و فکرِ جولاں
انسان بنے گا تاج دارِ دوراں
مجھ کو نہ ملا، تو اسے لگا پا آفاق
بن کر مری اولاد سے جائے گا کہاں

قتیل شفائی

دوراہا

غمِ دل کی وادیوں میں، یہ خوشی کے چند لمحے
انہیں جان لو غنیمت، کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

ابھی چاند حسرتوں کا، لبِ جاں چمک رہا ہے
ابھی چاہتوں کی لے پر، مرا دل دھڑک رہا ہے
ابھی دھڑکنوں کی آہٹ کوئی گیت گا رہی ہے
ابھی قربتوں کی لذت، ہمیں گدگدا رہی ہے
مگر ایک دن یہ گھڑیاں، یہ حسین پل نہ ہوں گے
انہیں جان لو غنیمت، کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

تمہیں اپنی جاں بنا کر، تہہ دل سے میں نے چاہا
مرے سامنے ہے لیکن، یہ عجیب سا دوراہا
کبھی دل خوشی سے جھومے، کبھی ڈوب ڈوب جائے
کوئی راستہ نکھر کر، مرے سامنے نہ آئے
مرے غم کے یہ مسائل، کسی طرح حل نہ ہوں گے
انہیں جان لو غنیمت، کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

ریاض انور

جب چلی سرد ہوا

موسم سرما کی یہ ویران اور مغموم شام
کہر کی چادر میں لپٹی ہے سسکتی کائنات
گیت خوابوں کی طرح لرزاں سلگتی ہے حیات
برف میں ڈوبی ہوا کی سیٹیاں
چیل کے جنگل کی میٹھی لوریاں
ڈگمگاتے ہیں پریشاں مضمحل لمحوں کے گام
چار سُو آواز دے کر پوچھتا پھرتا ہوں میں
ان ہواؤں کی جبینِ ناز پر
کیا کہیں لکھا ہوا ہے میرا نام ؟
اڑ رہے ہیں راستوں پر زرد پتے جو کبھی
چند لمحوں کو بنے تھے زینتِ شاخِ شجر
جانے یُوں کب تک رہیں گے یہ ہوا کے دوش پر
کُو بکُو قریہ بہ قریہ، یم بہ یم محوِ سفر
دکھ کے لمبے سلسلے اور چند لمحوں کی خوشی
ہائے اپنی زندگی !

مقصود زاہدی

رُباعیات

فریاد کی اس لے کو دل آویز کرو
نغموں کو ابھی اور جنوں خیز کرو
دل تندیٔ افکار سے پگھلیں گے ضرور
احساس کی اس آگ کو کچھ تیز کرو

باتوں میں خلوص اور نہ گیرائی ہے
محفل میں بھی اِک عالم تنہائی ہے
ہے اپنی سوسائٹی کا کچھ حال عجب
ہر شخص نے بیگانگیٔ اپنائی ہے

ہر گام پہ اوہام کی دیواریں ہیں
ہر چار طرف جہل کی للکاریں ہیں
جس راہ سے بڑھتا ہوں صداقت کی طرف
ہر موڑ پہ احمقوں کی تلواریں ہیں

ظلمت کدۂ راز میں اُترو تو سہی
سینے میں گم آواز کو ڈھونڈو تو سہی
اے مطرب! اے خود ہی نکل آئے گی
احساس کے تم ساز کو چھیڑو تو سہی

ساقی جاوید

وِتنام

اپنے وطن کی خاک سے کس کو نہیں ہے پیار
عزّت کسے عزیز نہیں اپنے دیس کی
کون اپنی گودیوں کے اُجالوں کے واسطے
کرتا ہے اہتمامِ صلیب و رَسن بتاؤ؟
پھر آندھیوں کی طرح ہلاکت کے دیوتاؤ
وِتنام کے عوام سے کیا چاہتے ہو تم؟

وتنام کے عوام سے کیا چاہتے ہو تم؟
اُن کی زمیں کو خون میں نہلا رہے ہو کیوں؟
کیوں کر رہے ہو اُن کے گھروں کے چراغ گل؟
یوں تو ہر ایک قوم میں ہوتے ہیں کاوَکی
آسان ہے خریدنا اُن کے سیہ ضمیر
لیکن وطن کے جعفر و صادق صفت یہ لوگ
جاگے ہوئے عوام کی آواز تو نہیں

اے ظلم کے خداؤ تمہارے یہ سُرخ ہاتھ
کب تک کریں گے جاگتے سینوں کو داغ داغ
گودیں جو تم نے ماؤں کی کی ہیں لہولہان
ماتھوں سے جو سہاگ کے ٹیکے مٹائے ہیں
ہاتھوں کی سُرخ سُرخ جو توڑی ہیں چوڑیاں
آنکھوں میں مامتا کے دیئے جو بجھائے ہیں

وہ سب چمک چمک کے اُجالے بنے ہیں آج
سینوں کے زخم زخم سے پھُوٹی ہے روشنی
پھولی ہوئی لہو کی شفق ہر گلی میں ہے
اب تم صلیب و دار کہاں تک بناؤ گے
کتنے کھڑے کرو گے فصیل و حصار تم
مٹی کے اِن بُتوں میں کہاں تک بھرو گے سانس
چاندی کے خول اُن پہ کہاں تک چڑھاؤ گے

جوالا مکھی پہاڑ ہیں وتنام کے عوام
وتنام کے عوام کو ہر قوم کا سلام
وہ دے رہے ہیں خون کہ ان کے وطن کی خاک
دنیا میں آفتابِ صداقت بنی رہے
اُن کے لہو سے آج جو پھوٹی ہے روشنی
ہر قوم کے عوام کی طاقت بنی رہے

انور احسن صدیقی

ویت نام کا دل

زندگی کی سیہ بختی کیا ہے؟
صبحِ امکاں کی روشنی کیا ہے؟
دستِ قاتل کی سفلگی کیا ہے؟
چشمِ بسمل کی بے بسی کیا ہے؟
کس توقع پہ لوگ جیتے ہیں؟
آزمائش کی ہر گھڑی کیا ہے؟
نفرتیں کس قدر ضروری ہیں!
مہر و لعنت کی چاشنی کیا ہے؟
چوٹ لگتی ہے کب رگِ جاں پر؟
سازِ دل کی شکستگی کیا ہے؟
لبِ تبسم کو کب ترستے ہیں؟
آہ کیا چیز ہے؟ ہنسی کیا ہے؟
کیسے بجھتے ہیں شعلہ ہائے وجود؟
نزع کیا شے ہے؟ جاں کنی کیا ہے؟
کیسے کٹتا ہے رشتۂ امید؟
آرزوؤں کی خودکشی کیا ہے؟
زخم کے پھول کیسے کھلتے ہیں؟
جوشِ خوں میں شناوری کیا ہے؟

موج در موج مقتلوں کا ہجوم
کوچہ کوچہ گلی گلی کیا ہے؟
صف بہ صف پھانسیوں کے پھندے کیوں؟
کنجِ زنداں کی تیرگی کیا ہے؟
کب اکھڑتی ہے سانس نغموں کی
موت کی سرد راگنی کیا ہے؟
کون ہے قیس، کون ہے لیلیٰ!
چاکِ دل کی دریدگی کیا ہے؟
آہ و شیون میں شورِ ماتم میں
دو گھڑی کی شگفتگی کیا ہے؟
کس قدر آتشیں ہے موجِ سموم!
غنچہ و گل کی تازگی کیا ہے؟
کس قدر محترم ہے جوشِ نمو!
رگِ گل کی بریدگی کیا ہے؟
پی چکی ہوں جو خون کے دریا
ان زمینوں کی بے خودی کیا ہے؟
کیا ہے معیارِ رفعتِ آدم
حوصلہ کیا ہے بزدلی کیا ہے؟

کیا ہے تہذیبِ نفس کا مفہوم؟
ضبط و عرفاں کی آگہی کیا ہے؟
جسم کیوں ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں؟
ٹوٹ جانے میں سرخوشی کیا ہے؟
کب اترتا ہے خون آنکھوں میں؟
غضب و غیظ و دشمنی کیا ہے؟
کس قدر زہرناک ہے انساں!
زخمِ مردم گزیدگی کیا ہے؟
خون میں کھیل کے، خاک میں مل کے
کامرانی کی سرکشی کیا ہے؟
دامنِ دشت و کوہ و صحرا میں
رقصِ عفریتِ زرگری کیا ہے؟
شہر کیوں راکھ بنتے جاتے ہیں؟
ننگِ تہذیب ڈالری کیا ہے؟

یہ دلِ ویت نام سے پوچھو
مرجعِ خاص و عام سے پوچھو

□□

خورشید راٹھور

بلیدان

چھوٹے سر پر ——————
کیسے رکھ دوں ؟
تاج بڑا ہے
بن مالک کے کس کو دے دوں ؟
غیر کے سر پر کیسے رکھ دوں ؟
کیوں میں رکھ دوں ؟
تاج میرا ہے
لعل و گہر سے تاج جڑا ہے
تاج بڑا ہے —— تاج میرا ہے
تاج لاج اور کاج کے کارن
آن بان اور شان کے شایاں
من کی دولت ——————
ہاتھ لگی ہے
کیسے کھو دوں ؟
کیوں میں کھو دوں ؟
آجاؤ تو زریں تاج !
میں تم کو دے دوں ——————
سندر —— راج کمار

لطف الرحمٰن

وادیٔ نور

دور سے اک چمکتی ہوئی وادیٔ نور کو
دل نے دیکھا تو سوچا
کہ اب راستوں کی تھکن
اور سب آبلہ ہائے پا کی جلن
ختم ہو جائے گی

اور اس وقت سے آج تک راستوں کے دہکتے ہوئے شعلہ زاروں
کئی کربلاؤں
کئی آگ کی ندیوں سے مرا دل گذرتا رہا ہے

مگر آج بھی سیکڑوں کربلا راستے میں
زمانہ کی تلوار کی دھار بن کر کھڑے ہیں
جفاؤں کی سنگین دیوار بن کر کھڑے ہیں
ابھی راہ میں صد بیابان آزردگی منتظر ہے
کوئی خضر و الیاس ہو تو بتائے
فرات تمنّا کا ساحل کہاں ہے
کہاں ہے غم دل کی منزل کہاں ہے

کدھر وادیٔ نور ہے کون جانے؟
کہاں منزل طور ہے کون جانے؟
سنا ہے کہ الیاس و خضر زمانہ بھی زخموں کی یورش سے گھبرا چکے ہیں
دہکتے ہوئے شعلہ زاروں میں، منزل کا ہر راستہ کھو چکے ہیں
بہت تھک گئے ہیں
کہیں راستے کی گھنی چھاؤں میں سو گئے ہیں۔

زیر اہتمام اردو مجلس کراچی

افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ

(۱۹۴۵ء ——— ۱۹۶۸ء)

صدارت: حکیم محمد سعید دہلوی ستارۂ امتیاز

آرٹس کونسل ——— ۲۲ فروری ۶۸ء جمعرات

تلاوت قرآن مجید سے تقریب سالگرہ کا آغاز کر رہی ہیں

غزالہ یاسمین

تقریب کے اختتام پر مہمان خصوصی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو۔ (دائیں سے) سید سبط حسن، پروفیسر عتیق احمد، صہبا لکھنوی، شمر ہاشمی، حکیم محمد سعید، سحر انصاری، جوش ملیح آبادی، مسعود احمد برکاتی، ڈاکٹر عالیہ امام، پروفیسر ممتاز حسین، صادق الخیری

(بیٹھے ہوئے) مشرف احمد، طاہر احمد

پروفیسر عتیق احمد

افکار کی ۲۳ ویں تقریب سال گرہ پر ملک کے مشہور و مستند علمی و ادبی اداروں اور ممتاز شخصیتوں کی جانب سے جو پیغامات موصول ہوئے تھے، افکار کے دیرینہ رفیق و معاون پروفیسر عتیق احمد انہیں پیش کر رہے ہیں

بنگالی اکادمی - ڈھاکہ

مکرمی جناب، سلام مسنون۔

ماہنامہ "افکار" کی ۲۳ ویں سال گرہ کی تقریب میں شرکت کے لئے آپ نے دعوت نامہ بھیج کر مجھ کو جو شرف بخشا ہے اس کا میں بے حد شکر گذار ہوں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس گراں قدر تقریب میں شریک ہو کر فیض یاب نہ ہو سکوں گا۔ بہرحال میں عقیدت مندانہ خلوص سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ' افکار کی پیش قدمی کو رواں رکھے۔ دنیائے علم و ادب میں افکار نے جو خدمات انجام دیں، اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ چنانچہ سال گرہ کے اس زریں موقع پر ادارۂ افکار کے تمام کارکنوں کو میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

زیادہ ادب والسلام۔

۱۷/۲/۶۸ء

خلوص کیش: ڈاکٹر قاضی دین محمد

ڈائرکٹر بنگالی اکیڈیمی - ڈھاکہ - پوربو پاکستان

انجمن ترقی اردو پاکستان

گذشتہ پچیس برس میں جن ادبی پرچوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دی ہے، ان میں "افکار"

کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اتنے عرصے تک کسی ادبی پرچے کا زندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے اور پھر 'افکار' نے محض زندگی کا ثبوت ہی نہیں دیا بلکہ صحت مند ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہ رسالہ اب ایک ادبی تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اسے صرف اعلیٰ درجے کے ادیبوں ہی کا نہیں ملک کے ذہین قارئین کا بھی تعاون حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ صہبا لکھنوی صاحب آئندہ بھی "افکار" کے ذریعے اردو زبان کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔

اختر حسین (ہلال پاکستان)

صدر انجمن

۲۰/۲/۶۸ء

ادارۂ مصنفین پاکستان

ادارۂ مصنفین پاکستان 'افکار' کو اس کی ۲۳ ویں سال گرہ پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

"افکار" نے اردو ادب کی بیش قیمت اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ علاوہ دیگر خوبیوں کے اُس کی باقاعدہ اشاعت ہمارے ادبی رسائل کے لئے ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔

آج کل ادبی رسائل جن دشواریوں سے دوچار ہیں ان کے پیش نظر یہ امر نہایت حیرت انگیز اور خوش آئند ہے کہ 'افکار' نہ صرف پابندی سے شائع ہو رہا ہے بلکہ نئے اور پرانے لکھنے والوں پر مشتمل ایک وسیع حلقۂ معاونین بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

ادارے کو یقین ہے کہ 'افکار' خوب سے خوب تر کی جستجو میں بڑی بڑی منازل طے کرے گا۔

جمیل الدین عالی

برائے ادارہ مصنفین پاکستان

۱۷ر فروری ۶۸ء

ترقی اردو بورڈ

صہبا صاحب، تسلیم

میں آپ کو "افکار" کی ۲۳ ویں سال گرہ پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ روپہلی جوبلی ابھی نہیں آئی مگر ۲۳ برس بھی کیا کم ہوتے ہیں۔ پھر سال گرہ تو ہر سال ہی منائی جا سکتی ہے۔ ملٹن نے اپنی ۲۳ ویں سال گرہ پر ایک مشہور سانیٹ لکھ کر ۲۳ ویں سال کو ایک خاص اہمیت دے دی ہے۔

آپ نے جن مشکل حالات میں اپنے پرچے کو زندہ اور توانا رکھا وہ ادبی خدمت کی ایک نہایت قابلِ قدر مثال ہے، اتنی محنت آپ کسی اور کاروبار میں کرتے تو یقیناً زیادہ پھل پاتے۔ مگر اب آپ کا اور 'افکار' کا نام جریدۂ عالم پر زندہ رہے گا۔ مجھے پھر ملٹن یاد آیا جس نے کہا تھا کہ شہرت توسنِ طبع کے لئے ایڑ کا کام کرتی ہے۔ شاید کرتی ہوگی، مگر شہرت تو بدنامی سے بھی حاصل ہو جاتی ہے، بلکہ سیر چشم لوگ شہرت ہی کو بدنامی کہتے ہیں ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ "بدنام" بہت ہے

آپ کی اس تگ و دو کا سبب وہ ذوق اور ذہن اور چینک تھی جو اہلِ علم کا مقدر ہوتی ہے اور انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

'افکار' کی پشت پر یا آپ کی کوشش تھی یا آپ کا خلوص جس نے اچھے ادیبوں کی ایک بڑی برادری کو آپ کے ساتھ تعاون پر مجبور کیا۔ اور آپ ہی پہلے مدیر تھے جس نے زندہ ادیبوں پر وہ نمبر نکالے جن کے لئے اب سے پہلے مرجانا شرط ہوتا تھا۔ آپ کے عام شمارے بھی بڑے سلیقے کے ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تلاش میں ہم معیاری رسائل کو بھی چھانتے رہتے ہیں اور آپ کے پرچے سے بھی کچھ نہ کچھ اخذ کرکے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں ڈالتے رہے ہیں۔

آپ کے اور افکار کے لئے میری دلی دعائیں۔

مخلص:

شان الحق حقی

سکریٹری ترقی اردو بورڈ، کراچی

۲۰ فروری ۱۹۶۸ء

قومی کتاب مرکز پاکستان

ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ماہنامہ 'افکار' اپنی ۲۳ ویں سالگرہ کا جشن منا رہا ہے۔ افکار نے اپنے مضامین اور نقطۂ نظر میں جس وسیع النظری سے آغاز کیا تھا اسے قائم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باشعور لکھنے اور پڑھنے والے ہمیشہ اس سے تعاون کرتے رہے ہیں۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو دانوں سے متعارف کرانے میں بھی افکار کا بڑا حصہ ہے، اور اس نے متعدد وقیع خاص نمبر بھی شائع کئے ہیں۔

نیشنل بک سنٹر، اس موقع پر افکار کے موسس اور مدیر صہبا لکھنوی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے، اور 'افکار' کی درازیٔ عمر کی دعا کے ساتھ اپنا پر خلوص تعاون بھی۔

ابن انشا (ڈائرکٹر)

۱۵ فروری ۱۹۶۸ء

ادارۂ یادگارِ غالب

پچھلی جنگِ عظیم کے بعد سے عام طور پر اور قیامِ پاکستان کے بعد سے خاص طور پر ہمارے معاشرے میں بڑی بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کا راست اثر اردو زبان اور اردو کے جرائد پر پڑ رہا ہے۔ ان اثرات میں شامل بعض نامساعد حالات بھی ہیں جن کا مقابلہ کرنا بہت بڑا ادبی جہاد ہے۔

قابلِ فخر ہے ماہنامہ 'افکار' جو گذشتہ ۲۳ سال سے مسلسل جہاد کرتے ہوئے علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اور اب بلند تر عزائم کے ساتھ اپنی عمر کے ۲۴ ویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب ماہنامہ افکار کی گذشتہ قابلِ قدر خدمات کو سراہتے ہوئے پر خلوص دعا کرتا ہے کہ یہ ماہنامہ اپنے

مخلص مدیر صہبا لکھنوی کی سرکردگی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

مخلص: ظفرالحسن

معتمد عمومی ادارۂ یادگارِ غالب

۲۰ر فروری ۱۹۶۸ء

ارشد اکیڈیمی - بہاول پور

محترم صہبا لکھنوی صاحب!

جب میں دیکھتا ہوں کہ ہماری قومی زبان "اردو" علاقائی عصبیت کے طوفان بلاخیز میں گھری ہوئی ہے، تو افسوس ہوتا ہے، لیکن جب آپ کی ذات اور آپ کے مجلّہ "افکار" پر نظر کرتا ہوں تو مجھے "دو روشنی کے مینار" دکھائی دیتے ہیں، اور کچھ طمانیت پاتا ہوں کہ جب تک آپ کا خلوص قائم ہے، کوئی حادثہ پیش نہیں آسکتا۔ آپ ہر سیلاب اور ہر طوفان کے مقابلے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

"افکار" نے جس عزم اور استقلال سے "اردو" کی خدمت کی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے، اور اسی طور اس مجلّہ کے مدیر کی حیثیت سے آپ نے جس ہمت سے، پاک و ہند کے کونے کونے تک قومی زبان کو پھیلانے میں سعی کی ہے وہ بہ طور مشکور ہے۔

آپ نے ایک نیا عزم بیدار کیا ہے، اور اپنی تحریروں سے سماجی شعور کو بصیرت دی ہے اور ابھرتے ہوئے امکانات کے ابلاغ کے لئے "افکار" کے صفحات کو ہمیشہ وقف رکھا ہے ——— خدا آپ کے عزم میں استقلال دے، اور "افکار" تابندہ و سوزندہ رہے۔

عبدالحمید ارشد

۱۸ر۲ر۶۸ء

کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ

برادرم صہبا صاحب،

آپ کے مشہور و معروف ماہنامہ "افکار" کے ۲۳ ویں جشن سالگرہ کے پُرخلوص دعوت نامے کا بہت بہت شکریہ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ "افکار" اُن چند گنے چُنے ممتاز ادبی رسالوں میں سے ایک ہے جنہوں نے پاکستان میں اردو زبان و ادب کی گراں مایہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں تمام تر مشکلات کے باوجود آپ نے جس عزم و حوصلہ اور ان تھک سعی و جہد سے افکار کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے وقف رکھا ہے۔ وہ بلاشبہ قابلِ صد تحسین ہے۔

یہ امر میرے لئے موجبِ مسرت ہے کہ آپ تقریباً ربع صدی سے اس ماہنامہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور افکار کو مزید کامیابی اور خوش حالی سے ہم کنار کرے۔

بہترین تمناؤں کے ساتھ

ایس، ایم، عثمان اللہ والا

۱۹ر۲ر۶۸ء

سید ضمیر جعفری

صہبا بھائی، سلام و نیاز۔

"افکار" کی ۲۳ ویں سال گرہ مبارک ہو! ـــــــ ادب و تہذیب کی تزئین میں "افکار" کا وسیع اور وقیع حصہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ "فکر و فن" کی داستان کو "افکار" کی داستانِ حیات سے الگ کر کے دیکھا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ خداوندِ کریم و رحیم آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھیں اور اپنے عظیم مشن کی بیش از بیش خدمت کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

سالنامے بلکہ کارنامے پر بھی دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سرہانے رکھ لیا ہے اور رفتہ رفتہ دیکھ رہا ہوں۔ یوں "سراپا" دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا ہے ـــــــ کیا عبارت، کیا اشارت، کیا ادا ـــــــ حیران ہوں کہ ہر لحاظ سے اس قدر عظیم الشان سالنامہ آپ نے ایک ہی سال میں کیونکر نکال لیا؟ میں آپ سے متفق ہوں کہ ادب پر قطعاً کوئی جمود طاری نہیں ہے۔ لیکن اگر کہیں جمود کا کوئی احساس تھا بھی تو وہ "افکار" کے اس دھماکے سے ٹوٹ گیا ہے۔

آپ کا اپنا:

ضمیر

۲۳ر فروری ۶۸ء

تقریبِ سال گرہ میں شاعرِ اعظم جوش ملیح آبادی کی آمد پر صہبا لکھنوی اور مسعود احمد برکاتی اُن کا استقبال کر رہے ہیں۔

حکیم محمد سعید دہلوی

خطبۂ صدارت

"افکار کے خصوصی شمارے جن میں جوش، فیض اور حفیظ جیسے زندہ شاعروں کے نمبر شامل ہیں ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل کرچکے ہیں۔ صہبا صاحب جیسے غیر ضخیم انسان کے لئے اتنے ضخیم نمبر نکالنا یقیناً بڑے حوصلے کی بات ہے۔ ایک ادبی رسالے کا اتنے عرصے تک زندہ رہ جانا معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

جناب صہبا صاحب، ادبائے کرام، خواتین و حضرات

میرے متعلق جناب صہبا صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ سراسر اُن کی محبت پر مبنی ہے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ محبت میں کہی ہوئی بات میں واقعیت بھی ہو۔ اگرچہ محبت ایک سچائی ہے اور اتنی بڑی سچائی کہ ادب کی تخلیق میں اس کا بڑا دخل ہے۔ زندگی سے محبت ہی کی بنا پر ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ ادب ایک ایسا عمل ہے جو زندگی کی تخلیق اور تعمیر بھی کرتا ہے اور ترتیب و تطہیر بھی۔ زندگی کے حسن کو نکھارنا اور بڑھانا ادب کا تخلیقی عمل ہے۔ ادب کا یہ عمل فکر کے نئے سانچے اور خیال کی نئی راہیں وجود میں لاتا ہے۔ جس سے زندگی کی محبت اور انسان کی عظمت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ ادب معاشرے کے احساسات، رجحانات اور جذبات کا ترجمان ہوتا

ہے لیکن یہ ترجمانی بھونڈی نہیں ہوتی بلکہ دائمی اقدار کے رشتے سے ظاہر ہوتی ہے ۔ معاشرے میں پائی جانے والی خوبیوں اور خامیوں کو ادیب آئینہ دکھاتا ہے ۔ لیکن یہ آئینہ صحافت کے آئینہ سے مختلف ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب بعض اوقات بُرائی میں بھی خوبی کا پہلو اور نامعقولیت میں بھی معقولیت کا شائبہ تلاش کر لیتا ہے ۔ کیونکہ ادیب کو زندگی عزیز ہوتی ہے اپنی زندگی سے زیادہ اپنے عہد کی زندگی، انسان کی زندگی، اعلا اقدار اور نئے افکار و خیالات کی زندگی ۔

جناب رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کو ماضی عزیز ہے یا مستقبل ؟ تو میں جواب دیتا ہوں کہ میں ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی پر اعتماد رکھتا ہوں ۔ یہ روایت بالمعنیٰ ہے ۔ رشید صاحب کے الفاظ شاید کچھ مختلف ہوں، خیال بہرحال یہی ہے ۔ انہوں نے چند الفاظ میں بڑے خوب صورت انداز سے بتایا ہے کہ "حال" زیادہ اہم ہے ۔ ماضی کی عظمت اور مستقبل کی امیدوں کی اصل اہمیت بھی حال ہی کے لئے ہے ۔ ادیب کا کام ماضی سے روشنی حاصل کرنا ہے ۔ اس کی پُوجا کرنا نہیں ہے ۔ اسی طرح بہتر مستقبل کی تلاش تو ادب میں منعکس ہوتی ہے ۔ لیکن انتظار محض جو مایوسی اور بے عملی کو دعوت دے ادب میں جگہ نہیں پاتا ۔ حال سے واضح رشتے کے باوجود ادب وقتی چیز نہیں ہے اور نہ محض تفریح کا ذریعہ ہے ۔ ادب کا عمل سیاست، سائنس اور معیشت کی طرح ہماری زندگی پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا ۔ ادب اپنے قاری پر جو اثرات چھوڑتا ہے وہ عمل کی قوتیں بیدار کرتے ہیں اور زندگی کے حُسن اور برکات و الطاف سے مستفید ہونے کی فضا تیار کرتے ہیں ۔ سچ پوچھئے تو سیاست کار اور سائنس داں بھی ادب کے مطالعہ کے بغیر فکر و عمل کی قوتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتے ۔ تہذیب جو سیاست و سائنس کو بلند مرتبہ بخشتی ہے اور جس کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے وہ سرگرم کار رہتے ہیں ادب کے توسط سے اپنا چہرہ نکھارتی ہے ۔

ادب اور ادیب کے کردار پر اس مختصر گفتگو سے ادبی رسالوں کی اہمیت پر بات پہنچ جاتی ہے ۔ ادب کی اشاعت کا پہلا مرحلہ ادبی رسائل کے ذریعے سے ہی طے ہوتا ہے ـــــــ خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں جہاں اشاعتی و طباعتی وسائل کی ترقی کے باوجود ابھی کتابوں کی جگہ اور بڑے پیمانے پر اشاعت ممکن نہیں ہو سکی ہے ۔ ادبی رسالوں کی اہمیت زیادہ ہے جو ادیب اور قاری کے درمیان ایک تیز رفتار رابطے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں، اور ایک طرف لکھنے والوں کو سوچنے اور لکھنے پر اُبھارتے ہیں، تو دوسری طرف پڑھنے والوں کو تازہ بہ تازہ فکری رجحانات اور ادبی موضوعات سے باخبر رکھتے ہیں ۔ نئے رجحانات سے بے خبری بہت سے قابل اور متبحر عالموں کو بھی لوگوں سے بیزار اور دنیا کو ان کے لئے اجنبی بنا دیتی ہے ۔ رسائل کا مطالعہ قدیم و جدید علوم و افکار کے درمیان بُعد کو دور کرنے کے لئے ایک پُل کا کام انجام دیتا ہے ۔ اسی کے ساتھ نئی کتابوں اور ان کے ادبی اعتبار پر نقادوں اور پڑھنے والوں کی بحثوں سے بھی اعلا ادب کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوتا اور ذوق تربیت پاتا ہے ۔

ایک اور اہم کردار جو میرے خیال میں ادبی رسالے انجام دیتے ہیں وہ ادیبوں کو خود تنقیدی اور خود احتسابی کا موقع فراہم کرتا ہے ۔ ادبی تخلیقات کی فوری اشاعت اور نقادوں اور پڑھنے والوں پر اس کا ردِ عمل ادیب کے فکر و خیال کے بہت سے گوشوں کو جلا بخشتا اور اظہار و ابلاغ کے نئے سانچے سجھاتا ہے ۔

خواتین و حضرات!

ماہنامہ افکار جس کی ۲۳ ویں سال گرہ آج ہم منا رہے ہیں ان رسالوں میں سے ہے جن کا میں اکثر مطالعہ کرتا رہا ہوں اور جن کی رفتار و معیار کو بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ میری رائے میں رسالے کا معیار بڑھانا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا مشکل معیار کو قائم رکھنا۔ جناب صہبا لکھنوی نے اپنی سلامت روی اور توازن سے افکار کے معیار کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خصوصاً افکار کے خصوصی شمارے جن میں جوش، فیض اور حفیظ جیسے زندہ شاعروں کے نمبر شامل ہیں۔ ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں ——— صہبا صاحب جیسے غیر ضخیم انسان کے لئے اتنے ضخیم نمبر نکالنا یقیناً بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ ایک ادبی رسالے کا اتنے عرصے تک زندہ رہ جانا معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں بہت کم رسالے اپنی زندگی کا ثبوت دے سکے ہیں اور جن رسالوں نے خسارے کے اس سودے کو نبھایا وہ مخزن، نگار، عالمگیر، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا اور ساقی کی طرح ادبی روایت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ صہبا صاحب کا تن تنہا ۲۳ سال تک افکار کو زندہ رکھنا ادب کی محبت اور مستقل مزاجی کا اعتراف کرا لیتا ہے۔

خواتین و حضرات!

میں اردو مجلس کے اراکین کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ادبی تقریب میں شرکت کی عزت اور مسرت بخش دی اور ادب کے بارے میں کچھ باتیں کہنے کا موقع فراہم کیا۔ شکریہ۔

جوش ملیح آبادی ماہنامہ "افکار" کی ۲۳ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں

جوش ملیح آبادی

افکار کی ۲۳ ویں سال گرہ

"صہبا صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے خونِ دل کے ایک ایک قطرے کو صرف کر کے اپنے رسالے کو اتنی مدت دراز تک چلایا اور پروان چڑھایا ہے اور ماشاءاللہ لہو لہان کھڑے ہیں۔"

خدا خدا کر کے جب وحشی و جاہل انسان نے 'خیر سے' تہذیب کے ریشمی پٹکے کو کمر میں باندھا، اور علم کی زریں کلاہ کو ماتھے پر کج کیا، تو اسی وقت سے تمدن کے دیگر تمام مسائل کے ساتھ ساتھ، اس نے ادب اور فلسفے کو خصوصیت کے ساتھ، اپنی توجہ کا مرکز بنانا شروع کر دیا۔

ادب نے آنکھوں کو جمالِ بینی کا درس دیا، پتھروں کو تراش کر حسین مجسمے طیار کئے، لوہے کو پگھلا کر کھنکتے ہوئے تار بنائے، کرخت آوازوں کو راگنیوں کے بول عطا کئے، سخت و سنگین اعصاب کو رقص کا لوچ مرحمت فرمایا، گونگی آدمیت کے منہ کو زبان بخشی، تیرہ و تار نفوسِ انسانی کی کھردری سطح کو، شرافت کی چھینیوں سے کھرچ کھرچ کر، چکنائی اور تاب ناکی سے دوچار کیا۔ پھر تھکی ہوئی زمین کی آہوں، اور مرجھائے ہوئے انسانوں کی کراہوں پر انسانوں کے دل کو دھڑکنے کی تعلیم دی۔ اور آخر کار عظیم شاعری کا دروازہ کھول دیا، اور شاعری کو پیمبری کے راستے پر ڈال کر دادرسی کی جانب روانہ فرما دیا۔

اسی طرح فلسفے نے انسان کے تیرہ و تار و نم گزیدہ کاسۂ سر میں روشن دان اور دریچے کھول کر دماغ تک صاف ہوا اور گرم روشنی پہنچانے کا راستہ صاف کیا

اُس نے علم کے بے ترتیب کباڑخانے میں قدم رکھ کر اُسے مرتب اور بامعنی بنا دیا۔ علت سے معلول اور معلول سے علت تک سفر کرنے کی راہیں کھول دیں، ایوانِ معارف و اسرار کے قفل کی کنجیاں ڈھالیں، گرہوں کے کھولنے کے واسطے ناخن پیدا کئے، خیر و شر کے معموں کو حل کیا، حیات و مرگ کے مسائل پر روشنی ڈالی، اور علوم کے مسالے سے ایک ایسا منارۂ بلند تعمیر کر لیا کہ اس پر چڑھ کر دماغِ انسانی عرشِ معلّی سے باتیں کرنے لگا۔

ادب اور فلسفے کے بعد سائنس نے آنکھیں کھولیں، اور آنکھیں کھولتے ہی پل بھر میں اس کا قد اس قدر بلند ہوگیا کہ دیکھنے والوں کی پگڑیاں گر گئیں۔

سائنس نے دھات کے آلات کو انسانی حواسِ خمسہ عطا کرکے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اُس کی پتھروں میں تیر جانے والی نظریں اُن پوشیدہ و غیر مرئی چیزوں کو دیکھنے لگیں جن کو آج تک کسی انسان نے نہیں دیکھا تھا —— اُس نے بے جسم کی چیزوں کو چھو لیا —— اُس نے بے ذائقہ چیزوں کو چکھ لیا —— اور گونگی چیزوں کی آواز سُن لی!

اُس نے لوہے کے تاروں کو مرغِ نامہ بر بنایا —— پرندوں کو جوڑ کر ہوا میں اُڑایا —— انتہا یہ ہے کہ مگس کی سی چیز کو بھی قوتِ پرواز عطا کر دی! —— پھر کیا تھا، سائنس بھی ادب اور فلسفے کے دوش بدوش سفر کرنے لگی، اور صدیوں تک سفر کرتی رہی۔

لیکن جب یہ ہماری صدی شروع ہوئی تو سائنس' ادب اور فلسفے' دونوں سے آگے نکل گئی، اور پھر رفتہ رفتہ ہماری یہ دنیا ادب اور فلسفے سے غافل ہو کر صرف سائنس ہی کی طرف آگئی —— اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس ہماری ایک بہت عظیم، پُرجلال و حلّالِ مشکلات اور قاضیٔ حاجات چیز ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ ادب اور فلسفے کے بغیر یہ دنیا' دنیا نہیں رہے گی، ایک ہولناک جنگل میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔

بے شک ہم سائنس کے توسط سے تمام قوائے کائنات اور تمام نظامِ شمسی کو مسخر کر لیں گے، لیکن اسے نہ بھولئے کہ اگر ہم ادب اور فلسفے سے دست بردار ہو کر فقط سائنس کے چیلے بن کر رہ جائیں گے تو ہم مہذب انسان نہیں رہیں گے بلکہ سانڈ بن جائیں گے، اور ایسے مہیب سانڈ جو آدمیت کو سینگوں پر اٹھا کر روند ڈالیں۔ اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ سائنس کو ضرور سینے سے لگائیں، میں خوش میرا خدا خوش، مگر، برائے خدا ادب اور فلسفے کے باغ کو بھی آب پانی دیتے رہیں کہ انہیں کی بنیادوں پر ہماری انسانیت کا تاج محل تعمیر کیا گیا ہے۔

اس لئے میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کے دل کو تہذیب کے چراغ سے روشن رکھنا ہے تو اپنے ادبی رسائل کی قدر کیجئے اور ان کا ہاتھ بٹانے کی سعادت حاصل فرمائیے۔

آخر میں صہبا صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے خونِ دل کے ایک ایک قطرے کو صرف کرکے اپنے رسالے کو اتنی مدتِ دراز تک چلایا اور پروان چڑھایا ہے۔ اور ماشاءاللہ ہونہار کھڑے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ کراچی اور لاہور کے رسائل رہتی دنیا تک قائم و دائم رہیں، اور ہماری کشتِ انسانیت کی آبیاری کرتے رہیں

سید سبطِ حسن

افکار کے حقوق
ادیبوں کے فرائض

> "کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خاص دھن، ایک خاص لگن اور اخلاقی جرأت جو میں نے اس دُبلے پتلے انسان میں دیکھی وہ یقیناً ایسی ہے کہ اس پر ہم سب جتنا فخر کریں کم ہے۔"

صدر محترم، خواتین و حضرات!

'افکار' کے دوستوں اور صہبا صاحب کے ملنے والوں کے اِس جلسے میں 'افکار' یا صہبا صاحب کے کردار اور اُن کی جو خدمات ہیں اردو ادب کے سلسلے میں، اُس پر میں زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کروں گا، اس لیے کہ مجھ سے پہلے احباب تفصیل سے فرما چکے ہیں۔

میں صہبا صاحب سے بالکل واقف نہ تھا۔ ۱۵ سال گذرے جب میں لاہور جیل میں نظر بند تھا، تو ایک دن مجھے ایک رسالہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خط ملا، میں نے رسالہ پڑھا ــــ اور خط پڑھنے کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ ہم معتوب لوگوں کو خط لکھتا ہے، تو میں نے ان کو جواب دینے کے بجائے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم

کو لکھا جو میرے بزرگ تھے اور شفقت فرماتے تھے کہ، حضور یہ کون صاحب ہیں؟ اور ان کو کیا تکلیف ہے جو مجھے خط لکھتے ہیں، اور ان کو سمجھائیے کہ خواہ مخواہ ایسے لوگوں کے ساتھ خط و کتابت نہ کریں ورنہ انہیں نقصان ہوگا اس کے بعد صہبا صاحب نے وہ خط بھی چھاپ دیا۔ اور خط و کتابت برابر جاری رہی —— تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خاص دُھن، ایک خاص لگن اور اخلاقی جرأت جو میں نے اس دُبلے پتلے انسان میں دیکھی وہ یقیناً ایسی ہے کہ اس پر ہم سب جتنا فخر کریں کم ہے۔

یہ شخص —— گذشتہ پچیس سال سے جس دُھن، جس محنت اور جس حوصلہ کے ساتھ اس رسالہ کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے اُس پر ہم سب کو نہ صرف یہ کہ ان کو مبارک باد دینی چاہیئے بلکہ کوشش اس کی بھی کرنی چاہیئے کہ اس رسالہ کو جو واقعی، جیسا کہ ممتاز صاحب اور مجتبیٰ حسین صاحب نے اور میرے پیش روحضرات نے فرمایا کہ اس کا اردو ادب کی تاریخ میں خاص مقام ہے —— یہ زیادہ سے زیادہ فروغ پائے —— اس میں زیادہ سے زیادہ تنوع اور موجودہ حالات کے مطابق زیادہ سے زیادہ دلکشی پیدا ہو۔

صہبا صاحب سے اکثر میری ملاقات ہوتی رہتی ہے اور ان کو جو شکایتیں ہیں —— مالی شکایتوں کی بات نہیں ہے —— بلکہ ادبی تخلیقات کے سلسلے میں ان کو جو شکایتیں ہیں وہ یقیناً آپ سے تو اس وقت نہیں فرمائیں گے لیکن وہ ایسی ہیں کہ آپ خود ان پر غور کریں۔

آپ غور کریں کہ ایک سو سال سے ہمارے ملک میں رسالے نکل رہے ہیں —— اور جیسے ہمارے ملک کے لوگوں کی عمر طبعی ۲۳ سال ہے —— اس طرح اتفاق سے رسالوں کی عمریں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں —— کوئی دس سال کے بعد مرجاتا ہے —— کوئی پندرہ سال کے بعد مرجاتا ہے —— کوئی زیادہ کھنچتا ہے تو ۲۰ —— ۲۲ سال چل جاتا ہے۔

لیکن صہبا صاحب نے اس رسالے کو ۲۳ سال تک جس طرح چلایا ہے —— اس کے بعد ان کے کچھ مطالبات ہیں، کچھ حقوق ہیں ہم پر اور ہمارے کچھ فرائض ہیں، جو ہمیں انجام دینے چاہئیں۔ خواہ وہ مالی ہوں یا ادبی اور تخلیقی ہوں ——

میں اس مختصر تقریر کے بعد آپ لوگوں سے پھر درخواست کروں گا کہ اس جلسے سے جب گھر تشریف لے جائیں تو پھر اس پر غور کریں کہ صہبا کو تو چھوڑ دیں —— اُن کے افکار کو کس طرح سے ہم اور زیادہ ترقی دیں اور بہتر رسالہ بنانے میں صہبا صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔

شاہد احمد دہلوی

—— "ماہنامہ افکار خاصی پکی عمر کو پہنچ گیا ہے لہٰذا ہمیں اس کی خوشی منانی چاہیئے اور حضرت صہبا لکھنوی کو مُبارکباد دینی چاہیئے کہ اُنھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ افکار کو زندہ رکھنے میں صرف کر دیا، اور یقیناً یہ ایک بہت بڑے ایثار کی مثال ہے۔"　　　اقتباس تقریر بتقریب ۲۰ ویں سالگرہ،

مطبوعہ افکار۔ شمارہ : ۱۵۴ - جون ۱۹۶۴ء

پروفیسر ممتاز حسین

افکار اور نیا شعور

> "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بعض کامیاب نمبر جو صہبا صاحب نے نکالے، اُن میں مالی دشواریاں ایسی پیش آئیں کہ انہیں اپنے گھر کا کچھ زیور بھی گروی رکھنا پڑا۔"

جناب حکیم صاحب، اور افکار کے قارئین، صہبا صاحب کے احباب!

'افکار' کا رسالہ غالباً سنہ ۴۵ء سے نکلنا شروع ہوا، اور میں افکار کے صفحات میں سنہ ۴۶ء سے لکھتا رہا ہوں۔ تقریباً ۲۲ سال یا ۲۴ سال ہوئے کہ افکار کے ساتھ میرا قلمی تعاون رہا ہے۔

یہاں پاکستان آنے کے بعد صہبا صاحب بہت پریشان رہے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ افکار کیونکر جاری رکھیں۔ انہوں نے بہت سے احباب سے مشورہ کیا ——— میرا مشورہ بھی یہی تھا کہ: آپ اس رسالہ کو جاری رکھیں۔ حالانکہ اس وقت صہبا صاحب کو کچھ ملازمتیں مل رہی تھیں جو کہ ان کو فارغ البال کر سکتی تھیں، اور وہ ان مالی دشواریوں میں مبتلا نہ ہوتے جن میں کہ اس پرچے کے نکالنے سے وہ مبتلا ہوئے ———
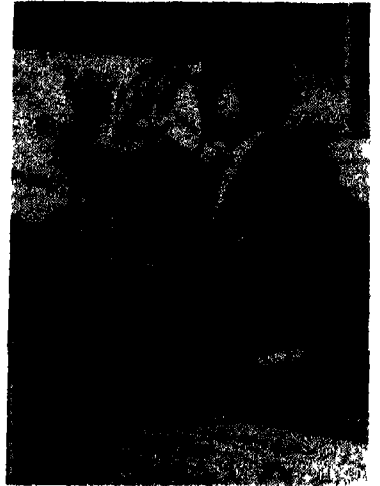
تو یہ مختصر سا حال ہے اور سنہ ۴۸ء یا سنہ ۴۹ء کے زمانے سے لے کر اس وقت کے زمانے تک وہ مسلسل اپنی کوششوں سے اس رسالہ کو کامیاب بناتے رہے

یہ رسالہ ایک عام ادبی رسالہ نہیں ہے۔ میری نظر میں ——— میں یہ سمجھتا ہوں کہ شروع میں وہ جس طرح سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ رہے نہایت پامردی کے ساتھ وہ اپنے اس مسلک پر قائم رہے ہیں۔ افکار کے صفحات دوسرے رسالوں سے قدرے مختلف ہیں۔ اس میں جو بھی مضامین، افسانے، نظمیں شائع ہوتی ہیں وہ مقصدی ہوتی ہیں اور ان میں ایک نیا شعور ہوتا ہے جس کا مقصد ملک و قوم کے لوگوں کو ایک نئے زاویۂ حیات کی طرف منعطف کرنے کا ہوتا ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب کہ تجارت اور تجارتی اغراض و مقاصد سارے رسالوں کے سامنے ہیں ——— صہبا صاحب کا اپنے مسلک پر قائم رہنا بغیر کسی قربانی کے نہ تھا ——— چنانچہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بعض کامیاب نمبر جو انہوں نے نکالے اُس میں مالی دشواریاں ایسی پیش آئیں کہ اُنہیں اپنے گھر کا کچھ زیور بھی گرد رکھنا پڑا ——— تو یہ کام جو ہے کوئی آسان کام نہیں رہا ہے ——— اور بہت سے لوگ جو یہ سوچتے ہیں شاید کہ صہبا صاحب بہت مالدار ہو گئے ہیں ——— میرا خیال یہ ہے کہ صہبا صاحب اس پرچے کو نکال کر زیادہ مال دار نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے لئے پریشانیاں زیادہ مول لی ہیں ——— اور اگر ان کی آپ روداد سُنیں گے تو صہبا صاحب کی تو آپ یقیناً یہی چیز باور کریں گے کہ اس زمانے میں ادبی رسالہ نکالنا ——— کسی مقصد کے تحت رسالہ نکالنا ——— بڑا مشکل کام ہے۔

ویسے اس ملک میں بہت سے رسالے نکل رہے ہیں، اور ان میں اچھی چیزیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں اور بعض رسالے ایسے ہیں جن کا معیار افکار سے بھی بلند ہے ——— تو کوئی مقابلہ اس وقت مقصود نہیں ہے اور نہ میں بڑھانا چاہتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ افکار کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔

آج ان چند الفاظ کے بعد میں صہبا کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ اس منزل میں ہیں کہ آج ۲۲ ویں یا ۲۳ ویں سال گرہ اس پرچے کی منا رہے ہیں اور میری بہترین دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

فیض احمد فیض

——— "ہمارے یہاں مشکلات کے باوجود محض اپنی دُھن اور لگن سے جو حضرات ادبی رسالے نکال رہے ہیں ان میں صہبا صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے میرے سرمایۂ سخن سے کہیں زیادہ ضخیم "فیض نمبر" جس محنت اور محبت سے شائع کیا ہے وہ آپ حضرات کے علم میں ہے اور اس کے لئے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔"

اقتباس صدارتی تقریر،

مطبوعہ افکار، شمارہ ۱۷۷، مئی ۱۹۶۶ء

پروفیسر مجتبیٰ حسین

افکار ایک ادبی تحریک

"صہبا صاحب کا رسالہ ایک ادبی تحریک بھی ہے اور ایک ادارہ بھی ـــ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب ہمارے ادبی رسالوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو صہبا صاحب کا نام ادبی مدیروں کی فہرست میں ممتاز نظر آئے گا۔"

حضرت جوش ملیح آبادی، خواتین و حضرات!

یہ اجتماع جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ادب دوستوں کا اور صہبا دوستوں کا اور افکار دوستوں کا ہے اور اس سلسلے میں جو باتیں کہی گئی ہیں افکار اور صہبا کے سلسلے میں وہ بہت ہی مناسب ہیں اور بہت ہی اعتدال کے ساتھ بھی کہی گئی ہیں حالانکہ اس سے زیادہ اعتدال کا تقاضا تھا۔ اور اس سلسلے میں میرے خیال میں کسی مزید اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چند اشارے کرنا چاہتا ہوں، وہ موجودہ رسالوں کی موجودہ صورت حال سے متعلق ہیں۔

ادھر ایک مدت سے ضخیم رسالے شائع ہو رہے ہیں اور وہ بڑے طمطراق کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں اور خاصے ادبی معیار کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ ظاہری بات ہے یہ ایک ادبی خدمت ہے اور کافی انتظار

کے بعد یہ سہ ماہی یا ششماہی رسالے شائع ہوتے ہیں ——— لیکن ہماری ادبی رفتار کو پرکھنے اور ادبی معیار کو جانچنے اور ادبی تسلسل کو برقرار رکھنے میں ماہناموں کا جو حصّہ ہے وہ بہت ہی اہم ہے اور ان ضخیم رسالوں کے دور میں ماہناموں کو نکالتے رہنا اور ان کو برقرار رکھنا اور ان کی بقا کا سامان کرنا، یہ بہت ہی اہم کام ہے اور صہبا صاحب نے بڑی خیر و خوبی کے ساتھ اس اہم کام کو انجام دیا ہے۔ صہبا صاحب کا رسالہ ایک ادبی تحریک بھی ہے اور ایک ادارہ بھی، اور میں سمجھتا ہوں کہ جب ہمارے ادبی رسالوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو صہبا صاحب کا نام ادبی مدیروں کی فہرست میں ممتاز نظر آئے گا۔

ان ادبی رسالوں میں جیسا کہ سرپنچ یا اودھ پنچ کا سا رسالہ جس کے مدیر منشی سجاد حسین صاحب تھے اور زمانہ تھا منشی دیا نرائن نگم کا ——— اور نگار رہے نیاز فتح پوری صاحب کا ——— اسی طریقے سے مخزن ہے سر عبدالقادر صاحب کا ——— بعد کے رسالوں میں صہبا صاحب کا نام بھی یقیناً اہمیت اور توجہ کا مستحق رہے گا۔

یہاں میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ جدیدیت کے سلسلے میں انجُم اعظمی صاحب نے میرے مضمون کی طرف اشارا کیا ہے۔ میں نے اقتباس اپنا نہیں دیا تھا ——— لن پیاؤ کا تھا ——— غالباً وہ نظر سے گذرے گا کہ جس میں گوریلا وار کے بارے میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ :-

We will fight against the enemy even with our bows and arrows.

میں نے اس کا ترجمہ کیا تھا ——— اب وہ جھگڑا لن پیاؤ کا ہے اور انجم اعظمی صاحب کا ہے ——— وہ جانیں اُن کا کام جانے۔

تو مجھے یہ عرض کرنا تھا ——— بہرصورت ——— میں اس موقع پر صہبا صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں، اور افکار کی سال گرہ کے سلسلے میں اپنے دلی خلوص و جذبات کا اظہار کرتا ہوں، اور امید ہے کہ افکار اس سے بہتر معیار کو برقرار رکھے گا۔ شکریہ۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"——— ادب میں رسالوں اور جریدوں کی ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے اور کئی لحاظ سے ادبی رسالے کتابوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ رسالوں میں جدید ادبی تحریکوں، رجحانات اور دیگر ادبی مسائل پر پہلے بحث ہوتی ہے اور انہیں پڑھنے کے بعد ہی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو ادبی رسالے انقلاب لا سکتے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے سخت تکلیفیں برداشت کر کے اُسے زندہ رکھا ہے ——— یہی نہیں بلکہ افکار کے ذریعہ اردو زبان و ادب اور علاقائی ادب کی بھی بڑی خدمت کی ہے ———"

اقتباس خطبۂ صدارت بتقریب ۱۶ ویں سالگرہ افکار

مطبوعہ افکار ——— شمارہ: ۱۰۹ ——— ستمبر ۱۹۶۰ء

پروفیسر انجم اعظمی

ادب اور ادبی رسائل

"نشر و اشاعت کی آسانی نے ادبی رسائل کے ذریعے ادب کا ایک ایسا مزاج پیدا کر دیا ہے جس کی حیثیت "انقلابی" ہے اور اب اس کا اثر تقریر، گفتگو اور منطق پر بھی پڑ رہا ہے"

موضوع اس بات کا متقاضی ہے کہ ادب اور ادبی رسائل کے تعلق کو بیان کیا جائے ماضی میں کیا تھا اب کس قسم کا ہے آئندہ اس کی شکل کیا ہوگی اور یہ کہ دونوں میں کیا تعلق ہونا چاہیے۔ لیکن یہ باتیں اور کبھی ہو جائیں گی پہلے اس موضوع کے پس منظر سے آگاہی ایک انتہائی ضروری امر ہے۔

یہ نشر و اشاعت کی آسانی کا دور ہے کام کی چیزیں ہی نہیں، نہ جانے کیا کچھ الا بلا چھپتا رہتا ہے اور سب کی کھپت بھی ہوتی رہتی ہے یہ کمال صنعتی شہر کی مارکیٹ کا ہے کہ مال جتنا چرپٹ ہوگا اتنی ہی جلد نکل جائے گا۔ رہا سوال نشر و اشاعت کی آسانی کا۔ تو اس عہد میں جتنی آسانی ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کو میسر آئی ہے اتنی ہی ادیب شاعر اور صحافی کو بھی حاصل ہے فی زمانہ ایک ادیب یا شاعر کو یہ ضرورت نہیں ہے کہ اپنی تخلیقات میں رتی برابر بھی خون جگر صرف کرے اور زندگی کا بہترین اور زیادہ

سے زیادہ وقت ان کی نذر کر دے۔ نشر و اشاعت کی آسانی کے سبب اس عہد میں وہ جو کچھ لکھے گا چھپے گا اور جس قدر بے تعلقی اور جلد بازی سے لکھے گا اتنی ہی تیزی سے چھپ چھپ کر دن دونی رات چوگنی شہرت پائے گا اُسے ان روایت پرست حاسدوں سے ذرہ برابر نہیں ڈرنا چاہئے جو روح عصر سے آگاہ نہیں ہیں اور اب بھی ادب و شعر کے سلسلے میں زندگی کے گہرے شعور کی باتیں کرتے ہیں اور ادراک و آگہی کا تذکرہ لے بیٹھتے ہیں کیونکہ موجودہ دور کے ایڈیٹروں اور پبلشروں نے ایسے حاسدوں کی مکمل شکست کا انتظام کر لیا ہے انہوں نے آج کے ادیب سے پورا پورا تعاون کیا ہے۔ یہ تعاون ان کی ضرورت بھی ہے۔

ادبی رسائل ادب کی اشاعت ہی کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ اس سے ادبی پرچوں کے ایڈیٹروں کی روزی بھی چلتی ہے انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ دور میں صرف ادیب ملتا ہے ادب کا قاری ہاتھ نہیں آتا اس لئے اپنی بیشتر توجہ اشتہارات کی فراہمی کی جانب مبذول رکھتے ہیں لیکن پرچے کی اشاعت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس میں چھپنے کے لئے کچھ نہ کچھ مواد موجود ہو اس صورت حال سے کامیابی کے ساتھ نبٹنے کے لئے ایڈیٹر قدیم و جدید انداز کے آسانی سے ہاتھ آنے والے ادب سے اپنے پرچے کا پیٹ بھر کر مفت میں تنوع بھی پیدا کر لیتا ہے روایت سے بھی رشتہ جوڑے رکھتا ہے اور تجربے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید کا کوئی ایڈیٹر یہ غلطی نہیں کرتا کہ آس پاس کے ادیبوں کو نظر انداز کر کے گوشہ نشین ادیبوں اور شاعروں کو لکھنے کی دعوت اور زحمت دے وہ ان ادیبوں اور شاعروں کو دل کی پوری کشادگی کے ساتھ چھاپتا رہتا ہے جو مشرقی روایات کے امین بن کر سراپا خاکساری کا نمونہ بنے ایڈیٹر کو نہ صرف اپنی ادبی تخلیقات سے برابر نوازتے رہتے ہیں بلکہ اس کے آگے پیچھے طواف کرتے رہتے ہیں کیونکہ ادب کی خرید و فروخت ایڈیٹروں کے تقدس کی سو فیصدی ضمانت ہے اور حساس۔ ادیبوں کی روح کی گہرائیوں میں اس کا احساس پیدا ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

آج ادب کے چھاپنے کی تکنیک میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا کر لی گئی ہے ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک پرچے میں چھپنے والی پندرہ بیس تخلیقات میں سے دو چار اعلیٰ معیار کی اور بقیہ معمولی ہوا کرتی ہیں پہلے کے ایڈیٹران دو چار تخلیقات کو اس طرح چھاپتے تھے کہ وہ قاری کی نگاہ سے کسی طور اوجھل نہ ہونے پائیں اس کے برخلاف ہمارے زمانے کا ایڈیٹر جمہوری روایات کا پاسدار ہے وہ اعلیٰ تخلیقات کو ابھارنے کے بجائے انہیں بھی دوسری تخلیقات کے برابر درجہ دیتا ہے اور گڈ مڈ کر کے شائع کرتا رہتا ہے تاکہ اچھی سے اچھی تخلیق قاری کی نظر سے اوجھل رہے۔

کل تک لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے لیکن آج ادب کی اشاعت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ کسی کو یہ سوال اٹھانے کی مہلت ہی نہیں دی جا سکتی کہ اچھا یا برا ادب کیا ہوتا ہے اور خدانخواستہ کسی نے یہ سوال اٹھایا بھی تو اس دوران کسی ادبی پرچے میں اس قسم کا ایک اعلان شائع کر دیا جائے گا کہ ۱۲ فروری ۱۹۹۱ء کی ادبی قدریں بروز جمعرات ۲۲ فروری ۱۹۹۱ء کو منسوخ کی جا چکی ہیں اور ان کی جگہ ادب کی نئی اقدار نے لے لی ہے جو اس ادب سے خود بخود پیدا ہوئی ہیں جس کا ابلاغ ممکن نہیں ہے کیونکہ پہلے بھی ادب کی اعلیٰ تر قدریں اسی ادب سے متعلق تھیں جس کا سمجھنا بے حد مشکل تھا۔ یہ منفی کی گڑیا ہے اس جملہ کا مفہوم کون نہیں جانتا لیکن ہیملٹ کا کردار بے حد پیچیدہ تھا اب زمانے نے تھوڑی سی اور ترقی کر لی ہے اس لئے جس ادب کا سمجھنا مشکل تھا اس کے ابلاغ کو ناممکن بنا کر انسانی فہم، تخیل اور جرأت کو آزمایا گیا ہے۔

غالب کا تخیل سرحد ادرک سے پرے جا پہنچتا تھا اور وہاں اپنا سجود ڈھونڈتا تھا لیکن جدید شاعری کے بعض ایسے نمونے بھی

آپ کو دیکھنے کے لئے مل جائیں گے جن میں شاعر نے اس تخیل سے ماورٰی اپنا نشیمن بنایا ہے آج کا یہ شاعر انسانی فطرت کی تلاش و جستجو اور اظہار ذات کی کوشش میں ابلاغ سے بے نیاز ہو کر ابتدائی انسان کی طرح گونگا ہوتا جا رہا ہے۔

نشر و اشاعت کی آسانی نے ادبی رسائل کے ذریعہ ادب کا ایک ایسا مزاج پیدا کر دیا ہے جس کی حیثیت "انقلابی" ہے اور اب اس کا اثر تقریر، گفتگو اور منطق پر بھی پڑ رہا ہے مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار رائٹرز گلڈ کے سکرٹری جنرل جناب جمیل الدین عالی سے کسی نے کہا تھا کہ ہماری انجمن میں ادیبوں سے زیادہ صحافی شامل ہو گئے ہیں کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہئے کہ صرف ادیب ہی اس کے ممبر رہ جائیں۔ عالی نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا کہ یہی میں بھی چاہتا ہوں لیکن یہ کیسے ثابت کیا جائے گا کہ فلاں شخص ادیب نہیں ہے آخر صحافی بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں ان میں سے بعض مضامین اور فیچر ہی نہیں نظمیں اور غزلیں بھی چھپواتے رہتے ہیں عالی کا جواب بے حد معقول اور تشفی بخش تھا آپ بھی غور فرمالیں کہ لکھتے رہنے اور چھپواتے رہنے میں کیا کیا رمز پنہاں ہیں۔ عالی کا جواب سن کر مجھے اس دن یقین آگیا کہ ہمارے ملک میں ادیبوں کی یہ زبردست انجمن کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ عین ممکن ہے کہ نامساعد حالات کے سبب ملک بھر میں ایک ادیب بھی باقی نہ رہے لیکن گلڈ خدا کے فضل و کرم سے قائم و دائم رہے گا اور پھلتا پھولتا رہے گا اس عملی منطق کے پیدا کرنے میں موجودہ ادبی فضا کا بڑا ہاتھ ہے جسے ادبی رسائل اور ادیبوں نے مل کر پیدا کیا ہے اسی طرح یہ فضا تقریر کے فن پر بھی اثر انداز ہو چکی ہے۔

پچھلے دنوں کراچی یونیورسٹی نے "جدیدیت" پر ایک سمپوزیم منعقد کرایا ایک مقرر نے ڈائس سے یہ فرمایا "دور انحطاط کا ادب بھی انحطاط پذیر ہوتا ہے"۔ انقلاب سے پہلے کا روسی ادب جس میں ٹالسٹائے کی تخلیقات بھی شامل ہیں ان کے اس ایک جملے سے قلب ماہیت پر مجبور نظر آیا۔ اور میر و غالب کے فن نے ہاتھ جوڑ کر مقرر سے عرض کیا کہ اپنے الفاظ واپس لے لیجیئے ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے اور آپ کے اس ایک جملے پر عمر بھر کی کمائی لٹا بیٹھیں گے۔ چونکہ مقرر کے خیالات کی ناگزیر اشاعت کے بہانے اس جملہ کی اشاعت کا انتظام بھی خدا کی جانب سے ہو چکا ہے اس لئے نشر و اشاعت کی آسانی کے انقلابی رول کا تھوڑا بہت اندازہ ہم آپ لگا سکتے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی کے اسی سمپوزیم میں ایک اور مقرر نے کہا کہ ایٹمی ہتھیاروں کا مقابلہ مشرق تیر و تفنگ[ل] سے کر رہا ہے آج مغرب کے لوگوں کو چاہیئے کہ ہماری اس جدیدیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مقرر کے ان جملوں میں ویت نام کی جنگ کا تاثر ابھارا گیا ہے لیکن جملے کتنے پہلو دار ہیں کہ کہنے والے نے تیر و تفنگ میں اپنی قدامت پرستی کا زہر سمو کر بزعم خود دشمن کو ہلاک بھی کیا اور مغرب کو مشرق کی جدیدیت کا تماشا بھی دکھایا اس نے ایٹمی ہتھیاروں اور تیر و تفنگ کی لڑائی میں کس خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ تیر و تفنگ کو فاتح بنا دیا ہے یہ کسی کی نظر میں جدیدیت ہو یا نہ ہو ایک جدید دور کے شعلہ بیان مقرر کا کمال ضرور ہے کہ ویت نامی جو جنگ اپنے وجود کی بقا کے لئے لڑ رہے ہیں اس کو بھی سستی جذباتیت میں بدل دیا۔ انسانوں میں جینے کی امنگ ہے

[ل] نوٹ:۔ مقرر نے بعد کو بتایا کہ یہ بات لن پیاؤ نے کہی ہے لیکن لن پیاؤ کی تحریر کے انگریزی ترجمے EVEN WITH ARROWS کا صرف ایک مفہوم ہے کہ ہتھیار ڈالنے کے بجائے، ہم دشمن سے آخری دم تک لڑتے رہیں گے اور مقرر کی بات اس سے بالکل مختلف ہے۔

تو آگے بڑھنے کا راستہ نکل ہی آئے گا لیکن یہ راستہ آج کی دفاعی جنگ میں تیر و تفنگ جیسے کند ہتھیاروں کے استعمال سے نہیں نکل سکتا بلکہ اس کے لئے انسانیت کے قاتلوں پر پوری قوت سے راکٹ برسانے ہوں گے اور جینے کی امنگ کے ساتھ ہی ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی اپنے تخلیقی ذہن کی آزمائش کرنی ہوگی ہوچی منہ نے یہ نہیں کہا کہ ہم کند ہتھیاروں سے لڑ رہے ہیں اس نے "امن پسند" دنیا سے صرف یہ سوال کیا کہ جنگ کے دوران پیدا ہونے والے اور پل کر بڑے ہونے والوں سے وہ کس امن کی باتیں کرے گی۔

اب آپ کو یقین آچکا ہوگا کہ ادب اور ادبی رسائل کا چولی دامن کا ساتھ ہے ماضی میں یہ تعلق جیسا بھی رہا ہو اس کے مقابلے میں آج بہت گہرا ہے اس تعلق میں اب یکسانیت بھی نہیں رہی کہ ہمہ وقت صرف ادب ہی کا فروغ ہوا جا رہا ہے آج ادب کے فروغ سے ہٹ کر ادیب و شاعر کو شہرت، ایڈیٹر کو اپنے کاروبار، قاری کو اس کے خطوط کی اشاعت، پروفیسر اور افسر ادیب کو اپنے بہتر کیریر کے ذریعہ مسلسل فائدہ پہنچ رہا ہے گویا ہمارا جدید ادب زندگی کی تمام سمتوں میں پھیل رہا ہے لیکن افسوس کہ ہمارے بعض نقاد اور شاعر اب بھی ایسے ہیں جو ان میں سے کسی بات کو اچھا نہیں سمجھتے اور اپنی "قدامت پرستی" پر برابر اڑے ہوئے ہیں اور یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ ادب کی تخلیق آسان کام ہے وہ ادبی رسائل کی خدمات کے بھی قائل ہیں اور صہبا لکھنوی نے جس محنت اور عرق ریزی سے جوش نمبر، غالب نمبر، فیض نمبر وغیرہ نکالے ہیں اسے دل کھول کر سراہتے ہیں۔

کاش یہ لوگ بھی ہماری ہی طرح موجودہ دور کے ادب اور ادبی رسائل کے تعلق اور انقلابی رول سے واقف رہتے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تقریب سالگرہ کے شرکاء کا ایک عام منظر
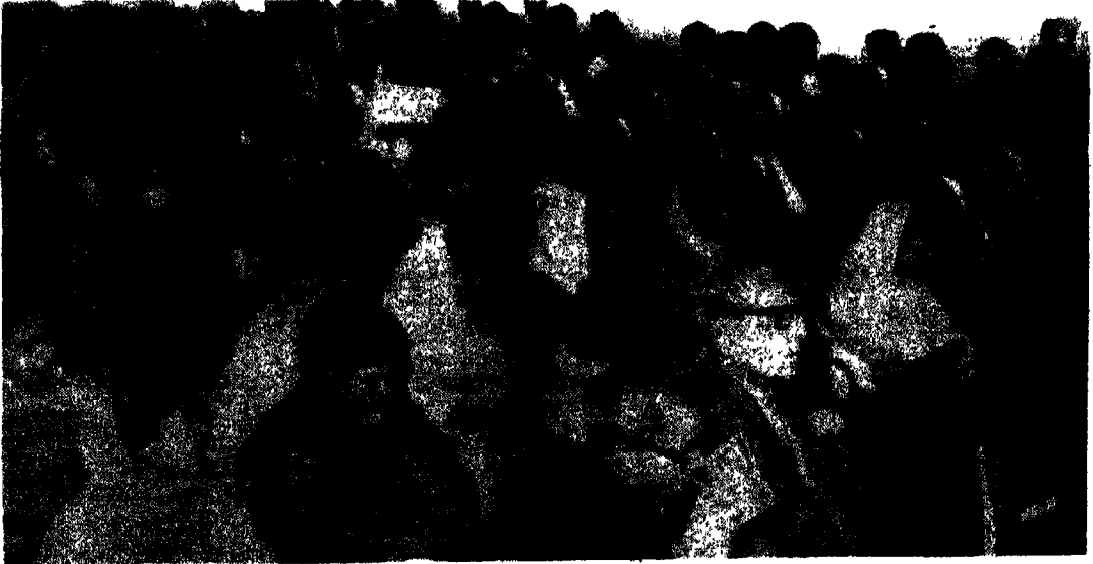
اس تقریب میں کراچی کے تقریباً چار سو نمائندہ ادیبوں، شاعروں صحافیوں اور باذوق خواتین و حضرات نے شرکت فرمائی،

سحر انصاری

افکار کی خدمات

"صہبا صاحب نے بڑے عزم و استقلال کے ساتھ نہ صرف اپنے رسالے کو جاری رکھا، بلکہ اس کے معیار کو بھی آگے بڑھایا ہے ان کی روشن خیالی نے ادبی رسالے کے بعض ایسے گوشے ابھارے جو اس سے پہلے ہمارے ہاں موجود نہ تھے"

جب سے ادب کا رشتہ مطبع کی مشینوں سے قائم ہوا ہے، اُس وقت سے ادب کی اجارہ داری کا تصور بھی ختم ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں کتابوں سے زیادہ رسالوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ——— ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ ادبی رسالے عموماً کسی تحریک یا کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر نکالے گئے ہیں مغرب میں متعدد رسائل ادب کی ترویج اور تاریخ میں اہم حصہ لیتے رہے ہیں۔ اور خود بھی تاریخ کا حصہ بنتے رہے ہیں
انگریزی میں اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالوں اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کی مثال موجود ہے جن کو قابلِ تقلید نمونہ بنا کر سر سید احمد خاں نے اپنا 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا تھا۔ یوں سر سید کی اصلاحی تحریک نے جہاں پہلی بار ادب کو تحریک کے تصور سے آشنا کیا وہاں تحریک کے اہم مقاصد کو بروئے کار لانے اور اپنے جدید

ریات کی ترویج و اشاعت کرنے کے لئے اس رسالے سے بھی اہم کام لیا ۔

ذیب الاخلاق کی بدولت اردو نثر کے نئے نئے امکانات سامنے آئے اور تاریخ، فلسفہ اور ادب کے متنوع موضوعات
لکھنے والوں کا ایک اہم اور معتبر گروہ پیدا ہوا ــــــ پھر اسی برصغیر میں صلائے عام، دلگداز، مخزن، الہلال، البلاغ،
.دوئے معلّی، ہمایوں، عالمگیر، نگار، ساقی، ادبی دنیا اور نیرنگ خیال ایسے رسالوں کی ایک اہم فہرست موجود ہے۔ برصغیر
ں علم و ادب کے مذاق کو نکھارنے اور ایک ادبی سلیقہ عطا کرنے میں ان رسائل نے جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ محتاج بیان
ہیں۔

اردو کی دوسری اہم تحریک ترقی پسند تحریک ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے ہولناک تجربوں اور برصغیر میں سیاسی و
ماجی شعور کی بیداری کے زیر اثر سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد نئے مزاج اور نئے انداز کے رسالے شائع ہوئے۔ جن کی بدولت ادب کی
ئی بحثیں سارے ملک میں شروع ہو گئیں، تنقید، شاعری، افسانہ، ڈراما، ناول، غرض تمام اصناف ادب کی نئی جہتوں کو
یش کرنے اور ان کے لئے ایک نئی فضا تیار کرنے میں تیسری اور چوتھی دہائی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں نے اہم منصب
ا کیا ہے۔

ماہنامہ افکار کی مسلسل اشاعت کو اب ۴۳ برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کا
یک سرسری جائزہ بھی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ رسالہ جب تجارت کی بنیاد پر جاری رکھا گیا ہو تو وہ خود ایک روایت
ن جاتا ہے۔ اور اس کے مدیر کی شخصیت اور مزاج کا ایک جزو لازم قرار پاتا ہے۔ اپنے پیش رووں کی طرح صہبا صاحب
نے بھی بڑے عزم و استقلال کے ساتھ نہ صرف اپنے رسالے کو جاری رکھا بلکہ اس کے معیار کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ اُن کی
وشن خیالی نے ادبی رسالے کے بعض ایسے گوشے اُبھارے جو اس سے پہلے ہمارے یہاں موجود نہ تھے۔ افکار نے یکے بعد
یگرے جن اہم شخصیات پر نمبر شائع کئے ہیں ان میں منٹو، مجاز، جوش، حفیظ، فیض اور غالب پر شائع ہونے والے نمبر
ن کے سلیقے، حسن ترتیب اور منفرد انداز سے ادبی تخلیقات کو یکجا کر دینے کی صلاحیت کے آئینہ دار ہیں۔ جوش نمبر سے انھوں
نے زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کی جو روایت قائم کی ہے اور ہمارے شاعر اعظم کی زندگی اور فن کو جس انداز سے پیش
یا ہے اس نے برصغیر کے بہت سے ادبی رسالوں کو راہ دکھائی ہے۔

صہبا صاحب اپنے پرچے کو محض اس لئے شائع نہیں کرتے ہیں کہ اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اور
وہ اس کے قائل ہیں کہ ؎

نباہے جا، نہ کر ترکِ محبت
بہت دن شہر میں چرچا ہوا ہے

نباہنے کے اس عمل کو وہ سسک سسک کر زندگی گزارنے سے تعبیر کرتے ہیں، جو انہیں یکسر ناپسند ہے۔ انہیں
انائی، محنت اور حوصلے سے محبت ہے، شاید اسی لئے ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ خوب سے خوب تر کی طرف سفر جاری
ہے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں پوری ذمے داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کام کر کے بھول جانے

والے افراد میں سے ایک ہیں وہ اپنے کسی کام کو "کارنامہ" نہیں سمجھتے۔ اور اپنی مسلسل جدوجہد کے بارے میں انہیں کوئی غلط فہمی بھی نہیں ہے۔ اشتہاری ضرورت کی بات اور ہے۔ نجی محفل یا کسی اجتماع میں میں نے کبھی انہیں اس بات پر فخر کرتے نہیں دیکھا کہ ان کے ترتیب دیئے ہوئے نمبر برصغیر کی اعلیٰ درس گاہوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

افکار نے برصغیر کے پرانے اور نئے ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کا کام بڑی لگن سے کیا ہے۔ افکار میں بیشتر اہم ادبی مباحث پر وقتاً فوقتاً مضامین اور مذاکرے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس پچیس سال کے اردو ادب کی تخلیقی رفتار کا دیانت دارانہ جائزہ لیتے وقت 'افکار' سے رجوع کرنا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ عالمی ادب اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے منثور اور منظوم تراجم جس التزام اور پابندی کے ساتھ افکار میں شائع ہوتے ہیں' اس کی مثال برصغیر کے ادبی رسائل میں ملنی مشکل ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستان میں علاقائی ادب کے اردو ترجموں کی طرف سب سے پہلے افکار ہی نے توجہ دی۔ چنانچہ جب سرکاری ادارۂ مطبوعات نے علاقائی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت کے پیش نظر ایک کتاب مرتب کی تو متعدد تراجم 'افکار' ہی سے لئے گئے۔

اردو ادب کو جدید عہد کے پس منظر میں پیش کرنے اور جدید نقطۂ نظر کے مطابق ادبی تخلیقات کو پرکھنے کے عمل کو بھی افکار نے بہت عزیز رکھا ہے۔ ہر ماہ غیر مطبوعہ اور معیاری تنقیدی مضامین کا حصول اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، انجم اعظمی، حنیف فوق اور آغا افتخار حسین نے مختلف ادوار میں بڑی پابندی اور ذمہ داری کے ساتھ افکار کے لئے مسلسل مضامین لکھے ہیں۔ ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ افکار نے سائنسی ادب کی اشاعت پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ افکار واحد ادبی رسالہ ہے جس نے تقریباً ایک سال تک ہر ماہ سائنس کے بعض اہم موضوعات مثلاً نظریۂ ارتقا، زمان و مکاں، اضافیت اور توارث پر مضامین شائع کئے۔ کسی ایسے رسالے کے لئے جو معاوضہ نہ دیتا ہو اس طرح ادیبوں کا مستقل تعاون حاصل ہونا نیک نیتی اور خلوص کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

افکار جدید ذہن کی نمائندگی کرتا ہے لیکن وہ مزید معیاری اور جدید ہو سکتا ہے، بشرطیکہ افکار ایک ایسا درخت بن جائے جو خشک پتوں سے زیادہ تازہ کونپلوں کو اپنے حسن کی علامت سمجھتا ہے۔ بہرحال مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ افکار کے مدیر جدید دور کے تقاضوں کے مطابق افکار کی ترتیب اور مواد میں مناسب تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود وہ بڑے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنا رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں 'افکار' ایسے معیاری ماہنامے کی اشاعت کے لئے اچھے اہل قلم کا تعاون، مسلسل محنت اور روشن خیالی اور ان سب سے بڑھ کر بے پایاں خلوص ضروری ہے ۔۔

گریہ نہیں تو بابا سب کچھ کہانیاں ہیں

قمر ہاشمی

اردو اور افکار

اردو اگر ہے آہوئے رم خوردۂ تتار
افکار بوئے نافۂ مشکین کیف بار

اردو نے فکر و فن کے کھلائے ہزار باغ
افکار فکر و فن کے حدیقوں کا ہے سراغ

اردو ہے موتیوں کے خزانوں کا سلسلہ
افکار ان کی آب سے پرتو ہے نور کا

اردو جمال و حسن کے اوراق کی کتاب
افکار اسی کتاب تجمل کا ایک باب

اردو ہے میر و غالب و مومن کا آئینہ
افکار جوش و فیض کے فن کا صنم کدہ
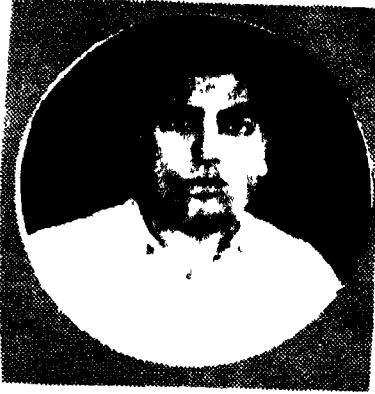
منیر احمد دہلوی

افکار و صہبا

افکار

سوچتا ہوں، یہ زندگی کیا ہے
سال لمحوں میں گھلتے جاتے ہیں
وقت بہتا ہے آب جُو کی طرح
وقت کی موج کی طرح پیہم
بڑھ رہا ہے سُبک خرامی سے
علم و دانش کا کارواں 'افکار'
نوجواں نسل کا نمائندہ
ایک تحریک ہے جریدہ نہیں
فکر و فن کا نگارخانہ ہے

سیکڑوں عصرِ نو کی تحریریں
عظمتِ آدمی کی جویا ہیں
سال لمحوں میں گھلتے جاتے ہیں
اب ہے ۲۳ سال کا 'افکار'
جشن ہے آج سالنامے کا
زندگی کے سفر میں اے ہمدم
ساعتیں ایسی بار بار آئیں

صہبا

کون ہے میرِ کارواں؟ صہبا
چلنے پھرنے میں، جاگتے سوتے
فکر 'افکار' ہی کا ہر دم ہے
خلوتوں جلوتوں میں، محفل میں
ذکر 'افکار' ہی کا پیہم ہے
اک مسلسل خیال ہے صہبا

اس قدر مختصر سے مجثّے میں
آگ بھی، پھول بھی، شبستاں بھی
عشق بھی، آرزو بھی، امکاں بھی
عزم و ہمت کا ایک طوفاں بھی
دوش و فردا کا حال ہے صہبا
اک مسلسل خیال ہے صہبا

مختار زمن

جشنِ سال گرہ

"آج کل کے زمانے میں کوئی صاحبِ مرتبت طویل و عریض سیٹھ اگر بے چارے سینک سلائی کشتۂ ادب صہبا کو دیکھے گا تو یہی کہے گا" یہ تو ایک دم کنڈم آدمی ہے ــ کوئی بیوپار نہیں جانتا۔ اس کا مستقبل بڑا ہی دھندلا ہے"۔

جناب صدر،

ہمارے محترم دوست صہبا صاحب بھی ایک عجیب و غریب اور یگانۂ روزگار ہستی ہیں کہ ۲۳ سال سے "افکار" کا بوجھ اپنے سر پر لادے ہوئے ہیں۔ بعض اہل نظر یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی غم پالنے کا شوق ہے تو "بُز بجز" پر عمل درآمد کیا جائے کہ "بُز" کی کھال تو ہاتھ آہی جاتی ہے جب کہ ادب کے کاروبار میں اپنی ہی کھال اُدھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ ہمارے سماج کے "بڑے لوگ" جن کے ہاتھوں میں ہم فانی انسانوں کی قسمتوں کی باگ ڈور اور عظیم الجثہ بتوں کی ڈور ہے، غالباً صہبا صاحب کو اسی انداز سے دیکھتے ہوں گے جیسے راجہ بھوج گنگوا تیلی کو، یا سقراط شیخ چلی کو، یا ہمالیہ پہاڑ ترائی میں پڑے ہوئے سنگ ریزوں کو آج کل کے زمانے میں کوئی صاحب

مرتبت طویل و عریض سیٹھ اگر بے چارے سینک سلائی، کشتۂ ادب صہبا کو دیکھے گا تو یہی کہے گا ۔" یہ تو ایک دم کنڈم آدمی ہے۔ کوئی بیوپار نہیں جانتا۔ اس کا بجا رہنا مندو ہے "۔۔۔ اور میں جب صہبا صاحب کو دیکھتا ہوں تو کچھ اس قسم کے اشعار اور مصرعے ذہن کے افق پر منڈلانے لگتے ہیں جیسے ؏

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

یا

لڑا دے ممولے کو شہباز سے

یا

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یا

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

مگر آپ میری باتوں پر نہ جائیے۔ میری بات میں کیا وزن ہو سکتا ہے، نہ میں ساہوکار نہ تھانیدار نہ کسی سرکاری دفتر کا اہل کار ۔۔۔ آپ خود صہبا کو دیکھئے اور عبرت پکڑئیے۔ آپ کے رسالے کا نام ہے "افکار"۔ آپ ہمیں دعوتِ فکر دے رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب آپ کسی عالی شان ہوٹل میں صرف دعوت دیں۔ کبھی اگر "ویسی" دعوت دینے کا مقدور نہیں تو دعوتِ فکر کیا ضرور ہے، خاموش بیٹھے رہو، علاوہ ازیں یہ فکر کا موقع نہیں عمل کا دور ہے، لوگ عاملوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ہر کامیاب شخص کوئی نہ کوئی عمل کر رہا ہے اور اپنا نامۂ اعمال بھر رہا ہے۔ سمجھ کا تقاضہ تو یہی ہے کہ افکار کے دفتر کو غرق مئے ناب کر دیں اور کوئی دوسرا دھندا ڈھونڈیں۔ افسر نہیں بن سکتے، رشوت نہیں لے سکتے تو شوق سے کھا دیجئے، ہڈی کا بیوپار کیجئے۔ گندے بہروزے کا بزنس جمائیے۔ آپ کہیں گے کہ اس کا تجربہ نہیں قلم گھسنے کی عادت ہے تو مزے سے چٹپٹے مسالے دار باتصویر ناول لکھئے، ایکٹریسوں کی آپ بیتیاں تصنیف فرمائیے۔ فلمی پرچوں کا میدان وسیع ہے۔ اس میں اپنے اشہبِ قلم کو دوڑائیے۔ اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ آج کل سماج کی ترقی کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ بہتی گنگا ہے۔ لوگ خوب خوب ہاتھ دھو رہے ہیں۔ لیکن یہ ادب کی خدمت کا قصہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی دھارے کی مخالف سمت پیرنے کی کوشش کرے۔ یوں تو خدا بڑا رزاق ہے اہلِ قلم کی روٹی بھی چلتی ہے اور رزق کے بہانے پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے بالکل ناامید ابھی نہ ہونا چاہئے۔ کبھی کبھی لیڈروں کو لاعیٹوں کے علاوہ قلم چلانے کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ صبح کو کان پر قلم رکھ کر نکلیں، تو محبوب کو خط لکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے کسی لیڈر ہی کو آپ کی خدمات کی ضرورت پیش آجائے۔ جیسا کہ ہمارے ایک مشہور افسانہ نگار کے ساتھ ہوا۔

جناب صدر کی اجازت سے میں یہ قصہ بھی سناتا چلوں ؛

روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ اسی شہر کراچی میں ۔۔۔۔ جو لیاری کوارٹرس سے لے کر کلفٹن اور انٹرکانٹی نینٹل

تک کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے ـــــــ ایک جغادری قسم کے افسانہ نویس کہیں میاں جی گری کرتے تھے۔ مالک اس مدرسے کا نہایت دولت مند اور سیر چشم تھا۔ علم کی کمی کو دولت سے پورا کرتا تھا، بلکہ علم اس کے سامنے ہمیشہ دست بستہ حاضر رہتا ـــــــ ناگاہ ایک سال الیکشن کا ہنگامہ برپا ہوا، اور وہ صاحب جاہ وحشم الیکشن میں کھڑا ہوا۔

مصاحبین نے رائے دی کہ "حضور کئی لاکھ پمفلٹ لکھوا کر شہر میں تقسیم کرائیے اور قوم کے لئے اپنی خدمات گنوائیے مگر پمفلٹ ایسی مؤثر زبان میں تحریر کئے جائیں کہ دل سینوں سے کھنچ آئیں اور ہاتھ حضور کے بیلٹ بکس کی طرف جائیں۔"

اُس دولت مند نے پوچھا کہ: "یہ تو ٹھیک بولتا پر لکھنے والا کدھر ہے؟"

عرض کیا کہ "حضور کے یہاں ایک میاں جی ہیں وہ بڑے لکھاڑ ہیں۔"

حکم کی دیر تھی، افسانہ نویس کو طلب کیا گیا، اور اس صاحب عز و وقار نے پوچھا:

"ہم سُنا ہے کہ گالب کوئی تمہارا بڑا لکھنے والا تھا۔"

عرض کیا کہ بجا فرمایا۔"

وہ ران پر ہاتھ مار کر بولا کہ "بس تم ایسا ہی پمفلٹ لکھو جیسا گالب لکھتا تھا۔ ہم تمہیں سو روپیہ دے گا۔"

ـــــ تو دیکھا آپ نے یوں اہل قلم کے لئے قلم رزق کا بہانہ بن سکتا ہے۔ مگر یہ دور وہ ہے جب لوگ مٹی سے سونا بنا رہے ہیں ـــــ بلکہ یہ محاورہ اب امر واقعہ بن چکا ہے ـــــ ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو حالات "خرکاراں" پاکستان جو اپنے غلاموں سے پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکوں پر مٹی کی کھدائی کرواتے ہیں اور خود شورلیٹ میں گھومتے ہیں ـــــ ایسی فضا میں صہبا صاحب افکار کی فکر میں گرفتار ہیں۔ انہیں ادب کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ خوش قسمتی سے آج حکیم سعید صاحب یہاں موجود ہیں، میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیوں صاحب "قانون شیخ" میں اس مرض کا ذکر ہے یا نہیں؟ یا شاید آپ نے تحقیق و تدقیق کی ہو گی۔ بہرصورت آپ ہی اس مرض کا کچھ علاج بتائیں تو بات بنے، ورنہ ع

عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے"

جوش ملیح آبادی

ـــــ" میرے نزدیک 'افکار' کا یہ نمبر میرے باب میں ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو آئندہ نسلوں کی بہ ہمہ وجوہ رہنمائی کر سکے گی اور اس سلسلے میں صہبا صاحب کا یہ اقدام اولیں ادبیات اردو کی تاریخ میں تا قیامت دائم و قائم رہے گا۔"

اقتباس مضمون بعنوان "ضربِ شاہد بعشرتِ شاہدانہ"

مطبوعہ افکار، جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن) شمارہ: ۱۲۲، ۱۲۳، اگست ۶۲ء

مشرف احمد

صہبا صاحب

"افکار کی ۲۳ سالہ زندگی میں صہبا صاحب نے جتنے نمبر نکالے ہیں، اگر ان کو ایک دوسرے پر رکھتے چلے جائیں تو ان رسالوں کا قد صہبا صاحب کے قد سے ذرا بڑھتا ہی نکلے گا۔"

صہبا صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی۔ جب میں اپنا ایک افسانہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ صہبا صاحب جس خوب صورتی، نفاست اور حسن کے ساتھ پرچے کو ترتیب دیتے ہیں اس سے ان جان آدمی کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ شاید کوئی بہت بڑا ادارہ ہوگا جس میں نہ جانے کتنے لوگ کام کرتے ہوں گے۔ ایڈیٹر کا کمرہ بالکل الگ ہوگا، باہر ایک چپراسی بیٹھا ہوگا۔ چِٹ اندر بھجوانی ہوگی، تب باریابی ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ کر پہلے پہل دفتر' افکار' میں داخل ہوا تھا۔

رابسن روڈ پر واقع رومان بلڈنگ کی جو اپنی شکل و صورت سے بالکل غیر رومانی ہے، ایک چھوٹی سی دکان کے اوپر ہلکا مدھم نیلے رنگوں کا

افکار کا بورڈ آویزاں ہے۔ دروازے پر چق پڑی ہوئی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا، میں چق اٹھا کر دفتر میں داخل ہوا، دفتر تو نام کا تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں چوکی پر ایک پتلا دبلا شخص آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک لگائے بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ کاغذ، ریک، الماری، کرسیاں اور ایک بڑی سی میز اس دفتر کی کل کائنات تھے صہبا صاحب کی ادارتی میز پر کتابوں، رسالوں کے ڈھیر، فائلوں اور خطوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

میں نے دبے دبے لہجے میں کہا:

"صہبا صاحب سے ملنا ہے۔"

"جی فرمایئے"، پتلے دبلے شخص نے جواب دیا۔

"ایک افسانہ دینا تھا۔"

"تشریف رکھئے ابھی بات کرتا ہوں۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

صہبا صاحب نے کہا: "کھانا کھایئے۔"

"جی شکریہ"

اس وقت تو میں نے صہبا صاحب کو تکلفاً یہی جواب دیا تھا، ویسے اب میں اس دسترخوان پر بارہا صہبا صاحب کا ساتھ دے چکا ہوں۔

بہرحال صہبا صاحب نے یہ کہتے ہوئے افسانہ رکھ لیا تھا کہ ہمارے پاس لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لکھتے کے لکھتے پڑے ہوئے ہیں، یہ کہہ کر اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے انہوں نے قریبی ریک سے تین چار موٹی موٹی فائلیں اٹھا کر میرے سامنے ڈال دیں —— لکھتے کے لکھتے، صہبا صاحب کا مخصوص لفظ ہے جو وہ ہر اس شخص کے سامنے دہراتے ہیں جو اپنی کوئی چیز بغرضِ اشاعت سے کر آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صہبا صاحب حوصلہ بھی بندھا دیتے ہیں۔ آدمی کو ذرا دھمکا کر کہیں گے: صاحب لکھتے رہیئے ہم ضرور شائع کریں گے۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔ آخر کرشن، بیدی، جوش اور فیض ہمیشہ تو نہیں لکھیں گے، نیا خون بھی آئے گا، وغیرہ وغیرہ۔

محبتوں کے موضوعات پر افسانے پڑھ کر صہبا صاحب ذرا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں: بات یہ ہے کہ زندگی کے اور مسائل بھی ہیں، لیکن نوجوان آدمی کے لئے تو محبت ہی اہم موضوع ہوتا ہے۔

یہاں میں اپنی عمر کے ان نئے لکھنے والوں کے فائدے کے لئے چپکے سے بتاتا چلوں کہ صہبا صاحب کی اس قسم کی باتوں سے گھبرائیں نہیں، اپنی چیزیں بھیجتے رہیں، آخر ایک نہ ایک دن صہبا صاحب آنے والے دور کے کسی کرشن، بیدی، جوش اور فیض کو چھاپنے پر تیار ہو ہی جائیں گے۔

کیا آپ نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو ایک ہی وقت میں ایڈیٹر بھی ہو، اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی، اکاؤنٹنٹ بھی ہو ایڈورٹائزنگ مینیجر بھی۔ سرکولیشن کا کام بھی سنبھالتا ہو اور کارسپنڈنس بھی۔ اور پرچوں، کتابوں کے بنڈل بھی خود ہی اٹھا کر دوکانوں پر دے آتا ہو۔

صہبا صاحب کو اس پوری ادارتی زندگی میں ایک ہی فن نہیں آسکا ہے اور وہ ہے کتابت کا فن۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صہبا صاحب کو جناب منیر احمد دہلوی کی ایسی پُرخلوص اور وفادار رفاقت میسّر آئی کہ انہوں نے منیر صاحب پر پورا اعتماد کرتے ہوئے یہ گوشہ خالی چھوڑ دیا۔ ورنہ صہبا صاحب سے یہ بھی بعید نہیں تھا۔

لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر، بھوپال اردو کانفرنس نمبر، بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر، کہانی نمبر، افسانہ نمبر، نئی تخلیق نمبر، رائٹرز کنونشن نمبر، جوش نمبر، حفیظ نمبر، فیض نمبر، غالب نمبر ——— یہ ہیں افکار کے چند خاص خاص نمبر جن سے اردو کے ادبی رسالوں کی ایک نئی اور شاندار روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ عام شماروں سے قطع نظر افکار کی ۲۳ سالہ زندگی میں صہبا صاحب نے جتنے نمبر نکالے ہیں اگر ان کو ایک دوسرے پر رکھتے چلے جائیں تو ان رسالوں کا قد صہبا صاحب کے قد سے ذرا بڑھتا ہی نکلے گا۔

صہبا صاحب بڑے عزم و حوصلہ کے شخص ہیں۔ ان کی خاص خوبی ہر کامیاب آدمی کی طرح خوب سے خوب تر کی جستجو اور ہر گھڑی کی کڑی محنت ہے۔ میں نے بارہا صہبا صاحب کو سخت تکلیف میں دیکھا ہے۔ بخار ہے، نزلہ ہے، سر میں کمر میں درد ہے لیکن صہبا صاحب ہائے ہائے کرتے جلتے ہیں، کمر پر مفلر باندھے ہوئے ہیں اور کام کئے جا رہے ہیں۔ اس جُثّے کے ساتھ اتنی محنت شاید ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

——— حسد کو ہمیشہ برا سمجھا جاتا ہے۔ صہبا صاحب میں حسد کی بیماری بالکل نہیں ہے، وہ دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہونے والے اور کامیابیوں پر رشک کرکے ویسی ہی یا ان سے بڑی کامیابیوں کو حاصل کرنے کی دُھن رکھتے ہیں۔ یہاں میں آپ کو ان کے بچپن کا ایک واقعہ سُناتا چلوں کہ جب وہ اسکول کے چھٹے یا ساتویں درجے میں پڑھتے تھے تو ان کے ایک کلاس فیلو کے خوش خطی میں ہمیشہ دس میں سے نو نمبر آتے تھے اور صہبا صاحب کو ۲ یا ۳ نمبر ملتے تھے۔ بس جناب انہوں نے خوش خطی میں اتنے ہی نمبر حاصل کرنے کی ٹھانی۔ جی اور زیڈ کی نبیں خریدی گئیں۔ دو تین ماہ کی شب و روز کی محنت اور درجنوں کاپیاں خراب کرنے کے بعد اتنے ہی نمبر حاصل کرکے چین کا سانس لیا۔

صہبا صاحب کا اصل نام تو سید شرافت علی ہے، لیکن نہ جانے یہ تخلص ان کے منہ کو کب لگ گیا تھا، کیونکہ "صہبا" تو آج تک اپنی اصلی صورت میں ان کے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکی۔ (جوش صاحب نے تو اس سلسلے میں ان پر ایک رباعی بھی کہی تھی، جوش صاحب یہاں تشریف فرما ہیں، وہ رباعی تو آپ ان ہی کی زبان مبارک سے سنئے گا)

صہبا صاحب کے اسی تخلص کی بنا پر جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی؟ تو صہبا صاحب نے جواب دیا:

"میاں اصل میں آدمی کو اپنے "کے لے بر" کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ شاعری میں ایک سے ایک بڑا آدمی پڑا ہے، غالب، میر، فراق، جوش اور فیض وغیرہ"

انہوں نے شاعری کو "COMPLEX" نہیں بنایا۔ کبھی کبھار کہہ لینے کے باوجود خود کو بحیثیت شاعر پیش نہیں کرتے۔ بہرحال شاعر تو وہ بہت اچھے بن سکتے تھے لیکن ہجوم افکار میں شاعری گُم ہو گئی۔ ان کے چند شعر آپ بھی سنتے چلے ۔

آج ہوا عجب چلی باغ وفا کی اِک کلی
حسنِ خزاں سے آشنا جشنِ بہار تک گئی

عہدِ حیات مستقل چہرۂ گل بجھا بجھا
گردِ سفر اڑی اڑی روئے نگار تک گئی

لے کے نشاطِ میکدہ آئی ہے موسموں کی یاد
ابرِ بہار کو لئے کوچۂ یار تک گئی

صہبا صاحب تیز تیز بولتے ہیں اور مسلسل بولتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح بولیں گے کہ سامنے والا آدمی اپنی بات کہنی بھول جائے۔ دُبلے پتلے جسم کے آدمی ہیں اور اپنے وزن کے برابر ہینڈ بیگ اٹھا کر چلتے ہیں۔ محفلوں میں دوسرے لوگوں کے درمیان اُن کی شخصیت دَب جاتی ہے لیکن دفتر میں جہاں وہ اپنی کرسی میں تین چار گدّے رکھ کر اُونچے ہو کر بیٹھے ہیں، صہبا صاحب ہی صہبا صاحب نظر آتے ہیں۔

صنعتی شہر ادب کے لئے کم ہی سازگار ہوتا ہے۔ اور کراچی جیسے بڑے صنعتی شہر میں جہاں صنعت کی برکت کے ہاتھوں لیٹ ہونا اور ہر جگہ لیٹ پہنچنا آدمی کا مقدر بن گیا ہے، وہاں افکار کا ہر ماہ وقت پر شائع ہونا معجزہ سے کم نہیں ہے۔ صہبا صاحب نے جن حالات میں افکار کو زندہ رکھا ہے، بدقسمت اردو زبان کے ایک ادبی پرچے کے ایڈیٹر کے ساتھ ۲۳ سال کی ادارتی زندگی میں جو کچھ گذری ہے اور جو آئندہ گذرے گی اس داستانِ غم کو تو خود صہبا صاحب ہی کبھی لکھیں تو لکھیں ہم لوگ تو شاید ان دشواریوں کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے۔

آصف، مینا، عطیہ، زیبا اور غوثیہ صہبا صاحب کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا بیٹا "افکار" ہے جس نے اپریل سنہ ۱۹۴۵ء میں غیر منقسم برصغیر کے شہر بھوپال میں جنم لیا تھا جو تقسیم کے بعد ترکِ وطن کر کے سنہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے شہر کراچی میں آ گیا۔

آج ہم سب لوگ صہبا صاحب کے اس سب سے بڑے بیٹے کی ۲۳ ویں سالگرہ کے سلسلے میں یہاں جمع ہیں۔ میں صہبا صاحب کو ان کے بیٹے کی ۲۳ ویں سالگرہ پر مبارکباد دیتا ہوں ——— خدا کرے کہ ان کا یہ بیٹا زندگی کی مسلسل بہاریں دیکھے ———

احمد ندیم قاسمی

——— "افکار نے اس دَور میں بھی ادب کی توانائی اور تازگی کا پرچم بلند رکھا ہے اور یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایک میں ہی نہیں ——— تمام احباب آپ کی مستقل مزاجی کے معترف ہیں۔

اقتباس خط، مطبوعہ افکار دس سالہ نمبر
شمارہ ۴۹ - ۵۰، اپریل - مئی ۱۹۵۵ء

صہبا لکھنوی

شکریہ

"میری دانست میں 'افکار' نے ۲۳ سال کے ادبی سفر میں کوئی ایسا مہتم بالشان کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس کا میں بطور خاص ذکر کرسکوں۔"

محترم صدر،
معزز خواتین و حضرات،
بزرگو اور رفیقو!

'افکار' کی تقریب سالگرہ میں آپ سب نے شریک ہو کر میری جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا میرا خوشگوار فریضہ ہے میں آپ سب کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔

کراچی میں افکار کی یہ پانچویں یادگار تقریب ہے۔ ۱۹ ویں سالگرہ بابائے اردو کی صدارت میں منائی گئی تھی اور ۲۰ ویں جناب الطاف گوہر کی صدارت میں۔ پھر جشن جوش منعقد ہوا، اور افکار نے زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کی روایت کا احیا کرتے ہوئے "جوش نمبر" پیش کیا ——

اس کے بعد جشنِ حفیظ منایا گیا اور افکار نے "حفیظ نمبر" شائع کیا ——— اور اب ادارہ مجلس اور رفیقانِ افکار نے ۲۳ ویں سال گرہ بھی منائی ، اور ملک کی مشہور و ممتاز شخصیت حکیم محمد سعید دہلوی کو اُن کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود آج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آمادہ کر لیا۔ میں حکیم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس تقریب کی صدارت قبول فرمائی۔

حکیم صاحب کو ادبی روایات اور تہذیبی رشتوں سے محبت ہے۔ وہ خود بھی کئی معیاری رسائل کے مدیر ہیں اور پاکستان کے ادبی رسالوں کی سرپرستی ہمیشہ اُن کا شعار رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے پاکستان کے چار بڑے شہروں کراچی، لاہور، راولپنڈی اور ڈھاکہ میں "شامِ ہمدرد" کی تقریبات کا آغاز کر کے ملک میں جو علمی، ادبی اور تہذیبی فضا پیدا کی ہے وہ ملک کے دانشوروں کے لئے اظہارِ خیال کا ایک امتیازی مرکز فراہم کرتی ہیں۔ یہ شامیں ادبی اور تہذیبی رشتوں کو بڑی خوبی سے استوار کر رہی ہیں۔

سچ پوچھئے تو یہی رشتے ہمارا وہ قیمتی سرمایہ ہیں جو ادب کو دوام بخشتے ہیں، اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ادب ایک آفاقی صداقت ہے جو امن و انقلاب، سرد و گرم واقعات اور ساعد و نا مساعد حالات میں بھی زندگی کو روشنی، حرارت تازگی اور توانائی عطا کرتا ہے ——— ایسا نہ ہوتا تو ادبی تاریخ کے سوتے خشک ہو جاتے۔ زندگی کے ایوانوں کی شمعیں گل ہو جاتیں اور تہذیب و معاشرت، حسن و صداقت اور علم و فن کے در و بام منور نہ رہ سکتے۔

ادبی رسالے بھی ہماری زندگی کا ایک حصہ ہیں اور بقول بابائے اردو ——— "ادب میں رسالوں اور جریدوں کی ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے، اور کئی لحاظ سے ادبی رسالے کتابوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ رسالوں میں جدید ادبی تحریکوں، رجحانات اور دیگر ادبی مسائل پر پہلے بحث ہوتی ہے اور انہیں پڑھنے کے بعد ہی کتابیں لکھی جاتی ہیں، سچ پوچھئے تو ادبی رسالے انقلاب لا سکتے ہیں۔"

خواتین و حضرات!

"افکار" بھی ایک ادبی ماہنامہ ہے جو اپنے پیش رو رفیقوں اور معاصر رفیقوں کے دوش بدوش زبان و ادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔ میری دانست میں افکار نے ۲۳ سال کے ادبی سفر میں کوئی ایسا مہتم بالشان کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس کا میں بطورِ خاص ذکر کر سکوں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ——— ۴۵ء میں رُشدی بھوپالی اور میں نے ریاست بھوپال سے 'جو کسی لحاظ سے بھی ادبی رسالوں کا مرکز نہ تھی'، افکار کو ایک ادبی مشغلہ اور شوقِ لاحاصل سمجھ کر جاری کیا تھا ——— پھر یہ رسالہ ہماری زندگی کا حصہ بن گیا۔

اگست ۴۷ء میں ہمیں آزادی ملی اور پاکستان عالمِ وجود میں آیا، ۵۰ء تک افکار بھوپال سے شائع ہوتا رہا، لیکن جب اسلامی ریاست بھوپال بھی شکست و ریخت کی زد میں آگئی اور عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ——— اور ——— افکار کی زندگی کے لالے پڑنے لگے تو دسمبر ۵۰ء میں ——— میں پاکستان آگیا اور ۵۱ء سے ماہنامہ افکار نے کراچی سے نئے سفر کا آغاز کیا جو اب تک جاری ہے۔

میرے بھوپال سے کراچی آنے کے بعد رُشدی صاحب نے روزنامہ افکار بھوپال سے جاری کر لیا جو اَب بھی شائع ہو رہا ہے، اور اس طرح افکار کا نام ـــــ ایک نئی روایت بن کر مشترکہ ورثے کی حیثیت سے برصغیر پاک وہند میں زندہ ہے۔

کراچی ـــــ میرے لئے ایک نئی سرزمین تھی ـــــ نیا ماحول اور نئے حالات تھے اور اس وقت یہاں کی فضا ادبی رسالوں کے لئے قطعی سازگار نہ تھی ـــــ لیکن میری خوش نصیبی ہے کہ رُشدی صاحب ایسے ہمدم ودمساز سے بچھڑنے کے بعد مجھے کراچی میں مُنیر احمد دہلوی ایسے مخلص وجاں نثار ساتھی مل گئے جنہوں نے شبانہ روز جگرکاوی کے ساتھ افکار کی زندگی کی جدوجہد میں میرا ساتھ دیا ـــــ اگر زندگی کے طویل اور صبر آزما سفر میں کوئی مخلص رفیق کار میسّر آجائے تو سفر کی صعوبتوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

۴۳ سال کا عرصۂ اشاعت طویل ضرور ہے لیکن ابھی زندگی کی کڑیاں نامکمل ہیں اور اسے داستانِ شوق بننے کے لئے کچھ اور وقت درکار ہے ـــــ البتہ اگر زندگی نے وفا کی اور صحت وتوانائی نے ساتھ دیا تو شاید کچھ عرصہ بعد افکار کے ادبی سفر اور اپنی صبر آزما جدوجہد کا کچھ احوال سُناسکوں جو دلچسپ تو کیا ہوگا ـــــ ہاں درسِ عبرت کا سامان ضرور فراہم کرے گا ـــــ ابھی تو خود مجھے نہیں معلوم کہ افکار کا اور میرا مستقبل کیا ہے، اور ہم دونوں اس ادبی سفر کی پُرپیچ اور خارزار وادیوں سے گزر کر آسودۂ منزل ہوں گے یا گُم کردہ راہ!

صدر گرامی!

ادبی رسالوں کے مدیروں کا جو مُقدّر رہا ہے وہی میرا مقدر ہے ـــــ جس ادبی مشغلہ کو تقریباً رُبع صدی پہلے میں نے محض تفریحاً اختیار کیا تھا ـــــ اب وہی میری زندگی، میرا نصبُ العین اور میری منزل ہے ـــــ راہ کی ساری دشواریاں اور تگ ودو کے تمام مرحلے میں نے بہت سوچ سمجھ کر اور "نوشتۂ تقدیر" جان کر مقصدِ حیات بنائے ہیں اور اس پر میں ہرگز دل گرفتہ اور متأسّف نہیں بلکہ آسودہ ومطمئن ہوں ـــــ مجھ سے پہلے بھی کئی لوگ سودائے ادب لے کر پیدا ہوئے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے　اور ادبی رسالوں کی زندگی کے لئے اپنی زندگیاں تک نچھاور کرتے رہیں گے۔ کیونکہ بقولِ اقبال ؔ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

خواتین وحضرات!

اب کراچی، صنعت ورفتار کا شہر بن گیا ہے۔ یہاں افکار کی سالگرہ ایسی ادبی تقریبات میں آپ ایسے صاحبانِ علم کا ذوق وشوق سے حصہ لینا، اس بات کا غمّاز ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور لاہور کی طرح کراچی بھی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور امید بندھتی ہے کہ پاکستان کا یہ عظیم شہر بھی مستقبل قریب میں ایک بڑے علمی، ادبی اور ثقافتی گہوارے کی حیثیت اختیار کرے گا۔

میں ایک بار پھر حکیم صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ادبی جرائد نامساعد حالات میں بھی اپنا فرض ادا کر رہے ہیں

افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ پر صہبا لکھنوی کی جدوجہد کو خراج تحسین

"کائنات کے انجام پر غور کرنے والوں کے لئے
اس میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں"
(قرآن حکیم)

مشرق

۲۴ فروری ۱۹۶۸ء

کراچی ۲۲ فروری (اسٹاف رپورٹر) حکیم محمد سعید نے کہا ہے کہ ادب زندگی کے حسن کو نکھارتا اور سنوارتا ہے اور ادیب جو معاشرے کے رجحانات اور احساسات کا ترجمان ہوتا ہے معاشرے کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کو بھی آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ بات انہوں نے آج شام اردو کے مشہور ماہنامہ "افکار" کی ۲۳ ویں سالگرہ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہی۔

حکیم محمد سعید نے ادب اور صحافت کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ صحافت کے مقابلے میں ادب کی قدریں دیرپا ہوتی ہیں، اور حال سے واضح رشتے کے باوجود ادب نہ تو وقتی چیز ہوتا ہے اور نہ تفریح کا ذریعہ، انہوں نے کہا کہ سیاست داں اور سائنس داں بھی ادب کے مطالعے کے بغیر فکر و عمل کو خاطر خواہ طور پر بروئے کار نہیں لا سکتے۔ مہمان خصوصی نے اپنی صدارتی تقریر میں ادب اور ادیبوں کے کردار ادبی رسالوں کی اہمیت، اور ان کو درپیش مسائل کا بھی اعتراف کیا، اور اس بات کو انتہائی حوصلہ افزا قرار دیا، کہ ان دقتوں کے باوجود اردو کے ادبی رسالے لکھنے والوں کو تخلیقی عمل جاری رکھنے اور پڑھنے والوں کو جدید رجحانات سے آگاہ کرنے کا فرض نہایت کامیابی سے ادا کر رہے ہیں۔

تقریب میں شریک ممتاز دانشوروں حضرت جوش ملیح آبادی، مسٹر سبط حسن، مسٹر ممتاز حسین، مسٹر مجتبیٰ حسین اور مسٹر مختار زمن نے آج کے کاروباری دور میں ادیب کو درپیش دقتوں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی خدمت دھارے کی

"افکار" کی تیئسویں سالگرہ کی تقریب میں جناب مختار زمن اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ درمیان میں مہمان خصوصی حکیم محمد سعید ان کے دائیں مدیر افکار صہبا لکھنوی اور جناب سبط حسن اور حضرت جوش ملیح آبادی ہیں

MORNING NEWS

Phones: Editorial
227151 and 227152
Managerial 227153
Kutchery Road,
Karachi, PAKISTAN.

SUNDAY, FEBRUARY 25, 1968. ZIQUAD 25, 1387.

The monthly Afkar (Karachi) has lately celebrated its 23rd year of existence as a successful literary Urdu magazine In its annual number it has presented for the readers, a large variety of material in various forms of literary composition.

There are nine critical articles on different aspects of Urdu literature, four on personalities, 28 poems by leading verse writers, seven dramas and 15 short stories, eight humorous skits and 16 'ghazals' (lyrical poems).

There are also 26 photographs of important writers and poets of Urdu Finally, there is a review section dealing with new publications.

The contributions are of high literary standard, specially the critical portion where the styles of Mir, Azad and Iqbal have been evaluated

Hakim Abdul Latif's article on the 'Disease of Research' would have been appropriate in the 'humour' section Prof Karrar Husain's article on 'Individual Freedom' is worth studying

It is inspired mostly by Western writings on modern problems including the writings of 'Hukama-i-Yunan' It seems something could have been found in our own cultural traditions justifying the subject, if the writer had cared to go deep into it

The part dealing with short stories presents problems of various kinds, reflecting our social and cultural life —M R

مخالف سمت تیرنے کی کوشش کے مصداق ہے بسٹر مجتبیٰ حسین نے اردو کے ادبی رسالوں کا جائزہ لیتے ہوئے ادبی ماہناموں کو ادب کی رفتار پرکھنے اور جانچنے کا معیار قرار دیا۔ مسٹر سبط حسن نے افکار کے مدیر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۲۳ برس تک ایک ادبی رسالے کو زندہ رکھنے کے بعد افکار اور اس کے مدیر کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ادیبوں کی توجہ ان کے فرض کی جانب مبذول کرائیں۔ قبل ازیں مسٹر صہبا لکھنوی نے مہمان خصوصی کو افکار کی ۲۳ ویں سال گرہ کی تقریب میں خوش آمدید کہتے ہوئے اُن کی ادب دوستی اور شام ہمدرد کے انعقاد کے ذریعے شہر میں ادبی فضا کے قیام کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو سراہا۔

کراچی ۲۲ رفروری (اسٹاف رپورٹر) ہمدرد ٹرسٹ کے چیئرمین حکیم محمد سعید نے کہا ہے کہ زندگی سے محبت کی بنا پر ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ آج ماہنامہ افکار کی ۲۳ ویں سال گرہ کی تقریب کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ زندگی کے حسن کو نکھارنا ادب کا تخلیقی عمل ہے۔ ادب معاشرے کے احساسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ادیب کو اپنی زندگی سے زیادہ اپنے عہد کی زندگی عزیز ہوتی ہے، اور ادیب کا کام ماضی سے روشنی حاصل کرنا ہے تاکہ بہتر مستقبل کی تلاش کی جا سکے۔ حکیم سعید نے مزید کہا کہ ادب کا مطالعہ اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر ایک سائنس داں بھی اپنی مکمل تخلیقی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاسکتا، اور درحقیقت یہیں سے ادبی رسالوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ادیب کے افکار کی اشاعت ادبی رسالوں کے ذمے ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک اہم کردار جو ادبی رسائل انجام دیتے ہیں وہ ادیبوں کو خود تنقید کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے ماہنامہ افکار اور اس کے مدیر کو خراج تحسین پیش کیا۔

پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر انجم اعظمی، سحر انصاری، سبط حسن، مشرف احمد اور مختار زمن نے بھی تقریریں کیں۔

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجراء — بھوپال سے

۱۹۴۸ء : (پہلی یادگار اشاعت) لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر

۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر

۱۹۴۹ء : بھیڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور (پاکستان میں)

۱۹۵۱ء : پہلا خاص نمبر کراچی سے

۱۹۵۲ء : خاص نمبر

۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۴ء : سالنامہ

۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر

۱۹۵۵ء : منٹو نمبر

۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)

۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر

۱۹۵۸ء : آزادی نمبر

۱۹۵۹ء : رائٹرز کنونشن نمبر

۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر

۱۹۶۰ء : سالنامہ

۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

> ۳ر اگست ۱۹۶۰ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں افکار کی سولھویں سالگرہ منائی گئی

۱۹۶۱ء : جوش نمبر (پہلا ایڈیشن)

۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

> ۵ر نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن جوش منایا گیا، اور افکار نے ۱۵۰۰ ادیبوں کے اس یادگار اجتماع میں افکار کا "جوش نمبر" پیش کیا۔

۱۹۶۲ء : جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن باضافہ)

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر

۱۹۶۳ء : [illegible] نمبر

۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

> ۲۷ر ستمبر ۶۳ء کو جشن حفیظ منایا گیا، اور کراچی کے نمائندہ ادیبوں کے اجتماع میں افکار نے حفیظ نمبر پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر

۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

> ۱۳ر مئی ۱۹۶۴ء کو جناب الطاف گوہر کی صدارت میں افکار کی بیسویں سالگرہ منائی گئی

۱۹۶۵ء : فیض نمبر

۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر

۱۹۶۶ء : غالب نمبر

۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر

۱۹۶۸ء : سالنامہ

> ۲۲ر فروری ۶۶ء کو جناب حکیم محمد سعید دہلوی ستارۂ امتیاز کی صدارت میں افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر افکار نے سالنامہ ۶۸ء پیش کیا

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی اور جنرل ہیڈ کوارٹر آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

نعیم آروی

سائے، رنگ اور خوشبو

(ایک رپورتاژ)

درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی آرٹس کونسل کی عمارت کرسس کارڈ پر چھپی ہوئی جدید طرز کی عمارت دکھائی دیتی ہے، اگر اس عمارت کو علیحدہ اور لاڈ لوائز کی دھوپ اور بارش سے ہار کھائی ہوئی میلی چہار دیواری سے دیکھئے تو بام کے چتناروں سے ایک ایسے چوکور ڈبے کی مانند دکھائی دے گی جیسے کسی فنکار کے ہنرمند ہاتھوں نے انتہائی نفاست سے تراش کر ایک جگہ خاموشی سے رکھ دیا ہو، اسی چوکور ڈبے نما عمارت کی دائرہ نما جھریوں اور روشندانوں سے کبھی کلاسیکی موسیقی کی لہریں ابلتی ہیں اور کبھی صادقین اور زین العابدین کی روغنی تصویروں کی نمائش پر سحر زدہ آوازوں کا ہلکا پھلکا رومانٹک شور مرکزی اور عقبی سڑکوں پر دندناتی ہوئی گاڑیوں کی سنسناہٹ میں گھل مل جاتا ہے، آج یعنی ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء کو شام ساڑھے چار بجے اسی عمارت کی نچلی منزل پر ماہنامہ "افکار" کی ۲۳ ویں سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ رابسن روڈ سے آرٹس کونسل کی عمارت کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ پھر بھی صہبا صاحب کے ایک اشارے پر ان کے عزیزوں اور افکار دوستوں کی دو تین گاڑیاں اس ذرا سے فاصلے کو آنکھوں آنکھوں میں گذار رہی تھیں۔ راستے میں سحر انصاری کو صہبا صاحب نے مخاطب کر کے کہا ____ "آج تو آرٹس کونسل کی تیسری منزل پر پھولوں کی نمائش بھی ہو رہی ہے، رنگ برنگ پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ بس یاروں کے مزے آ رہے ہیں ____"

"چلئے ٹھیک ہے افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ اور پھولوں کی نمائش کا پروگرام ساتھ ہی ساتھ نمٹ رہا ہے" سحر انصاری کے ہونٹوں پر ایک سحر انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

صہبا صاحب کی باتوں میں پھولوں کی تازگی اور زندگی کی حرارت تھی، آج ان کے افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ تھی جسے انہوں نے مسلسل ۲۳ سال سے اپنے عمل کی حرارت اور لہو کی گرمی سے زندہ رکھا تھا۔ ان کے تخلیقی عمل کا سارا جوش اور ولولہ افکار کو زندہ اور اس کے مزاج کو فعال اور متحرک بنانے میں صرف ہوا تھا۔ افکار کی زندگی صہبا صاحب کی زندگی ہے ____ اپنی زندگی کی ساری توانائی اور حرارت اور ولولہ افکار کو منتقل کرنے کے بعد بھی ان میں تھکن اور اضمحلال کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی چال ڈھال میں اس حوصلہ مند سپاہی کے پختہ عزم کی جھلک تھی جو پچھلے محاذوں کی فتحمندی کے نشے میں اگلے مورچوں پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرتا ہے اور دشمن کی چوکیوں کو ایک ہی یلغار میں سمیٹ لینے کی خواہش میں مچلتا ہے۔ ان کی زندگی کے پچھلے پچیس ۲۵ تیس

سال ادب کے خارزار میدانوں اور محاذ دل پر ایک جنگجو سپاہی کی طرح بسر ہوئے ہیں۔ ان سے گفتگو کیجئے تو پتہ چلے گا کہ وہ ایسے نہیں کہ راہ کی طوالت اور مسافت کی کڑی آزمائشوں سے تھک ہار کر بیٹھ رہیں۔ "وہ تو کچھ لے کر رہیں گے یا جان دے کر رہیں گے" والی اسپرٹ کے مالک ہیں۔

جب ہم آرٹس کونسل کی عمارت میں پہنچے تو نچلی منزل پر درمیان میں راستہ چھوڑ کر دو رویہ کرسیاں بچھ چکی تھیں۔ ڈرامے کی تیاری میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اسٹیج کی چوکیوں پر دھلی دھلائی سفید چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک لمبی سی کشادہ میز اسٹیج پر رکھی جانے والی تھی۔ اسٹیج کے عقبی دیوار پر کپڑے کا ایک بڑا سا بینر لان سے گذر کر آنے والی ہواؤں سے ہولے ہولے لہرا رہا تھا ——— "ماہنامہ افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ"

"صہبا صاحب آپ کو اس افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ مبارک ہو جس کی زندگی کی خاطر آپ نے اپنی عمر کے بہترین لمحات ادب کی آبیاری میں گذار دیئے"

انجم اعظمی خالی کرسیوں کے درمیان ایک کنارے بیٹھے ہوئے بڑے انہماک سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر خشک اور الجھے ہوئے بال بے ترتیب تھے، اور قلم ایک خاص رفتار سے کاغذ پر دوڑ رہا تھا۔ شاید وہ اپنے کچھ خیالات، فکر کی کچھ قندیلیں، لہو کے چند چراغ جلا رہے تھے۔

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے

انکار کے دیرینہ رفیق منیر احمد دہلوی عصرانے کے انتظامات میں تھے اور احمد طاہر بک شلف پر افکار کے خاص خاص نمبروں کی سجاوٹ میں مصروف تھے۔ رفیقان افکار تھوڑی کیل اور ٹیپ کی مدد سے افکار کے پرانے پوسٹر کارڈ بورڈ پر چسپاں کر رہے تھے، اور صہبا صاحب آدھے ادھر آدھے ادھر دو حالوں میں بٹے ہوئے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ "بھائی یوں نہیں یوں ——— ایسے نہیں بھائی نہیں، ایسے نہیں ایسے"

لان کی چمپئی دھوپ دھیرے دھیرے سمٹتی جا رہی تھی، سلیقے سے کٹی ہوئی ہری ہری گھاس کا رنگ گہرا سبز ہوتا جا رہا تھا فروری کی شام تھی۔ موسم سرما کا جلد چلاؤ تھا پھر بھی شام کی ہواؤں میں خنکی گھل چلی تھی اور پام کے چکنے پنکھوں میں سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا سورج کی الوداعی کرنوں کو چومتی ہوئی کہہ رہی تھی ——— "اب گذر جاؤ کہ آنے والے دن میں تمہارا استقبال کروں گی۔"

سیرینا کی سیڑھیوں پر شام کی ہلکی ہلکی دھوپ ابھی باقی تھی۔ تین چار طلائی نقش و نگار کی خوبصورت سی لڑکیاں بے فکری اور لاابالی پن سے بیٹھی ہوئی پٹاپٹ انگریزی بول رہی تھیں اور بات بات پر چاندی کے سکے کھنکا رہی تھیں۔ ان کے چہرے اور ان کی ہنسی میں بشاشت اور تازگی تھی۔ جیسے انہیں آرٹس کونسل کی دلچسپیوں کے علاوہ اور کوئی کام نہ ہو۔ ایسے ہی خوبصورت لڑکیاں بے مصرف گھومتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ ایک جپسی ٹائپ کی لڑکی بار بار خالی اور سنسان کرسیوں پر نظر دوڑاتی اور پھر پاس بیٹھی ہوئی دوسری لڑکی سے ہولے ہولے کچھ کہتی اور دونوں کے قوسی ہونٹ اَن سنی باتوں پر مسکرانے لگتے تھے۔

میں نے مڑ کر دیکھا انجم اعظمی لکھنا ختم کر چکے تھے اور اب وہ سحر انصاری کے قریب کھڑے ہوئے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ سحر انصاری نے سیرینا کی سیڑھیوں کو دیکھا، گذرتی ہوئی دھوپ اور درختوں کے پھیلتے ہوئے لمبے لمبے سایوں کو دیکھا

اور اس خوبصورت لڑکی کو دیکھا جس نے مدھ بھری آنکھوں کو سیاہ عینک سے ڈھک لیا تھا۔ اور جو ان کی کسی نظم کے عنوان کی طرح اسی اطمینان اور بے فکری سے بیٹھی ہوئی سارے منظر کو رغبت اور پسندیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ مشرف احمد کی آنکھوں میں اداسی کی کیفیت کچھ اور بڑھ چلی تھی، اس کی چکنی اور چوڑی پیشانی شام کی سنولائی سنولائی روشنی میں صاف ستھری اور بے عیب دکھائی دے رہی تھی۔ "یار شام خوبصورت ہو تو دل اور بھی ڈوبنے لگتا ہے۔"

آرٹس کونسل کے مرکزی دروازہ سے اسکول کی ایک لاری داخل ہوئی، لاری جوں ہی میدان میں رکی، اس کے پچھلے دروازے سے گڑیوں کی طرح اسکول کی جوان اور نوعمر لڑکیاں بھربھرا کر باہر نکل پڑیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے جسم پر اسکول کے رنگین یونیفارم تھے، ان کے چمکیلے بال سرخ اور سنہرے ربن سے بندھے ہوئے تھے اور وہ شور مچاتی تیسری منزل پر چلی گئیں۔ مسعود کوہاری نے اپنی پینٹنگ کی نمائش کا اعلان نوٹس بورڈ پر آویزاں کر کے ایک نظر ان لڑکیوں کو دیکھا اور خاموشی سے اوپر چلا گیا۔

شام کی روشنی ڈھلی تو ہوائیں پام کے درختوں میں الجھ کر زور زور سے سرسرانے لگیں، اگلی نشستوں کی کرسیاں بھرنے لگی تھیں اور نچلی منزل کی چھت سے چپکے ہوئے بلب روشن ہو گئے تھے۔ پورے ماحول میں طمانیت اور آسودگی کی کیفیت گھل رہی تھی۔ اتنے میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی پوری شخصیت میں ایک عزم اور پرسکون ٹھہراؤ تھا۔ وہ اپنے استقبال میں اٹھنے والے کارکنوں اور مداحوں سے بڑی شفقت اور نرمی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ چہرے پر بلا کی تروتازگی تھی وہ ایک کرسی پر بیٹھنے لگے تو صہبا صاحب انہیں بازوؤں سے سہارا دے کر اگلی صف کی طرف لے گئے، وہ وہیں بے نیازی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس صدی کے اس عظیم شاعر کا بلا تکلف عین وقت پر پہنچ جانا ان کی افکار نوازی اور بلند حوصلگی کا بین ثبوت تھا۔

جوش تو خیر جوش ہیں ایسے موقع پر تو شٹ پونجیے شاعر اور عقل داڑھ سے مبرا دانشور تک ہاتھ پیر پھیلا دیتے ہیں، جوش صاحب کی آمد کے ساتھ ہی کرسیاں دھڑا دھڑ بھرنے لگی تھیں، جلسے کی باقاعدہ کارروائی کی شروعات کے لئے بس مہمان خصوصی کا انتظار تھا، نشست گاہ کی تین چار سو کرسیاں دیکھتے دیکھتے کراچی کے شعراء، دانشوروں، صحافیوں اور ادیبوں سے پُر ہو گئیں دائیں جانب کی اگلی سیٹوں پر ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، محمد احمد سبزواری اور ظفر الحسن تھے ان کے بعد خواتین تھیں، زاہدہ تقی، خالدہ شفیع رشیدہ رضویہ، شمیم طلعت کے ساتھ ساتھ اور بہت سی بیبیاں تھیں، مختار زمن کے ساتھ ان کی بیگم سلمیٰ زمن تھیں۔ بائیں جانب کی کرسیوں پر کمانڈر انور، ابوالفضل صدیقی، علی نصرت ایڈوکیٹ، یونس احمر، جمیل اختر، صادق الخیری، ڈاکٹر عالیہ امام جمیل زبیری، مسعود احمد برکاتی، قمر ہاشمی تھے، ان کے عقب میں برٹش انفارمیشن کے جلیل صاحب تھے اور اس کے بعد سرشار صدیقی، شمیم نوید، عشرت انجم، شمس زبیری، نسیم احمد درانی تھے، ان کے بعد کرسیوں پر شبنم رومانی، مسلم ضیائی، شاہد عشقی اور عباس احمد عباسی تھے آخری کرسیوں پر رفیق خاور اپنی بیگم کے موجود تھے۔ مجھے ان لوگوں کے درمیان ایک تنہا خاتون بھی نظر آئیں، جن کا برقعہ سرمئی رنگ کا تھا اور جن کی بڑی بڑی آنکھیں بلا کی حسین تھیں۔

مہمان خصوصی حکیم محمد سعید دہلوی کے آنے کے بعد جلسے کی کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض اردو کے مشہور شاعر سحر انصاری ادا کر رہے تھے۔ حکیم صاحب حسب روایت سفید کپڑوں میں ملبوس تھے، سفید اچکن، سفید پاجامہ، آنکھوں پر سیاہ عینک، گورا چٹا رنگ، کھڑی ناک، ستھرے نکھرے نقش و نگار کے حکیم صاحب روایتی حکیموں سے کچھ علیحدہ نظر آتے ہیں

اور چہرے مہرے سے بڑے بارعب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اسٹیج پر ایک غیر معمولی قد و قامت کی کرسی پر بیٹھے تھے جس کی گدی اور پشت گاہ مخملی تھی اور چاندی کی پالش والی ہتھیاں روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔

پروگرام کی ابتدا عزالرباسمین کی تلاوت قرآن سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ پیغامات جو افکار کو اس کی ۲۳ ویں سالگرہ پر پاکستان کے مختلف علمی اور ادبی اداروں اور مشاہیر کی طرف سے موصول ہوئے تھے پڑھے گئے۔ ان پیغامات میں خلوص اور نیک نیتی کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اور آخیر میں افکار اور اس کے مدیر صہبا لکھنوی کو مبارکباد پیش کی گئی تھی۔ پیغامات پڑھنے والے ایک مقامی کالج کے پروفیسر اور نقاد عتیق احمد تھے۔ اس کے بعد صہبا لکھنوی نے مہمان خصوصی، شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی اور جلسے کے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک مختصر سے جائزے میں بھوپال سے لے کر تقسیم کے بعد کراچی سے افکار کے اجرا، ہران مشکلات اور دشواریوں کی روداد بیان کی جو وہ اس کٹھن راہ میں بھگت چکے تھے اور پیش آئند دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "ادبی رسالوں کے مدیروں کا جو مقدر رہا ہے وہی میرا مقدر ہے۔" انہوں نے اپنے جائزے میں ادبی رسالوں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا "ادبی رسالے بھی ہماری زندگی کا ایک حصہ ہیں اور بقول بابائے اردو" ادب میں رسالوں اور جریدوں کی ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے اور کئی لحاظ سے ادبی رسالے کتابوں پر فوقیت رکھتے ہیں، رسالوں میں جدید ادبی تحریکوں، رجحانات اور دیگر ادبی مسائل پر پہلے بحث ہوتی ہے اور انہیں پڑھنے کے بعد ہی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو ادبی رسالے انقلاب لا سکتے ہیں"۔ افکار انقلاب تو نہ لا سکا مگر اس کا مزاج ہمیشہ انقلاب پسند خیالات کا ترجمان رہا۔ اس نے اس نظریئے کی اہمیت محسوس کی اور ان توقعات کو پورا کیا جو افکار سے وابستہ کئے گئے تھے اور ان خیالات کی ترجمانی میں جو اس کے مزاج میں رچی بسی تھی کبھی مصلحت یا بخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ان کی اشاعت میں ہمیشہ غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیتا رہا۔ صہبا صاحب کے بعد ڈائس پر افکار کے دیرینہ رفیق منیر احمد دہلوی آئے۔

بڑھ رہا ہے سبک خرامی سے
علم و دانش کا کارواں "افکار"
نوجواں نسل کا نمائندہ
ایک تحریک ہے جریدہ نہیں
فکر و فن کا نگار خانہ ہے

حضرت! "افکار" فکر و فن کا نگار خانہ ہو نہ ہو ہم آپ کے فکر و فن کے پوشیدہ نگار خانے کے قائل ضرور ہو گئے، کیا چھپے رستم نکلے منیر احمد دہلوی صاحب اگر آپ میں کچھ شاعروں والی لت اور خو بیاں ہوتیں تو ہم آپ کو پہلے ہی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔ آپ کا یک بیک بحیثیت شاعر نمودار ہونا حیران کرنے والی بات ہے"!

"یار یہ منیر صاحب بھی شاعر ہیں" حفاظ الرحمن کی آواز میں حیرت تھی۔

اس میں حیرانی کی کیا بات ہے بعض لوگ کچھ نہیں ہوتے اور بہت کچھ بن جاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی اچھائیوں پر پردہ ڈالے رہتے ہیں۔ یہ سب تصوف کی باتیں ہیں، تیری میری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

نظریں اٹھائیں تو سامنے مشرف احمد تھے، نام کچھ غیر رومانی ہے مگر موصوف خاصے رومانٹک ہیں، اردو میں ایم اے ہیں، افسانے لکھتے ہیں، فیض احمد فیض اور دنیا بھر کے شاعروں کے شعر فر فر سناتے ہیں، ان کی آنکھیں ہمیشہ حیرت زدہ رہتی ہیں، مگر

چہرے سے مطمئن اور ہشاش بشاش دکھائی دیتے ہیں ڈائس پر پہنچے۔ اور انھوں نے ـــــــ
ـــــ "اپنا خاکہ، صہبا صاحب" شروع کر دیا۔

اسٹیج کے علاوہ صہبا صاحب مشرف احمد کے خاکے میں بھی زندہ اور متحرک تھے۔ خاکہ ختم کر کے وہ اسٹیج سے اترے تو کچھ لوگوں نے اپنی کرسیوں پر گردنیں گھما گھما کر کہا:

"میاں خوب لکھا ہے صہبا صاحب کا خاکہ، بڑی صحیح صحیح باتیں لکھی ہیں۔"

اپنی تعریفیں سن کر کس کا ز کا سینہ نہیں پھولتا۔ مشرف احمد کی گردن اصیل مرغ کی مانند اکڑ چکی تھی۔

"میاں تم کیا لکھتے ہو جو میں لکھتا ہوں، مگر خیر تم نے بھی برا نہیں لکھا۔"

شام گہری ہو چلی تھی۔ سورج کبھی کا ڈوب چکا تھا۔ سیرینا کی سیڑھیاں دھندلا گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے پاس بے فکری سے بیٹھی ہوئی خوبصورت آنکھوں اور سڈول جسموں والی لڑکیاں اکتا کر جا چکی تھی۔ ان کی دلچسپی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ میں نے عقبی رو کی کرسیوں پر نظر دوڑائی، سرمئی برقعے کے چوکھٹے میں دو بڑی بڑی غزالی آنکھیں ٹمٹما رہی تھیں۔ "یہ آنکھیں کس کی یاد سے جگمگا رہی ہیں، کون ہے جو ان آنکھوں میں ڈوبا ہوا ہے۔" لاؤن میں افکار کی تینتیسویں سالگرہ کا سارا حسن سمٹ گیا تھا۔ جوش ملیح آبادی اسٹیج کی ایک کرسی پر کسی سنگتراش کے مجسمے کی مانند ساکت تھے۔ ان کا سرخ سپید چہرہ بلب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں افکار کی سالگرہ کا بڑا سا بینر اب بھی سرسرا رہا تھا۔ سارے ماحول پر ایک پر وقار گمبھیر تا تھا اور مطمئن خاموشی برس رہی تھی۔ پروگرام میں سامعین کی دلچسپی گہری ہو گئی تھی۔ اب ڈائس پر دبلے پتلے، موٹی موٹی عینک والے شاعر قمر ہاشمی تھے جو "اردو اور افکار" کے عنوان سے ایک نظم سنا رہے تھے۔

اردو جمال و حسن کے اوراق کی کتاب
افکار اس کتاب تجمل کا ایک باب
اردو ہے میر و غالب و مومن کا آئینہ
افکار جوش و فیض کے فن کا صنم کدہ

قمر ہاشمی کے بعد سحر انصاری نے ایک مقالہ پیش کیا۔ جس میں افکار کے فعال کردار، معیار اور ادب میں اس کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "اردو ادب کو جدید عہد کے پس منظر میں پیش کرنے اور جدید نقطۂ نظر کے مطابق ادبی تخلیقات کو پرکھنے کے عمل کو بھی افکار نے بہت عزیز رکھا۔ افکار جدید ذہن کی نمائندگی کرتا ہے لیکن وہ مزید معیاری اور جدید ہو سکتا ہے بشرطیکہ افکار ایک ایسا درخت بن جائے جو خشک پتوں سے زیادہ تازہ کونپلوں کو اپنے حسن کی علامت سمجھے۔" سحر انصاری نے اپنا مقالہ ختم کرنے کے بعد نعرہ ہائے قلندری کا انتظار بھی نہ کیا اور کھٹ سے مختار زمن کا نام پکار لیا۔ "آؤ، تم بھی میدان آزماؤ۔"

مختار زمن کی آواز اور لہجے میں دھوم دھڑکا اور ڈرامائی اتار چڑھاؤ تھا۔ مضمون کیا تھا بس یوں سمجھ لیں کہ رنگا رنگ روشنی چھوڑنے والی پھلجھڑی تھی، چٹپٹے چٹکلے اور مسالے دار باتوں نے سماں باندھ دیا۔ بعض حصے میں طنز کی ایسی کراری ضربیں تھیں کہ غیر شعوری طور سے ہاتھ سر بچانے کی فکر کرتا تھا۔ یارو! مختار زمن تو بے حد خطرناک قسم کے آدمی نکلے۔ بڑا مہلک ہتھیار رکھ چھوڑا ہے اپنے ہاتھوں میں۔ "آجکل کمزور آنکھوں کی صاحب بصیرت لوگوں کی عینک سیٹ ہو اگر بیچارہ جیسے سکی سلائی گشت اب صہبا کو دیکھے گا تو کیا کہے گا۔"

تو ایک دم کنڈم آدمی ہے۔ کوئی بیوپار نہیں جانتا۔ اس کا بچار بڑا ومندو ہے" مختار زمن کے ایک ایک جملے پر واہ، واہ ہوئی
، اور پھر جب وہ مہمان خصوصی حکیم محمد سعید دہلوی کی طرف مڑ کر اس جملے پر پہنچے تو سارا ماحول دلوار قہقہہ بن گیا۔ "صنعتی اور
دباری فضا میں صہبا صاحب افکار کی فکر میں گرفتار ہیں۔ انہیں ادب کا مرض لاحق ہوگیا ہے، خوش قسمتی سے آج حکیم سعید صاحب
ان موجود ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں ـــــ کیوں صاحب قانون شیخ میں اس مرض کا ذکر ہے یا نہیں۔"

حکیم صاحب مسکرا کر پہلو بدل گئے۔

مختار زمن کے بعد ممتاز شاعر اور نقاد انجم اعظمی کا نام پکارا گیا ـــــ ڈائس پر پہنچے تو ایک نظر ادہر ادہر ڈالی اور بڑے نپے
انداز سے شروع ہوئے ۔ "فی زمانہ ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات میں رنگ بھرنے کو خون جگر صرف نہیں کرتا۔ نشر و اشاعت کی آسانی کے
سبب اس عہد میں وہ جو کچھ لکھے گا چھپے گا اور جس قدر محقق بے تعلقی اور جلد بازی سے لکھے گا اتنی ہی تیزی سے چھپ چھپ کر
دن دونی رات چوگنی شہرت پائے گا"۔ بات معقول تھی کیونکہ پہلے کے ادیب، شاعر اور صحافی برسوں کی کڑی ریاضت
عرق ریزی کے بعد بھی مشکل سے شہرت کا دامن پکڑ پاتے تھے۔ اب تو زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ ہر دوسرا آدمی صحافی، تیسرا آدمی ادیب
شاعر اور چوتھا پانچواں آدمی اپنے جسم سے کہیں زیادہ تنومند رسالے کا ضخیم نمبر لیے اور شہرت کو اپنی لونڈی کی مانند
ساتھ میں لئے لئے پھرتا ہے۔ اور بے زبان دوستوں اور ریڈیوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے آپ کو مستند کہلوا تا ہے۔ یہ سب اس عہد کی باتیں
جن پر انجم اعظمی نے اشارہ کیا تھا ـــــ انجم اعظمی نے آگے چل کر کہا۔ "ابھی کچھ دن ہوئے کراچی یونیورسٹی میں جدیدیت کے ایک سمپوزیم
ایک مقرر نے جدیدیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "مغربی ممالک کے ایٹمی ہتھیاروں کا مقابلہ مشرق تیر و تفنگ سے کر رہا ہے۔
مغرب کو چاہئے کہ وہ ہماری جدیدیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔" انجم اعظمی نے جدیدیت کے اس پہلو کو Condemn کرتے ہوئے
کہا "انسانیت کے قاتلوں پر پوری طاقت سے راکٹ برسائے ہوں گے اور جینے کی امنگ کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی
بھی اپنے تخلیقی ذہن کی آزمائش کرنی ہوگی۔" ایٹمی ہتھیاروں کے مقابلے میں تیر و تفنگ کا استعمال جدیدیت نہیں بلکہ پڑا
دینے والا پہلو ہے۔ "انسانیت کے قاتلوں پر پوری طاقت سے راکٹ برسانے ہوں گے ۔" مغرب کے جدید ہتھیاروں کا
مقابلہ جدید ہتھیاروں سے کرنا ہوگا۔

انجم اعظمی کی آواز جذبات اور خلوص میں ڈوبی ہوئی تھی اور میرے ذہن میں مشرق کے عظیم رہنما ماؤزے تنگ کا
یہ گونج رہا تھا۔ "سیاسی طاقت بندوق کی نال سے جنم لیتی ہے"۔ ۲۲ رفروری ۶۸ کی شام کو پروگریسو مومنٹ کی یہ کڑی
زور دار آواز میں کھنکی "انجم اعظمی شاعر ہیں اور نقاد بھی، شہر کے ایک کالج میں اردو کے استاد ہیں، ادبی دھڑے بندیوں سے
اپنے آپ کو ہمیشہ بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، شاید اسی وجہ سے ان کی شہرت پر لگا کر نہیں اڑی۔ کبھی کبھی گوشہ نشینی کی
سے مصلحت پسندوں کی ادبی چوکیوں پر شبخون مارتے ہیں اور افراتفری کے مزے لوٹتے ہیں۔ انجم اعظمی کے بعد نذرانی
ریدوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ مقرروں میں صرف حضرت جوش تھے جنہوں نے مقالہ پڑھا، سحر انصاری نے مجتبیٰ حسین کا نام پکارا، وہ
کس پر آن کر بولے۔ "افکار برصغیر کے ان چند گنے چنے رسالوں میں سے ایک ہے جس نے ادب میں بڑے بڑے خدمات انجام دیں اور
اپنے معیار کو گرنے نہ دیا، چلتے چلتے انہوں نے کہا۔ یونیورسٹی میں جدیدیت کے سمپوزیم میں تیر و تفنگ سے متعلق میں نے جو جملہ کہا
وہ میرا نہ تھا بلکہ لن پیاؤ کا تھا۔ اب یہ معاملہ لن پیاؤ اور انجم اعظمی کا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی باتیں سن کر خون گردش کرنے لگا تھا کہ لیں اب ایک نیا محاذ کھلنے والا ہے اکھاڑ پچھاڑ ہوگی داؤ پیچ آزمائے
ں گے مگر مجتبیٰ صاحب درمیان سے اپنے آپ کو ہٹا کر سارے معاملے کو ٹھنڈا کر گئے، چلیے چھٹی ہوئی۔

اردو کے مشہور نقاد ممتاز حسین نے کہا۔ افکار کو مسلسل ۲۳ سال زندہ رکھنا کچھ صہبا لکھنوی کا کام ہے اور بلاشبہ وہ
رک باد کے مستحق ہیں جبکہ ادبی جریدے مشکل ہی سے چند ماہ یا چند سال چل پاتے ہیں۔ افکار کو زندہ رکھنے میں صہبا لکھنوی کی
ملسل کاوشوں اور بے مثال قربانیوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ رسالہ کو جاری رکھنے کے لئے ایک مرتبہ صہبا
ھنوی نے اپنے گھر کے زیورات تک فروخت کر ڈالے تھے۔ ادب کے لئے ایسی قربانیاں ذرا مشکل ہی سے ہاتھ لگتی ہیں، یہ ان
ہ افراد میں سے ہیں جو آنکھ بند کرکے ادب کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالتے ہیں۔ سید سبط حسن نے اپنی تقریر کے دوران ایک
ے دار واقعہ سنایا۔ بہت پہلے کا ذکر ہے، میں جیل کے دن کاٹ رہا تھا۔ ایک دن مجھے جیل میں افکار کے ایک شمارے کے ساتھ
ب خط موصول ہوا۔ وہ رسالہ اور خط صہبا لکھنوی نے میرے نام ارسال کیا تھا۔ اس وقت ان سے میرا تعارف نہ تھا۔
اے اردو کو فوری خط لکھا۔" ان صاحب کو سمجھائیں، ناحق مجھے خط لکھنے اور رسالہ بھیجنے کے جرم میں معتوب
ں گے۔ کہیں کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔" افکار کے دوسرے شمارے میں میرا خط جو بابائے اردو نے انہیں روانہ
دیا تھا جوں کا توں شائع کر دیا گیا اور جب تک جیل میں رہا افکار برابر ملتا رہا۔

سید سبط حسن کے بعد برصغیر کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے گراں قدر خیالات سے
معین کو نوازیں، ادھر جوش صاحب کا نام آیا ادھر لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے کہ یہ عہد کچھ لینے والا تھا۔
روانی کی جیب سے کاغذوں کے چند ٹکڑے نکالے اور گرجنے لگے۔ ادب انسانیت کا لباس ہے، زبان ہے، روح ہے، اس کے
برکات ناآسودہ اور نامکمل ہے۔ ایک ایسے جنگل کے مانند ہے جہاں غول ہائے وحشی کے سوا کچھ نہیں، ایک ایسے سانڈ کی طرح
پوری انسانیت کو اپنے سینگ پر اٹھائے کچل ڈالنے کی فکر میں ہو۔ نہیں، شاعری، ادب اور آرٹ کے ذریعہ انسانی زندگی
نواری ہوگی، اور انسانیت کے دامن کو لازوال خوشیوں اور مثبت اقدار سے بھرتا ہوگا۔"

پروگرام کی طوالت کے باوجود سامعین کی دلچسپی کسی طرح بھی کم نہ ہوئی تھی کم کیونکر ہوتی جبکہ مدت کے بعد ادب کے شائقین
ایسا دلچسپ اور رنگا رنگ کا ادبی پروگرام ہاتھ لگا تھا۔ اگلی صف سے ایک صاحب اٹھے، ان کا انداز ایسا تھا جیسے جلسہ گاہ
ے ایک دم باہر نکل جائیں گے، پتہ نہیں کیا بات تھی، سیاہ شیروانی کے اندر ان کا جسم گوشت کا ناقابل عبور پہاڑ تھا۔ خدا معلوم
ن میں کبھی کچھ تھا یا وہاں بھی گوشت کے تازہ لوتھڑے رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان صاحب کو عارضہ ہے، وہ ایک جگہ
اموشی سے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر انہیں چلنے پھرنے کا موقع نہ ملے تو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس زور زور سے تھلتھلی رانیں اور موٹی گردن
لتے ہیں جیسے زمین زلزلے کی لپیٹ میں آگئی ہو۔

جوش صاحب کے بعد مہمان خصوصی جناب حکیم محمد سعید دہلوی ڈائس پر کھڑے ہوئے، ان کی آواز مدھم تھی مگر لوگ غور
ے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ " ادیب کا کام ماضی سے روشنی حاصل کرنا ہے کہ بہتر مستقبل کی تلاش کی جا سکے۔" بیچ میں ایک
دبار مائیک کے کھڑکنے کی صدا بلند ہوئی مگر مدھم مدھم آواز جلسہ گاہ میں پھیلتی رہی، اور سامعین سنتے رہے۔" ادب زندگی کے
سن کو نکھارتا اور سنوارتا ہے اور ادیب جو معاشرے کے رجحانات اور احساسات کا ترجمان ہوتا ہے، معاشرے کی اچھائیوں

یے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کو بھی آئینہ دکھاتا ہے" مہمان خصوصی نے ادب، ادیب کے کردار اور ادبی رسالوں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس بات کو انتہائی حوصلہ افزا قرار دیا کہ دشواریوں کے باوجود اردو رسالے لکھنے والوں کو تخلیقی عمل جاری رکھنے اور پڑھنے والوں کو جدید رجحانات سے آگاہ کرنے کا فرض نہایت کامیابی سے ادا کر رہے ہیں۔" مہمان خصوصی اپنی تقریر کے آخری حصے میں تھے جب اچانک چھتوں میں چھپے ہوئے جگمگاتے بلب بجھ گئے اور مائیک خاموش ہو گیا، میں مہمان خصوصی حکیم محمد سعید دہلوی کے ہونٹ کھلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پر آواز سنائی نہ دی، یہ سلسلہ چند ہی لمحوں میں ختم ہو گیا۔ مہمان خصوصی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے، سحر انصاری نے ایک مرتبہ پھر حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسے کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔" دوسری جانب لان میں چائے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

شام ختم ہو چلی تھی، رات کا اولین اولین دھندلکا پام کے بڑے بڑے ہوا سے سرسراتے ہوئے پنکھوں کو اپنی آغوش میں بھر چکا تھا۔ درختوں پر رات کا بسیرا لینے والی چڑیوں کا شور گونج رہا تھا اور ان کی گھنی گھنی ٹوکرا ر شاخیں کسی انوکھے اور مبہم خیال کے مانند تاریکی میں لپٹی ہوئی پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ نرم نرم ٹھنڈی گھاس پر چپ چاپ چلتے ہوئے میں نے چائے کی پیالی اٹھالی تھی کچھ لوگ اب بھی میزوں کے گرد جمع تھے اور کچھ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے چائے کی گرما گرم چسکیوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے، ایک طرف مجتبیٰ حسین اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ دوسری جانب چائے کی میزوں سے ذرا پرے انجم اعظمی اسلم فرخی سے نہ معلوم کیا باتیں کر رہے تھے، میں لُوہ لینے کی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ اگر نہ پہنچتا تو زندگی بھر افسوس رہتا، انجم اعظمی اسلم فرخی سے کہہ رہے تھے۔" لن پیاؤ نے اردو کبھی نہیں لکھی، کوئی صاحب لن پیاؤ کا حوالہ دیں تو صحیح ترجمہ کریں اور جدیدیت کا لن پیاؤ سے کیا تعلق مترجم نے غلط ترجمے کے ذریعہ اپنی قدامت پرستی سے جدیدیت کا ایک نیا ہیولیٰ تیار کیا ہے جو کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے۔" میں نے دیکھا پام کے موٹے تنے کے قریب ہی مجتبیٰ حسین بھی چپکے چپکے اپنے اردگرد کھڑے ہوئے کچھ لوگوں سے باتیں کئے جا رہے تھے۔ خواتین کی میز مخصوص کر دی گئی تھی رجانے یہ مشرقی روایت اور کتنے دن ہمارے ساتھ ساتھ چلے گی، جہاں وہ نہایت بے تکلفی اور بے رحمی سے کیلوں کی طشتریاں، دال موٹ اور گلاب جامن کے پلیٹوں اور چائے کی پیالوں کا صفایا کر رہی تھیں۔ بڑا معقول انتظام تھا۔

میں نے دیکھا کچھ لوگ صہبا صاحب کو گھیرے ہوئے ہیں۔" افکار کا سالنامہ بلاشبہ آپ کا ایک کارنامہ ہے" "دریں چہ شک، دریں چہ شک" ایک صاحب نے گردن ہلا ہلا کر فارسی میں تصدیق کی۔

"آج کا عصرانہ اور جلسہ بھی اپنی جگہ نا قابل فراموش ہے۔ ایسا دل موہ لینے والا ماحول تو اس صنعتی شہر میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔"

صہبا صاحب تعریفیں سن کر ذرا اور جھک گئے اور مسکراتے ہوئے تیز تیز لہجے میں بولے" بھیا یہ سب آپ لوگوں کی افکار دوستی ہے، وسیع القلبی ہے، بھلا میں کیا ہوں۔"

"جی ہاں آپ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔۔۔!!"

حفیظ ہوشیارپوری

اشک آنکھوں میں ہیں رُسوا وضعداری ہو گئی
کتنی مشکل تیرے غم کی پاسداری ہو گئی

پھر گئی آنکھوں میں پھر اک صورتِ بے خدّ و خال
دل پہ پھر کیفیتِ موہوم طاری ہو گئی

پھر نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر لالہ و گل کی طرف
دامنِ دل پر کچھ ایسی لالہ کاری ہو گئی

آ گئے وہ جب ذرا دل کو قرار آنے لگا
اور پہلے سے سوا کچھ بے قراری ہو گئی

وہ خود آئے تھے کہ اُن کی یاد تھی، کس کو خبر
بار ہا آنکھوں سے جوئے اشک جاری ہو گئی

مدّعا قطعِ تعلق تھا فقط اُن سے، مگر
وہ یہ سمجھے ختم رسمِ دوستداری ہو گئی

مٹ گئے ہم خاکِ راہِ دوستاں ہو کر حفیظ
سُرخرو ہم سے ہماری خاکساری ہو گئی

تابش دہلوی

(نذرِ اقبال)

نہ ہوسکے گی حریفِ جام و سبو کبھی گردشِ زمانہ
کہ ہم تک آ کر شرابِ امروز ہو گئی ہے مئے شبانہ

مری نظر میں نہیں ہے اس سے زیادہ کچھ اعتبارِ منزل
کہ نارسائی کو چاہیے تھا رہِ طلب میں کوئی بہانہ

نظر نظر اُن کی روشنی ہے نفس نفس اُن کا دائمی ہے
ترے کرم سے بنامِ الفت جنھیں ملا سوزِ جاودانہ

فریب کس سادگی سے کھائے ہیں اعتبارات زندگی کے
چمن میں وہ برق بن کے ٹوٹی جو شاخ تھی اپنا آشیانہ

مری بساطِ نیازمندی میں صرف لے دے کے ایک ایماں
ترا یہ عالم کہ لاکھ بت خانے ایک اندازِ کا خزانہ

ہزار محرومیاں ہیں لیکن میں دل سے نامطمئن نہیں ہوں
یہ کروٹیں درد کی سلامت کبھی بدل جائے گا زمانہ

خدا کرے اہلِ باغ کو بھی ہمارے ہمراہ راس آئے
نئی نئی عشرتِ رہائی، نیا نیا ذوقِ آشیانہ

ہم اپنی رودادِ شوق کیونکر سنائیں اربابِ انجمن کو
کسی کی چشمِ فسانہ خواں بھی سُنا رہی ہو جب اک فسانہ

یہاں وہی ہے نفس نفس میں ہزار تشنہ لبی کا عالم
اگرچہ ہے سرخوشی سے تیری نظر نظر میں شراب خانہ

بدلتے ہی ایک فصلِ گلشن تمام فطرت بدل گئی ہے
کبھی نشیمن ہمیں قفس تھا اور اب قفس بھی ہے آشیانہ

مرا طریقِ نیازمندی الگ ہے سارے جہاں سے تابش
وہاں ہے ذوقِ سجود مجھ کو جہاں جبیں ہے نہ آستانہ

ادا جعفری

بیگانگی، طرزِ ستم بھی بہانہ ساز
بے چارگی، کرب و الم بھی بہانہ ساز

کچھ بُت بنا لئے ہیں چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے، غم بھی بہانہ ساز

عزمِ وفا کے ساتھ جلاتے رہے چراغ
کھلتا ہے اب کہ دیدۂ نم بھی بہانہ ساز

پابندیٔ رسوم وفا بھی بہانہ خو
ترکِ وفا و شیوۂ رم بھی بہانہ ساز

ہر لمحۂ حیات کا تنہا رہا وجود
دلداریٔ نگاہ و کرم بھی بہانہ ساز

کچھ دُور ساتھ ساتھ تھے اتنا تو یاد ہے
صحرائے غم میں نقشِ قدم بھی بہانہ ساز

سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی اداؔ
اس حیلہ جو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

خورشید احمد جامی

جس پہ تیرے لب و رخسار کا سایا ہوگا
کون کہتا ہے کہ وہ گیت پرایا ہوگا
دل کے دروازے پہ آہٹ ہے تھکے قدموں کی
دیکھنا، دُور سے چل کر کوئی آیا ہوگا
ہم سے اس شہر میں کچھ اور بھی ہوں گے، جن کو
وقت نے صبح کی پھانسی پہ چڑھایا ہوگا
ایک خواب ۔ ایک امیدوں کا چمکتا لمحہ
ہم نے کھویا ہے ۔ کسی اور نے پایا ہوگا
کیا پتہ ہے کہ بخیلوں کے خزانے کی طرح
کتنی صبحوں کو اندھیروں نے چھپایا ہوگا
آج بھی کل کی طرح درد کی دیوار کے پاس
منتظر ایک مہکتا ہوا سایا ہوگا
دردمندوں نے شبِ غم کی فصیلوں کے تلے
اک چراغ اور امیدوں کا جلایا ہوگا
گھر سے نکلے تو وہی دھوپ کھڑی تھی جامی
ہم سمجھتے تھے بہاروں نے بلایا ہوگا

حامد سروش

وہ بے وفا بھی ہمیں با وفاؤں جیسا ہے
کہ آشنا تو نہیں آشناؤں جیسا ہے

نہ آرزو کے کنہیا نہ پیار کے پنگھٹ
دلِ تباہ بھی ویران گاؤں جیسا ہے

لبوں پہ پھول، مژہ پر دہکتے انگارے
مزاجِ دیدہ و دل دھوپ چھاؤں جیسا ہے

بہت حسین، بہت ہی سبک، بہت ہی گداز
وہ نرم گرم بدن فاختاؤں جیسا ہے

ابھی تو دن کے اُجالے پہ رات کا ہے گماں
ابھی تو موسمِ گل بھی خزاؤں جیسا ہے

ملے ہیں، دیکھا ہے حامد سروش کو ہم نے
وہ بے خدا تو نہیں با خداؤں جیسا ہے

خلیل رامپوری

آسماں کی جھیل بھی اب خشک ہو جائے گی کیا
رات آئے گی تو بینائی بھی کھو جائے گی کیا

وہ اگر خالق ہے میرا، مجھ سے کیوں ملتا نہیں
روشنی میلی میرے سائے سے ہو جائے گی کیا

ڈوبتا سورج سیاہی کے بھنور پھیلا گیا
تیری صورت بھی مری آنکھوں سے کھو جائے گی کیا

آج کل بجلی کے پنکھوں کی ہوا کھاتے ہیں لوگ
زندگی سوکھی ہوئی لکڑی نہ ہو جائے گی کیا

کھینچتا رہتا ہے کاغذ پر وہ تصویریں خلیل
اُس کی آنکھوں کی اداسی دور ہو جائے گی کیا

رحمان کیانی

جو اپنے گھر کے دریچے بھی بند رکھتے ہیں
سنا گیا ہے دلِ درد مند رکھتے ہیں

رہے نہ خود پہ بھروسہ تو گھر کی دیواریں
ہم اپنے سر سے بھی اکثر بلند رکھتے ہیں

یہ احتیاطِ ہوس ہے کہ احترامِ چمن
گلوں سے لوگ خیالِ گزند رکھتے ہیں

چلے بھی آؤ نہ گھبراؤ تم کہ آئینے
نہ اپنا ذوق نہ اپنی پسند رکھتے ہیں

ہوئے ہیں کتنے مہذب کہ ہم عدو کے لئے
دلوں میں زہر زبانوں پہ قند رکھتے ہیں

چراغِ خانۂ ویراں کہو کہ ہم رحماںؔ
ابھی تو حوصلۂ زہرخند رکھتے ہیں

وقار خلیل

خلوصِ مدحِ جلال و جمال سے بھی گئے
فقیہہِ عصر تو کشف و کمال سے بھی گئے

بلند و پست کے ہر مرحلے کو طے کر کے
ہم امتیازِ عروج و زوال سے بھی گئے

حضورِ دل بڑے دعوے تھے لن ترانی کے
جواب بن نہ پڑا، اور سوال سے بھی گئے

ترے خیال کا موسم، ترے خیال کے دن
مگر گمان کہ تیرے خیال سے بھی گئے

ملال یہ ہے کہ اس سرخوشی کے عالم میں
بفیضِ قُرب نشاطِ وصال سے بھی گئے

وہ ذی شرف، وہ ہوس کارِ خسروانِ جہاں
جو دن پھرے ہیں تو جاہ و جلال سے بھی گئے

جنم جنم سے اُجالوں کی آرزو میں وقار
فریبِ سلسلۂ ماہ و سال سے بھی گئے

رشیدہ رضویہ

وِش کنیا

جب وہ زینہ طے کر کے اُتری، تو رخساروں پہ آبشاریں بہہ رہی تھیں۔ اور جب وہ موٹر میں بیٹھی، تو آبشاروں میں پتھر بھی لڑھکنے لگے۔ وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگی تھی۔ اور جب اُس نے اسٹیرنگ سنبھالا تو آنکھوں کے آگے دُھند چھائی تھی، اور اُسے سامنے کوئی رستہ نظر نہ آرہی تھی۔ موٹر سائیکل پہ سوار ایک پولیس انسپکٹر نے اس کا پیچھا کیا، اور سڑک کے ایک جانب موٹر رکوادی۔

"محترمہ، اگر آپ کو اپنی زندگی عزیز نہیں، تو کم از کم دوسروں کا ہی خیال کیجیے۔ اپنا لائسنس دکھایئے۔" کہتے کہتے پولیس انسپکٹر نے موٹر میں جھانکا۔ عونیہ خفیر اسٹرنگ پہ سر رکھ کر رو رہی تھی۔ پریشان ہو کر پولیس انسپکٹر نے ازراہِ ہمدردی رونے کی وجہ دریافت کی۔

"میرا شوہر مر گیا ہے۔ اُسے دفن کرنے جا رہی ہوں۔" کچھ غصہ اور کچھ رنج سے کہہ کر عونیہ خفیر نے آنسو خشک کئے اور موٹر آگے بڑھا دی۔

کئی گھنٹے وہ بلاوجہ سڑکوں پہ چکر کاٹتی رہی۔ پھر اس کلب کی راہ لی، جو سمندر کنارے تھا اور جہاں کا ماحول صدق صد گھریلو تھا۔ شیر خوار بچے یہاں آیاؤں کی گود میں بیٹھے بندرگاہ سے نظر آنے والی روشنیوں اور جہازوں کے مستولوں کی طرف ہمکتے تھے۔ اور جب کسی جہاز کی زوردار آواز آتی، تو ڈر کر آیاؤں کے سفید دوپٹوں میں منہ چھپا لیتے، بڑے بچے یہاں ٹرائیسکل دوڑاتے یا ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے، اور بعض اوقات آپس میں لڑ کر رو بھی پڑتے، لیکن مائیں ان کے رونے سے بے نیاز ہو کر بیل اور بکرے کے مغز کے پکوڑے کھائے چلی جاتیں۔ ساتھ ساتھ اپنے شوہروں کی قصیدہ گوئی میں سمندر کنارے جھلملاتے زمین و آسمان کے تمام ترگوشوں کو ایک کر دیتیں اور ان کے شوہر بیویوں سے قطع نظر اپنی تجارت، لائسنس، پرمٹ واؤچر اور تجارتی پالیسی پر بحث کرتے رہتے۔ ان تمام لوگوں کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان کی کوئی الگ حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ہی گھر کے ایسے افراد ہیں، جن کا آپس میں بے حد اتفاق ہے۔ اور واقعی یہاں یک جہتی اور ایکائی دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے حضرات تمام کے تمام پشتینی خاندانی تھے۔ ان میں نو دولتیا یا ناجائز طریقوں سے دھن کمانے والا کوئی بھی نہ تھا۔ عونیہ کا خاندان پچھلی نصف صدی سے اس کلب میں آ رہا تھا

عونیہ کو بھی یہاں آنا بے حد پسند تھا۔ گو وہ اس شہر سے عموماً باہر ہی رہتی تھی۔

پاؤڈر روم میں جا کر عونیہ نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی اور رونے کے بجائے بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ بھی کیسی دیوانی تھی۔ بچوں کی طرح کتنی ذرا سی بات پہ یوں رونے لگی تھی۔ گویا تمام شہر کو ہی ڈبو دیں گے۔ یہ آنسو! ارے بھئی۔ یوں تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ خوشی اور دکھ، خیر اور شر، نفرت اور محبت تو ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اور پھر وہ خود ہی تو نہیں چاہتی تھی کہ امیل ادمان اس کی زندگی میں کسی طور داخل ہو جائے تو جو کچھ ہوا اس کی منشا کے عین مطابق ہوا۔ اب پچھتاوا کس بات کا؟ وہ روئی کیوں تھی؟

عونیہ کی آنکھوں سے آنسو دوبارہ اُبل پڑے۔ یہ کم بخت آنسو بھی کیا شے ہے کہ دل سے نکل کر فوراً آنکھوں میں آجاتا ہے۔ اور پھر ہر جذبہ، ہر راز کو عیاں کر دیتا ہے۔ آنسو خشک کر کے اس نے دوبارہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھی، آنکھوں کے اردگرد پاؤڈر لگا کر سبز شیشوں کی عینک پہنی اور پھر باہر نکل کر ایک کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس وقت کلب تقریباً خالی تھا اور بار میں دو تین مرد توانا بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ بلیرڈ روم میں خلافِ معمول سکوت تھا اور نیچے لبِ ساحل وہ تنہا بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد سناٹا تھا۔ وہ وقت کی اس تنہا ویران خاموشی کو کبھی کبھی ہوا کی سرسراہٹ توڑتی جھاڑیوں سے گزر جاتی۔ بعض اوقات ہوا کے ساتھ اختر شیرانی کے غزل کے یہ بول بھی بہتے چلے آتے ——— تو جانِ آرزو ہے ایمانِ آرزو۔

کلب سے ملحق ایک بنگلہ سے یہ آواز آرہی تھی۔ اور گانے والی بڑے تڑپا دینے والے انداز میں گا رہی تھی۔ آوازوں اور غزلوں کے انتخاب میں ریڈیو کراچی کا کوئی جواب نہ تھا۔ عونیہ کو بے چینی سی ہونے لگی۔ سمندر ساکت، چپ چاپ پڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی سفید لہریں آگے بڑھ کر، سر اونچا کر کے شوخی سے اس منہ بسورتی لڑکی کو بھی دیکھ لیتی تھیں جو ایسے بچے کی مانند نظر آرہی تھی جس کے تمام کھلونے ٹوٹ گئے ہوں۔

کوئی کسی کا جانِ آرزو نہیں ہوتا۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے، لہروں کی جانب دیکھتے ہوئے عونیہ نے ایک موٹی سی کتاب کے اوراق پلٹے۔ کتاب اس نے غلط رُخ سے پکڑ رکھی تھی، یہ کسی کی داستانِ حیات نہ تھی بلکہ اس کا نام "سازش نہر سوئز تھا"۔ زندگی نے عونیہ کے ساتھ بھی کیسی سازش کی تھی کہ جس روز اُسے عمو عاکف کی موت کی اطلاع ملی۔ اسی روز امیل ادمان نے قاہرہ سے آکر اس سے قطع تعلق کر لیا۔ کیونکہ اُسے راستہ میں ایک نئی لڑکی نظر آگئی تھی جس نے اپنے جسم کے تمام راز اس پر فوراً عیاں کر دیئے تھے۔ یہ لڑکی امیل ادمان کو عونیہ کی نسبت زیادہ دلربا محسوس ہوئی تھی۔ عونیہ تو بڑی ڈھکی ڈھکائی اور کچھ اپنے آپ میں رہنے والی لڑکی تھی جس کی پاکیزگی اور معصومیت کا تاثر اس نئی لڑکی نے زائل کر دیا تھا، اور آج ۲۷ اگست کو تعلقات منقطع ہونے کے ٹھیک دس روز بعد عونیہ نے امیل کی تمام تر خوبصورت چیزیں اُسے واپس کر دیں، اس وقت دن کا ایک بجا تھا۔ ریڈیو پاکستان شمالی ویت نام پر بمباری کی کوئی نئی خبر سنا رہا تھا۔ امیل اپنے دفتر میں بیٹھا خبریں سن رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اور دس روز بعد اس نے عونیہ کی آواز سنی۔ عونیہ یہ دریافت کر رہی تھی کہ بات کرنا پسند کرے گا یا نہیں؟

نہیں۔ مجھے تنگ نہ کیجئے۔ اطمینان سے جینے دیجئے۔ آخر آپ مجھے فون کیوں کرتی ہیں۔

"آپ" عونیہ تو سناٹے میں آگئی۔ اتنی اجنبیت۔ اس قدر مغائرت — ! یہ تو امیل ادھان کا انداز گفتگو نہ تھا
اُسے کیا ہوا تھا ! اس نے اچانک، کوئی وجہ بتائے بغیر بات چیت کیوں بند کر دی تھی ؟ وہ جو ایک خوبصورت سا دلربا
جذبہ دونوں کے درمیان تھا۔ اس کائنات کی ایک ان دیکھی سازش کے تحت ختم ہو گیا اور اس پگلی کو یقین نہ آتا تھا کہ اس
قدر جلد یہ جذبہ مر بھی سکتا ہے۔ کیا امیل کو اس سے کسی قسم کا کوئی قلبی یا روحانی لگاؤ نہ تھا۔ محض جسم کی طلب تھی، یہ سب کچھ
جاننے کے لیے عونیہ نے فون کا کھوکھلا سہارا لیا اور امیل سے آخری مرتبہ دریافت کیا کہ کیا وہ واقعی اس سے بات نہیں
کرنا چاہتا ؟

"نہیں" امیل حسب عادت تناؤ میں آ گیا۔

"اچھی بات ہے" فون بند کر کے عونیہ چند لمحات وہیں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں کھڑی رہی۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا
کہ یوں ہو گا۔ واقعی ہو گا ! اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ امیل ذرا روٹھ گیا ہے جسب معمول اس کے منانے پہ مان جائے گا
لیکن نہیں — اب ان کے درمیان کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

گھر والوں کی نگاہوں سے بچ کر نہانے کے بہانے وہ غسلخانہ میں چھپ کر رونے لگی۔ جی ذرا ہلکا ہوا۔ تو اپنے کمرہ میں
آ کر الماری سے وہ تمام اشیاء نکالنا شروع کر دیں جو امیل ادھان کے خلوص کی نشانی تھیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر عونیہ کو شک
ہونے لگا تھا کہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کو یونہی امیل نے تحفوں سے نوازا ہو گا اور تحفوں کے عوض کیا کچھ حاصل کیا ہو گا۔ امیل
ہر چیز کی قیمت ادا کرنے کے بجائے وصول کرنے میں زیادہ ماہر تھا۔ محبت کو اس نے یقیناً بیکار وقت کا سودا سمجھ رکھا تھا،
عونیہ غصہ سے ان اشیاء کو دیکھنے لگی۔

دو جنادری ناول تھے جو درحقیقت چینی ناولوں کے انگریزی ترجمے تھے، چینی نظموں کا ایک خوبصورت سا اردو ترجمہ
بھی تھا جس پہ امیل ادھان نے عونیہ کا نام لکھ رکھا تھا۔ ایک بے حد نفیس چینی ڈائری تھی جس میں عونیہ نے اپنے ایک
پسندیدہ شاعر کے اشعار لکھ رکھے تھے۔ ان کے علاوہ لکڑی کا ایک گڈا اور ایک گڑیا بھی تھی۔ ان اشیاء سے کئی یادیں وابستہ
تھیں اور ان کی واپسی گویا قلب پہ انگارہ رکھنا تھا لیکن تمام اشیا ایک کاغذ میں لپیٹ کر اس نے موٹر نکالی، دو رطوفان کی
طرح امیل کے دفتر کی راہ لی۔ امیل فائلوں پہ جھکا بیٹھا تھا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی اور انگاروں پہ قدم دھرتی وہ اس
کے کمرہ میں داخل ہوئی اور تمام چیزیں میز پہ پھینک دیں۔ اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور آواز غم و غصہ سے بھرپور
تھی۔ امیل نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر خاموش ہو کر چہرہ پرے کر لیا اور سگریٹ
سلگانے لگا۔ عونیہ نے بغور اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھا جو لرز رہے تھے اور سگریٹ کسی طور سُلگ ہی نہ پاتا تھا وہ شدید
انتشار اور ہیجان میں مبتلا تھا۔ عونیہ کو دیکھ کر ہمیشہ اس کے جذبات طوفانی ہو جاتے تھے اب تو وہ دشمن کی حیثیت سے سامنے
کھڑی تھی اور دشمن عورت زیادہ محبوب محسوس ہوتی ہے۔

"ہونہہ۔ خود کمینگی کرتے ہو۔ اور خود ہی ناراض ہوتے ہو۔ پھنکارتی ہوئی وہ کمرہ سے باہر نکل آئی۔

اور اب الف لیلیٰ الدین سی کتاب ہاتھ میں تھامے ساحل سمندر پہ بیٹھی تھی۔ ویران و تنہا ساحل ہی اس کے لگاؤ کا انجام
تھا۔ لیکن یہ بات تو اسے بہت پہلے سوچنا چاہئے تھی کہ وہ یہاں کے لئے ہمیشہ اجنبی رہے گی۔ کسی دور دراز کے جزیرہ کی

باشندہ رہے گی۔ اور وہ دن اس کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا جب وہ زندگی کی تمام تر لطافتیں پیچھے چھوڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔

کتاب بند کر کے۔ ریلنگ کے سہارے کھڑی ہو کر، وہ لہریں گننے لگی۔ بس اسی کام کی کسر رہ گئی تھی!

وہ دن کے ڈیڑھ بجے گھر سے نکلی تھی اور اب شام کے سائے دھیرے دھیرے چہار اطراف پھیل رہے تھے۔ اُن پھولوں کی خوشبو ہر سو اڑی تھی، جن کے نام عونیہ کو کسی طور یاد ہی نہ ہو پاتے تھے۔ غیر ارادی طور پہ چند پھول توڑ کر اس نے بالوں میں سجا لئے۔ وہ خود بھی تو ایک ایسا پھول تھی جسے بڑی بے دردی سے توڑ دیا گیا تھا۔

انجانے نامعلوم درختوں کی شاخیں پانی میں اپنا عکس دیکھتی تھیں اور سامنے جہازوں پر روشنیاں جل اٹھی تھیں یہ روشنیاں زندگی اور امید اور منزل کا پیغام دیتی تھیں۔ یہ روشنیاں عونیہ کی نگاہوں کا مرکز بنیں تو چہرہ پہ مسکراتی لہریں پھیل گئیں۔ وہ اُن بچوں کی مانند خوش ہو گئی جو پہلی مرتبہ جہاز دیکھتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لئے وہ امیل کو بھی بھول گئی اور کتاب ہاتھ میں تھامے تیزی سے باہر نکلی اور موٹر چلاتی کشادہ سڑک پر نکل آئی۔ چلتے چلتے جب وہ پی آئی اے کے دفتر کے قریب پہنچی تو موٹر کی رفتار کم کر کے چوڑے چوڑے خوبصورت شیشوں کی جانب دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلاتی الخطوط الجویہ الشرق الاوسط کی طرف آ گئی۔ یہاں اس نے قاہرہ کی پرواز کے متعلق دریافت کیا اور اپنا ٹکٹ لے کر کچھ سوچتی سوچتی باہر نکلی یہ بات تو خیر کب سے طے شدہ تھی کہ ایک روز وہ چلی جائے گی۔ لیکن اگر امیل یوں بیٹھے بٹھائے ناراض نہ ہو جاتا تو شاید وہ یہیں اپنا کوئی گھر تعمیر کر لیتی۔ مراجعت کا فیصلہ اس نے اچانک کر لیا تھا۔ یوں بھی اب اتنی ڈھیروں کمینگیوں میں وہ سامنا نہ لے سکتی تھی۔ اس کے ارد گرد بے شمار بے رحم۔ عنادی اور بغض بھرے چہرے تھے، جن میں امیل کا چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔ ان چہروں سے ہی پریشان ہو کر وہ اس ساحلی کلب کی راہ لیا کرتی تھی جہاں اس کے لئے تکلیف دہ رویہ اختیار کرنے اور اسے اپنے عتاب کا نشانہ بنانے والا کوئی نہ تھا۔ یہاں آنے والے عونیہ سے مختلف نہ تھے۔ ایک ہی طبقہ۔ ایک ہی انداز فکر کے لوگ تھے، جبکہ امیل اور ان بالکل ہی مختلف اندازِ زندگی رکھتا تھا۔ یہ کم بخت دو بالکل ہی مختلف انسان ایک دوسرے کی طرف کیوں بڑھ جاتے ہیں؟

ٹکٹ جھلاتی وہ موٹر میں بیٹھی اور سوچنے لگی۔ اب کہاں جائے؟

غیر ارادی طور پہ وہ پی آئی اے کے دفتر کے قریب چلی آئی اور موٹر روک کر شیشوں کی جانب دیکھا، شیشوں کے اندر بڑی تیزی اور مصروفیت سے کام ہو رہا تھا۔ یہ کام امیل کی زبان میں بھی ہوتا تھا۔ اور انگریزی میں بھی ہوتا تھا۔ اگر وہ امیل کے ساتھ کہیں جاتی "تو یقیناً پی آئی اے سے ہی جاتی"۔ لیکن اب تو وہ بڑی حسرت سے اس کے قریب سے گزر کر وہاں چلی گئی تھی، جہاں امیل اور ان کی کوئی زبان نہ تھی۔ بلکہ خود اس کی زبان تھی۔ عونیہ نے وہ اشتہار دیکھا۔ جو ٹکٹ کے ساتھ دیا گیا تھا اور جس پہ لکھا تھا۔ سُرعۃ فائقہ۔ راحہ تامہ۔ تقدما لکم رحلۃ متکو (آپ کی خدمت میں تیز پرواز کی آسائش پیش کی جاتی ہے)

عونیہ بے توقف اس زبان کو اپنا کہتی تھی۔ جبکہ امیل کی ذہن پرست اور محض اردو جاننے والی خواتین کا خیال تھا کہ عربی کے محض دو تین الفاظ جانتی ہے ایک محترمہ ایسی تھیں۔ جن کی عونیہ نے صورت تک نہ دیکھی تھی، اتنا ضرور سنا تھا کہ محترمہ کچھ پڑھنے لکھنے کا کار خیر کرتی ہیں اور عالم کو اپنے خیالات سے مستفید فرماتی ہیں۔ لیکن ان دنوں تو ہر لڑکی

ہر خاتون ہی پڑھنے لکھنے کا شغل اختیار کئے تھی اور دھڑا دھڑ افسانے اور ناولیں لکھ رہی تھی، یہ کھیپ کی کھیپ ایسی خواتین کی موجود تھی۔ ان میں دو تین ذہن پرست خواتین نہ جانے کیوں عونیہ پہ کبھی مہربان ہو گئی تھیں یا تو وہ اُسے اپنی کتابوں کا موضوع بنانا چاہتی تھیں یا پھر اس کے وجود سے انہیں کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ یا پھر اپنی گم مائیگی اور کھوکھلے پن کا احساس ہوتا ہوگا۔ بہرحال کوئی بات تو ضرور تھی۔

امیل گو قاہرہ و کراچی کے راستوں میں دستیاب ہونے والی نئی لڑکی کی وجہ سے ہی عونیہ سے لاتعلق ہوا تھا۔ لیکن اس لاتعلقی میں امیل کے ایک دوست کی ذہن پرست بیوی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ امیل کو جو عقل پرست خواتین جانتی یا چاہتی تھیں جنہیں امیل "میری جان۔ میری جان"، کہہ کر بے وقوف بناتا تھا، وہ عونیہ سے بے حد چڑتی تھیں اور اسے ذلیل کرنے کے مواقع تلاشتی تھیں۔ امیل کے دوستوں کا بھی کچھ یہی عالم تھا۔

ایک مرتبہ ایک عقل پرست خاتون نے تو حد ہی کر دی۔ نہ جانے کہاں سے عونیہ کا تذکرہ سن کر اسی کی خالہ زاد بہن سے کہنے لگی۔

"اچھا۔ تو وہ عونیہ جعفر آپ کی خالہ زاد بہن ہے۔ اس قدر بد دماغ، گستاخ اور جاہل اور خرافات لکھنے والی لڑکی آپ کی بہن کیونکر ہو سکتی ہے؟ معلوم ہے وہ کس قدر جھوٹ بولتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ بڑی پڑھی لکھی ہے ———— مجھے تو جاہلوں سے بدتر نظر آتی ہے۔ ساری زندگی میں کہیں ایک مرتبہ مشرق اوسط کے کسی شہر میں دو تین روز کے لیے کیا چلی گئی کہ اب بیٹھی ہر محفل میں مشرق اوسط کے ہی تذکرے کرتی ہے۔ ظاہر یوں کرتی ہے۔ گویا لندن و یورپ کے مختلف شہروں میں بھی رہی ہے۔ اسے ذرا اپنی اوقات تو دیکھیے۔ معمولی سے دوکاندار کی بیٹی۔ سارا دن گھر میں بیٹھی کھانے پکاتی اور برتن مانجھتی ہے۔ اور پردہ کرتی ہے اور خواب دیکھتی ہے۔ لندن و پیرس کے۔ !ائے ہے۔ اتنی اوقات بھی ہے اس کی کہ لندن و پیرس کا نام بھی زبان پہ لائے۔ کبھی پاکستان سے تو کیا۔ نگوڑی سے اپنے شہر سے بھی۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ کہ اپنے گھر کی چہار دیواری سے بھی باہر قدم نہیں دھرا ہے۔ سسک سسک کر۔ دانے دانے کو محتاج، زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن خیالات اتنے اونچے گویا امیر زادی ہے کوئی۔ اور ساری عمر ہوائی جہازوں کے سفر کرتی رہی ہے۔"

اور یہ سب کچھ سن کر عونیہ کی خالہ زاد بہن چپ چاپ ان محترمہ کا منہ تکا کی۔ کیا اتنا پڑھ لکھ جانے کے بعد بھی عورتیں ایسی باتیں کرتی ہیں؟ اتنی شہرت حاصل کرنے اور عوامی حیثیت رکھنے کے باوجود دنیا بھر کی لڑکیوں کو دلدل میں گھسیٹتی ہیں؟ اور پھر اپنی ذہن پرستی پر افتخار کرتی ہیں! بغداد کی امیرہ نورالدین۔ بیروت کی لیلیٰ بعلبکی اور قاہرہ کی امینہ السعید نے ایسی باتیں کبھی نہ کی تھیں۔

"ہا!" عونیہ نے زور سے سر جھٹکا۔ اور دھیرے دھیرے موٹر چلانے لگی۔

"تو عونیہ جعفر۔ یہ ہے زندگی۔ یہاں اگر تم اپنے مخصوص حلقہ سے باہر نکلو گی، تو تمہیں ایسے ہی لوگ ملیں گے۔ جو بغیر کسی وجہ کے تمہارے دشمن بن جائیں گے اور قدم قدم پہ تمہیں دکھ پہنچانے کی کوشش کریں گے اور تمہارے ارد گرد تاریکیاں پھیلا دیں گے۔

تاریکی کا بھی تو ایک حسن ہوتا ہے۔ لیکن یہی تاریکی جب شر کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کس قدر تکلیف دہ ثابت

ہوتی ہے۔ اور جب یہ تاریکی قبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تو ـــــ عونیہ کو بے اختیار عمّو عاکف کا خیال آگیا۔

عمّو عاکف کوئی اجنبی شخص نہ تھا۔ سوریہ کی وہ جو حزب البعث سے تھا جو آئے دن ملک میں انقلاب بپا کرتی رہتی ہے اور جس شخص کو چاہتی ہے۔ مملکت کا حکمران بنا دیتی ہے۔ اور جس کے لئے غیر عرب ممالک میں بڑا غلط قسم کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے تو اسی جماعت میں ہیں ـ جو مختلف پیچیدگیوں اور گردشوں سے بھرپور رہے جہاں چور دروازوں سے عربی وان ہونے کے ناتے سے اسرائیل کے سمدر دبھی آ داخل ہوئے تھے۔ وہیں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اسلامی نظریات کا حامی تھا اور تبلیغی دورروں پہ استنبول و بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ و جرمنی بھی جا پہنچتا ہے تو عمّو عاکف اسی تبلیغی گروہ سے متعلق تھا۔ وہ کوئی بوڑھا شخص نہ تھا۔ جیسا کہ نام سے مظہر تھا وہ ایک خوش شکل اور خوش وضع نوجوان تھا، دمشق کے لڑکے تو آپ جانتے ہی ہیں کس قدر جمیل ہوتے ہیں۔ لیکن ان لڑکوں کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ یہ عراقی ہوں یا سوری یا اردنی۔ اگر یہ سیاست میں دخیل ہیں تو کیا مجال ہے کہ عورت کو اپنی سیاسی نظریات میں شامل کرلیں۔ عمّو عاکف بھی کچھ ایسا ہی سرد مزاج لڑکا تھا لیکن ان لڑکوں کی سرد مزاجی اس روز برف کی طرح پگھل جاتی تھی جب دمشق یا بغداد میں پانی کی طرح خون بہتا تھا۔ ان لڑکوں کی برف خون میں شامل ہو کر عرب کی زمین کو سیراب کرتی تھی۔ کیونکہ عرب کی فصلوں کے لئے پانی سے زیادہ خون کی ضرورت ہے۔

ہاں تو عمّو عاکف حزب البعث کے تبلیغی گروہ کا رکن تھا۔ جن کے سیاسی مراکز دمشق کی مسجد اموی۔ استنبول کی مسجد سلیمانیہ اور بلغاریہ کی مسجد ستنبول اور بغداد کی جامع مرجان و جامع ابوحنیفہ تھے۔ عمّو عاکف کو عونیہ نے سب سے پہلے بلغاریہ کی مسجد ستنبول میں ہی دیکھا تھا۔ اگر آپ کو سوئے اتفاق بلغاریہ کا ویزا ملا ہو۔ اور بلغاریہ کے حسن سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ہو۔ تو آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ صدیوں پیشتر کولاروگراڈ نامی ایک شہر بلغاریہ کا شہرۂ آفاق ، دارالحکومت تھا اور موجودہ شہر سے کچھ فاصلہ پہ تھا اور پلی سکا کہلاتا تھا۔ پلی سکا کے شمال میں ایک قریہ کیس پی۔ کن کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ پلی سکا اور "کیس۔ پی۔ کن" کے پہاڑی علاقہ میں زیادہ تر عمال اور فلاحین رہتے ہیں اور ریلوے اسٹیشن پہ عموماً دیہاتی نظر آتے ہیں۔ یا پولیس کے آدمی گھومتے پھرتے ہیں۔ عونیہ اسی اسٹیشن پہ عمّو عاکف کی بہن کے ساتھ بیٹھی تربوز کھا رہی تھی۔ بلغاریہ کے تربوزوں کی کیا بات ہے جناب! دمشق اور استنبول کے تربوزوں سے بدرجہا شیریں اور گداز ہیں۔ پلیٹ فارم چوڑی اور بھدی اینٹوں کا بنا تھا، جس پہ سرخ رنگ چڑھا تھا۔ تیز دھوپ میں یہ رنگ نگاہوں کو چبھتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پہ جو پولیس اسٹیشن تھا، وہاں بھی سرخی ہی سرخی تھی اور ایک لمبا سا سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لڑکیاں جو تربوز کھا رہی تھیں وہ بھی سرخ تھا۔ کھاتے کھاتے دونوں سپاہیوں کی جانب بھی دیکھ لیتی تھیں۔ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک کی پولیس مسافروں کو بہت تنگ کرتی ہے جب عراق میں کمیونسٹ حکومت تھی تو وہاں کی پولیس نے عونیہ کے ایک مرتبہ وارنٹ نکال دیئے تھے اور جناب ایک معروف ادیبہ بہ اسم حاجرہ کے پھانسی کے احکامات جاری کردیئے۔ جی ہاں ۔ ایک ادیبہ کے لئے پھانسی کے احکامات ـــــ! وہاں کی ذہن پرست خواتین ایسی انقلابی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں کی اعلیٰ خیالات رکھنے والی خواتین کی مانند اسکنڈل سازی کے کارخانے تعمیر کرنے یا رشک و حسد کی بنیاد پہ دوسری اہلِ قلم خواتین کے خلاف بہتان تراشنے یا باتیں پھیلانے یا اپنے قلم کے ذریعہ ذلیل کرنے کا وقت ان کے پاس بالکل نہیں ہوتا وہ محض اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔

بلغاریہ کے اس دور افتادہ دیہاتی اسٹیشن پہ عونیہ اور عمو عاکف کی بہن عرب ممالک میں کمیونزم کے اثرات اور بلغاریہ کے کردار کا ذکر کر کے دھیرے دھیرے ہنس رہی تھیں، ہنسی اس بات پر آرہی تھی کہ عراق بین الاقوامی سیاست میں کیسے قلابازیاں کھاتا ہے اور ابو خالد (ناصر) بھی کیا دُہری چالیں چلتا ہے اور ریڈیو بلغاریہ کیسے بڑھ بڑھ کر باتیں بناتا ہے۔
لڑکیوں کو ریڈیو بلغاریہ کا کوئی تازہ پروگرام یاد آیا تو زور سے ہنس پڑیں۔ لیکن پھر فوراً ہی منہ میں تربوز ٹھونس لیا کہ آواز باہر نہ نکلے۔ کیونکہ بلغاریہ کے دیہاتوں میں بھی عربی، انگریزی دان گھومتے پھرتے ہیں۔ گو یہ لوگ ظاہر یہی کرتے ہیں کہ بلغاری زبانوں، جرمن اور ترکی کے علاوہ جو بھی کوئی زبان نہیں جانتے۔ لیکن عونیہ کو شک ہوتا تھا کہ یہ لوگ اردو بھی جانتے ہیں کمیونسٹ ممالک میں اکثر اردو دان بھی نکل آتے ہیں۔

"صباح الخیر یا بنات الاحمر" دونوں لڑکیوں کی پشت سے چھ سات لڑکے لڑکیوں کا ایک گروہ چلاتا ہوا نمودار ہوا۔

"صباح الاحمر یا بنات الخیر۔ کہو جی، ہم سرخ لڑکیاں نہیں ہیں۔ بلکہ اسلام کے احساسِ خیر سے ہمارا خمیر اٹھا ہے اور بلغاریہ کے سُرخ سویروں میں ہم حزب البعث کا سبز پرچم لہرانے آئے ہیں۔ لڑکیوں نے پلٹ کر کہا اور تربوز کے چھلکے سمیٹ کر اٹھیں اور سب کے ساتھ مسجد استنبول کی راہ لی۔ یہ مسجد ترکی فنِ تعمیر کا دلکش نمونہ تھی اور اس کی منقش دیواروں والے دالان میں عمو عاکف کچھ لوگوں سے ترکوں کے زوال پہ گفتگو کر رہا تھا

"ترکوں کے زوال کی وجہ یہود نوازی کے سوا دیگر نہیں۔ ترک اب بھی عرب سے زیادہ ایک اسرائیلی کا حمایتی ہے" ایک لڑکا بڑے جوش سے بولا۔

"ترکوں کا زوال عربوں کی سازشوں سے ہوا ہے۔ اسی لئے آج کا ترک اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرتا ہے کہ اچھا ہے عربوں کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ دیکھنا عرب دنیا پہ کوئی افتاد پڑی تو ترکیہ و ایران الگ تھلگ ہو جائیں گے۔ ایران کا ۹۰ فی صد تیل اسرائیل کو جاتا ہے"، دوسرا لڑکا بھی گفتگو میں کود پڑا۔

پاکستان ہمیشہ اور ہر حالت میں عربوں کا ساتھ دے گا۔ اس لئے کہ پاکستان خود کو عربوں سے الگ نہیں سمجھتا۔ وہاں کے عوام کو عرب کے مقامات مقدسہ خود عربوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اگر حضرت ابراہیم کا مزار کہیں فلسطین کے بجائے پاکستان میں ہوتا۔ تو دیکھنے کے قابل ہوتا"، عونیہ بھی لڑکوں کے قریب آگئی۔

"رہنے دو۔ تم لوگ تو آج تک قائد اعظم کا مزار بھی تعمیر نہ کر سکے حضرت ابراہیم تو بہت دور کی چیز ہیں" ایک لڑکے نے طنز کیا۔ اور مسجد کا دالان ہنسی سے گونج اٹھا۔ خفیہ کے جو آدمی وہاں دیواریں دیکھ رہے تھے۔ چونک اٹھے لیکن وہ جانتے تھے کہ عرب ہر حالت میں عرب ہے۔ قید و بند کی پروا کرتا ہے نہ تختۂ دار کی۔ اور پھر بلغاری حکومت بذاتِ خود عربوں کے معاملہ میں بہت سخت تھی۔ ان عربوں پر تو خفیہ کو مسلط کرنا ہی انتہائی نامعقول بات تھی۔ خفیہ کے آدمی دوبارہ مسجد کی چھت پہ لگے رنگین شیشے دیکھنے لگے۔ گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں۔ لڑکے لڑکیوں نے چھت گھورنے والے آدمیوں کی جانب دیکھا۔ اور کچھ فقرے چست کر کے زور زور سے ہنسنے لگے۔

"بچو! تم یہاں ہنسی مذاق کرنے آئے ہو۔ یا کوئی مقصد لے کر آئے ہو۔ تمہاری ناتجربہ کاری پہلے ریلوے اسٹیشن

کے تعاقب میں پھنس گئی اور اب تم یہاں بھی پولیس کے چنگل میں پھنسنا چاہتے ہو۔ عمو عاکف بہ آواز بلند بولا۔ لیکن خوش باش
گروہ کی ہنسی میں کسی طور کمی نہ آئی۔

" عاطف بن عاکف۔ ہماری ناتجربہ کاری نے ہمیں پولیس اسٹیشن میں نہیں الجھایا تھا بلکہ ہم پولیس انسپکٹر سے
اس بات پر دلچسپ بحث کر رہے تھے کہ بلغاریہ کے حسین چہروں پر اس قدر کرختگی کیوں ہوتی ہے؟ خروشچوف جب یہاں
آئے گا تو ان چہروں کے متعلق کیا سوچے گا؟ خوش باش گروہ بولا۔

پولیس انسپکٹر نے ہمیں جواب دیا ہوگا کہ خروشچوف کا کوئی حرم نہیں ہے نہ بلغاری خواتین حرم کے لئے تیار کی جاتی
ہیں۔ وہ محض کارخانوں اور کھیتوں کی مخلوق ہیں۔" عاطف بن عاکف نے جواب دیا اور پھر تمام لڑکے لڑکیوں کا بغور جائزہ
لینے کے بعد کچھ سوچ کر بولا۔

بچو۔ یہاں تم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ پولیس ضرورت پڑنے پر ہمیں حوالات میں بھی ٹھونس سکتی ہے۔ یاد کرو
وہ جلوس جو دیہاتیوں نے ہمارے اعزاز میں نکالا تھا۔ لیکن دور سے ہی پولیس کی صورت دیکھ کر دیہاتی خود تو بھاگ نکلے تھے
اور ہم پر پولیس نے یہ شک کیا تھا کہ ہم دیہاتیوں کو حکومت کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ یہ کمیونسٹ ممالک بھی کس قدر
دلچسپ ہوتے ہیں؟"

جب عاطف بن عاکف کمیونسٹ ممالک کے دلچسپ ہونے کے ثبوت پیش کر رہا تھا تو ایک لڑکی کو خیال آیا کہ
اس لڑکے میں اس قدر بزرگی ہے کہ اسے تو عمو عاکف کہنا چاہیے۔

اور جب وہ بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ میں خروشچوف کا جلوس دیکھتے اور نعرے لگاتے استنبول اور پھر دمشق
آئے تو عاطف ہر جگہ عمو عاکف کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔

عمو عاکف کچھ ہمدرد قسم کا انسان تھا۔ جو امیل کی طرح ہی حساب کتاب کے معاملہ میں بہت سخت تھا۔ لیکن امیل
شر کا محاسبہ کرتا تھا اور عمو عاکف خیر کا؟ اول الذکر لڑکیوں سے عشق کا خراج وصول کرنے میں ماہر تھا اور عمو عاکف
لڑکیوں کو کسی قسم کا کوئی خراج نہ دینے کی تلقین کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں اس سے خائف نہ تھیں۔ اگر وہ کسی لڑکی کو شب
کے دو بجے بھی اپنے ہمراہ کسی ویرانہ میں چلنے کے لئے کہتا۔ تو وہ لڑکی بلاخوف و خطر تیار ہو جاتی" کیونکہ عمو عاکف کی تربیت
قرآنی تعلیمات پر ہوئی تھی۔ جبکہ امیل تو الحمد للہ پڑھنا بھی نہ جانتا تھا کہ وہ ہند و معاشرت سے پاکستان تک
پہنچا تھا۔

شب کی تنہائیاں اور سحر انگیزی یا تاریکی بھی عمو عاکف کے جذبات میں ہیجان نہ پیدا کر سکتی تھی۔ یہ بات نہیں
کہ وہ فرشتہ تھا۔ لیکن وہ کچھ اصول رکھتا تھا اور آدمی ہونے کے علاوہ آدم النبیل یعنی پرا جینٹلمین تھا جبکہ
امیل کا معاملہ بالکل برعکس تھا اور کیسی ستم ظریفی ہے کہ امیل کو عزیزہ دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی تھی لیکن اس پر بھروسہ
اور اعتماد بالکل نہ کرتی تھی اور غیر قانونی و غیر شرعی طور پر اس کے ساتھ تنہا کہیں جانے کو کسی صورت آمادہ نہ تھی۔ کبھی کبھی
اس کا جی چاہتا کہ امیل کے ساتھ چڑیا گھر جا کر بندروں کو چنے کھلائے۔ اور انسان کے بندر بننے کے امکانات پر غور کرے کہ
وہ اکثر "امیل" کو کالا بندر کہہ کر پکارتی تھی۔ اس کا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ امیل اس کے ہمراہ ساحلی کلب میں بیٹھ کر

کافی پیئے اور جہازوں کی روشنیاں دیکھ کر اجنبی ممالک کی سیاحت کا پروگرام بنائے - اور دونوں افریقہ کے جنگلات میں روشن دنوں کی یادیں اپنے ذہنوں میں محفوظ کرتے جائیں ۔ لیکن امیل کو روشنی سے نفرت تھی ۔ وہ عونیہ کو کسی تاریک کمرہ یا سینما گھر کے تاریک ہال میں اپنے ساتھ دیکھنا زیادہ پسند کرتا تھا ۔ لڑکیوں کی معصومیت یا اچھے خیالات کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہ تھی ۔

"تمہیں محض ایک لڑکی کا اچھوتا جسم عزیز ہے اور جب تک وہ جسم تمہارے تسلط میں ہے، تم اس لڑکی کے ہو۔ ورنہ نہیں ۔ لیکن عمو عاکف سب لڑکیوں کا تھا۔ سمجھے تم" غصہ سے عونیہ نے سر ہلایا، اس کے ذہن میں دونوں گڈ مڈ ہو رہے تھے ۔کون کس پہ حاوی تھا - اس کا وہ اس لمحہ فیصلہ نہ کر سکی ۔ عمو عاکف مر چکا تھا ۔ امیل زندہ ہونے کے باوجود اُس کے لئے مر گیا تھا ۔ دنیا کے تمام تر ہنگامے ایک شخص کے زندہ رہنے تک ہی ہیں ۔ جس طرح وہ عمو عاکف کو بھول جائے گی - اسی طرح بہت جلد امیل کو بھی فراموش کر دے گی ۔ امیل ایک ذہنی حادثہ تھا اور حادثات روز مرّہ کی زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں ۔

اچانک عونیہ نے موٹر کی رفتار تیز کر دی ۔ گویا حادثہ میں مرنا چاہتی ہو ۔ جوں جوں موٹر کی رفتار میں تیزی آ رہی تھی، اس کے ذہن میں خیالات کی یورش خون کے دباؤ کی مانند بڑھ رہی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا مر جائے بس مر جائے ۔ اسکے ساتھ تمام شہر بھی امیل سمیت مر جائے یہاں بھی کوئی زلزلہ یا طوفان آ جائے ۔ ویت نام میں اس قدر تباہی ہو رہی تھی ۔ مشرق وسطی کس طرح تباہ ہو رہا تھا اور یہاں ہر طرف عیش و آسائش اور زندگی کی چہل پہل تھی ۔

جنگلی بلی کی طرح غرا کر بڑی جھنجھلاہٹ سے اس نے شیشے سے باہر کی دنیا کو دیکھا اور دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ یہ تمام دنیا امیل سمیت مر چکی ہے ۔ صفر کے نقطہ پر آ رکی ہے، جہاں محض سنّاٹا اور سکون ہے ۔

سنّاٹا اور سکون ——— دونوں ہی عونیہ کو خائف کرتے تھے ۔ اُس کا جی چاہا زور زور سے پکارے ———

لیکن کسے ؟

امیل کو یا عمو عاکف کو !

عمو عاکف کو وہ کتنے پیار سے اخویا (میرا بھائی) کہتی تھی لیکن جب وہ سطوس تقریریں کرتا تو وہ بھی عمو عاکف پہ اُتر آتی ۔

"کم از کم تم تو مجھے عمو عاکف نہ کہا کرو عینی ۔ عینتین ! وہ اُسے عونیہ کے بجائے میری آنکھوں کا نور اور میری دونوں روشن آنکھیں کہا کرتا تھا ۔

"کیوں اخویا ! مجھ میں ایسی خصوصیت بھلا کونسی ہے ۔"

صرف ایک ——— اور وہ یہ کہ تم میری اس پگلی بہن کی طرح ہی بے وقوف ہو " وہ اپنی بہن کے بال زور سے کھینچتا، اور بہن کے ساتھ عونیہ بھی اس سے لڑنا شروع کر دیتی ۔ عمو عاکف کے لئے عونیہ ایک بہن سے کسی طور کم نہ تھی ۔ اب اگر امیل کے شہر کی کوئی ذہن پرست خاتون یہ بات سن کر عمو عاکف اور عونیہ کا کوئی ناجائز رشتہ قائم کر دے تو دوسری بات ہے جیسے کہ انہوں نے بغداد کی عائشہ اور کراچی کے الپ ارسلان کے درمیان مختلف رشتے پیدا کر دیئے تھے حوالے کے لئے دیکھئے " فاختہ " مطبوعہ افکار شمارہ اگست ۶۷ء میں)

لیکن افسوس کہ عمو عاکف بہت جلد مرگیا۔ وہ ــــ جو اس قدر خوش باش اور زندگی سے بھرپور انسان تھا۔ تمام عرب ممالک میں ایک انقلاب کی سوچتا تھا عجیب عجیب خواب دیکھتا تھا۔ وہ مرچکا تھا۔ ابھی ستمبر ۱۹۶۶ء کی ہی تو بات ہے جب سوریہ میں حسبِ معمول ایک نیا انقلاب آیا۔ وہ سب کے سب ترکیہ و عراق کی سرحد تل کوچک پہ بیٹھے کچھ سٹڈی کر رہے تھے اور چیکوسلواکیہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ انقلاب کی خبر انہوں نے بڑے اطمینان سے سنی اور پراگ جا کر بغداد کے ابن الوقت شاعر بحر العلوم الجواہری کی خیریت طلب کرنے کے بجائے دمشق روانہ ہو گئے۔ لیکن وہاں ایک اور نیا ناکام انقلاب آچکا تھا۔

عمو عاکف۔ تمہارے اس مختصر سے ملک میں اب کونسا انقلاب آئے گا۔ امریکی۔ فرانسیسی۔ انگریزی۔ روسی و مصری۔ ہر نوعیت کے انقلاب تو آگئے۔ اب کیا اسرائیلی انقلاب آئے گا۔ اسرائیل کے تو بہتیرے حامی تمہاری حزب البعث میں شامل ہیں۔ جن کا پشت پناہ اردن ہے۔ عونیہ طنزیہ ہنسی اور عمو عاکف سر کھجا کر اردن جانے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن وہ ایسے وقت میں اردن گیا۔ جبکہ عونیہ امیل کے شہر میں تھی اور امیل کو عمو عاکف اور اس کی تحریکوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

عمو عاکف اردن اس وقت گیا جب اُسے یہ خبر ملی کہ تلولپو (تل ابیب) میں امریکہ و برطانیہ اور جرمنی سے دو ہزار بلند رفتار پائلٹ اور دبابات کی جنگوں کے ماہر مع اسلحہ و سرمایہ آئے ہیں۔ اسرائیل ایک بہت بڑی جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ اردن ایسے سب کو اس بات کا علم تھا کہ مصر و سوریہ پہ اسرائیل کا حملہ امریکہ کروائے گا۔ سوریہ و اردن ایک ہو کر مصر تک وسیع ہو جائیں گے اور تمام عرب دنیا پر ہاشمی خاندان کی حکمرانی کا پرانا خواب بھی مکمل ہو جائے گا عرب دنیا اور خصوصاً سوریہ پہ حکمرانی کا خیال کس قدر دل خوش کن تھا۔ یہ ملک نہ صرف کسی دوشیزہ کی الھڑ جوانی کی مانند جمیل تھا۔ بلکہ تجارتی مرکز بھی تھا اور تیل کی تمام تر پائپ لائنیں یہاں سے گزرتی تھیں۔

اردن کو یقین کامل تھا کہ برطانیہ سے سسرالی رشتوں کے تحت اسرائیل اُسے بالکل نہ چھیڑے گا۔ لیکن اسرائیل کے ایک آنکھ والے نقیب نے مصر و سوریہ کے علاوہ اردن سے بھی تمام حساب کتاب چکا لیا اور عمو عاکف اپنے تمام تر ساتھیوں سمیت اسرائیلی سپاہیوں سے لڑتے لڑتے جنگ کے تیسرے روز مر گیا۔

وہ مر گیا۔ اور امیل ــــ!

" امیل کے بچے۔ عقل کے کچے۔ آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔ نہ تم مردِ سیاست ہو۔ نہ تم نے کبھی کسی تحریک میں حصہ لیا۔ نہ اپنے وطن کے لئے کوئی قربانی دی۔ سارا دن گھر اور دفتر کے کمروں میں بیٹھے لڑکیوں کے خواب دیکھتے رہتے ہو۔ اور یہ تصور کرتے ہو۔ کہ ہر لڑکی تمہاری آغوش میں آگری ہے۔ ہونہہ! تم بھلا کیا جانو کہ عمو عاکف کیا شئے تھی؟ " عونیہ نے غصے سے کپڑے کا وہ گڈا دیکھا۔ جو موٹر کی چھت سے لٹک رہا تھا۔ امیل کا یہ ہم شکل گڈا عونیہ نے خود بنایا تھا۔ لیکن کیوں؟ امیل کیا واقعی اُسے اس قدر عزیز تھا کہ ہر لمحہ اس کی صورت سامنے رکھنا چاہتی تھی۔

" عزیز۔ عزیز؟ ! کی دم میں چھچھوندر۔ تم تو اس قابل ہو کہ تمہیں پھانسی پہ چڑھا دیا جائے۔ عونیہ نے گڈے کو نوچنے کے بجائے اپنے ہونٹ اس زور سے چبا ڈالے کہ ان سے خون بہنے لگا۔ وہی خون آلود ہونٹ اس نے گڈے پہ بھی رگڑ دیئے اور گڈے پہ جابجا خون کے چھینٹے پڑ گئے اور اسی لمحہ موٹر بھی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اور سڑک کے ایک گڑھے میں پھنس گئی۔

تم مجھے گڑھوں میں پھنسانا چاہتے ہو۔ عونیہ نے گھور کر گڈے کو دیکھا۔

"اللہ بچائے تم سے اور اس شہر سے۔ کوئی سڑک سلامت نہیں۔ اگر یہاں بھی روز روز انقلاب آئیں تو لوگوں کا دماغ ٹھکانے آجائے۔ یہ لوگ مشرق اوسط کی عیاشیوں کے تذکرے کرکے وہاں کے لوگوں کو برا کہتے ہیں۔ لیکن وہاں سڑکوں کے سینے پہ دہاہات چلتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی سڑک نہیں ٹوٹتی اور قومی ترقیاتی کاموں میں کوئی بے ایمانی نہیں کرتا۔ قوم قربانی دے کر اپنا خون بہا کر بنتی ہے۔ رشوتوں اور خوشامدوں سے نہیں۔ یہاں کے مزدور اور کسان امیل جیسے انسانوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ لیکن ان مزدوروں اور کسانوں کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ مشرق اوسط کے عمال اور فلاحین کبھی یہاں کسی کو نظر نہیں آتے۔ ہاں ننگے ناچ ہر کوئی دیکھ لیتا ہے جو نالائق یہاں سے جاتا ہے۔ وہاں کے شبینہ کلبوں کی ہی راہ لیتا ہے جیسے یہاں کراچی کے کلبوں میں باجماعت نمازیں ہوتی ہیں۔ فوہ! وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔

اس روز بیچ لگژری میں کیا ہو رہا تھا؟ وہ عورت ناچتے ناچتے نوزائیدہ بچے کی مانند برہنہ ہو گئی تھی۔ یہاں لیڈو میں بھی کیا ہوتا ہے؟ لیکن یہاں کی بات کوئی نہیں کرتا۔ وہ امیل بھی بیروت کے لیبون اور لغدا دکے اوبرج کی بات کرتا ہے اپنے ملک سے زر مبادلہ غالباً ننگے ناچ دیکھنے کے لئے ہی حاصل کرتے ہیں اور جب میں ان باتوں پہ ٹوکتی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ میں پاکستان دشمنی کی باتیں کرتی ہوں۔ میں بے بصر ہوں کہ مجھے یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ نظر کیوں نہیں آتا؟ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں جھگیاں اور فقیر اور غلاظت کے ڈھیر۔ شہری اصولوں سے ناواقفیت اور قانون کی بے احترامی۔ سب کچھ تو نظر آتا ہے"

عونیہ نے غصہ سے سر جھٹکا۔ اور ایک سگریٹ سلگا یا۔ سخت پریشانی کے عالم میں امیل کی طرح وہ سگریٹ پھونکنا شروع کر دیتی تھی اگر کوئی اسے ایک لمبی سیلون کار میں اور شب کے تاریک لمحات میں یوں سگریٹ پھونکتے دیکھ لیتا تو یہی کہتا کہ کوئی اعلیٰ درجہ کی طوائف ہے۔ شکار کی تلاش میں باہر نکلی ہے۔ شریف زادیوں کو بھی طوائف کا خطاب دینا کوئی غیر معقولی بات نہ تھی۔ لغدا دکے نچلے طبقے کی خواتین کی زبان پہ ایک لفظ قحبہ چڑھا ہوا ہے وہ ہر عورت کو پیار اور غصہ دونوں ہی صورتوں میں قحبہ کہتی ہیں اور ہر مرد کو ابن القحبہ کے خطاب سے نوازتی ہیں تو اسی طرح امیل کے پڑھے لکھے دوست احباب اور ان کی لاڈلی بیویاں بڑے اطمینان سے دیگر خواتین کو طوائف کہہ دیتی تھیں ان کا اصول ہی یہ تھا کہ جو عورت اپنے سے بہتر نظر آئے۔ اس کی شرافت کے پیچھے اڑا دو۔ امیل اکثر کہا کرتا تھا۔

"عونیہ اب تم اتنی شریف نہیں ہو جس قدر ظاہر کرتی ہو"

اس کے ارد گرد سستی قسم کی خواتین کا میلہ لگا رہتا تھا۔ اس لئے وہ ہر عورت کی شرافت پہ شک کرتا تھا۔

"شک کرتے ہو۔ تو کرتے رہو۔ علی کند ریتی" (میری جوتی سے) سگریٹ پھینک کر عونیہ نے موٹر گڑھے سے نکالی اور گھر کا راستہ لیا۔

وہ اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ کیونکہ اس نے امیل کا گھر کبھی دیکھا ہی نہ تھا، اسے معلوم نہ تھا۔ امیل کے گھر میں گلاب کے پودے اور حنا کی جھاڑیاں ہیں یا نہیں؟ چمن میں سلیقے سے گھاس اگتی ہے یا نہیں؟ وہ امیل کے گھر کے علاوہ اس کے پس منظر سے بھی قطعی ناواقف تھی۔ اسے امیل کے ماضی کا بھی علم نہ تھا۔ اس نے کبھی امیل کے معاملات میں مداخلت نہ کی تھی نہ اس کی پچھلی زندگی کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی ——

—— جبکہ امیل نے اس کے بارے میں الف سے ی تک معلوم کر لیا تھا امیل

کچھ ایسا پُرکشش انسان بھی نہ تھا۔ پھر عونیہ کو اس میں کیا نظر آیا؟

اگر کوئی عونیہ سے دریافت کرتا۔ تو وہ آنکھیں چمکا کر اور مسکرا مسکرا کر یہی کہتی۔ جناب من ۔جب امیل بزبان پنجابی بڑے مدھم لہجہ میں ایک لفظ کہتا ہے۔ تو بس دل چاہتا ہے کہ انسان سب کچھ قربان کر دے۔ عفیفہ سکندرا اور مہا صبری کی آوازیں بھی اس لفظ کے ترنم کے آگے ہیچ ہیں۔

اب اگر کوئی پوچھتا۔ محترمہ۔ ذرا یہ بتلایئے۔ وہ پنجابی لفظ کیا ہے ذرا ہم بھی تو سنیں۔ تو وہ یقیناً بتانے سے قاصر رہتی۔ باوجود کوشش کے پنجابی کا کوئی لفظ اُس کی زبان پہ نہ چڑھتا تھا۔ امیل بعض اوقات پنجابی اور ہندی میں اسے کھلیاں بھی دے جاتا۔ لیکن وہ حیران پریشان یہی سوچتی کہ لوگ اتنی آسانی سے پنجابی اور ہندی کیونکر بول اور لکھ لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اردو اخبار میں اس نے کراچی کی محنتی افسانہ نگار سعیدہ افضل کے تحریر کردہ ہندی دوہے پڑھے تو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اسے پڑھنا اچھا لگا۔ اور ایک ان دیکھی خوبصورتی اور انجانے دکھ کا احساس ہونے لگا

امیل جب اُسے " وش کنیا " کہتا تھا۔ تو اس وقت بھی اس کے کچھ عجیب سے احساسات ہو جاتے تھے۔ اس لفظ کا مطلب کبھی ڈھنگ سے اس کی سمجھ نہ آتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ یہی سمجھی کہ جاسوسی کے ناولوں کی کوئی اصطلاح ہے جو ہیروئین کے لئے استعمال کی جاتی ہوگی اور ہیروئین کے لئے اخبارات یوں سُرخی جماتے ہوں گے۔

وش کنیا عرف زہریلی ناگن عرف پٹاخہ جان وغیرہ وغیرہ نے آج صبح شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ جبکہ اُس نے شہر کی مصروف ترین شاہراہ پہ مشہور بنک میں داخل ہو کر لوگوں کے

ہجوم کے درمیان اپنے پٹاخہ سے چلنے والے پستول سے نہیں۔ بلکہ چھ گولیوں والے جرمن پستول سے بنک کے عملہ کو دھمکا کر تمام رقم لوٹ لی۔ کہا جاتا ہے کہ وش کنیا عرف زہریلی ناگن عرف پٹاخہ جان وغیرہ وغیرہ کا نشانہ اس قدر سچا ہے کہ ایک گولی میں تین آدمیوں کو مار سکتا ہے وغیرہ وغیرہ!

لیکن جب امیل نے بڑی احتیاط سے اور " وش کنیا " پہ کئی قسطوں میں تقریروں کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد اس لفظ کا مطلب اس کے ذہن میں ٹھونسا۔ تو اُسے بے حد عجیب لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ اُسے پسند آنے لگا۔ کیونکہ یہ امیل کہتا تھا اور اسی لفظ کی خاطر اس نے طے کیا تھا کہ ہندی سیکھے گی۔ یوں بھی عربی کی نسبت یہاں ہندی کی زیادہ اہمیت تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ پنجابی کی مانند وہ ہندی بھی سات جنم لے کر بھی نہ سیکھ سکتی تھی کہ ایک مدت تک وہ آشوری اور عبرانی زبانوں میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مشرق وسطٰی کا وہ مخصوص جادو بھی سیکھتی رہی تھی۔ جس کے ذریعہ نیلے ہوتے تھے۔ موم اور کپڑے کی پتلیوں پہ عمل کیا جاتا ہے اور صحرائی چھپکلیوں اور گرگٹوں اور سانپوں کا زہر " عامل " بننے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو اساطیر کی وش کنیا کی مانند عونیہ نے بھی ایک حد تک زہر سے پرورش پائی تھی اور اس قابل ضرور تھی کہ جس کے لئے چاہتی۔ اُسے مار ڈالتی۔ بلکہ جسے پسند کرتی۔ اسے بھی مار ڈالتی۔ وہ عموماً " کہا کرتی تھی کہ جس شخص کو میرے والدین میرے لئے پسند کریں گے، وہ بھی مر جائے گا۔ اور اگر اس شخص نے مجھے دھوکا دیا۔ جسے میں خود پسند کروں گی، تو یقیناً وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے وہ کبھی کسی کو دوست کی حیثیت نہ دیتی تھی۔ باپ اور بھائی۔ بہن اور ماں سے آگے بڑھنے ہی نہ دیتی تھی۔

امیل نے اس کا نام وِش کنیا کچھ غلط تو نہ رکھا تھا اور اس نام میں کتنا پیار اور کتنی گہرائی تھی۔ یہ تو کچھ وہی جانتی تھی۔

در حقیقت یہ ہے کہ اس نے کبھی امیل کی موت کی خواہش کبھی نہ کی تھی۔ اس کا کوئی پتلا بنا کر عمل نہ کیا تھا۔ بس ایک گڈا سا اپنی موٹر کی چھت سے لٹکا دیا تھا۔ امیل سے جان پہچان کئی سال پرانی تھی۔ لیکن ادھر کچھ ماہ سے۔ اس کے کراچی آنے پر اس جان پہچان کا رنگ ہی دیگر ہو گیا تھا۔ اس میں خونِ جگر کی سُرخی بھی آ گئی تھی۔ عزنیہ اسے کچھ ایسا پسند نہ کرتی تھی لیکن جب خیر اور شر کا براہ راست ٹکراؤ ہوا۔ تو خیر نے شر کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

گو عزنیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ امیل کے ساتھ زندگی کیونکر گزرے گی۔ امیل دوہرے کردار کا مالک تھا۔ اس کی دنیا میں ہر کام پوشیدہ طور پر ہوتا تھا۔ اور وہ سکون اور ٹھہراؤ کا عادی تھا۔ وہ کافی حد تک سُست رَو بھی تھا جو اپنی دوپہریں عشق کرنے اور اپنی شامیں گھر خاموش کمرہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھ کر گزارنا پسند کرتا تھا۔ جبکہ عزنیہ کو عشق کرنے کا خیال سخت واہیات معلوم دیتا تھا۔ عشق تو اللہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یا پھر کسی اہم مقصد یا کسی تصور کے ساتھ! اسے اپنی شامیں گھر میں گزارنے سے بھی سخت وحشت ہوتی تھی۔ شامیں تو ویسے ہی اداس ہوتی ہیں۔ ان شاموں میں گھر کا سناٹا شامل ہو جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں خود کو دفن کر رہا ہے۔ امیل کے ساتھ زندگی گزارنے کا مطلب اپنی تمام تر خواہشات، احساسات۔ آسائشات اور آزادی و خود مختاری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا تھا۔ اس کے باوجود جب امیل نے اس سے کہا ـــــ "استنبول نوجوانوں کی جنّت ہے" تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ قاہرہ واپسی کے بجائے امیل کے ساتھ استنبول کی راہ لے گی، وہاں کے چشمے پھلانگے گی اور امیل کو ننگے ناچ دیکھنے کا شوق پورا کرتے دیکھے گی اور یہ بات بالکل نہ سوچے گی کہ استنبول کے لوگ عربوں سے اس قدر نفرت کرتے ہیں۔

عزنیہ جانتی تھی کہ اس کے والدین کبھی کسی صورت امیل اوہان کو اس کے لئے پسند نہ کریں گے وہ یقیناً عزنیہ سے قطع تعلق کر لیں گے وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ممکن ہے دو ماہ بعد ہی وہ امیل سے بیزار ہو جائے، نہ گھر کی رہے، نہ گھاٹ کی! لیکن انجام کی پروا کئے بغیر اس نے آنکھیں بند کر کے آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ـــــ!

لیکن تم نے مجھ پر کبھی اعتماد نہ کیا۔ تم اس زمانہ بھر کی جھوٹی مکار عورت اور اپنے فسادی دوستوں کی باتوں پہ زیادہ یقین کرتے رہے تم خود میری طرف لپکے۔ جیسے مکھی کے پیچھے مکڑی لپکتی ہے۔ لیکن تم نے ہر جگہ یہی ظاہر کیا کہ میں تمہارے عشق میں مبتلا ہوں، حالانکہ میں عشق کا لفظ انسان کے لئے پسند ہی نہیں کرتی۔ لیکن تم نے میرے اردگرد جھوٹ کا ایک سنہرا جال پھیلا دیا اور ہمیشہ مجھے شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ میں نے آج تک تمہیں اپنے قلب میں چھپا رکھا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ لیکن تم ـــــ تم تو اپنے اور میرے درمیان اس کالی مائی۔ کو بھی لے آئے۔ جو تمہارے کسی دوست کی بیوی ہے۔ تم نے اتنا نہ سوچا کہ میرے پاس کالی مائی (موت کی دیوی) کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بلکہ آتو پشتم کا تخیل ہے۔ جانتے ہو۔ آتو پشتم کون ہے؟ یہ بابل کا لازوال انسان ہے، جس کے پاس بقائے دوام کا راز ہے۔ لیکن یہ جاننے کی زحمت تم نے نہ کی۔ میرے والدین کا سامنا کرنے کی ہمت بھی تم نے کبھی نہ کی اور یہی چاہتے رہے کہ میں غیر شرعی طور پر تمہارے ساتھ وقت گزاروں اسی لئے تم مجھے ہر جگہ۔ ہر محفل میں ذلیل کرتے رہے۔ میں نے تمہاری ہر کمینگی۔ ہر زیادتی صبر و سکون کے ساتھ برداشت کی

تو میں جانتی تھی۔ تم ہملٹ ایبنیل نہیں ہو۔ تم عورتوں کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ دل پھینک ہو۔ جہاں جاتے ہو وہاں کی عورتوں سے قرب کے خواہاں ہوتے ہو۔ اور ایک عورت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے ہو۔ لیکن میں نے تمہاری تمام تر برائیوں سے چشم پوشی کرلی اور تم ہو کہ —!

"تم نرا بھس بھرا بے قلب اور بے روح گڈا ہو، سنتے ہو تم امیل ادھان —— جیب حمو عاکف۔ میرا پیارا بھائی نہ رہا۔ تو تم کیوں زندہ ہو۔ بتاؤ کیوں زندہ ہو۔؟" اس نے گڈے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

امیل تم کہتے ہو کہ دش کنیا سے وصال درحقیقت ایک شخص کی موت ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ دش کنیا سے فراق و ہجر دراصل ایک شخص کی موت ہے۔

جھنجھلا کر عونیہ نے موٹر کی چھت سے کپڑے کا گڈا کھینچا اور جب ٹریفک سگنل پر گاڑیاں رکیں تو اس نے ایک کاغذ اور کچھ سوئیاں اپنے بٹوہ سے نکالیں۔ کاغذ پر قلب کی صورت بنا کر امیل ادھان کا نام لکھا اور چاروں اطراف لمبی لمبی سوئیاں چبھو دیں اور پھر آشوری زبان میں کچھ پڑھ کر گڈے پہ پھونکیں مارنے کے بعد گڈا اپنی موٹر کے پہیے تلے رکھ دیا۔

اور پھر جب ٹریفک کھلی تو موٹر کے دو پہیے کپڑے کے گڈے سے بھی گزر گئے اور پھر پیچھے سے آنے والی تمام گاڑیاں اس پر سے گزرنے لگیں اور گڈے کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ عونیہ کا دل امیل نے توڑا تھا۔ عونیہ نے اسے ہی اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ اور پھر ——!

اور پھر جیسے تمام تر بوجھ بھی سینہ سے ہٹ گیا، وہ اپنے تمام ترغم بھول گئی اس ایک لمحہ میں یہ بھی بھول گئی کہ امیل نامی کسی شخص کو کبھی جانتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گمشدہ زندگی کی چمک پیدا ہو گئی اور ہونٹوں پر روشن مسکراہٹ پھیل گئی۔ عربی کا ایک مسرت بھرا نغمہ گنگناتی وہ گھر کی طرف دوڑ گئی۔

آج شب دو بجے کی پرواز سے وہ قاہرہ جا رہی تھی۔

سیّد رضا کاظمی

قِصّہ گدھے اور سینگ کا

لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھی بہت بڑا جانور ہے۔ مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں تو یہ ننھی ننھی آنکھوں والا جانور، تھل تھل کرتا ہوا گوشت کا پہاڑ ہی نظر آیا! — اسی طرح شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ نہ جانے کس قسم کا بادشاہ ہے کہ اُسے دیکھتے ہی ڈر لگتا ہے۔ ہم نے تو دو چار بادشاہ یا راجے مہاراجے دیکھے ہیں وہ تو انتہائی حسین، نازک اندام گڈے جیسے سجے سجائے ہی نظر آئے — اُونٹ کو دیکھئے۔ کوئی کل سیدھی نہیں۔ بے ہنگم ڈیل ڈول۔ انتہائی بدشکل۔ بے حد طویل گردن جیسے کسی نے بچپن میں ربڑ کی مانند کھینچ لی ہو۔ بانسوں کی طرح پتلی اور لانبی ٹانگیں لیکن دُم انسانی عقل کی طرح چھوٹی اور موٹی!

گائے کو لیجئے۔ بڑی خود غرض۔ سانی چارہ نہ دیجئے دودھ نہ دے گی۔ حد تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی گئو ماتا ہونے کے باوجود اُنہیں دودھ نہ دے گی اگر سانی بھوسہ نہ ملا ہوا!

لیکن گدھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام جانوروں میں اس سے زیادہ نیک، شریف، جفاکش اور معصوم شکل صورت والا اور کوئی نہیں۔ کم دام اور بڑے کام کا۔ نہ بہت اُونچا نہ بہت نیچا۔ نہ بیٹھنے کے لئے کاٹھی کی ضرورت نہ ہانکنے کے لئے لاٹھی کی ضرورت۔ جب جی چاہے اچھل کر بیٹھ جائیے۔ نہ بہت لانبا نہ بے حد موٹا۔ مختصر سی جگہ میں باندھ دیجئے، اور اگر باندھنے کے لئے جگہ نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دروازہ پر کھلا چھوڑ دیجئے۔ کھڑا رہے گا!

خود غرض و موقع پرست سیاسی لیڈروں کی مانند گدھے کی کھال بھی بہت موٹی ہوتی ہے۔ کوئی اسے کتنا ہی بُرا کہے یہ ذرا پروا نہیں کرتا اور اپنی کھال میں مست رہتا ہے۔ لیڈر تو موقع بے موقع رینک کر ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں لیکن گدھے کی ایسی خراب عادت نہیں ہے۔ وہ کبھی بے موقع منہ نہیں کھولتا۔ لیڈر تو اقتدار کی کرسی حاصل کرتے ہی — یعنی ان کے الفاظ میں عوام کی خدمت کا موقع پاتے ہی آنکھیں پھیر لیتا ہے اور پُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ لیکن گدھے پر جتنی ذمہ داری یعنی بوجھ بڑھتا جاتا ہے وہ اتنا ہی شریف النفس اور مستعد ہوتا جاتا ہے!

لیڈر تو صرف انتخابات کے موقع پر قابو میں آتا ہے لیکن گدھے کو جب چاہیے کان پکڑ کر کھینچ لیجئے، وہ کبھی انکار نہ کرے گا!

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، گائے سانی چارہ کے بغیر دودھ نہیں دیتی لیکن گدھا مشرقی عورت کی طرح بھوکا پیاسا رہ کر بھی کام میں لگا رہتا ہے۔ بیوی تو خیر کبھی کبھار بڑبڑاتی بھی ہے، لیکن یہ بے چارہ تو ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ گھروالی تو تنگ کر یوں چال بند کر دیتی ہے یا عدم تعاون کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے لیکن یہ بے چارہ اپنے آقا سے روٹھ کر کبھی اٹوائی کھٹوائی لے کر نہیں بیٹھتا۔ بیویاں تو اکثر میکے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہیں لیکن گدھا تو میکے سسرال کے جھمیلوں سے بے نیاز ہو کر اپنے مالک کی خدمت میں مشغول رہتا ہے۔

اس کلجگ کے زمانے میں وفا شعار اور شوہر کو مجازی خدا سمجھنے والی بیویوں کا تناسب دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ وقت بھی آجائے جب وفا شعار پتی ورتا بیوی صرف لغت کے صفحات میں ہی نظر آسکے، لیکن ہمیں مکمل یقین ہے کہ خواہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے۔ نئے نئے قوانین نافذ ہو جائیں، اور عائلی قوانین کے طرز پر کوئی ایسا قانون بھی بن جائے جس کی رو سے گدھے کو بھی طلاق دینے یا لینے کا حق حاصل ہو جائے یا کسی قانون کے تحت اسے بھی اپنے مالک کی جائیداد و ملکیت میں حصہ دار تسلیم کر لیا جائے لیکن گدھا اپنی چال نہ بدلے گا، اور مالک کی خدمت سے کبھی منہ نہ موڑے گا۔

مشرقی خاتون گذرے زمانے میں شرم و حیا کا مجسمہ کیونکر ہوتی تھی۔ وفا شعار اور خدمت و فرماں برداری کو اپنا مقصدِ حیات کیونکر سمجھتی تھی، اسے جاننے کے لئے مستقبل کے ریسرچ اسکالر جب تک گدھے کو قریب سے نہ دیکھیں گے صحیح صورتِ حال سے کبھی واقف نہ ہو سکیں گے۔ بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ گدھے کو دیکھ کر ہی وہ لوگ اس مشرقی بیوی کا اندازہ لگا سکیں گے جو شوہر پرست اور فرماں بردار ہوا کرتی تھی کہ اب یہ 'ٹائپ' رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے (آقا خواہ جوان ہو یا بوڑھا، لولا ہو یا لنگڑا، آنکھوں والا ہو یا اندھا کانا، آجکل کی بیوی تو خیر صورتِ حال کے عین مطابق اپنی منزل متعین کرے گی لیکن بے چارہ گدھا ہر حال میں آقا کی خدمت کرتا رہے گا!

ہمیں اگر دین و مذہب کے اجارہ داروں کے خانہ ساز فتوے کا ڈر نہ ہوتا تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہہ دیتے کہ قدرت نے گدھے کے ساتھ انتہائی ناانصافی کی ہے! بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ گدھے پر اتنا بوجھ لاد دیا۔ اُسے بے زبان بنا دیا اور پھر اسے دانت کاٹنے کے قابل بھی نہیں رکھا! نہ اُسے لانبے لانبے ناخن دیئے کہ دانت نہ کاٹے تو نوچ ہی لے! اس کی قسم کے تمام جانوروں کے سروں پر سینگ اُگا دیئے لیکن گدھے بے چارے کو اس سے بھی محروم رکھا ذرا تصور تو کیجئے کہ اگر گدھے کے سر پہ سینگ ہوتے تو کیا ہوتا؟

کیا قدرت کو یہ خدشہ تھا کہ گدھا سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہو جائے گا؟ یا یہ کہ انسانوں کو سینگ دکھائے گا؟ گائے بھینسوں نے سینگ رکھ کر انسانوں کا کیا بگاڑ لیا ہے جو قدرت کو گدھے سے کسی قسم کا خدشہ محسوس ہوتا؟ بھلا قدرت کو کیا معلوم کہ سینگ مارنے والے سے زیادہ خطرناک ڈینگ مارنے والا ہوتا ہے۔ اب بے چارہ گدھا اپنے سینگ ہی تو مارتا ڈینگ تو نہ مارتا کہ میں روئے زمین کا مہذب ترین فرد ہوں۔ جمہوریت کا علمبردار ہوں۔ میرے پاس اتنے بم ہیں اتنے راکٹ ہیں!!

میں سمجھتا ہوں کہ اگر گدھے کے سر پہ سینگ ہوتے تو صرف دکھانے کے ہوتے۔ کسی کو مارنے کے نہیں، اور شاید

ایک نئے محاورے کا اضافہ ہوجاتا کہ ہاتھی کے دانت ہی نہیں گدھے کے سینگ بھی دکھانے کے ہوتے ہیں!

میرے خیال میں گدھے کے سر پر سینگ اُگ آنے سے اس کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوتا کہ وہ دولتی جھاڑنا بھول جاتا! — دولتی جھاڑنا میدان جنگ کا وہ ناقابلِ تسخیر داؤں ہے جس کا استعمال صرف گدھے کو ہی آتا ہے، اور ٹھیک ہی تو ہے۔ دشمن کو آگے سے کیا مارنا! اُسے تو پیچھے سے جھاڑنا چاہیے! منہ زوری تو سب ہی کر لیتے ہیں، سامنے سے لات مارنا بھی کوئی کارنامہ ہوا؟ لیکن پیٹھ دکھا کر بھی دشمن کے دانت توڑ دینا واقعی کارنامہ ہے بلکہ ایک آرٹ ہے! اس میں کم از کم دشمن سے آنکھ کی مروّت تو قائم رہتی ہے اور کسی پر ہاتھ اٹھانے کا الزام بھی نہیں آتا۔ تو دیکھا آپ نے کہ اگر گدھے کے سر پر بھی سینگ ہوتے تو آج کی دنیا اس آرٹ سے بے بہرہ اور ناواقف ہی رہ جاتی!

ذرا سوچئے تو سہی کہ اگر گدھے کے سر پر بھی سینگ ہوتے اور وہ پیچھے والوں کو دولتی نہ مار کر آگے والوں کے پیٹ میں سینگ بھونکنے لگتا تو صرف دھوبی یا کمہاروں کا ہی نہیں، بڑے بڑے تیس مار خاؤں کے لئے اڑ جاتے اور شیر کے ساتھ ساتھ گدھے کا شکار بھی بہادری کی علامت سمجھا جاتا۔ تب لوگوں کے نام شیر خاں یا شیر جنگ کے علاوہ گدھے خاں یا خر جنگ بھی ہوا کرتے۔ اور توہم پرست مائیں اپنے شیر خوار بچوں کے گلے میں شیر کے ناخن کے ساتھ ساتھ گدھے کے کھُر بھی باندھا کرتیں!

ایک خطرہ اور بھی تھا۔ گدھے نامی جانور کے سر پہ سینگ دیکھ کر دنیا کے بے شمار گدھے سینگ کی تمنا کرنے لگتے اور اگر انہیں اصلی سینگ نہ ملتے تو کسی سے مانگ کر ہی بھلے مانسوں کو ڈرایا دھمکایا کرتے۔

فیروز

بازآمد

یہ تیسری پیالی انہوں نے اس لئے نہیں منگوائی تھی کہ انہیں آج کی چائے بے حد پسند تھی، بلکہ وہ ہمیشہ کی طرح آج کی شام بھی اس ریستوران میں دیر تک بیٹھے رہنا چاہتے تھے، ورنہ یہ تیسری پیالی تو انہیں بے مزہ سی لگ رہی تھی۔ وہ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے سامنے والی میز کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں ایک تیکھے نقوش والی سانولی سی لڑکی اور ایک خوب صورت نوجوان دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔

وہ چائے کثرت سے پیتے تھے، کبھی کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ ان کی زندگی بھی بے مزہ چائے کی طرح ہے جس کا ایک ایک گھونٹ وہ بے دلی سے حلق کے نیچے اتار رہے ہیں۔ پہلے وہ زندگی سے بیزار نہ رہتے تھے، بلکہ ہر وقت چہکتے رہتے۔ کالج کے ساتھیوں میں ان کی زندہ دلی مشہور تھی۔ ان کے چھریرے جسم پر ہر طرح کا لباس خوب سجتا تھا۔ ان کے چہرے پر بلا کی جاذبیت تھی اور آنکھوں میں عزم جھلکتا تھا۔ ان دنوں تو وہ غزلیں بھی کہا کرتے تھے۔ رنگوں میں ڈوبی ہوئی، دل کو مسحور کر لینے والی غزلیں۔ بالکل نجمہ کے ہونٹوں کی طرح۔ مگر اب تو وہ زمانے بیت گئے، برسوں پیچھے چھوٹ گئے۔ اب تو زندگی ہی بدل چکی تھی، مگر وہ اب بھی نجمہ کے غم کو سینے سے لگائے اس بھری پری دنیا میں تنہا تھے۔ ورنہ ان کی جانب تو کتنے ہاتھ بڑھے تھے، مگر جن ہاتھوں کو تھامنے کی انہیں حسرت تھی وہ کسی اور کے ہاتھ میں چلے گئے تھے۔ نجمہ کو پانے کے لئے انہوں نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ اس ریستوران میں انہوں نے نجمہ کے ساتھ کتنی شامیں گزاری تھیں، چائے کی چسکیوں کے دوران کتنی باتیں ہوئی تھیں، خوب صورت شہد میں ڈوبی ہوئی باتیں، بالکل نجمہ کے ہونٹوں کی طرح۔ نجمہ کی یاد آتے ہی انہیں کالج کے دن یاد آجاتے اور آنسو کے ایک دو قطرے ان کے چہرے پر ڈھلک آتے جنہیں وہ چونک کر سب کی نظریں بچا کے پونچھ لیا کرتے، انہوں نے نجمہ کو کتنا چاہا تھا۔

وہ شام بھی آج ہی کی طرح سانولی اور اداس تھی۔ دسمبر کی وہ شام ــــ وہ نجمہ کا اسی ریستوراں میں بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ شام ان کی زندگی کی اہم ترین شام تھی، اس روز نجمہ نے ان سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ویسے تو نجمہ پہلے بھی اس ریستوران میں ان سے کئی بار مل چکی تھی۔ مگر اس روز انہوں نے نجمہ کو بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کردے۔ وہ جلد سے جلد نجمہ کو اپنا لینا چاہتے تھے۔ انہیں

ڈر تھا کہ نجمہ کسی اور کی نہ ہو جائے۔ بڑی دیر کے بعد وہ اس بات پر رضامند ہوئی تھی، اور اس نے کہا تھا کہ وہ کل تک انہیں اپنے والدین کی رائے سے آگاہ کر دے گی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے والدین سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکے گی۔ اور تب وہ اس شام بڑی بے چینی سے نجمہ کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی نظریں بار بار گھڑی پر جا رہی تھیں اور ان کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا، آخر بڑی دیر کے بعد نجمہ آئی تھی۔

"نجمہ جلد بتاؤ، کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

انہوں نے کس بے تابی سے پوچھا تھا،

اور نجمہ نے کس سنگدلی سے بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔

انہوں نے نجمہ کی طرف بڑے کرب کے ساتھ دیکھا۔

"میں مجبور ہوں راشد، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو" نجمہ نے عام عورتوں کی طرح کہا تھا۔

"تم میرے دل کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرو نجمہ، میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ میں تو اب اس قدر آگے بڑھ آیا ہوں کہ پیچھے مڑ کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی نجمہ، میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا"

وہ بے حد جذباتی ہو گئے تھے، ان کی آواز اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آس پاس کی میزوں تک پہونچ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے اس ریستوران سے باہر نکل آئے۔ ان کا چہرہ غم اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور ان پر ایک جھلاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔

اس روز کے بعد سے وہ اس ریستوران میں کئی مہینے تک نہ آئے۔ کبھی کبھی کالج میں نجمہ کا سامنا ہو جاتا تو وہ کترا کے دوسری طرف نکل جاتے۔ اس کے بعد ان پر گھنٹوں افسردگی چھائی رہتی۔ اس رات کو کوشش کے باوجود انہیں دیر تک نیند نہ آتی اور وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہتے۔ ہر چیز ان کے لئے اپنی کشش کھو چکی تھی۔

گرمی کی تعطیل کے بعد نجمہ کالج میں نظر نہ آئی تو درد کی ایک زہریلی لہر اُن کے دل کو چھو کر گذر گئی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال پائے۔

'نہ جانے کہاں ہوگی وہ؟' انہوں نے کسی سے پوچھا بھی تو نہیں۔

ویسے اِدھر اُدھر سے انہوں نے یہ بھی سُنا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔

کسی نے کہا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی گئی ہے۔

اب زندگی اور بھی ویران لگنے لگی ——— رفتہ رفتہ انہوں نے دوستوں سے بھی ملنا کم کر دیا۔ اور پھر اسی ریستوران میں آنے لگے۔

اس ریستوران نے ان کی جوانی دیکھی تھی، اور اب ان کے آفتابِ جوانی کے ڈھلنے کا سماں بھی دیکھ رہا تھا۔ ہاں، اب اُن کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ اب تو اُن کی کنپٹیوں میں سفید بال جھلکنے لگے تھے، جنہیں وہ ہر روز آئینے میں دیکھ کر ایک اطمینان سا محسوس کرتے۔

اب وہ سگریٹ پی رہے تھے، اور اس سامنے والی میز کی طرف بھی دیکھ رہے تھے جہاں وہ نوجوان اور وہ سانولی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر اداسی تھی اور نوجوان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ـــ خیر انہیں کیا مطلب ان دونوں سے ـــ وہ چلنے کے لئے اٹھے، اور اس میز کے پاس سے دھیرے دھیرے گزرے۔

"سدھا، بھگوان کے لئے مجھ پر ایسا ظلم نہ کرو، میں پاگل ہو جاؤں گا، میں زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ سدھا میں تمہارے بغیر........"

وہ نوجوان بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کی آواز اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آس پاس کی میزوں تک پہونچ رہی تھی اور پھر انہوں نے دیکھا کہ لڑکا تیز تیز قدموں سے ریستوران سے باہر نکل گیا۔ اس کا چہرہ غم اور غصے سے سُرخ ہو رہا تھا، اور اس پر ایک جھلاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔

ڈی ایس۔ ریمونٹ
ترجمہ
عبدالمجیب ملک

شامِ زندگی

پولش کہانی

پولینڈ کے نوبل انعام یافتہ ادیب ولادا سٹیلا ستانسلا ریمونٹ (VLADISLAV STANISLY REYMONT) (۱۸۶۸ – ۱۹۲۵ء) کا بچپن روسی پولینڈ میں ..... ایک فارم میں گزرا۔ اسکول میں فیل ہونے کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگ گیا، اور سارے پولینڈ میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ ۱۸۹۳ء میں اُس نے کہانی نویسی کا مشغلہ اختیار کیا اور اس کی اکثر کہانیاں پولش رسالوں میں چھپنے لگیں۔ دیہاتی زندگی اور اس کے رسم و رواج کو اس نے اپنی کہانیوں کا خاص موضوع بنایا۔ اس کا شاہکار ناول "THE PEASANTS." ہے جس میں دیہاتی طرزِ معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اس کی دوسری کتابوں میں THE COM-EDIENNE. THE PROMISED LAND — اور THE DREAMER بڑی مشہور ہیں۔ اسے سنہ ۱۹۲۴ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ (مترجم)

سوکول پڑا ہوا مَر رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے اسی حالت میں پڑا تھا: وہ بیماری کے بعد اب بے کار لاش کی طرح ٹھٹھر رہا تھا۔ ٹیکسطی لوگ کہتے تھے کہ اگرچہ اس کی کھال سے نہایت عمدہ چمڑا بن سکتا ہے لیکن اس کو مارنا مناسب

ہوگا۔ ہاں، وہ اچھے لوگ اسے آہستہ آہستہ، اکیلا اور کس مپرسی کے عالم میں مرنے دے رہے تھے، وہی اچھے لوگ کبھی کبھی اس کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ وہ بہت آہستگی سے مر رہا ہے ایک آدھ لات سے نواز جاتے تھے۔ لیکن اس کے سوا وہ اس کی طرف ذرہ برابر توجہ نہ کرتے تھے۔ کبھی کبھار شکاری کتے، جن کے ساتھ وہ شکاریوں کے تعاقب میں برق رفتاری کے ساتھ دوڑا کرتا تھا، اس کو دیکھنے آجاتے تھے لیکن کتوں کی روحیں تو گریہ ہوتی ہیں .... (انسانوں سے بہت زیادہ قرب کی وجہ سے !) چنانچہ اپنے مالکوں کی آواز پر وہ سوکول کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ صرف لاپا، ایک بوڑھا، اندھا سا ٹیریر شکاری کتا، دوسروں کی نسبت زیادہ دیر اس کے پاس رکتا تھا۔ وہ ناند کے پیچھے سوکول، جس کی بڑی بڑی رحم طلب پُرنم آنکھیں اس کو خوفزدہ کر دیتی تھیں، کی حالت پر سوگوار پڑا اُونگھتا رہتا تھا۔

یوں اس بوڑھے گھوڑے کو تنہا اذیت سہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی رفاقت گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ تھی ——— سنہری، گلابی دن یا سرمئی اور بے رحم اور پُر درد دن جو اس کے تھان کو اپنے آنسوؤں سے بھر دیتے، وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے، پھر چپکے سے وداع ہو جاتے گویا خوفزدہ ہو گئے ہوں ....

سرکول صرف راتوں سے ڈرتا تھا۔ مختصر، ہیبت ناک، خاموش دَم گھٹنے والی جُون کی راتیں ——— تب ہی تو اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ یقیناً مر رہا ہے ——— اور وہ خوف سے تقریباً پاگل ہو اٹھتا۔ وہ اپنی رسی تڑانے کی کوشش کرتا اور اپنے سموں سے دیوار کو پیٹتا ——— وہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا ——— وہ فرار ہو جانا چاہتا تھا ....

ایک دن جب سورج غروب ہو رہا تھا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا، دیوار کے سوراخوں میں سے آنے والی روشنی کی چھیٹوں کو گھورنے لگا، اور غم آلود آواز سے زور زور سے ہنہنانا شروع کر دیا، رخصت ہوتے ہوئے دن کی اس بوجھل خامشی میں ایک آواز نے بھی اسے جواب نہ دیا۔ ابابیل ادھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے یا اپنے گھونسلوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ سورج کی آخری کرنوں میں بھنبھناتے سنہری کیڑوں پر پروں والے تیروں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ دور چراگاہوں میں درانتیاں چلنے کی تیز گونج سنائی دے رہی تھی۔ اور غلے کے کھیتوں اور پھولوں سے سرسراہٹ، گنگناہٹ اور کانا پھوسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

لیکن سرکول کے اردگرد ایک گمبھیر، ہیبت ناک خامشی چھائی تھی جو اس کو کپکپا دیتی تھی، اک مغموم ہول نے اس کو جکڑ لیا تھا۔ اس نے مجنونانہ انداز میں اپنی رسی کو جھٹکے دینے شروع کر دیئے ——— رسی ٹوٹ گئی، اور وہ باڑے میں بھاگ گیا۔

دھوپ نے اس کو اندھا کر دیا، اور شدید درد گویا اس کی انتڑیوں کو کترنے لگا۔ اس نے سر جھکا لیا، اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا گویا مُن ہو گیا ہو، تاہم وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ گیا۔ کھیتوں، جنگلوں، مرغزاروں کی دھندلی یادیں اس کے ذہن میں تیرنے لگیں ...... اس کے اندر دوڑنے کی ناقابل مزاحمت خواہش جاگ اٹھی .... لمبے لمبے فاصلوں کو تسخیر کرنے کی تمنا........ دوبارہ زندہ ہونے کی پیاس ...... اس نے باڑے سے نکلنے کے لئے راستے کی مشتاقانہ تلاش شروع کر دی۔ باڑہ مربع نما تھا اور اس کی تین اطراف مختلف عمارات نے بند کر دی تھیں۔

اس نے لاحاصل جستجو کی۔ اُس نے بار بار کوشش کی حالانکہ وہ بمشکل اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا تھا، ہر حرکت سے اس کو ناقابلِ بیان درد ہو رہا تھا اور اس کے پرانے زخموں سے خون بہنے لگا۔۔۔۔

آخر وہ لکڑی کی باڑھ پر پہونچا جہاں سے وہ جاگیردار کی ڈیوڑھی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر سامنے والے لان کو دیکھا جس میں کتے پڑے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے، اور پھر اسے وہ مکان نظر آیا جس کی کھڑکیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اس نے غم انگیز اور قابلِ رحم انداز میں منہنانا شروع کر دیا۔

اگر کوئی وہاں آکر اس کو چمکار دیتا یا اُس کے بدن پر پیار سے ہاتھ پھیر دیتا تو شاید وہ فوراً گر کر جان دے دیتا۔ لیکن گرد و پیش کا سارا ماحول سونا، اونگھتا ہوا اور خاموش تھا۔

مایوسی کے عالم میں اُس نے سریوں کو کاٹنا شروع کر دیا اور دروازے پر اپنا پورا زور ڈال کر اُس کو زور زور سے دھکے دینے لگا۔ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور وہ باغ میں داخل ہو گیا۔ وہ غمناک انداز میں منہناتا برآمدے تک چلا گیا، لیکن کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا، وہ کافی دیر وہاں کھڑا پردے والی کھڑکیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کی بھی کوشش کی، پھر اس نے مکان کے گرد چکر لگایا۔

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ وہ سب کچھ بھول گیا ہے ۔۔۔۔۔ اس کو دور بہت دور افق تک پھیلے ہوئے وسیع، سرسبز کھیت کسی ناپیداکنار سمندر کی طرح نظر آ رہے تھے ـــــــ ان موہ لینے والے تصورات سے مسحور ہو کر وہ لڑکھڑاتا ٹھوکریں کھاتا اپنی تمام تر ناقابلِ اختلاط پذیر طاقت کے ساتھ آگے بڑھا۔

سرکوں کو کپکپی آئی، اس کی آنکھیں دکھ سے دھندلا گئیں اُس نے گہری سانس لی اور جلتے ہوئے نتھنوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی ناک نم گھاس سے لگا دی ۔۔۔۔۔۔ وہ بہت پیاسا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ بچ نکلنے کے ناقابلِ بیان جذبے اور اپنی مغموم وحشت سے برانگیختہ، لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہا ـــــ جب وہ گیہوں اور غلّے کے ڈنٹھلوں میں ٹھوکریں کھاتا بڑھ رہا تھا تو اس کے پاؤں بوجھل ـ بے بوجھل ہوتے گئے۔ نالیاں اب اس کے لئے بڑے گڑھوں کی طرح تھیں۔ گھاس اس کے پاؤں میں الجھ کر اسے پیچھے گھسیٹ رہی تھی۔ جھاڑیاں سدِّ راہ تھیں، ساری زمین اس کو مشفقانہ اپنی طرف کھینچتی معلوم ہوتی تھی۔ اناج زیادہ تر اس کی نظر سے افق کو چھپائے ہوئے تھا۔

اس کی لاچار رگوں کی رُوح خوف کی ظلمت میں ڈوبتی گئی کچھ بھی نہ پہچانتے ہوئے وہ اندھا دھند آگے لڑکھڑاتا رہا گویا گہر میں چل رہا ہو۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان ایک تیتر اچانک اُڑا۔ وہ ڈر کر بدک گیا اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ وہ جنبش کرنے سے بھی گھبرا رہا تھا۔ کھیتوں پر سے اڑ کر گزرنے والے کوّے اس کو دیکھ کر رُک گئے۔ ناشپاتی کے درخت پر ڈیرا جما لیا اور شیطانی آوازوں میں کائیں کائیں کرنے لگے۔

وہ خود کو چراگاہ تک گھسیٹ کر لے گیا اور نڈھال ہو کر گر گیا اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں۔ آسمان کی طرف دیکھا اور غمناک آہ بھری۔ کوّے درخت سے اُڑ کر زمین پر آ گئے۔ اور پھدک پھدک کر اس کے بہت قریب آ گئے۔

اناج کا پودا اپنی گل لالہ جیسی سُرخ سُرخ آنکھوں سے اس کو گھورنے لگا۔ کوّے اپنی چونچوں کو گھاس کے سخت گچھوں سے تیز کرتے اور نزدیک آتے گئے۔ کچھ حریصانہ انداز میں اس کے اُوپر اڑنے لگے وہ نیچے آتے گئے۔ یہاں تک کہ اس کو ان کی خوفناک گول گول آنکھیں اور ادھ کھلی چونچیں نظر آنے لگیں۔ لیکن وہ جنبش تک نہ کر سکا۔ اس نے اپنے سُم زمین پر مارے اور تصور میں دیکھا کہ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور کھیت میں سرپٹ دوڑتا جا رہا ہے ...... شکار کے تعاقب میں ...... اپنی محبت میں بھونکتے ہوئے شکاری کتے لئے ...... ہوا کی طرح اڑتا ہوا ......

اس کی روح کا کرب اتنا شدید ہو گیا کہ وہ وحشیانہ انداز میں ایک بار پوری قوت سے ہنہنایا اور زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کوّے چیختے چلاتے پرے اُڑ گئے ......

لیکن اب اسے کچھ دکھائی دیتا تھا نہ کچھ سمجھ آ رہی تھی ...... اس کے گرد و پیش کی چیز گھوم رہی تھی۔ اچھل اچھل کر ٹوٹ پھوٹ رہی تھی ...... اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ کسی گہری دلدل میں دھنستا جا رہا ہے ..... اس کے سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا ....

سُورج ڈوب گیا، اور محو کر دینے والے جھٹپٹے نے ہر چیز کو خاموشی کے لبادے سے ڈھانپ دیا اور ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔

لاتیا دوڑتا ہوا اپنے دوست کے پاس آیا لیکن سوکول نے اس کو نہیں پہچانا۔ بُوڑھے کتے نے اس کے جسم کو چاٹا، زمین پر پنجے مارے، کھیت میں بھونکتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑتا پھرا۔ مدد کے لئے پکارتا رہا، لیکن کوئی نہیں آیا .....

گھاس سوکول کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانکنے لگی ..... درخت اس کی طرف بڑھے اور اپنی تیز پنجوں جیسی ٹہنیاں اس کی طرف بڑھانے لگے۔ پرندے خاموش ہو گئے۔ ہزارہا زندہ چیزیں اس کے جسم پر رینگنے لگیں اور اسے نوچنے کھسوٹنے لگیں..... کوّے مہیب انداز میں کائیں کائیں کرنے لگے۔

خوف سے لاتیا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ پراسرار انداز میں چیخنے اور نوحہ کرنے لگا۔

ابن زیدون
ترجمہ
ڈاکٹر محمد یوسف

عربی

محبّت کی خاطر

(ابن زیدون اندلس کا مشہور شاعر جس کا شہزادی ولّادہ کے ساتھ عشق کا واقعہ افسانہ سے کسی طرح کم نہیں)

لَئِن فاتَنی منک حَظُّ النَّظَر
لأکتفِیَن بسماعِ الخَبَر
وإن عَرَضَت غَفلۃٌ للرّقیب
فحسبِی تسلیمۃٌ تُختَصَر
اُحاذِر ان یتَظنّیَ الوُشاۃ
وقد یُستَدام الهوی بالحذَر
فاصبِرُ مستیقِناً انّہ
سیحظَی بنَیلِ المُنیٰ من صَبَر

رہوں میں جو محروم حظِ نظر
تو تسکینِ دل ہے سماعِ خبر
جو غافل کبھی ہو نگاہِ رقیب
زہے مژدہ تسلیمۂ مختصر
یہ کھٹکا ہے مجھ کو عدو بدگماں
محبت کی خاطر میں ہوں پُرحذر
ہے مسلک مرا صبر مجھ کو یقیں
کہ ہے صبر کا پھل منال و ظفر

شمشیر الحیدری
ترجمہ
محسن بھوپالی

سندھی

پیش کش

ابتدا اور انتہا کی وسعتوں پر ہے محیط
زندگی کا شہر — شہرِ لازوال
شورشوں اور حادثوں کی سلطنت ؛
جس کے دور افتادہ گوشے کی بلندی پر ہے قائم
ایک باغ — خوشنما حیرت کا باغ
پُرسکون و پُرفضا تنہائیوں ، خاموشیوں کی سرزمیں

وقت کا مالی عجیب !
انجان شہزادی کی آمد کا سدا سے منتظر
دل کو آنکھوں میں سما کر
حزن کو آنسو بنا کر
درد کے دریا بہا کر
سینچتا رہتا ہے چاہت کے گلاب ،
پیش کش کے واسطے — خوشبو کے نورستہ ثمر!

ایک مدت میں کہیں
یہ شورشوں اور حادثوں کی سلطنت کی شاہزادی
زندگی کی حسن بانو ،
وقت کی اُن تھک امیدوں کے گلابوں میں
نظر آتی ہے اور —
دل ہی دل میں مسکرا کر
قرب کی باہیں بڑھا کر
پیار سے اپنا بنا کر
درد کے تحفے کو کرتی ہے قبول!

مہجور کاشمیری
ترجمہ
خاور لدھیانوی

کشمیری

غزل

وزنہ لگ بیہ زندگی ہند سازمیون
سازمیون اظہار کرہ وون رازمیون

نغمہ زن ہستی کا میری ساز ہے
ساز یہ پردہ کشائے راز ہے

باغ میونوُی گُل تہِ میون بلبل تہ میون
بولہ وُن بلبل چھُ خوش آواز میون

گُل مرے، گلشن مرا، بلبل مرا
میرا ہی یہ مرغِ خوش آواز ہے

پنجرہ نزہ نیربہ وچھن یامت ہچھوم
آسمانو پیٹھ تہ گو پرواز میون

سرِّ آزادی سمجھنا ہے تو دیکھ
چرخ سے اُونچی میری پرواز ہے

را تہ مفلس زرو کُس چمنس اندر
پنجہ وِتھ تس لنجہ کڈ شہباز میون

بوم کا میرے چمن میں کام کیا
یہ چمن جولاں گہہ شہباز ہے

آسہ پوُد فولاد تن اسفندیار
تس اچھو کن مارِ تیرانداز میون

خرمن دشمن سے یہ کہہ دے کوئی
ما حقہ میرا ہر اک جانباز ہے

دلہ پہ سازن بوزکُس میون سوز دل
کس چھُ مہجورس سوا ہمراز میون

ساز دل کے نغمۂ پرسوز کا
اک فقط مہجور ہی ہمراز ہے

فدائے اطہر
ترجمہ
قاسم سروش

سرائیکی

غزل

راتیں ڈینہاں نندر وجھی ہے
عشق دی ایہا کھٹی چھی ہے

شب و روز کی نیندیں اُچاٹ ہو گئی ہیں
یہی مجھے عشق کا صلہ ملا ہے

توں نہ آنویں تاں ول کیہا ہے
یاد جو تیڈی چلی آئی سیئے

اگر تو خود نہیں آیا تو کیا ہوا
تیری یاد کا آنا ہی کافی ہے

لوک ولا ہن مونجھے ماندے
آیا میکوں ہوش اجیئی سیئے

لوگ دوبارہ اُداس اور مایوس ہوگئے ہیں
میرا ہوش میں آنا عبث ثابت ہوا

"اَج کل دا انسان خدا نی"
کیں اے پُٹھی بِین وَجھی سیئے؟

"آج کل کا انسان خدا نہیں ہے"
یہ اُلٹا راگ کس نے اُلاپا ہے؟

جیکوں آدھن لوک قیامت
آوے کیڑھی مادی جئی سیئے

لوگ جسے قیامت کے نام سے پکارتے ہیں
وہ آئے تو دیکھوں کس ماں کی جنی ہے

اطہر کرتے پیار دا سودا
آپنی قدر آپ گھٹی سیئے

اطہر ہم تو پیار کا سودا کر کے
اپنی قدر خود ہی کھو بیٹھے ہیں

نوٹ: جن حروف کے نیچے یہ علامت (॥) لگی ہے وہ خاص سرائیکی تلفظ میں ادا کئے جائیں

ک ۔ ا

سحر انصاری

نئی کتابیں

(تعارف و تبصرہ)

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تذکرہ قلندر زماں

(حالات و واردات)

مولف :۔ حسن عزیز جاوید رحمانی
ناشر :۔ مکتبۂ قدسی اے۔ ایم ۲۰ فریئر روڈ۔ کراچی ۱
صفحات :۔ ۱۳۳ ۔ قیمت :۔ دو روپے

یہ کتاب مصنف کی اس انتہائے عقیدت کی گواہ ہے جو اسے قلندر زماں جناب نا صرالدین محمد امداد الرحمٰن قدسی کی ذات سے ہے۔ تصوف و طریقت کے مسلک کی اولین شرط ہی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس راہ کا فرش بنا دیا جائے جو پیر طریقت کی رہنمائی میں محبوب حقیقی تک لے جاتی ہے۔ جبھی وہ منزل سامنے آتی ہے جس کے بارے میں ایک فارسی شاعر نے کہا ہے

آں را کہ خبر شد، خبرش باز نہ آمد

گمشدگی کی یہ منزل روحانی عظمت اور سربلندی کی وہ انتہا ہے جہاں پہنچنے کے بعد انسانی دل اور روح کو کبھی زوال نصیب نہیں ہوتا۔ عشق اور وسعتِ قلب سے صوفی کا منفرد کردار بنتا ہے۔

حسن عزیز جاوید رحمانی نے قلندر زماں کی زندگی کے جو حالات بیان کئے ہیں، اس میں بھی اپنی اوصاف کا ذکر بطور خاص کیا ہے جو ان کے مسلک سے وابستہ ہیں اور لطیفیات

اس بات کا ایک ثبوت بن جاتی ہے کہ صوفی زندگی کے سارے معاملات میں صوفی ہی رہتا ہے دُنیا داری اس کے دامن کو آلودہ نہیں کر پاتی ۔ یہ کتاب تصوّف سے دلچسپی رکھنے والوں میں ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی ۔ (ک ۔ ۱)

اسلام ڈی اونلی وے
(مخطوطہ)

مصنف :۔ انعام محمد
طابع :۔ انٹر سروسز پریس، کراچی ۴۰
صفحات :۔ ۳۲ ۔ قیمت :۔ درج نہیں

یہ انگریزی کتابچہ اسلام کے بُنیادی رکن ایمان اور عقیدت کی اس کمزوری سے متعلق ہے جو موجودہ دور کے مسلمانوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے ۔ اس اعتبار سے ساری دنیا میں یکساں حالت ہے ۔ یہ خطوط جو انعام محمد اور انڈونیشیا کے ایک سابق سفیر ڈاکٹر ایچ ترتاونا تزنے ایک دوسرے کو لکھے تھے ۔ سارے عالم کے مسلمانوں کی اس بے راہ روی پر تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان دونوں کی نظر میں علماء اور مشائخ کا بھی آج وہ کردار نہیں رہا جو عام مسلمانوں کو دین کی طرف کھینچ لیتا تھا ۔ لیکن ان خطوط سے ان اسباب و علل کا پتا نہیں چلتا جن کی وجہ سے ساری دنیا کے مسلمان دین سے انحراف کر کے مادی زندگی کو عادی ہو چکے ہیں ۔ البتہ جستہ جستہ اشارے ان خطوط میں ضرور موجود ہیں ۔ ان اشارات میں موجودہ دور کے روحانی بحران کی ماتم گساری بھی ہے اور تنقید بھی ۔

کتاب کا پیش لفظ جناب سید عبدالقادر گیلانی سفیر عراق نے لکھا ہے اور انعام محمد کی کوشش کو سراہا ہے ۔ کتاب اچھے گیٹ اَپ کے ساتھ شائع کی گئی ہے ۔ (ک ۔ ۱)

حرفِ سپاس
(شعری مجموعہ)

مصنف :۔ رحمٰن کیانی
ناشر :۔ ہمارا ادارہ ۔ ۳۰ اشیلڈان روڈ نزد اردو کالج کراچی
صفحات :۔ ۱۲۲ ۔ قیمت : ۳ روپے ۵۰ پیسے

'حرفِ سپاس' رحمٰن کیانی کی رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے ۔ یہ نظمیں انہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پوری سچائی سے لکھی ہیں ۔ وہ پاک فضائیہ کے ایک جیالے سپاہی ہیں اور خود جنگ میں عملی طور پر شریک رہے ہیں ۔ ہمارے ملک میں بہت سے جنگی ترانے لکھے گئے ۔ رزمیہ گیتوں کے مجموعے شائع ہوئے ۔ لیکن 'حرفِ سپاس' کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" ۔ رحمٰن کیانی جدید دور کے نمائندہ شاعر ہیں ۔ سخن گوئی کی قدرت سے انہوں نے یہ کام لیا کہ بڑی رواں دواں ، مترنم بحروں میں جنگ کے ہولناک تجربوں کو مکمل

صداقت کے ساتھ نظم کر رہا ہے۔

"اپنے شاہین بچے" اس مجموعے کی سب سے طویل نظم ہے۔ اس میں پاک فضائیہ کے حملوں کی پوری گرد و پیش کی فضا کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس نظم میں رحمان کیانی نے روایتی الفاظ سے کیفیت، رزم پیدا کرنے کے بجائے بڑی خوبصورتی اور فن کارانہ چابکدستی سے موجودہ دور کے حقیقی اسلحہ اور آلاتِ حرب کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں بارود، توپ، ٹینک، بمبار، بم، راکٹ کے الفاظ کو تخلیقی انداز میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ حدِ صدا (SOUND BARRIER) توڑنے کے عمل کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

جیسے بجلی کہ آندھی کو بھی راہ میں
دوڑ جاتی ہے چلتا ہوا چھوڑ کر
اپنی آواز کو، چیختی، پیٹتی
چھوڑ جاتی ہے حدِّ صدا توڑ کر

اس کے علاوہ "حرفِ سپاس" اور "آدمی تنکا بھی نہیں" اس مجموعے کی جاندار نظمیں ہیں۔ 'حرفِ سپاس' میں رحمٰن کیانی نے افواجِ پاک کی جانب سے اُن اہلِ قلم کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے قلم کے ذریعے اس جنگ میں حصّہ لیا۔ یہ نظم بہت متاثر کرتی ہے۔ اس میں ایک سچا عسکری جذبہ اُبھر آیا ہے۔ 'حرفِ سپاس' میں ہمیں شاعر اور سپاہی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ رحمٰن کیانی کے اس رزمیہ مجموعے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ (سحر انصاری)

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی　　طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی　　دفتر: رابسن روڈ، کراچی

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
دس میں سے نو آدمیوں میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناقص اور ناکافی غذا ہوتی ہے۔
اس غیر طبعی حالت سے بچنے کے لئے ہمدرد کا ماء اللحم دو آتشہ
استعمال کیجئے۔ یہ صحت و شباب قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
جدید طبی تحقیق کی مدد سے ماء اللحم کے خواص اور خوبی کو کمال تک
پہنچا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک ایسا مکمل اور مؤثر
ٹانک بن گیا ہے جو تھکے ہوئے اعصاب کو قوت بخشتا ہے اور
پورے نظام جسمانی کو چاق و چوبند کر کے سال بھر کے لئے
ضروری توانائی مہیا کرتا ہے۔ بیشمار لوگ اس کی تاثیر کو آزما چکے ہیں
ماء اللحم دو آتشہ
جاڑوں میں قوت اور صحت حاصل کرنے کے لئے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک
ماء اللحم
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
HMU. 1/63

بلینڈ عمدہ، فلٹر لگے
سگریٹ نوشی کا لطف دوبالا!
ولز
فلٹر ٹپ
PTC
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

ہر بک اسٹال سے خریدیئے

مجاز، ایک آہنگ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نظر میں

• یہ کتاب صہبا لکھنوی صاحب مدیر افکار نے مرتب کی ہے۔ محض معمولی ترتیب کا کام نہیں کیا جو اکثر تاجرانہ ذہنیت والے کرتے ہیں، اور ادھر اُدھر سے الٹی سیدھی تحریریں سمیٹ کر جھٹ ایک کتاب تیار کر لیتے ہیں۔ یہ پیشہ ور منشیوں کا کام ہے۔ اس "آہنگ" میں صہبا صاحب کا شوق، محبت، ذوق صحیح ان کے شریک کار ہیں۔ انہوں نے مجاز کے متعلق اُن تمام تحریروں، تاثرات اور مقالوں کو فنِ ترتیب و تبویب کے تحت یک جا جمع کر دیا ہے جو مجاز کی وفات کے بعد اس کے احباب اور قدردانوں کے زبان و قلم سے نکلے۔

صہبا صاحب نے جس شوق اور محبت سے اس کتاب کی ترتیب میں محنت کی ہے وہ بہت قابلِ شکرگذاری ہے۔ انہوں نے نہ صرف مجاز کا حق ادا کیا ہے بلکہ مجاز کے مداحوں اور قدردانوں نیز اردو ادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔

——— عبدالحق